رجسٹرڈ نمبر اے ۷۷۰
لہو زمیں سے ابل رہا ہے نظامِ ہستی بدل رہا ہے
ہوائیں لاتی ہیں خاکِ صحرا یہ کون مقتل میں بے کفن ہے
فضل
سرفراز لکھنؤ
نمبر ۱
محرم نمبر
اڈیٹر: سید مصطفٰے حسن رضوی
Date of passing
1
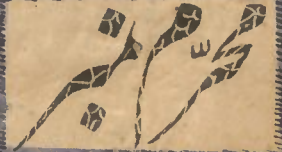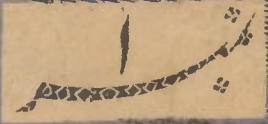
عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ صدر آل انڈیا شیعہ کانفرنس

جناب سید شبر حسن صاحب عابدی ایڈووکیٹ
غازی پور

حصّہ اوّل

فرازِ محرم نمبر

جس میں ۱۹۲۵ء لغایتہ ۱۹۵۵ء کے محرم

نمبروں کے بعض اہم مضامین و نظمیات

شامل ہیں

فہرست مضامین محرم نمبر حصہ اوّل

حصہ دوم

انقلابِ عظیم

منشی پریم چند صاحب سرگباشی

معرکہ کربلا دنیا کی تاریخ میں پہلی آواز ہے اور شاید آخری بھی جو مظلوموں کی حمایت میں بلند ہوئی اور جس کی صدا آج تک فضائے عالم میں گونج رہی ہے۔ حسین کو خلافت کی محبت کوفہ نہیں لائی تھی، نہ وہ جنگ کے ارادے سے آئے تھے۔ اگر انھیں جنگ کرنی ہوتی تو لاؤ لشکر سے آتے۔ نہیں، حکمرانی اور ملک داری کی ہوس نہ ان کو تھی نہ اُن کے نفس عالی کو ڈانوا ڈول کر سکتی تھی۔ وہ کوفیوں کی دعوت پر محض امرِ حق کی دستگیری کے لیے آئے اور جان بوجھ کر آئے۔

اس معرکہ کا انجام ان سے پوشیدہ نہ تھا وہ خوب جانتے تھے کہ کربلا کی خاک غبار بن کر اُڑے گی لیکن وہ ہمت عالی صدائے دردمند دل پر قابو نہ رکھ سکتی تھی۔ ملک گیری کے لیے، حفظ ناموس کے لیے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے بڑے بڑے معرکے ہوئے ہیں مگر اصیول نے کبھی اتنی شاندار قربانی نہیں پائی۔

اسے معرکہ کون کہے گا؟ یہ ایثار اور قربانی کی زندہ جاوید داستان ہے، ایک طرف کل ۷۲ بہتّر ذی روح ہیں، جنمیں زیادہ تر بوڑھے، ضعیف، حسین کے بچے اور بیمار ہیں، دوسری طرف ایک فوجِ عظیم ہے۔

ٹڈی دَل، سامان حرب سے لیس۔ اگر حسینؓ کے ایثار اور قربانی کے لحاظ سے یہ سانحہ بے مثل ہے تو شاید مخالفین حسین کے دغا و فریب، بہیمیت اور نفسانیت کے اعتبار سے بھی بےنظیر۔

آہ! کوفہ کے ظالموں نے ثروت اور جاگیر، رتبہ اور منصب کے لیے اُس نفس پاک، بزرگ کے ساتھ دغا کی جو تمھاری صدائے دردمند تمھاری حمایت کرنے کے لیے سربکف ہو کر گیا تھا۔ نہ وہ سلطنت رہ گئی نہ وہ ثروت نہ وہ رتبہ اور نہ وہ منصب۔ تمھاری ہڈیاں تک پیوند خاک ہو گئیں لیکن تمھاری پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ ابھی تک لگا ہوا ہے اور قیامت تک لگا رہیگا۔ تم نے کِس کے ساتھ یہ دغا کی؟ حسینؓ کے ساتھ؟ جو تمھارے نبیؐ کے نواسے تھے۔ جو راہبر تھے، مکروہاتِ روزگار سے الگ، خواہشات سے دور۔ تمھاری دغا نے دنیا میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔

کیا تم اسے جانتے ہو؟

(محترم نمبر سنہ ۱۳۴۴ھ)

حید ریار جنگ نواب علی حید ر صاحب طباطبائی از حیدرآباد دکن مرحوم

بعثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے مکہ کے روسائ امراو حکام جو کچھ تھے بنی اُمیّہ تھے قریش کے تمام قبائل ان کو اپنا خداوند نعمت سمجھتے تھے۔ بنی ہاشم کے لیے امارت و تمول تو نہ تھا مگر سب کی نظروں میں یہی لوگ بزرگان قریش میں تھے۔ خصوصًا اجداد طاہرین رسول اللہ صلعم کہ ان میں شریعت ابراہیمی کے مبلغ اور دین حنیف کے امام موجود تھے۔ میرا متمسک اس باب میں حضرت عبدالمطلب کا وہ شعر ہے جسے محدّث محقق ابن حجر عسقلانی نے صحیح بخاری کی شرح میں نقل کیا ہے ؎

لم یزل للہ فینا حجۃ

یدفع اللہ بھا عنا النقم

ہم لوگوں میں ہمیشہ ایک حجت خدا رہتا ہے۔ اسی کے طفیل میں خدا ہم سے عذاب کو دفع کرتا رہتا ہے۔"

غرض بنی ہاشم میں ایسے نفوس بھی تھے جن پہ حجۃ اللہ کا اطلاق ہوسکتا تھا۔ عرب کی ساری قوم قتل و غارت شرک وبت پرستی وخمر و قمار و زنا میں مبتلا ہونے کے باوجود بنی ہاشم کی تعظیم کرتی تھی۔ انھیں لوگوں میں سے حق تعالیٰ نے حضرت ختم المرسلین کو بحکم وانذر عشیرتک الاقربین مامور فرمایا۔ حضرت موسیٰؑ کو فرعون وآل فرعون کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمانے سے کہیں بڑھکر یہ امر تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے قریش کی ہدایت کے لیے حکم فرمایا۔ یہ قوم بڑی ظالم اور بڑی کینہ کش تھی۔ رسولؐ اور سب مومنین ان کے ہاتھوں سے طرح طرح کے ظلم اٹھاتے رہے اور برسوں اسی طرح حکم خدا کو بجالاتے رہے آخر کو ہجرت اور ہجرت کے بعد جہاد کا حکم اُترا۔ بندگان خدا دین خدا میں فوج در فوج داخل ہونے لگے۔ مدینہ کے بھی کچھ لوگ ہوس ریاست میں منافقوں میں شامل ہوگئے تھے۔ غزوۂ بدر میں جب ایسے ایسے روسائے بنی امیہ قتل ہوگئے جو لطن مکہ کے پارہ جگر تھے۔ تو مکہ کے منافقین بھی جوشش انتقام کے شعلوں میں جلنے لگے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ جناب رسالتمآبؐ نے فتح مکہ کا خواب دیکھا اور اصحاب کرام کو اس سے مطلع فرماکر لشکر اسلام کے ساتھ مکہ کی طرف نہضت فرمائی۔ حدیبیہ تک پہنچے تھے کہ مشرکین مکہ شہر سے نکل کر غیظ وغضب میں آکر مقابل ہوئے۔ اور اُن کے رئیس نے رسول اللہؐ سے خطاب کرکے یہ کلمہ کہا کہ یہ سارا مجمع جو تمھارے ساتھ ہے وقت پڑے گا تو تم کو چھوڑکر سب کے سب چل دینگے" اُسوقت حکم خدا ہوا کہ ان سے صلح کرلو۔ اور وہ کفار واشرار بھی صلح پر راضی ہوگئے۔ حضرت کو اجازت دی کہ مع اصحاب مکہ میں داخل ہوں اور اعمال عمرہ اپنی مرضی کے موافق بجالائیں۔

حضرات یہ وہی مکہ ہے جہاں آپ نے چھپ کر جان کے خوف سے ہجرت کی تھی۔ جہاں راہ چلنے میں عبادت کرنے پر مشرکین قریش طرح طرح کی بے ادبی کرتے تھے۔ اب وہی مکہ ہے کہ آپ مع اصحاب داخل ہوتے ہیں اور سب لوگ نہایت آزادی سے عمرہ کے اعمال بجالاتے ہیں اور جب فارغ ہوکر پھر حدیبیہ میں واپس آتے ہیں تو اُسی مقام میں حقتعالیٰ جلّ شانہ سورۂ فتح نازل فرماتا ہے، اور اُسی صلح کو حق تعالےٰ نے فتح مبین سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس صلح کے واقعہ میں اکثر لوگوں کے دلوں کا نفاق ظاہر ہوگیا کہ رسول اللہ صلعم نے جناب اُم سلمہ سے آکر کہا کہ لوگ تو مرتد ہوگئے۔ آخر آپ نے سب سے فرمایا کہ تم لوگوں کو از سر نو مجھ سے بیعت کرنا چاہئے یعنی پہلی بیعت اب باقی نہ رہی (اسی کو بیعت رضوان کہتے ہیں)

خدا اپنے پیغمبر کے خواب کو سچا کرنے والا ہے اُس نے سب کو

دکھا دیا کہ آپنے آخر مکہ کو بھی فتح کر لیا۔ بنی اُمیّہ کا زور ڈھے گیا۔ اُنکی ریاست و امارت خاک میں مل گئی۔ ابوسفیان سید قریش اسوقت حضرت عباس سے نہایت حسرت و غم کے لہجہ میں کہہ رہا ہے لقد اصبح ملاث ابن اخیاث عظیما۔ ادھر حضرت سعدبن عبادۃ کی تلوار چیاے ہی ہے اُدھر اُس کا زہرہ آب ہوا جاتا ہے۔ یہی شخص اُحد میں لشکر عظیم لے کر رسول اللہؐ سے لڑنے کو مدینہ تک پہنچا تھا اور مسلمانوں کو شکست دے کر واپس آیا تھا۔ آج ابوسفیان و معاویہ جان کے خوف سے ایمان لا رہے ہیں۔ تمام بنی امیہ اور قبائل قریش اپنے رئیس کے ساتھ حضرت سے بیعت کرنے کو ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور دلوں کا حال ایسا ہے کہ مولفۃ القلوب سب ان کو کہتے ہیں۔ یہ خطاب ایک کلنگ کا ٹیکہ ہے کہ آجتک نہیں مٹتا۔ مگر بیعت کرنے کے بعد مکہ سے مدینہ میں بہت سے لوگ چلے آئے۔

مہاجرین کا خطاب اپنے لیے بھی تجویز کر لیا۔ اور لا ھجرۃ بعد الفتح کے حکم کو پس پشت ڈال دیا۔ اور نفاق کی وبا کو پھیلایا اب رسول اللہ منافقین میں گھر گئے۔ کچھ لوگوں نے مدینہ کے باہر مسجد ضرار بنائی کہ رسول اللہ کو نماز پڑھانے کے لیے اس مسجد میں لا کر قتل کریں۔ کچھ لوگوں نے تبوک کی راہ میں رات کے وقت کپّے ڈھلکائے کہ حضرت کا ناقہ بھڑک کر پہاڑ کے نیچے جا پڑے۔ آپ کا آخری وقت تھا کہ منافقین کا زور بڑھ گیا کہ پیغمبر کا ادب بھی اٹھا دیا۔ گستاخانہ مسجد میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ حضرت عباس نے عرض کی کہ آپ کے بیٹھنے کے لیے مسجد میں عریش بنا دوں کہ ان لوگوں کے گرد و غبار سے آپ محفوظ رہیں۔ فرمایا جب تک خدا مجھے ان (کی ایذا) سے راحت دے۔ اسی طرح رہنے دو۔

میں بخاری کی ایک حدیث سے (کتاب فضائل اصحاب) ثابت کیے دیتا ہوں کہ منافقین رسول اللہؐ کی میت پر بھی موجود تھے اور حضرت شیخین ان کو ساتھ لے کر سقیفہ بنی ساعدہ میں گئے تھے رسولؐ خدا منافقوں سے پرہیز بھی نہیں فرماتے تھے۔ سنت نبویؐ یونہی جاری ہوئی تھی کہ آپ منافق سے بھی اسیطرح ملتے تھے۔ جس طرح مومنین سے ملتے تھے۔ اُن کے دل کی حالت کو خدا پر چھوڑتے تھے۔ اور بمقتضائے آیۂ کریمہ مردوا علی النفاق لا تعلمھم اکثر منافقوں کو آپ جانتے بھی نہ تھے کہ یہ منافق ہیں۔ شارح عسقلانی (فضائل اصحاب صفحہ ۲۶) میں لکھتے ہیں کہ بخاری کی اس حدیث پر حمیدی کو ایسا تعجب ہوا کہ انھوں نے اپنی کتاب جمع بین الصحیحین میں (ان فیھم لنفاقا) کو ان فیھم لتقًا بنا دیا۔ اُنھیں باور نہ آیا کہ ایسے اصحاب جو سقیفہ کے حل و عقد میں شریک تھے کیا منافق ہو سکتے ہیں۔

رسولؐ اللہ مسجد ضرار میں یا عقبۂ تبوک میں مرتبۂ شہادت سے فائز ہو جاتے تو شوکت اسلام جاتی رہتی اور منافقین یہ اعلان کرتے کہ دعویٰ باطل کیا تھا مار ڈالے گئے۔

غرض اسمٰعیل کی طرح اس فرزند اسمٰعیل کو بھی حق تعالیٰ نے قتل سے محفوظ رکھا۔ اب فدینٰہ بذبح عظیم کے ظہور کا وقت آگیا امام حسینؑ کوفہ کی طرف آ رہے ہیں۔ جن لوگوں کو یقین ہے کہ یہ جاتے کے ساتھ ہی رسولؐ اللہ کی مسند پر بیٹھ جائیں گے وہ تو آپ کے لشکر کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ہر قریہ و منزل سے اعرابیوں کا مجمع بڑھتا جاتا ہے۔ اور جن کو یقین ہے کہ یہ جاتے کے ساتھ ہی قتل ہو جائیں گے اُن کے گھروں میں ماتم برپا ہے۔ مصر و شام و حجاز و عراق دشمنان اہلبیت کے قبضہ میں ہے زیاد پسر سمیّہ کو معاویہ نے بنی اُمیّہ میں داخل کر لیا تھا۔ اس وقت اُس کے سب بیٹے کوفہ و بصرہ و خراسان و سجستان اور دجلہ سے جیحون تک حکومت کر رہے ہیں۔ منبروں پر سردار اہلبیت امیرالمومنینؑ پر سبّ و شتم ہو رہا ہے۔ حضرت عثمان کے قاتلوں میں ان کا شمار ہے۔ عبیداللہ ابن زیاد نے پسر سعد کو لکھا ہے حل بین الحسین والماء کما یصنع بالتقی الزکی عثمان حضرت نے جب یہ دیکھا کہ دشمنوں میں گھر گئے۔ تو تمام اعرابیوں سے اور ساتھ والوں سے کہہ دیا کہ سب منتشر ہو جائیں۔ شمر آپ کے خیمہ گاہ کے اطراف میں دیکھتا پھرتا تھا ایک شخص کی زد پر آگیا۔ اُنھوں نے عرض کی کہ یہی شخص ہمارا بڑا عدو ہے۔ حکم ہو تو اسے مار لوں۔ فرمایا اپنی طرف سے پہل کرنا مجھے گوارا نہیں۔ آپ اسی پر ثابت قدم رہے۔ اُن اشرار نے جب دیکھا کہ ان میں سے کوئی حملہ نہیں کرتا خود ہجوم کر کے حملہ کرنے لگے۔ اس صورت میں آپ کے انصار بھی دفاع کرتے

تھے اور بڑے بڑے لشکروں کو پسپا کرتے تھے آپ نے اس شان و شوکت سے خلعت شہادت کو پہنا کہ اسلام کی شوکت اور بڑھ گئی۔

سر مبارک شام میں یزید کے سامنے رکھا ہوا ہے اس وقت یحییٰ بن حکم یعنی مروان کا بھائی وہاں موجود تھا اُس نے دو شعر مرثیہ کے کہے ؎

سمیۃ امسیٰ نسلہا عدد الحصیٰ
وبنت رسول اللہ لیس لہا نسل

سمیہ فاحشہ کی نسل تو سنگریزہائے صحرا کے برابر پھیل گئی ہے اور دختر رسولؐ اللہ کی نسل میں کوئی نہ رہا۔

یزید نے اس شعر کو سنکر یحییٰ سے کہا اُسکت وہ خاموش ہو رہا یزید نے خود یہ شعر پڑھے اِن شعروں کو ابو حنیفہ دینوری نے اخبار الطوال میں لکھدیا ہے ع

لیت اشیاخی ببدر شہدوا الخ

یعنی میرے وہ سب بزرگ جو غزوۂ بدر میں بنی ہاشم کی تلوار سے قتل ہوئے ہیں کاش آج موجود ہوتے الخ

یزید نے حرم محترم کو زندان سے بلا کر اپنے محل میں اُتارا۔ جب یہ بیبیاں یزید کے ایوان میں داخل ہوئی ہیں تو معاویہ کی بہنوں اور بیٹیوں اور ازواج میں کوئی عورت ایسی نہ تھی جو روتی ہوئی اُن بیبیوں کے پُرسے کو نہ آئی ہو۔ شاید مظلوم کربلا کی یہ پہلی مجلس تھی جو قاتل کے گھر میں برپا ہوئی۔

(محرم نمبر ۱۳۴۵ھ)

الحسینؑ منی و انا من الحسینؑ

سرکار شریعتمدار حجۃ الاسلام مولانا سید علی حائری صاحب قبلہ (اعلی اللہ مقامہ)

حسین علیہ السلام وہ برگزیدہ مقدس ہستی ہے جس کے لیے حضور ختمی مرتبت فداہ روحی علی رؤس الاشہاد یہ شہادت دے رہے ہیں کہ الحسینؑ منی و انا من الحسینؑ (متفق علیہ) یعنی پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔

اس حدیث متفق علیہ سے صراحتہً ثابت ہے کہ ان دونوں بزرگ ہستیوں کا وجود ایک دوسرے سے متلازم ہے۔ کیونکہ حدیث شریف کے پہلے جملہ کا مفہوم تو صریح اور صاف ہے جہاں پیغمبر نے فرمایا ہے کہ حسین مجھ سے ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حسینؑ بضعۃ الرسول سیدہ بتول کے فرزند ہیں۔ اگر رسول نہ ہوتے تو لازماً پھر حسین بھی نہ ہوتے جس میں کسی کو اعتراض کی گنجایش نہیں رہتی۔

لیکن حدیث مذکور کا جملۂ ثانیہ غور طلب ضرور ہے جہاں ارشاد ہوا ہے کہ و انا من الحسین اور میں بھی حسینؑ سے ہوں۔ کیا اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ پیغمبر نے فرمایا اگر حسینؑ دنیا میں نہ آتے تو پھر میں بھی عالم وجود میں نہ آتا۔

اللہ۔ اللہ؟ کیا شان حسینی ہے اور کس قدر عظیم المرتبہ ہستی ہے کہ اگر پیغمبر باعث ایجاد عالم و آدمؑ ہے تو حسین علیہ السلام باعتراف شہادت پیغمبر صلعم باعث وجود ختمی مرتبت ہے۔

(حل عقدہ)

یہ عقدہ اس طرح حل ہو سکتا ہے کہ حسینؑ فرزند رسول صلعم ہے اور رسول خدا روحی لہ الفداہ نسل اسماعیل ذبیح اللہ سے ہیں جب ابراہیمؑ خلیل اللہ حضرت اسماعیلؑ ذبیح اللہ کو ذبح کرنے کیلیے امتحان میں مبتلا ہوئے ہیں، تو آپنے خدا کے اس حکم کی تعمیل محض ایک رویائے صادقہ کی بنا پر کرنا چاہی۔ خلیل اللہ نے اسماعیلؑ کو زمین پر لٹا کر ذبح کرنے میں ہر چند کوشش کی مگر چھری نے بحکم خدا اس مقدس گلو کو نہیں کاٹا۔ خلیل اللہ اس پر نہایت متاسف ہوئے کہ حکم خدا۔ اور تعمیل ابتلا میں تاخیر ہوئی۔ اسوقت خطاب ہوا اے خلیل متاسف کیوں ہو۔ عرض کیا کاش میں اپنے ہاتھ سے اس

فرزند کو خاص تیری راہ میں ذبح کرڈالنے میں کامیاب ہوجاتا اور اس طرح ہم دونوں اجر عظیم کے مستحق ہوتے۔ اُسوقت خطاب ہوا اے خلیل مَنْ اَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَیْکَ تم کس کو سب سے زیادہ دوست رکھتے ہو کہا حَبِیْبُکَ مُحَمَّدٌ یعنی محمدؐ رسول خدا کو سب سے زیادہ دوست رکھتا ہوں۔ خطاب ہوا فَاَوْلَادُہٗ اَحَبُّ اِلَیْکَ مِنْ اَوْلَادِکَ قَالَ نَعَمْ کہ اے خلیل محمد خاتم الانبیاء علیہ السّلام کی اولاد کو تم اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے ہو۔ کہا بیشک۔ پھر خطاب ہوا۔ فَانْظُرْ اِلٰی سَاقِ الْعَرْشِ کہ اے خلیل ساق عرش کی طرف دیکھ۔ اہلسنت کی تفسیر کے مطابق خطاب ہوا اِرْفَعْ رَاْسَکَ فکشف الغطاء فرای یوم العاشورا اے خلیل اوپر کی طرف دیکھ جب دیکھا تو پردے ہٹا دیئے گئے عاشورا کے واقعات کو خلیل اللہ نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اس میں اشارہ تھا کہ اے خلیل دربار عظمت الٰہی کے لیے قربانی ایسی محبت کاملہ سے ہونی چاہیے کہ حسینؑ کی طرح جملہ تعلقات دنیاوی کو قطع کر دیا جائے فَبَکٰی بُکَاءَ الثَّکْلٰی اسوقت واقعات شہادت حسین علیہ السلام کو دیکھکر خلیل اللہ بے اختیار رو پڑے اسوقت خطاب ہوا وَفَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ یعنی اے خلیل حسین علیہ السلام پر تیرے اس بکاء و جزع کو میں نے ذریعہ قرار دیا اس رونے کا جو تم اسماعیلؑ پر ذبح ہونے کے بعد کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ؎

سِرِّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود ٭ یعنی آں اجمال را تفصیل بود

اب اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس مقدس ہستی (حسین علیہ السلام) کی شہادت نے اسمٰعیلؑ کو ذبح ہونے سے بچا لیا، کیونکہ حسینؑ شہادت اختیار کر چکے تھے اسلیے یہ ضروری تھا کہ وہ دنیا میں آتے۔ اسی غرض کی تکمیل کے لیے اسمٰعیلؑ ذبح ہونے سے بچ گئے۔ اور اُن کی ذرّیت طاہرہ میں حضور ختمی مرتبتؐ پیدا ہوئے اور پیغمبر صلعم کی بیٹی سے حسین علیہ السلام دنیا میں آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگر حسین علیہ السلام شہادت اختیار نہ کرتے تو نہ اسمٰعیلؑ ذبح ہونے سے بچتے نہ ان کی نسل سے پیغمبر خدا پیدا ہو سکتے۔ اسلیے پیغمبر صلعم نے فرمایا وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ کہ اگر حسینؑ مجھ سے ہے یعنی میرے ذریعہ سے ہے تو میں بھی حسینؑ سے یعنی حسینؑ کے ذریعہ سے ہوں کہ ان کی شہادت قبول کرنے کے سبب اسمٰعیلؑ بچ گئے۔ اور اس کی ذرّیت سے میں وجود میں آیا۔ پس میرے دنیا میں آنے کا ذریعہ حسینؑ ٹھہرے۔ سچ ہے ؎

خون او تفسیر ایں اسرار کرد ٭ ملت خوابیدہ را بیدار کرد

مزید بریں اس حدیث کے شرح کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضور ختمی نبوّت روحی فداہ کی خلقت اور بعثت اسلیے ہوئی کہ آپ انس و جن کی اصلاح کریں۔ ان کو ہدایت فرمائیں۔ علم و حکمت سکھائیں۔ اور ان کے اخلاق و معاشرت کو سنواریں جیسا کہ قرآن کریم و حدیث سے ثابت ہے یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ الخ کہ رسول خدا کی آیتیں پڑھ کر سناتا۔ ان کو پاک و پاکیزہ کرتا اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حدیث بھی سُن لیں جس میں پیغمبر صلعم نے اپنی بعثت کی علت خود بیان فرما دی ہے اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ یعنی میری بعثت کی غرض یہ ہے کہ میں لوگوں کو ہدایت کروں اور اُن کے اخلاق کی اصلاح کروں۔

اب غور کرو کہ یزید کے زمانہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلقت اور بعثت کی یہ علت قطعاً مفقود ہو چکی تھی اس نے تمام احکام اسلام کو ضایع کر دیا تھا جس کی وجہ سے عامۂ خلق صراط مستقیم سے قطعی منحرف ہو کر بہت دُور چلی گئی تھی صرف اسلام کا نام ہی نام تھا۔ اسلام کا کوئی کام باقی نہ رہا تھا۔ اس شارب الخمور و راکب الفجور (یزید) کی اس وقت اگر امام حسینؑ بیعت کر لیتے تو اسلام کا نام بھی یقیناً آج صفحۂ ہستی پر باقی نہ ہوتا۔ مگر حسینؑ نے درجۂ شہادت کو حاصل کر کے نہ صرف دین اسلام کو زندہ ہی کیا۔ بلکہ قیامت تک آنے والی نسلوں کی ہدایت کے لیے اپنی شہادت سے اسلام کی صداقت پر کبھی نہ ٹوٹنے والی مُہر کر دی اور قیامت تک اپنی شہادت کو ایک نہایت روشن مینار کی طرح دلیل و برہان کی صورت میں پیش کر دیا تاکہ ان کی شہادت کے واقعات عجیبہ کو سُن سُن کر فرزندان اسلام ہدایت حاصل کرتے رہیں اور اسلام کی صداقت اور صراط مستقیم کو معلوم کرنے کے لیے اُن کے سامنے آیندہ کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ پس جو غرض بعثت رسول کی تھی چونکہ وہ اب شہادت حسینؑ سے حاصل ہو گئی اسلیے پیغمبر نے پہلے سے یہ فرمایا تھا کہ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ

کہ میں بھی حسینؑ سے ہوں یعنی حسین علیہ السلام اپنی شہادت کے سبب سے میرے وجود اور علت بعثت کا باعث اور دین اسلام کے بقار اور استقرار کا سبب ہے جیسا کہ میں اس کے وجود کا باعث ہوا ہوں۔

اس حدیث کی شرح میں ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب ایک چیز کے مثلاً مختلف حصے دو چار۔ پانچ میں تقسیم کر دیئے جائیں تو اس کے ہر حصہ کے متعلق یہ کہنا صحیح اور معقول ہوگا کہ یہ حصہ اس میں سے ہے۔ ایسا کہنے سے ان تمام حصوں کی وحدت ذاتی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جب متفق حدیثوں سے یہ ثابت ہے کہ (خمسہ طیبہ) پنجتن پاک کا عالم انوار میں ایک ہی نور تھا۔ گو بظاہر اس عالم اجسام میں وہ محمدؐ۔ علیؑ۔ فاطمہؑ۔ حسنؑ۔ حسینؑ علیہم السلام کی پانچ صورتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مگر حضور ختمی مرتبت صلعم نے ارشاد الحسینؑ منی و انا من الحسینؑ میں اس راز سے پردہ اٹھانا چاہا کہ حسین علیہ السلام مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں یعنی میری اور اس کی حقیقت اصلیہ (نور) ایک ہے۔ اگر ظاہری کچھ فرق ہے تو بس اسی قدر ہے کہ مجھے خلعت نبوت و رسالت پہنایا گیا اور حسین علیہ السلام کو لباس امامت و خلافت۔ بلا تشبیہ بمانند اُن دو روشن شمعدانوں کے جن میں سے ایک کا فانوس تو مثلاً سبز ہو اور دوسرے کا فانوس سُرخ رنگ کا ہو۔ ان مختلف الالوان فانوسوں کے سبب سے اگر ان کی ماہیت اور حقیقت شمع میں فرق نہیں آسکتا ہے تو اس فانوس نبوت و امامت کی اصلیت و حقیقت میں پھر کیوں فرق آسکتا ہے۔ بس یہ سب حضرات درحقیقت ایک ہی تھے صرف لفظ نبوت کے سوا ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَاَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَاٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ یہ سب حضرات درحقیقت متحد ہیں اور ایک شان و حقیقت رکھتے ہیں اسلیے حسینؑ کا پیغمبرؐ سے ہونا اور پیغمبرؐ کا حسینؑ سے ہونا بجا اور بالکل صحیح ارشاد ہے۔ مگر ناابلوں نے انکی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ سچ ہے ؎

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت

حریت را زہر اندر کام ریخت

(محرم نمبر ۱۳۴۵ھ)

واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی

جناب محسن مرزا صاحب ایم۔ اے پرنسپل گورنمنٹ کالج کیمبلپور (مرحوم)

یوں تو دنیا میں ایک سے ایک زیادہ پارسا ہے۔ ایک سے ایک زیادہ خدا ترس اور متقی ہے کون سا فسانہ ہے جس کا جواب ہو کون سی مصیبت ہے جس سے بڑھ کر اور سخت مصیبتیں نہ موجود ہوں مگر حسینؑ مظلوم کا قصہ بھی عجیب فسانہ ہے۔ سچ پوچھو تو اپنی وضع میں لاثانی ہے۔ خدا کی نشانی ہے۔ راہ راست کا جھنڈا ہے جسکے پھریرے کی چھاؤں میں بھٹکے ہوئے دم لیتے ہیں۔ راستبازی ایک مضبوط لوہے کی لاٹھ ہے۔ جو راستہ بھولے ہوئے کو منزل مقصود کا اشارہ کرتی ہے۔

حسینؑ نے وہ کام کیا جو آجتک نہ اور کسی سے ہوا ہے اور نہ ہوگا عام مخلوق کو جانے دو۔ برگزیدہ نفوس کے کارناموں سے موازنہ کرو۔ آدمؑ کی فراق بہشت و حوا میں آہ وزاری۔ نوحؑ کے نوحے۔ زکریاؑ کا آرے سے چیرا جانا۔ یحییٰؑ کا سر ایک زن فاجرہ کے لیے قلم کیا جانا ایوبؑ کا آزار۔ ابراہیمؑ کا آگ میں پھینکا جانا۔ یعقوبؑ کا فراق یوسفؑ میں آنکھیں سفید کر لینا۔ یوسفؑ کا زندان مصر میں رہنا۔ موسیٰؑ کا فرعون کے مظالم سہنا۔ عیسیٰؑ کا یہود سے اذیتیں اٹھانا۔ ان سب امور پر غور کی نظر ڈالیے اور پھر حسینؑ خاتم الرسل کے جگر حسینؑ کا وہ کام دیکھیے جو اُس نے کربلا کے میدان میں کر دکھایا۔ تو یقیناً اُس کا پلہ جھکا ہوا اور بہت جھکا ہوا پایئے گا۔

رسولخدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اگر اسلام کو قائم فرمایا تھا تو حسینؑ نے اپنی خون کی صیقل سے اسے چمکا دیا۔ رسولؐ اللہ نے یہ پودا

لگایا اور حسینؑ نے اپنے لہو سے سینچا۔ حسینؑ شہید اسلامی دنیا میں وہ بزرگوار گزرا ہے جس کی ذات واحد سے اسلام برقرار رہا۔ اور برقرار رہے گا۔ ؎

تو نے سر دے کے کیا دین کا سکہ جاری　　اللہ اللہ یہ عجیب تیری عالی داری

حسینؑ نے سر دے کر صرف اسلام ہی کو زندہ نہیں کیا بلکہ دنیا میں سچائی کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اگرچہ وہ مظلوم اس دنیا میں نظاہر موجود نہیں لیکن اُن کی روحانیت اور ان کا عظیم الشان صبر و استقلال اسلام کی حقانیت کی تلقین کر رہا ہے۔

حسینؑ کے فسانہ نے ثابت کر دیا کہ اگر کتنی ہی دقتیں ہوں اُن میں فتح نیکی کی ہو گی۔ راستی پر قائم رہنے سے حسینؑ کو کیا پھل ملا۔ سوا رنج و تعب اور کیا ہاتھ آیا۔ انتہا یہ کہ سر دینا پڑا۔ اسوقت تو ظاہر میں لوگوں کو معلوم ہوتا ہو گا۔ سچائی کا نتیجہ دنیا میں رنج و محن ہے۔ مگر اب ملاحظہ فرمائیے۔ یہی مظلوم جو مع اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کے ایک جنگ میں قتل کیا گیا۔ آج اس کے غلاموں کے قدموں پر بڑے بڑے بادشاہ اپنا سر نیاز رکھنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ جس کا صرف ایک بیمار بیٹا رہ گیا تھا (خدا زندہ سچا ہے) آج اس کی تیسویں چوتیسویں پشت میں ایک کروڑ سے زیادہ موجود ہیں تیس چالیس کروڑ کے قریب آدمی اُس کی گرد قدم کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کو تیار ہیں۔ اور کروڑوں آدمی اس مقبرہ کے گنجینہ ہستی کو فرشتہ رحمت مانتے ہیں۔ لاکھوں گمراہ ان کے نام سے ہدایت پاتے ہیں۔

مانا کہ راستباز کو تکلیفیں ہوتی ہیں۔ یہ تکلیفیں بھی امتحان ہیں خدائے عز و جل دنیا میں راہ راست پر چلنے والے کا طرح طرح کی مصیبتوں سے امتحان لیتا ہے۔ تاج شہادت پہناتا ہے۔ دشمن اس کے قتل پر آمادہ ہوتے ہیں۔ شہید کو دوسری دنیا میں اس کا صلہ ملتا ہے رنج و تعب کے بدلے ابدی راحت و آرام میسر آتا ہے کانٹے کے بدلے نور کا تاج سر پر ہوتا ہے۔ اور رحمت یزداں شریک حال ہوتی ہے۔ یہ شہادت دُنیا والوں کو بے چین کر دیتی ہے۔ لوگوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عالم بالا کا نظارہ ہوا۔

جس وقت قاتل سینہ پر سوار ہوتا ہے اسے خیال ہوتا ہے کہ خنجر کی چمک پر شاید اب بھی ڈر جائے۔ قاتل سمجھتا ہے اسوقت تک ڈرانے دھمکانے کو یہ محض باتیں سمجھتا تھا۔ اب جب خوفناک قاتل سینہ پر سوار نظر آئے گا۔ اپنی موت کا پیغام سامنے دیکھے گا۔ اجل کے فرشتہ کو خنجر کی دھار میں چھپا ہوا پائے گا۔ ممکن ہے اپنی ہٹ سے ہٹ جائے مگر عاشق الٰہی ذرا پروا نہیں کرتا۔ خنجر براں کی دھار میں جلوہ حق نظر آتا ہے۔ ہر چمک سے اسی کا نور ٹپکتا ہے۔ خنجر کی رگڑ میں شہد کا مزا آتا ہے۔

جب قاتل اپنا کام کر چکتا ہے۔ اُسوقت وہ پریشان ہوتا ہے اپنے کیے پر پشیمان ہوتا ہے۔ خون جو شہید کی گردن سے ابلتا ہوا گرتا ہے۔ زمین کو ہلا دیتا ہے۔ آسمان پر سناٹا چھا جاتا ہے۔ پرندے سکتے کے عالم میں جہاں تھے وہیں رہ جاتے ہیں اور اپنی چونچیں آسمان کی طرف بلند کر کے فریاد کرتے ہیں۔ خونخوار اور وحشی درندے حیران و ششدر چاروں طرف تکتے ہیں۔ ماہیاں دریا اچھل اچھل کر ریت پر تڑپتی ہیں۔ سمندر کا پانی ٹھہر جاتا ہے آسمان اشک خونی برساتا ہے۔ سورج کو گہن لگ جاتا ہے۔ اور ہاتف غیبی درمیان زمین و آسمان ندا کرتا ہے۔ آہ قتل الحسینؑ بکربلاء　آہ ذبح الحسینؑ بکربلاؑ

جو خون شہید کی گردن سے گرم گرم ابلتا ہے وہی خون لوگوں کے دلوں میں جوش مارتا ہے۔ اور دنیا والے آہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ظالم سے بدلا لیتے ہیں۔ مظلوم کا مزار بناتے ہیں۔ اسکی تربت پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اسکی قبر پر اشک حسرت بہاتے ہیں اور اس مایوسی کے عالم میں اس کا جھنڈا عالم میں پھیلاتے ہیں۔ زمین کے مختلف طبقات میں اس کی مجالس عزا سالانہ قائم ہوتی ہیں اور ہر سال کروڑہا روپیہ اسکی یادگار زندہ رکھنے میں صرف کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایسا شخص ناکامی کیساتھ مر گیا۔ ہرگز نہیں۔ اسکی موت پر زندگی کو رشک ہے اور اسکی ناکامیابی کی طرف فتح بحسرت نگراں۔ یہ ساری باتیں اسواسطے ہیں اور ہوتی رہیں گی کہ اُس نے اپنی جان حق پر دی۔ اور راستی کی راہ میں باوجود نقصان اُٹھانے کے ایک انچ نہ سرکا۔ یہ ابدی حیات و رفیعت مندی کا خلعت اسکو حق اور راستی کی جانب سے عطا ہوا ہے جو زمانہ کے گزرنے پر ہمیشہ نیا ہوتا رہے گا اور زیادہ چمکتا رہے گا۔

(محرم نمبر سنہ ۱۳۴۵ھ)

(ہز اکسلنسی راجہ راجایان سر کشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنت کے، سی، آئی، ای، جی، سی، آئی، پیشکار صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی)

نہ فقط دنیائے اسلام بلکہ از آغاز تا انجام کوئی مثال دنیا میں واقعہ روح فرسا ارض نینوا ڈھونڈھے سے بھی نہ ملے گی۔ یہ سانحہ اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اپنی مثال خود ہی ہو سکتا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس سے بنی نوع انسان انسانی تکمیل کے واسطے ہر قسم کی نصیحت اور سبق حاصل کر سکتا ہے۔

اخذ اخلاق ممدوحہ و ترک اطوار مذمومہ کے واسطے کوئی امر باقی نہیں ہے جو اس واقعہ کی تکمیل میں نہ پایا جاتا ہو۔ یہی وہ واقعہ ہے جس میں انسان کے اخلاق حسنہ، اس کی مروت، فتوت، شجاعت، سخاوت، صبر، رضا، حلم، ستاری، غفاری، رحم، کرم، عبادت، ریاضت، زہد، تقوی، شرم، حیا، وفا، خلوص و صدق و صفا، صلۂ رحم، مہربانی، شفقت، ہمدردی وغیرہ کون بات ہے جس کا عملی سبق مثالی نہیں ملتا۔ واقعہ کربلا ہی ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس کے جزئیات پر نظر ڈالنے سے انسان کو تہذیب اخلاق کا پورا پورا امید ان ہاتھ آتا ہے۔ ہائے کون سا دل ہے جو اس درد کو محسوس نہ کرتا ہوگا۔ نہیں بلکہ ہر قلب میں ایک خار ہے جو اس واقعہ کے وقوع کے بعد کھٹکتا ہے۔ مظلوم حسینؑ نے جس استقلال اور مضبوط ارادے کے ساتھ دنیا میں صداقت اور حق کا علم گاڑا، وہ صرف اسی کی ذات سے ہو سکتا تھا، جس کو خدا نے ایسا بہادر دل دیا تھا۔

اس واقعہ سے جو اغراض حسینؑ کی تھیں ان کے نشر کے واسطے ضروری تھا کہ اس واقعہ کی یادگاریں قائم کی جاتیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دنیا کے عقلا نے اس واقعہ کو تازہ رکھنے کے لیے مختلف طریقوں سے اظہار غم کیا۔ ان واقعات کو ہر سال بیان کرنا شروع کیا۔ کیوں؟ محض اس غرض سے کہ دنیا میں اُن اغراض کی اشاعت ہو جن کو مظلوم حسینؑ نے اپنے واقعہ کو اہم سے اہم درجے تک پہنچا کر اہل دنیا کے سامنے مکمل سبق کی شکل میں پیش کیا تھا۔

حضرت امام حسینؑ کی شہادت ایک ایسا واقعۂ عظیم ہے جیسا نہ کبھی کہیں ہوا اور نہ خود تاریخ اسلام اس کا مقابل لا سکی۔ ملل ماضیہ اور اُن کی تاریخ اگر اسی طرح قبول کر لی جائے جس طرح اسوقت ہمارے سامنے موجود ہے تب بھی ان کا کوئی شہید یا سلسلۂ شہدا کسی شکل سے ہمارے شہید کی عظمت و شرافت اعمال کا مقابلہ کر سکے گا۔ اولیائے مذاہب اور اُن کی تکلیفیں حسینؑ کے انبوہ مصائب پر غلط انداز نظر میں بھی ٹھہر جائیں گی۔ کسی صلیب رسیدہ جسم کی چند کیلیں حسینؑ کے جسم اقدس میں پہنچنے والے بیشمار تیر اور نیزوں کی انیوں کے سامنے بے حقیقت ہوں گی۔

اس حیثیت کی تاریخ دشمنوں ہی کی زبان اور قلم نے ہمارے حوالے کی۔ حسینؑ کا دوست واقعہ نگار کوئی زندہ نہ چھوڑا گیا اگر کوئی واقعہ نگاری کر سکتا تھا تو علی بن الحسینؑ اور مخدرات عصمتؑ۔ امام زین العابدینؑ اپنی قید سے بہت پہلے بستر علالت پر مقید تھے اور پردہ نشین بیبیاں حسین کی زندگی تک بیرونی حالات سے بہت کچھ بیخبر تھیں۔ لیکن حسینؑ کی شہادت کے بعد نہ صرف علیؑ بن الحسینؑ اپنے بستر بیماری سے کھینچے گئے کہ وہ اس کے بعد کے واقعات دیکھیں بلکہ مخدرات عصمت و طہارت نے بھی یہ دیکھا کہ ہمیں اپنے تقاضائے غیرت کے خلاف عام نگاہیں دیکھتی ہوں گی۔

حسینؑ کی شہادت نے تاریخ اسلام پر عام اس سے کہ وہ گذشتہ ہو یا آیندہ ایسی تیز روشنی ڈالی ہے جس سے واقعات کا اصلی رنگ معلوم ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دشمنوں نے خاندان رسالت کے مٹا دینے میں کس شرمناک کوشش سے کام لیا ہے۔ جو گھر مہبط جبرئیل اور سجدہ گاہ میکائیل تھا اور ہر وقت جس گھر سے صدائے تکبیر و تہلیل

بلند تھی اب اُس گھر سے آواز نماز و اذان بھی کسی کے کان میں نہیں آتی۔ کوئی گھر عالم میں ایسا تباہ و برباد نہ ہوا ہوگا جیسا کہ خاندان رسالت تباہ و برباد ہوا ہے۔

جو کچھ مجھے اپنے اس سب سے پُر غم فرض کے متعلق عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ میں اس دعوی پر قناعت نہ کرلوں کہ شہادت امام حسینؑ ایک واقعہ عظیم ہے بلکہ یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ حقیقتاً یہ نہ صرف اسلام بلکہ عالم کی تاریخ کے مشہور واقعات میں ایک سرمایۂ حیرت اور عظیم سانحہ ہے۔

محرم ۶۱ھ کی دوسری تاریخ پنجشنبہ کے دن امام حسینؑ وارد صحرائے کربلا ہوئے۔ اعثم کوفی کی تحقیق کے موافق دریائے فرات کے کنارے اسباب اُتار اگیا خیمے نصب کیے گئے۔ بنی ہاشم اپنے اپنے واسطے خیمے لگانے لگے۔ حضرت کے خیمے کے گرد احباب اعزہ کے خیمے کھڑے کیے گئے۔ سب اپنے خیمے میں آرام سے لیٹ رہے۔ اور امام حسینؑ اپنی تلوار کے صیقل کرنے میں مصروف ہوئے۔

ابن زیاد کو خبر ملی کہ حسینؑ ابن علیؑ وارد کربلا ہوئے۔ ابن سعد کو حکومت رے کی طمع دے کر چار ہزار سواروں کا افسر کرکے کربلا کی طرف روانہ کیا۔ حُر ابن یزید ریاحی بھی ایکہزار سوار لے کر ابن سعد سے آکر مل گیا۔ شمر ذی الجوشن بھی چار ہزار کی جمعیت لیکر آیا۔ اب ابن سعد کے پاس نو ہزار سپاہ ہو گئی۔

یزید ابن رکاب کلبی دو ہزار کی جمعیت لے کر آیا۔ اس کے پیچھے ہی حصین بن نمیر سکونی چار ہزار آدمی لیکر پہونچا معائز بن مزینہ مازنی تین ہزار، ایک اور سردار دو ہزار پھر اور مختلف قبائل کے سردار یکے بعد دیگرے آئے۔ یہاں تک کہ ساتویں تاریخ تک پینتیس ۳۵ ہزار کی تعداد ہوگئی دریا پر قبضہ کرکے پہرے بٹھا دیئے کہ حسینؑ ابن علیؑ کے خیمہ تک پانی نہ جائے

صحرائے کربلا میں ہوا کیا بُری چلی
پانی طلب کیا تو گلے پر چھُری چلی

حُر نے جب آپ کو کوفہ کی طرف آتے ہوئے راہ میں روکا تو اس وقت وہ اور اس کے ہمراہی پیاس سے بیتاب ہو رہے تھے سب کی زبانیں باہر نکل آئی تھیں۔ امام حسین علیہ السلام سے دیکھا نہ گیا اپنے بھائی عباسؑ سے فرمایا کہ ان کو پانی پلاؤ یہاں تک کہ سب سیراب ہوئے حتیٰ کہ گھوڑوں تک کو سیراب کر دیا۔ اپنی آئندہ ضرورتوں کو مطلق ملحوظ نہ رکھا۔ اللہ اللہ جائے حسرت ہے کہ ایسے رحیم و فیاض حسینؑ اور ان کے عزیز و رفقا پر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انھیں اعدا کی طرف سے پانی بند کیا گیا۔

ایسا ہی واقعہ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ جنگ صفین میں جب معاویہ سے امیر المومنینؑ کو لڑائی کا سابقہ پڑا تو حضرت علی کا لشکر ایسی بے موقع جگہ میں اُترا جہاں پانی نہ تھا۔ دریائے فرات معاویہ کے قبضے میں تھا جو اپنے مخالف کے ساتھ کرم کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ امیر المومنینؑ نے بزور شمشیر فرات کو اپنے قبضہ میں لیا۔ اب معاویہ نے امیر المومنینؑ سے پانی کی درخواست کی حضرت نے فوراً اجازت دی اور فرمایا کہ پانی ایسی چیز ہے جس پر وحش و طیر، مور و مردم سب کے سب یکساں حق رکھتے ہیں اس سے کسی کو ممانعت نہیں کی جاسکتی۔ ایسے معاملات جو علیؑ اور حسینؑ ابن علیؑ کو پیش آتے گئے ہیں دنیا میں ان کی کہیں نظیر نہیں ملتی اور یہ ایسے معاملات ہیں جو خاندان پیغمبرؐ کی معصومیت کو بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ ثابت کیے دیتے ہیں۔

بہر حال نویں تاریخ کو حضرت نماز صبح سے فارغ ہوئے کہ ابن سعد کے لشکر میں حرکت ہوئی اور وہ آگے بڑھا۔ سپہ سالار لشکر خود فوج کے سامنے تھا۔ قیاس آسان ہے کہ نمایش اور اظہار شوکت کے لیے قریب قریب تمام فوجیں ترتیب اور انتظام سے بڑھائی جارہی ہوں گی۔ سواروں اور پیادوں کی بیشمار صفیں بڑھ رہی ہوں گی۔ تیس۳۰ پینتیس۳۵ ہزار سوار اور پیادے یہ فوجی آمادگی بجائے خود ایک مہیب منظر ہوگا اور جنگی باجوں کے شور نے ایک عالم پیدا کیا ہوگا۔ یقیناً یہ موقع نہ تھا جب کہ شجاعت کو شام کے لشکر کی آمادگی پر ناز ہوتا۔ لشکر نمازیوں پر تیس۳۰ ہزار سوار پیادوں کی چڑھائی۔

ناسخ التواریخ اور روضۃ الشہدا کی تحقیق کے موافق گویا حضرت کا چھوٹا سا لشکر اس وقت سے خصوصیت کے ساتھ فوجی محاصرے میں آگیا۔ اس ٹڈی دل لشکر کے لیے بیس۲۰ اکیس۲۱ خیموں اور بہتر آدمیوں کا محصور کرلینا آسان سے زیادہ آسان تھا۔

شب عاشور یا شہدائے کربلا کے حیات کی آخری رات زمانہ کے اُس ٹکڑے میں ہے جسے چند آمادگان شہادت نے اسلئے مختص کیا تھا کہ اس میں خدا کی عبادت کریں، محفوظ ہو جانے کے لیے نہیں، تدبیروں کے لیے وقت حاصل کرنے کے لیے نہیں، لذات دنیوی میں آخری مرتبہ مصروف ہونے کے لیے نہیں۔ عبادت کے لیے۔ تمام مورخین ہمزبان ہیں کہ لشکر کے ٹھہر جانے کے بعد امام حسینؑ نے تمام رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذاری۔ رکوع و سجود میں مصروف رہے اور گریہ وزاری کے ساتھ دعائیں مانگتے رہے۔ اسیطرح آپ کے بھائی اور فرزند اور تمام اہلبیت اور دوست رات بھر مصروف عبادت رہے۔ دم بھر کے لیے بھی نہ سوئے تسبیح و تہلیل میں محو رہے۔

صبح ہو گئی دنیا کی سب سے مشہور صبح۔ وہ صبح جسے روز الست سے آنیوالی اور ابدالآباد تک گذر جانے والی صبحوں پر فخر ہے کہ ہم وہ تھے جس نے عالم کا یہ سرمایہ حیرت تماشہ دیکھا کہ ہزاروں ہزار مطمئن دشمنوں کے مقابلہ میں چند نفوس کو بھوک اور پیاس نے دل شکستہ نہیں کیا۔ انھیں شب کی عبادت نے سیر نہیں کیا۔ آخری مرتبہ کمر بندی کے قبل اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ مایوس نہیں ہوئے اپنے اعتقاد میں متزلزل نہیں ہوئے۔ وہ ایک تالاب تھے جنھیں محیط زمین نے ہوا اور موجوں سے مستغنی کر دیا تھا۔ ان کے سکون میں تغیر لانے والی کوئی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک پہاڑ تھے جسے تیز اور تند ہوائیں متحرک نہیں کر سکیں۔ وہ تھے اور عبادت تھی۔ عبادت تھی اور وہ تھے۔ کاش ابن مریمؑ انھیں دیکھتے کاش موسیٰؑ عمران انکی زیارت کرتے، کاش داؤدؑ ان کا مطالعہ کرتے، کاش رشی گوتم غور کرتے کہ ان کی شانتی کا تصور اپنے درجہ میں اس سے کہاں تک مقابل تھا۔ ان کے لیے کوئی خوف نہ تھا۔ ان کے لیے آرزو و آرزو نہ تھی۔ صرف اُن کے خاموش چہروں میں آنکھیں تھیں جو اِدھر اُدھر پھرتی تھیں جدھر امامؑ حرکت فرماتے تھے۔ دل میں ایک حرکت تھی کہ ہم کس طرح اپنے امامؑ کی بہتر طریقے سے حفاظت کر سکیں۔ اس کی فکر نہ تھی کہ ہم رہیں گے۔ اس کا غم تھا کہ ہمارے بعد امامؑ پر کوئی قربان ہو کر امام پر آنچ نہ آنے دے گا۔

سپہ سالار لشکر تعبیہ لشکر میں مصروف ہوا اور یقیناً کوئی کثیر لشکر اپنے اسلحہ اور سامان اپنے سپاہیوں اور انتظام کے باوجود اپنی ترتیب کے وقت ایسا ذلیل نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسا شام کا لشکر۔ شاید ہی کسی لشکر کو اپنی فتح کا ایسا یقین ہوا ہو۔ جیسا لشکر شام کو تھا۔ اور شاید کوئی لشکر اپنی فتح کے یقین کے بعد بھی ایسا ذلیل ہوا ہو جیسا کہ یہ لشکر ہوا۔ آخر یہ کون سے مقابل کے لیے صفیں درست کر رہا تھا۔ مقابل کون تھا۔ کوئی لشکر کہاں تھا۔ جو تیس ہزار سپاہیوں کی گھنی صفوں سے ٹکراتا۔ کیے اگر کوئی کہہ سکے کہ حسینؑ کے چند رفقا کا شمار لشکر میں ہے۔ حسینؑ کے تمام لشکر میں مشکل سے ایک آدمی لڑنے کے قابل تھا۔ ضعیف اور متزلزل ڈھانچوں کو جن کو شدت عطش اور نقاہت سے بغیر ٹھوکر کھائے چلنا دشوار ہوتا اب اپنے عالم نزع میں ان سپاہیوں سے لڑنا تھا۔ جسے شجاعون عرب کے فخر ہو سکتا تھا۔ تاہم حسینؑ ان کی آخری وصیت تھے۔ نوجوان نمو پاتے ہوئے جن کا شباب بھی ابھی پورا نہ ہوا تھا اور جن کی شادی کی حنا کی سرخی نہ مٹی تھی اُن سے انکی ماؤں اور بہنوں نے شہید ہو جانے کی خواہش کی تھی۔ قاسم کے ایسے بارہ برس کے بچے جنھیں گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے دوسرے کی مدد کی ضرورت تھی دیوخصال پہلوانوں کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ عون، محمدؑ حسینؑ ابن علیؑ کے بھانجوں کی عمریں کیا تھیں۔ آٹھ نو برس کی۔ مجھے اس قدر اور کہہ دینا ہے کہ شام کے انبوہ کثیر کے مقابل میں حسینؑ کے سپاہیوں کی تعداد اس وقت پوری ہوتی ہے جس وقت حسینؑ کے لشکر میں علی اصغر کا جھولا بھی رکھ دیا جاتا ہے

اور کیا مجھے یہ بھی کہنا ہو گا کہ دنیا میں کوئی چھوٹا سا لشکر اس شان سے نہیں کھڑا ہوا جیسے حسینؑ کے یہ چند بچے جوان اور بوڑھے رفقا کھڑے تھے۔ ہاں وہ زمین، وقت اور اتفاق پیدا نہیں ہوا جس میں اتنے لشکر کے مقابلے میں باوجود شدید گرمی اور پیاس کی شدت کے اس طرح قلب مطمئن سے تیار اور منتظر ہوتے۔ شاید ہی کسی لشکر کو اپنی شکست اور سپاہی کو اپنے قتل کا ایسا یقین ہو جیسا حسینؑ کے لشکر اور سپاہیوں کو تھا۔ اور شاید ہی کوئی

لشکر اس یقین کے بعد اس استقلال اس شان اور شہادت کے شوق میں موت کا ایسا منتظر ہوا اور ان کی یہ بےخوفی مصائب پر صبر و استقلال اور جان سے لاپروائی نہ ہوتی اگر وجہ ایسی عظیم نہ ہوتی اور شاید باوجود وجہ کے بھی دُنیا کا یہ حیرت خیز واقعہ واقعہ کی صورت میں نہ آتا۔ اگر مرکز ایسا نہ ہوتا جیسے حسینؑ تھے۔ ابن سعد کے لشکر کی تعداد کم سے کم تیس ہزار۔ امام حسینؑ کے لشکر کی تعداد زیادہ سے زیادہ (۷۲) نفوس۔

جنگ کا آغاز ہوا لشکر حسینؑ کے ایک ایک جانباز سپاہی نے اپنے دل کو سپاہیانہ ہوش میں بلکہ شہادت کے جوش میں اور موت کی جلدی کے لیے دشمنوں پر دے مارا۔ اصحاب حسینؑ ہزاروں کا فروں کو خاک و خون میں آلودہ کر کے عالم راحت کی طرف رخصت ہو چکے۔ اندوہناک واقعات میں غم کی زیادتی ہوتی جا رہی تھی۔ کہ بے مثل رفقار ایک ایک کر کے تمام ہوگئے۔ انھوں نے اپنی حیات تک اہل بیت تک کوئی آنچ نہ آنے دی۔ یہی تھے جنھوں نے اپنے دلوں کو زرہ اور آستینوں پر پہن لیا تھا اور اپنی جان دینے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا۔ ان کا فخر تھا کہ یہ حسینؑ کے اصحاب تھے اور ان کے جانکاہ مصائب میں شرکت کرتے۔ انھوں نے حسینؑ کا نام بلند کرنے اور ان کی وجہ کو قوت دینے میں اس طرح مدد دی جس طرح ممکن تھی۔ یہ حسینؑ کی طرح زندۂ جاوید ہوئے۔ کون ہے حسینؑ کا زائر جوان کی خاک کو آنکھوں سے لگانا اپنی نجات کا باعث نہ سمجھے۔ کربلا کسی ایک یا چند قبروں کا نام نہیں ہے۔ بلکہ انھیں شہدا کی قبروں کا نام ہے۔ جن کی لوح مزار سید الشہداؑ کی قبر مطہر ہے۔

ایک ایک شاخ کٹ گئی لیکن جڑ کی حفاظت کرتی رہی۔ اب کوئی نہ تھا جو بنی ہاشم سے کہتا کہ ہم اپنی زندگی تک آپ کو میدان میں نہ جانے دیں گے۔ کسے حق تھا کہ حسینؑ کے فرزند کے پہلے جام شہادت نوش کرنے کے لیے آگے بڑھتا۔

بنی ہاشم اذن جہاد حاصل اور لشکر شام کو تہ وبالا کر کے آگے روانہ ہونے والے قافلہ سے جا ملے۔ عباس کی نگاہ بھائیوں کی طرف اٹھتی ہے۔ جس میں استغاثہ محبت اور حکم سب کچھ ہے۔ زبان یہ کہتی ہے کہ بہادروں کی طرح ابن سعد کے لشکر کی طرف بڑھو اور لشکریوں کے چہرے اور سینوں کو زخموں سے بھر دو۔ دیکھا کہ ایک ایک بھائی حیدری زور دکھا کر خون میں نہایا۔ عباسؑ اپنی شہادت کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ جانتے تھے کہ علمداری کا عہدہ جہاد کی اسوقت تک اجازت نہ دینے پر مجبور نہ کرے گا جب تک کوئی تلوار اٹھانے والا رہے گا۔ اجازت جہاد مل گئی۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر مناسب سمجھا کہ ایک مشک بھی ساتھ رکھ لیں۔ یہ علیؑ ہی کے فرزند کی ہمت تھی کہ جو بہتّر کی پیاس میں وہ اس ٹڈی دل لشکر کو ہزیمت دے کر گھاٹ پر قبضہ کرنے کا مستقل ارادہ کرے۔ ایک نہ رکنے والے جوش کے ساتھ حملہ کر دیا۔ میمنہ میسرہ اور جناح کو تہ وبالا کرتا ہوا فوج کے ادھر دریا پر پہنچا۔ گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ جھک کر مشک بھری۔ خود پانی نہ پیا۔ پیاسے ہی نکل آئے فوج نے مجموعی قوت سے پھر حملہ کیا۔ مگر علیؑ کے بپھرے ہوئے شیر کے لیے کھلا ہوا میدان تھا۔ جسوقت یہ شکار کھیل رہا تھا۔ دشمن پس پشت سے وار کرنے کی فکر میں تھا۔ یکہ و تنہا ہزاروں کا نرغہ کس کس کے حملے کا جواب دے۔ وار چل گیا اور عباسؑ کا کافر کش ہاتھ زمین پر تڑپنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ عباس پر مایوسی کی ایک خفیف سی لہر آ گئی ہو۔ خصوصاً اس لیے کہ وہ ہاتھ کٹ گیا جس سے اپنے بھائی کی حمایت کر رہے تھے۔ لیکن عباس کا استقلال انھیں بایاں ہاتھ دکھاتا ہے اور اب دشمن کش بجلی اس ہاتھ میں چمکتی ہے۔ پھر لڑنے لگے اور اب دشمن کے لیے پیشتر سے آسان تھا کہ دوسرے ہاتھ پر بھی وار کرتا۔ ضرب چل گئی دوسرا ہاتھ بھی کٹ گیا۔ دونوں قوی بازوؤں سے خون کی چادر بہہ رہی تھی۔ لیکن عباسؑ کا چہرہ ویسا ہی غیر متحرک اور شاندار تبسم کا مرکز ہے۔ نگاہیں دشمنوں کو اب بھی ویسی ہی حقارت سے دیکھ رہی ہیں۔ مشک ابھی تک تو محفوظ ہے۔ اب بھی عباس موزے کی نوک سے دشمنوں کو دور کر رہے تھے اور خیمہ کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ قیاس آسان ہے کہ شیر کو مجبور دیکھ کر دشمن کی نامردانہ شجاعت میں کس قدر زیادتی ہوئی ہو گی۔ اس طرح کچھ دیر یہ عبرت خیز تماشہ قائم رہا۔ عباسؑ اپنا خون آلود جنازہ لئے جا رہے تھے۔ کہ مشک پر تیر لگا۔ سر پر گرز پڑا اور عباسؑ کے مقدس خون کے ساتھ یہ پانی

بہہ گیا جس کی قیمت کا اندازہ ممکن نہیں۔ راہ خدا میں جہاد کر چکے تھے۔ اپنی قوت بازو سے فتح کی ہوئی فرات کی ترائی کو ابدالآباد تک کے لیے اپنی آرام گاہ قرار دیا۔ سو گئے عباسؑ۔

علی اکبرؑ نے اپنے پدر بزرگوار کی طرف دیکھا۔ جوان بیٹے نے باپ سے مرنے کی رضا مانگی اجازت مل گئی۔ حسینؑ دیکھ رہے ہیں۔ علی اکبرؑ بھرے ہوئے ہیں۔ ولولہ ہے۔ شوق شہادت ہے۔ رُک نہیں سکتے نہیں، آنکھ نیچی کر لی جاؤ۔ کیا قدرت نے علی اکبرؑ کو اسلیے شبیہ پیمبرؐ بنایا تھا۔ کہ میدان جنگ میں ایک ہیجان پیدا کر دے۔ ابن سعد نے تو حضرت رسالت مآبؐ کو دیکھا تھا۔ کتنے ہوں گے جنھوں نے دیکھا ہوگا پھر وہ سوچ رہے ہوں گے کہ جناب رسالتمآبؐ اپنے فرزند حسینؑ کی سفارش کرنے آئے ہیں۔ اس کی بیگناہی کی وکالت کر رہے ہیں۔ اور اس کیلیے شمشیر بکف ہیں۔ آثار ہیں کہ لشکر میں علی اکبرؑ اس طرح دشمنوں کیطرف دوڑ رہے تھے گویا اس موت کے مشتاق تھے جو دشمنوں کے حربے میں تھی۔ خبریں ہیں کہ علیؑ کا پوتا تشنہ اور یادگار جنگ سے واپس آیا ہو ہوسکتا ہے کہ بیچین شبابیہ اور اسکی امنگوں نے کہا ہوگا کہ اس کارنامے کے بعد باپ کی نگاہ حاصل کرو مگر سوال آب تھا اسلیے کہ جنگ کی قوت آجائے بشارت شہادت اور پلٹ پڑے۔ دشمن کے انبوہ میں کمین سے سر پر گرز لگا۔ نیزہ کی انی سینہ توڑ گئی ہاتھ رُکا تھا کہ بے شمار حربے چل گئے۔ حسینؑ کو معلوم ہوا کہ علی اکبرؑ تڑپ چکے۔ حضرت کسیطرح لاش لائے۔ چہرے اور دانتوں سے خون پونچھ رہے ہیں۔

اب میں حسینؑ کے آخری سپاہی کی شہادت بیان کرنے کے لیے اپنے کو تیار کر رہا ہوں لیکن تیار نہیں ہوتا اپنے کو کھینچتا ہوں لیکن منقلب ہو رہا ہوں۔ ایک مجاہد جو حیرت خیز حربے سے لڑا۔ گھوڑے پر سوار نہیں ہوسکتا۔ پاؤں پاؤں چل نہیں سکتا۔ سواری باپ کا ہاتھ یا آغوش ہے۔ اور حربہ وہ سوکھی زبان ہے جو ورق گل سے باہر نکلی ہے۔

بنا کے شکل مجاہد کی لے چلے حضرت
اُلٹ دیا علی اصغرؑ کی آستینوں کو! (رشید)

اس کے بعد کیا ہوا اس کے سمجھانے کے لیے بجائے اس کے کہیں ایک معصوم بچہ کی صورت دکھاؤں حسینؑ کے کپڑوں کی سرخی دکھاتا ہوں اُس کا خون حسینؑ کے سینے پر جاری تھا۔

نوحہ کے قابل ہے کہ اب کوئی نہیں اور قافلہ سالار اہلبیتؑ سے اسلحہ جنگ طلب کر رہا ہے۔ حضرت زینبؑ ہوں یا شہر بانوؑ اسلحہ جنگ دے رہی ہیں۔ بیقراری نہیں، شکایت نہیں۔ تسلیم و رضا ہے۔ کیا یہ برداشت کے قابل تھا کہ حسینؑ کو رخصت کرنے کیلیے کوئی مرد نہیں ہے کہ رکاب تھام کر سوار کرے۔ علیؑ کی بیٹی یہ رسم ادا کرتی ہے۔ شجاعان عالم اس بی بی کے قدم کی خاک اپنی آنکھوں میں لگائیں اور فخر کریں۔ شہدائے عالم دیکھیں اور وجد کریں کہ کوئی بے یار و مددگار بی بی جو اس کے بعد اپنے لیے دنیا کی مصیبتیں دیکھ رہی ہے۔ اس فرض کو کس طرح ادا کرتی ہے۔

حضرتؑ میدان میں تشریف لائے۔ حجت تمام کی اور ایک پُرجوش حملہ کیا۔ ابو مخنف کے نزدیک حضرتؑ نے پہلے حملے میں پندرہ سواروں کو قتل کیا۔ اکثر مضمون نگار اور واقعہ نویس حضرات نے مسٹر جیمس کارکرن مؤلف تاریخ چین کے وہ فقرات جو انھوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق نوٹ کیے ہیں۔ لیکن چونکہ ایک غیر قوم کے مورخ کی انصاف پسندی کا اعتراف نہ کرنا میرے نزدیک مستحسن نہیں ہے۔ میں بھی اس موقع کو ضائع نہیں کرتا کہ اس قابل مصنف مورخ کے پُر اثر فقرات کو ناظرین کے دلچسپ غور کے حوالہ کروں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

دنیا میں رستم کا نام بہادری میں مشہور ہے۔ لیکن کئی ایسے شخص گزرے ہیں کہ ان کے سامنے رستم کا نام لینے کے قابل نہیں۔ چنانچہ اوّل درجہ میں حسینؑ ابن علیؑ کا مرتبہ بہادری میں ہے۔ کیونکہ جس نے میدان کربلا میں ریت پر تشنگی اور گرسنگی میں ایسا کام کیا ہو اسکے سامنے رستم کا نام وہی شخص لیتا ہے جو تاریخ سے واقف نہیں۔ کس کے قلم کی قدرت ہے کہ حسینؑ کی بہادری کا حال لکھے۔ کس کی زبان میں یہ طلاقت و بلاغت ہے کہ ان بہتر۷۲ بزرگوں کی ثابت قدمی اور تہور و شجاعت اور تیس ہزار سوار خونخوار شامیوں کے جواب دینے اور ایک ایک کے ہلاک ہو جانے کے باب میں مدح جیسی کہ چاہیے کر سکے۔ کس کی نازک خیالی

کی یہ رسائی ہے۔ کہ ان لوگوں کے دلوں کے حال کو تصور کرے کہ ان پر کیا کیا گزرا۔ اسوقت سے کہ جب ابن سعد نے انھیں گھیر لیا۔ اسوقت تک جب کہ شمر ملعون نے سر کاٹ لیا کیونکہ ایک کی دو اور دو مثل مشہور ہے اور مبالغہ کی حد بھی ہے۔ جب کسی کے حال میں یہ کہا جاتا ہے کہ دشمن نے چار طرف سے گھیر لیا لیکن حسینؑ اور بہتر تن کو آٹھ قسم کے دشمنوں نے تنگ کیا تھا۔ اور اس پر بھی قدم نہ ہٹا۔ چنانچہ چار طرف تو یزید پلید کی فوج تھی۔ جن کے تیروں اور نیزوں کی بوچھار مثل آندھی کے آتی تھی۔ اور پانچواں دشمن عرب کی دھوپ۔ چھٹا دشمن وہ ریگ کا میدان تھا جو آفتاب کی تمازت میں شعلہ زن اور تنور خاکستر سے زیادہ پرسوز تھا۔ بلکہ اس کو دریائے قہر کہنا چاہیئے۔ جس کے بلبلے بنی فاطمہؑ کے پاؤں کے چھالے تھے۔ اور دو دشمن سب سے زیادہ دشمن بھوک اور پیاس مثل دغاباز ہمراہی کے جسم کے برابر عدو نہیں ساتھ تھے۔ پس جنھوں نے ایسے معرکہ میں ہزارہا کافروں کا مقابلہ کیا ہو اُن پر بہادری کا خاتمہ ہو چکا۔

ابو اسحاق اسفرائینی حضرت کے ایک حملے کے متعلق لکھتے ہیں کہ حضرت شیرانہ جوش میں قلب لشکر کی طرف حملہ آور ہوئے اور دائیں بائیں ہر طرف تیغ زنی شروع کی اسوقت آپ کی تیغ زنی آپ کے والد ماجد شیر خدا علی مرتضیٰ علیہ السّلام کی نبرد آزمائی کا سماں باندھ رہی تھی۔ ایک سوار کو گردن سے پکڑ کر دوسرے سوار کے ساتھ اس طرح ٹکراتے تھے کہ دونوں مر جاتے تھے اور دو سواروں کو پکڑ کر دو سواروں کو اس زور سے ٹکراتے تھے کہ چار ہوا ہو جاتی تھی۔ آپ کا گھوڑا ذوالجناح بھی برابر کام میں مشغول تھا۔ کسی سوار کو دانتوں سے پکڑتا اور جھنجوڑ کر ہلاک کرتا کسی کو دولتی رسید کرتا اور پرخچے اڑا دیتا کسی کو دُم اس زور سے مارتا کہ وہ اس کی جان کے لیے خدائی تازیانہ کا کام دیتی۔ دیر تک یہی حالت رہی۔ حتیٰ کہ دشمن کی فوج کا یہ حال ہو گیا کہ کوئی زخمی پڑا ہے۔ کوئی خاک و خون میں ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کوئی بھاگ جانے کی کوشش کر رہا ہے۔

مقتل ابومخنف میں حضرت کے تین حملے ذکر کیے گئے ہیں۔ ہر حملہ میں کئی کئی ہزار کافروں کا قتل۔ میدان صاف ہے۔ شمر ابن سعد کے پاس گیا اور کہا کہ اب وہ وقت ہے کہ ہمارے لشکر کا ایک آدمی بھی باقی نہ رہے۔ ابن سعد نے کہا پھر کیا کرنا چاہیئے ....

.... کہا تمام لشکر مجموعی طاقت سے تیروں، نیزوں، تلواروں، آگ اور پتھر سے حملہ کریں۔ یہی ہوا حضرت زخموں سے چور ہو گئے۔ تمام مورخین ہمزبان ہیں کہ پیشانی اقدس سے ناف مبارک تک ایکہزار نوسو اکاون زخم تھے باایں ہمہ لشکر نے داہنے سے حملہ کیا۔ حضرت نے ان کو پسپا کر دیا۔ بائیں طرف سے حملہ کیا انکو بھی متفرق کیا۔

ابن اثیر کا قول ہے کہ ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا گیا جسکے بھائی بھتیجے بھانجے اور عزیز مارے گئے ہوں۔ تین دن کا بھوکا پیاسا ہو۔ اور ایسی جرأت و بہادری دکھلائے۔ اب حضرت گھوڑے پر نہیں سنبھل سکتے۔

اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

ابی مخنف اور روضۃ الشہداء کی تحقیق ہے کہ جب قاتل حضرتؑ کے قریب پہنچا حضرت نے غش سے آنکھیں کھول دیں فرمایا کیا وقت ہے۔ جب معلوم ہوا کہ نماز عصر کا وقت ہے تو حضرت نے فرمایا اس قدر صبر کرو کہ ہم نماز پڑھ لیں۔ لیکن ابھی سجدہ ختم نہ ہوا تھا کہ لشکر شام سے تین تکبیروں کی آواز بلند ہوئی۔ کسی نے ان تکبیروں کو سن کر کہا ہے

ویکبّرون اذا قتلت وانّما
قتلوا بک التکبیر والتّھلیل

آپکو قتل کرکے تکبیر کہہ رہے ہیں۔ حقیقۃً آپکو قتل کرکے اُنھوں نے تکبیر اور تہلیل کو قتل کر ڈالا حضرت مولانا روم نے تاریخ کا کیا خوب مصرعہ فرمایا ہے ع سر دیں را برید بیدینے

حضرت خواجہ خواجگان معین الدین چشتی رحؒ فرماتے ہیں۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین دیں است حسین دیں پناہ است حسینؑ
سر داد و نداد دست در دست یزید حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

(محرم نمبر ۱۳۵۵ھ)

مقاصد کی جنگ

تہذیب اسلام کی بیخکنی کی کوشش

اور

بقائے اسلام کے لیے جاں فروشانہ جد وجہد

(نوشتۂ پروفیسر سیّد احتشام حسین صاحب رضوی ماہلی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ)

عالم وجود کا ذرہ ذرہ اپنی ہستی کے مقاصد اپنے ساتھ لایا ہے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر اُسی قدر اہم ہے جتنی کہ ہم سمجھ سکتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ! کیونکہ اگر ہم کسی چیز کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں تو ممکن ہے کہ ہماری نظروں میں اس کی قیمت کم ہو لیکن ہمارے نہ سمجھنے کی وجہ سے اُن میں فرق نہیں آسکتا۔

مخلوق خداوندی میں انسان ہی وہ بلند مرتبہ چیز تھی جس نے تمام اشیائے کائنات میں سب سے بلند اور معزز جگہ پائی۔ ہر چیز اپنے حوصلہ وہمت کے مطابق ترقی کرسکتی ہے۔ انسانوں میں کچھ وہ ہیں جو اپنے بنی نوع پر حکومت کرتے ہیں، کچھ وہ ہیں جن کے مقدس ہاتھوں میں معرفت وروحانیت کی باگ ہوتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی گہوارے سے لحد تک کسی خصوصیت کی حامل نہیں ہوتی، اور ایسے ہی انسانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ وہ لوگ کم ہیں جو اپنی ہمت وجرأت سے کوئی کارنمایاں دکھا کر ترقی کے اوجِ کمال تک پہونچ جائیں۔ یہ فطرت انسانی کا مقتضا ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ حوصلے رکھتا ہے، ہر انسان اپنی زندگی کے کچھ مقاصد سامنے رکھکر اُنھیں کی طرف گامزن ہوتا ہے لیکن اُن میں سے بعض اپنے نام صفحۂ کائنات پر اس قدر گہرے چھوڑ جاتے ہیں کہ زمانے کی تمام مخالفانہ کوششیں اُنھیں مٹانے سے عاجز رہتی ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ زمانہ ان کی پرواہ بھی نہیں کرتا اور وہ خود مٹ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ دریافت کرنے میں ہمیں نفسیات کے بہت سے اصولوں پر بحث کرنی ہوگی۔

ہر شخص اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور متصوّر کرلیتا ہے بعض اوقات ایسے مقاصد جان سے زیادہ عزیز ہو جاتے ہیں۔ ان میں کامیابی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ تصوّر میں تو ہر شخص نپولین یا گاندھی بن سکتا ہے لیکن زمانہ اب تک انکے علاوہ کوئی اور نپولین یا گاندھی پیش نہ کرسکا۔ اُسکی صرف وجہ یہ ہے کہ . . . . کوشش اچھی طرح نہیں کیجاتی اور خود ذوق عظمت ناقص رہتا ہے۔ اگر زندگی کا یہی ماحصل قرار دے لیا جائے اور دوسرے خیالات وجذبات سے قطع نظر کرکے اپنی پوری قوت اسی پر صرف کردی جائے تو ناکامی کی کوئی وجہ نہیں۔

مہاتما بدھ نے حکومت وسلطنت، عیش وعشرت کو ٹھوکر مار کر اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرنے میں جان لگادی، سقراط نے سچائی کی تعلیم پھیلانے میں اُسوقت بھی قید سے نکل کر بھاگنا مناسب نہ جانا جب کہ اُس کے دوست نے قید خانہ کا دروازہ کھول کر اُس سے منت وسماجت کی۔ حضرت عیسیٰ نے فقیرانہ شان سے زندگی بسر کرکے بنی نوع انسان کو بُرائیوں سے بچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ رسولؐ اسلام کو وحدانیت کی تعلیم سے وہ محبت تھی کہ طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد بھی اُن کو کوئی سچّی راہ سے نہ موڑ سکا۔ مقاصد کے حصول کے لیے نپولین نے دن اور رات ایک کردیا۔

مختصر یہ کہ جب کوئی مقصد اس قدر عزیز ہو جاتا ہے تو پھر جان ومال کوئی چیز اُس کی قیمت نہیں ٹھہر سکتی۔ اگر یہ یقین ہو جائے کہ تمام تکالیف اور مصائب کامیابی کی طرف لے جا رہے ہیں تو ہمت

اور جرأت اور بڑھ جاتی ہے۔ انگلستان کا مشہور شاعر براؤننگ کہتا ہے

THen welcome each rebuff that has tarns earths.
smoothness
Rough, each sting that bids now sit now stand but go!
Be our toys three parts pain! strive hold cheap the strain
Lean, now account the rang; dare never grodge the throe

مختصراً اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑی سے بڑی شکست کا خیر مقدم کرو! ہر نیش زنی جو تمھیں اپنے مقصد تک پہونچنے کے لیے اُکساتی ہے اگرچہ پچھتر فیصدی تکلیف دہ ہو تو بھی پرواہ مت کرو اور بڑھتے چلے جاؤ۔" اپنے مقاصد کو کامیاب دیکھنے کے خواہشمند جان پر کھیل جانا معمولی بات سمجھتے ہیں اُن کی نگاہیں دور کسی کشش انگیز منظر پر جمی ہوتی ہیں، وہ اسی کی جانب مردانہ وار بڑھتے ہیں۔

حسینؑ!

امام حسینؑ کی زندگی کا بھی ایک مقصد تھا۔ وہ اسلام جو ان کو رسولؐ مقبول کے ہاتھ سے ملا تھا اس کی حفاظت کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ بس یہی ایک مقصد تھا جس کے بچانے اور حاصل کرنے کے لیے وہ تعلیمات رسول کی بیخکنی کو آنکھوں سے نہ دیکھ سکتے تھے خواہ اس کے لیے انھیں کتنی ہی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں، وہ گھر سے بے گھر ہو سکتے تھے لیکن یہ ہرگز بھی نہ چاہتے تھے کہ اسلام دنیا میں ایک نئے اور جھوٹے رنگ میں پیش کیا جائے، وہ اپنی اور اپنے خاندان کی قربانی گوارا کر سکتے تھے لیکن اپنی جان سے زیادہ عزیز چیز۔ اسلام۔ کو سرسبز دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جب اسلام پر آنچ آنے لگی تو حسینؑ اپنی جگہ پر تڑپ گئے۔ انھوں نے سب کچھ چھوڑ دیا اور صرف حقیقی اسلام کی ساری کائنات اپنے ساتھ لے کر نشر و اشاعت کے لیے مدینہ کو خیرباد کہہ دیا۔

یزید

یزید بھی اپنے مقصد کا علمبردار تھا، اُسے صرف جوانی کا غرور نہ تھا، صرف شباب کا نشہ نہ تھا، محض حکومت ملنے کی خوشی نہ تھی بلکہ اُن سب سے الگ اسکے ذہن میں کوئی اور خیال چکر لگا رہا تھا۔ اس کی نظر میں فتوحات کا کوئی خوش آیند منظر نہ تھا، وضع قوانین اور رفاہ عام کی مفید تدبیریں نہ تھیں بلکہ ان سب سے زیادہ دلکش ان سب سے زیادہ ہنگامہ پرور اور دل خوش کن ایک تمنا عمق قلب میں پرورش پا رہی تھی، ابوسفیان اپنی حسرتوں کے ساتھ زمین کی گہرائی میں کیڑوں کی نذر ہو چکا تھا، معاویہ بھی قبر کے تاریک گوشہ میں جمہوریت اسلام کو شخصی حکومت میں تبدیل کرنے کی تمنائیں لیے ہوئے غافل پڑا تھا۔ سرداران بنی امیہ کی تمامتر کوششیں اسلام کی صورت مسخ کرنے میں ناکامیاب ثابت ہو چکی تھیں، یہی موروثی آرزو تھی جس نے یزید کو حسینؑ کے مقابلے میں لا کر کھڑا کیا، اس نے چاہا تھا کہ معاویہ کے کام کی تکمیل ہو جائے، اسلام کی وہ تہذیب جس کی بقا کے لیے رسولؐ خدا کبھی چین کی نیند نہ سوئے یزید کی نگاہوں میں کھٹک رہی تھی، کہنے کو تو وہ مسلمان ضرور تھا لیکن رسول خدا کی تعلیمات میں کچھ اصلاحیں چاہتا تھا، زنا و شراب خواری کا جواز اس کے ذہنی اسلام کا ایک جزو تھا۔ بنی امیہ کا پورا عہد حکومت تمدن اسلام کے خلاف ایک باقاعدہ جہاد تھا۔ یزید اسی خاندان کا ایک فرد تھا۔ نکلسن (NICHOLSON) اپنی ادبی تاریخ عرب میں لکھتا ہے کہ بنی امیہ روحانیت کے کسی درجہ پر فائز نہ تھے اور اگر کسی طرح کا مذہب رکھتے تھے تو وہ برائے نام تھا۔ ڈوزی (DOZY) کہتا ہے کہ اموی عہد حکومت کا برسر اقتدار ہونا اسلام کی شکست الفاظ کے برابر تھا اور عرب کی مٹی ہوئی لامذہبیت کا نشاۃ ثانیہ! —— یزید اسی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمیں اس کا مقصد زندگی سمجھنے میں نہایت آسانی

ہو گی اگر ہم اس کی سیرت اور اس کے خاندانی رجحانات کو پیش نظر رکھیں،

مقاصد میں اختلاف

ایک طرف ایک شخص اسلام کی بقا کے لیے اپنی حیات کا ہر لمحہ قربان کر دینا چاہتا تھا، اسلام کو سرخرو رکھنے کے لیے اپنے خون کا ہر قطرہ صرف کر دینے کو تیار تھا۔ تہذیب اسلام کے قائم رکھنے کے لیے اپنی جان تک سے دریغ نہیں کرنا چاہتا، دوسرے شخص کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ اسلام تباہ و برباد ہو جائے، قوانین اسلام موقع اور وقت کے لحاظ سے دنیاوی بادشاہ کے نجس ہاتھوں سے توڑے جاتے رہیں۔ اور تبدیل ہو سکیں جب مقاصد میں اس قدر اختلاف ہو گا تو دونوں قوتوں کا ٹکرا جانا لازم تھا اس آویزش میں سیاست کا کوئی شائبہ نہ تھا یہ صرف مختلف اصول کے حاصل کرنے کا ذریعہ تھی،

حصول مقصد کا طریقہ

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مقصد حیات کے لیے کوشش ضروری ہے ہر طرح کی تدبیریں (اچھی ہوں یا بُری) عمل میں لائی جاتی ہیں جتنے ذرائع اور جتنی قوتیں ایک شخص کے پاس ہو سکتی ہیں وہ سب اس موقع پر صرف کر دی جاتی ہیں۔ حسینؑ بانئ اسلام کے نواسے تھے اخلاق کے مجسمہ تھے، وہ دنیا کو سیاست کی پُرفریب ریاکارانہ چالوں سے دھوکا نہ دینا چاہتے تھے، وہ دوسرے ممالک کے بادشاہوں سے ساز باز رکھکر اسلام کو خانہ جنگی کا ذریعہ نہ بنانا چاہتے تھے، انکے پاس خاندان کے چند افراد تھے یہی فوج تھی اور یہی دولت! چند ایسے احباب تھے جن کو حسینؑ جدا بھی کرنا چاہتے تو وہ جدا نہ ہوتے یہی ساری کائنات تھی جس کو لیکر وہ اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ یزید وہ پردہ بھی چاک کر چکا تھا جس کے آڑ سے معاویہ کی حکمت عملی تنگ نگاہوں کو درست معلوم ہوتی تھی۔ عرب کیا دُنیائے اسلام کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ یہ خیال کر کے حسینؑ کانپ گئے وہ جانتے تھے کہ یزید اپنی نارواحرکتوں سے باز نہیں آسکتا اور وہ وقت دور نہیں جب ان کو بقائے اسلام کے لیے قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ اس لیے اس تھوڑے سے وقت میں بھی انھوں نے ہر ممکن تدبیر پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا جو کام ایک جگہ بیٹھ کر نہیں ہو سکتا وہ نقل و حرکت سے انجام پاتا۔ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا کا سفر کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ حسینؑ نے کم سے کم وقت میں عرب کے ایک بڑے حصّہ کو بتلا دیا کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

یزید بھی اپنے خیال سے غافل نہ تھا اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنی حکمت عملی کو عمل کا جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ اُس نے اپنے مقصد حیات کا اظہار حسین و خوب رُو ساقیوں کے جھرمٹ میں کیا، اس نے اپنی کامیابی کا نقشہ اپنے جاہ و حشم، وزراء اور کارپردازانِ مملکت کی قوت میں دیکھا، اپنی قوت کا غلط اندازہ کر کے یزید نے حسینؑ سے بیعت طلب کی اور انکار پر قتل کا حکم دے دیا گیا۔ میں اس نکتہ پر کہ یزید کی زندگی کا حقیقی مقصد صرف تہذیب اسلام کی بربادی تھا اسلیے بہت زیادہ زور دیتا ہوں کہ یزید کی حکومت اسی کے حصول کی ایک مسلسل کوشش تھی۔ جب حسینؑ کی شہادت سے بھی اسلام کا چراغ گُل نہ ہو سکا تو مدینہ کے گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہا دی گئیں جب اس سے بھی کامیابی نہ ہوئی تو کعبہ کی حرمت کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ واقعات تاریخ کے دامن پر صرف دھبّہ ہی نہیں ہیں بلکہ اموی سیاست کا کھلا ہوا ثبوت، اگر تہذیب اسلام کو مٹانے کی کوشش نہ تھی تو عباسؑ و اکبرؑ کی کیا خطا تھی؟ قاسمؑ و عونؑ و محمدؑ نے حکومت کا کیا بگاڑا تھا؟ چھ مہینہ کی جان نے کب یزید کے تخت پر حریص نگاہیں ڈالی تھیں۔ اگر حسینؑ سے کوئی سیاسی خطرہ تھا تو عورتوں کی بے حرمتی سے اس میں کہاں تک کمی ہو سکتی تھی؟ آپ یقین فرمائیے کہ سیاست کے پردے میں علمبرداران علم و اخلاق سے عرب خالی کیا جا رہا تھا۔ یزید کو معلوم تھا کہ یہ وہ بچے ہیں جو بڑے ہو کر دنیا کی حالت ہی بدل دیں گے۔ اموی اقتدار کا سر کچل دیں گے۔ یہ وہ ذاتیں تھیں جو عرب کی تہذیب کو چار چاند لگا دیتیں، یزید نے ان سب کو قتل کرا دیا تاکہ اس کی برائیوں کو منظر عام پر لانے والا

اس قابل ہی نہ ہوا - ایسا اکثر ہوا ہے - یزید کا طرز عمل بھی ایسا ہی تھا۔ اس کی نظر میں صرف اس کا مقصد حیات تھا اور اس کی کامیابی کا خواب - اس کے حاصل کرنے میں وہ اسقدر اندھا ہو چکا تھا کہ اسے نام و ننگ کی پرواہ نہ تھی اسے اس سے کیا مطلب کہ چھ مہینے کا بچہ کسی کا بھی گنہگار نہیں ہوتا - اسے کیا اگر دنیا اسے ظالم و جابر کے نام سے یاد کرے گی،

مقاصد میں چونکہ زبردست اختلاف تھا اسلیے ان کا یہ طریقہ حصول بھی بالکل جُدا گانہ تھا۔ حسینؑ نے کربلا کے میدان میں بھی اس تفریق کو بدرجۂ اتم ظاہر کیا، اگر افواج یزید نے آب و غذا بند کر کے اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا تھا تو حسینؑ نے حُر کے ساتھ بھائی کی طرح برتاؤ کر کے مساوات اور مہمان نوازی کی تعلیم دی۔ اگر عاملان یزید نے قوانین جنگ کا خیال نہ کیا اور ایک ایک پیاسے پر ہزار ہا ٹوٹ پڑے تو امام نے اپنی طرف سے کبھی جنگ میں سبقت نہ کی۔ یزید کے یہاں تو یہ تھا کہ کسی طرح حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کو ختم کر دیا جائے......

حضرت مسلمؑ ایک قاصد کی حیثیت سے کوفہ گئے تھے ان کے ساتھ جو سلوک ہوا غالباً بین الاقوامی آئین جنگ اسکو ناجائز قرار دے گا اور ملامت کی نظر سے دیکھے گا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ حسینؑ کی چھوٹی سی فوج نے عجب سج دھج سے مقابلہ کیا اور پوری طرح داد مردانگی دی۔ ان میں سے ہر ایک سپاہیانہ نمود کے ساتھ ہی ساتھ حقیقت اسلام کی پیروی بھی کر رہا تھا، بعض نے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیئے جن کی ضعف سے کمر خم ہو چکی تھی انھوں نے ایک دفعہ تن کر اپنی کمریں مضبوط باندھ لیں۔ جن کے پیروں میں میدان تک آنے کی قوت نہ تھی انھوں نے باپ کے ہاتھ پر صرف سوکھی ہوئی زبان سے اسلام کا پیغام پہنچا کر راہِ حق میں جان دے دی۔ طریقہ جنگ کا یہ اختلاف مقصد کے اختلاف کا آئینہ دار ہے، حسینؑ نے اپنی کامیابی کا طریقہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ایک جابر فوج کے مقابلہ میں صرف یہی صورت اپنی کامیابی کی ہو سکتی تھی، جنگ صرف اسلیے تھی کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ علیؑ کا بیٹا میدان کارزار سے ہٹ گیا!

محض یہ دکھانا تھا کہ اے میری زندگی سے سبق لینے والو! اگر کبھی ایسا ہی موقع پڑ جائے اور تمھاری تعداد کم ہو پھر بھی اپنی سچی بات پر قائم رہ کر جان دے دو! حسینؑ نتیجۂ جنگ کو اچھی طرح جانتے تھے۔

پھر کون کامیاب ہوا

یہ وہ جنگ تھی کہ یہاں حسینؑ کے نقطۂ نظر سے حیات و موت کا سوال ہی نہ تھا وہاں تو صرف مقصد کی کامیابی اور ناکامیابی کا سوال تھا - اگر شہادت حسینؑ کے بعد اُموی اسلام ہاشمی اسلام کو نیست و نابود کر دیتا تو یزید کی فتح تھی - اگر حسینؑ کے قتل کے بعد تہذیب اسلام ان تبدیلیوں کو قبول کر لیتی جن کے لیے یزید بے چین تھا تو یقیناً حسینی مقصد کی شکست تھی - لیکن تاریخ کا صفحہ صفحہ اسلام کی فتح کا اعلان کر رہا ہے۔

یزید نے فوجیں جمع کی تھیں ظالم اور بے رحم سرداران فوج مقرر کیے تھے اپنی ظاہری کامیابی کا تمام سامان مہیا کر لیا تھا لیکن نتائج پر بالکل غور نہ کیا تھا - خون بہا دینا آسان تھا لیکن دامن سے بے گناہ خون کا داغ مٹا دینا کھیل نہ تھا، سر کو کاٹ کر نیزے پر بلند کرنا معمولی بات تھی لیکن یزید کی تمام سطوت و دولت اس سربلندی کو مٹانے سے عاجز تھی جو انھیں شہادت پا کر حاصل ہو چکی تھی - بے جان لاشیں گھوڑوں سے پامال ہو سکتی تھیں لیکن قدموں کے وہ گہرے نشان جو کربلا کے میدان میں ذرا سے غور کرنے کے بعد نظر آ سکتے ہیں کسی طرح محو نہیں ہو سکتے تھے۔ پانی بند کر دینا کچھ مشکل نہ تھا لیکن فرات کی اشکبار آنکھ آج بھی وہی افسانہ دُہرا رہی ہے، خیام میں آگ لگا دینا ایک کھیل تھا لیکن انھیں شعلوں میں مقصد حسینؑ کی گرمی تھی جو آج بھی ہمارے کمزور ارادوں میں حرارت پیدا کر سکتی ہے۔ یہ ہے مختصراً کربلا کی جنگ کا نتیجہ!

اے شہدائے کربلا تمھیں مبارک ہو کہ تم حفاظت اسلام میں جان دے کر حیات جاوید کے مالک ہو!

(محرم نمبر ۱۳۵۳ھ)

مسلمانوں کی عالمگیر تباہی کا ذمہ دار کون ہے

عربی ڈاکو مجاہدوں کے لباس میں

ان مسلمانوں کی سیاہ کاریاں جو قیصر و کسریٰ کیلئے باعث رشک تھے

اسلام پھیلا ـــــــــ یا ـــــــــ سلطنت عرب؟

(مولانا سیّد ابن حسن صاحب قبلہ رضوی چارجوی مبلغ اسلام سندھ)

آج جب اسلامی سلطنتوں کا علم دنیا کے ہر حصہ میں سرنگوں ہو چکا ہے۔ جب مسلمانوں کے حریصانہ منصوبوں اور سرمایہ دارانہ ارادوں کے لیے خدا کی زمین تنگ ہو گئی۔ جب اجماع، استخلاف، شوریٰ اور غلبہ کے سیاسی حربے مسلمانوں کو نہیں بلکہ مسیح ناصری کی امت کو امت خیر الامم ثابت کر رہے ہیں۔ تو کبھی کبھی میرے دل میں عرب کے ان بہترین سیاسی دماغوں کا خیال آجاتا ہے جنھوں نے اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے اسلام کے اصول کو سرے سے ہی بدل ڈالا۔

[اللہ اللہ کہاں تو وہ عالمگیر برادری جس کی بنیاد "انما المومنون اخوۃ" پر رکھی گئی تھی۔ جس میں کالے۔ گورے۔ عرب عجم۔ قریشی اور غیر قریشی سب کو مساوات کا درجہ حاصل تھا۔ اور کہاں وہ تنگ نظری اور قبیلہ پرستی کہ بھری محفل میں "الائمۃ من قریش" کہہ کر تمام حریفوں اور قسمت آزماؤں کو دم بخود کر دیا۔ اور غیر قریش کی آرزوؤں اور تمناؤں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خون ہو گیا۔ مگر حریت اور آزادی کا جذبہ جب اکبر تبہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کا مٹنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ استبداد اور تحکم کی زنجیریں اس کو چند دن تک جکڑے رہیں۔ مگر جب کبھی موقعہ ملتا ہے وہ نکل کر پھر ظاہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ "یہ فریب وقت" بھی آہستہ آہستہ غیر موثر ہوتا گیا اور مسلمانوں کی ہر قوم نے "اسپ خلافت" پر "چڑھی" گانٹھی۔ کیا بنی امیہ۔ کیا بنی عباس کیا ترک۔ کیا دیلم۔ سب ہی باری باری اپنے ناموں کے ساتھ "امیر المومنین" کا شاندار لقب لگا گئے اور سچ بھی ہے کہ جب "امارت دین" اور "ریاست دنیا" قابو یافتہ جماعت کا حق ہو تو ؎

ہر کہ شمشیر زند خطبہ بنامش خوانند

کی تصدیق کیوں نہ ہو جائے۔ انجام بیں رسول اپنے گرداگرد بیٹھنے والوں کی ذہنیت سے ناواقف نہ تھا وہ کہہ دیا کرتا تھا کہ "مسلمانوں اس دن تمھارا کیا حال ہو گا۔ جب روم و ایران کی دولت سمٹ سمٹ کر تمھارے پاس آئے گی۔ جب تم قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے مالک ہو جاؤ گے؟

سرمایہ داری اور اقتدار پسندی کا برا ہو کہ اس نے مسلمانوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ اسلامی تاریخ پڑھو اور جہانگیر پسند سلاطین کے کارناموں پر ایک نگاہ ڈالو تو سوائے اسکے اور کیا ظاہر ہو سکتا ہے کہ رسول کریمؐ سے پہلے عرب قبیلے آپس میں لڑتے تھے اور ان کی لوٹ مار کا دائرہ محدود تھا۔ اسلام کی ولولہ خیز اور جوش آفریں تعلیم نے ان کو سلطنتوں سے مقابلہ کرنے اور دور دور کے ممالک سے نبرد آزمائی کا موقعہ دیدیا۔ اور وہی عرب جو "پالان شتر" "اساس البیت" اور خرموں کے چند دانوں کی چوری کرتے تھے قیصر و کسریٰ کے خزانوں اور روم و شام کے زرخیز خطوں پر قبضہ جا بیٹھے گویا (خاکم بدہن) رسول عربی نے تو ایک بلائے ناگہانی کو جو ریگستان عرب ہی تک محدود تھی عالمگیر بننے کا موقعہ دیدیا۔

حجاج ابن یوسف جو قسمیں کھا کر منبر پر اپنی خوں آشامی اور مردم کشی پر فخر کیا کرتا تھا جس کے "کشتگان ناز" کی تعداد سیکڑوں اور ہزاروں سے گذر کر لاکھوں تک پہونچی ہوئی تھی، اسی دربار کا ادنیٰ خادم تھا۔ جہاں رحمۃ للعالمینؐ کا نام نہاد جانشین تخت بچھا کر بیٹھا تھا، ولید جو ساری ساری رات مے نوشی میں مبتلا رہتا تھا اور صبح کو مسجد کوفہ میں مصلی پرتے کرکے دو کے بجائے چار رکعت نماز پڑھانے سے بھی نہ شرماتا تھا۔ اسی "مجسمۂ حیا" اور "پیکر ایمان" خلیفہ کا گورنر اور "ماجایا" تھا جس کے گھر میں بقول حسن نظامی ایک چھوڑ دو دو "نبی زادیاں" (معاذ اللہ) ہر مہینے ہٹلر آئی تھیں۔ علوم پرور اور داد گر ہارون کا واقعہ کس کو یاد نہیں جس نے اپنے باپ کی مدخولہ کنیز سے گویا اپنی ماں سے زوجہ کا کام لینے میں تامل نہ کیا اور اس وقت کے آرک بشپ (Arch Bishop) یعنی سرکاری امام نے جواز کا فتوےٰ دے کر ۱۰ ہزار یا بقولے دس لاکھ درہم بطور فیس کے کھرے کھرے گنوا لئے۔ یہاں تک کہ بیچارہ خراٹے آنکھیں ملتا ہوا بستر پر سے اٹھایا گیا اور امام صاحب صبح تک انتظار نہ کر سکے علہ اور اس بدبخت زر پرست سے کون واقف نہیں جس نے ہارون کے خوش کرنے کے لئے یہ حدیث بنا دی تھی کہ معاذ اللہ رسول اللہؐ بھی کبوتر باز تھے۔ عله یہ سب کچھ کیا تھا؟ دراصل یہ خلیع العذاری کا نتیجہ تھا جس کو اس وقت کے مسلمانوں نے عمداً یا سہواً "حریت ضمیر" اور "آزادی عمل" کا بے ڈھنگا نام دے دیا تھا۔ جمہوریت آج اس ترقی کے زمانے میں بھی جتھہ بند لوگوں اور قابو یافتہ جماعتوں کا ایک "سامان تفریح" ہے جس میں بقول (gold smith) گولڈ اسمتھ غریبوں کا گلا گھوٹنے کے لئے قانون بنائے جاتے ہیں اور رہے سرمایہ دار تو وہ خود قانون کے اوپر حکومت کرتے ہیں۔ ان کی ابرو کا ہر اشارہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ایک مستقل قانون ہے۔

امریکہ میں وہاں کے اصلی باشندوں کا حال زار جو خود اپنے ملک میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں اور فرانس کی نو آبادیوں کی "داستان غم" میرے اس دعوے کی روشن دلیلیں ہیں۔ اور تیرہ و تاریک زمانہ میں جب نہ علم دفن تھا نہ اس قدر روشنی پھیلی تھی جمہوریت کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا کم از کم جہاں تک جزیرہ نمائے عرب کا تعلق ہے! میں زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس اصطلاح سے واقف بھی نہ تھے ورنہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ جلیل القدر سلطان جو ایک دن مہاجر اور انصار کی بھری محفل میں "رائے عامہ" کو اپنے انتخاب کی طرف مائل کر رہا تھا۔ دوسرے دن دستاویز لکھ کر اپنے جانشین کا فیصلہ کر دیتا حالانکہ لوگ یہ کہہ رہے تھے

تستخلف علینا فظا غلیظا[1]

اور اسلام کا وہ ہیرو جس کے نام کے ساتھ فاتح اعظم کا خطاب لگایا جاتا ہے اس مسئلے کو ایک سب کمیٹی (شوریٰ) کے سپرد کیوں کرتا! بیشک دنیا کا وہ پرانا قانون جو (Might is right) "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"، کے نام سے موسوم ہے عرب کی تمام قوموں کو یاد تھا اور جب تک ان کے ہاتھ میں تلوار رہی وہ اس قانون کو عملی شہادت دے کر داد شجاعت دیتے رہے اور جب تہذیب و تمدن کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے اس تلوار کو چھین لیا تو یہودیوں کی طرح مسلمان بھی ایک مردہ قوم بن کر رہ گئے۔

جب تک ظاہری نماز روزے سر بازار اسنتجے۔ اور لمبی لمبی داڑھیاں "حصول سلطنت" کا ذریعہ بنی رہیں۔ تو ہم نے طوعاً یا کرہاً ان کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ اور گو ہم نے خود "شراب نوشی" کی قسم نہ کھائی تھی بلکہ شیرازی شراب کے خم کے خم لنڈھا دیئے۔ مگر دوسروں پر شراب نوشی کی حد جاری کرتے رہے۔ اور گو ہم کلب گھر میں جا کر محو رقص نہیں ہوئے مگر "حریم خلافت"، ہمیشہ رقاصہ عورتوں کا اڈہ بنا رہا۔ بغداد اور دمشق کے سلطانی محلات میں دور دور کی حسین عورتیں ناچ و رنگ کا نقشہ جماتی رہیں" اور "سرود ہمسایہ" سے تو سرکاری اماموں نے بھی پرہیز نہ کیا مگر ہمارے قاضی ہمیشہ "گانے بجانے" پر تعزیر دیتے رہے۔ ہاں جب یہ باتیں "حصول سلطنت" کا باعث نہ رہیں اور "وتعز من تشاء وتذل من تشاء" کی طاقت جمہور اسلام کے ہاتھ سے نکل کر "جمہور مغرب" کے ہاتھ میں آگئی تو ہم نے تمام اسلامی باتوں کو دور سے سلام کر لیا اور کھلم کھلا کہہ دیا کہ "آئندہ سے ترکی سلطنت کا مذہب اسلام سے کوئی واسطہ نہ رہے گا" وقت کا مورخ جو اپنے گوشۂ عافیت سے پکار رہا ہے۔

علہ تاریخ الخلفا صفحہ ۱۹۷ علہ منہج الوصول صفحہ ۹ علہ حیواۃ الحیوان جلد ۱ صفحہ ۱۳۶

بدن را تا فرنگ از جاں جدا دید
نگاہش ملک و دیں را ہم دو تا دید
کلیسا سبحۂ پطرس شمارد
کہ او با حاکمی کارے ندارد
بکار حاکمی مکر و فنے بیں
تن بے جان و جان بے تنے بیں
خرد را با دل خود ہمسفر کن
یکے بر ملت ترکاں نظر کن
بتقلید فرنگ از خود رمیدند
میاں ملک و دیں ربطے نہ دیدند"

وہ پکارتا رہے گا اور "ملت اسلامیہ" آہستہ آہستہ اس منزل سے گذرتی رہے گی۔ اور دو تین صدیوں کے بعد "پیام مصطفےٰ کمال" اسلام کا ایک جزو بن جائے گا کیونکہ مسلمانوں کا شروع ہی سے یہی حال ہے کہ وہ حکمران جماعت کے اعمال و افعال کے لئے "کتاب و سنت" سے کوئی نہ کوئی سند نکال ہی لیتے ہیں سہ ہر کفر کہ کہنہ شد مسلمانی شد۔

کیا وہ مسلک اور رسم پاش نظریہ جو بنی امیہ نے اپنی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے بنایا تھا (خیرہ و شرہ من اللہ) آج ہمارے کلمہ کا جزو نہیں اور گو عملاً نہ سہی زبان سے تو ہم اس کو مانتے ہیں اور جب تک ہمارے ہاتھ میں تلوار رہی ہم عملاً بھی اپنے اس عقیدہ کا اظہار کرتے رہے۔ آج مسلمان اس بات سے بہ رہے ہیں کہ "اسلام کے نام لیواؤں نے تلوار کے زور سے اپنے مقاصد کی اشاعت کی۔ مگر ان کی تاریخ جو "قصاب خانہ" کی داستان معلوم ہوتی ہے جس کے ہر ورق پر خونیں لفظوں میں ان معصوم اور بے گناہ لوگوں کا درد بھرا افسانہ لکھا ہوا ہے جو حرص اور لالچ کی قربان گاہ پر بے دریغ بھینٹ چڑھائے گئے۔ کہاں چھپائی جا سکتی ہے۔

ہم مانتے ہیں اور ساری دنیا جانتی ہے کہ مذہب اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ ظاہر ہے کہ ظالم سلاطین کی سیہ کاریاں مذہب کو اور کمزور کر دیا کرتی ہیں اور دل طاقت اور قوت کے مظاہروں سے نہیں بدلا کرتے مگر اس حقیقت واضح سے کون انکار کر سکتا ہے کہ طامع اور لالچی مسلمان غازیوں اور مجاہدوں کا روپ بدل کر ساری دنیا پر چھا گئے اور ان کی ترکتازیوں نے "امن پسند" انسانوں کا ناک میں دم کر دیا۔

رسول اللہ کی تمام جنگیں مدافعانہ تھیں۔ وہ اپنی اور اپنے صحابہ کی حفاظت کے لئے امن عامہ کے قیام کے لئے تلوار اٹھاتے تھے۔ مگر "آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ" لوگوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جہاں سے لوٹ مار کی امید ہوئی وہیں جا چڑھے یہ تو سچ ہے کہ اسی طرح چوتھائی صدی کے اندر ہی اندر عربوں کی سلطنت سکندر اعظم کی فتوحات سے بڑھ گئی۔ مگر اسلام جس مقصد کو لے کر آیا تھا وہ فوت ہو گیا۔

"کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا" عرب دوسرے ملکوں کو عربی تہذیب سکھانے کے لئے اٹھے تھے۔ وہاں لینے کے دینے پڑ گئے خود ایرانی اور رومی رسموں کا شکار ہو گئے۔ اور "سرمایہ پرستی و فرقہ بندی" دو گونہ از کار منطق اور فلسفی موشگافیوں کا سبق پڑھ کر اسلام کو وہ برباد کیا جس پہ آج سب خون کے آنسو بہا رہے ہیں۔

جس طرح ایران میں مانی اور مزدک کے الگ الگ چیلے تھے۔ جس طرح یونان میں ارسطو۔ ارشمیدوس۔ اقلیدس وغیرہ کے الگ نظریے School of Philosophy اور مذاہب تھے اسی طرح مسلمان بھی حنفی۔ مالکی، حنبلی۔ شافعی۔ فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

دین حق را چار مذہب ساختند
فتنہ در دین نبی انداختند

اور پھر ان فرقوں کے اندر بھی جدا جدا ٹولیاں ہو گئیں اور آہستہ آہستہ توحید کا وہ سبق جس کے معنی یہ تھے کہ "ایک خدا اور ایک ہی امت ہو" فراموش ہوتا گیا سچ تو یہ ہے کہ ریفارمر اور مصلح کے حقیقی مفہوم کو اس کے معاصر مشکل سے سمجھتے ہیں۔ اسی لئے مشہور ہے کہ "ریفارمر قبل از وقت پیدا ہوتا ہے" یعنی اس زمانے میں آتا ہے جب اس کے اعلیٰ اصول کو سمجھنے والے موجود نہیں ہوتے ہاں اس کی وفات

کے بعد جیسے جیسے دنیا ترقی کرتی جاتی ہے اور حالات وواقعات ان اصول کی صداقت کے نشان ظاہر کرتے ہیں تب اُس کا اصلی حسن ظاہر ہوتا ہے۔

رسول کریم اس دکھ بھری دنیا کو "فردوس بریں" بنانے کے لئے آئے تھے۔ اور لڑائیوں جنگوں۔ اور خونریزیوں کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے، وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ، وہ سرمایہ داری ناجائز اقتدار۔ خاندانی اور نسلی امتیازات کو یک لخت موقوف کرنے کے خواہاں تھے قیصر وکسریٰ کی طرح سلطنت کا سنگ بنیاد رکھنا جس میں غریبوں کے سر پر سوار ہوں اور غریب اقتصادی مشکلات میں پھنس کر دم توڑتے رہیں۔ توسیع سلطنت جہانگیری اور شہنشاہی یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کا تخیل بھی حضورؐ انور کے پیش نظر نہ تھا۔ وہ سیدھا سادھا نبیؐ جس کی ساری عمر ایک حجرے میں بسر ہو گئی۔ جس نے خدا کی ایک مسجد کے سوا (جس کی دیواریں کچی تھیں) جہاں فانوس کی شمعوں کے بجائے کھجور کی سوکھی ہوئی ڈالیوں کو جلا کر روشنی کی جاتی تھی۔ جس کی چھت گھاس پھوس کی بنی ہوئی تھی، دوسری عمارت نہ بنوائی۔ جو اپنے ہاتھوں میں کدال لے کر خندق تک کھودنے میں پس وپیش نہ کرتا تھا۔ جو بکریوں کو دُھنا اور کفش دوزی کرنا عار نہ سمجھتا تھا اس کے پیرو تیس سال کے اندر ہی اندر قیصر وکسریٰ کے ہمسر بن گئے۔

محلات کی بنیادیں پڑیں دروازے پر حاجب اور چوبدار مقرر ہوئے خدمت کے لئے لونڈی اور غلاموں کے پرے لگ گئے یہاں تک کہ اسلام مٹنے لگا اور رسول اللہ کی جانشینی کا دعویٰ کرنے والے "سردربار" شراب پینے لگے ماں بہنوں کی تمیز اٹھ گئی دولت وثروت کا دیوتا دلوں پر حکومت کرنے لگا۔ تو غیرت حق جوش میں آئی اور فاطمہ کے گھر سے ایک ایسا مجدد اٹھا جس نے اسلام کی لاج رکھ لی۔ اور مسلمانوں کو جو بے دینی کے غار میں گرتے چلے جا رہے تھے جن کے سروں پر عیش وآرام کا بھوت سوار تھا اپنے نانا کا پڑھایا ہوا سبق یاد دلایا۔ آتش کفر کے وہ شعلے جو خرمن اسلام کو جلانے کے لئے بڑھ رہے تھے۔ سیلاب استبداد کی وہ رَو جو مسلمانوں کی آزادی کو بہائے لئے جا رہی تھی جہالت کی وہ تاریکی جس نے تمام جزیرۂ عرب کو گھیر لیا تھا حسین مظلوم کی عدیم النظیر قربانیوں سے رُک گئی ورنہ امیر معاویہ کے رسوائے زمانہ فرزند یزید نے اپنے باپ دادا کی مٹی ہوئی سنت کو زندہ کرنے اور لات ومنات کے دین کو پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کربلا کی یادگار جنگ تلواروں اور تیروں کی لڑائی نہ تھی بلکہ حق وباطل نور وظلمت کفر واسلام کی نبرد آزمائی تھی۔

ایک طرف بندوں کا بنایا ہوا وہ رہنمائے دین تھا جس کے منھ سے شراب کی بو آتی تھی۔ جس کی حسن پرست طبیعت نے ماں بہنوں کی تمیز اٹھا دی تھی جو بندروں سے کھیلتا تھا اور کتوں کو لڑاتا تھا جس کے اندر لوازمات انسانی کا تو پتہ نہ تھا ہاں شرائط خلافت سیہ کی سب موجود تھیں۔

کہاں تھا عمر ابن العاص جو اس حسین اور نوخیز خلیفہ کی کرشمہ سازیوں کی داد دیتا جس کے "حسن نما پُر فریب" نے عبداللہ ابن عمر جیسے گوشہ نشین کو بھی رام کر لیا۔ ہاں وہ ہاتھ جو یداللہ کی بیعت کے لئے شل ہو گیا تھا یزید کے مصافحہ کے لئے بڑھ گیا۔ وہ سر جو "راس الاسلام" کے سامنے تنا رہا اس میگسار خلیفہ کے سامنے جھک گیا۔ آج معاویہ ہوتا اور اپنے لخت جگر کی ہولی کا تماشا دیکھتا جو آل محمدؐ کے خون سے کھیلی جا رہی تھی۔ آج وہ " اسرار اسلام" جن کی پالیسی تکمیل کی حد تک پہنچائی جا رہی تھی۔ ایک طرف یہ ننگ انسانیت تھا اور دوسری طرف خدا کا منتخب کیا ہوا وہ امام عادل تھا جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ "ملت اسلامیہ" کی خدمت کے لئے وقف تھا جس کا "اسوہ حسنہ" لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرتا تھا۔ جس کو نہ دولت "نہ ثروت" کی تمنا تھی نہ سلطنت وحکومت کی آرزو۔ اس کے لئے اپنے نانا کے روضہ کی مجاوری اور بوسیدہ بوریے کی نشست دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر تھی وہ اپنے بزرگ اور باپ کی طرح خود بھی اپنی روزی اپنے ہی ہاتھوں سے پیدا کرتا تھا۔ وہ دنیا کے دوسرے مذہبی پیشواؤں۔ پیروں اور مرشدوں کی طرح بیت المال کے ٹکڑے کھانے کا عادی نہ تھا قوم کے چندوں پر گذر اوقات نہ کرتا تھا۔ اپنے معتقدوں کی جیبوں پر بار نہ تھا۔ وہ دنیا کے بیکاروں کی تعداد میں اضافہ کرنا اپنی

زندگی کا نصب العین نہ سمجھتا تھا۔ گویا فقیر تھا۔ مگر کوئی سائل اس کے در سے خالی نہیں گیا۔ گو بے زر تھا مگر مدینہ کا کوئی گھر اس کے احسان سے خالی نہ تھا۔

مختصر یہ کہ ایک طرف شر تھا اور دوسری طرف خیر ایک طرف بہیمت تھی اور دوسری طرف انسانیت۔ ایک طرف خانہ ساز خلیفہ تھا اور دوسری طرف منصوص من اللہ امامؑ گویا۔ خدا اور بندہ کے درمیان جنگ تھی۔ بندہ کی قوتِ ساخت اور اللہ کی قوتِ انتخاب کا معرکہ تھا۔ اس جنگ کا انقلاب آفریں نتیجہ تاریخ عالم میں تاقیامت رہے گا۔

دنیا میں بہت سے انقلاب آچکے ہیں انقلاب فرانس جس نے یورپ کے نظام مجلس کو درہم و برہم کر دیا تھا۔ انقلاب روس جس کے شعلے روس سے بڑھ کر تمام عالم پر چھا جانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ اور جس کے خوف سے تمام استبداد پسند قوتیں لرزہ بر اندام ہیں لیکن "حسینی انقلاب" اپنی شان میں بالکل نرالا تھا۔ حسینؑ نے کربلا کی سہ روزہ زندگی میں اپنے اور اپنے مخالفوں کے طرز عمل میں مقابلہ کر کے تمام دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ حق کس طرف ہے اور باطل کا دامن کون پکڑے ہوئے ہے۔ یزید خوش تھا کہ وہ دیار و امصار میں اہل بیت رسول کی تشہیر کر کے ان کی تذلیل کر رہا ہے اسے یہ خبر نہ تھی کہ یہی وہ عمل ہے جس سے آل محمدؐ کے مصائب کی داستان عالمگیر ہوتی جا رہی ہے۔ اور ان کی صداقت کا نقش دلوں پر پائیدار ہو رہا ہے۔ کوفہ و حلب موصل و دمشق کے شہروں میں ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں نے آل محمدؐ کے مصائب کا ڈرامہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور مخدرات عصمت کی جگر خراش اور رقت خیز تقریروں کو سنا تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک اک آگ سی لگ گئی۔ محبت آل محمدؐ کا وہ جذبہ جو استبدادیت کے سبب سے دب گیا تھا پھر ظاہر ہو گیا اور "عشق رسولؐ" کی وہ آگ جو زر پرستی اور سرمایہ داری کی وجہ سے بجھنے لگی تھی پھر بھڑک اٹھی اور اس آگ نے ایک طرف تو "عصیاں سوزی" کا کام دیا اور دوسری طرف بنی امیہ کی آرزوؤں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

خون او تازہ چمن ایجاد کرد
تاقیامت قطع استبداد کرد

دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ سلطنت جس کے خوف سے قیصر روم کے قصر میں زلزلہ پڑ جاتا تھا جس کی ہیبت کے سامنے صنادید عجم تھرا جاتے تھے۔ چند سال کے اندر پاش پاش ہو گئی اور بنی امیہ کا گھر کا گھر ایسا برباد ہوا کہ کوئی نام لینے والا بھی نہ رہا۔ دمشق کا وہ قصر ابیض جس میں کافوری شمعیں جلا کرتی تھیں جو اندر کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ جہاں سلاطین عالم کے سر جھکتے تھے آج ویران ہے۔ اور حسینؑ کا وہ اجڑا ہوا بن جہاں ریگستان کے سوا کچھ نہ تھا آج گلزار بنا ہوا ہے۔ تو کیا اہل بصیرت کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ کافی نہیں ہے۔

كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ

رمز قرآں از حسینؑ آموختیم
ز آتشش او شعلہ ہا اندوختیم
شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیک دور افتادگاں
اشک ما بر خاک پاک او رساں

(از محرم نمبر ۱۳۴۶ھ)

کربلا کا پیغام

(پروفیسر خواجہ اطہر حسین صاحب ایم اے)

اسلامی تعلیمات کے مطابق روز جزا ہر شخص کو اپنی زندگی کے تمام اچھے یا برے کاموں کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اور وہ اسی کے مطابق جزا و سزا کا مستحق ہوگا۔ ہر شخص خود اپنے افعال و اعمال کا ذمہ دار ہوگا۔ ایک کو دوسرے کے بجائے جزا و سزا نہ ملے گی باپ کے اعمال نیک بیٹے کے لئے اور بیٹے کے باپ کے لئے کسی طرح مفید نہ ہوں گے۔ جاہل و عالم و امام مقتدا غرض سب ہی اپنے اپنے اعمال و افعال کے جوابدہ ہوں گے۔ ہاں خدا اپنے فضل سے چاہے تو اپنی مخلوق کے تھوڑے سے عمل نیک کو بہت کچھ شمار کرلے اور اس طرح اس کے گناہوں کی گرانی کو سبک بنادے۔ وہ غفور و رحیم ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ عدل کی نظروں میں ہم جس سزا و جزا کے مستحق ہیں اس سے ہمیں انفرادی سزائیں کہیں ہلکی اور جزائے عمل نیک کہیں زیادہ ملے لیکن ہمیں یوم حساب اپنے اعمال کا تبادلہ دوسروں کے اعمال سے جزواً یا کلیتہً کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

بعض مذاہب میں اس سے مختلف عقیدہ پایا جاتا ہے عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ خود حضرت عیسیٰ صلیب پاکر اپنے پیروؤں کے گناہوں کا کفارہ ہوگئے اور گویا یہ نصاریٰ کی بخشش کے لئے کافی ہے اس عقیدہ کی بنیادی کمزوریوں اور غلطیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بھی اس میں ایک بدیہی خامی یہ ہے کہ یہ عقیدہ لوگوں کو نہ محض اپنے اعمال کی ذمہ داری اور جوابدہی سے اور زیادہ غافل بنادے گا۔ بلکہ وہ انھیں سزا سے بے خوف کرکے ارتکاب گناہ کی ترغیب بھی دے گا۔ یہ خیال صرف اسی نقطۂ نظر سے ناقابل تسلیم ہے کہ اس کے اندر افعال میں بے پروائی اور اخلاق میں کمزوری پیدا کردینے کا رجحان موجود ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ عیسائی مبلغین اس عقیدہ کی مختلف تاویلات کرتے ہیں تاکہ اس پر یہ اعتراض وارد نہ کیا جاسکے۔ متذکرۂ بالا نظریہ غلط یا صحیح ہو دونوں باتوں کا امکان ہے اس لئے کہ خود عیسائی علما اور مبلغین میں اس پر اختلاف ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ عقیدہ صریحاً اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اسلام کھلے لفظوں میں لوگوں کو جزا اور سزا کا یقین دلاتا ہے۔ اسلام اس امر کی علانیہ تردید کرتا ہے کہ کوئی کسی کا کفارہ نہیں ہوسکتا اس طرح کوئی شخص اپنے اعمال کی جزا اور سزا سے غیر مطمئن رہتے ہوئے ارتکاب گناہ پر مصر نہیں ہوسکتا کیونکہ اسے یہ امید نہیں ہے کہ اس کا بوجھ کوئی اور اٹھائے گا۔

یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ اسلام جیسا عملی مذہب کیونکر اس عقیدہ کی اجازت دے سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ عقیدہ تو اچھے کاموں کی ترغیب اور برے کاموں سے بچنے کے خیال ہی کو سرے سے ختم کردیتا ہے۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ ایسی تعلیم اسلام کی فطرت اور اصول کے خلاف ہے۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے اس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسینؑ کی شہادت اور قربانی ان کے ماننے والوں کی بخشش میں کیونکر معین ہوسکتی ہے، ہم شیعیان حسینؑ کا یہ اعتقاد ہے کہ عرب کے ریگستان میں مصائب اور شہادت قبول کرکے حسینؑ نے اپنے نانا کی امت کے لئے ذریعہ نجات مہیا کردیا ہے کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ شیعہ حضرات ایک دوسرے اندرونی راستے سے ایک ایسے اصول کو داخل کررہے ہیں جو خود نفس اسلام کے خلاف ہے اس کا جواب ایک غیر مبہم نفی میں ہے ہم بلا پس و پیش اور بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں۔ کہ نہ کسی شیعہ کا یہ عقیدہ ہے اور نہ دعویٰ۔ کوئی باعقل شیعہ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کبھی اپنے افعال و اعمال کی بنیاد ایسے تسکین بخش مگر خطرناک تصورات پر نہیں رکھ سکتا۔ شیعیان حسینؑ کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ بے مثل مصائب و مظالم جو حسینؑ اور اصحاب حسینؑ

نے برداشت کئے کسی طرح بھی ہمارے ذاتی اور انفرادی گناہوں کا کفارہ نہیں ہو سکتے۔ حادثہ کربلا کسی طور سے بھی اس اصول کو نہیں بدلتا کہ ہر شخص خود یوم محشر اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اسلام ایسے جعلی اور خود ساختہ نظریوں کا کبھی حامی نہیں ہے۔ اگر کوئی شیعہ جہالت یا غلو کے سبب اس عقیدہ کو مانتا ہو تو وہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اسے اپنی قوم کی بھلائی کی خاطر چھوڑ دے ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کیوں کہ کوئی غلط فہمی اس سے زیادہ مہلک افراد بلکہ کل قوم کے لئے نہیں ہو سکتی

ہاں صرف ایک لحاظ سے یعنی جس لحاظ سے ہم اسے مانتے ہیں یہ درست ہو سکتا ہے کہ حسینؑ کی قربانی امت کے لئے وسیلہ نجات بن گئی اور وہ یوں کہ حسینؑ نے باطل کے سامنے سر تسلیم نہ خم کر کے اسلام کو اس کی ابتداہی میں سرے سے مٹنے یا مسخ ہونے سے بچا لیا اور اس طرح سے انھوں نے ہمیں وہ راستہ دکھا دیا جس سے ہم خدا کی خوشنودی حاصل کر سکیں حسین اپنی بے نظیر قربانی اور ایثار کے ذریعہ تمام اسلامی اصول و قواعد کو قیامت تک کے لئے یوں محفوظ کر گئے کہ وہ آج بھی اس تاریک عہد میں انسانیت کے لئے مشعل و سرچشمۂ ہدایت ہیں اسلام انھیں سے زندہ ہے ہماری رہبری کرتا ہے ان اصول و احکام الٰہی پر عمل کرنا ہمارا فریضہ ہے جسے حسینؑ نے اپنے خون کی قیمت دے کر بچا لیا۔ علاوہ بریں ہمارے لئے ان کی مثال اپنی زندگی کے ہر شعبے میں ذمہ داریوں اور فرائض کو انجام دینے میں کارآمد اور مفید ہے۔ حسینؑ ہر لحۂ زندگی میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں حسین نے نہ صرف ہمارے لئے راستہ نجات کو سہل بنایا بلکہ اس پر عمل کر کے عمل کرنا بھی سکھایا۔ انھوں نے رہنمائی کا ایسا چراغ جلا دیا کہ صداقت کی راہ روشن ہو گئی۔ اب صراط مستقیم پر چلنا اور اس بے مثل نمونہ عمل سے سبق حاصل ہم متمسکین بالثقلین کا فریضہ ہے اگر ہم اس اصول پر عمل اور تاسی امام نہ کریں تو حسینؑ کا ایثار ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا اور نہ ہم کو خدا سے نزدیک تر بنانے میں معین ہو سکتا ہے۔ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کی محبت اور ہمدردی میں آنسو بہانا بذاتِ خود ایک بہشت کا پروانۂ جنت ہے یہ درست اور صحیح ہے لیکن مقصد برآری کے لئے لازمی ہے۔ کہ آنسو دلی احساس اور خلوص عقیدت کے سبب نکلیں اور رنج و محبت دونوں میں خلوص ہو محض زبانی اظہار عقیدت ہمیں وہ رفعت نہیں دے سکتا جسے حاصل کرنا ہمارا مقصد حیات ہے بس حقیقی محبت اور پر خلوص ہمدردی کا اثر ہمارے افعال پر ہونا لازمی ہے جس سے ہم میں ان مقدس ہستیوں کے نقش قدم پر چلنے کی دلی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم حسینؑ سے سچی محبت کرتے ہیں کس حد تک صحیح ہے اور یہ کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے کہ ہمارے آنسو میں خلوص ہے اور وہ محض ہنگامی اشتعال کا نتیجہ نہیں۔ اس کا اندازہ ہمارے روز آنہ کی زندگی اور افعال سے ہو سکتا ہے۔ محض آنسو پر خلوص عقیدت کا ثبوت نہیں ہو سکتے اور نہ صرف نمائش کافی ہو سکتی ہے۔

حسینؑ کا مقصد قربانی صرف یہی نہ تھا کہ ہم آپس میں آنسو بہائیں بلکہ اس طریق زندگی کو پیش کرنا تھا۔ جو نجات کا واحد ذریعہ ہے اور وہ محبت جو عمل پر نہ اُکسائے حقیقی محبت نہیں کہی جا سکتی۔ بالآخر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہی اصل چیزیں ہیں اور ہم تنہا اس کے ذمہ دار ہیں اور انھیں پر فیصلہ خداوندی کی بنیاد رکھی جائے گی۔

درحقیقت حسینؑ نے صرف اسلام کی حفاظت کیلئے مصائب شہادت جھیلے اور وہ صرف مذہب اسلام ہے جو انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اسی اصول پر روز قیامت جزا و سزا کا انحصار کرتا ہے اب ظاہر ہے کہ یہ قول کیونکر صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حسین کی شہادت ہمیں عبادت خدا سے منحرف کراتی ہے اور اس مقصد ہی کا خاتمہ کر دیتا ہے جس کے قیام و بقا کے لئے کربلا کا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ یہ تو ایک لغو قسم کا تضاد ہو گا۔ جس کا ذمہ دار تیرہ سو برس قبل کے ذبیحہ فرات کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس لئے ہمارا طرز عمل یہ ہونا چاہئے کہ حسینؑ سے ہم محبت کریں۔ حسین اور ان کے ساتھیوں کے مصائب پر ہمدردی اور خلوص کے آنسو بہائیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ہم صرف اسی طرح کی زندگی گذار کر اپنے محبت و ہمدردی کے جذبہ پر خلوص کی مہر لگا سکتے ہیں جیسی کہ حسین نے گذار دی۔ جیسی زندگی خود خدا کو پسند ہے عبادت کے دن ہمارا فیصلہ خود ہمارے اعمال پر ہوگا نہ ان خدا رسیدہ ہستیوں کے اعمال پر جو ہماری رہبری کے لئے عملی نمونہ بنا کر بھیجی گئیں۔

(محرم نمبر ۱۳۶۱ھ)

خواتین کربلا کے عملی کارنامے

(نوشتہ فاطمہ بنت اسد متعلمہ اُردو مڈل کلاس گورنمنٹ نارمل اسکول لکھنؤ)

(خواجہ اسد اللہ صاحب اسد مرحوم سابق ایڈیٹر سرفراز کی صاحبزادی جنھوں نے یہ مضمون اُسوقت لکھا تھا جب وہ اُردو مڈل اسکول کی متعلمہ تھیں اس کے بعد خواجہ صاحب مرحوم نے اس صاحبزادی کی تعلیم کیطرف انتہائی توجہ کی جب وہ گریجوٹ ہوگئی اور ایل ٹی میں داخلہ لے لیا تو قضا و قدر نے خواجہ صاحب کی ذات کو ہم سے چھین لیا اسی زمانہ میں فاطمہ بنت اسد بھی مرض دق کا شکار ہوگئیں اور باپ کے انتقال کے چند ماہ بعد یہ ہونہار تعلیم یافتہ لڑکی بھی انتقال کر گئی۔ افسوس۔

(مصطفےٰ احسن رضوی ایڈیٹر)

جب سے دنیا دنیا کہے جانے کے قابل ہوئی اور جب سے صفحۂ عالم پر تاریخی نشانات ملتے ہیں، اسوقت سے لے کر آج تک عورتوں کے عزم۔ صبر۔ استقلال۔ ثابت قدمی۔ عفت۔ ہمت۔ حمیت۔ وفا اور ایثار کی وہ مثالیں نہیں ملتیں جو حسینی قافلہ کی خواتین سے میدان کربلا۔ بازار شام اور دربار یزید میں ظاہر ہوئیں۔

عہد ماضی تو ایک تاریک دور سمجھا جاتا ہے آج اس روشنی کے زمانے میں بھی جب کہ طبقۂ نسواں تمام قیود و رسوم سے آزاد ہو کر مردوں کی برابری بلکہ ان سے بھی سبقت لے جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ ہمیں ایسی نسوانی سیرتیں نہیں ملتیں جو خواتین کربلا کے مقابلے میں پیش کی جاسکیں۔

وہ مقدس خواتین جو خاندان نبوت کی تربیت یافتہ تھیں، آغوش رسالتؐ میں پلی تھیں، علیؑ کے تیور دیکھے ہوئے تھیں، فاطمۂ زہراؑ کے ہاتھوں حُسن اخلاق کے زیور سے آراستہ ہوئی تھیں، حسینؑ علم کے سایہ میں مدینہ سے کربلا تک آئی تھیں اُن کی سیرتوں کو غیر معمولی ہونا ہی چاہیے، اگر ان کو نظر انداز کر کے اس گھر کی کنیزوں کو بلکہ ان عورتوں کو دیکھا جائے جن کے دلوں میں محبت اہلبیتؑ کا ذرا بھی شائبہ موجود تھا تو یہ عورتیں بھی ایسی نظر آئیں گی جنھیں آج دنیا کے تاریخ میں مایۂ ناز کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر

قبیلہ بنی اسد کی عورتوں کی فرض شناسی اور جوش ایمانی کو دیکھئے کہ جس وقت فوج یزید کے ڈر سے قبیلہ بنی اسد کے مرد حسینؑ مظلوم اور شہدائے کربلاؑ کی لاشوں کو دفن کرنے سے گریز کر رہے تھے بنی اسد کی عورتوں نے یہ کہہ کر انھیں ہمت دلائی کہ اگر وہ اپنے فرض کو پورا کرنے میں ذرا بھی کوتاہی کریں گے تو ان کی عورتیں میدان میں آجائیں گی اور شہدائے کربلاؑ کی لاشیں جو چالیس روز دن کی دھوپ اور رات کی اوس میں پڑی رہی ہیں سپرد خاک کردیں گی۔

فدا ہوں ہماری جانیں ان عورتوں پر کہ جنھوں نے اپنے عمل سے یہ ظاہر کردیا کہ طبقۂ نسواں باوجود اپنی تمام کمزوریوں اور دشواریوں کے ایمان میں استوار اور قربانی میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

عاشور کی خونیں تواریخ دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں حسینی لشکر کے مردوں نے بے پناہ شجاعت اور استقلال کا ثبوت دیا وہاں عورتیں بھی صبر و رضا کی منزل میں ان سے پیچھے نہیں رہیں۔ جہاں امامؑ نے اصغر معصومؑ کے خون سے اپنے چہرے کو گلگوں بنا کر یادگار زمانہ صبر کا ثبوت دیا، وہاں حضرت رباب نے بھی کچھ کم استقامت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ حسینؑ مظلوم امام تھے بہادری اور صبر کے جوہر سے پورے طور پر متصف تھے لیکن مادر اصغر بے شیرؑ کے ضبط کو دیکھئے کہ اپنے ششماہہ بچے کی شہادت پر راضی رہیں اور مہر مادری پر فرض شناسی کو ترجیح دی۔

اسی کربلا کے میدان میں ایسی مائیں بھی دیکھی گئی ہیں جنھوں نے اپنے عزیز بچے کے سر کو گود میں لے کر رونا نہیں شروع کیا بلکہ اس سر کو جو فدیہ راہ خدا ہوچکا تھا بوسہ دے کر میدان میں پھینک دیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

عاشورہ کی رات کا یہ واقعہ کس سے چھپا ہوا ہے کہ ایک ایک عورت اپنے بچے اپنے بھائی اور اپنے سرتاج کو جنگ کے سامان سے آراستہ کرتی تھی اور کہتی تھی کہ ہم کو رسولؐ کے نواسے سے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دینا۔

کیا ایسی مثالیں کسی مذہب کی کتاب یا کسی تاریخ سے پیش کی جا سکتی ہیں؟ کیا کسی زمانہ کسی ملک، کسی قوم اور کسی مذہب کی عورتوں نے خوشنودیٔ خدا کے لئے اس صبر، اس عزم، اس شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے؟ حضرت زینبؑ کی یادگار شجاعت، اور صبر کو چھوڑ کر اُن خطبوں کو جو آپ نے بازار کوفہ وشام میں ارشاد فرمائے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں کیسے بیش بہا نصائح موجود ہیں اور ان میں دنیا کی حالت پر کتنی تیز روشنی ڈالی گئی ہے۔

حضرت سکینہؑ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے ان برجستہ جوابات کو دیکھیے جو انھوں نے یزید کے مقابلہ میں دئے، آپ کو یہ ماننے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا کہ اس گھر کی عورتیں اور بچیاں بھی اپنے دلوں میں ہدایت کا ایک خزانہ رکھتی تھیں۔

خدا شاہد ہے کہ ان مقدس خواتین اور ان بچیوں نے جن کی غلامی ہمارے لئے باعث فخر ہے عورتوں کی عزت اور بچیوں کے مرتبہ کو چار چاند لگا دیئے اور یہ ثابت کر دیا کہ عورتیں اور لڑکیاں مذہب کے راستہ ایمان کی منزل اور ایثار کی وادی میں کمزور دل ہونے کے باوجود مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہیں۔ بلکہ انھوں نے وہ عملی کارنامے دکھائے جو قیامت تک بچوں اور طبقہ نسوان کے لئے فخر زمانہ کا سبب ہوں گے۔

سلام ہو تم پر اے زینبؑ علیا مقام، اے رباب، اے حضرت رقیہؑ، اے حضرت سکینہؑ اور ان کی کنیز اور ہماری سرتاج فضہؓ کہ تمھارے عملی کارنامے عورتوں اور بچیوں کو ہمیشہ ہدایت دیتے رہیں گے اور دنیا کی تمام عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے فرائض برابر یاد دلاتے رہیں گے۔

زمانہ کی نمائشی تہذیب کتنی ہی ترقی کرے لیکن جس تہذیب کا سبق میدان کربلا کی مقدس خواتین دے گئی ہیں آخر میں اسی تہذیب کو فتح ہوگی اور اسی کے سامنے دنیا کو سر جھکانا پڑے گا۔

(محرم نمبر سنہ ۱۳۵۱ھ)

خان بہادر رشید اولاد حید ر صاحب فوق ملگرامی مصنف فسرح عظیم وغیرہ کواتھ آرہ (مرحوم)

دنیا کے تمام واقعات کا معیار صداقت تاریخ ہے اس سے انکار کرنے والا یا تو حیوان لا یعقل ہے یا پیکر انسانی کی ترکیب مہمل۔ اپنی خصوصیات میں کربلا کے واقعات کی عدیم المثالی دنیا کے مسلمات سے ہے۔ اس کی تاریخ کہاں سے آغاز ہوتی ہے۔ اُس کے متعلق ایک مشہور شعر دُہرا دینا کافی ہے۔ ؎

چہ خوش گفت است تخفے ایں لطیفہ
کہ کشتن حسینؑ اندر سقیفہ

ہم واقعات ماقبل سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ ہم تو اسی وقت سے اس کی تفصیل کو بیان کریں گے جس وقت سے تاریخوں میں اس کے وقوع کے آثار و اسباب قلمبند ہونے لگے ہیں۔ دنیا کی سہل پسند طبیعتیں غور و خوض کرنا نہیں چاہتیں اور جلد سے جلد واقعات کو لفظوں میں پڑھ لینا اور سمجھ لینا پسند کرتی ہیں تفہیم عام کی غرض خاص سے ہم کو بھی یہی طریقہ بیان اختیار کرنا ضروری ہے

جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد ہی سے اہلبیت کرام علیہم السّلام کی ناقدری اور بے وقعتی شروع ہو گئی۔ سیاسی ضرورتوں نے رفتہ رفتہ اس کو اور بہت دے دی۔ لیکن تاہم چالیس برس تک کسی کو ان پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ خلافت رابعہ میں جو ملکی اور سیاسی فتنہ و فساد قائم ہوئے ہیں وہ سب قبیلہ بنی اُمیّہ کی زائل شدہ قوتوں کے بارِ دیگر عود کر آنے کے باعث سے تھے اور حقیقتاً ان کو تقویت پہونچانے اور آلہ کار بنانے کی ضرورت بھی مخالفت اہلبیتؑ کی بنا پر مبنی تھی اور یہ اُس زمانہ کی ایسی ناقابل ترمیم اور فاش سیاسی غلطیاں تھیں جو بالآخر اسلام کے تمام مدعائے تبلیغ و تنظیم کی بیخکنی ثابت ہوئیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ تاریخوں نے ان واقعات ابتدائی کو چھپایا ہے۔ نہیں لکھا ہے اور ضرور لکھا ہے کچھ تو داب سلطنت اور زیادہ تر حفظ عقائد اور تقلید اسلاف کی مصلحت خاص سے ان واقعات کو واقعات کربلا کے آثار و اسباب میں ختم نہیں کیا ہے۔ ہم اس مقام پر نہ اُن کی تفصیل کرنا چاہتے ہیں اور نہ ان کو معرض بحث میں لانا پسند کرتے ہیں۔ اسلیے اُن سے قطع نظر کر کے ہم واقعات کربلا کی تفصیل کو امیر معاویہ کے زمانہ سے شروع کرتے ہیں۔ اہلبیتؑ کی مخالفت میں اسکی گرمی اور سعتدی کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔

بنی ہاشم کا کینہ ان کا نقش سینہ تھا۔ مزید برآں حضرت امام حسن علیہ السلام کے صلحنامہ کی ایک شرط خاص نے اس خاندانی مخالفت میں ایک سیاسی ضرورت کا اور اضافہ کر دیا اور وہ حقیقت میں معاویہ کے لیے ایسا عقدہ لاینحل تھا۔ جو اُسوقت تک ان کے لیے کبھی مفید کار نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ حضرت امام حسنؑ اور امام حسین علیہما السّلام دونوں کا خاتمہ نہ کر لیا جائے

تفصیل یہ ہے۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری کی کتاب الخوارج میں بہ سند قوی محمد بن قدامہ نے ابو بصرہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے حضرت امام حسنؑ کو خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ ہم نے معاویہ سے (اُس کے بعد) اپنی خلافت کے لیے شرط لے لی ہے اور ابن خثمہ عبداللہ ابن شوذب کے طریق سے راوی ہیں کہ جب جناب امیرؑ قتل کیے گئے تو امام حسن علیہ السلام اہل عراق کے لشکر کے ساتھ اور معاویہ اہل شام کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے اور جب دونوں لشکر باہم مل

گئے تو امام حسنؑ نے جنگ کرنا مناسب سمجھا اور معاویہ سے اس شرط پر مصالحت کر لی کہ ان کے بعد خلافت پھر آپ پر لوٹ آئے گی۔ امام لعقبہ کی امامت و سیاست اور استیعاب عبد البر مکی اور حسن میاں صاحب مرحوم پھلواڑی کی "شہادت حسینؑ" کے اسناد سے الفاظ و عبارت صلح یہ تھے کہ معاویہ کے بعد امر خلافت امام حسن علیہ السلام یا جو اہلبیتؑ میں سے باقی ہو گا اسے واپس دی جائے گی۔

ان شواہد تاریخی سے ثابت ہے کہ صلحنامہ میں یہ شرطیں ضرور تھیں۔ اسی وجہ سے حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو خاتمہ تک پہونچا دینے کی ضرورت تھی۔ ان دونوں حضرات کے خاتمہ سے حکومت کے استقرار اور استمرار کی سیاسی ضرورتیں وابستہ تھیں کیونکہ جب تک یہ دونوں مقدس ہستیاں قائم تھیں حکومت کا خاندان اموی سے دودمان ہاشمی میں منتقل ہو جانا شرائط صلح کی رُو سے متوقع بھی تھا اور متیقن بھی۔ اسی بنا پر خواجہ عبید اللہ صاحب امرتسری حنفی ثم القادیانی شرح بخاری کی مندرجہ بالا روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ معاویہ حسب عہد نامہ یزید کو اپنے بعد خلیفہ بنانے کے مجاز نہیں تھے۔ کیونکہ عہد نامہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ معاویہ کے بعد خلافت پھر خاندان نبوت کی طرف عود کرے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ نے اسی عہد کے خوف سے جناب امام حسن کو زہر دلوایا تھا۔ اگر امام حسنؑ میرے بعد زندہ رہے تو حسب عہد نامہ خلیفہ بن جائیں گے اور میرا بیٹا یزید خلافت سے محروم رہ جائیگا

(ارجح المطالب مطبوعہ لاہور ص۲۰۷)

روضۃ الصفا کی بھی اس عبارت سے کہ (معاویہ) بہ تحقیق میدانست کہ این قضیہ (بیعت یزید) با وجود امیر المومنین امام حسن علیہ السلام متمشی نہ خواہد شد لاجرم در دفع آن حضرت شبہا را بروزی آورد۔

بہر حال مروان کے ذریعہ اور جعدہ بنت اشعث کے وسیلہ سے زہر دلوا کر امام حسنؑ شہید کرا دیے گئے تب جا کر اُسے ایک حریف کی طرف سے کسی قدر یکسوئی ہوئی اور ان کے اقرار کے موافق یہ چنگاری بجھ گئی اور ان کے قلب کو استراحت ملی اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔

حضرت امام حسنؑ کا یوں خاتمہ کرا دیا گیا۔ آپ کے خاتمہ پر بیعت یزید کی سلسلہ جنبانی شروع کی گئی لیکن اس کو امام حسینؑ کا وجود بالکل امام حسنؑ کی موجودگی کی طرح دشوار بنائے ہوئے تھا۔ اس غرض سے معٰویہ نے تقیقہ کی پالیسی اختیار کی قتل حسینؑ پر توجرأت نہ کی لیکن تہدید و تخویف شدید کا بھی کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا۔ صاحب روضۃ الصفا نے معاویہ کی ان جوڑ بندیوں کو پوری تفصیل کیساتھ لکھا ہے ہم اس سے صرف امام حسینؑ کی مکالمت پر اکتفا کرتے ہیں۔

معاویہ۔ میں نے قبل اس کے اطراف و جوانب کے تمام شہروں میں خطوط لکھکر تمام مشاہیر اور عمائد ملک و قوم کو بلوایا کہ یزید کی بیعت کریں اور میرے بعد اُس کی حکومت پر راضی ہو جائیں اور میں نے عموماً لوگوں کی رائے کا انتظار کیا۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ یزید کے قوم و عشیرہ کے کثرت سے لوگ ہیں وہ اس امر میں مضائقہ نہیں کرینگے لیکن جب یہ امر تمام اُمت کے سامنے پیش ہوا تو خلاف امید انھیں لوگوں نے بیعت یزید سے انکار کیا جن سے اعتراف و اقرار کی پوری توقع تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یزید سے زیادہ کوئی لائق میری نگاہ میں ہوتا تو میں اسی کو ولی عہدی کے لیے اختیار کرتا۔

امام حسینؑ۔ معاویہ! چپ رہو! ابھی یزید سے بہتر باعتبار حسب و نسب کے بہت سے لوگ موجود ہیں۔

معاویہ۔ تو کیا آپ اپنے لیے حکومت چاہتے ہیں؟

امام حسینؑ۔ اگر میں اس کی خواہش کروں تو تعجب کیا ہے

معاویہ۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے والدین یزید کے والدین سے بدرجہا بہتر ہیں۔ لیکن انتظام سلطنت اور احکام حکومت میں وہ آپ سے زیادہ لائق ہے۔

امام حسینؑ۔ طرفہ ماجرا ہے کہ ایک فاسق ترین کو بہترین امت پر ترجیح دی جائے۔

معاویہ۔ چپ رہیے۔ اگر آپ یزید کے سامنے یہ کہتے تو وہ آپ کی شان میں سوائے کلمہ نیک کے اور کچھ نہ کہتا۔

امام حسینؑ۔ مجھے کیا پرواہ ہے۔ اسلیے کہ میں جو کچھ اسکے متعلق جانتا ہوں کہتا ہوں۔ وہ بھی میری نسبت جو جانتا ہو اُسے صاف صاف کہے۔

معاویہ سے آپ کی اس تقریر کا کوئی معقول جواب بن پڑا۔ آپکو

رخصت کر دیا لیکن خوف و تہدید کے خیال سے چلتے چلتے اتنا گوش گزار خدمت کر دیا۔

یا ابا عبداللہ! بہتر۔ آپ بخیر و عافیت تشریف لے جائیں لیکن اہل شام سے ڈرتے ہیں اور بہتر ہوگا جو کچھ یزید کی شان میں میں نے آپ کی زبان سے سُنا ہے۔ اس کو اہل شام سننے نہ پائیں۔ کیونکہ وہ لوگ آپ اور آپ کے باپ کے ساتھ سخت کدورت و عداوت رکھتے ہیں۔

مدینہ میں بیعت عامہ والے جلسہ میں امام حسینؑ، عبداللہ عباس، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر یہ چاروں حضرات منکرین بیعت بھی شریک تھے۔ ان کے خاموش رکھنے کی جو ترکیب کی گئی وہ بھی سُن لیجئے۔ روضۃ الصفا میں ہے۔

دوسرے دن معاویہ نے تمام صنادید قریش کو بلایا۔ امام حسینؑ، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر بھی تشریف لائے۔ معاویہ بیٹھ گئے خطبہ شروع کیا اور بتدریج مدعائے سخن پر پہونچکر کہنے لگے کہ میں بہت سے لوگوں سے ایسی باتیں سنتا ہوں جن پر مجھے خود اعتبار نہیں کل میں نے سنا تھا کہ امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بیعت یزید پر راضی نہیں ہیں۔ مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا میں نے ان عمائد قریش کو بلایا اور اس امر کا استفسار کیا۔ اُن حضرات نے بڑی مہربانی کی اور خلافت یزید پر اپنی رضامندی ظاہر فرمائی چنانچہ اس راز کا انکشاف انھیں حضرات کے سامنے کرتا ہوں اگر کسی شخص کو اس میں شک ہو تو کھڑے ہو کر بیان کرے۔ اتنا سننا تھا کہ اہل شام کی ایک معتدبہ جمعیت ننگی تلواریں کھینچکر کہنے لگی کہ یہ لوگ (امام حسینؑ وغیرہ) اس مجمع عام کے سامنے بیعت یزید کریں تو خیر۔ نہیں تو ہم لوگ ابھی ابھی ان کو قتل کر ڈالیں گے۔ اس لیے کہ ہمکو یہ پسند نہیں ہے کہ یزید کی بیعت آپ کے پاس خفیہ طور پر کرلیں کیونکہ یزید کی موجودہ شوکت و عظمت کے سامنے ان تین چار آدمیوں کی کیا ہستی ہے۔ اور ان کی نارضامندی کس شمار میں ہے۔ اے معاویہ ہمیں اجازت دے کہ ہم ان چاروں آدمیوں کی گردنیں اڑا دیں۔ اس واقعہ کا ذکر ابن اثیر نے تاریخ کامل جلد ۵ صفحہ ۱۲ میں کیا ہے اور امام سیوطی نے بھی تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے۔

غرضکہ امام حسینؑ کو قتل کرنے کی یہ پہلی کوشش اور پہلا منظر تھا جو معاویہ کے وقت میں آپنے خود براۃ العین مشاہدہ فرمایا لیکن معاویہ اپنے ڈیڑھ سال کی باقیماندہ مدت حیات میں آپ کے قتل پر دوبارہ دو وجہوں سے جرأت نہ کر سکا اول تو اس وجہ سے کہ دنیا پرستانِ قوم و ملک نے اس کثرت سے بیعت یزید اختیار کرلی تھی کہ ان کی لاتعداد کثرت و شمار کے آگے آپ کے ایک ذاتی انکار کی مقدار ایک سیاسی ضرورت کے نقطہ نظر سے کسی طرح قابل اعتنا نہ تھی دوم یہ کہ قتل ظاہری کی تدبیروں کے علاوہ خفیہ ترکیب بھی آپ کے قتل و ہلاکت کے متعلق دشوار معلوم ہوتی تھی۔ اگر معاویہ کچھ اور دن رہ جاتے تو شاید کوئی صورت نکال لیتے مگر وہ اسی حسرت و تمنا میں مر گئے لیکن یزید کے خوب خوب کان بھر گئے۔

قتل حسینؑ تو یزید کے دل سے لگا تھا۔ تخت امارت پر بیٹھتے ہی اپنے اعلان شاہی کے فرمان ہی سے اس کا آغاز کر دیا۔ ولید والی مدینہ کو اعلان شاہی کے ساتھ ہی یہ تاکیدی فرمان بھی بھیجا کہ امام حسین علیہ السلام سے فوراً بیعت لے لی جائے اگر انکار کریں تو اُن کا سر کاٹ کر بھیجدیا جائے (مقتل ابی مخنف) قتل حسینؑ کا یہ دوسرا منظر تھا۔ ولید نے بُلا بھیجا۔ رات کا وقت تھا۔ شہر میں سناٹا ہو چکا تھا۔ آپ چند اعزا کے ساتھ تشریف لے گئے۔ ولید نے پوچھا آپ بیعت یزید کے متعلق کیا کریں گے۔ آپ نے فرمایا۔ میں یزید کی بیعت اختیار نہ کروں گا اس لیے کہ معاویہ نے میرے بھائی کے ساتھ اس شرط پر صلح کی تھی۔ اور قسم کھائی تھی کہ اُس کے مرنے کے بعد مجھے خلافت ملے گی اور وہ ہرگز اپنی اولاد میں سے کسی کو خلیفہ نہ کرے گا اگر معاویہ مر گیا ہے اور اس نے اپنے اس قول و قرار کو پورا نہیں کیا ہے تو "بڑا اہم کام" واقع ہوا ہے۔ کیا تیرا خیال ہے کہ میں یزید کی بیعت کرلوں گا یزید علانیہ جھوٹا اور فسادی ہے۔ ہم جناب رسول خدا صلعم کے اہلبیتؑ ہیں ہم سے ایسی بات وقوع میں نہیں آسکتی (ابو مخنف۔ روضۃ الصفا وغیرہ) طبری کی روایت سے اس واقعہ میں امام حسینؑ کے عدیم المثال اخلاق ثابت ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ولید نے آپ کو بلا کر معاویہ کی خبر مرگ اور یزید کا خط پڑھ کر سُنایا آپ نے مرگ معاویہ کے متعلق الفاظ تعزیت ارشاد فرمائے

اور بیعت یزید کے متعلق کہا کہ شاید تم بھی اس کو مناسب و مستحسن نہ سمجھو گے کہ مجھ سے خلوت میں امور بیعت طے کر لیے جائیں مناسب یہ ہے کہ کل صبح کو جب تمام عماید قریش اکٹھا ہوں، مجمع عام میں امر بیعت کو پیش کیا جائے ولید بولا بہت بہتر مروان ولید کے قریب بیٹھا ہوا تمام گفتگو سن رہا تھا۔ فوراً بول اٹھا" ولید! تو سخت غلطی کر رہا ہے۔ ایسا موقعہ پھر ہاتھ نہ آئے گا حسینؑ گئے تو گئے پھر نہ آئیں گے۔ ان سے فوراً یزید کی بیعت لے لے یا یزید کے حکم کے موافق ان کا سر کاٹ لے"

امام حسین علیہ السلام نے ڈانٹ کر کہا کہ تم دونوں کی اتنی مجال نہیں کہ مجھے قتل کر سکو۔ آپ کی آواز بلند سن کر بنی ہاشم جو باہر موجود تھے۔ اندر چلے آئے اور آپ ان کی ہمراہی میں صحیح و سلامت محلسرائے عصمت میں واپس آئے قتل حسینؑ کی یہ دوسری ترکیب تھی جو مراۃ العین مشاہدہ فرمائی گئی اس کے بعد ہی آپ نے سکونت مدینہ ترک فرمائی اور بال بچوں کو لے کر مکہ میں اس خیال سے آئے کہ حرمت کعبہ کے لحاظ سے کم از کم حفاظت جان اور صورت امان ضرور قائم ہو گی لیکن حسینؑ غریب کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ عین حج کے ایام میں پھر امام حسینؑ کو خاص کعبہ کی عمارت کے اندر اپنے قتل کر دیے جانے کی خبر محقق ہو گئی۔

چنانچہ (مقتل ابومخنف، تاریخ اعثم کوفی اور ینابیع المودۃ) امام قندوزی میں ہے کہ اسی دن (۸ ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ) امام حسینؑ نے طواف بیت اللہ و سعی و تحصیل تحلیل احرام وغیرہ ادا فرما کر اپنے حج کو عمرہ مفردہ سے بدل ڈالا۔ اور مکہ سے عراق کی طرف کوچ فرمایا کیونکہ آپ تمام حج تک وہاں نہیں رہ سکتے تھے اسلیے کہ آپ کو خوف لگا ہوا تھا آپ پر ایسی سختی کی جائے گی جس کی وجہ سے مکہ معظمہ میں اور خاص موسم حج میں فساد واقع ہو گا کیونکہ یزید نے ہمراہی عمر ابن سعد امیر الحجاج شیاطین بنی امیہ میں سے تیس ۳۰ آدمیوں کو قافلہ حجاج کے ساتھ مخصوص اس لیے بھیجا ہے کہ وہ امام حسینؑ کو جس حال سے جہاں پائیں قتل کر ڈالیں قتل حسینؑ کی یہ تیسری ترکیب تھی۔

آپ نے اس انتہا کے اضطراب میں حج کے ارکان کو عمرہ مفردہ سے بدل کر عراق کی طرف کوچ فرمایا یہ تو ظاہر ہے کہ جب خدا کے گھر میں آپ کو تحفظ جان کا اطمینان نہ ہو سکا۔ تو پھر اور کس کے گھر میں یقین ہوتا۔ جان خدا کی خاص امانت ہے اور اس کی حفاظت منجانب اللہ ہر انسان پر واجب ہے لیکن مظلوم حسینؑ کو موجودہ حالت میں اس امانت الٰہی کی حفاظت کے لیے بھی تمام ملک و قوم میں کوئی اور مقام اور کوئی جگہ نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ تاریخ طبری میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے ایسے تنگ وقت میں فریضہ حج کو چھوڑ کر سفر اختیار کرنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں مکہ سے ایک بالشت باہر قتل کیا جاؤں تو یہ امر مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ بقدر ایک بالشت کے میں مکہ کے اندر قتل کیا جاؤں۔ قسم ہے خدا کی اگر میں حشرات الارض میں سے کسی کے سوراخ میں بھی جا بیٹھوں تب بھی یہ لوگ مجھے وہاں سے باہر نکال کر ضرور قتل کر ڈالیں گے اور بخدا مجھ پر ایسا ہی ظلم و تعدی کریں گے جیسا کہ یہود نے سبت میں ظلم و تعدی کی تھی اب اس کے بعد واقعات کربلا کا آغاز ہوتا ہے جس کی تفصیل محتاج بیان نہیں۔ اس لیے کہ تمام دنیا جان چکی ہے اگر سلسلہ کلام قائم رکھنے کی ضرورت بھی مجبور کرتی تو تاہم میں اپنے الفاظ میں بیان کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ ایک غیر مسلم محقق کی تحریر سے اس ذبح عظیم کی تفصیل اور شہادت کی توثیق نقل کر دینا بہتر جانتا ہوں بمبئی ہائیکورٹ کے مشہور و معروف جج مسٹر جسٹس ارنلڈ خوجہ کیس کے فیصلہ میں لکھتے ہیں:" امام حسنؑ کے بعد خاندان رسالت کے سید و سردار امام حسنؑ کے چھوٹے بھائی حضرت فاطمہ اور حضرت علی کے بیٹے امام حسین علیہ السلام باقی رہ گئے۔ اس شجاع اور شریف النسل بزرگ محترم میں اپنے پدر عالی مقدار کے جوہر اوصاف بڑی حد تک مجتمع تھے۔ برادر بزرگوار کے واقعہ شہادت سے گیارہ برس کے بعد مومنین و مسلمین عراق کی متواتر التجا و استدعائے ہدایت اور وعدہائے مدد و حمایت پر مکہ سے کوفہ اس غرض و غایت سے روانہ ہوئے کہ قابل نفرت خاندان اموی سے اپنی خاندانی استحقاقی وراثت واپس لیں اسلیے محض ایک

مختصر سی جماعت کے ساتھ جس میں آپ کی بی بیاں بھی تھیں۔ صاحبزادے تھے اور چند سوار و پیادے تھے کربلا میں داخل ہوئے کربلا اسوقت ایک ویران وادی دجلہ کے مغربی ساحل سے حوالی کوفہ میں ایک دن کی مسافت پر واقع تھا یہاں پہونچکر آپنے اپنے میزبانانِ عراق کی جگہ اپنے دشمنوں کی ایک خوں ریز جماعت تیار پائی۔ فیما بین جو واقعات پیش آئے وہ تمام عالم کے واقعات سے زیادہ دردانگیز اور عبرت خیز ہیں یہ شجاع ترین عالم، فاطمہؑ کا فرزند، علیؑ مرتضیٰ کا جگر بند، رسول اللہ کا لاڈلا نواسہ اپنی شجاعت کے جوش میں جس کی مثال شجاعان عرب کی روایات قدیمہ میں نہیں ملتی اپنی مختصر جماعت کے ساتھ بزدل دشمنوں کی صفوں میں ان کی تیر بارانی اور تیغ زنی کی عین شدت کے عالم میں دھنس پڑا۔ جو اپنی بزدلی اور کم جرأتی کے باعث اس کی تیغ شرربار کے سامنے آنے کی ذرا بھی جرأت و جسارت نہ کرسکے۔

بالآخر اُس کے رفقاء اقربا باری باری سے کام آئے۔ اُسکے بھائی بھتیجے اور بیٹے اُس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہوئے اور سب سے آخر میں وہ خود بھی شہید کرڈالا گیا۔ اس کا باقیماندہ بیٹا اور اسکی بیٹیاں اس کی بہنیں اور دیگر مستورات قیدی بناکر دمشق میں بھیجی گئیں۔ اور اس کے فرزند علیؑ کا سر کاٹ کر اور نیزے پر چڑھاکر مع المحرم کے بازار کوفہ میں تشہیر کیا گیا۔ جب سر اقدس عبداللہ بن زیاد گورنر کے سامنے لایا گیا تو اُس نے اپنی چھڑی سے اس کو حرکت دی یہ دیکھکر ایک معمر صحابی رسول صلعم سخت استعجاب و اضطراب کے عالم میں چلا اٹھا ارے ابن زیاد یہ کیا کر رہا ہے۔ خدا کی قسم میں نے ان لب ہائے مبارک پر لب ہائے رسول صلعم کو بوسہ لیتے دیکھا ہے۔

ان واقعات نے عالم اسلام کے قلوب میں اپنی تاثیر و تسخیر ابدالآباد تک قائم کی ہے۔"

(دیباچہ محمڈن لا بائی مسٹر امیر علی مطبوعہ ٹھیکر اسپنک اینڈ کو کلکتہ

ان واقعات و مشاہدات کو پڑھ کر ہر شخص بآسانی سمجھ لے گا کہ جسطرح امام حسین علیہ السلام تبلیغ اسلام کی ضرورت سے منجانب اللہ اپنی جان دینے پر مامور ہوچکے تھے اسیطرح یزید بھی اپنی سیاسی ضرورتو اور خاندانی مخالفتوں کے دباؤ سے آپ کی جان لینے کے لیے مجبور تھا جس کا سنگ بنیاد امام حسنؑ کو زہر دلواکر اور بمقابلہ امام حسینؑ بیعت یزید کا اقرار اہل اسلام سے لے کر ظلم و جبر سے قائم کیا گیا تھا معویہ مرگیا یزید تخت پر بیٹھا۔ تو امام حسینؑ حی القائم تھے اور امام حسنؑ کے صلحنامہ کے وہ شرائط بھی بجنسہ اپنے مقام پر قائم تھے۔ گویا اصل حقدار مع اپنے جملہ حقوق کے اپنے مقام پر موجود تھا۔ اور جس خوف و اندیشہ کے سبب اتنی ترکیبیں کی گئی تھیں وہ سب تدبیریں عمل میں لائی گئیں، بیت المال مسلمین لٹا دیا گیا۔ وہ ویسا ہی کا ویسا باقی رہ گیا اسی فکر و خیال سے مدینہ کے اول شقہ ہی میں جو یزید کی اعلان شاہی کی غرض سے روانہ کیا گیا تھا قتل حسینؑ کا فوری حکم یزید سے لکھوا کر بھجوادیا۔ کیونکہ یزید نے سمجھ لیا تھا کہ تاخیر کا وقت نہیں التوا و انتظار کا موقع نہیں استمالت و طوالت کی ضرورت نہیں۔ حسینؑ فوراً قتل کردیئے جائیں۔ اور یہ قدیم خدشہ ہمیشہ کے لیے رفع کردیا جائے۔ لیکن امام حسینؑ اسموقعہ کو پہنچ گئے اور حفاظت جان کے خیال سے خانہ خدا میں پناہ گزین ہوئے وہاں بھی قاتل موجود تھے اور اس اہمیت کے ساتھ کہ حرمت کعبہ بھی ضائع ہونیوالی تھی اب حسینؑ کو اپنی جان کی طرف سے پوری مایوسی تھی لیکن حسینؑ کی حقیقت بیں آنکھوں کے سامنے قانون فطرت اور احکام شریعت دونوں پیش تھے اور یہ دونوں محافظت جان کو ضروری قرار دے رہے تھے کہ جان ودیعت خداوندی ہے انسان اس کا امین۔ اس بنا پر آپنے قیام مکہ اور ادائے مناسکات حج کو بھی ترک فرمایا اور کوفہ کی راہ لی راہ میں کوفہ کے تمام مظالم کی خبر ملی اور بھی مایوسی بڑھتی گئی لیکن صبر و استقلال کی قوت قوی ہوتی گئی راہ کوفہ بھی ترک فرماکر ایک غیر معروف راستہ اختیار کیا گیا۔ عندالاستفسار رفقا سے فرمایا کہ میں خود نہیں جانتا کہ کدھر اور کہاں جاتا ہوں آخر مقتل کربلا میں پہونچے فیما بین جو کچھ واقع ہوا وہ خالص اور کامل طور پر آپ کی طرف عہد رسالت اور زمانہ نبوت کا جہاد مدافعانہ تھا اب دنیا پرست اپنی بدعقلی سے اسے پولٹیکل جنگ قرار دے لیں تو یہ ان کی گمراہی تنگ ظرفی اور تنگ خیالی ہے۔

(محرم نمبر ۱۳۴۴ھ)

(پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری - الہ آباد یونیورسٹی)

۸ بینک روڈ - یونیورسٹی بلڈنگس الہ آباد

۲۷ دسمبر ۱۹۵۶ء

مکرمی - تسلیم -

عدیم الفرصتی کی وجہ سے آپ کے گرامی نامہ کا جواب اب تک نہ دے سکا تھا - یہ چند ٹوٹے پھوٹے بے ربط جملے جو میری روح کی گہرائیوں سے نکلے ہیں سپرد قلم کر رہا ہوں نہ جانے کیوں طبیعت کی موج ایسی ہی ہوئی کہ انگریزی میں حضرت حسینؑ کے متعلق لکھوں۔ آپ نے لکھا تھا کہ انگریزی میں بھی اگر میں نے لکھا تو آپ اس کا اردو میں ترجمہ کرالیں گے - کوئی بولی ہو خلوص اور عقیدت کی زبان ایک ہوتی ہے -

میں اس آرزو کے ساتھ اس خط کو ختم کرتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ماتم حسینؑ سے آگے کی منزل میں قدم رکھیں اور شہادت حسینؑ کو دنیا کے ابھارنے کا پیغام سمجھیں۔

خون شہید کا ترے آج ہے زیب داستاں
نعرۂ انقلاب ہے، ماتم رفتگاں نہیں (فراقؔ)

آپ اس خط کو چاہیں تو شایع کر سکتے ہیں اور اسی خط کے نیچے میرے مضمون کا ترجمہ شایع فرما سکتے ہیں۔ اس خط اور مضمون کو لکھتے ہوئے حضرت حسینؑ کی یاد یوں آئی کہ جی بھر آیا۔

آپ کا
رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

حسینؑ کا نام اس وسیع دنیا کے کروروں انسانوں کے لیے آبحیات ہے اس نام نے میری آنکھیں ہمیشہ اشک آلود کر دی ہیں حسینؑ کی بلند اور پاکیزہ سیرت محسوس کیے جانے کی چیز ہے ایسے الفاظ کا پانا آسان نہیں جو ان کے کردار کی عظمت کے مکمل مظہر ہوں یوں تو ان کی سیرت روحانیت اور آنسوؤں کی سب سے زیادہ تابناک روشنی میں کربلا (کرب و بلا) کے اندر جھلک دکھاتی ہے لیکن جو لوگ حسینؑ کی زندگی سے کربلا میں شہادت واقع ہونے کے پہلے سے واقف ہیں ان کے لیے اس زندگی کی بے داغ اور ہمہ گیر پاکیزگی اس کی بشریت، اس کا خلوص اور وقار سچ کی عجیب اور سخت امتحان کے مقابلہ کی طاقت یہ باتیں اتنی نمایاں ہیں کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہر فرد سے بخوشی خراج عقیدت حاصل کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں ایسے ہیرو روز نہیں پیدا ہوا کرتے۔

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسینؑ
چرخ نوع بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ (جوشؔ)

مجھ سے گنہگار انسان کے لیے حسینؑ کے اخلاقی کمالات کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانا غالباً اپنی قابلیت سے بڑھ کر جرأت آزمائی کا مرادف ہوگا وہ دنیا کے بڑے سے بڑے خدا رسیدہ رشیوں اور شہیدوں کے ہم پلہ ہیں ان کا نام اور کام ان کی زندگی اور موت کے واقعات ان نسلوں کی روحیں بیدار کریں گی جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں۔ - کوئی مرثیہ اور کوئی سوانحعمری ان کی سیرت کی عظمتوں کو نمایاں نہیں کر سکتی - خاتمہ میں باادب ایک تجویز اپنے سنی اور شیعہ بھائیوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ دنیا بدل رہی ہے خون اور آگ میں نہا کر ایک نئی بشریت ظہور پذیر ہوگی جو ذات اور عقیدے کی تفریق کا خاتمہ کر دے گی۔ یہ نیا عالم انسانی ایک خاندان ہوگا۔ امام حسینؑ بنی نوع کے لیے جیئے اور مرے - تمام مسلمانوں اور دوسرے عقاید

رکھنے والے تمام انسانوں کو حسینؑ کی شہادت سے زندگی کا سبق لینا چاہئے۔ وہ حسینؑ جن کا دل صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، صرف اپنے خاندان والوں کیلئے نہیں، صرف اپنے معتقد ہمراہیوں کے لیے نہیں بنی نوع انسان کے لیے دھڑک رہا تھا۔ آج سے ہمارا مذہب انسانی برادری ہونا چاہئے آمین۔

(انگریزی سے ترجمہ)

(محرم نمبر ۱۳۷۱ھ)

کربلا تک

ایک مادّی اور تاریخی تجزیہ کی کوشش

(سید احتشام حسین صاحب ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی)

یورپ میں ہیگل نے بہت کچھ فلسفۂ تاریخ پر لکھا تھا لیکن اُس نے سارا زور خیال اور نظریہ پر دیا تھا اور اُس کے فلسفہ میں واقعات اور حادثات کے تعلق مادی زندگی اور خیال کے ربط اور معاشرتی و اقتصادی حالات سے دنیائے عمل میں تبدیلی کو اتنی جگہ نہیں ملتی کہ ہم انسانوں کی تاریخ کے ماضی یا حال کسی کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ اس سے پہلے ابن خلدون وغیرہ نے تاریخی ترجمانی کے نظریے قائم کیے تھے لیکن وہ بھی اتنے ہمہ گیر نہ تھے کہ انسانی اعمال کے اکثر شعبوں پر حاوی ہو سکیں۔

مارکس اور اینگلز نے البتہ انیسویں صدی کے وسط میں ہیگل کے فلسفہ کو پوری طرح سمجھنے کے بعد اسے سر کے بل کھڑا کر دیا، انھوں نے تبدیلی و ترقی کا نیا فلسفہ بتایا ان کا خیال تھا کہ ترقی کے اندر صرف تعمیر ہی کی نہیں بلکہ تخریب کی بھی طاقتیں ہیں۔ تغیرات ایک رائج نظام کو اس کے تمام متعلقات کے ساتھ ایک نئی دنیا میں پہونچا دیتے ہیں جہاں معاشی اور اقتصادی تقاضوں سے نئے تعلقات اور نئے روابط خود بخود قائم ہو جاتے ہیں، انسانی ذہن مادہ کو کام میں لاکر معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حالات کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے کہ اسکا شمار تاریخ کی طاقتوں میں ہونے لگتا ہے، نئے اصول حیات، نئے طبقاتی تعلقات، فلسفیانہ، روحانی اور ذہنی زندگی کی قدروں میں نئی چمک دمک ان تبدیلیوں کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوتی ہے اور بعد میں وہی نئی تبدیلیوں کا سبب بن جاتے ہیں، اسی طرح تاریخ انسانی صرف خیالات اور محسوسات کو مادّی شکل دینے کا نام نہیں رہ جاتا بلکہ خود ملی حالات ہی انسانی دماغ کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں، تجزیے تحلیل اور ترکیب کی پیچیدہ راہوں سے گزر کر تاریخ اپنا فرض پورا کرتی ہے۔ واقعات کے اندر جو تضادی کیفیت ہوتی ہے وہی ایک دوسرے سے ٹکرا کر نئی قدروں کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ اس فلسفے کا پوری طرح ادراک کر لینے سے تہذیب و تمدن کی بہت سی ظاہری و باطنی پیچیدگیاں سمجھ میں آنے لگتی ہیں، واقعات کی رفتار کا احساس ہونے لگتا ہے اور بظاہر غیر مربوط اور بکھرے ہوئے مواد سے صحیح نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔

قبل اسلام کی تاریخ عرب کو اس اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھنا اسلام کے سمجھنے کے لیے بھی ضروری ہے یوں تو عرب کا بہت بڑا حصہ ایک ریگستان ہے لیکن ساحلی اضلاع میں اچھی خاصی تجارت ہوتی تھی فلسطین اور ایران میں تاجروں پر بعض طرح کی پابندیاں عاید ہونے کی وجہ سے افریقہ اور یورپ کی بہت سی تجارت عرب کے راستے سے ہوتی تھی اس تجارت کا اہم عنصر بردہ فروشی تھا تجارت انکے معاشی نظام کو پوری طرح مربوط نہ بنا سکی تھی بلکہ وہ بکھرے ہوئے

قبیلوں کو اور سرداران قبائل کی سرکردگی کی وجہ سے ایک ہی ملک میں بسنے کے باوجود بہت علیحدہ تھے، تاریخ کی رفتار کا تقاضہ تھا کہ وہ اس منزل سے آگے قدم بڑھائیں، اور ان کے اندر کسی طرح کا قومی اتحاد پیدا ہو اس ضرورت کو اسلام نے پورا کرنا چاہا۔ بہت سادہ اور سلجھے ہوئے طریقے پر رسولؐ نے انھیں ایک وحدت میں منسلک کرنے کے لیے قبیلہ پرستی کو ختم کر دینا چاہا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ واقعات کے اندرونی تضاد ہی تاریخ کو آگے بڑھاتے ہیں اور اسی سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ متحدہ عرب کے اسلامی تصوّر نے عربوں کو نئی زندگی کا پیامبر بنا دیا تو اُن کی قومیت میں شہنشاہی اور عسکریت کے آثار بھی آہستہ آہستہ دکھائی دینے لگے۔ اس طرح اگر اسلام کے آجانے سے عربی اتحاد کا خواب پورا ہو گیا۔ تو دوسری طرف ایک ایسی جماعت کا نشو و نما بھی ہوا جو اتحاد اور قوتِ جہادی غلط فائدہ اٹھا کر ایک طرف تو اصلی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کے درپے تھی اور دوسری طرف اپنے قبیلے کی برتری کے سامان مہیا کرنا چاہتی تھی۔ یہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ انقلابات کی رَو میں جھوٹی سچی ترقی کی بہت سی شکلیں نمودار ہوتی ہیں اور وہ انتہائی بے استقلالی سے فائدہ اٹھا کر اپنا راستہ مضبوط بنا لیتی ہیں۔

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام نے عربوں کو مساوات برادری اور ترقی کے وہ خواب دکھلائے جنھوں نے ان میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ یہ تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اسلامؐ نے ساتویں صدی کو بیسویں صدی عیسوی بنا دیا، یا مساوات کی اُن عملی پیچیدگیوں کو ہمیشہ کے لیے حل کر دیا جو آج بھی فلسفۂ معاشرت سے دلچسپی لینے والوں کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی ہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اسلام نے تاریخی طور پر انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہت سے نئے امکانات کا پتہ دے دیا گیا آج ۱۳۰۰ برس پہلے کا یہ خیال قابل قدر نہیں ہے کہ قبیلہ پرستی پر کاری ضرب لگائی جائے اور عرب کے وحشیوں کو ایک حیرت خیز طاقت کا مجسمہ بنا دیا جائے۔ اس اتحاد اور قومیت نے عربوں کے اقتصادی مسائل کو بھی تشنہ نہ چھوڑا۔ یہ صحیح ہے کہ مذہب نے ان پر بہت سی پابندیاں عاید کر کے ان کی بے اعتدال زندگی کو نئی قیدوں میں جکڑ دیا لیکن انھیں دُور تک ایک شاندار مستقبل کا راستہ بھی دکھایا۔ اگر عربوں نے قومیت کے اس نئے جوش میں ملک گیری اور جہانداری شروع نہ کر دی ہوتی بلکہ اپنے معاشی نظام کو تجارت ہی کی ٹھوس بنیاد پر مضبوط کرتے تو وہ اور زیادہ دنوں کے لیے کامیاب رہ سکتے تھے لیکن انھوں نے رسولؐ کے انتقال فرماتے ہی اپنا نظامِ عمل تبدیل کر دیا۔ اُس زمانہ میں سرمایہ داری یا شہنشاہیت کا معمولی تصوّر بھی پیدا نہیں ہوا تھا لیکن ایک مبہم طریقے پر اس کے جو اثرات سوسائٹی میں پائے جاتے تھے اسلام نے انھیں بھی سمجھ لیا تھا، قوم میں عملی مساوات کو مکمل اور کارآمد بنانے کے لیے رسولؐ نے سود خواری کو بالکل ممنوع قرار دے دیا تھا۔ عورتوں کو وہ حقوق دے تھے جو اس سے پیشتر انھیں کسی نظام زندگی میں میسّر نہ ہوئے تھے، آقا اور غلام کے رشتے میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ آزاد تجارت کا اصول جاری کیا گیا تھا، اور غلّہ کی گرانی کے زمانہ میں غلّہ کو آیندہ منافع کی امید پر چھپا کر رکھنا بہت بڑا جرم قرار دیا گیا تھا۔

ان باتوں نے عربوں کے محدود تصورِ حیات کو اُن کے چھوٹے چھوٹے قبائلی مسائل سے ہٹا کر بڑے بڑے ملکی اور اقتصادی مسائل میں تبدیل کر دیا۔ وہ ساتویں صدی عیسوی میں تاریخ کی ارتقا کے راہبر و راہنما تھے اور اگر حالات صحت بخش اور متوازن رفتار سے چلتے پھرتے رہتے تو وہ ترقیاں جن سے اسلامی ممالک آج بھی محروم ہیں کب کی اپنا اثر ڈال چکی ہوتیں۔

بہرحال اسلام کی روشنی کے ساتھ ساتھ کچھ تاریکی بھی قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی کیونکہ اُسے اس کا موقع مل گیا تھا ظاہری اسلام کی آڑ لے کر انقلاب کے حامی بنکر اپنے قدم جما دینے کا موقعہ تھا اور رجعت پسندوں کے لیے اسے ہاتھ سے دینا ممکن نہ تھا۔ عرب میں قبیلہ بنی ہاشم کو بڑی اہمیت حاصل تھی، تجارت شجاعت، دولت، مہمان نوازی حسن۔ ان چیزوں کا ذکر جب آتا تھا، تو بنی ہاشم کے نوجوانوں کا نام ضرور لیا جاتا تھا۔ کئی نسل اوپر بنی ہاشم اور بنی اُمیہ کے خاندان مل جاتے تھے لیکن جب سے تفریق ہوئی تھی۔ اختلافات

بڑھ گئے تھے اور بنی اُمیہ بنی ہاشم کے مخالف ہی نظر آتے تھے۔ ویسے تو عرب کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے مخالفت رکھے، جنگ آزمائی کرے لیکن ان دو قبیلوں کے اختلافات کی نوعیت کسی قدر جداگانہ تھی۔ بنی امیہ جیسے نسلی طور پر عربی خون کی بہت سی لطافتیں کھو بیٹھے تھے اور ان کے اندر دنائت، فریب، احساس کمتری اور دوسرے مرکبات پیدا ہو گئے تھے جو بار بار شکست کھانے والوں کے یہاں لازمی طور پر پیدا ہی ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں سامنے سے مقابل پر حملہ کرنے کے لیے نہیں اُٹھتیں بلکہ وہ بغل سے یا پیچھے سے حملہ کرنے کے متمنی ہوتے ہیں وہ بظاہر خاموش معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کا ہر قدم کسی سازش حکمت عملی کی تکمیل کیلیے اُٹھتا ہے۔ اگر دبی ہوئی قوموں اور نسلوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سمجھ لینے میں کچھ زیادہ دقت نہ پیش آئیگی کہ بنی ہاشم کی ہر ترقی بنی امیہ کی امنگوں کا تابوت بنتی جا رہی تھی۔

انھیں یہ اچھا تھوڑا ہی معلوم ہوتا کہ عبدالمطلب کو سید العرب کہا جائے یا خانۂ کعبہ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں رہیں یا عرب کے دُور دراز کے لوگ جب آئیں تو عبدالمطلب ہی کا پتہ پوچھتے ہوئے آئیں لیکن ہوتا یہی تھا۔ اس خانہ جنگی یا اختلاف کی تاریخ لکھنے کا موقع نہیں ہے لیکن یہ سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دینا ضروری تھا کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے تاریخی اختلافات اختلافات سے ہٹ کر کسی حد تک نفسیاتی بھی بن گئے تھے اور وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ بنی ہاشم کو نیچا دکھایا جائے۔

محمد مصطفےٰ صلعم بھی اُٹھے تو بنی ہاشم کے یہاں سے یہ آخری اور بڑی چوٹ تھی جسے بنی امیہ آسانی سے سہہ نہ سکتے تھے اور جتنی زیادہ طاقت اسلام کے اندر آتی جاتی تھی اتنی ہی زیادہ بنی امیہ کی سازشیں بڑھتی جاتی تھیں وہ اسلام سے اختلاف رکھنے والی طاقتوں کے ساتھ ہوتے جا رہے تھے اور جب حالات ایک خاص نقطہ پر پہونچ گئے تو انھوں نے کھلم کھلا رسولؐ اسلام کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے بنی امیہ کو شکست ہوئی۔ کیونکہ بہرحال اسلام اسوقت تاریخی ترقی پذیر طاقتوں کا مجموعہ تھا اور اُسے بڑھنے سے روک دینا آسان نہ تھا

میدان جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد بنی امیہ کے سرگروہ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ابوسفیان نے اُس انقلاب کا ساتھ دینے کا ارادہ کر لیا جو انکی ذاتی اُمنگوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینا چاہتی تھیں لیکن یہ چیز حقیقتوں سے بعید تھی۔ ابوسفیان نے اپنی خواہشات کے پورا کرنے کے لیے ایک دوسرا راستہ نکالنا چاہا تھا اور اسلام کی ترقی کے ساتھ ہو کر اسی کے اندر ایک ایسا بلاک تیار کرنا شروع کر دیا جو بظاہر اسلام کے مخالف بھی نہ ہو اور اس کا منشا بھی پُورا کر دے ابوسفیان کی زندگی میں تو یہ بات پُوری نہ ہو سکی کیونکہ ایک جانب تو رسولؐ اسلام کی تیز نگاہ اسے دیکھ رہی تھی کہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت نہ جائے جو اسلام کو اسلام ہی کے خلاف استعمال کریں گے اور دوسرے یہ کہ ابھی اسلام کی ابتدا تھی اور سچے سرفروشوں کے سامنے دوسروں کو خدمت کا موقعہ کم ملتا تھا۔ رسولؐ اسلام کی زبردست حکمت عملی یہ تھی کہ بنی امیہ پر زیادہ بھروسہ نہ کیا جائے، اس کی قدر و قیمت اُسوقت پُوری طرح معلوم ہوتی ہے جب ہم بعد میں بنی امیہ کا اقتدار اور اسلام دشمنی دیکھتے ہیں۔

ابوسفیان کے بعد بنی امیہ کی لیڈری معاویہ کے ہاتھ میں پہونچی اور چونکہ وقت کچھ گزر چکا تھا اس لیے وہ نقاب کام نہیں دے رہا تھا جو اسلام کے نام سے چہرے پر لگا ہوا تھا لوگوں نے رسولؐ کی اس پالیسی کو اچھی طرح سمجھا نہ تھا کہ وہ کیوں بنی امیہ پر بھروسہ نہیں کر سکتے اور معاویہ کو شام کی گورنری مل گئی تھی۔ شام اس زمانہ کے لحاظ سے ایک دُور دراز صوبہ تھا اور اتنی دور پر ایک ایسے عہدہ دار کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دینا صحیح راہ عمل نہیں ہو سکتی۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اور دوسرے قبیلے بھی تو اسلام کے مخالف رہ چکے تھے لیکن جب وہ اسلام لائے تو ان پر اعتبار کیا گیا، وہ اسلام کے جاں نثار بن گئے۔ پھر بنی امیہ ہی کیوں قابل اعتبار نہ تھے۔ اس کا جواب اوپر آ چکا ہے۔ بنی امیہ کے یہاں بہت دنوں تک دبے رہنے کی وجہ سے کچھ نفسیاتی پیچیدگیاں ایسی پیدا ہو گئی تھیں کہ وہ نیم شعوری طور پر بنی ہاشم سے بدلہ لیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ کلمہ گو مسلمان ہوتے تو بھی ذہنی طور پر وہ بنی ہاشم سے مخالفت کا

جذبہ ضرور رکھتے اور اس کا ثبوت نہ جانے کتنی جگہ ملتا ہے۔ ابوسفیان کا یہ کہنا کہ خلافت کی گیند سے ہمارے بچے کھیل رہے ہیں، معاویہ کا حضرت عثمان کے وقت تک خاموش رہنا اور حضرت علیؑ کے خلیفہ ہوتے ہی صف آرائی پر آمادہ ہو جانا امام حسنؑ کی موت کی خبر سُنکر نعرۂ تکبیر جوشِ مسرت میں بلند کرنا اور شراب کے نشہ میں جب شعوری طاقتوں پر نیم خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے، یزید کا بدر کے مقتولین کا انتقام کربلا کے شہیدوں سے لینے پر خوشی کا اظہار کرنا یہ باتیں دوسرے قبائل کی زندگی میں نہیں ملتیں۔ پھر یورپ کے مورخین کی شہادتیں بھی ہیں جو صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ بنی امیہ کا برسرِ اقتدار ہو جانا درحقیقت اسلام کی شکست اور ایامِ جاہلیت کے کفر کی فتح تھی۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ بنی امیہ اسلام کی اٹھتی ہوئی رَو کے ساتھ صرف اسلیے ہو گئے تھے کہ مشین کے کسی پُرزے پر قابو پاکر اپنے مصرف میں لائیں گے۔ چنانچہ معاویہ نے شہنشاہیت کا خواب دیکھنا شروع کر دیا اور اس شاہی نظام کی بنیاد ڈال دی جس کا جواز اسلام سے نہیں مل سکتا یہ جگہ بہت پیچیدہ سوالات پیدا کرتی ہے۔ کیا شاہی نظام اسوقت قائم و درست نہ تھا یہ تاریخی طاقتوں کی رفتار کو دیکھتے ہوئے خالص مادی نقطۂ نظر سے ترقی پسندی تھی یا رجعت پسندی؟

تاریخ کے بعض طالب علم جو مادی تضاد کو اس کی پیچیدگیوں میں نہیں دیکھتے شاید یہ کہیں کہ اسلام نے قومی اتحاد کے سانچے میں عربوں کو ڈھال کر ایک شاہی نظام کے لیے راستہ کھول دیا تھا کیونکہ اس اتحاد کی شیرازہ بندی اسی طرح ممکن تھی۔ یہ خیال بالکل صحیح ہوتا اگر بنی اُمیہ نے اپنے دبے ہوئے جذبات کو قومی شیرازہ بندی کے اوپر نہ رکھا ہوتا، اگر انھوں نے صحیح بنیاد پر اسلامی اصولوں کی ترویج، اسلامی مساوات کی تلقین، اسلام کی سادہ زندگی کو اپنا شعار بنا لیا ہوتا، ایک طرح کی شاہی یقیناً اس وقت کچھ زیادہ غلط نہ تھی لیکن شاہی کو قیصر و کسریٰ کی شاہی نہیں اسلام کی سرداری اور سروری ہونا چاہئے تھی۔ یہ بات بہت زیادہ فرق پیدا کرتی ہے کیونکہ معاویہ اور یزید کی شاہی تو بڑے پیمانہ پر ایک قبیلے کی سرداری سے ملتی جلتی تھی اسے اسلام کی شیرازہ بندی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رجعت پسندی کبھی کبھی ترقی کا ظاہری بھیس بھی بدل لیتی ہے لیکن اس کی تہہ میں وہ حقیقت ہوتی ہے رجعت پسندی جس کی ترجمان ہوتی ہے۔ بنی امیہ نے مدتوں دبے رہنے کے بعد جو اُبھرنے کا موقعہ پایا تو خوب کھیل کھیلے اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنی خواہش سروری و حکومت پوری کر لی، بہت جلد بنی امیہ کا زوال ہو گیا کیونکہ ان کی بنیاد عرب کے اتحاد اور قومی شیرازہ بندی پر نہ تھی بلکہ ذاتی ترقی اور شخصی جاہ و حکومت کے اظہار پر مبنی تھی۔

تاریخ بھی اس خیال کی ہمنوا ہے ابوسفیان سے لے کر یزید کے تختِ حکومت پر بیٹھنے تک یہی جذبہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ حضرت علیؑ خلیفۂ وقت تھے۔ لیکن معاویہ نے اُن سے مخالفت شروع کی اور حالات کو تقریباً اسی سطح پر پہونچا دیا جو محمد مصطفےٰ صلعم اور ابوسفیان کے زمانہ میں رہ چکے تھے۔ وہاں بھی مخالفت، مخالفت ہی کے لیے تھی اور شعوری تھی۔ ابوسفیان عربوں کو وہ نظام ملنا نہیں ہونے دینا چاہتے تھے جو محمد مصطفےٰ لائے تھے یا پیش کر رہے تھے، معاویہ عربوں کو حضرت علیؑ کے ہاتھ سے چھڑا لینا چاہتے تھے اور جب حضرت علیؑ کی زندگی میں یہ ممکن نہ ہوسکا تو امام حسنؑ کی زندگی میں اس کی تکمیل کی۔

یہی نہیں کیا بلکہ امام حسنؑ جب خاموشی کی زندگی مدینہ میں بسر کر رہے تھے وہاں سے بھی انھیں ہٹانے کی کوشش کی۔ عوام کیجانب سے بغیر کسی تحریک کے یزید کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنانے کی کوشش میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ یہ باتیں بتاتی ہیں کہ اس جذبہ حکومت کی بنیاد عرب اتحاد یا اسلامی شیرازہ بندی کے تصور پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ بنی امیہ خاندان کی حکومت کا ایک سلسلہ قائم کر کے اس مرکز کو تباہ و برباد کر دینے کا خیال تھا جسے ابوسفیان تباہ کرنے میں ناکام رہ چکے تھے اور جسے پوری طرح معاویہ بھی مکمل نہ بنا سکے تھے یہ کام وہ اپنے بیٹے یزید کے سپُرد کرنا چاہتے تھے اور اس کو اپنی زندگی ہی میں مضبوط بنا دینا چاہتے تھے۔ امام حسینؑ جو نصف صدی سے حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اسلام کی نشو و نما، عروج، تبدیلیوں اور معرکہ آرائیوں سے بے

واقف تھے وہ جانتے تھے کہ کون اسلام کا کتنا دوست ہے اسلیے جب ان کے سامنے یہ مسئلہ یزید کی خلافت یا جانشینی کی شکل میں پیش ہوا تو انھوں نے پسند نہیں کیا، مخالفت بڑھتی چلی گئی کیونکہ معاویہ کا مقصد بغیر بنی ہاشم سے بیعت لیے ہوئے پورا ہو ہی نہ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کام کو نامکمل چھوڑ کر معاویہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ یزید کے پاس معاویہ کی حکمت عملی نہ تھی ایک خوبصورت شوریدہ سر نوجوان زیادہ دیر تک انتظار نہ کر سکا حکم ہو گیا یا تو حسینؑ سے بیعت لو یا ان کا سر حاضر کرو۔

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ معاویہ اور یزید دونوں نے حالات کا غلط اندازہ لگایا تھا تلوار اور زہر، روپیہ اور منصب کا منتر بہت سے لوگوں پر چل جاتا ہے لیکن جو کسی انقلاب کے حامی ہوتے ہیں جن کا راستہ زیادہ روشن، زیادہ تابناک اور زیادہ صحیح ہوتا ہے وہ ان منتروں کا شکار نہیں ہوتے ان کے سامنے سوال اس شکل میں آتا ہے کہ اس اصول کو کیسے بچایا جائے جس کے مٹ جانے کا اندیشہ اور سب کچھ نگاہوں کے سامنے ہو تو اسے یزید کے اس حکم کے ساتھ مفاہمت ممکن نہ تھی اور پھر مفاہمت اور معاہدہ کا انجام امام حسینؑ دیکھ چکے تھے۔ امام حسنؑ اور معاویہ کے درمیان بھی تو کوئی معاہدہ ہوا تھا جس کی ہر دفعہ معاویہ نے توڑ دی تھی معاہدہ اور مفاہمت کا وقت نکل چکا تھا۔ اب حسینؑ نے موت کو ترجیح دی لیکن اس طرح کہ دنیا ان کے مقصد کو سمجھ لے اور یزید کے مدعا کو جان لے۔ اسطرح حادثۂ کربلا کے واقع ہونے تک جو کچھ ہوا اس کا مادی تجزیہ کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہیں۔ بنی اُمیہ اسلام کو اسلام کے خلاف استعمال کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور عربوں کو ان کے تاریخی مشن سے ہٹا کر انھیں خانہ جنگیوں میں اسیر کر دینا چاہتے تھے۔ جس سے وہ بڑی مشکلوں سے نکلے تھے۔ انھوں نے ترقی کی اُس راہ میں رکاوٹ ڈالی جسے اسلام پیش کر رہا تھا۔

(محرّم نمبر سنہ ۱۳۶۱ھ)

امامیہ مشن کی ممبری قبول فرما کر نصرت اہلبیت علیہم السلام کا فریضہ ادا کیجیے

تفصیل چندہ ممبری

		کم از کم		
۱۔ سرپرستان مشن		کم از کم	پانچسو روپیہ یکمشت	
۲۔ مربیان مشن		"	ایک سو روپیہ "	
۳۔ ممبران دوامی	(لائف ممبر)	"	پچاس روپیہ "	یا بدفعات
۴۔ ممبران خصوصی		"	پانچ روپیہ سالانہ	
۵۔ ممبران عمومی		"	ایک روپیہ سالانہ	

سرپرستان و مربیان کی خدمت میں تمام قدیم و جدید رسائل پیش کئے جاتے ہیں۔
ممبران دوامی اور خصوصی کو ممبری کے بعد شائع ہونے والے تمام رسائل بلا طلب و بلا قیمت ارسال ہوتے ہیں اور ممبران دوامی اگر سابق کے رسائل خریدنا چاہیں تو صرف نصف قیمت لی جاتی ہے۔
ممبران عمومی کو بشرط طلب صرف نصف قیمت پر رسائل دیئے جاتے ہیں۔

اپنے اس واحد تبلیغی ادارے کی ممبری قبول فرما کر عنداللہ و عندالرسولؐ ماجور ہو جیئے

الداعی الی الخیر:۔ سید ابن حسن نقوی۔ آنریری سکریٹری امامیہ مشن۔ لکھنؤ

حسینؑ مظلوم پر رونا باعثِ مغفرت ہے

ماہ محرم امشب گردید آشکارا
دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدارا

(مولانا عینی شاہ صاحب حنفی نظامی مؤلف مناقب سیدنا علی علیہ السلام (حیدرآباد دکن))

ہر قوم کا ایک نیا سال اور ہر نئے سال کا ایک نیا دن ہوا کرتا ہے۔ اور یہ نوروز عید کا دن قرار پاتا ہے اس میں خوشیاں منائی جاتی ہیں شادیانے بجا کرتے ہیں۔ مگر ہم مسلمانوں کا نوروز سنہ ۶۱ھ سے صرف رونے دھونے کے لئے پیدا ہوتا ہے اور ہمارے سال نو کی ابتدا غم والم سے ہوا کرتی ہے اور بجائے شادیانوں کے حسینؑ حسینؑ کی صداؤں سے ہلال محرم کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور اس دلدوز واقعہ کی جو ۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ میں ہو چکا ہے۔ سال سال یاد تازہ کی جاتی ہے یہ خونی واقعہ اپنا آپ نظیر جریدۂ عالم پر ہی نہیں بلکہ قلوب میں بھی خونی حرفوں میں کندہ ہے۔ واقعہ کیا تھا۔ متقی بے گناہ معصوموں کا قتل تھا۔ خاندان رسالت کا بھوکے پیاسے مارا جانا تھا۔ یہ دو برابر والوں کی لڑائی نہ تھی۔ دو مساوی الدرجہ حیثیتوں کی جنگ نہ تھی۔ ایک طرف حسینؑ اور ان کے بہتّر تن اور دوسری طرف یزید بادشاہ شام اور اس کے لاکھ ڈیڑھ لاکھ لشکری۔ ایک طرف نونہال باغ مصطفےٰ اور دوسری طرف شجرہ خبیثہ کا عصارہ۔ ایک طرف روح رواں رسول اللہ اور دوسری طرف لشکریاں بنو امیہ، ایک طرف حبیب اللہ اور دوسری طرف عدو اللہ۔ ایک طرف حق وصداقت اور دوسری طرف شیطان اور اسکی ذریت ادھر حسینؑ اسلام پر سے تصدق ہونے کھڑے ہیں اور دوسری طرف یزیدی اسلام کے مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، تاریخ بتا دیتی ہے کہ آخر کیا ہوا۔

سر داد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

اس واقعہ کے عینی شاہد خدا، خدا کے رسولؑ، اولیاء ملائکہ اور نجات تھے۔ اور حسینؑ کی اس فتوت، اور عزیمت کی داد دے رہے تھے۔ خود حضور سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام میدان کربلا میں موجود تھے علیؑ موجود تھے، فاطمہؑ موجود تھیں قاتلوں نے جب سر اقدس کو تن مطہر سے جدا کیا حسینؑ کا خون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن پر گر رہا تھا۔ اور حسینؑ کا سر نانا کی گود ہی میں امت نے اتارا اسی دن اور اسی وقت نانا نے اپنے نواسے کی شہادت کی خبر ادھر مدینہ میں ام سلمہ کو اور ادھر مکہ میں ابن عباسؓ کو پہونچائی۔ ان حضرات نے حضور کو کس ہیبت سے دیکھا تھا۔ زلفیں گرد آلود۔ چہرہ پریشان، لباسِ اقدس خون بھرا اور ہاتھ میں خون سے لبریز شیشہ۔ زار و نزار روتے ہوئے فرماتے تھے امت نے میرے حسینؑ کو میری ہی گود میں قتل کر دیا۔

وہ کون سنگدل ہوگا جو حسینؑ کے اس سانحہ کو سنے اور روئے نہیں۔ مسلمان تو مسلمان ہر انسان اس پر ضرور روئیگا انسان آخر انسان ہے۔ اپنے سینہ میں دل، اور دل میں درد رکھتا ہے ذرا سی ٹھیس لگی اور اس کے آنسو نکل پڑے، ذرا ذرا سی بات پر اُبل پڑتا ہے۔ رونا دھونا بھی بھلا قانون اور ضابطہ کے تحت آسکتا ہے۔ ان فطری جذبات کی روک تھام بھی قانون سے ہو سکتی ہے۔ ادھر انسان نے دنیا میں قدم رکھا اور ادھر دھائیں دھائیں رونے لگا۔ آتے روتا ہے اور جاتے روتا ہے۔ بلکہ زندگی بھر روتے دھوتے ہی رہتا ہے۔ ہزاروں روٹی کے لئے روتے ہیں۔ صدہا بیماری پر روتے ہیں۔ کوئی ایک جوان مرگی پر روتے ہیں۔ لاکھوں نا امیدیوں

پر روتے ہیں۔ دنیا نا امیدیوں کا گھر اور انسان امیدوں کا پتلا۔ بے روئے کیسے گزارے۔ انسان نہ روئے تو کیا پتھر روئیں گے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں

رونا جائز ہے یا ناجائز یہ ہمیں معلوم نہیں مگر اتنا جانتے ہیں کہ قرآن میں رونے والوں کا ذکر خیر ہے واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع ساتویں پارے میں موجود ہے اور ینال واعینهم تفیض من الدمع حزنا مسطور ہے۔ بلکہ منہ بنا کر رونے کا بھی تذکرہ ہے وجاؤ اباهم عشاءً یبکون۔ باپ کا بیٹے کے غم میں روتے روتے اندھے ہونا کا بھی ذکر آیا ہے وابیضت عیناه من الحزن وهو کظیم۔ حضرت آدمؑ برسوں روئے۔ حضرت نوحؑ مہینوں روئے۔ حضرت ابراہیمؑ ہمیشہ روئے۔ حضرت یعقوبؑ چالیس سال روئے۔ حضرت یوسفؑ کنوئیں میں روئے۔ حضرت ایوبؑ ایک عرصہ روئے۔ حضرت یونسؑ روئے۔ اور حضرت ذکریاؑ روئے۔ اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم روئے۔ کوئی جنت کے لئے روئے کوئی مغفرت کے لئے روئے۔ کوئی اولاد کے لئے روئے۔ کوئی صحت کے لئے روئے۔ کوئی خدا کے لئے روئے مگر روئے سارے انسان۔ ہمارے آقا کبھی خدا کے لئے روئے کبھی امت کے لئے روئے۔ کبھی چچا حمزہ کے لئے روئے کبھی نواسہ حسینؑ کے لئے روئے اور اس کی ہمیں ترغیب بھی دی من بکی علی الحسینؑ وجبت له شفاعتی (احمد)

ابوبکر ابن ابی شیبہ نے مصنف میں عبدالرزاق نے مسند میں اور ابن منصور نے سنن میں۔ سیدنا علیؑ سے روایت کی ہے کہ ایک دن حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بے اختیار رو رہے تھے۔ پوچھا تو فرمایا کہ جب سے شہادت حسینؑ کی خبر ہوئی ہے۔ میرے آنسو تھمتے نہیں ہیں۔

بیہقی اور ابو نعیم حضرت ام سلمہ سے ناقل ہیں کہ حضورؐ میرے حجرہ میں یہ حکم دے کر داخل ہوئے کہ کوئی اندر آنے نہ پائے نہ معلوم کہ کیسے حسینؑ اندر چلے گئے۔ میں نے آہ و بکا کی آواز سن کر پردہ اٹھایا دیکھتی کیا ہوں کہ حسینؑ کو پیار کر رہے ہیں اور رو رہے ہیں میں نے عرض کیا خیر تو ہے فرمایا شہادت حسینؑ کی خبر آئی ہے۔ طبرانی معجم میں ام سلمہ سے مروی ہے کہ ایک دن حضورؐ خواب سے اٹھے اور زار زار رونے لگے۔ میں نے عرض کیا خیر تو ہے فرمایا ایک دن حسینؑ کی شہادت ہونے والی ہے۔

ابوبکر ابن ابی شیبہ حضرت ام سلمہ سے راوی ہیں کہ حسینؑ حضورؐ کی گود میں تھے۔ اور حضورؐ انھیں پیار کرتے تھے۔ اور روتے تھے۔ میں نے کہا کیا ہے۔ فرمایا کہ جبرئیل نے ابھی ابھی حسینؑ کے قتل کیے جانے کی خبر دی ہے اور مقتل کی خاک بھی دی ہے جس دن یہ خاک خون ہوگی اس دن سمجھنا کہ حسینؑ قتل ہو گئے۔ میں نے اس مٹی کو باندھ رکھا خدا کی قسم عاشور کے دن یہ خاک خون ہو گئی تھی۔

واقعہ سے پچاس سال پہلے اس ہونے والی بات کو سن کر حضورؐ کا غم و الم کرنا صدہا احادیث سے ثابت ہے مگر عین واقعہ کے روز حضورؐ کا کیا حال تھا۔ ذیل کی حدیثوں سے واضح ہوگا۔

ترمذی، نسائی، حاکم اور احمد ام سلمہ سے ناقل ہیں کہ حسینؑ کے عراق جانے کے بعد سے دن بے قراری اور رات اختر شماری میں کٹتی تھی۔ عاشورہ کے روز ظہر کے بعد میری آنکھ لگ گئی دیکھتی کیا ہوں کہ سرکارؐ پریشان حال زار و نزار تشریف فرما ہیں۔ چہرہ گرد آلود، زلفیں پراگندہ، لباس خون آلود اور ہاتھ میں خون بھرا شیشہ ہے میں نے عرض کیا یہ کیا حال ہے۔ فرمایا۔ صبح سے مقتل حسینؑ میں تھا۔ امت نے میرے حسینؑ کو میرے سامنے ذبح کر دیا۔ یہ خون اسی کا ہے۔

ادھر مدینہ میں مخبر صادق نے یہ خبر دی اور اسی روز اسی وقت مکہ میں ابن عباس کو بھی خبر دی کہ حسینؑ کو امت نے میرے سامنے قتل کر دیا۔

جب حضورؐ کو اس سانحہ پر اتنا غم و الم ہو تو ہم اس کی یاد تازہ رکھیں اور رو بھی چلا لیں تو کون جرم ہے ہر قوم و ملت ایسے واقعات کو ہر سال تازہ کیا کرتی ہے۔

حضرت فاطمہ علیہا السلام نے اپنی سہ ماہہ زندگی حضورؐ کے فراق میں روتے روتے کاٹ دی اور اسی غم میں دنیا سے سدھاریں۔ اور حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے زندگی کے ڈھائی سال کا اکثر حصہ یاد رسول اللہ میں گزار دیا۔ اور حضرت بلال اسی غم رسولؐ میں دنیا سے گزر گئے۔ ایسی بیسیوں مثالیں تاریخ اور حدیث سے بآسانی مل سکتی ہیں۔

ابن سعد طبقات میں شعبی سے ناقل ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا کربلا میں گزر ہوا۔ پوچھا اس نواح کا کیا نام ہے۔ لوگوں نے کہا کہ کربلا ہے۔ یہ سن کر آپ بے اختیار رونے لگے۔

صرف انسان ہی نہیں بلکہ فرشتے اور جنات، آسمان و زمین بھی اس مظلومؑ پر روئے ہیں۔ چنانچہ ابونعیم نے حلیۃ الاولیا میں اصبغ بن نباتہ سے روایت کی ہے کہ سیدنا علیؑ جب کربلا پہنچے تو ہم سے فرمایا کہ یہاں ہمارے ناقے باندھے جائیں گے۔ اس جگہ پر ہمارے خیمے کھڑے ہوں گے۔ یہاں ہمارے بال بچے بے گناہ مارے جائیں گے۔ اور یہاں ہمارے نورِ نظر حسینؑ کی بوٹیاں اڑیں گی اور اس دن ہم پر رونے والے آسمان و زمین بھی ہوں گے۔

ابونعیم یحییٰ حضرمی سے ناقل ہیں کہ مولا بمقام نینوا چیخ چیخ کر فرمانے لگے اصبر یا اباعبد اللہ ہم نے عرض کیا خیر ہے فرمایا زبانِ وحی ترجمان سے سنا ہے۔ کہ یہاں حسینؑ شہید ہوں گے اور اس دن ان پر آسمان و زمین خون روئیں گے۔ بیہقی اور ابونعیم نضرۃ الازدیہ سے ناقل ہیں کہ قتل حسینؑ کے روز آسمان سے خون برسا اور زمین سے اتنا خون اُبلا کہ ہمارے برتن سب خون سے بھر گئے۔ بیہقی نے علی المسہر سے روایت کی ہے کہ ان کی دادی کہتی تھی یوم عاشورہ سے کئی دن تک آسمان سے خون برس رہا تھا۔ اور ابونعیم و بیہقی نے زہری سے روایت کی ہے کہ عاشورہ کے روز ہر پتھر اور درخت کے نیچے سے تازہ خون نکلتا تھا۔

جس دل خراش واقعہ پر رسولؐ روئیں نبیؑ روئیں۔ ولی و وصی روئیں۔ معصوم روئیں۔ زمین آسمان روئیں۔ حیوان اور جن روئیں۔ ہم سنگدل روئیں نہیں۔ جس دل میں ایمان ہو اور ایمان حب محمدؐ کا نام ہی ہے تو ہر شخص جو مسلمان ہے ضرور حسینؑ پر روئے گا۔ کربلا کا لفظ ہی کچھ ایسا دردناک ہے۔ کہ سنتے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اور آنکھ سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں۔ ہاں یزید کے حامی نہ روئیں تو تعجب نہیں۔ ان حضرات نے واقعات پر خاک جھونکنے اور قتل حسینؑ کو سیاسی بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر اصل حقیقت پردۂ مجاز سے ہمیشہ نمایاں ہوتی رہی۔ اور حسین کی صداقت کرسی نشین ہو گئی اور یہ عرس شریف ایسا مقبولِ عام ہو گیا کہ آپ کے نانا، بابا کے اعراس سے بھی بڑھ کر وسیع الاشاعت اور ہر دل عزیز ہو گیا حتیٰ کہ غیر اقوام بھی یہ عرس سال سال منایا کرتی ہیں۔ اور محرم میں ہر ہر گوشہ سے حسینؑ حسینؑ کی صدائیں سنی جاتی ہیں۔ آج کل اس کے روک تھام کی سعی لاحاصل جو کی جا رہی ہے۔ وہ فضول و عبث ہے۔ دل ہی تو ہے سنگ و خشت نہیں۔ ذرا سی بات پر خوش ذرا سی بات پر کدر۔ رونا دھونا فطرت انسانی ہے۔ کوئی کسی بات پر کوئی کسی بات پر روتا ہی رہتا ہے فطرت بھلا کہیں دور ہو سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض صاحبان کو محرم کا رونا ناگوار ہو۔ کیوں کہ اس رونے دھونے اور واویلا مچانے سے حسینؑ کی صداقت اور دشمنوں کی شیطنت ظاہر ہو جاتی ہے اور خواہ مخواہ دشمنان اہلبیتؑ کے نام لوگوں کو معلوم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض مصلحان قوم نے اپنے مضامین میں اس رونے دھونے کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اس کے روکنے کی کوشش کی ہے۔ یہ رونے دھونے والوں کا قصور نہیں بلکہ اس فعل شنیع کے کرنے والوں کا قصور اور جرم ہے جن کی بیجا حمایت میں مصلحین کے قلم آج کل اُٹھ رہے ہیں۔

بعضوں کا یہ کہنا کہ یہ کہاں لکھا ہے کہ مرثیے۔ نوحے سال سال پڑھے جائیں اور رونے رُلانے کی مجلسیں سال کے سال منعقد ہوں۔ ادباً عرض ہے کہ اس کی ممانعت کون سی آیت اور کون سی حدیث سے ہے کہ حسینؑ کے لئے رویا نہ جائے اور ان کے دلدوز واقعات لوگوں کو نہ سنائے جائیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر قوم و ملت اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں کے عرس سالانہ کیا کرتی ہے۔ اس طرح ہم مسلمان بھی اپنے پیشوا حسینؑ علیہ السلام کا عرس مناتے ہیں۔ اور ان پر جو ظلم و ستم روا رکھے گئے۔ وہ لوگوں کو سناتے ہیں، ان پر روتے ہیں۔ اور رلاتے ہیں۔ دور کیوں جائیے حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبح کا واقعہ ہر سال عید الضحیٰ کے موقع پر ہمارے خطبوں میں سال کے سال دوہرایا جاتا ہے۔ اور حسینؑ پر رونے کو منع کرنے والے بھی اس ذبح اسمٰعیل کا قصہ سن کر رو پڑتے ہیں۔ یہ تو یہ رخصت ماہ رمضان پر جمعۃ الوداع میں صدہا مسلمان رمضان کے رخصتی پر رو پڑتے ہیں اور سال سال یہی مرثیہ اور نوحہ مسجدوں میں پڑھا جاتا ہے۔ مسلمانو! یہ کون سا انصاف ہے۔ کہ ذبح اسمٰعیل علیہ السلام کا مرثیہ جائز اور اس پر رونا جائز۔ رخصت رمضان پر نوحہ خوانی جائز اور اس پر آہ و زاری جائز مگر حسینؑ کے قتل کا

تذکرہ ناجائز اور حسینؑ پر رونا دھونا ناجائز۔

صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام پر حضرت ابوبکر الصدیق حضرت مولا مشکلکشاؑ حضرت حسان بن ثابت حضرت فاطمہؑ، حضرت عائشہؓ اور حضرت صفیہ نے مرثئے کہے اور یہ مرثئے اصحاب پڑھتے تھے۔ اور رسولؐ اللہ کی یاد میں رویا کرتے تھے۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ شب وفات پیغمبر صلی اللہ علیہ سلم میں اور شب عاشورہ میں میں نے جنوں کو مرثئے پڑھتے اور روتے سنا ہے۔ حافظ ابن عساکر نے تاریخ میں اور سبط ابن جوزی نے مراۃ الزمان میں لکھا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کربلا سے جب مدینہ واپس آرہے تھے، راستہ ہی سے بشیر ابن جزلم نامی شاعر کو امام مظلوم کا مرثیہ مدینے والوں کو سنانے کے لئے اپنے آگے روانہ فرمایا تھا۔

اس مرثیہ کا پہلا شعر یہ ہے ؎

یا اھل یثرب لا مقام لکم
قتل الحسین فادمعی ابدا

پس حسینؑ مظلوم پر رونا رلانا یہ بھی جائز بلکہ باعث مغفرت ہے۔ من بکی علی الحسین فوجبت لہ شفاعتی (احمد) اور من دمعت عیناہ لقتل الحسین دمعۃ بواہ الجنۃ (احمد)

جواز غم حسینؑ کے لیے مسلمانوں کے پاس کافی دلائل ہیں کسی اور کی نصیحت کی ضرورت نہیں۔

(محرم نمبر ۱۳۵۳ھ)

مظلوم کربلا کا سفر

شہادت امام حسینؑ کے متعلق ایک جرمن فاضل کی تحقیق

(سید نذیر حسین صاحب زیدی از تحصیل صدر گورکھپور)

اکثر معاندین اسلام مظلومؑ کربلا کے سفر کربلا کے متعلق بے سروپا خیالات کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ اس کے متعلق و نیز واقعات کربلا کے متعلق ایک فاضل جرمن نے حال ہی میں اپنی تحقیقات کا اظہار کیا ہے جو کتاب کی صورت میں شایع ہو گیا ہے اس کے تھوڑے حصہ کا ترجمہ مسٹر صلاح الدین خدا بخش نے انگریزی میں کیا ہے۔ فاضل جرمن نے اپنی کتاب میں عربی، لاطینی اور فارسی علمی ذخیروں سے بہترین اقتباسات شایع کئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں انگریزی کے ترجمہ کے کچھ حصہ کا ترجمہ ہمارے محترم جناب شاہ محمد صاحب نے فرمایا ہے جو حسب ذیل ہے۔

پہلا سوال فاضل جرمن نے یہ کیا ہے کہ کیا امام حسینؑ علیہ السلام میدان کربلا میں ملک گیری اور حکمرانی کے لئے لڑ رہے تھے اس کے جواب میں وہ لکھتا ہے کہ حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام صرف بنی ہاشم کے افراد سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنے عہد میں تمام عرب میں اور اس کے نواح میں اپنی عالی نسبی اپنی ذاتی علمی قابلیت اور اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے نہایت مشہور و ممتاز تھے دنیا کا قاعدہ ہے کہ وہ پاک نفوس کی طرف بڑھتی ہے اگر کوئی سلطنت قائم کرنا چاہتے بہت پہلے ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے لیکن حضرت امامؑ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بنی ہاشم کے قدیم دشمن میری مخالفت پر تلے ہیں تو انھوں نے دشمنوں کے دل سے یہ شبہ ہٹانے کے لئے کہ کسی وقت حسن

حکمراں بن بیٹھیں سب سے پہلے خلافت اور حکومت وغیرہ سے دست کش ہونے کا باقاعدہ معاہدہ لکھ دیا۔ افسوس ہے کہ اس پر بنی ہاشم کے دشمن قانع نہ رہے اور سات بار امام مقدس[۲] کو زہر دیا۔ اس کے بعد جرمن مورخ نے اس عہد کی مذہبی اور اخلاقی حالت دکھلا کر ثابت کیا ہے کہ دونوں اماموں[۳] کے ساتھ جو کچھ بھی برا سلوک نہ ہوا ہو وہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ اب یہ امر کہ حضرت امام حسین علیہ السلام میدان کربلا میں ملک گیری کی ہوس میں لڑ رہے تھے یا نہیں اس سے صاف ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اس خیال کے ہوتے تو واقعہ کربلا کے کہیں پہلے کسی نہ کسی قبیلہ پر چڑھ دوڑتے مگر کسی تاریخ سے آپ کی ذات خاص کا حملہ آور ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے اگر ہم بلا تعصب اس زمانہ کے حالات اور واقعات پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت دنیا پرست اور دولت پرست مسلمانوں میں حکومت کی بو آگئی تھی اور امام مظلوم[ؑ] کی ہستی ان کی نظروں میں کھٹک رہی تھی وہ اپنے خیال میں سمجھے کہ ہماری کوششوں میں حریفانہ روکاوٹ ڈالنے والا حسینؑ ہے۔ اگرچہ خود اس مقدس شخص نے کبھی اپنے کسی فعل سے ایسا خیال کرنے کا موقع نہیں دیا۔ مگر جس طرح تاریکی کو روشنی سے خوف رہتا ہے اسی طرح دنیا کے ظالموں اور غاصبوں کو مقدس اور معظم نفوس سے کھٹکا لگا رہتا ہے افسوس ہے کہ اس دھوکے میں بہت سے خدا کے پاک بندے ذبح کر ڈالے گئے اسی دھوکے میں یہودیوں نے حضرت عیسیٰ[۴] کو صلیب پر چڑھایا تھا اور اسی دھوکے میں حضرت ذکریا[۳] کو آرے پر کھینچ دیا تھا۔

دوسرا سوال۔ اس نے یہ قائم کیا ہے کہ کیا حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے دشمنوں سے ذاتی اغراض اور انتقام کے لئے لڑ رہے تھے اس بحث میں جرمن مورخ نے نہایت دلچسپ اور فلسفیانہ بحث کی ہے وہ لکھتا ہے کہ امام مظلومؑ کی زندگانی کا وہ حصہ جو واقعہ کربلا کے پہلے گزرا ہے عام طور سے عرب کے حالات اور واقعات میں محفوظ ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے یہ بات روشن ہے کہ اس قدسی نفس نے کبھی بنی ہاشم کے دشمنوں سے بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ انتقام کی آگ صرف اسی شخص میں بھڑک سکتی ہے جو کسی معاملہ میں کسی سے شکست کھا چکا ہو اور اس شکست اور ذلت کو دفع کرنے کے لئے ایسے رہ رہ کے خیال آتا ہے مگر خود مخالفین کا یہ قول مسلم ہے کہ آپ نے میدان کربلا میں بار بار عاجزی سے فرمایا تھا کہ اچھا مجھے دنیا کی کسی سمت نکل جانے دو اگر اس پر بھی نہیں راضی ہو تو آؤ ہم تم مناظرہ کر لیں جو حق پر ہو وہ فاتح سمجھا جائے اور جو حق پر نہ ہو تو اس کی شکست مشتہر کی جائے۔ کیا یہ واقعہ کسی شخص کے جوش انتقام کو ظاہر کرتا ہے۔ کیا اس سلجھی ہوئی تقریر سے کسی کے غصہ اور حرارت کا پتہ چلتا ہے کبھی نہیں اور ہرگز نہیں۔ اب ہم مورخ کے اس بیان کی تعریف کرتے ہیں اور اس سوال کے جواب میں جو اس نے آخری الفاظ لکھے ہیں اس کو پیش کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام صرف ایک عابد و زاہد شخص نہیں تھے بلکہ وہ امانتیں اور ذمہ داریاں بھی ان میں مستور تھیں جو عرب کے پیغمبر اعظمؐ میں ودیعت کی گئی تھیں جس طرح اس اولوالعزم نبیؐ کو خیال تھا کہ مسلمان قبیلے اور کنبوں کے جھگڑوں سے دور رہیں اسی طرح آپ کے نواسوںؑ میں بھی اس بات کا احساس تھا اور ذمہ داری اس امر سے نہایت درجہ ثابت ہوتی ہے کہ میدان کربلا میں تمام تدبیروں سے تھک کر یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ لوگو یاد کرو کہ میں کون ہوں اور کس کا بیٹا ہوں اور کس کا نواسہ ہوں اور نہ صرف حسب نسب کا ذکر کیا بلکہ اپنے علم و فضل اور آخرت کے اسرار بھی بیان فرمائے کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ امام مظلوم کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا لحاظ تھا کیا ان واقعات سے کہیں بھی انتقام کی بو پائی جاتی ہے۔

تیسرا سوال اور نہایت معنی خیز سوال مورخ موصوف نے یہ کیا ہے کہ کیا حضرت امام حسین علیہ السلام کسی عنوان شائستہ سے اس خونریز جنگ کو اوپر اوپر ٹال سکتے تھے وہ لکھتا ہے کہ قوم عرب کے خصائل اور عادات تمام دنیا سے نرالے تھے وہ لوگ اپنے ایام جاہلیت میں بھی اپنی مہمان نوازی حمیت وغیرہ میں مشہور تھے۔ قوم عرب اس درجہ غیور تھی کہ وہ کسی حالت میں اپنے قبیلے اور خاندان کے روایات اور حکایات کو ترک کرنا نہیں چاہتی تھی وہاں کے ایک شاعر کا قصہ کتابوں میں یوں لکھا ہے کہ وہ کسی جنگل میں ڈاکوؤں سے گھر گیا تھا اور جب وہ اپنی جان بچا کر بھاگنا چاہتا تھا کہ ڈاکوؤں میں سے ایک نے بلند آواز سے پکار کر ایک شعر پڑھا جس میں اس نے اس

خیال کو نظم کیا تھا کہ میدان میں دشمن سے لڑنا ہمارے لڑکوں کا کھیل ہے۔ اور مرنا یا مارنا ہماری بازی کا پہلا قدم ہے غرض جب اس شاعر نے یہ سنا تو وہ پلٹ پڑا اور اس نے لڑ کر اپنی جان دے دی۔ اسی طرح کے بہت سے واقعات ہوئے ہیں۔ ایسے غیور اور بہادر قوم کے افضل ترین قبیلے سے کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ وہ میدان کارزار سے محض جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوگا۔ کبھی نہیں اور ہرگز نہیں حضرت امام حسین علیہ السلام نے چاہا کہ مخالفین انھیں یزید تک لے چلیں تاکہ اتمام حجت ہو جائے لیکن یزیدیوں نے اصرار کیا کہ بغیر یزید کے نام پر بیعت لئے ہوئے آپ کا ایک قدم بھی ہم لوگ اس کی جانب نہ بڑھنے دیں گے۔ اس لئے آپ نے مجبور ہو کر رفقا کو سمجھایا کہ تم لوگ چلے جاؤ میں اکیلے ان لوگوں سے نپٹ لوں گا۔ ہاں جیسی غیور اور باحمیت لوگوں سے امید ہو سکتی تھی ویسے ہی ظہور ہوا کہ کسی نے بھی آپ کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا حتیٰ کہ عورتوں نے بھی آپ کا ساتھ چھوڑنا منظور نہ کیا۔ اب بات اصول حق پرستی کی آگئی ہے۔ امام مظلومؑ دیکھ رہے ہیں کہ ایک دنیا امارت و حکومت کی پرستش میں خدائے واحد کی بادشاہت کو اپنے جور و ظلم سے تباہ کرنے کی فکر میں ہے اور حق و ناحق کی فتح یا شرمندگی کی گھڑی آپہونچی ہے۔ امام مظلومؑ سمجھ رہے ہیں کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو حق کے لئے آگ میں جانا پڑا اور حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھنا پڑا اسی طرح آج مجھے بھی جان دینا ہے۔ لہٰذا انھوں نے ٹھان لی کہ میں اپنے خون سے اسلام کی کھیتی کو سینچوں گا۔ بہرحال امام حسین علیہ السلام نے کوئی دقیقہ اس شر و فساد کے روکنے کے لئے اٹھا نہیں رکھا۔ اگر انھوں نے بیعت کرلی ہوتی تو خاندان رسالت ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو جاتا اور بنی ہاشم کی بزرگی خاک میں مل جاتی۔ اگر امام مظلوم نے یزیدیوں کو اپنا ساتھی مان لیا ہوتا تو پھر اسلام کا ساتھی کوئی نہ رہتا یعنی تکمیل رسالت عرب کے پیغمبر اعظمؐ پر ہوئی اور تکمیل جانبازی امام مقدسؑ کی ذات پر ختم ہوئی۔

چوتھا سوال۔ مورخ نے یہ کیا ہے کہ کیا حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی جماعت کو لڑنے سے روک نہیں سکتے تھے اس کے جواب میں وہ صرف یہ کہتا ہے کہ ان کی جماعت بہت تھوڑی تھی وہ کسی حال میں اپنے امامؑ کو نہ چھوڑ سکتی تھی۔ (زیادہ تر خود انھیں) کے خاندان کے لوگ تھے جو پہلے ہی دشمنوں کی نظر میں کھٹک رہے تھے۔ یہاں تک کہ بعض چھوٹے بچوں کو بھی دشمنوں نے قتل کیا۔ ایک فرد کو بھی زندہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

پانچواں سوال۔ تمام کتاب کی جان ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیا حسینؑ کی لڑائی خدا کے لئے تھی وہ کہتا ہے کہ میں اس سوال کا جواب پورا طرح نہیں دے سکتا۔ میں بس اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر واقعہ شہادت اسلام کی تاریخ میں نہ ہوتا تو غیر مسلم دنیا کو اسلام کی تاریخ اور اسلام کی حقانیت سے دلچسپی نہ ہوتی۔ ایک شخص یکہ و تنہا بالو کے چٹیل میدان میں کھڑا ہے تھوڑے سے رفقا اس کے ساتھ ہیں، زمین و آسمان تک اس وقت کے آنے والے طوفان کے لئے ساکت ہیں اور تمام انسانی ہمدردی کا چشمہ بند ہے ایک انسان اور محض انسان ایسی حالت میں بہت آسانی سے ایک ذرا سی بات مان لینے سے اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن وہ دنیا کی ناپائیدار زندگی کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے وہ اس میدان میں مرجانے کو حیات جاوید سے بہتر جانتا ہے اس کے آگے خدا کا وہ کلام پیش پیش ہے جس میں خدائے برتر فرماتا ہے کہ جو لوگ ہماری راہ میں مارے جاتے ہیں وہ مرتے نہیں اور وہ زندہ رہتے ہیں یعنی ان کی زندگی ایک دوسری شکل میں بدل جاتی ہے اس ربانی کلام پر دل و جان سے یقین کامل کر کے خدا کا مظلوم و مجبور بندہ سر نیاز خم کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ میرے مخالفین زیادہ سے زیادہ میری جان طلب کریں گے اور مجھ سے اپنے خیال کے موافق بیعت لینا چاہیں گے لیکن یہ جنگ کثرت افواج کی نہیں ہے بلکہ اصول و حق کی ہے۔ اسی حالت میں وہ شخص سمجھ رہا ہے کہ حق پرستی اور غیرت و حمیت کا تقاضہ صرف یہی نہیں ہے کہ زبان سے اس کا دعویٰ کیا جائے بلکہ قول کو فعل میں بدلنے کی ضرورت ہے اس لئے بغیر دنیاوی طمع کے ہر شخص تسلیم و رضا کی راہ میں اپنی جان نذر کرتا ہے تاکہ خدا کا کلام سچا ہو اور اس کی مخلوق کے درمیان سے سچائی اور روشنی نہ مٹنے پائے۔ جرمن مورخ اس جگہ نہایت جوش سے لکھتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اگر چاہتے تو یزید کی ماتحتی میں رہ کر بڑی جگہ کے گورنر بن جاتے لیکن انھیں دنیا کی حکومت سے سخت

نفرت تھی اور جو روحانی حکومت کا سلسلہ ان بزرگوں کی دم سے قائم تھا اس کی بلندی نے دنیا کی حکومت کو ہیچ کر دیا تھا اس وجہ سے یزید کی بیعت کرنا کسی حال میں گوارا نہ کیا اگر حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کو مٹا کر اس زمانہ کی دنیا پرستی پر آجاتے تو یقیناً دنیاوی لحاظ سے انھیں کوئی تکلیف نہ پہونچتی لیکن جو شخص دنیا کی حقیقت سے واقف ہو اور خدا کی حکمت اور قدرت کا قائل ہو وہ کبھی دنیا کی عارضی زندگی کو عقبیٰ کی دائمی زندگی پر ترجیح نہیں دے سکتا آخر میں جس نکتے پر تمام بحث کا خاتمہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ

اگر واقعہ شہادت کو یہ عظمت و شہرت نہ دی جائے جو اقوام عالم میں حاصل ہے تو کیا اس سے بنی نوع انسان پر کوئی اخلاقی جرم عائد ہو سکتا ہے، اس بارہ میں وہ کارلائل کی کتاب ہیروورشپ سے انتخاب کر کے یہ دکھلاتا ہے کہ بہادرانہ کارنامے محض ایک قوم یا ایک ملک تک محدود نہیں رہتے بلکہ تمام انسانی برادری کی میراث اور ملکیت ہو جاتے ہیں ان کی وجہ سے آنے والی نسلوں میں سلسلہ شجاعت اور استقامت کا باقی رہتا ہے۔ اس لحاظ سے واقعۂ شہادت پر جس قدر غور اور فکر کیا جائے اسی قدر اس کے اعلیٰ اور عمیق مطالب روشن ہو جائیں گے، دنیا میں موجودہ جنگ سے خونریز کوئی جنگ نہیں ہوئی لیکن مظالم، بیرحمیاں اور ناانصافیاں جس حد تک واقعۂ کربلا میں ہوئیں ان کا عشر عشیر بھی کسی معرکہ میں نہیں ہوا، یہ ہوتا رہا ہے کہ وہ زیادہ مارے گئے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ خون زیادہ بہا۔ لیکن یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ دل اور روح کے پاک اور عزیز ترین جذبات کے ساتھ ایسی بیرحمی جیسی کہ کربلا میں واقع ہوئی ہو۔ ہٹ دھرمی ناانصافی و جور و ظلم اور ہر طرح کی سختی جو میدان میں ان مظلوموں کے ساتھ برتی گئی اس کی دوسری مثال کہیں نہیں ملتی، آج قوموں اور ملکوں کے تشدد اور ظلم کا رونا رویا جاتا ہے آج توپ اور تلوار سے بہادروں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے آج دنیا بہت جلد دیکھنے والی ہے کہ کون حق پر ہے ایسی حالت میں انصاف سفارش کر رہا ہے کہ مظلوم کربلا کی بہادری کو پہلے دیکھ لیں تب اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔ آؤ ہم دیکھیں واقعہ کربلا سے ہمیں سبق حاصل ہوتا ہے جو دوسری اور تاریخ سے نہیں ملتا۔ سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ فاتحان کربلا کو خدا کا کامل یقین تھا اور وہ اپنی آنکھوں سے اس دنیا سے اچھی دنیا کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ اور ایک نتیجہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب دنیا میں تعصب اور غضب وغیرہ بہت ہو جاتا ہے تو خدا کا قانون قربانی مانگتا ہے اس کے بعد سب راہیں صاف ہو جاتی ہیں۔ قومی غیرت و حمیت کا درس ملتا ہے جو کسی تاریخ سے نہیں ملتا۔ (محرم نمبر ۱۳۴۶ھ)

(خانبہادر نواب سید سرفراز حسین خانصاحب مرحوم ایم۔ ایل۔ اے۔ پٹنہ)

دنیا کی چند روزہ زندگی میں نیک نامی نہ حاصل کرنا نعمت خدا کی ناشکری ہی نہیں ہے بلکہ جامۂ اشرف المخلوقاتی کو پرزے پرزے سے چاک کر دینا ہے، اور خلعتِ لقد کرمنا بنی آدم کی بے قدری کر کے عذاب کا مستحق بننا ہے۔ دنیا میں اکثر صاحب فہم انسان ایسے گذرے ہیں جنھوں نے محض رفاہ عام کے لیے اپنے آرام و عیش، اہل و عیال، جان و مال کی مطلق پروا نہ کی اور ہر تکلیف کو آرام، ہر غم کو سرور سمجھ کر میدان ثابت قدمی میں اپنی نظیریں قائم کر گئے، اگرچہ وہ اب دوسرے عالم میں ہیں مگر اپنے ایثار نفس کا اشتہار مثل آفتاب نصف النہار کے چار دانگ عالم میں ایسا جلوہ نما کر گئے کہ ایک عالم کو اخلاق کا سبق دے رہا ہے۔ کیسے کیسے شجاع اور پاک طینت بندگان خدا اپنی نیک نامی کا ثبوت دے گئے۔ اس طرح کہ تمام عالم کو متحیر کر دیا اگرچہ زمانہ رنگ بدلتا رہا مگر ان کا بہادری اور نیکنامی کا تارہ بلند ہی ہوتا رہا۔ اور ہوتا جائے گا۔

ہمارے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفےٰ کی غرض تو یہی تعلیم نیکنامی تھی۔ خود حضرت نے اپنی زبان مبارک سے انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ کے جملہ کو ظاہر فرما کر اور خود عمل کر کے ہر روشن دماغ انسان کو اس طرف منہمک کر دیا۔

حصول دنیا مقصود نہیں ہے۔ زمانے کی رفتار ایک اصول پر قائم نہیں ہے اور اس کے تین فروع ہیں، ۱۔ تہذیب الاخلاق۔ ۲۔ تدبیر منازل ۳۔ سیاست مدن تمام روئے زمین یعنی صحن عالم پر نگاہ کرنے سے ایک بشر ملتا ہے جو اپنے ہر نفع کو چھوڑ کر صرف رضائے خدا اور نفع بندگان خدا کے واسطے یادگار مسلم بن گیا جس کا ہر فعل کوٹ کوٹ کر اخلاق سے بھرا ہوا تھا وہ قطعہ زمین جو ریگ۔ اور پہاڑوں سے محیط ہے۔ چشمے کم ہیں۔ ستمگار کی خونخوار عادت نے وہاں کے لوگوں کے دلوں میں رحم پیدا ہی نہیں کیا ہے۔ اسی وجہ سے صاحب خلق عظیم جناب محمد مصطفےٰ کو خدا نے مبعوث فرمایا۔ اسی حکیم الاخلاق نے جان توڑ کوشش کر کے اخلاق کا سبق دیا۔

اگرچہ آپ کی تعلیم سے کچھ انسان نظر آنے لگے۔ مگر سب سے زیادہ بدرجہ اکمل اس رزمگاہ میں جس نے ناموری حاصل کی اور

جان دیکر شاہراہ اخلاق تمام عالم کو دکھا دی وہ آپ کے بہادر اور جوانمرد عالی ہمت نواسۂ حسینؑ ابن علی ابن ابی طالب ہیں۔ جو اخلاقی دنیا میں تمام صاحبان اخلاق کے سرتاج بلکہ شاہراہ اخلاق کے ہادی بن گئے۔ اگرچہ اکثر صاحبان اخلاق کرم اخلاق میں فرد گزرے ہیں۔ مگر مجموعی حیثیت سے بحالت (نہ معمولی مجبوری) بلکہ پریشانی کی حالت میں جس نے کل اقسام اخلاق پر عملی کارروائی کی وہ سوائے حسینؑ ابن علی کے کوئی دوسرا بشر نہیں گزرا باوجودیکہ لاکھوں دشمنوں کا ہجوم تھا مگر زمام اخلاق آپ کے زبردست ہاتھوں سے نہ چھوٹی اجو مصیبتیں انتہائے سفر میں اور کربلائے معلیٰ میں اس ستم اخلاق پر ٹوٹ پڑیں وہ آفتاب سے زیادہ روشن ہیں ایسے مصائب کے وقت بھی اپنے جد کے دین کی کشتی کے لنگر بن گئے۔ ؎

کٹوا کے حلق کشتیٔ دیں شہ نے روک لی
ہر نہر لہو کی بوند کو لنگر بنا دیا

اس غیر اطمینانی حالت میں بھی ہمارا جوانمرد شہید مظلومؑ ہے جس نے دنیا میں حق پسند قلوب پر گہرا نقش جما دیا۔ کیوں نہ ہو اس کی روشنائی میں فاطمہؑ کا شیر ہی کا خون ملا ہوا ہے۔ قیامت تک یہ نقش نہیں مٹے گا۔ ثبوت ملاحظہ ہو۔ ماہ محرم وہ مہتم بالشان مہینہ ہے کہ جس میں دسویں تاریخ ہمارے شہیدِ راہ خدا حسینؑ مظلوم کی شہادت ہوئی۔ اور اس سانحہ نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اقوام پر اثر ڈالا اور اسلام اور ایمان کے لئے یہ ایسا اشرف المشہور ہے کہ اس مصیبت نے زمین و آسمان کو رلایا، پتھر کا دل خون کر دیا۔ عالم کو درہم برہم کر دیا۔ جن و انس کو ماتم دار بنا دیا۔ عرش سے فرش تک ثریٰ سے ثریا تک از قاف تا قاف یہ مصیبت تاثیر کر گئی اور اس کی وجہ سے ہر شئے آپ کی مسخر ہو گئی ذرہ ذرہ پر آپ کا سکہ بیٹھ گیا ماہ سے ماہی تک زیر نگیں ہو گیا۔ خدائی کارخانے کے مختار حسینؑ مظلوم۔ عجب شہنشاہی حسینؑ کو مظلومیت سے ملی۔ ہر شہنشاہ کی سلطنت زندگی تک رہتی ہے مگر آنکھ بند ہوئی تو پھر کچھ بھی نہ تھا۔ الا دیکھو ہمارے مظلوم شہنشاہ کی کس درجہ کی عظیم الشان سلطنت ہے۔ انوکھی اور نرالی فرمانروائی ہے۔ آج بھی ایک بادشاہ اپنی تاجپوشی کا دربار کرتا ہے تو خزانے کا منہ کھول دیتا ہے۔ پروانے جاری ہوتے ہیں۔ اشتہار دیا جاتا ہے

وہ ایک مرتبہ اور بس۔ مگر ہمارے سلطان کو دیکھئے کہ نہ تو کوئی اعلان کیا جاتا ہے۔ نہ دلاؤ نہ روپئے صرف ہوتے ہیں مگر ہر سال چند بار کئی کئی دربار ہوتے ہیں۔ ۱۰ اور دس محرم ۲۰ ربیع صفر رجب میں ۱۳ شعبان میں پندرہ کو ذی الحجہ میں ۱۸ کو کیسا دربار ہوتا ہے۔ کئی لاکھ آدمی شریک ہوتے ہیں۔ کئی لاکھ گردنیں سلام کے لئے جھکی ہوتی ہیں جناب سلیمان نے انسانی دیو و جن پریزاد سب پر حکومت کی آخر کب تک بس حیات تک۔ ان کے پایۂ تخت کا مقام اب نہیں معلوم ہوتا۔ اور اب ہمارے سلطان کا پایۂ تخت دیکھئے تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزر گیا۔ کہ اس نے اپنا قدم ہمارے درمیان سے نکال لیا ہے یعنی ہم اس دنیا ہی سے چلا گیا ہے اور کسی اور عالم میں اپنی بود و باش اختیار کر لی ہے مگر وہی دھاک ہے وہی اختیارات ہیں اور وہ عرب کی زمین چٹیل ریت کا میدان جہاں آبادی کا نام نہ تھا۔ وہاں ایک یادگار اپنی چھوڑی ہے اللہ اللہ کیا اختیارات ہیں جو پایۂ تخت کے لئے ہو لیا ہے وہ وحشت ناک صحرا غیر آباد مقام مگر کہاں کہاں کے لوگ آتے ہیں متمدن ملکوں سے عجم سے ہند سے، روم سے، چین سے یورپ کے جزائر سے کھینچے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہ کیوں؟ کتابیں دیکھی ہیں۔ حالات سے واقف ہیں اس مظلوم کے اخلاق کا یہ اثر ہے۔ پہلا سفر ہے۔ کعبہ میں حضرت سے کہا جاتا ہے کہ آپ یہیں رہیں مگر آپ کا دماغ روشن تھا۔ انجام سے واقف تھے۔ فرمایا میں نہیں چاہتا کہ میرے یہاں شہید ہونے سے حرمت کعبہ برباد ہو۔ عرض کیا جاتا ہے ایسی حالت ناامیدی میں عورتوں اور بچوں کو کیوں ہمراہ لئے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ کوئی امین نہیں جس کے سپرد کر دوں۔ اور یہ بھی ہم سے مفارقت گوارا نہ کریں گے۔ جب محمد حنفیہ کا زیادہ اصرار ہوا تو فرمایا کہ بھائی خدا کو منظور ہے کہ انھیں اپنی راہ رضا میں اسیر دیکھے۔ اب انصاف فرمایئے کہ حسینؑ نے اپنے علم اور ارادے سے تمام مصائب کو گوارا فرمایا ہر وقت روانگی بار بار فرمایا کہ جسے مرنا ہو وہ میرے ہمراہ چلے۔ اگر وہ سلطنت و ریاست کے طلبگار ہوتے تو بہت بڑا لشکر جمع کر سکتے تھے ہمارے مظلوم حسینؑ نے چونکہ سیاست اسلامی سے بدرجہ اکمل واقف تھے اپنی جان دے کر اپنے نانا کے دین کو اور اسلام کے قاعدوں کو زندہ کر دیا۔

سہ تباہی میں سفینہ آپ کا تھا امت جد کا
یہ کشتی بحرِ خون میں ڈوب کے تہ نے لگائی ہے

کیونکہ۔ نواسے جب نظر آئے پیمبرؐ نے یہ فرمایا
جہاز امت عاصی کے لنگر ایسے ہوتے ہیں

اگر واقعہ شہادت نہ ہوتا اور مادہ بصیرت نہ پیدا ہوتا تو اسلام آج دنیا میں باقی نہ رہتا۔ یہ ثابت ہے کہ چونکہ حسینؑ کا اپنے والد کے شہید ہونے کے بعد اس مطلب عالی کو پورا کرنے کا ارادہ تھا اس لئے آپ نے مدینہ سے اسی بنا پر سفر اختیار کیا کہ مسلمانوں کے بڑے مقامات (مکہ اور عراق) میں پہنچکر ظاہر کر دیں یہ آپ کی سیاست کا مقدمہ تھا۔ باریک بیں نگاہیں غور کریں کہ اگر حسینؑ اپنے علم و ارادے سے اپنا قتل ہونا گوارہ نہ فرماتے تو سامان مہیا ہو سکتا تھا کیونکہ اس زمانے میں حسینؑ محبوب خلائق تھے۔ بلکہ جو لوگ طمع کے ساتھ ہوئے تھے ان سب کو پراگندہ کر دیا تھا۔ اب صرف اپنے خاص اعزا بھائی بھتیجے بھانجے اور بنی عمام اور اولاد اور خالص اصحاب رہ گئے حالانکہ ان مخصوص اصحاب سے بھی کہا کہ ہم کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤ مگر ان لوگوں نے منظور نہ کیا کیونکہ وہ بھی ایسے تھے کہ مسلمانوں کے نزدیک تقدس اور خلالت قدر میں بے مثل تھے اور ان کا حسینؑ کے ساتھ قتل ہو جانا اس واقعہ کی زیادہ عظمت و تاثیر کا سبب ہوا باریک بیں دماغ غور کریں کہ حسینؑ کے کلمات و حرکات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ انھوں نے بحیثیت سیاست اپنی مظلومیت کے ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور یہ بات حد درجہ کی سیاست اور قوت قلب اور اپنے مقصد عالی کو پورا کرنے میں ان کی از خود رفتگی کو ثابت کر رہی ہے حسینؑ نے اپنی زندگی کے آخر وقت میں اپنے طفل شیر خوار کے بارہ میں وہ کام کیا کہ زمانہ کے فلاسفہ کے عقول کو متحیر کر دیا۔

یعنی اس آخر وقت میں ان جانکاہ مصائب کے ہجوم میں ان افکار کثیرہ کے عالم میں اس تشنگی میں، کثرت جراحات میں اپنے مقصد عالی کو پورا کرنے سے چشم پوشی نہ کر کے اپنی بیکسی ثابت کر دی حسینؑ خوب جانتے تھے پیروان یزید اس صغیر مسافر پر رحم نہ کریں گے۔

محض اس غرض سے کہ اپنی مصیبتوں کی عظمت اور شان بڑھا دیں اس اپنے شیر خوار بچہ کو ہاتھوں پر بلند کیا اور اس کے لئے پانی مانگا مگر زبان تیر سے جواب سُنا۔

اور بھی بعض رؤسائے روحانی اور ارباب دیانات گزرے ہیں اور بحالت ظلم قتل ہوئے ہیں۔ اور ان کے قتل کے بعد ہی اور دیا بھی ہوا ہے اور جوشِ انتقام میں تلوار کھینچی ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل میں ہوا ہے۔ حضرت یحییٰ کا قصہ بڑے بڑے تاریخی واقعات میں سے ایک بڑا واقعہ ہے حضرت مسیح علیہ السلام کی شہادت بھی بے نظیر تھی۔ مگر حسینؑ کی شہادت نے سب پر فوقیت حاصل کر لی۔ کیونکہ آنحضرت یعنی حسینؑ کا واقعہ عالمانہ اور حکیمانہ اور سیاسی حیثیت کا ہے حسینؑ نے اپنی جان عزیز دی، اپنے بیٹے بھائی بھتیجے بھانجے اقربا گھر بار سب راہ خدا میں دیا عیال کی اسیری گوارہ کی اور یہ مصائب دانستہ نہیں، ناگہانی نہیں مافوق دیگر نازل ہوئے حقیقی روحانیت اس کو کہتے ہیں۔ اسلام میں تازہ زندگی کی روح آگئی ان سب معاملات پر نظر کرتے ہوئے ہمارے شہید راہ خدا کا یہ حال بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ اخلاق کا پہلو کسی حالت میں نہ چھوٹا۔ اپنے اصحاب باوفا سے فرمایا کہ میں اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں مجھے چھوڑ دو۔ یہ منافقین میرے ہی سر کے طالب ہیں۔ مگر اب تو خالص وفادار ہیں وہ جانا منظور نہیں کرتے۔ تب فرمایا اچھا اپنے ناموس کو یہیں سے جہاں بن پڑے پہونچا دو۔ مگر ان کی عورتوں نے اہلبیت کے ہمراہ اسیر ہونا خوشی سے گوارہ کیا۔ بشیر حزمی کو پانچ بردیمانی دی کہ اپنے چھوٹے بیٹے کو دو۔ اور وہ ملک رے میں جا کر اپنے بڑے بھائی کو قید سے رہا کرے۔ اور ان چادروں کی قیمت دو ہزار اشرفی تھی اب جب امید صلح منقطع ہو گئی تو فرمایا کہ اچھا راہ کھول دو میں دوسرے ملک میں اہلبیت نبی کو لے کر چلا جاؤں۔ مثل رعایا کے عمر کاٹ لوں گا۔ جب یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی تو آسمان کو دیکھا اور آپ راہ مولا میں مرنے کو تیار ہو گئے۔ اس روز جیسا فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا وہ تسلیم و رضا کا ثبوت بدرجہ اکمل دیتا تھا۔ ہاں یہ سب ہے مگر شجاعت حسینی نے دشمنوں کو بھی متحیر کر دیا۔ عاشور کے روز جو شجاعت حسینی دیکھی گئی ہے۔ ابتدائے خلقت سے آج تک صفحہ روزگار پیش نہیں کر سکتا۔ مسٹر جیمس کارکرن اپنی کتاب تاریخ چین میں لکھتے ہیں کہ دنیا میں بہادری کا ذکر ہوتا ہے تو رستم و اسفندیار کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن رستم کو بہادر وہ کہے گا۔ جو تاریخ سے واقف نہیں۔

حسینؑ اور ہم

جناب نجم آفندی مدظلہ

کیا حسینؑ کی عظیم الشان شہادت کا راز چند رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں میں مضمر ہے کیا چالیس روز کی سینہ زنی اور ایک روز کی فاقہ کشی حسین کی عدیم المثال قربانی کا ماحصل ہو سکتی ہے۔

کیا کربلا کے دل ہلا دینے والے تاثرات کی دنیا اس قدر محدود سمجھی جائے۔ کیا حسینؑ اور حسینؑ کے بچوں کا خون صرف اس مقصد کے لئے پانی کی طرح بہایا گیا تھا کہ ایک رونے والا گروہ تیار کیا جائے۔

برائے خدا یہ کونسا فلسفہ ہے کہ حسینؑ اس لئے شہید کئے جائیں کہ حسین پر رونے والے پیدا ہوں

کیا ہماری یہ کاریوں کے دفتر دھونے کے لئے حسین کے خون کی ضرورت تھی۔ کون ہے جو ان سوالوں کا جواب اثبات میں دے سکتا ہے۔

حسینؑ کو کیوں شہید کیا گیا
حسینؑ دنیا سے کیا چاہتے تھے
حسینؑ سے دنیا کیا چاہتی تھی
حسینؑ نے یہ قربانیاں کیوں گوارا کیں

کیا صرف حسین پر رونا حسین کی محنت کا صحیح اعتراف ہے۔ حسینؑ کے کروروں ماتم داروں میں کتنے فرد ہیں جنھوں نے کبھی ان مسائل پر غور کرنے کی زحمت برداشت کی ہے۔ یہ دو چار سوال ہیں جن پر اس شہید اعظم کی یادگار میں قلم اٹھانے کی جرأت کر رہا ہوں۔ حسین کو کیوں شہید کیا گیا۔ یہ کوئی راز نہیں ہے نہ کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر بڑی بڑی مبسوط کتابیں لکھنے کی ضرورت ہو حسینؑ کے قبضہ میں کوئی سلطنت نہ تھی جس کیلئے کسی حکومت کے خلاف تلوار اٹھائی گئی تھی نہ کوئی پوشیدہ ریشہ دوانی کی گئی۔ حسینؑ ایک اچھے آدمی ہو کر رہے۔ یہی ان کی شہادت کا قوی سبب تھا۔ اگر حسینؑ معاذ اللہ برے ہو سکتے، برے بنائے جا سکتے، تو حکومت کی تلوار ان کی گردن سے دور رہتی۔ مجھے کوئی پیچدار بات کہنی نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہوں گا سادہ لفظوں میں اور سامنے کی بات جس کے لئے نہ قلم کی معرکہ آرائی درکار ہے نہ منطقی دلائل۔ حسینؑ دنیا سے کیا چاہتے تھے۔ حسینؑ دنیا سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے تھے۔ دنیا کے پاس حسینؑ کے قابل کچھ نہ تھا۔ حسینؑ کے پاس وہ سب کچھ تھا جو دنیا کے پاس نہ تھا اور جس کی دنیا کو ضرورت تھی۔ حسینؑ انسان کو صحیح معنے میں انسان دیکھنا چاہتے تھے۔ حسینؑ سے دنیا کیا چاہتی تھی۔ یہ کہ حسین بھی ہم میں سے ایک فرد ہو جائیں۔ حسین کی ہستی صرف قول سے ہی نہیں عمل سے بھی یہ بتاتی تھی کہ خدا ہے اور یہ خطرناک تھا ان لوگوں کے لئے جن کی مصلحت یہ چاہتی تھی کہ خدا نہیں ہے۔ کہاں یہ جذبہ کہ ہمارے لئے سب کچھ ہو کہاں یہ تعلیم کہ سب کے لئے ہو خواہ تمہارے لئے کچھ نہ ہو۔ حسین شہ نشینوں کو محراب عبادت بنانا چاہتے تھے لوگ کہتے کہ محراب عبادت میں درجے قائم کر رہے تھے۔ مساوات کا لفظ بھی ان لوگوں کے لئے تلخ تھا جنکی زبانوں کو چٹخارے لینے کی عادت تھی جن کی گردنیں بلند تھیں جنکے معدے بھرے ہوئے تھے جن کا مقولہ تھا تم باغ لگاؤ ہم پھل کھائیں۔ حسینؑ ان کو گلے سے لگا کر جن کی نحیف گردنوں پر لوگ سوار تھے۔ اسلام کی اس تعلیم کو یاد دلاتے تھے جس کے بھلانے کی کوششوں میں پچاس برس کا طویل زمانہ صرف کیا گیا تھا۔

امن و امان کے شہزادے حسینؑ کی خاموش جد و جہد خون کی بارش اور تلواروں کی جھنکاروں سے نہ بدلتی اگر حسینؑ سے یہ نہ چاہا جاتا کہ تم بھی تصدیق کر دو جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ حق ہے۔

"حسینؑ نے یہ قربانیاں کیوں گوارا کیں" اس لئے کہ کسی قوم کے احساسات جب مردہ ہو جاتے ہیں تو جان دے کر زندہ کئے جاتے ہیں تم محکوم بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہو جو ہم دیں وہ لے لو۔ غنیمت ہے کہ ہم تمکو اس فضا میں سانس لینے دیتے ہیں جس میں ہم سانس لے رہے ہیں

ہماری آنکھوں سے دیکھو۔ ہمارے کانوں سے سنو اور ہماری زبان سے بولو۔ اس ماحول اور آب و ہوا میں پرورش پائے ہوئے لوگوں کی اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا۔ حسینؑ آنے والے خطرے سے آگاہ تھے اور اگر مافوق العادت قوت سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو آثار و قرائن بتا رہے تھے۔ کہ وہ ہونے والا ہے جو ہوا۔ حسینؑ کے پاس وقت بھی تھا۔ اور راستے بھی کھلے ہوئے تھے صرف عراق کا راستہ نہ تھا۔ ممکن تھا کہ حسینؑ عرب کے حدود سے نکل جاتے

لیکن یہ حسینؑ نے نہیں کیا۔ حسینؑ اگر منجانب اللہ ہدایت خلق کے لئے مامور نہ بھی ہوتے۔ تب بھی دو بڑے سبب تھے کہ وہ اس قربانی کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔

قوم جو بگڑ رہی تھی وہ حسینؑ کے نانا کی بنائی ہوئی تھی۔ یہ بھی نہ ہوتا جب سقراط خلق اللہ کی خدمت کے لئے زہر کا جام پی سکتا ہے تو حسینؑ تو پھر حسینؑ تھے"۔ مدینہ میں بیٹھ کر موت کا انتظار نہیں کیا بلکہ کربلا تک استقبال کیا۔ یہ حسینؑ کا تدبر تھا کہ انھوں نے اپنی شہادت کے لئے کربلا کو پسند کیا کچھ لوگوں نے ہمدردی سے حسینؑ کو روکا تھا کہ مدینہ نہ چھوڑیں لیکن حسینؑ جانتے تھے کہ بغرض محال رسولؐ کے روضہ کا احترام بھی کیا گیا (جس کے بظاہر کوئی آثار نہ تھے) تو زہر کا پیالہ تیار ہو سکتا تھا۔ مدینہ کی مسجد موجود تھی۔ کسی ابن ملجم کا مل جانا بھی ناممکن نہ تھا۔ اور قطامہ بھی دستیاب ہو سکتی تھی۔ اور پھر تاریخ صرف دو لفظوں میں حسینؑ کی شہادت کا تذکرہ کر کے خاموش ہو جاتی اور حسینؑ اپنی شہادت سے جو کام لینا اور جو اثر پیدا کرنا چاہتے تھے وہ نہ ہوتا۔ اثر پیدا کرنا مقصود تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ قوم یہ فیصلہ کر سکے کہ حسینؑ حق پر تھے اور یزید ناحق پر۔ عالمگیر اثر قائم کرنا تھا۔ یعنی ایسی حکومت کے خلاف جو آزادوں کو غلام بنا رہی تھی۔ قوم کی تباہی اخلاق کے ذمہ دار اور اپنی مصلحتوں کے ماتحت اس تباہی و بربادی کے تکملہ کی کوششوں میں سرگرم تھی، وہ جذبات جنھیں غیرت و حمیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو قوموں کو ابھارتے ہیں بتدریج فنا ہوتے جا رہے تھے۔ لوگ بھول چلے تھے کہ آزادی ہمارا فطری حق ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلام نے یہی سکھایا تھا۔ حسینؑ کی شہادت نے یہ بتا دیا بلکہ ذہن نشین کر دیا کہ اسلام نے کیا سکھایا تھا۔ اب تم کتنی ہی ہیبت پھیلاؤ دیکھنے والے اسلام کو حسینؑ کی روشنی میں دیکھیں گے کیا صرف حسینؑ پر رونا حسینؑ کی محنت کا صحیح اعتراف ہے۔

میرا اصل موضوع یہی ہے۔ اور مجھے اسی کے متعلق کچھ کہنا ہے اگر قوم ٹھنڈے دل سے اس سوال پر غور کرے "کیا صرف حسینؑ پر رونا حسینؑ کا صحیح اعتراف ہے" تو بہت مشکل ہے کہ فیصلہ "ہاں" پر ہو سکے ان خیالات کی ترتیب کے دوران میں مجھے محترم ایڈیٹر سرفراز کا عنایت نامہ ملا۔ جس میں موصوف نے محرم نمبر کے مضمون کی فرمائش کرتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمایا ہے

کہ مضمون مطلوبہ میں حسینؑ کے کیریکٹر پر روشنی ڈالی جائے تاکہ ہم اسے غیر اقوام کے سامنے پیش کریں موصوف کا خیال بہت اچھا ہے لیکن دل دکھتا ہے اور غیرت آتی ہے یہ سوچتے ہوئے کہ خود ہم نے حسینؑ کی ماتمدار قوم نے حسینؑ کے کیریکٹر کا کیا اثر لیا ہے مگر یہ "حسینؑ" کا نام سن کر رو دو لیکن حسینؑ کے عمل اور ان توقعات سے جو حسینؑ کے نام سے وابستہ ہیں کوئی سروکار نہ رکھو۔ مجلسوں کو شاعری کا میدان۔ دلچسپ شاعرانہ سلیس تقریروں کا مرکز سوز خوانی اور نوحہ خوانی کا دنگل بنا دو۔ یہ حسینؑ کی قربانیوں کا ماحصل ہے جس قوم میں اتنا بڑا اور اہم واقعہ ہو جائے جو ایک عالم کو دعوت عمل دے رہا ہو۔ تاریخ جس کی نظیر نہ پیش کر سکے۔ جس کا ہر پہلو سبق آموز اور درس عمل کی بہترین مثال ہے۔ جو ہر سال اس طرح تازہ کیا جاتا ہے گویا آج ہی کا واقعہ ہے۔ اس قوم سے کیا امید کر لی جائے۔ صرف چند آنسو ذرا سے غور کی ضرورت ہے۔ کونسی قوم ہے جس کے ہیرو ایسی جوش پیدا کرنے والی مثال چھوڑ گئے ہیں۔ قوم بن جاتی اگر جوش سے کام لیا جاتا اور سینہ زنی تک محدود نہ رہتا اس سے زیادہ کسی قوم و ملت کی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے۔ کہ کربلا کا سا اہم واقعہ ایک مذہبی رسم بن جائے۔ میں مجلس و ماتم علم و ضریح ماتمی جلوس وغیرہ کا مخالف نہیں ہوں خود عزادار ہوں۔ میرے گھر میں عزاداری ہوتی ہے میرا عقیدہ ہے کہ یہ ماتمی جلوس قوموں کو حسینؑ اور حسینؑ کے ذریعہ سے اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لئے بہترین چیزیں ہیں۔ مجھے تاریخ دانی کا دعویٰ نہیں میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مظاہرہ کا زبردست اصول ہم شیعوں کی ایجاد ہے مگر کم از کم ایسا یہ مجد افزا اور شاندار مظاہرہ

کسی دوسری قوم میں نہیں دیکھا گیا۔ اس قوم کو کیا کچھ نہ ہونا چاہیئے تھا اور یہی قوم آج کچھ نہیں ہے۔

یں یہاں قوم کی اخلاقی حالت آپس کے برتاؤ۔ رواداری امراء وغرباء کے تعلقات ان کی ذہنیت ان امور پر تبصرہ نہیں کروں گا اس کے لئے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ مجھے صرف چند قومی مسائل کا ذکر کرنا ہے اور بس۔ حسینؑ مظلوم اور یزید کی جنگ حق اور ناحق کی جنگ تھی۔ ہم حق کے طرفدار ہیں۔ اور حسینؑ کے اس لئے مداح ہیں کہ وہ حق پر اڑ گئے اور حق کے لئے اپنی ہی جان نہیں بلکہ اپنی جان سے زیادہ عزیز جانیں بھی قربان کردیں۔ لیکن عمل تو درکنار۔ آج ہم میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ حق بات منہ سے نکال سکیں۔ مصلحتیں عبادتیں کی دامنگیر ہیں۔ حق گوئی کے ثمرہ کو جو دنیا سے ملتا ہے۔ فتنہ وفساد کا لقب دے کر فتنہ وفساد کے خوف کی آڑ لئے بیٹھے ہیں۔

حسینؑ کی مجلس میں موٹے موٹے آنسوؤں سے رونے والوں اور دونوں ہاتھوں سے ماتم کرنے والوں کے سامنے شہد مقدس کا واقعہ بھی ہوا۔ نجف اشرف کا بھی۔ جنت البقیع کی بربادی بھی دیکھ لی۔ انہیں ہاتھوں کو واقعات پر پردہ ڈالتے اور پالیٹکس کی آڑ اڑاتے بھی دیکھا گیا ایک غریب اگر جذبات سے مجبور ہو کر جنت البقیع کے متعلق لکھنؤ سے کوئی تحریک پیش کرتا ہے تو بمبئی سے ایک قومی کارکن کے قہقہہ کی آواز بلند ہوتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تحریک کمسن ہی کمزور اور ان ہوتی سہی لیکن ہنسی اڑانے کا موقع نہ تھا۔ تردید کے لئے دو الفاظ بھی تھے۔

بہرحال یہ ہے ہماری ذہنیت ان کو جانے دو یہ دور کی باتیں ہیں۔ کیا کالج کے معاملہ میں ہم میں سے ایک فریق ناحق پر نہیں ہے ایک طرف سے جبر واستبداد کا مظاہرہ نہیں ہو رہا ہے۔ دونوں طرف حق پر ہونے سے رہے۔ یہ وہ قوم ہے جو حق وناحق کے مسئلہ پر ہر سال متواتر چالیس روز تک بحث کرتی ہے۔

حسینؑ کے انصار نے حسینؑ سے یہ عہد کیا تھا۔ خواہ کچھ ہو جائے ہم حضور کا دامن نہ چھوڑیں گے آج اسی قوم کے افراد حسینؑ کے ماتم دار "خواہ کچھ ہو جائے" کے پر زور الفاظ کے ساتھ حکومت سے وفاداری کا عہد باندھتے ہیں۔ کیوں؟ آج حکومت و رعایا میں حق وناحق کی جنگ ہو رہی ہے اور ہماری قوم ہمیشہ سے حق کی طرفدار ہے۔

بہت کچھ لکھنا تھا لیکن سرفراز کے کالم دوسروں کیلئے بھی ہیں ایسی مادی، زمانہ سے پست اور رو بہ تنزل قوم جس میں نہ کوئی کیرکٹر ہے نہ اخلاقی جرأت تو اوس وقت تک نہیں سنبھل سکتی جب تک حسینؑ کی عظیم المرتبت قربانی کے مقصد سے چشم پوشی کرتی رہے گی۔ حسینؑ کا خون تیری سیہ کاریوں کے دفتر دھونے کے لئے نہیں بہایا گیا ہے حسینؑ کی شہادت ہماری نجات کا ذریعہ بن گئی۔ عقیدہ کی صحت میں کلام نہیں لیکن اسطرح نہیں کہ چار آنسو بہائے اور جنت خرید لی ایسے افراد بھی ہوں گے۔ جنھوں نے حسینؑ کے حسن عمل کی روشنی میں صحیح راستہ معلوم کرلیا۔ وہ حسینؑ کی شہادت کے مقصد کو سمجھ گئے انھوں نے حسینؑ کے اخلاق کی پیروی کی اور حسینؑ کی شہادت ان کی نجات کا باعث ہوگئی۔ حسینؑ نے یہی چاہا تھا۔ اب قوم جو کچھ سمجھے:۔

نجم کہتے ہیں شہادت جس کو عرف عام ہے
یہ حسینؑ ابن علیؑ کا قوم کو پیغام ہے

(محرم نمبر ۴۹ ۱۳ھ)

ممبران مشن توجہ فرمائیں

مشن کا مالی سال محرم سے شروع ہو کر ذی الحجہ میں ختم ہوتا ہے۔ لہذا جملہ ممبران سے استدعا ہے کہ وہ اپنا چندہ شروع محرم ۱۳۷۶ھ میں مرحمت فرما کر ادارے کی امداد فرمائیں اور عند اللہ وعند الرسولؐ ماجور ہوں

۱ ــــ ۱۵ ۱ع۱ ــــ الحجہ

سید ابن حسین نقوی۔ سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ۔

شہادت حسینؑ کی معجز نما ضمیر افروزی

نوشتہ عالیجناب سید ریاض علی صاحب ریاض مرحوم بنارسی (مصنف الکرار شہید اعظم وغیرہ)

حسینؑ کی شہادت مجنونانہ سیاست کی ابتدا نہیں بلکہ اس کے تاشدنی شباب کا نتیجہ تھی۔ اس سیاست نے شباب تک پہونچنے تک اپنے گردوپیش ضمیر کا مقتل بنایا تھا اور اسے خوف، لالچ یا عذر تراشی کے پردوں سے چھپانے کی بھونڈی کوششیں کی تھیں۔ بظاہر ایسے قومی عناصر یہ سمجھا رہے تھے۔ کہ حکومت اپنی صداقت کش مصلحت میں کامیاب ہوتی جارہی ہے۔ سطح پر چھوٹی سے چھوٹی لہر بھی نہ تھی۔ خاموشی اور مجرمانہ سکوت، ہر روش کے جواز کی دلیل بن گیا تھا۔ ضمیر فروشوں کا گروہ بڑھتا جاتا تھا۔ حقیقت اداس اور مایوسانہ نظروں سے دور دور دیکھتی تھی۔ لیکن تسکین کہیں نہ تھی۔ وہ بلند شخصیت وہ صداقت ریز ہستی، وہ حقیقت پرور ذات دکھائی نہ دے رہی تھی جس کا بلند خاصہ، جس کی معرفت جس کا نور آگیں ضمیر آواز دیتا کہ میں آگیا۔

لیکن ذرا ٹھہرو۔ اِدم گھٹنے والی تاریکی، اور اس ملعونانہ خاموشی، بلکہ نامرادی کا ذکر ملتوی کردو۔ جو نحش ظلم اور بدکرداریوں کو دیکھ کر اس لئے نہیں بولتی کہ اپنا مفر اسی میں سمجھتی ہے۔ اس میں یہ لطافت حسن نہیں جو یہ سمجھے کہ یہ خاموشی اور مفر ضمیر کی موت ہے۔ زبان ہمت و اخلاق کا بریدہ ہوجانا ہے انسانیت کی اعلیٰ شان کی نفی اور صدائے تسکین کا ماتم ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ یہ خاموشی اور سکوت بد افعالیوں کی ہمت افزائی کرنا اور صدائے ضمیر کا گلا گھونٹنا ہے۔ لیکن یہ تو اچھا بھلا اور رائیگان بکواس ہے۔ یہ وہ آفتاب نہیں جو گرمی پہنچا، ہول خیز اور مسامات فضا میں بسی ہوئی تاریکی کے پردے کو چاک کرتا ہے۔ یہ وہ نشتر نہیں جو مادۂ فاسدہ کو نکال دیتا ہے۔ یہ وہ آگ نہیں جو خس و خاشاک کو جلا دیتی اور باقی رہنے والی چیز کو رہنے دیتی ہے۔ یہ وہ گلا نہیں جس سے صداقت کی آواز نکلتی، باطل کے شور پر غالب آتی اور قلب کی گہرائیوں میں پڑجاتی ہے۔ ایک صدا جو صاف، جاذب، نتھری ہوئی اور چہیتی

بخشش ہوتی ہے۔ کیا ہمیں اپنی ہر روزہ زندگی میں اس کا تجربہ نہیں کہ ہم گھروں میں، محلوں میں، شہروں میں کمزوروں، عورتوں، یتیموں اور بیوؤں پر ظلم اور نامناسب باتوں کو ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ لیکن ہماری اخلاقی جرأت کی کمی ہمیں اس بات پر آمادہ نہیں کرتی۔ کہ ہم بولنے اور اس کے روکنے کی فکر کریں۔ بلکہ ہم ظلم، برائی اور نامناسب باتوں کے ہونے دینے کو اس سے کم برائی سمجھتے ہیں کہ ہم بولیں اور "کسی کی برائی میں" لیکن یہ چھوٹی بات نہیں۔ اس سے فرد یا قوم کا اندازہ اخلاق ہوتا ہے قوم کی اخلاقی جرأت میں کمزوری یا قوت پیدا ہوتی ہے۔ یہی جذبہ قوم بناتا یا مردہ قوم کو زندہ درگور کردیتی ہے۔ اور قوم مردہ قبل زندہ سے بڑھ کر نہیں ہوتی کیونکہ بدنصیبی خاموشی کو تدبر کا بھیس سمجھا دیتی ہے۔ یہ صحیح یا غلط امر التصفیہ ہے کہ مسلمانوں کی تباہی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ بدروی پر ٹوک دینے کی ہمت افراد اور قوم سے مفقود ہوگئی تھی۔ صاحبان حکومت کو نہ صدائے قوم کا خوف رہ گیا تھا۔ نہ بجز گردوپیش کے خوشامدیوں کے ان کے متنبہ ہونے کا کوئی ذریعہ رہ گیا تھا۔ ارباب حکومت اس آزادانہ آواز اور صدا کے قوم کو دبانا مطلق العنانی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اور آخر میں یہ مجنونانہ بے لگامی اور غرہ حکومت اور قوم دونوں کو فنا کردیتا تھا۔

لیکن یہ اخلاق گونگے نہ تھے جنہیں انسانی ضمیر نے ابدی معراج کا شایان اور لازوال احترام کا مستوجب قرار دیا۔ یہ ضرورت کے وقت بول دینے والے جن کی صدا رعد سے زیادہ گرجنے والی اور قرنا سے زیادہ ہوشیار کن تھی۔ جو تاریکی کے پردوں کو چاک کردیتی تھی اور اپنے لفظوں کی روشنی سے اس ماحول کی کثافت دکھادیتی تھی جس میں شخص یا قوم دھنسے جارہے ہوں

ہیروڈاٹس کے تین صوبوں میں ایسے بہت سے آدمی ہونگے

جو بلند آوازی سے میدان ہائے جنگ میں نعرے کرتے اور دشمنوں کے دل بھرا دیتے ہوں۔ لیکن ان میں سے کسی کی آواز ایسی نہ تھی۔ جس سے ہیرو ڈ، اس کا قصر، اس کے کرلیٹہ خوشامدی اور اس کا ملک کانپ اٹھتا۔ ایسی آواز کے لئے حضرت یحییٰ کے گلے اور ان کے صدق سے بھرے ہوئے دل کی ضرورت تھی۔ جو قانون کے احترام کے لئے بادشاہ کی تنبیہ کرتی اور ہر ایک اپنی جگہ سکتہ کے عالم میں سوچتا کہ یہ کون ہے جو بادشاہ کو قانون شکنی کا الزام دے رہا ہے۔ یہ کیوں اپنے خون سے کھیل رہا ہے اور کس قوت کے بھروسہ پر ایسی جرأت کا اظہار کر رہا ہے۔ یحییٰ کا سر جسم سے اتر کر کشتی میں آگیا۔ صدق کے لئے یہ دردناک منظر زبان بن گیا، سچائی رجز خواں ہوئی کہ میرے شہید کو دیکھ لو!

یونان دمصر اں رصاد تقریر کرنے والوں سے خالی نہ تھا۔ فن خطابت پورے عروج پر تھا۔ لیکن سینٹروں کی لفاظی سوفسطائیت کے لئے تصنیع کھیلنے تھی، خودنمائی کے لئے تھی، تعلی کے لئے تھی، اور اس لئے ان کے دل اور زبانوں میں صدق کی الہامیت نہ تھی۔ لیکن جب صدق نے سقراط کی زبان منتخب کر لی اور اس کے سوز و گداز نے قلوب پر اثر شروع کیا تو دور افلیٹی کے خوگروں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی آواز سن رہے ہیں جو ان کی ایسی نہیں۔

وہ لفظوں میں اثر پا رہے ہیں جو ان کی لفاظی میں نہیں۔ وہ خود اپنی آنکھوں میں سبک ہونے لگے اور بجائے اس کے کہ زبان صدق کا احترام کرتے انھوں نے جام زہر سے اس گویائی کو خاموش کر دیا۔ جس کی سچائی کی ہیبت انہیں لرزہ براندام کر دیتی تھی۔ سو رہو سقراط، خفتہ صداقت، تمہاری چھیڑ کی بھی ممنون ہیں جگا کے سوئے!

ہوگا کہ عرب کے ذرہ ہائے ریگ کے نیچے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی ہدایت زبان اور ہدایت عمل کی چنگاریاں مدفون ہوں۔ اور کبھی کبھی کسی کوشش سے ہوتا ہو تو پھر یہ روایتیں کیوں ہیں کہ کوئی عرب ہدایت ابراہیم کی تلاش میں نکلا۔ یہی یا دور جانا ہے نزدیک جگہ کا شبہ ہو۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ہزار برس کے طول زمان میں کسی کے گلے میں یہ قوت ہو جس کی صدا سنکر لوگ مرمی دور دیکھنے لگیں کہ کوئی نغمہ کر رہا ہے یا مرحبا صلو ہے

کچھ تو بنے بیٹھے تھے وہ زردشت کے نام لیوا، کچھ موسویت کی بچ کرنے والے اور خلاف مسیحیت کی علامت اپنے گلے میں جھوٹے کھیل رہا ہے۔ باوجود اس کے کیا یہ واقعہ نہیں کہ اگر یہ آوازیں نہ بھی ہوتیں تو عرب کی بدکرداریاں کچھ بڑھ نہ جاتیں۔ تاریخ عرب کو جس نظر نے دوڑتے اور چھلانگیں مارتے ہوئے بھی پڑھا ہے وہ سمجھنے کے قابل ہے کہ جس اخلاقی خموشی اور تاریکی کی دیواروں میں وہ گھرا تھا۔ وہ دیوار چین سے کچھ پتلی نہ تھی۔ دیوار چین کو توڑ ڈالنا انسان کے لئے ممکن تھا۔ لیکن مجھے کوئی سورما معلوم نہیں جس کی آواز ان پردوں کو چاک کرنے کی جرأت رکھتی جو عربوں کے کانوں پر پڑے تھے۔ عرب کے نسلی اور لسانی نعرے، انفرادی جذباتی ڈینگیں اور خود ستائی اس کی صلاحیت سماعت کو سلب کر چکی تھی۔ لیکن جب ہشیار غار حرا سے فضا چیرنے والا ایک طوفان، صدائے رعد، زلزلہ، آنکھیں پوری چوڑائی سے کھل گئیں۔ کانوں کے قد دراز ہو گئے۔ متوالے جاگ اٹھے، شاعری نہیں واقعات کی مصوری ہے۔ میری آنکھوں سے دیکھو۔ وہ لڑکے پتھر لئے ہیں۔ یہ کانٹے بچھ رہے ہیں۔ ادھر محاصرے اور قتل کے مشورے ہو رہے ہیں۔ وہ نجاشی کے پاس قاصد دوڑے جا رہے ہیں۔ وہ عرب ہرقل سے اپنے ملک کے انقلاب کا حال بیان کر رہا ہے۔ اور وہ قبیلہ اور اس کا بدخواہ قاصد حالات کو دیکھ کر غور کر رہا ہے اور سن رہا ہے کہ مکہ پورے شور کے عالم میں ہے۔ جاگ اٹھا۔ کیوں ربانی آواز، ابدی صداقت، ایک دل اور ایک زبان پر چھا گئی۔ اس میں گدگدی ہونے لگی۔ اور سب نے ایک پہچانے ہوئے پیکر سے عجیب جوش، عجیب خلوص، عجیب طہارت، پیہم ضد، اور مسلسل اصرار سے۔ نہیں بے اختیارانہ سادگی سے "قولو لا الٰہ الا اللہ" کی صدا سن لی۔ عباسؓ کی بلند آواز تین میل تک اثر دکھا سکتی تھی۔ لیکن نور اعظم کائنات کی اس صدا کے اثر کو مادر گیتی سے پوچھ لو۔ طول صدا کو گوشہ ہائے عالم میں دیکھ آؤ۔ کہدو یہ انا فارسولا ہوگا۔ لیکن انصاف ہو تو یہ بھی کہدو کہ صدائے حرا کے قبل یہ انا فارسولا کبھی ایسا خالص اور پرصفا نہ تھا۔

عجیب کہ خود صدائے حرا کو ایک مددگار آواز کی ضرورت محسوس

ہونے لگی۔ بارہا میں نے اس موقع کی مصوری کی ہے۔ الفاظ مجروح ہو گئے لیکن سیر نہیں ہوا۔ موقع کی متلاطم جلالت اور ہیبت انگیز نورانیت یہی کہتی ہے کہ میں تلاؤں اور ہلاؤں۔ موقع ذوالعشیرہ صدائے حق محتاج صدائے نصرت۔ شجاعان عرب کا مجمع، جگر داروں کی کمی نہ تھی۔ اگر پیکر ہدایت کسی فوج کے خوف سے یا آل غالب یا آل عبدالمطلب کا نعرہ لگاتا تو نہ صرف ذوالعشیرہ کا مجمع بلکہ غالباً تمام مکہ اپنے امین کی حفاظت کے لئے آن کی آن میں تجربہ کئے ہوئے ہاتھوں سے تجربہ کی ہوئی تلواریں نکال لیتا۔ لیکن امین کا مقصود صدا حملہ آور فوجوں کی دہشت سے زیادہ پرخوف تھا۔

معاملہ روحانی انقلاب ملک اور قوم بلکہ دنیا بدل دینے کا اقدام تھا۔ یہ مجمع کی شجاعت سے کہیں زیادہ ہمت کا کام تھا۔ خاموشی داہنے اور خاموشی بائیں، خاموشی سامنے، خاموشی پس پشت۔ کچھ جھجکیں، کچھ ذہن نمائی۔ کوئی قہقہہ۔ لیکن جواب نصرت معدوم، صداقت کا گلا گھٹنے لگا تھا۔ کیونکہ بقول کارلائل سب تو سکوت اور تذبذب کے عالم میں تھے۔ مگر علیؑ جن کی عمر اس وقت تیرہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس سکوت کی تاب نہ لائے۔ اور بے چین ہو کر کھڑے ہو گئے اور جوش شجاعت میں کہا میں آپ کا ساتھ دیتا ہوں۔

پہچانی ہوئی صورت نے پہچانی ہوئی آواز سے جواب دیا۔ محمدؐ حق بے کار نہیں گئی صداقت نے اپنے مفہوم عالی کا جواب پا لیا۔ خموشی ٹوٹی مستقبل کے شیر خدا کی زبان سے۔ نصرت کی صدا نے خاتم الانبیاء کا سینہ بھر دیا۔ تسکین ابل پڑی۔ دو دل اور دو زبانوں نے مفہوم کی ہم آہنگی پر متفق ہو کر دنیا کی اصلاح کا بیج بو دیا۔ نہ بجھنے والا چراغ جلا دیا۔ زمانہ ان آوازوں کی دائمی گونج کو مٹا نہیں سکتا۔

خاتم الانبیاء نے اگر ہدایت کو نہج سے ثبت کر دیا تھا تو اس زمانے میں جبکہ ذکر مقصود سے کھیل بن کر بگڑ گیا تھا۔ اب ہستی کے بعد نیستی کا دور تھا۔ روشنی کے تجربہ کے بعد دم خفا کرنے والی تاریکی چھا رہی تھی۔ رہنما صداؤں کے بعد گمراہیاں مسلط ہوتی جا رہی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ تمام مصیبتیں جو اعلائے

حق کے لئے برداشت کی گئی تھیں۔ وہ تمام خون جو خدا کی راہ ہموار کرنے اور دکھانے کے لئے بہے تھے۔ ضائع ہوئے جا رہے تھے۔ جاہل پرستیاں اس کوشش میں کامیاب ہو گئی تھیں کہ جو روح فرسا تکلیفیں ہادی عالم اور خدا کے نیک بندوں نے قیام حق کے لئے اٹھائی تھیں۔ اور جو نتیجے حاصل ہو چکے تھے۔ اب انھیں اپنی خواہشات، حوصلوں اور تخئیل کی صورت میں مسخ کر دیں۔ حیرت سے اپنی جگہ سے اچھل پڑو کہ یہ بھی ممکن ہو گیا کہ جو نظم مدعی تکمیل مکارم اخلاق قائم کرے اس کا عنوان گیر یزید بھی ہو سکے اور ایک طویل فہرست میں مروان الحکم اور ولید ابن یزید ابن عبدالملک کا نام بے خوفی سے لیا جا سکے۔ اور جب عنوان گیر ایسے ہوں تو حامیان مصلحت ولید، حجاج، عبداللہ ابن سعد، ابن ابی سرح، ضحاک اور مسلم ابن عقبہ کے ایسے کیوں نہ ہوں۔ اس فقرہ کی واقعہ خوانی اور قوت کا میں بغیر معترف ہوئے نہیں رہ سکتا کہ "ابھی رسول کا کفن میلا نہیں ہوا کہ ان کی سنت کہنہ ہو گئی"۔ جس وقت سے یہ بات کہی گئی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ہر وہ شخص جسے یہ نظم اپنے موافق نہ سمجھتا تھا یا جس کی وجاہت اور اثر سے خوف زدہ ہوتا تھا اسے خفیہ سازشوں، خاموش یا علانیہ زہر اور قتل سے اپنی راہ سے ہٹا دیتا تھا۔

آں سموم کہ بر طرف بوستاں بگذشت
عجب کہ رنگ گلے ماند و بوئے یاسمنے

حالت یہ ہو گئی کہ اگر خاتم الانبیاء بجائے مستقل ہدایتوں کے یہ وصیت فرماتے کہ میرے بعد میرے دین کو اس اس طرح مسخ کرنا تو شاید ان کا پاک دین اس سے زیادہ مسخ نہ ہو سکتا جس قدر ہوا۔ عوام کے ہاتھوں نہیں بلکہ ان کے ہاتھوں جو ہوش مصلحت رکھتے تھے۔ عوام کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنی آواز کے اختیار کو کھو بیٹھے۔ اور یہ نظریہ قائم ہو گیا کہ

رموز مصلحت خویش خسرواں دانند

اور دوسری طرف ہر ظالم اور ہر بد اخلاقی کا نمونہ اپنے کو ہر باز پرس سے بالاتر اور اپنی شاہی کے حق کو مع ان تمام اعمال کے جو اس کی اور اس کے تلون خیالی سے سرزد ہوں، منجانب اللہ

بجھانے چلنے لگا۔

ذرا سوچو کہ کیا رسول اللہ اور ان رفقائے حق نے جنھوں نے اساس دین خدا میں ناقابل بیان مصیبتیں اٹھائیں یہی مقصد تھا کہ ہمارے بعد جو ہمارے نام سے صاحب اختیار و حکومت ہوں وہ ہمارے مکتب تعلیم و عمل کو نہیں بلکہ بدترین قسم کی سیاسیات کو اپنی معلم قرار دیں۔ اسلام اپنے عہد سے اپنے قانون کی گود میں چلا گیا تھا۔ اور اپنی شہرگ کٹنے کا منتظر تھا۔

یہ کہدینا ضروری ہے کہ وہ زمانہ جسے میں نے مجنونانہ سیاسیات کا شباب کہا ہے سنہ ۶۰ھ تھا۔ یعنی ہادی عالم کو عالم قدس کی طرف رحلت فرمائے ہوئے صرف پچاس برس گزرے تھے۔ دوسری لفظوں میں ابھی ایسے لوگوں سے زمانہ خالی نہ ہوا تھا جنھوں نے اپنی آنکھوں سے نور کا زمانہ دیکھا تھا۔ اور اپنے کانوں سے ہدایت کے الفاظ سنے تھے۔ تاہم وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ کچھ تو جنھیں یہ تکلیف تھی۔ کہ اہل بیت رسالت کو گرا کر ہم اوپر ابھارے جا رہے ہیں۔ کچھ تھے جن کی زبانوں سے زہد، عبادت اور روحانیت کا مزہ جا رہا تھا۔ اور اب انھیں حکومت کا ساتھ دے کر حسینؑ غلاموں، کنیزوں اور اسباب تعیش و حکومت کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ کچھ تھے جن کے ضمیر ممکن ہے کہ محفوظ ہوں لیکن جن کے جسم اتنے قوی نہ تھے کہ وہ پسلیاں ٹوٹنے، زہر پینے، زندہ در گور یا کنویں میں گرائے جانے یا جلا وطن ہونے کی ہمت کرتے۔

مختصر لفظوں میں نظم حکومت اس میں کامیاب ہو گیا تھا کہ نہ صرف رسولؐ کی بنائی ہوئی قوم بلکہ اصحاب کی زبان سے قوت گویائی چھین لیتا۔ اور وہ بنی قربانی کی طرح قصاب کی چھری دیکھ کر خوفزدہ رہتے۔ کیا زمانہ کہ اور تو اور خود ابن عباس اور ابن عمر بھی حسینؑ سے یہ کہہ رہے تھے کہ یزید سے بیعت کر لو!

اب بتاؤ کہ کیا اس وقت کے عالم اسلام کی طرح حسینؑ بھی "جان ہے تو جہان ہے" کی مصلحت کے آسان مدبر بن جاتے۔ یا سب کی طرح متانت کے ردائے خاموشی اوڑھ لیتے۔ آہ نہیں۔ قولوا لا الہ الا اللہ کہنے والے شجاع کا لہو اسے اور ذوالعشیرہ میں اعلان نصرت کرنے والے کا فرزند اس نور کو ہمیشہ کے لئے بجھانے میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ جو اس کے گھر سے چلا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے حق کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا۔ ہدایت کی گود کا پالا اس سے کہیں بلند تھا۔ کہ وقتی حیثیت سے بھی اخلاق کشی کی مصلحت سے اپنے نور آگیں ضمیر پر دھبہ آنے دیتا۔ اور اپنی جان بچا کر دین اللہ کو دائمی تاریکی میں ملفوف کر دیتا۔ حسینؑ کی اکیلی گردن کچھ ہوئی۔ مدینہ سے نکلتے ہوئے چند اونٹوں کے پاؤں کے تلیوں اور چند گھوڑوں کے سموں کی صدا ہزار ہا طبل کی آواز سے کر خت ہو گئی۔ سُن کان کھلے۔ غنودگی آلود نگاہیں اٹھیں یہ سننے اور دیکھنے کے لئے کہ حسینؑ اپنے سب سے پیارے عزیزوں اور رفقاء کے ساتھ مقتل کی طرف جا رہے ہیں۔

یہ خوف تھا کہ رونے والے رو بھی نہ سکتے تھے۔ اور شایعت کرنے ساتھ چلتے گھبراتے تھے۔ لیکن دیکھو تو حسینؑ کے شہیدانہ تبسم میں کوئی فرق یا ان کے عزم و استقلال میں کہیں سے ذرا بھی ہے؟۔

معجزہ تماشے کا کرتب نہیں جو ہر وقت دکھایا جا سکے اور اگر فطری حیثیت سے ممکن بھی ہو تو اصل دشواری اتفاقی حیثیت سے اثبات کی ہوتی ہے ورنہ کسی امر کا محض نظریۂ ثبت سے ممکن ہونا کچھ بھی مفید نہیں۔ اور پھر قومی اور مذہبی عصبیت ہو یا عموماً معجزہ کا وقتی ہونا یہ بجز اس قوم کے معجز نما کے دوسری قوم کے لئے تشفی بخش نہیں ہوتا۔ لیکن حسینؑ کا عدیم المثال معجزہ حق دوستی، حق پسندی اور تحفظ حق ایک ایسا معجزہ ہے جس پر ان کے دشمن بھی متحیر تھے۔ اور جسے ہر قوم و ملت کا آدمی واقعات کے فطری حدود میں سمجھتا ہے۔ شرافت پسندی اس کی گواہ، یہ وہ ضمیر اس کا داد دہ اور انسانیت پرنم آنکھوں اور شگفتہ جگر سے کہتی ہے۔

آفریں! اے حسینؑ تمہارے اور تمہارے رفقا کے پاک قطرہائے خون نے صداقت پسندی اور حق دوستی کی عزت بڑھا دی۔ اور ضمیر افروزی کی وہ حرکت پیدا کر دی جسمیں کبھی سکون نہ ہوگا۔

ہو سکتا ہے کہ ایک مجلس خواں کے لئے ہل من ناصر

ینصرنا اثر خیزی کا ایک ذریعہ ہو لیکن میرا ابھرا ہوا دل جس کے سامنے حسینؑ کی عظیم شخصیت ہے۔ یہ دائمی معنے سمجھتا ہے۔ کہ کون میری روش یعنی باطل کے زائل کرنے اور حق کے قائم کرنے میں میری مدد کرتا ہے۔ جیسے کہ عباسؑ کے ایسے بازو، علی اکبرؑ کا ایسا سینہ اور علی اصغرؑ کی ایسی گردن ریگ کربلا پر اپنا خون انڈیل چکی۔

حسینؑ! اے حسینؑ!! تم خدا کی حکومت کے شجاع ترین سپاہی ہو۔ تمہاری مظلومی، اور اس کے سوز و گداز کی معنی خیزی اور قوت سے بہترین غور شرف اندوز ہو سکتا ہے۔ اور تمہارے اسوہ سے بہترین قوم بن سکتی ہے۔ تم پر تمہارے پاک شرکائے شہادت اور تمہارے برگزیدہ اہلبیتؑ پر سلام کرتا ہوں۔ تمہارا اسیر شیدا۔

(محرم نمبر ۱۳۵۳ھ)

خطبہ موعظہ سرکار ناصر الملۃ والدین اعلی اللہ مقامہ

شان امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام

سرفراز محرم نمبر کے لئے جناب ناصر الملۃ والدین شمس العلما مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد العصر لکھنؤ نے ہماری درخواست پر مندرجہ ذیل خطبہ موعظہ روز ولادت باسعادت جناب امام حسینؑ مرحمت فرمایا ہے جسے ہم جناب ممدوح کے انتہائی شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی تفضل فی ھذہ الایام علی عبیدہ المخلصین فاکمل لھم فیھا لطفہ ومنّہ، وتکرم فی تلک الازمان علی عبادہ الصالحین فابان لھم فضلہ وسنہ، سبحانہ من حنان اعطی کل مؤمل ما اضمرہ فی قلبہ واجنّہ، وما اعظم شانہ من منان حبا کل متمن ما اخفاہ فی نفسہ واکنہ، وصلی اللہ علی سیدنا ابی القاسم محمد منعش المریض المدنف عن کل ما اوصبہ واتنّہ، ورافع الظنین المعروف عن کل ما وصمہ وازنّہ، ھو الذی ارغم انف الشیطان برسالتہ فبکی عند بعثتہ بالانین والرنّۃ، والجی اھل العصیان بدلالتہ بعد ما صدق علیھم ابلیس ظنّہ، وعلی آلہ الطیبین الطاھرین الحافظین لما شرعہ وسنّہ، وعترتہ الاعظمین الاکرمین المجددین لما حددہ وسنّہ لاسیما سیدنا ومولانا امیر المومنین الساد علی الکفرۃ الطغاۃ کل مھرب ومجنّہ، الشانی بکلامہ المعجز کل عتہ وجنہ، المستبیح من اھل العدوان کل حریم ومخنہ، المفجع من اھل الطغیان کل حنۃ وکنّہ، وجہ اللہ الذی صب اللہ علیہ ما لا لھام ورشنّہ، وابی تراب الذی استنار بنورہ آدم حین صورہ اللہ وسنّہ، ولاسیما سبطہ الاصغر الزاکی الزکی الذی حملتہ امہ کرھا واضطغنتہ، والطیب الطاھر الذی ربتہ الطواھر واضطبنتہ، ھو الذی رواہ النبی العربی بریقہ فابدی منہ علمہ وما اعتنّہ، وربّاہ بلعابہ شھرا او عشرا فعنوان کتاب فضلہ وعنہ، البطل الوحید الذی استاصل بسیفہ الباطل واطنّہ، الذمر الشدید الذی حمی الحق

والصواب بخیر ترسی ومحبتہ، ریحان الرسولؐ الناخ بکل طیب وبتہ، مولانا الامام ابی عبداللہ الحسینؑ سید شباب اہل الجنۃ، صلوٰۃ شافعۃ تبلیج لنا فی ریاض الرضوان کل حور اعیناہ مخدرات مکنۃ، فاجحۃ ناجحۃ تلیح لنا فی غرفات الجنان کل لولؤ مکنون وجوہر مصون وعلق مضنۃ،

ترجمہ:۔ اس خدا کا شکر جس نے ان دنوں میں اپنے مخلص بندوں پر تفضل فرمایا اور ان پر اپنے لطف و احسان کو کامل کر دیا۔ اور اس خدا کا حمد جس نے اس زمانہ میں اپنے نیک بندوں کی تکریم کی اور ان کے لئے اپنے فضل وکرم کو ظاہر اور جاری فرمایا۔ پاک ہے وہ بڑا ترس کھانے والا خدا جس نے ہر امید وار کو اس کی امید بخشی دی اور بر لایا۔ کس قدر عظیم ہے اس خدائے محسن کی شان جس نے ہر آرز ومند کی آرزو پوری کی (جو دل کے پردوں میں چھپائی گئی تھی) خداوند عالم صلوٰۃ و رحمت نازل کرے ہمارے سردار حضرت ابوالقاسم محمد مصطفےٰ پر جنھوں نے صاحب فراش بیمار کو ہر اس مرض سے بھلا چنگا کر کے اٹھا دیا جو موذی اور غم افزا تھا۔ اس پیغمبر پر خدا کی صلوٰۃ ہو جس نے متہم اور معیوب ذات کے دامن سے ہر اس چیز کو دور کر دیا جو عیب اور تہمت لگانے والی تھی۔ وہ رسولؐ جس نے اپنی رسالت سے شیطان کی ناک رگڑ دی ذلیل کیا، لہذا وقت بعثت وہ رو دیا اور چیخ پکار مچائی۔ وہ رسولؐ جس نے اپنی ہدایت سے گناہگاروں کو نجات دی بعد اس کے کہ شیطان نے اپنے علم و گمان کی تصدیق ان لوگوں میں کر دی تھی یعنی وہ گمراہ تھے اور خدا کی صلوٰۃ ہو ان کی آل پاک و طاہر پر جو شرع وسنت محمدیہ کے محافظ ہیں اور ان کی عترت بزرگ و برتر پر جو شریعت غرا اور سنت رسولؐ کی تجدید کرنے والے ہیں وہ شرع جس کی رسولؐ نے تجدید کی اور سہل کر دیا خصوصاً ہمارے سردار اور مولا اسلی ابن ابی طالب علیہ السلام پر صلوٰۃ خدا ہو جنھوں نے کفار اور طغیان کرنے والوں کی راہیں بند کر دیں اور انھیں بھاگتے راستہ نہ ملا۔ وہ امیر المومنینؑ جنھوں نے اپنے کلام معجز سے ہر مجنون اور بے عقل و بہوت کو شفا دی۔ وہ علیؑ جنھوں نے اہل عداوت کے گھروں کو تاراج کیا اور اس کی غارت مباح کر دی۔ وہ علیؑ جنھوں نے اہل طغیان کی عورتوں کو راہ اسلام میں ان کے مردوں کو قتل کر کے) در دمند بنا دیا۔ وہ علیؑ جو وجہ اللہ تھے۔ وہ وجہ اللہ جس پر خدا نے آب الہام کے چھینٹے دیئے اور بارش کی۔ وہ ابوتراب جن کے نور سے آدم نے اس وقت ضیا حاصل کی جب خدا ان کی صورت اور ان کی مٹی کو بنا رہا تھا۔

خصوصاً (صلوٰۃ خدا ہو) امام حسین علیہ السلام پر جو سبط اصغر تھے اور جن کا لقب "زاکی" اور "زکی" ہے جن کو عفیف مخدرات نے اٹھایا اور پالا وہ پاک و پاکیزہ ذات جس کی پرورش پاک عورتوں نے کی اور اپنی گود میں اٹھایا۔ وہ بچہ جس کی (پیاس) رسولؐ نے اپنی زبان چبا کے بجھائی لہذا علم رسولؐ اس کے دہن سے ظاہر ہوا اور رسولؐ نے اپنے لعاب دہن سے اس کی پرورش ایک مہینہ دس دن کی اور یہی عنوان کتاب فضیلت امام حسینؑ ہو گیا۔ وہ شجاع جس نے اپنی تلوار سے باطل کی جڑ کاٹ کر پھینک دی اور نیست و نابود کر دیا۔ وہ بہادر مرد میدان جس نے حق کی راہ درست کی بہترین سپر سے حمایت کی۔

رسولؐ کا وہ پھول جس میں سے ہر خوشبو نکل رہی تھی۔ وہ ہمارے مولا امام حسینؑ جو جوانان بہشت کے سردار ہیں ان پر خدا کی وہ رحمت وصلوٰۃ ہو جو ہمارے لئے شفیع ہو جائے۔ اور روضۂ رضواں میں ہمارے لئے بڑی آنکھ والی حوروں کو جو پوشیدہ ہیں اور پردہ میں ہیں جائز اور عطا کر دے ایسی صلوٰۃ جس کی شفاعت سے مراد مل جائے اور مقصد حاصل ہو جائے جو جنت کے درجوں میں ہر مکنون جوہر محفوظ اور نایاب و نفیس شے کو ہمارے لئے مقدر کر دے۔

(محرم نمبر ۱۳۵۳ھ)

حسینی مشن ہماری تنظیم اور ترقی کا

بہترین ذریعہ ہے

جناب سید صغیر حسین صاحب نسیم کندرکی ضلع مراد آباد

یہ امر ظاہر ہے کہ جب تک ہمارا ہر کام کسی نظام کے ماتحت نہ ہو اور جب تک ہم منظم ہو کر اپنی منتشر و پراگندہ قوتوں کو ایک مرکز پر جمع نہ کرلیں۔ اس وقت تک ہمارا جادۂ ترقی کی طرف گامزنی کرنے کے لئے جدوجہد کرنا اور منزل عروج و ارتقا کی طرف بڑھنے کے لئے سعی کرنا عبث اور بالکل عبث ہے۔ ہماری قومی یکجہتی ہی ہم کو کامیابی اور کامرانی کے نصف النہار پر ضوفگن کر سکتی ہے ہماری اجتماعی شان ہی ہماری مقصد برآری کا ذریعہ بن سکتی ہے اور ہم کو ترقی کی دوڑ میں منزل مقصود تک پہنچانے میں کامیاب بنا سکتی ہے۔ زمانہ اس قسم کی سیکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں پیش کرتا رہتا ہے۔ دیکھئے جب تک اسلام کا فرد فرد اپنے مذہبی اور قومی کارناموں کی انجام دہی کے لئے ایک جان دو قالب تھا۔ اس وقت تک ہماری قومی زندگی اور حیات عروج کے جھولوں میں جھولتی نظر آتی تھی۔ اسپین پرتگال بلکہ انگلینڈ تک ہماری ان ترقیوں کے گواہ اور شاہد ہیں۔ اسپین اور پرتگال میں صلیبی نشانوں کے لئے "اللہ اکبر" کے جھنڈے اڑانے والی یہی قومی یکجہتی تھی۔ فارس اور مصر میں اسلام کا ڈنکا بجانے والا یہی قومی اتحاد و اتفاق تھا۔ لیکن جب سے ہم نے اپنے قومی شیرازہ کو درہم و برہم کر دیا۔ اور اتحاد و اتفاق کو الوداع کہہ بیٹھے اس وقت سے ہماری تمدنی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی میں اضمحلال کے آثار نمودار ہونے لگے۔

آج بھی جبکہ دنیا کی ہر قوم اپنی تنظیم و تربیت میں انہماک سے کام لے رہی ہے اور ترقی کے مدارج طے کرنے میں جدوجہد کر رہی ہے ہم اپنی مثال آپ ہی ہیں۔ ہم افتراق و نفاق ہی میں اپنی زندگی کے راز کو مضمر تصور کئے بیٹھے ہیں۔ اشتعال انگیزی اور ہنگامہ آرائی کو ہم اپنی زندگی کا جزو لاینفک سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم اپنی ذاتی اغراض کی قربان گاہ پر قومی مفاد کو ذبح کر ڈالنے ہی کو قومی ترقی کے مرادف خیال کئے ہوئے ہیں کاش یہ قاتل اور سم آلودہ ذہنیت ہمارے قلوب سے رخصت ہو جائے کاش ہماری بھولی بھالی اور سیدھی سادی قوم اتحاد و اتفاق کی آبیاری سے مزرع ترقی کو سرسبز اور بار آور بنانے کی طرف اپنی اشتعال انگیز اور تفرقہ پرداز طبائع کو مبذول کرنے کی کوشش کرے۔ کاش کہ وہ اپنے روحانی پیشواؤں کے اقوال و افعال کو اپنا لائحہ عمل قرار دے اور منظم ہو کر زمانے کے دوش بدوش اور پہلو بہ پہلو چلنے کے قابل ہو جائے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اسلاف اور پیشوا اکثرت سے ان شاہراہوں کا سنگ بنیاد رکھ سکتے تھے۔ اگر ہم گامزنی کو اپنا مسلک قرار دیتے تو ہماری تنظیم و ترتیب کا شیرازہ منتشر و پراگندہ نظر نہ آتا۔ اور سیکڑوں ایسے عملی طریقہ کار کے بنیادی پتھر نصب کر گئے تھے۔ کہ اگر ہم ان کی تقلید و تاسی کرتے تو دنیا کی ہر قوم سے راہ ترقی میں پیش پیش اور آگے آگے نظر آتے لیکن افسوس ہم اصلی مقاصد سے کوسوں دور ہٹ کر ضمنی اور سطحی امور کو اپنی ترقی کا راز سمجھ بیٹھے اور ہم نے ان تمام مقاصد کو پس پشت ڈال دیا جن کی ترقی کے لئے ان عملی طریقوں کا سنگ اساس رکھا گیا تھا۔ نماز جماعت اور حج بیت اللہ پر نظر تعمق ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ قوم کی تنظیم و تربیت کیلئے کتنے آسان ذرائع مہیا کر دئے گئے تھے لیکن ہم ان امور سے بجائے

اتحاد و اتفاق کا سبق لینے کے اشتعال انگیزی اور ہنگامہ آرائی کی طرف جھک پڑے۔ حضرت امام حسینؑ کی مجالس عزا کا بنیادی پتھر رکھنے سے ہمارے بزرگوں کا یہ مقصد تھا کہ ہماری قوم کی منتشر کڑیاں ایک دوسری سے مل کر اتنی مضبوط اور پائدار ہو جائیں۔ کہ دنیا کی زبردست سے زبردست قوت بھی ان کو منتشر و پراگندہ کرنے کی جرأت و ہمت نہ کر سکے اور ہم کربلا کے پر کے لائحہ زندگی پر عمل کر کے دوسری قوموں کی نظر میں اپنی قدر و منزلت اور وقعت قائم کر سکیں۔ لیکن حقیقتاً ہم نام کے شیعہ ہیں۔ اور صرف کہنے کو رسول مقبولؐ اور ائمہ معصومینؑ کے پیرو ہیں سچ تو یہ ہے کہ ہم گمراہی کے راستہ کی طرف جا رہے ہیں ہمارا پیشوا ہمارا روحانی پیشوا علیؑ "صاف اور واضح الفاظ میں اپنے فرزند گرامی کے ساتھ مکالمہ کرتا ہوا ہم کو سبق دیتا ہے" لے فرزند تم غیر کے غلام نہ بنو اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے" ایک جگہ کہتا ہے "ہم انقلاب کو پسند کرتے ہیں چاہے وہ ہمارے ہی مقابلہ میں کیوں نہ ہو۔"

آج ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑے پڑے ہیں ہماری قومی سرسبزی و شادابی اور خوش حالی ظلم و جہالت کی ژالہ باری سے بربادی کی انتہائی منزل تک پہونچ چکی ہے۔ دنیا ایک انقلابی کروٹ لینے کا تہیہ کر چکی ہے لیکن ہم ہیں کہ خواب غفلت میں محو، اپنی دینی دنیوی ترقی سے بے خبر انقلاب پیدا کرنا تو درکنار ہم انقلاب کے تخیل کو بھی اپنے دل و دماغ میں جگہ دینا گناہ کے مرادف تصور کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ جیسا انقلاب ہمارے بزرگوں نے پیدا کیا اور اہل عالم کی بے حسی اور جمود و سکوت میں خون حیات دوڑانے اور ان کے احساس خفتہ کو بیدار کرنے کے لئے جن انمول اور گرانمایہ قربانیوں کو ہمارے پیشواؤں نے پیش کیا ان کی رہتی دنیا تک وسعت عالم میں نظیر ملنی دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے وسیع پیمانے پر انقلابی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے قربانیاں پیش کیں وہ دنیا اور دنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے قہرمانی طاقتوں، جفاکاریوں

اور بدمستیوں کے علمبرداروں کے سامنے سر نیاز خم کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنے ارفع و اعلیٰ اصول کی بلند ترین قربانگاہ سے اپنے بھائی، بھتیجے، اولاد و اعزا و انصار یہاں تک کہ شش ماہے بچہ کو ذبح ہوتا ہوا دیکھا۔ لیکن زبان سے شکوہ و شکایت تو درکنار اف تک نہ کی حسینؑ اس امر کو اچھی طرح جانتے تھے کہ کوئی انقلابی تحریک کوئی اصلاحی اسکیم اس وقت تک کامیابی و کامرانی کی منزل تک نہیں پہونچ سکتی جب تک اس کی اپنی جیسی عظیم الشان اہمیت رکھنے والی ہستیوں کے خون سے آبیاری نہ کی جائے۔ حسینؑ نے بہتر افراد کو تنظیم و ترتیب کا عملی جامہ پہنا کر دنیا کو دکھا دیا کہ اقلیت سے اقلیت اس اکثریت کے مقابلہ میں جو اس سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں گنی زیادہ ہو۔ کس طرح اپنے جائز حقوق کی نگہبانی و نگہداشت کر سکتی ہے۔ اور اس طرح چند افراد کی تنظیم، ترتیب اور اتحاد و اتفاق دنیا کی بڑی بڑی اور زبردست طاقتوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔

کس طرح اپنے ملک و ملت کو اسلام کے جھوٹے نام لیواؤں اور بدکیشوں کے ظلم و ستم سے محفوظ و مامون رکھا جا سکتا اور کس طرح سرمایہ داری کا سدباب اور اہل عالم میں مساوات کا درجہ قائم کیا جا سکتا ہے جس نے دنیا والوں کو عمل کر کے دکھا دیا۔ کہ صلوٰۃ کی ادائیگی دشمن کی تلواروں کے سایہ میں بھی لازمی و لابدی ہے۔ اور اس خالق حقیقی کی درگاہ میں سربسجود ہونے سے ظلم و ستم کی تیز تلواریں بھی باز نہیں رکھ سکتیں۔ حسینؑ ہی نہیں بلکہ علی اصغر جیسے ننھے بچے شیر خوار مجاہد نے بھی دنیا پر روشن کر دیا کہ روزہ کس طرح رکھا جاتا ہے۔ اور اس کی افطاری تیر سہ شعبہ سے کس طرح کی جاتی ہے لیکن افسوس کہ حسینؑ اور حسینؑ والوں کے ان عملی کارناموں سے کوئی مفید سبق لیں اور جمود و سکوت کو توڑ پھوڑ کر خون حیات دوڑانے والے اصول کو شمع راہ بنا کر ترقی کی دوڑ میں تمام معاصر اقوام سے پیش قدمی کا بنیادی پتھر رکھیں ہم صرف روایت کر کے ہی اس عظیم ترین قربانی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

اور اس میں اپنی قومی و ملی ترقی کا راز مضمر سمجھے ہوئے ہیں ہمارے واعظین اور ذاکرین کے وعظ اور بیانات بھی رونے رلانے ہی کے واسطے ہوتے ہیں۔ یا صرف لفظوں کا ایک طومار ہوتا ہے جو "واہ وا" اور "سبحان اللہ" یا نعرہائے تحسین و آفرین سننے کے لئے زبان پر لائے جاتے ہیں کاش کہ ہمارے واعظین اور ذاکرین صرف رونے رلانے ہی کے مقصد کو پیش نظر نہ رکھ کر قوم کو حسینؑ کے اصلی اور حقیقی مقاصد سے آگاہ اور واقف بنانے کی طرف عملی قدم اٹھائیں اور حسینی مشن کی اصلی غرض کو فوت نہ کریں کیونکہ ہماری قومی ترقی کا دار و مدار ایک بڑی حد تک صرف اسی کے مشن پر ہے چنانچہ میں نے ایک انگریزی رسالہ میں دیکھا کہ ایک عیسائی پادری حسینی مشن کو مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی کا ایک زبردست ذریعہ قرار دیتا ہے وہ لکھتا ہے کہ اسلام کی اس قدر ترقی بہت کچھ حسینی مشن کی ممنون احسان ہے اور اگر مسلمان حسینی مشن کے مفہوم کو سمجھتے رہے تو اسلام کے سامنے کسی دوسرے مذہب اور قوم کا ٹھہرنا دشوار ہے" افسوس! اغیار تو حسینی مشن کو ہماری ترقی کا ایک زبردست آلہ سمجھیں اور ہم اس سے بالکل بے خبر اور ناواقف رہیں۔ بس اگر ہم کو قومی و ملی ترقی کی آرزو ہے تو ہم کو چاہئے کہ ہم اپنی قومی تنظیم و ترتیب سے کام لے کر حسینی مشن اور اس انقلاب عظیم کو جو کربلا کے میدان میں رونما ہوا اصلی مقصد اور مفہوم کو سمجھیں اور اس پر کاربند ہو کر فلاح دارین حاصل کریں۔ (محرم نمبر ۱۳۴۹ھ)

حسین علیہ السلام میدان سیاست میں

حکیم الامۃ علامۂ ہندی مولانا سید احمد صاحب مجتہد (اعلی اللہ مقامہ)

تمام تمدنی شاخوں کا مبدأ اصلی قوم کا وہ مزاج عقلی ہوتا ہے جو مدتوں کے موروثی اثر سے پیدا ہوتا ہے اور جب تک یہ مزاج نہ بدل جاوے تمام تمدنی شاخوں میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ لیکن مزاج عقلی کو صرف زمانہ ہی بدل سکتا ہے فاتح قومیں بھی اس میں کوئی تغیر نہیں پیدا کر سکتیں۔ ہر پست درجہ قوم کو تمدنی مدارج کے طے کرنے میں مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جن وحشی قوموں نے یونانی تمدن کو پامال کر دیا حالات سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس بنا پر جو لوگ تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ان مراحل کو پھاندنا چاہتے ہیں وہ اس قوم کے اخلاق کو پراگندہ اور اس کے دماغ کو پریشان کرتے ہیں۔ اور اس کو ایک ایسی سطح کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جو پہلے سے بھی زائد پست ہے۔

اسی طرح سے متمدن قومیں بھی اپنے تمدن میں دفعتاً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتیں بلکہ ان کو اس تمدنی انقلاب میں بتدریج مختلف مرحلوں اور مختلف دوروں سے گذرنا پڑتا ہے۔ تاریخ بظاہر اس کی مخالفت کرتی ہے اور بہت سے نظائر اس کے ملتے ہیں کہ قوموں نے اپنے تمدنی عناصر بدل دئے ہیں۔ اور اپنے قدیم مذہب یا قدیم سیاست و قدیم زبان اور قدیم فنون لطیفہ کے بجائے جدید مذہب، جدید سیاست، جدید زبان، جدید فنون لطیفہ کو اختیار کر لیا ہے بعض قومیں اپنے آبا و اجداد کے مذہب کو چھوڑ کر عیسائی مذہب، بدھ مذہب یا مذہب اسلام کے دائرے

میں داخل ہوگئی ہیں بعض قوموں نے اپنی زبان بالکل بدل دی اور بعض قوموں نے اپنے نظام سیاست اور فنون لطیفہ کو بالکل دوسرے قالب میں ڈھال لیا۔ دور جدید میں بھی اسلامی مدبرین یورپ کی ترقی سے گھبرا کر اپنا چولا اتار کر مغربی رنگ کو اختیار کر رہے ہیں۔ اصول مذہبی میں کاٹ چھانٹ، زبان میں ترمیم، لباس و معاشرت میں تبدیلی، فنون لطیفہ میں دست درازی وغیرہ وغیرہ مزاج عقلی سے کھلی جنگ ہے جو مفید ہونے کے بجائے سخت ضرر رساں اور پستی کی طرف دوڑنا ہے درحقیقت تاریخ ان انقلابات کی روایت میں اپنی قدیم فطری غلطی کی تائید کر رہی ہے ورنہ ہم اگر ان انقلابات و تغیرات کو تحقیق نگاہ سے دیکھیں تو ہمیں نظر آوے گا۔ کہ ان تمام چیزوں کے صرف نام بدل گئے ہیں حقیقت نہیں بدلی۔ الفاظ کی تہ میں جو معنی تھے وہ ابتک زندہ ہیں اور اس میں بہت تھوڑا بعد تغیر پیدا ہوا۔ ہم اپنی تائید میں اگر عناصر تمدنی کا ذکر کریں تو بہت طویل ہوگا اس لئے ہم صرف تمدن کے سب سے بڑے عنصر مذہب کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں تاکہ یہ ثابت ہو جاوے کہ جو نظریہ تمدن کے ایک عنصر پر صادق آتا ہے وہ اس کے دوسرے عناصر پر بھی صادق آسکتا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ مذہبی انقلابات کی تاریخ اس نظریہ کے بالکل مخالف ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ صرف مذہبی تاریخ ہی میں اس نظریہ کی صحت کی یقینی مثالیں ملتی ہیں اور اس میں اس قسم کے دلائل پائے جاتے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انسان اپنے قد و قامت میں خط و خال رنگ و روپ کے بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا اسی طرح کوئی قوم اپنے تمدنی عناصر میں بھی تغیر نہیں پیدا کر سکتی۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تمام بڑے بڑے مذاہب مثلاً بودھ مذہب، ہندو مت، عیسائیت اور اسلام کے حلقہ اثر میں دفعتاً بڑی بڑی قومیں داخل ہوگئی ہیں۔ اور ان مذاہب نے ان کے اصلی مذہب کو دفعتاً بدل دیا ہے لیکن غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں نے اپنے اپنے قدیم مذہب کی حقیقت کو نہیں بدلا ہے صرف ان کے نام کو بدل دیا ہے اور ان جدید مذاہب نے ان کے قدیم مذہب میں کوئی تغیر نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ وہ خود ان کے قدیم عقائد کے قالب میں ڈھل گئے ہیں اس بناء پر اس جدید مذہب کی حقیقت اس قدیم مذہب کے پھیلاؤ اور وسعت سے زائد نہیں بلکہ ان مذاہب میں جو ایک قوم سے منتقل ہو کر دوسری قوم میں آتے ہیں اس قدر تغیر پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف ان کا نام ہی نام باقی رہ جاتا ہے۔

بودھ مذہب اس کی نمایاں مثال ہے چنانچہ جب وہ چین میں داخل ہوا تو اس کی تمام خصوصیات اس طرح مٹ گئیں کہ اول اول علماء نے اس کو ایک مستقل مذہب خیال کیا اور ان کو ایک مدت کے بعد معلوم ہوا کہ یہ بودھ مذہب ہے جس میں چینیوں نے اس قدر تغیرات پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ مذہب ہندوستان، چین، نیپال، سیلون میں بھی قائم ہے لیکن اس کی حقیقت ہر جگہ ایک دوسرے سے مختلف ہے وہ ہندوستان قدیم برہمنی یا ہندو مذہب کی ایک شاخ ہے اور ان دونوں میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے لیکن چین میں وہ اسی مذہب سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جو اس کے پہلے وہاں عام طور پر موجود تھا۔ قدیم ہندو مذہب کی بھی یہی حالت ہے ہندوستان مختلف ذاتوں کا مرکز ہے اور اگرچہ ان سب کا ایک مذہب ہے تاہم ان مختلف گروہوں کے عقاید میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے اگر ہم وید میں ہندوستان کے حقیقی مذہب کی تحقیقات کرنا چاہیں تو ہم کو ان تمام معبودوں سے جو یہاں پوجے جاتے ہیں اور ان تمام عقائد میں سے جو یہاں کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں صرف معدودے چند کا پتہ لگے گا اس لحاظ سے اگرچہ برہمنی مت وید مقدس کی عزت کرتا ہے لیکن اس کتاب نے جس مذہب کی تلقین کی ہے۔ اس کا کوئی جز محفوظ نہیں ہے۔ یورپ میں بھی عیسائیت اختلاف اقوام کی بنا پر ان تغیرات سے محفوظ نہیں۔ مذہبی کتابوں کی تفسیر و تشریح ہر قوم نے اپنے مذاق پر کر کے مختلف مذہب بنا لئے۔ عیسائیوں میں بعض قومیں خالص بت پرست ہیں جیسا کہ برطانیہ

زیریں کے باشندے، اسپین کے عیسائی مخلوقات کو خدا قرار دیتے ہیں۔ اٹلی کے دہقان جناب مریمؑ کے مجسمہ کو خدا مانتے ہیں اسلام بھی اپنے عقیدے کی سادگی کے باوجود اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ چنانچہ ایران، عرب اور ہندوستان کے اسلام میں عظیم الشان فرق ہے۔ ہندوستان میں شرک کا اعتقاد نہایت پختہ طور پر قائم تھا۔ اس لئے ہندوستانیوں نے بت سے تشبیہ خدائی مذہب میں بھی آسانی کے ساتھ بہت سے خدا پیدا کر لئے پیروں کو خدائی صفات دے کر اپنے ہزاروں معبودوں کے ساتھ ان کا بھی اضافہ کر لیا۔

مشرقی بنگال، دکن، مدراس اور سندھ کے بعض اضلاع میں تشبیہات نے اسلام کی صورت اس قدر مسخ ہے۔ کہ ان میں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ مسلمانان الجیریا کی حالت دیکھو، ان میں دو مختلف قبیلے ہیں۔ عرب، بربر اور دونوں مسلمان ہیں لیکن دونوں کے اسلام میں بڑا فرق ہے بربریوں کے اسلام میں اس بت پرستی کی بھی آمیزش پائی جاتی ہے جس کے وہ کارتھیج "دور حکومت سے خوگر ہو گئے تھے" عرب کی جاہلیت کے رواسم و معتقدات آج تک ان کے اسلامی رواسم میں محفوظ ہیں اور ایران کے قدیم مذہبی روایات سے ان کا اسلام خالی نہیں۔

یہ سب شواہد و نظائر اس بات کے ہیں کہ قوم کا مزاج عقلی کسی انقلاب انگیز تحریک سے بھی نہیں بدلتا نہ عناصر تمدنی میں کوئی تغیر ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سرزمین حجاز میں آ کر ایک انقلابی روح کو پھونکا اور ان کی جاہلانہ خصائل کو تھوڑی مدت کے لئے اس انقلاب انگیز تحریک کے ذریعہ کچل دیا۔

لیکن درحقیقت ان کے مزاج عقلی میں سرمو تغیر نہ ہوا اور بانی اسلام کی آنکھ بند ہوتے ہی تمام خصوصیات کو لے کر قوم عرب پھر کھڑی ہو گئی نام کا اسلام تھا لیکن اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے نظریہ میں وہی خصائص قومی کارفرما تھے جو قدیم سے ان میں پائے جاتے تھے۔ جناب امیر علیہ السلام نے اس اسلامی مشن کو اسی طرح سے چلایا جس طرح سے رسولؐ اپنے مشن کو آخری دم تک چلاتے رہے لیکن علوی مشن کو کچھ دشواریاں زائد ہو گئی تھیں۔ اس لئے کہ دائرہ اسلام حجاز سے نکل کر روم و شام و عراق و عمان و ایران و مصر و یمن تک پہونچ چکا تھا۔

اور وہ بھی تبلیغی حیثیت سے نہیں بلکہ قہر و غلبہ جنگ و جدل کے ذریعہ سے۔ لہٰذا اقوام مذکورہ کے تاریخی و تمدنی خصائص کا مقابلہ ایک طرف، ان کی منتقمانہ اسپرٹ ایک طرف یہ مقابلے اس صورت میں جبکہ خود مرکزی اسلام میں اس کی بنیادیں مضبوط نہ تھیں۔

خصوصاً وفات رسولؐ سے جو دھچکا اسلامی مشن کو پہونچا تھا اس کی اصلاح کچھ نہ ہو سکی تھی اس لئے دبی ہوئی چنگاریاں خاندانی عداوتوں اور خود غرضیوں کی بھی بہت کچھ سد راہ تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیہم خانہ جنگیوں کے ساتھ علوی مشن کا مسجد کوفہ میں شہادت کے ساتھ خاتمہ کر دیا گیا۔ امام حسنؑ کے لئے موقع ہی نہ رہا کہ وہ اپنے نانا کی مشن کی علانیہ سرپرستی کرتے لیکن محمدؐ ثانی حسینؑ مظلوم نے اس مفلوج مشن کو کامیابی اور ہنگامی انقلاب کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات کی بنا پر نظر رکھتے ہوئے اپنی سیاسی بنیاد اس سنگلاخ زمین پر رکھی جو ابد الآباد تک کے لئے غیر متبدل ہے اور یہی طرہ امتیاز حسینی مشن کا ہے "حسینؑ منی و انا من الحسینؑ" کا یہی فلسفہ ہے انھوں نے اقوام عالم کی روح مشترک کو سمجھا۔ اور اپنے تدبر و ذہانت سے استقرار تام کر کے اس حد مشترک کو ڈھونڈھ نکالا جو ہمیشہ ہمیشہ اقوام عالم کے مزاج عقلی میں باوجود تباین و اختلاف کارفرما ہے اور اس تلاش و جستجو و الہامی ذہانت پر وہ تاریخ عالم میں ابد الآباد تک کے لئے مبارک باد کے مستحق ہو گئے۔ اسی حد مشترک کو لے کر روح قومی کی تعمیر تین دن کی بھوک پیاس میں اپنے خون سے کر دی۔ جس کو رجز میں آپ نے دشمنوں کے بھرے مجمع میں اعلان کر کے تاریخ کے نہ بھولنے والے اوراق کا سرنامہ بنا دیا اور فرمایا ؎

الموت اولی من رکوب العار
والعار اولی من دخول النار

عزت و ناموس پر جان نثار کر دینا چاہیئے اور جان و عزت کو خدا کی راہ میں دے دینا چاہیئے۔ اسی اصول پر انتہائی مظلومیت کے ساتھ تمام قہر و استیلا ہر قسم کے تشدد و ظلم کا مقابلہ کر کے حق کی طرف داری میں جان و مال و اولاد و عزت نثار کر دی اور اپنے متبعین کو عمل سے صرف اسی کی تعلیم دی۔ یہ ایک ایسا نظام سیاسی تھا جس پر عامل ہونے سے تمام عناصر تمدنی میں کسی قسم کا بھی بدترین ہو عام انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مزاج عقلی اقوام مختلفہ کا کیسا ہی متضاد ہو مظلومیت کا جتنا شدید مظاہرہ ہو گا اتنا ہی شدید انقلاب مزاج عقلی میں پیدا ہو گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تعلیم میں اتنی قوت ہے کہ آج تمام سیاسی فرقوں میں باوجود سخت مغائرت کے اور خیالات کے شدید تناقض کے سب کی ایک ہی حقیقت ہے اور ان کے اندر سے حسینیؑ روح علانیہ جھلک رہی ہے انتہا پسند، شخصیت پرست، سوشلسٹ غرضکہ تمام فرقے مختلف رنگ کی جھنڈیوں کے نیچے ایک ہی منزل مقصود کی طرف جا رہے ہیں۔ اور سب کا نصب العین صرف یہ ہے کہ افراد کو تمام اقوام کی حکومت حسینیؑ کے اندر فنا ہو جانا چاہیئے ہر فرقہ یہ چاہتا ہے کہ قوت و نفوذ حکومت حسینیؑ کے دامن میں اس طرح سمٹ کر آجاویں کہ ہر چیز کی باگ حسینؑ کے ہاتھ میں آجاوے حکومت حسینؑ ہر چیز کی ترتیب دے۔ اور اسی کی طرف تمام چیزیں سمٹ آویں۔ معمولی سے معمولی جزئیات کے متعلق بھی وہ افراد کی زندگی کو قانون حسینیؑ کے شکنجہ میں جکڑ دیوے اور مخلوق کو دنیا کے جھگڑے بکھیڑے سے نجات دلا دے۔ بادشاہ "امپراطور" پریسیڈنٹ غرضکہ حکومت کسی کے ہاتھ میں بھی ہو، افراد کا صرف مقصد یہ ہے کہ امن و امان راحت و اطمینان حاصل ہو اور عدم انتداد کے ساتھ ہمیشہ ناحق کا مقابلہ کریں۔ یہی مقصد تمام قوم میں روح حسینؑ کی ترجمانی کرتا ہے۔ امام حسینؑ کے سچے متبعین اس اصول کو چھوڑ کر کسی

دوسری طرف نہیں جا سکتے اور قوم شیعہ ہر جگہ [illegible] سلطنت و حکومت میں اس کے ساتھ خود بھی زندگی بسر کر سکتی ہے اور دوسروں کو بھی امن و راحت و سلامتی کا پیغام پہونچانے میں کامیاب ہو گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ لیڈروں کی غلط کارروائی سے اس قوم کا تصادم دوسروں سے ہو جاوے لیکن یہ خاموش متین جنگی اسپرٹ کھو کر امن و امان کے گہوارے میں ہر قسم کی جد و جہد میں مشغول رہ سکتی ہے۔

ایک طرف ہمارے نظام تعصبی کا [illegible] اور آسانی کے ساتھ بدلنے والا مذاق ہمیشہ کہتا ہے کہ "کاش اس نظام مظلومیت کے بجائے جو ہر وقت ہم کو ظلم اور تشدد کے مقابلہ میں خاموش رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے اور مرنے رلانے سے بزدلی پر تیار کیا جاتا ہے۔ کوئی دوسرا نظام ہوتا تو ہماری حالت بہتر ہو جاتی" لیکن دوسری طرف شہیدوں کی آوازیں ان کے مزاروں سے آتی ہیں۔ ہماری مظلومیت نے ہمیشہ ظالموں کو رحم پر آمادہ کیا، ہماری مظلومیت نے بڑی بڑی جبار قوتوں کو مسخر کیا، ہماری مظلومیت نے دکھا دیا کہ حق کی حمایت میں غیر متزلزل صبر و استقلال سے خونی ہاتھ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئے، ہماری مظلومیت نے دکھا دیا کہ بہترین تمدنوں اور مہذب ترین اقوام میں ہم سرتاج ہو کر چمک سکتے ہیں، ہماری مظلومیت نے ہر قسم کی ترقیوں کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھلے رکھے ہیں۔ ہمارے جذبہ مظلومیت نے ہماری تعداد نفوس میں روز افزوں افزائش کی اور ہر دلعزیزی اختیار کی، مالی تفوق، علمی تفوق، سیاسی تفوق حاصل کیا۔ پھر آج کیا ہے جو ہم صدیوں کے تجربہ کے بعد اس نظام سیاسی کو چھوڑیں۔ دنیاوی برتری، عالمگیر حکومت جو چاہے حاصل کر دیکھیں ناحق کوشی نہ ہو۔ تشدد نہ ہو بلکہ صبر و استقلال، ہمت و ایثار، قربانی و مظلومیت کے ساتھ۔

یہ وہ نظام ہے کہ جو وجود عالم سے آج تک یکساں کامیاب رہ سکتا ہے اور آج سے قیامت تک صفحات تاریخ کو الٹ ڈالو، میدان رزم کی ہر خون آشام داستان ہنگامی اور وقتی

کامیابیوں کے سوا کوئی ثبات و دوام اپنے دامن میں نہیں رکھتیں (لاینال عهدی الظالمین) خدائی عہد ظالموں سے پورا نہیں ہوتا انتہائی تشدد اور سخت ترین مادی اور جنگی کارگزاریوں کا آخری نتیجہ صلح و سلم و آشتی و محبت ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی قوت چندروزہ اشتداد کے بعد ایک چھوٹی اور کمزور قوم کے آگے جھکنے پر مجبور ہوتی اور اتحاد عمل و اشتراک حکومت کی دعوت دے کر سکون و امن پیدا کر سکتی ہے۔

دنیا کی استبدادی طاقتوں کا خاتمہ ہو گیا اور جتنے بھی استبدادی مظاہرے نئے نئے لباس میں ظاہر ہو کر سب ہی تو چل بسے اور اپنے کیے کی پاداش اٹھانا پڑی۔ (وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون) کسی نے کبھی ظالموں سے ہمدردی نہیں کی نہ ان کے ظلم و تشدد کو سراہا (فما للظالمین من نصیر) لیکن مظلومیت کا دائمی بول بالا رہا اور ہمیشہ ہمیشہ کی فتح مظلومیت ہی کو ہوئی۔ آخری جیت مقتول ہی کی ہے (فلا یسرف فی القتل انہ کان منصوراً) جس قدر دل کھول کر قتل و غارت کیا جاوے گا۔ اسی قدر مظلوم پر فتوحات کے دروازے کھلتے جاویں گے۔ مادہ پرست سمجھیں اور مادی قوتوں کے ظاہری اور فوری نتائج کے پجاری رہیں لیکن وہ حقیقت و واقعیت کو نہیں جھٹلا سکتے پولیس، فوج، آیرو پلین، مشین گن، سبمیرین، زہریلے گیس اور طرح طرح کی مہلک چیزیں انسانی خون آشامی کے لئے ایجاد ہوئیں اور برابر ان ایجادات کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان اقوام کا نہایت بے چینی سے عام مطالبہ ہے، کہ تو اسلحہ حربیہ کی تخفیف ہو، برابر کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ تاکہ جنگ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ تاریخ اس زمانے کی زشت کاری و وحشت و بربریت کے ملعون افسانے آئندہ نسلوں کے لئے نفرت و حقارت کے لئے چھوڑنے والی ہے۔

حسینی مشن نے کیا کیا۔ بنی امیہ کے جبر و تشدد کے مقابلہ پر مقاومت مجہول کی اور کبھی یزیدی ظلم سے تعاون نہ کیا یزید کا بیعت کے لئے جب شدید تقاضہ ہوا اور قانون حکومت کی پابندی کا ولید کے ذریعہ سے شدید مطالبہ ہوا تو امام حسینؑ نے قانون یزید کو ٹھکرا دیا۔ اور "سول نافرمانی" میں ہر جبر و اشتداد کو برداشت کر لیا۔

یزید نے امام حسینؑ کو مدینہ میں امن اور راحت کی زندگی بسر کرنے سے روکا۔ تو امام حسینؑ نے خاص اسی مقام کو منتخب کیا۔ جہاں ان کے پدر بزرگوار کا خون بہایا گیا تھا یزید نے خون حسینؑ کا مطالبہ کیا تو اس حق کے پرستار نے عزیز و اقارب اور بچوں تک کے خون دینے میں دریغ نہ کی۔ یزید نے ہر قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا تو حسینؑ نے مظلومیت کے پیکر میں خود کو پیش کیا۔ یزید نے مردوں کی قربانی کی دعوت دی تو حسینؑ نے عورتوں تک کو اسیری کے لئے پیش کر دیا۔ یزید نے زندگانی دنیا چھوڑنے پر دعوت دی تو حسینؑ نے نعشوں کو بھی کربلا کے ویران و سنسان جنگل میں بے گور و کفن پڑا رہنا گوارا کیا۔

مگر یزید سے نہ تعاون کرنا تھا نہ کیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سرخیل شہداء ہمیشہ کی فتحمندی حاصل کر کے کربلا کے جنگل میں سو رہا اور بنی امیہ ابدالاباد کے لئے نظروں میں دنیا کی ذلیل و رسوا ہو کر تخت و تاج سے محروم ہو گئے

پولیس، قلعہ و فوج؛ ڈاکوؤں، راہزنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کی تادیب و سرزنش کے لئے موزوں ہے اس وقت جبکہ اخلاق و نصیحت، تعلیم و تربیت سب بیکار رہی ہوں یا ہنگامی ہیجانات ہوں۔ لیکن ملکی آزادی اور سیاسی و مذہبی انقلابات میں صرف مظلومیت و عدم تشدد ہی کامیاب ہوا ہے دنیا کے مبلغین و واعظین نے مذہبی انقلابات مظلوم بن کر پیدا کئے۔ محبت و آشتی و رواداری کر کے۔ قوم کیسی ہی سفاک بے رحم و ظالم کیوں نہ ہو لیکن استبدادی مظاہرے کے تحت میں محبت و رحم کا تقاضہ رہتا ہے۔ خود یزید اور اس کے ساتھی باوجود اس سفاکی و بے رحمی کے عین موقعوں پر ظلم و اشتداد سے ندامت و خجالت کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے بہرحال جبر، شدت، قہر و غلبہ، قتل و غارت، قید و بند

جلا وطنی، زد و کوب وغیرہ اگر قوت ہیں تو ان کی ضد بیشک صبر و تحمل، مظلومیت، خاموشی، برداشت و استقلال، ایثار، قربانی، رضا بھی بڑی قوت و طاقت ہے جس میں فتح و غلبہ یقینی ہے اور سابق الذکر قوت میں مشکوک و مظنون یہی روح حسینی ہے جس کے فقدان یا غلط استعمال ہی آج ظلموں پہ شیعہ پست ترین اقوام میں داخل ہو کر بربریت، جہالت نے لندنی کا مظہر بن گئی ہے۔ شہادت امام حسینؑ پکار پکار کر دعوت دے رہی ہے کہ حق و آزادی کی طلب میں انتہائی مصیبت جھیل کر مر جاؤ حق و آزادی کی حمایت میں بڑی سے بڑی قوت سے مقاومت مجبولہ کر کے اس کی تمام ظالمانہ انجمنوں کو باطل کر دو۔

حق و آزادی کے حصول میں بڑی سے بڑی لالچ و رشوت و خوف و ظلم سے نڈر ہو کر بے جگری سے عدم تعاون کر دو۔ حق و آزادی کی غرض سے سب سے زیادہ قانونی احترام کرنے والی حکومت کو سول نافرمانی کر کے بے کار کر دو۔ امام حسینؑ نے یہی کیا اور نانا کے دین کو ہمیشہ کے لئے بچا لیا ؎

سر داد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

قوم شیعہ کے رہبروں اور مصلحوں کا فرض اولیں ہے کہ فلسفہ شہادت امام حسینؑ کا بغور مطالعہ کریں۔ شہادت کے تکالیف و مصائب بیان کر کے رونے رلانے کے ساتھ قوم شیعہ کی تعمیر حسینیؑ تعلیم پر کریں جب قوم میں جذبہ شہادت و ایثار و قربانی، مظلومیت، صبر و استقلال، حق پرستی و آزادی کیلئے پیدا ہو جائے گا وہ قوم بے رٹے بکھڑے ایک دن شرق سے غرب تک حاکم و مالک ہو جائے گی۔

(ان الارض یرثہا عبادی الصالحون)
انھیں نیک بندوں کی تمام روئے زمیں میراث ہے دلیں —
(محرم نمبر سنہ ۱۳۴۹ھ)

(بقیہ ص ۶۷)

...نیا۔ جب ڈھونگ رچانے والوں کی گردن پر تلوار رکھی گئی۔ ...یسا خدا، کیسے انبیا و رسل اور کیسا دین، حسینؑ کی ہاں ایک ...یسی لکیر ہوتی جو بیک جنبش قلم تاریخ صفحات کو قلمزد کر دیتی۔

حسینؑ کی ایک نہیں نے خدا کی خدائی انبیا اور رسل کی ...بوت و رسالت بچالی اور جیسے جیسے مصائب اور شدائد میں ...ضافہ ہوتا گیا "یہ نہیں" قوی سے قوی تر ہوتی گئی اس ...ہیں کی تکرار اور قوت نے یہ بات ثابت کر دیا کہ دین الٰہی ...سی قیمت پر خریدا نہیں جا سکتا۔ حسینؑ کی نہیں نے منصب ...امت کو بھی ثابت کر دیا۔ "یہ نہیں" مصائب کے مقابلہ میں ...ون کر سکتا تھا۔ وہی تو کر سکتا تھا جو خدا پر ایمان رکھتا ہو انبیا ...ایمان رکھتا ہو، دین پر ایمان رکھتا ہو۔ اسی ایمان کی قوت ...نے مصائب کو ہیچ کر دیا۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو کوئی کس لیے شدائد ...یں اپنے کو مبتلا کرتا۔ حسینؑ پر گزرنے والے مصائب کی سنگینی ...ور اس سنگینی میں تمام اضافات سے وجہ حسینؑ کو روشن اور منور کر دیا۔

حسینؑ نے اس لڑائی کے لیے انوکھا سامان مہیا کیا۔ کربلا کو حسینؑ ...سیج بنانا نہیں چاہتے تھے۔ جہاں مقتولین کی گنتی بڑھ جائے حسینؑ کو دین بچانا تھا ملک فتح کرنا نہ تھا۔ حسینؑ نے مجاہدین کی فہرست تیار کی اور اس فہرست میں انھیں لوگوں کو رکھا جن کے خون کے وزن کو حسینؑ جانتے تھے۔

کربلا کی دوپہر کی جنگ ختم ہو گئی اور اس کو ختم ہوئے تیرہ سو دو برس گزر چکے اس جنگ کے بعد تمام مسلمان درست نہیں ہو گئے، مسلمانوں نے اپنی بنائی ہوئی سلطنتوں میں اسلامی نظام قائم نہیں کیا، مگر شہادت حسینؑ نے ایک کام کیا۔ پھر کوئی یزید نہ پیدا ہوا۔ اب کوئی بادشاہ کتنا ہی کجرو ہو کوئی سلطنت کیسی ہی خام ہو، مسلمان کتنے ہی بد وضع ہوں مگر اسلام پر کوئی دھبہ نہیں آ سکتا۔ دین الٰہی کو کوئی غاصب اپنی ذاتی ملکیت نہیں بنا سکتا۔ دین اپنی جگہ پر ہے اس کی ترجمانی ہر کس و ناکس نہیں کر سکتا شہدائے کربلا کے خون کا وزن اتنا گراں ہے کہ کوئی سر نہیں اٹھا سکتا۔ خواجہ اجمیری نے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ جب کہا کہ

"حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ"

جن قوموں کو دنیا میں زندہ رہنا ہے انکو چاہئے کہ اپنے خون کے وزن کو بڑھائیں اور یہ وزن صرف کردار، اعمال اور سیرت سے بڑھ سکتا ہے۔

(محرم نمبر سنہ ۱۳۷۴ھ)

سلسلۂ حیات میں خون کی قدریں
خون شہداء کربلا کا وزن

سید [illegible] حسین صاحب [illegible] ایڈووکیٹ

سلسلۂ حیات میں خون کے مختلف مدارج ہیں کسی خاص نوع کے خون کے کیمیاوی اجزا یکساں ہوں مگر خون کے وزن کا انحصار صرف کیمیاوی اجزا پر نہیں ہے۔ خون کا ایک وہ وزن ہے جسکو SPECIFIC GRAVITY کہتے ہیں یہ تقریباً نوع کی ہر فرد میں مساوی ہے۔ ایک وہ وزن ہے جو صاحب خون کے اعمال سے دریافت کیا جاتا ہے جہانتک ظاہری اعضا و جوارح کا تعلق ہے خالق نے ہر نوع کی ہر فرد کو یکساں ودیعت کیا ہے خون ہر جسم میں ایک ہی طرح گردش کرتا ہے۔ خون کی اس گردش سے اس کی قدر معین نہیں ہوتی۔ انفرادی اعمال سے خون کی قدر معین و مقرر ہوتی ہے۔ ہر ساعت نباتی قتل ہوتا رہتا ہے مگر کسی کو کوئی احساس نہیں ہوتا۔ روزآنہ کیڑے مکوڑے نادانستہ و غیر دانستہ پامال ہوتے رہتے ہیں مگر کسی کو کوئی خیال نہیں ہوتا۔ ہر روز جانور ذبح اور ہلاک ہوتے رہتے ہیں مگر بجز بعض جانوروں کے ذبح کے متعلق سیاسی آواز بلند ہونے کے کوئی مخالف آواز بلند نہیں ہوتی۔ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک نہ معلوم کتنی لڑائیاں کتنی خونریزیاں ہوئیں، کتنی جانوں کا اتلاف ہوا بلکہ بیشتر تو ایسا ہوا کہ انسانوں نے انسان کو صرف اپنے نفع کے لئے موت کے منہ میں جھونک دیا مگر سوا اس کے غریب تاریخ نے خاموش نامہ نگاروں کی طرح ان واقعات اور حادثات کو اپنے سینہ پر ثبت کر لیا اور کوئی نتیجہ سوا ان خونریزیوں سے اصلاح کی اور نہ انسداد کے لئے متنبہ کیا۔ عالمگیر جنگ اول کے واقعات اذہان سے محو ہونا شروع ہی ہوئے تھے کہ دوسری جنگ کے لئے طبل جنگ بجا اور دوسری جنگ کی تباہ کاریاں ہنوز تازہ ہی ہیں کہ تیسری جنگ کے ڈرامہ کی ریہرسل شروع ہو گئی۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نباتی اور حیوانی قتل کسی حیثیت سے قابل لحاظ ہی نہیں ہے۔ اپنی جگہ پر اس کی قدر ہے۔ اسلامی نظام وہ منفرد نظام ہے جس نے نباتی قتل کو بھی ایک خاص مقام پر ممنوع قرار دیا ہے اور پھر یہی وہ نظام ہے جس نے اپنے مقدس دستور العمل میں چرند اور پرند کو اپنی قبیلہ سے شمار کیا ہے اور بنیادی حقوق نظام کے اندر دیا ہے مگر یہاں تو خون کی قدر سے بحث ہے چونکہ انسان ہی مکلف ہے لہذا دستور العمل پر گامزن ہونے یا نہ ہونے یا اس کی مخالفت کرنے سے انسان کے خون کی قدر گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

تاریخی اوراق پر نظر کرنے سے کہیں کہیں ایسے مقامات بھی ملتے ہیں جہاں نوع انسانی کے کسی ایک فرد یا افراد کے خون کے دھبے نظر آتے ہیں اور یہ خون کے دھبے ایسے گہرے ہیں کہ امتداد زمانہ ان کو نہ مٹا سکا۔ یہی تو وہ خون ہے جس نے حیات انسانی کے دھاروں کو بدل دیا ہے۔ اگر یہ خون کے دھبے جابجا تاریخی صفحات پر نہ ہوتے تو انسانیت بجائے اعلیٰ کی طرف جانے کے اسفل کی طرف رجعت قہقری کرتی۔

قدر مقرر کرنے کا معیار شہادت اور افادیت ہے شہادت کے معنی گواہی اور افادیت سے مراد فائدہ پہونچانا ہے عام قتل اور شہادت میں یہی فرق ہے حق کو حق تسلیم کرنا اور

اور انتہائی شدائد کے بعد بھی اس تسلیم و رضا پر قائم رہنا اور جان
دے دینا شہادت ہے۔ ایسے خون کے اثر کا محافظ خود حق ہے
شہید کی زندگی ہمیشہ افادیت کا پہلو لئے رہتی ہے اور اس کی
روزانہ کی پاک و صاف زندگی کی قوت و عظمت ہے جو اس کو
مستقل مزاج بنا دیتی ہے۔ انسان تلون مزاج، حریص اور
خود غرض ہے۔ اگر نظام عالم اسی پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ مرکز سے
بالکل علیحدہ ہو گیا ہوتا۔ یہ چند نفوس قدسی کا احسان ہے کہ انھوں
نے اپنے کو فنا کر کے انسان کو مرکز سے الگ نہ ہونے دیا۔
ان کے خون میں وزن اس جذبہ تسلیم و رضا نے پیدا کر دیا جو
ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا، اور اسی جذبہ
کے ماتحت انھوں نے استقلال و ہمت سے کام لیا۔ انکی زندگی
کردار کے اعتبار سے انفرادی زندگی باقی نہ رہی بلکہ نوع
انسان کی زندگی ہو گئی اور ان کی شہادت کا اثر قانون فطرت
کی طرح غیر قانونی ہو گیا۔

خدا نے اپنے آخری نبی کو بھیج کر دین کو کامل کر دیا، دستور العمل
کو سمیٹ کر ایک جامع کتاب میں منضبط کر دیا۔ یہ دین
آدم سے لے کر خاتم تک کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور ایک
ایسا سرمایہ تھا جو کسی نسبت پر ضائع کرنے کے قابل نہ تھا۔
دین وہی دین ہے جس کی نیابت اور نقابت وہی ہستیاں کریں،
جن کو [illegible] ازل نے سندیں دی تھیں۔ سند ملنا کوئی
آسان کام نہ تھا۔ خدا کے سامنے اعتبار قائم کرنا تھا۔
مبارک ہیں وہ ہستیاں جنھوں نے پیش خدا اپنا اعتبار قائم
کیا اور عہد کیا کہ کسی صورت میں ہم دین پر آنچ نہ آنے دیں گے،
اور ہمیشہ دین کے لئے سینہ سپر رہیں گے اور ضرورت ہوگی تو
جان و مال، اولاد سب دین پر نثار کر دیں گے۔

دین کا کام انسان کے اندر جو حیوان ہے اسکو فنا کرنا ہے
اور یہ اسوقت تک فنا نہیں ہو سکتا جب تک کہ مطلق آزادی
کی حد بندی نہ کی جائے اور فرائض و حقوق کی بنیادیں نہ قائم
کی جائیں۔ انسان نے ہمیشہ ان حدود کو توڑنے کی کوشش کی،
خاتم النبیین کے بعد جمہوریت تو آئی یا جمہوریت نوازی کے

ایران میں حدود کو توڑنے کی خواہش عود کر آئی، اور یہی سبب ہے کہ
جمہور نے ان ہستیوں سے گریز اور بغاوت کی جو دین کے
حدود کو باقی رکھنا چاہتی تھیں۔ یعنی اس حد تک بات پہنچ گئی تھی
کہ اپنے زعم میں یزید بن معاویہ مسند رسول پر بیٹھا اور شام کے
علاوہ اہالیان مکہ و مدینہ نے بھی اس پر رضامندی کا اظہار کیا
ان ہاتھوں کو قطع کر دینے کے بعد جو ذمہ دار ہستیوں کی
موافقت میں اٹھ سکتے تھے ان گلوں کو کاٹ دینے کے بعد جن سے
دین کی موافقت میں آواز بلند ہو سکتی تھی، ان دلوں کی دھڑکنوں
کو خاموش کر دینے کے بعد جن میں صحیح جذبات و احساسات پیدا
ہو سکتے تھے، یزید کے لئے یہ آسان تھا کہ حسینؑ بن علیؑ سے
بیعت کا طالب ہوتا۔ بیعت کے معنی بجز اسکے اور کچھ نہ تھے کہ حسینؑ
اس پر راضی ہو جائیں کہ یزید نائب خدا ہو کر دین کی جس طرح
چاہے ترجمانی کرے۔ یزید نے بھی آخری بازی لگائی تھی۔ یہ جبار کی
کا آخری پانسہ تھا۔ یزید کا رویہ کوئی نیا نہ تھا اس نے اپنے پیشروں
کے طرز میں موقع کا لحاظ کرتے ہوئے صرف شدت پیدا کر دی تھی
یزید اتنا جاہل نہ تھا کہ وہ بات نہ سمجھتا، وہ حسینؑ کی عظمت کو
خوب سمجھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کی مملکت کی ہر فرد
اس کی بیعت کرے اور حسینؑ بیعت نہ کریں تو ایسی بیعت بیکار
ہو گی، اور اگر حسینؑ نے بیعت کر لی تو پھر کسی کی پرواہ نہیں ہے۔
حسینؑ کی ایک سند اسکے لئے تمام عالم کے مقابلہ میں حجت ہو جائے
گی، اور یہی وجہ تھی کہ اس نے نبرد آزمائی کے لئے حسینؑ کا انتخاب کیا
جس طرح محمدؐ کی نبوت باوجود اسکے کہ آپ مدینہ اور مکہ
میں رہے سارے عالم کے لئے ہے اسی طرح حسینؑ کی شہادت
حالانکہ وہ کربلا میں واقع ہوئی سارے عالم کے لئے ایک سبق ہے
حسینؑ کا موقع ایک اہم موقع تھا، تاریخ میں شاذ ہی کوئی
ایسا موقع آتا ہے جہاں کسی فرد کی ذمہ داری اسقدر وزنی ہو جائے
کہ اس کی ایک ہاں یا نہیں پر کائنات کے مسائل کا حل منحصر ہو،
اگر حسینؑ آج بیعت کے مسئلہ پر ہاں کر دیتے تو ماہ خدا کی خدائی
رہتی اور نہ انبیاء کی رسالت۔ تاریخ یہی کہتی کہ شروع سے
آخر تک سب ایک ڈھونگ تھا اور یہ ڈھونگ اس وقت

(بقیہ ۱۶۵ پر)

فرضِ ایمانی

فضیلت مآب جناب مولانا مولوی محمد قطب الدین عبدالولی صاحب قبلہ (مرحوم)
فرنگی محل لکھنؤ

بمقامیکہ نشان کفِ پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

ہم لوگ سرکار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جمیع منتسبات کے ساتھ شیفتگی محبت اور عشق کو عین ایمان اور مذہب جانتے ہیں قرب حق، طاعت وعبادت مولا سب اسی ایک جذبہ میں مضمر ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سلف نے جو کچھ کیا اور جو ثمرہ دینی و دنیاوی حاصل ہوا سب بدولت نقش برداری و جاں نثاری سرکارؐ اور آپ کے منتسبات کے تھا خصوصاً گروہ انصار کا عہد رسالت پناہ سے یہی ایمان و اسلام ہے کہ حضور اور آپ کی ذریت کے لئے جان و مال وعزت و آبرو نثار کرتے رہے ہیں جس کی شاہد حدیث کی کتابیں اور سیر کی روایتیں ہیں حتی کہ مشہور واقعہ کربلا میں بھی حضرت ایوب انصاری کے بیٹے اور پوتے معیت امام میں شہید ہوئے اس وقت بھی جاں نثاری کا ثبوت دیا اللھم اجعلنا منھم الحاصل ہمارا اور ہمارے اکابر کا عقیدہ ہے کہ حضرت رسالت پناہ اور آپ کی ذریت آپ کے اصحاب آپ کی ملت کے علماء آپ کے شہر آپ کے ہر دو کرار اور آپ کے جمیع آثار کی حسب مرتبہ عظمت و محبت باعث تقویت ایمان بلکہ عین ایمان ہے اس وقت آثار متبرکہ معابد مقدسہ جن میں سرکار کے متعلقین سرکار کے صاحبزادے سرکار کے جاں نثار مدفون ہیں جو ہماری آنکھوں کے نور اور دل کا سرور ہیں۔ وحشی نجدیوں نے مسمار کرکے جو اذیت پہونچائی ہے۔ اس کی نظیر بجز وحشیوں کی تاریخ کے کہیں نہیں ملتی۔

منتقم حقیقی جلد اس مصیبت کو دفع کرے اور ہم کو دفاع کی قوت اور توفیق عطا فرمائے۔

اللھم آمین

سرفراز محرم نمبر سنہ ۱۳۴۵ھ

رونا منافی صبر نہیں!

عالی جناب مولانا سید سلیمان عباس صاحب بی اے ایم اسپاز قیصر باغ لکھنؤ

ایک عام مغالطہ ہے کہ مصائب میں رونا منافی صبر ہے۔ لوگ صبر کے معنی "نہ رونا" سمجھتے ہیں اور صبر کا تعلق صرف مصائب و آلام ہی سے جانتے ہیں۔ اسی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ میرے ایک انگریزی کے استاد نے ایک مرتبہ میر انیس مرحوم پر یہ اعتراض کیا کہ انھوں نے اپنے مرثیوں میں امام حسینؑ کے کردار کو متضاد حیثیت سے پیش کیا ہے کیونکہ کہیں امام حسینؑ ہیں کہ تیر دن کی عید ادن میں نماز پڑھتے ہیں، تین دن کی بھوک پیاس میں دلیری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور صبر و سکون کے ساتھ لاشہ ہائے شہداؑ کو اٹھا اٹھا کر لاتے ہیں۔ ششماہے کو اپنے ہاتھوں پر قربانی پیش کرکے دکھلایا ہے اور کہیں انصار کے جنازے پر روتے، جدائی علمدار پر گریہ کرتے، شبیہ پیغمبرؐ پر آنسو بہاتے، سکینہؑ کو لپٹا کر اشکوں سے منہ دھوتے بیان کیا ہے، اور یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ نیز اسی مغالطہ کا یہ نتیجہ ہے کہ اکثر دوسرے پیرایہ میں اقبال سہیل یہ نظم کر گئے ہیں کہ ؎

وہ روئیں جو قائل ہیں ممات شہدا کے
ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

اس مغالطہ کا تفصیلی جواب تو اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔ ہاں کچھ ایسے اشارے کئے جا سکتے ہیں جن سے یہ مغالطہ رفع ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلے یہ معلوم ہونے کی ضرورت ہے کہ دراصل صبر کیا ہے؟ لغتاً اور شرعاً اس کی کیا تعریف ہے؟ نفسیاتی اور اخلاقی طور پر صبر کا تعلق کن قوتوں سے ہے؟ پھر یہ دیکھنا ہے کہ رونا کیا ہے؟ اس کے حدود کیا ہیں؟ انسان کیوں اور کیوں روتا ہے؟ رونا ایک فطری چیز ہے یا غیر فطری؟ رونا مرضی خدا اور رسولؐ کے خلاف ہے کہ نہیں؟ خود ہمارے نبیؐ کا طریقہ کیا رہا ہے؟ دیگر انبیاء و مرسلین روئے ہیں یا نہیں؟۔

یوں تو ان میں کی ہر جز کی مستقل مقالہ چاہتی ہے مگر اجمالاً ہر ایک کے لئے کچھ اشارے ضروری ہیں۔ لغت میں صبر کے معنے ہیں "کسی ناپسندیدہ امر پر نفس کو جزع و فزع کرنے سے روکنا" یعنی ناپسندیدہ امر کو برداشت کرتے ہوئے انتشار ذہنی و اضطراب اعضاء سے بچنا۔ نہ ہوش و حواس کھو کے اور قوت فکریہ معطل ہو جائے اور نہ ایسے خلاف معمول فطرت حرکات کرے جن پر عقلاً مذمت کریں۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ صرف مصائب و آلام میں استقامت کا نام صبر ہے حالانکہ جیسا اس تعریف سے پتہ چلتا ہے صبر کا تعلق ہر اس امر سے ہے جو ناپسندیدہ ہو۔ خواہ اس کا تعلق قوت غضبیہ سے ہو خواہ قوت شہوانیہ اور قوت عاقلہ سے۔ اور ان تینوں قوتوں میں فضائل کے جو پہلو نکلتے ہیں ان میں صبر ہی کار فرما ہوتا ہے۔ مثلاً معرکوں میں جہاں قوت غضبیہ کا مظاہرہ ہوتا ہے اگر دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ جائے تو یا جبن اور بزدلی پیدا ہوگی، اور انسان میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے گا یا تہور کا مظاہرہ ہوگا اور انسان بے سمجھے بوجھے مہلکے میں پڑے گا، اور اگر صبر و سکون سے کام لے کر قوت غضبیہ کو حد اعتدال کے ساتھ استعمال کیا تو شجاعت کا مظاہرہ ہوگا اور وہ شخص شجاع کہلائے گا۔ اگر قوت غضبیہ کے استعمال کا محل ہی نہیں ہے اور اختیاراً اس کو معطل کرکے غیظ و غضب کو پی جائے تو حلم و بردباری کا مظاہرہ ہوگا جسکو "کظم غیظ" کہتے ہیں اور اس صفت سے متصف کو حلیم و کاظم کہتے ہیں۔

اسی طرح خواہش لباس و طعام، آرزوئے جاہ و حشم اور حرص مال و منال کا تعلق قوت شہوانیہ سے ہے۔ اگر اس میں انسان صبر سے کام نہ لے تو جائز و ناجائز کا امتیاز جاتا رہے گا اور حریص بنکر نہ جانے کتنے گناہ اور بد اخلاقیوں کا ارتکاب کرے گا۔ اور اگر صبر سے کام لیا یعنی خواہشات پر قابو حاصل کر کے جائز سے فائدہ اٹھایا اور ناجائز سے پرہیز کیا تو عفیف کہلائے گا اگر جائز کے ترک پر بھی صبر کیا اس لئے کہ روز قیامت زیادہ حساب نہ دینا پڑے اور امکان گناہ کم ہو جائے تو زہد کا مظاہرہ ہوگا اور وہ شخص زاہد کہلائے گا اور اگر جائز کو ترک کر کے خود اپنے پر تکلیف برداشت کی اس لئے تاکہ دوسروں کو آرام پہونچائے تو یہ ایثار کی منزل ہوگی اور اس شخص کو موثر کہیں گے۔ اسی طرح قوت عاقلہ بلکہ ان تینوں قوتوں کے ماتحت اور جو دوسرے فضائل نفسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی صبر ہی کار فرما ہوتا ہے اور جہاں جہاں رذائل نفسانی ملیں گے وہاں یا تو فقدان صلاحیت ہوگا یا فقدان صبر۔ بغیر صبر کے نہ ایمان واسلام کامل ہو سکتا ہے نہ فضائل و حسنات حاصل ہو سکتے ہیں۔

صبر ایک عام چیز ہے اس کا تعلق ہر فضیلت سے ہے اسی لئے قرآن میں جابجا اسکا ذکر عمومیت کے ساتھ آیا ہے اور کہیں مجاہدین کو صبر کی دعوت دی گئی ہے کہیں مہاجرین کو، کہیں اغنیا و صاحبان ثروت کو صبر کی تلقین کی گئی ہے کہیں غربا و صاحبان عسرت کو۔ کہیں مومنین کو صبر کی ہدایت کی گئی ہے کہیں انبیاء و مرسلین کو۔ فضیلت صبر کی عمومیت کا یہ نتیجہ ہے کہ خدا نے بحکم عام و عدۂ عام فرمایا کہ "اصبروا ان اللہ مع الصابرین" صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یا "انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب" صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔ "واللہ یحب الصابرین" اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح احادیث میں بھی صبر کی عمومیت اور اس کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ صبر صرف غم و الم ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق طرب و نشاط سے بھی ہے صرف معاصی سے نہیں بلکہ طاعات سے بھی ہے چنانچہ حدیث رسولؐ ہے کہ صبر کی تین صورتیں ہیں (۱) مصیبت پر صبر (۲) طاعت پر صبر (۳) معصیت پر صبر۔ مصیبت پر صبر کرنے والے کو تین سو مدارج ثواب ملیں گے اور ادائے طاعت پر صبر کرنے والوں کو چھ سو اور ترک معصیت پر صبر کرنے والوں کو سات سو۔ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مصائب و آلام میں صبر کر لینا آسان ہے بہ نسبت طاعات پر صبر کرنے کے اور عبادت کا بجا لانا آسان ہے بہ نسبت ترک معاصی پر صبر کرنے کے۔

اہمیت صبر کا یہ عالم ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "الصبر من الایمان بمنزلۃ الرأس من الجسد" یعنی صبر کا ایمان سے وہی تعلق ہے جو سر کا جسم سے ہے "لا ایمان من لا صبر لہ" جو صبر نہیں رکھتا وہ ایمان بھی نہیں رکھتا۔ ایک حدیث میں ہے کہ "الصبر نصف الایمان" صبر نصف ایمان ہے کہیں فرمایا ہے کہ "الصبر راس الایمان" صبر جسم ایمان کے لئے سر کا مرتبہ رکھتا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ "صبر کے معنی یہ ہیں کہ لب پر کوئی شکوہ اور گلہ نہ ہو"

ان چند شواہد سے معلوم ہو گیا کہ صبر کا محل صرف مصائب و آلام ہی نہیں بلکہ میدان قتال، خزائن زر و مال اور مسند جاہ و جلال بھی ہے۔ اور یہ کہ صبر کی ضد آنسو بہانا اور رونا نہیں ہے بلکہ موقع اور محل کے بدلنے سے صبر کی ضدیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً مصائب و آلام میں صبر کی ضد جزع و فزع یعنی خوف کھانا۔ ہوش و حواس کا بجا نہ رکھنا۔ قلب و دماغ کا منتشر رکھنا۔ شکوے شکایت کرنا ہے۔ اور میدان قتال میں صبر کی ضد فرار یا تہور ہے اور صبر سے کام لینا شجاعت۔ محل خواہشات میں صبر کی ضد حرص و طمع ہے اور صبر کرنا عفت۔ زر و مال میں صبر کی ضد بخل ہے اور صبر کرنا سخاوت۔ احکام الٰہی میں صبر کی ضد سرکشی و نافرمانی ہے اور ان کی پابندی میں صبر کرنا طاعت و عبادت

مہنیات الٰہی میں صبر کی ضد عصیان و گنہگاری ہے اور ان کے ترک
پر صبر کرنا تقویٰ و پرہیزگاری۔ لہٰذا یہ کہنا کہ صبر کی ضد رونا ہے بالکل
غلط ہے۔ جزع و فزع کے معنی فطری اشک ریزی یا آنسو بہانا نہیں
ہے بلکہ خلاف معمول فطرت حرکات کا صادر کرنا جزع و فزع کہلاتا ہے
مزید توضیح کے لئے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ رونا کیا ہے؟
جس طرح مسرت کے نتیجہ میں انسان کو ہنسی آتی ہے اسی طرح غم والم
اور درد دیکھنے سے انسان کو رونا آتا ہے۔ مسرت ہو یا غم۔ قلب
میں دونوں سے ایک حرارت پیدا ہوتی ہے۔ مگر غم کی حرارت بہت
شدید ہوتی ہے .. .. اور مسرت کی نسبتاً
کم۔ دل پر چوٹ لگتی ہے تو حرارت بخارات پیدا کرتی ہے جو پانی
کی شکل میں آنسوؤں کے آنکھوں سے جاری ہو جاتے ہیں ہنسنے میں بھی
یہ آنسو نکلتے ہیں مگر اس قدر سرعت کے ساتھ نہیں جس قدر کہ رونے
میں بلکہ جب ہنسی انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے تو آنکھوں سے
آنسو نکل پڑتے ہیں۔

دل کے مسرور ہونے سے ہنسی کا آجانا ایک انسانی فطرت
ہے۔ اسی طرح دل پر غم کی چوٹ لگنے سے آنسو کا نکلنا اور رونا بھی
ایک فطری چیز ہے۔ آواز سے رونے اور صرف آنسو نکلنے میں وہی
نسبت ہے جو تبسم و قہقہہ میں ہے۔ یہ دونوں چیزیں شدت و خفت
غم و مسرت یا شدت و خفت کے احساس کے نتیجہ میں رونما ہوتی ہیں
ان دونوں فطری افعال کا مظاہرہ فطرت کی آغوش میں پلنے والے
بچہ سے برابر ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ رونے کا سبب دل کا دکھنا
اور دل پر چوٹ کا لگنا ہے اور بچوں کے دل بہت نازک ہوتے
ہیں اس لئے وہ ذرا ذرا سی بات پر رویا کرتے ہیں۔ مگر جیسے جیسے
دل قوی ہوتا جاتا ہے اور برداشت کی قوت بڑھتی جاتی ہے
بات بات پر رونا کم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جوان ہو کر انسان
اسی وقت روتا ہے جب کوئی غیر معمولی غم اس کے دل کو زخمی کر
دے بعینہٖ یہی حال ہنسنے کا بھی ہے۔ اس کے بھی یہی مراتب ہیں۔
رونا اور ہنسنا گو فطری امر ہے مگر ان دونوں کے حدود میں نرمی
یہ ہے کہ بات بات پر ہنسے یا بات بات پر رو دے نہیں بہتر
یہ ہے کہ کسی بات پر نہ رو دیجئے نہ ہنسیے وہ فقدان صلاحیت۔

لازم آئے گا یا فقدان احساس۔ اب یہ سوال ہے کہ آیا دل کو
اتنا سخت بنا لیا کہ احساس مٹ جائے اور غیر معمولی غم کا بھی اس
کے دل پر اثر نہ ہو اچھی بات ہے یا بری۔ فطرت انسانی کا مطالعہ
کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس قدر سخت دلی اور قساوت قلبی انسانیت
کے خلاف ہے۔ کمال یہ نہیں ہے کہ انسان اتنا سخت دل ہو جائے
کہ اس پر اپنے یا کسی کے غم والم کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔ دل پر چوٹ ہی
نہ لگے اور آنسو ہی نہ نکلیں۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ دل دکھے آنسو نکلیں
مگر لب پر شکوہ نہ ہو۔ کوئی فعل منافی عقل یا خلاف مرضی الٰہی صادر
نہ ہو۔ اگر بھوک ہی نہیں اور کھانا دوسرے کو کھلا دیا یا خواہش
ہی مردہ ہے اور گناہ نہ کیا تو کیا کمال۔ در اصل کمال تو یہ ہے کہ
بھوک ہو مگر دوسرے کو کھلا دے خواہش ہو مگر معاصی سے پرہیز
کرے اور صبر کے جادے سے ہٹ نہ بیٹھے۔

غم والم میں رونا مگر دامن صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دینے
کی مثال اس مجاہد کی سی ہے جو زخم پر زخم کھاتا ہے جسم سے خون
جاری ہے مگر نہ لب پر شکوہ ہے نہ میدان سے قدم ڈگمگاتے ہیں جس
طرح جسم پر تلوار لگنے کے بعد خون کا بہنا ایک فطری چیز ہے اسی
طرح دل پر غم کی چوٹ لگنے کے بعد آنسو کا بہنا بھی فطری امر ہے اور
جس طرح خون کے بہنے سے استقامت مجاہد پر کوئی دھبہ نہیں آتا
اسی طرح آنسو کے بہنے سے صبر محزون پر پانی نہیں پھرتا بلکہ خون
مجاہد چہرہ جہاد کا غازہ ہے اور اشک محزون انسانیت اور رحم
دلی کی آبرو۔ زخم کھا کر خون نہ نکلنا جسم مردہ کی خاصیت ہے
اور غم کی چوٹ لگنے کے بعد آنسو نہ نکلنا دل مردہ کی علامت
ہے۔

کون ایسا انسانی دل ہے جو غم والم سے متاثر نہ ہو۔ دوسروں
کو مصائب و پریشانی میں دیکھے اور غمگین نہ ہو کسی کو زخم پر زخم کھاتے
دیکھے اور آنسو نہ نکل پڑیں۔ شاید کوئی شقی القلب اور پتھر دل
کار تھے والا ہو جس پر یہ فطری تاثرات نہ ہوں۔ بلکہ ایسا دل
تو پتھر سے بھی سخت تر ہے کیونکہ کبھی پتھر دل سے بھی پانی کے چشمے
جاری ہو جاتے ہیں۔ پتہ چلا کہ خداوند عالم ایسے ہی سخت اور
شقی القلب آدمیوں کے بارے میں فرماتا ہے [illegible]

اس کے بعد سخت ہو گئے پس وہ مثل پتھر کے ہو گئے بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔ کیونکہ بعض پتھر تو ایسے بھی ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ جگہ جگہ دراڑ سے پانی نکلتا ہے۔

رقت قلب اور رحمدلی ہی انسانوں اور فرشتوں کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ کمال صبر پر فائز انبیاء و مرسلین نے گریہ و بکا کو چہرۂ انسانیت کا غازہ بنایا اور غم کے آنسوؤں اور اشک ندامت سے اپنی آبرو بڑھائی۔ حضرت آدمؑ نے فراق جنت یا ترک اولیٰ پر اشکوں کے چشمے بہائے۔ جناب یعقوبؑ نے فراق یوسفؑ میں روتے روتے آنکھوں کی بصارت کھو کر بصیرت حاصل کی کیونکہ یہ بھی ایک امتحان تھا۔ جناب ایوبؑ مصائب پر روتے رہے مگر کوئی گلہ نہیں کیا اس لئے کامیاب ہوئے اور تقرب حاصل کیا۔ جناب یحییٰؑ آنسوؤں سے زمین صحرا کو تر کر کے رحمت الٰہی کے مستحق ہوئے۔ جناب عیسیٰؑ نے محتاجوں اور یتیموں کے حال پر اشک آلود ہو کر مسیحا کا لقب حاصل کیا۔ جناب محمد مصطفیٰؐ نے اپنے اور اپنے اہلبیتؑ کے مصائب پر آبدیدہ اور دوسروں کے حال زار پر رحم کھا کر رونے کی وجہ سے رحمۃ للعالمینؐ ہونے کا شرف حاصل کیا۔

ظاہر ہے کہ ہمارے رسولؐ مقبول تمام انبیاء و مرسلین پر سبقت لے گئے ہر فضیلت میں افضل تھے خواہ وہ فضیلت صدق و صفا ہو۔ یا فضیلت زہد و اتقا خواہ فضیلت شجاعت و سخاوت ہو یا فضیلت صبر و رضا۔ کیا رسولؐ مقبول سے زیادہ کوئی صابر ہو سکتا ہے؟ اس کمال صبر پر فائز سید المرسلین نے اپنے بیٹے ابراہیمؑ کی وفات پر آنسو نہیں بہائے بلکہ جب کسی صحابی یا مومن کو کرب میں دیکھا، جیسے حالوں یا نزع و احتضار کے عالم میں دیکھا بے ساختہ آبدیدہ ہوئے، روئے اور دوسروں کو رلایا۔ اگر رونا خلاف صبر ہوتا تو خلق عظیم پر فائز رسولؐ کبھی نہ روتے۔

انس ابن مالک سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہؐ کے ساتھ آپ کے بیٹے ابراہیمؑ کے پاس گیا۔ رسولؐ نے ابراہیمؑ کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ پھر دوبارہ ابراہیمؑ کے پاس تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ دم توڑ رہے ہیں یہ دیکھ کر رسولؐ کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ عبدالرحمٰن ابن عوف نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ آپ رو رہے ہیں؟ رسول اللہؐ نے جواب دیا کہ اے ابن عوف یہ رحمدلی کی علامت ہے۔ پھر آپ نے اور فرمایا کہ آنکھ روتی ہے، دل محزون ہوتا ہے مگر ہم ایسی کوئی بات منہ سے نہیں نکالتے جس پر خدا راضی نہ ہو۔

ابو امامہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبیؐ کی خدمت میں اس وقت آیا جب آپ کے فرزند ابراہیمؑ کی وفات ہو گئی تھی اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس شخص نے کہا۔ یا رسول اللہؐ آپ اس چھوٹے سے بچے پر روتے ہیں! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنایا ہے کہ میں نے اپنی جاہلیت کے زمانے میں اپنے بارہ لڑکوں کو دفن کیا اور زمین میں تو پ دیا۔ اور وہ کل کے کل اس بچہ سے زیادہ سن رکھتے تھے۔ (مطلب یہ کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا) نبیؐ نے فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم میں رحمدلی ہوتی تو ضرور اثر ہوتا۔ اور فرمایا کہ ہمارا قلب محزون ہوتا ہے آنکھیں روتی ہیں مگر ہم کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہیں نکالتے جو مرضی الٰہی کے خلاف ہو۔"

زبیر ابن بکار سے روایت ہے کہ نبیؐ جب ابراہیمؑ کو ان کی وفات کے بعد لے کر نکلے تو پیدل گئے۔ ابراہیمؑ کی قبر کے پاس بیٹھے ان کو قبر میں اتارا اور بغیر آخری دیدار کے دفن کر دیا۔ مگر رسولؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے صحابہ نے دیکھا تو سب نے رونا شروع کیا اور کہا یا رسول اللہؐ آپ رو رہے ہیں حالانکہ آپ رونے سے منع فرماتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا آنکھیں روتی ہیں اور دل دردمند ہوتا ہے مگر ہم کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہیں نکالتے جو خلاف رضی الٰہی ہو۔ صحیح مسلم میں مسلم نے روایت بیان کی ہے کہ نبیؐ نے اپنی مادر گرامی کی قبر کی زیارت کی اور گریہ فرمایا اور آپ کے رونے نے ان سب کو رلایا جو آپ کے گرد تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب عثمان ابن مظعون جن کے نام پر علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ایک فرزند کا نام عثمان رکھا تھا، نے وفات پائی تو رسول اللہؐ نے ان کے چہرہ سے چادر

بٹھا کر ان کی پیشانی کا بوسہ دیا اور اس کے بعد بڑی دیر تک رو یا کئے۔ الی آخرہ

اسامہ ابن زید سے روایت ہے کہ امامہ بنت زینب جب دم توڑ رہی تھی تو رسول اللہ تشریف لائے اور فرمایا کہ جو چیز لے لی جائے وہ بھی اللہ کی ہے اور جو عطا ہو وہ بھی اسی کی ہے، رب کے لئے ایک مدت معین ہے۔ اس کے بعد آپ روئے تو سعد ابن عبادہ نے کہا کہ آپ روتے ہیں یا رسول اللہ حالانکہ آپ نے رونے کو منع فرمایا ہے۔ رسول اللہ نے جواب دیا کہ رونا رحمدلی اور رقت قلب کی علامت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے قلب میں قرار دیا ہے اور اللہ اپنے بندوں میں سے انھیں پر رحم کرتا ہے جو رحمدل ہوتے ہیں۔

عبداللہ ابن جعفر ابن ابی طالب فرماتے ہیں کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب رسول اللہ میری مادر گرامی کے ہاں تشریف لائے اور میرے پدر بزرگوار کی خبر مرگ سنائی تو میں نے دیکھا کہ آپ میرے اور میرے بھائی کے سر پر دست شفقت پھیر رہے تھے اور آپ کی آنکھوں سے اس قدر آنسو جاری تھے کہ ڈاڑھی سے ٹپک رہے تھے۔ الی آخرہ

سعد ابن عبادہ کسی مرض میں مبتلا ہوئے رسول اللہ جب ان کی عیادت کو آئے تو ان کو غش میں پڑا پایا۔ آپ نے پوچھا کیا انتقال ہو گیا؟ لوگوں نے کہا کہ نہیں، رسول اللہ نے رونا شروع کیا۔ آپ کو روتا دیکھ کر سب لوگ رونے لگے پھر آپ نے فرمایا تم لوگ سنتے نہیں (دیا دیکھو) اللہ آنکھوں سے آنسو کے نکلنے یا دل کے محزون ہونے پر عذاب نہیں نازل کرے گا مگر اس (زبان کی طرف اشارہ فرما کر کہا) اس کی وجہ سے عذاب کرے گا یا رحم فرمائے گا۔

مطلب یہ کہ رونا دھونا یا محزون و غمگین ہونا خلاف صبر نہیں بلکہ کوئی ایسا کلمہ زبان پر لانا جو مرضی الٰہی کے خلاف ہو منافی صبر اور گناہ ہے۔

اسی قسم کی اور بہت سی حدیثیں کتب صحاح میں موجود ہیں۔ صحیح بخاری میں جناب عائشہ سے بھی رسول کے گریہ فرمانے کے متعلق حدیثیں مذکور ہیں۔ رسول نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں ایک بشر ہوں جس پر تمام فطری تاثرات ہوتے ہیں مگر دامن صبر نہیں ہاتھ سے چھٹنے پاتا۔

اب ذرا ان سخت دلوں سے پوچھئے کہ رسول اللہ کا ان مواقع پر گریہ فرمانا مثلاً شہادت جعفر طیار پر گریہ کرنا۔ معاذ اللہ رسول حیات شہدا کے قائل تھے یا ممات کے۔ دراصل اک حسین غریب پر نہ رونے کے لئے یہ سب سخت دل سیاہ باطنوں کے لاطائل حیلے ہیں۔

ان احادیث میں کہیں کہیں جو اس کا ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ نے رونے سے منع فرمایا اور خود روئے اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ نے اول تو اس قسم کے غم منانے اور گریہ و بکا سے منع کیا ہے جس میں صبر و رضا بہ قضاء و قدر الٰہی مفقود ہو جائے خدا سے گلہ و شکوہ کرنے لگے۔ مثلاً ہائے اللہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا یہ بڑا ظلم ہوا۔ اے خدا تیرا رحم و کرم کیا ہوا؟ اور اسی قسم کے الفاظ جو خلاف شان صبر و رضا ہوں استعمال کر کے نالہ و بکا کرنا۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہ نے ان نو مسلموں کو ان کے کفار یا منافقین باپ، بھائی، دیگر اعزا و اقربا کی موت پر رونے سے منع کیا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ منافقین اور اعدائے اسلام کی موت پر رونا ان سے محبت کی علامت ہے اور ان سے محبت یا اظہار محبت خلاف حُبِّ خدا و رسول ہے اس لئے جائز نہیں کسی کی مصیبت یا موت وغیرہ پر اسی وقت کوئی روتا ہے جب رونے والے کو اس مصیبت زدہ یا اس مردہ سے کوئی قلبی لگاؤ اور محبت ہو یا کم از کم اس سے کسی منفعت کی امید رہی ہو جو منقطع ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام صورتوں میں کسی کافر و منافق کی موت پر آنسو بہانا جو اسلام کا دشمن رہا ہو جائز نہ تھا اس لئے ان لوگوں کو اس کی ممانعت کی گئی مگر کسی مومن کی موت پر رونا چونکہ اس مومن سے محبت کی علامت ہے اور قلبی لگاؤ کی دلیل ہے اس لئے رسول اللہ نے گریہ فرمایا۔ مگر اس فرق کو نہ سمجھنے والوں کو معاذ اللہ رسول کا یہ فعل متضاد معلوم ہوا اور اعتراض کر بیٹھے۔ اس لئے رسول

نہ کہیں صورت گریہ کو تباہ کر دیں اور محزون ہوں مگر کوئی کلمہ خلاف مرضی الٰہی منہ سے نکالیں۔ اور کہیں دوسری روایتوں میں جن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بتایا کہ جس گریہ و بکا سے منع کیا گیا ہے وہ کفار و منافقین پر گریہ کرنا ہے یا ایسا نالہ و گریہ جس سے کسی خلاف صبر و رضا فعل کا مظاہرہ ہو۔

امام حسینؑ بھی ایک انسانی دل اپنے پہلو میں رکھتے تھے۔ رحمۃ للعالمین کے نواسے تھے بہت رحمدل اور رقیق القلب تھے مگر کس کے لئے؟ مومنین کے لئے! جیسا کہ رسولؐ کے اقوال اور افعال اوپر مذکور ہوئے اور جیسا کہ خود خدا نے مومن کی صفت بیان کی ہے کہ "أشداء على الكفار رحماء بينهم" یعنی کفار کے لئے سخت گیر ہیں اور مومنین کیلئے رحمدل۔ امام حسین علیہ السلام معاذ اللہ سخت دل نہ تھے کہ انصار کی جدائی اور اعزا و اقربا کی شہادت پر آنسو نہ بہاتے۔ لاش پر لاش اٹھا کر لاتے اور مغموم و محزون نہ ہوتے۔ امام حسنؑ کی نشانی قاسمؑ گلبدن کو میدان جہاد میں بھیجنے کے لئے امام حسینؑ نے خود اپنے ہاتھوں ہتھیار لگائے۔ مقتل میں اس وقت پہونچے جب قاسمؑ کی لاش پر ملاعین گھوڑے دوڑا چکے تھے۔ لاش کو ٹکڑے دیکھ کر بے ساختہ رو دیئے مگر لب پر سوائے صبر و شکر کے کوئی کلمہ شکایت نہ تھا۔ علی اکبرؑ کی آواز استغاثہ "یا ابتاہ ادرکنی" پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پہونچے اور کڑیل جوان کو ایڑیاں رگڑتے اور سینہ پر برچھی کھائے ہوئے تڑپتا دیکھا رو دیئے اور بہت روئے مگر دامن صبر و رضا کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اگر کچھ کہا تو صرف یہ کہ اے معبود! تو گواہ رہنا کہ جو رفتار و گفتار میں تیرے رسولؐ سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ اس کی قربانی پیش کر رہا ہوں۔ شش ماہے کا نرم و نازک گلا تیر حرملہ سے چھد گیا۔ ادھر خون جاری ہے ادھر آنسو۔ مگر جادہ صبر سے قدم ڈگمگاتے ہیں نہ ہاتھوں میں تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ خود تن تنہا کھڑے ہیں۔ نہ اعزا ہیں نہ انصار نہ قاسمؑ و اکبرؑ ہیں نہ عباسؑ علمدار، عاشور کا سورج ڈھل رہا ہے۔ سامنے لاشہ ہائے شہدا ہیں اور اہل حرم کے خیمے جہاں عابدؑ بیمار غشی میں پڑے ہوئے ہیں اور کوئی بیواؤں اور یتیموں کا والی و نگہبان نہیں۔ نہ کوئی کمک دینے والا ہے نہ داد شجاعت دینے والا ہے۔ زرہ پر اتنے تیر لگے ہوئے ہیں جیسے ساہی کے جسم پر کانٹے۔ دل و جگر زخمی ہو چکے ہیں، کمر ٹوٹ چکی ہے، بصارت ختم ہو چکی ہے، جسم سے خون اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ کبھی لاشہ ہائے شہدا کو مخاطب کر کے گریہ کرتے ہیں، اور کبھی اہل حرم کو سلام آخر، مگر ثبات و استقلال، صبر و رضا کا یہ عالم ہے کہ ایک قدم جہاد فی سبیل اللہ سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ دل میں جادۂ حق سے پھرنے، اعلائے کلمۂ حق سے باز رہنے کا خیال تک نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور سالکان صبر و رضا کے لئے ہر ہر منزل پر لازوال پرچم نصب کرتے جاتے ہیں۔ اتنا آگے بڑھتے ہیں کہ اس عالم میں بھی فوج یزید تاب مقاومت نہ لا کر فصیل کوفہ سے ٹکرا جاتی ہے اور آخر کار جب عرش زین سے فرش زمین پر تشریف لاتے ہیں۔ تو سجدۂ شکر میں تشریف لے جاتے ہیں اور لبوں پر شکوہ و گلہ کیسا بلکہ کبھی لا إلٰه إلا اللہ حقاً حقاً ہے اور کبھی لا حول ولا قوة إلا باللہ العلی العظیم۔

آج یا آج کے بعد قیامت تک کون سا ایسا انسانی دل ہوگا جو ان مصائب عظمیٰ اور دلدوز واقعات کو سنے اور اس کے دل پر اثر نہ ہو اور وہ رو نہ دے۔ در اصل نہ رونا مقتضائے بشریت کے خلاف ہے۔ رسولؐ نے کبھی اصحاب کی وفات پر گریہ فرمایا، کبھی کسی مومن کی حالت نزع میں دیکھ کر اور واقعات کربلا پر تو رسول اللہ نے صرف پیشینگوئی کو جبریلؑ سے سن کر آنسو بہائے جن ہونے والے واقعات ہائلہ کی پیشینگوئی پر رسول اللہ نے آنسو بہائے اور امام حسینؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گریہ فرمایا آج ہم انہیں واقعات مصائب کو سن کر روتے ہیں اور جبتک سینوں میں انسانی دل ہیں روتے رہیں گے

روتے ہیں مصائب پہ شہیدان وفا کے
ہم مردہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

(محرم نمبر ۱۳۷۲ھ)

ایڈیٹر "النجم" کی طرف سے

تحریف کا ایک شاندار مظاہرہ

شیوۂ نواصب "شریعت اسلامیہ" قرار پا گیا

مولانا سید محمد رضی صاحب قبلہ مرحوم زنگی پوری پرنسپل جامع العلوم جوادیہ کالج بنارس

النجم کا عاشورہ نمبر جس کے لئے اشتہارات کے ذریعہ سے اسلامی دنیا کو مشتاق بنایا گیا تھا شایع ہو گیا۔ اس کا ایڈیٹوریل ہمارے سامنے ہے جس کو دیکھ کر نہایت حیرت سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ کسی مختلف فیہ مسئلہ میں صرف ایک پہلو پر نظر کرنا اور دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دینا ایڈیٹر النجم کے ان خصوصیات میں داخل ہے جن میں وہ یگانہ سمجھے جا سکتے ہیں۔

عزاداری کے متعلق شیعی لٹریچر کو نظر انداز کر کے انھیں باتوں کو دہراتے جانا جو زمانہ قدیم سے پیش ہوتی چلی آئی ہیں ایسا فعل نہیں ہو سکتا جو منصفانہ کہا جا سکے۔ ایڈیٹر النجم نے علمائے شیعہ کے ان بے شمار دلائل کو جو عزاداری کے جواز بلکہ استحباب پر دلالت کرتی ہیں ہاتھ بھی نہ لگاتے ہوئے یہ دکھانا چاہا ہے کہ یوم عاشورہ ہماری شریعت میں بہت محترم دن مانا گیا ہے اس لئے کہ انبیاء سابقین پر اس دن بڑے بڑے انعامات خدا کی طرف سے نازل ہوئے تھے۔ لہذا اس تاریخ کے لئے شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ اس دن اپنے اہل و عیال کے کھانے میں کچھ وسعت کر دینی چاہئے اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اس دن اپنے اہل و عیال کے کھانے میں وسعت کرے گا خداوند عالم سال بھر تک اس کے لئے وسعت رکھے گا۔

اس کے بعد علامہ ابن حجر کی مشہور کتاب صواعق محرقہ سے اپنے اس مقصد پر شہادت پیش کی ہے کہ شریعت اہل سنت میں غم کی یادگار قائم کرنا جائز نہیں اور مرثیہ خوانی ونوحہ وغم روافض کی بدعتیں اور مومنین کے اخلاق کے خلاف ہیں۔ مجھے ایڈیٹر النجم کے مبسوط مضمون سے تعرض کی ضرورت نہ ہوتی اگر ایسا نہ ہوتا کہ حسب عادت علامہ ابن حجر کے مسلسل کلام سے صرف اتنے ہی حصہ کو نقل کیا گیا ہے جو موافق مقصود تھا اور تصویر کا دوسرا رخ جو بلا فاصلہ عبارت منقولہ کے بعد ہی بے نقاب کیا گیا ہے اس کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ ممنون پردہ پوشی کر دیا گیا۔ کس قدر قابل افسوس تحریف ہے کہ صرف اسی حصہ عبارت کو نقل کیا گیا جس میں علامہ مذکور نے مرثیہ خوانی و نوحہ و غم کو بدعات روافض میں داخل کر کے ممنوع قرار دیا ہے اور اس حصہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا جس میں بدعات نواصب کو شمار کیا ہے۔ کاش ایڈیٹر النجم روز عاشورہ کے شرعی احکام کی شرح و تفصیل فرماتے ہوئے اس آئینہ میں اپنی صحیح تصویر کی رونق بھی دیکھ لیتے جو علامہ ابن حجر نے ان کے لئے پیش کر دیا ہے۔ دیکھئے جس مقام پر عبارت منقولہ ختم ہوتی ہے اسی جگہ علامہ ممدوح لکھتے ہیں۔

"اور خبردار ایسے کام بھی نہ کرنا جو اہلبیت پر تعصب رکھنے والے ناصبیوں اور ان جاہلوں کی بدعتیں ہیں جو فاسد کا فاسد سے اور بدعت کا بدعت سے اور شر کا شر سے مقابلہ کرتے ہیں یعنے انتہائی فرحت و سرور کا اظہار اور یوم عاشورہ کو عید قرار دینا اور اس دن زینت کرنا، خضاب لگانا، سرمہ لگانا، نئے کپڑے پہننا اور نفقات (عیال کے کھانے پینے) میں وسعت دینا اور خلاف عادت کھانوں کا تیار کرنا اور یہ اعتقاد رکھنا

کہ یہ باتیں سنت ہیں حالانکہ ان تمام باتوں کا ترک کرنا ہی سنت ہے کیونکہ اس باب میں کوئی قابل استناد شئے وارد نہیں ہوئی اور نہ کوئی ایسا اثر صحیح موجود ہے جس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ بعض ائمہ حدیث وفقہ سے بروز عاشورہ سرمہ لگانے اور غسل کرنے اور مہندی لگانے اور کھانے تیار کرنے اور نئے کپڑے پہننے کی بابت سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ نہ کوئی حدیث صحیح آنحضرت سے وارد ہوئی اور نہ کسی صحابی سے۔ اور اس کو ائمہ مسلمین میں کسی نے بھی مستحب نہیں قرار دیا خواہ وہ ائمہ اربعہ ہوں یا دیگر لوگ۔ اور کتب معتبرہ میں اس کے متعلق کوئی صحیح یا ضعیف ثبوت وارد ہی نہیں ہوا۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ جو شخص اس دن سرمہ لگائے وہ سال بھر آشوب چشم سے محفوظ رہے گا۔ اور جو شخص غسل کریگا وہ بیمار نہ ہوگا اور جو شخص اپنے عیال پر کھانے میں وسعت کریگا خدا اس کو سال بھر تک وسعت دیگا اسی طرح دیگر اقوال مثلاً اسی نماز کی فضیلت اور یہ کہ اسی دن توبہ آدمؑ قبول ہوئی اور نوحؑ کی کشتی کوہ جودی پر ٹھہری اور ابراہیمؑ نے آگ سے نجات پائی اور دنبہ اسمٰعیلؑ کا فدیہ قرار پایا اور یوسفؑ یعقوبؑ کے پاس پلٹائے گئے۔ تو یہ سب محض وضعی ہیں سوائے حدیث توسعہ کے مگر اس کے راویوں میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے متعلق کلام کیا گیا ہے پس وہ نواصب اپنی جہالت کی وجہ سے موسم عید قرار دیتے ہیں۔ اور رافضی اپنے رفض کی سبب سے یوم ماتم۔ اور دونوں ہی خطاکار اور مخالف سنت ہیں۔

بحمد اللہ یہی علامہ ابن حجر جن کے کلام کو ایڈیٹر النجم نے عزاداری کے خلاف شہادت میں پیش کیا ہے نہایت صاف الفاظ میں یہ بھی بتا گئے ہیں کہ ایڈیٹر النجم کے ایسے مسلمان جن باتوں کو شعار دینی اور طریقہ شرعی بتا کر عامۃ الناس کی عقلوں کو مبتلائے فریب کرنا چاہتے ہیں وہ نواصب اور اہلبیت کے متعصب دشمنوں کے شعار ہیں اور وہ تمام حدیثیں وضعی اور جعلی اور ناقابل عمل ہیں جن میں بروز عاشورہ انبیاء علیہم السلام پر انعامات کے نزول کا تذکرہ کیا گیا ہے اور عیال پر کھانے میں وسعت کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

ایڈیٹر النجم کا یہ کہنا کہ علمائے کرام نے اس حدیث پر عمل کرنے کا فتوی دیا ہے نہایت عجیب ہے کیونکہ علامہ ابن حجر کے بیانات سے واضح ہو گیا کہ ائمہ مسلمین میں سے کسی نے اس فعل کے مستحب ہونے کا فتوی نہیں دیا ہے۔ نیز اسی کتاب کے صفحہ مذکورہ بالا پر یہ بھی مذکور ہے کہ علامہ ابن تیمیہ جو فرقہ اہل حدیث کے مورث اعلی کی حیثیت رکھتے ہیں اس حدیث کی اصلیت کا قطعی انکار کرتے تھے چونکہ ایڈیٹر النجم نے علامہ ابن حجر کی شہادت پیش کرتے ہوئے ان کی جلالت ومقبولیت کا اعتراف کر لیا ہے لہٰذا ان کے لئے علامہ ممدوح کے وہ بیانات جن میں تصویر ناصبیت کے ابھرے ہوئے خط وخال نمایاں کئے گئے ہیں۔ ناقابل انکار حجت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علامہ ابن حجر کا یہ ارشاد کہ فرزند رسولؐ پر نوحہ وغم بدعت روافض ہے کیونکر لائق قبول ہو سکتا ہے جب کہ دنیا دیکھ رہی ہے کہ شیخ امام شرف الدین ابو عبد اللہ محمد بن سعید بوصیری صاحب قصیدۂ بردہ جیسی مقدس شخصیت اپنے مشہور قصیدہ ہمزیہ میں سبط رسولؐ پر نوحہ خوانی کا فرض ادا کرتی ہے۔ اور وہ اہل اسلام کو یہ سمجھاتی ہیں کہ حسینؑ اور ان کے اہلبیتؑ کا مبتلائے مصائب ہونا تمام امت کے لئے مصیبت عظمیٰ ہے لہٰذا جہاں تک استطاعت ہو آنسو بہاؤ اور سمجھ لو کہ تمہارا زیادہ سے زیادہ رونا بھی عظمت مصائب کے مقابلہ میں کم ہی ہو گا۔ اور یہی علامہ ابن حجر اس قصیدے کی شرح فرماتے ہوئے امام بوصیری کی ہدایت کو یہ کہہ کر حد سے زیادہ قوی کر دیتے ہیں کہ تمہارے اس گریہ وبکا میں رسولؐ کی تاسی ہے امیر المومنینؑ کی تاسی ہے۔ قصیدۂ ہمزیہ مع شرح ابن حجر مصر میں چھپ چکا ہے اور عام طور سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ ایڈیٹر النجم اس کے صفحہ ۲۰۴-۲۰۵ پر میرے مجمل بیان کی تفصیل ملاحظہ فرما کر خود اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ روز عاشورہ رسول کریمؐ، جبرئیل امینؑ، علی مرتضیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پیروی گریہ وبکا کرنا شعار اسلامیت ہو سکتا ہے یا یزید عنید سے تنور شکم کو پر کر کے داد عیش وعشرت دینا اور بنی امیہ کی روحوں کو شاد کرنا۔

(محرم سنہ ۱۳۵۴ ہجری)

———

آنند میا دھر ایم اے۔ بی ایل سابق ایڈیٹر انچارج سرونٹ
و انگلش بسومتی

اس دلدوز اور روح فرسا حادثہ کو ساڑھے بارہ صدیاں گذر چکیں جو کربلا کے چٹیل میدان میں رونما ہوا تھا۔ بہادروں اور جری لوگوں کی مٹھی بھر جماعت نے نہایت تہور و جرأت کے ساتھ اپنے مذہب کی خاطر ایک کثیر فوج کا مقابلہ کیا اور تمام مصائب استقلال اور پامردی کے ساتھ برداشت کر کے فرشتۂ اجل کا خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا اس مبارک اور یادگار زمانہ گروہ کی قیادت امام حسینؑ فرما رہے تھے، جو رسولِ عربی کی اکلوتی بیٹی فاطمہؑ کے فرزند تھے آپ کو مکر و دغا سے دریائے فرات کی وادی کی طرف روانہ ہونے پر آمادہ کیا گیا جہاں آپ کو امید دلائی گئی تھی کہ حمایت دین و مذہب کے لئے ایک کثیر التعداد گروہ آپ سے آکر مل جائے گا۔ لیکن جب آپ نے دیکھا کہ دریائے فرات کے قریب پانچ ہزار سوار آکر سدِ راہ ہوگئے ہیں تو آپ کو اپنی اور اپنے ہمراہیوں کی موت کا یقین ہوگیا اور آپ نے اسے محسوس کر لیا کہ آپ کے فرائض کیا ہیں اور آپ کو کیا کرنا چاہیئے، ایک موقع پر آپ سے اور دشمن سے جو گفتگو کے مصالحت ہوئی تھی اس میں آپ نے صلح کی تین باعزت شرائط پیش کئے تھے لیکن افسوس ہے کہ فریق ثانی کی طرف سے ان تینوں شرطوں کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا۔ آپ نے اپنی بہن زینبؑ کو تسلی و تشفی دی اور پھر اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ اس وقت موقع کو غنیمت سمجھو اور جدھر چاہو اپنی جانیں بچا کر چلے جاؤ لیکن وہ لوگ ایک لائق قائد کے لائق پیرو تھے انھوں نے اپنے شفیق آقا اور مہربان امام سے کسی حالت میں جدا ہونا گوارا نہ کیا۔ اگلی صبح ان پر آزمائشوں اور امتحانوں کی گوناگوں مصیبتیں اور سختیاں لے کر طلوع ہوئی۔ ان بہتّر جواں مرد دلیروں نے پانچ ہزار فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور چند گھنٹوں کے اندر شجاعت و مردانگی کے ایسے ایسے جوہر دکھائے جو رہتی دنیا تک فراموش نہیں ہو سکتے اور جنھیں دیکھ کر ان کے دشمن خوف و دہشت سے لرزہ براندام ہو گئے لیکن دشمن اپنی عددی قوت کی وجہ سے ان پر غالب آیا اور امام حسینؑ اور ان کے انصار ایک ایک کر کے شہید ہو گئے، انھوں نے تلواریں کھائیں لیکن شکوہ و شکایت کا حرف تک زبان پر نہ لائے، وہ زخم کھا کر بجائے رنجیدہ ہونے کے خوش ہوتے تھے اور سجدۂ شکر بجا لاتے تھے کہ وہ مذہب کی خدمت میں رسول اللہؐ کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ آخری لمحوں میں بھی جب حسینؑ نہر فرات سے چلو بھر کر پانی پینا چاہتے تھے آپ کے چہرہ پر ایک تیر لگا لیکن پھر بھی عنانِ صبر و ضبط آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹی اور استقلال و اطمینان آپ سے ایسے نازک حالت میں بھی رخصت نہ ہوا آپؑ نے اپنے ان ہاتھوں کو جن سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے آسمان کی طرف بلند کیا، زندہ و مردہ دونوں کے لئے رحم کی دعا مانگی۔ آپ نے مردانہ وار ۳۲ زخم اپنے جسم مطہر پر کھائے جن کی وجہ سے آپ کی زندگی ختم ہوگئی۔ دنیا آج تک شہید کربلا کی دلیری، جرأت، تہور، مردانگی، استقلال اور صبر کو نہیں بھولی ہے۔ جو نمونہ آپ نے بے نظیر قربانی کر کے کربلا کے میدان میں پیش کیا ہے وہ آج تک صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ آپ کی شہادت سے صحیح عالم

پر مذہب اسلام کا وقار قائم ہو گیا اور اسی شہادت کی صداقت اور سچائی کا یہ اثر ہے کہ آج دنیا کے ہر ہر گوشہ میں ہر سال آپ کی شہادت کی یادگار منائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شہید کربلا کی سالانہ یادگار کے منانے سے مذہبی عقائد کو بہت تقویت پہونچتی ہے۔ وہ لوگ جو آج معمولی معمولی بنیادوں پر مذہب کے نام سے فسادات برپا کرتے رہتے ہیں اور جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر مذہبی جھگڑے کھڑے کر دیتے ہیں۔ اگر حسینؑ کی سیرت سے صحیح طور پر سبق حاصل کرنے کی کوشش کریں تو یقیناً مسلمانوں کے باہمی جھگڑے نہیں بلکہ وہ جھگڑے بھی فوراً دور ہو جائیں جو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے ہوتے رہتے ہیں اور ایک بین الاقوامی اتحاد کی فضا پیدا ہو جائے

محرم نمبر ۱۳۵۵ھ

حضرت علیؑ اور اُن کے پیرو

مسٹر ایف ڈبلیو۔ ڈیجولن ایم۔ اے سابق ممتحن کیمبرج کالج

(ترجمہ از اصل مضمون بزبان انگریزی)

حضرت علیؑ نے جو محمد صاحب کے عزیز شاگرد اور صحابی تھے مذہب اسلام کی حقیقی تعلیم میں ایک تازہ روح پھونک دی آپ خدا کی محبت اور اس کے خیال میں اس قدر مستغرق رہتے تھے کہ اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ آپ کو آپ کے دوستوں نے غشی کے عالم میں پایا اور اٹھا کر گھر پہونچایا ہے۔

اگرچہ آپ کی روحانیت معراج کمال پر پہونچی ہوئی تھی اور آپ کا مرتبہ نہ بلحاظ روحانی پیشوا کے بلکہ اس اعتبار سے بھی سب سے بلند تھا کہ آپ نے تمام اسلامی جنگوں اور غزووں میں انتہائی شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ فرمایا تھا ہم آپنے دوسروں کو خلیفہ ہو جانے دیا اور اپنے حقوق کی پامالی صرف اس لئے گوارا کر لی تاکہ مسلمانوں میں آپس ہی میں کشت و خوں کا دور شروع نہ ہو جائے۔ اس وقت بھی جبکہ بظاہر خلافت کا تاج آپ کے زیب سر نہ تھا آپ حقیقی روحانی پیشوا تھے۔ اور امت کے جسم بے جان میں ایک روح تازہ پھونک رہے تھے۔

حضرت علیؑ نے جود و سخا کے وہ اعلیٰ نمونے پیش کئے جس کے نقوش صفحہ دوام پر ثبت رہیں گے۔ اس کی ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ آپ نے اپنے قاتل کے ساتھ حسن سلوک سے کام لیا اور اپنے فرزندوں یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو وصیت کی کہ وہ بھی اس سے مہربانی اور عدل و انصاف کا برتاؤ کریں۔ آپ اپنی مذہبیت، مہماں نوازی، جود و سخا، رحم و کرم، عدل و انصاف اور دیگر اخلاق حسنہ اور اطوار پسندیدہ کی وجہ سے روحانی پیشواؤں کی بزم میں ہمیشہ صدر نشین رہیں گے میرا پختہ عقیدہ ہے کہ علیؑ کی تعلیم کی علامتیں اب تک شیعہ مسلمانوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں جو ان کی تعلیم پر سختی کے ساتھ کاربند ہیں۔

محرم نمبر ۱۳۵۰ھ

حسینؑ کیوں شہید ہوئے؟

جناب عمار حسین صاحب نقوی کندرکی ضلع مرادآباد

کسی قوم کی ترقی کا راز مضمر ہے ان قربانیوں میں جو اس کے رہبروں نے وقتاً فوقتاً اس کی بقا کے لئے پیش کی ہوں۔ کیونکہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتی جب تک وہ ایثار و قربانی کی اسپرٹ اپنے دل و دماغ میں نہ رکھتی ہو اور قربانی کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ رہبروں اور لیڈروں نے عملی حیثیت سے خود ایثار و قربانی کے مظاہرے نہ کئے ہوں اور جب قوم کے لیڈر قربانیاں پیش کرنا اپنے لئے ننگ و عار سمجھتے ہوں وہ قوم و ملت عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کو ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اس لئے کہ جب قربانی کا جوش و ولولہ ہی کسی قوم سے مفقود ہو جائے اور ایثار کی تڑپ ہی کا فقدان ہو جائے تو اس کا زندہ رہنا موت سے بدتر ہے اور ایک نہ ایک دن اسکے دامن حیات کا چاک چاک ہونا یقینی ہے کیونکہ دنیا نام ہے تغیرات و حوادثات کا اور تغیرات و انقلابات بغیر قربانی کے پیش کئے ہوئے رونما نہیں ہو سکتے اور جب تغیرات و انقلابات کا روشن و تاباں چہرہ ہی ماند پڑ جائے گا تو بجز جمود کی کالی اور ڈراؤنی صورت کے انسان کے پاس کیا رہ سکتا ہے اور کسی قوم پر جمود کی ادبار کا آ جانا گویا اس کی رگ حیات منقطع ہو جانا ہے اور اس صورت میں اس کے اعضا و جوارح کا مفلوج ہو جانا اتنا ہی ضروری و لابدی ہے جتنا کہ شام کے وقت آفتاب کی روشن و منور شعاعوں کا غروب ہو جانا۔ صحن عالم کے ذرے ذرے میں بھی انقلابی کشش کارفرما ہے۔ یہ چھوڑ دیجئے

زمین، یہ گنبد نیلگوں، یہ رقص کرتے ہوئے ستارے، یہ آفتاب کی ضو پاش شعاعیں، یہ ماہتاب کی خنک و سرد روشنی، یہ بہار کا دلکش سماں، یہ عطر بیز ہوائیں، یہ پھولوں کی نرم و نازک پنکھڑیاں، یہ ابلتے ہوئے چشمے یہ فردوس نظر دشت و جبل کی سبزیاں غرض دنیا کی ہر شے اور گلستان عالم کے پتے پتے میں انقلاب کی مقناطیسی کشش اپنا کام کر رہی ہے۔ انسانی ذہنی و دماغی لطافتیں، آرٹ کے حسین و لطیف مرقعے، سائنس اور فلسفہ کے نئے نئے نظریے پتہ دے رہے ہیں کسی انقلابی جذبہ کا۔ اگر یہ جذبہ ہی فنا و مفقود ہو جائے۔ تو حیات انسانی کا یہ تر و تازہ چمن ہوائے جمود کے تیز و تند جھونکوں سے پژمردہ ہو جائے اور کشت انسانی جمود کی ژالہ باری سے بالکل فنا ہو جائے پھر نہ دنیا رہے نہ دنیا کے رہنے والے۔

غرض یہ کہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام چہل پہل اور رونق انقلاب کی لاتعداد اور لامتناہی زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہے اور بغیر انقلابی کشش کے دنیا کا کوئی ذرہ بھی اپنی جگہ سے سرمو حرکت و جنبش نہیں کر سکتا جب دنیا کا یہ تمام نظام مرہون منت ہے انقلابی اسپرٹ کا تو ضرور ہوا کہ انسانی زندگی کا سدابہار چمن بھی انقلابی ہوا اور پانی کے ذریعہ سے سرسبز و شاداب بنایا جائے تاکہ دریائے حیات کا ہر سوت اخلاق حسنہ کے عظیم الشان سمندر میں جا کر مل جائے اور علم و حکمت، ہمدردی و رحمدلی، ایثار و وفا، عمل، کردار، شجاعت و دلیری کے ہزاروں چشمے انسانی نظروں کے سامنے ابلتے ہوئے دکھائی دیں اور انسان کی

معنوں میں صفت انسانیت سے ہم آغوش ہو کر اشرف المخلوقات
ہونے کا شرف حاصل کر سکے۔

اسی لئے باغبان قدرت نے چمنستان عالم میں انقلابی
تخم ریزی اور گلکاری کرنے کے واسطے اپنے پیغمبروں اور
رسولوں کو سلسلہ بہ سلسلہ بھیجنا شروع کیا تاکہ انسان میں
انقلابی روح پھونکی جائے اور جمود کی دائرہ اثر کو اس
قدر گھٹا دیا جائے کہ اس کا ہونا نہ ہونا سب برابر ہو جائے
تاکہ پھر اس کا کوئی نام لیوا بھی پیدا نہ ہو سکے اور صحیح
معنوں میں دنیا رشک جنت بن جائے

انبیاء اور مرسلین آئے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار
کی تعداد میں آئے۔ جنھوں نے اپنی انتھک کوششوں
سے دنیا کو انقلابی دنیا بنا دیا۔ لیکن یہ انقلابات کہ جن
سے دنیا کو آئے دن سامنا کرنا پڑتا تھا کہ زیادہ مستحکم
اور پائدار ثابت نہ ہو سکے اور وجہ یہ تھی کہ ابھی ذہن عالم میں اتنی
طاقت اور صلاحیت پیدا نہ ہو سکی تھی کہ انقلاب کا درخت
اس میں اچھی طرح نمو اور بالیدگی حاصل کر سکے اس لئے کہ کاشتکار
خواہ کتنی ہی جانکاہ محنت اور شدید مشقت کیوں نہ برداشت
کرے اور کوشش کرے آبپاشی بھی وقت مقررہ پر کیوں
نہ کر دے لیکن فصل اپنے موسم ہی پر پک کر تیار ہوتی ہے یہی حال
دنیا کے اس باغ کا ہوا کہ جس میں انقلابی تخم ڈالا گیا تھا اگر
چہ انبیائے ماسبق نے ہزارہا مصائب و آلام برداشت کئے
جور و ظلم کے تیروں کا نشانہ بھی بنے اور بہیمیت و استبداد کی
کند چھری سے ذبح بھی کئے گئے لیکن خدائی قانون بدل نہیں
سکتا تھا۔ اور وقت سے پہلے درختوں پر برگ و بار نہ آ سکتے
تھے ابھی ضرورت تھی ان درختوں کو اس پاک و مطہر خون کی
اور ان انقلابی ہواؤں کی جن سے سیر سیراب ہو کر برگ
و بار سے مزین اور بارونق بن جائیں۔

یوں تو ہر رہبر، ہادی، مصلح، اور ریفارمر نے دنیا
کو درس انقلاب دینے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا اور دنیا
کو انقلابی اور اخلاقی دنیا بنانے میں اپنی جانوں کی بھی کوئی

پروانہ کی لیکن قبول عام اور بقائے دوام کی سند تو اس
انقلاب کی قسمت میں لکھی تھی جس کا سنگ بنیاد آج سے تقریباً
ساڑھے تیرہ سو سال قبل مکہ کی سرزمین پر رسول عربی نے اپنے
مبارک ہاتھوں سے رکھا تھا اور جس کا اتمام دس محرم ۶۱ھ
میں کربلا کے بے آب و گیاہ اور چٹیل میدان میں اس رسولؐ
کے نواسہ حسین علیہ السلام کے ہاتھوں ہوا۔ نانا نے جس مقصد
کے حاصل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا نواسہ نے نہ صرف اپنی بلکہ
اپنے اعزاء و اقرباء، اخوان و انصار، بھائی بھتیجوں،
بیٹوں، بھانجوں کی قربانیاں دے کر اس کو حاصل کیا اور
جمود کی کیفیت کو ایک ایسے انقلاب میں تبدیل کر دیا کہ جس
کو دنیا عرصے سے بھلا چکی تھی۔ کربلا کی خونچکاں داستان
اور حسینؑ کا بے دردانہ اور ظالمانہ قتل جو تاریخ عالم کے
صفحات پر خونی سرخی سے لکھا ہوا ہے۔ اس کی تکرار کر کے میں
انسانیت کے قلوب کو زخمی و مجروح کرنا نہیں چاہتا اور نہ
میں مظالم کی ان تفصیلات میں جانا چاہتا ہوں جو کفر نواز
مسلمانوں نے اپنے نبیؐ کے تین دن کے بھوکے پیاسے نواسے پر
دوپہر کے قلیل عرصہ میں عرب کی تپتی زمین پر دریائے فرات کے
کنارے مہمان بلا کر جائز و روا رکھے اور جس کی وجہ سے جبین
اسلام ہمیشہ ہمیشہ عرق ندامت میں غرق رہے گی۔ یہ واقعات
اتنے درد انگیز اور جگر سوز ہیں کہ ان کو سن کر در و دیوار
تک لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ میں تو صرف یہ دکھلانا
چاہتا ہوں کہ وہ کیا غرض اور نصب العین تھا جس کی وجہ
سے حسینؑ شاہراہ شہادت کی کٹھن اور دشوار گذار منزلوں
کو طے کر کے کامیاب اور بامراد ہوئے اور اس امتحان کے
ہر ہر پرچے کو اپنی اور اپنے رفقاء کی خونی سرخی سے ایسا حل
کر دیا کہ جس میں سو فیصدی کامیابی ہوئی۔ حسینی شہادت
کی غرض و غایت اور نوعیت سمجھنے کے لئے تاریخ اسلام کی
تھوڑی سی ورق گردانی کی ضرورت ہے رسول عربی کی آنکھ
بند ہوئی تھی کہ اغیار نے خلافت کی باگ ڈور سنبھال
لی اور اس کے حقیقی وارث کو قطعاً بے دخل کر دیا۔ علیؑ نے

خاموشی اور متانت و سنجیدگی سے ہر اس ظلم کو انگیز کیا کہ جو اس اثناء میں ان پر ڈھایا گیا۔ اسی صورت سے تین دور یکے بعد دیگرے گذر رہے اب خلافت نے پلٹا کھایا اور اپنے مرکز اصلی کی طرف عود کیا۔ لیکن علیؑ کو زمانے نے اتنی مہلت و فرصت نہ دی کہ وہ خلافت رسولؐ کو اتنا مستحکم اور پائیدار بنا سکتے کہ آئندہ وہ صورت پہ کار اپنے مرکز سے ہٹ کر گردش نہ کر سکے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں امام حسینؑ کو بجز خلع خلافت کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا اس لیئے کہ خفیہ ریشہ دوانیاں جو اموی سیاست کی شاطرانہ چالیں تھیں خلافت کو کھوکھلا کرنے میں مصروف تھیں۔

آپ ظاہری خلافت سے چند شرطوں کے ساتھ دستبردار ہوئے اور خلافت کی باگ پھر ان ہاتھوں میں چلی گئی جو سیاسی اقتدار میں بنی ہاشم سے پست ترین تھے اور جن کی روحانیت کا دار و مدار محض سنہری و روپہلی چند ٹکلیوں پر تھا۔ لیکن چونکہ وہ سیاسی گھاتیں جنکا نام یورپ نے ڈپلومیسی قرار دیا ہے ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ان چالوں سے کام لے کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیا اور بنی ہاشم کو اپنی سرمایہ داری اور ملوکیت پرستی کے زعم میں پست و حقیر سمجھنے لگے۔

بہرحال اگرچہ خلافت اپنے مرکز سے کوسوں دور رہی اسلام کے ظاہری خدوخال میں کوئی بین فرق نہ آیا اور اوامر و اصول دفرد رع جنکی ترویج کیلئے نبی آخرالزماں علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے جوں کے توں قائم و برقرار رہے۔ جو کچھ جھگڑا تھا وہ علیؑ اور اولاد علیؑ کے حقوق کا تھا ان بزرگوں نے اپنے حقوق کو پائمال ہوتے دیکھنا پسند کر لیا لیکن خرمن اسلام کو خاکستر ہونے سے بچا لیا ابھی اسلام کا وہ پودا جس کو نبیؐ وصیؑ نے اپنا خون چھڑک چھڑک کر پروان چڑھایا تھا۔ اس قدر نرم و نازک تھا کہ ہوا کی ذرا سی حرکت سے زمین پر آ رہتا اور رسولؐ کی تیئیس سالہ جد و جہد خاک میں مل جاتی ورنہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ علیؑ ابھی وہی تھے اور ان کی برق دم ذوالفقار بھی وہی تھی۔ جو بدر و احد، خندق و خیبر کے معرکوں کو سر کر چکی تھی اور قلعہ کفر کی بنیادوں کو متزلزل بنا چکی تھی۔ علیؑ میں ابھی وہی قوت تھی جو عمرو ابن عبدود اور مرحب و عنتر ایسے پہلوانوں کو زیر کر چکی تھی۔ لیکن چونکہ اسلام کو کوئی ظاہری خدشہ نہ تھا اس لئے علیؑ نے اپنی زندگی کو خاموشی کے ساتھ گذار دیا اور تلوار کے قبضہ پر ہاتھ نہ ڈالا۔ اور چونکہ معاویہ کے عہد میں بھی اسلامی چہرہ بڑی حد تک گرد و غبار سے پاک و صاف رہا اور کوئی ظاہری دھبہ جس سے تعلیم اسلامی میں خلل واقع ہوتا ظاہر نہ ہوا اس لئے حضرت امام حسن علیہ السلام بھی زندگی بھر خاموش رہے۔

معاویہ نے رجب ۶۰ھ میں دنیا سے انتقال کیا لیکن چونکہ معاویہ نے اپنی حیات ہی میں اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعت کی جد و جہد کر لی تھی اور ایک حد تک کامیابی بھی حاصل ہو گئی تھی اس لئے باپ کے انتقال کے بعد یزید تخت خلافت پر متمکن ہو گیا۔ یزید کا تخت پر بیٹھنا تھا کہ زمانے کا رنگ ہی بدل گیا اور شعائر اسلام علی الاعلان فسق و فجور کی بھینٹ چڑھائے جانے لگے۔ حرص و آز کا بازار گرم ہونے لگا کذب و نفاق کے جراثیم انسانی رگ و پے میں سرایت کرنے لگے ہمدردی و رحمدلی انسانی سرشت سے کوسوں دور ہو گئی۔ اخلاق حسنہ اور خصائل پسندیدہ سے کسی کو کوئی واسطہ ہی نہ رہا۔ درندگی و حیوانیت، فرعونیت و نمرودیت، ظلم و استبداد غرض دنیا کی ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی برائی کا انسانی دماغ آماجگاہ بن گیا اور بجائے آگے بڑھنے کے انسان پیچھے ہٹنے لگے یزید نفس کا بندہ اور خودغرضی کا غلام قیصر و کسریٰ کی شان و شوکت کا خواب دیکھ رہا تھا امیر شام کا مکار اور حیلہ جو بیٹا جمہوریت اور مساوات کو مٹا کر شخصیت پرستی اور سرمایہ داری کو رواج دینے میں منہمک تھا فتنہ پرداز اور کمینہ خصلت حاکم شراب و کباب، نغمہ و سرود کے چنگل میں گرفتار ہو چکا تھا۔ حریص و طامع انسان حرام کو حلال اور حلال کو حرام میں تبدیل کر رہا تھا۔ کتوں کے شکار کا

دلدادہ بادشاہ علماء و فضلاء کی توہین میں سرور قلب
محسوس کرتا تھا۔ کتاب الٰہی اور رسولؐ برحق کی شان میں
گستاخی کرنا اس کا شعار بن گیا تھا۔ انسانی خون کی کوئی
وقعت اس کی نظروں میں نہ تھی۔ کذب و نفاق و زناکاری
و افترا پردازی اس کے خمیر میں پیوست ہو چکی تھی اور اس کا
دماغی اور ذہنی توازن اس قدر بگڑ چکا تھا کہ باوجود ان
عیوب کا حامل ہونے کے خود کو خدا اور رسولؐ خدا کا سچا
جانشین اور خلیفہ برحق سمجھتا تھا اور اب خدارا انصاف سے
بتلائیے کہ جس انسان کا وجود قومی مفاد کا دشمن تھا جس کی رگ
رگ میں عیوب کا نجس خون دورہ کر رہا تھا اور جو جبین انسانیت
پر ایک بدنما دھبے کی مانند تھا۔ اس کی بیعت کرنا اسلامی مفاد
کے گلے پر کند چھری پھیرنے کے مرادف تھا یا نہیں۔ ایسے برے
انسان کے ہاتھ میں ہاتھ دینا دعوت کفر تھی یا نہیں۔ ایسا
نااہل اور کندہ ناتراش شخص کیا اس قابل تھا کہ اس کی خلافت
و امامت کو تسلیم کر کے حقوق انسانی کا خون کر دیا جاتا۔

زمانے کو ضرورت تھی۔ اور سخت ضرورت کسی ایسے رہبر
کی جو اپنے لائحہ عمل اور طریق کار سے اسلام کو فنا ہونے سے
بچا سکے۔ اور گمنامی اور تباہی کی آتشیں خندق سے اسلامی
بیڑے کو پار لگا سکے۔ کون تھا جو اس تلاطم خیز وقت میں جہاز
انسانیت کی ناخدائی کرتا اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو اپنی خدا
داد قابلیت سے سطح آب پر لے آتا۔ لیکن افسوس چند سال
کے عرصہ میں اسلامی فضا میں ایسا تغیر رونما ہو چکا تھا۔ کہ
مسلمانوں میں حمیت و غیرت کا نام تک نہ رہا تھا۔ اسلام
عجب کشمکش اور گو مگو کے عالم میں تھا اور کوئی اسکا پرسان
حال نہ تھا تمام دنیا یزیدی رنگ میں ... رنگ گئی تھی۔
اور اسلام کی یاس انگیز صورت پر کسی کو نظر کرنے کی مہلت
نہ تھی۔ وجہ یہ تھی اگر اپنا لگایا ہوا باغ ہوتا اور اسکی پرورش
میں تھوڑی بہت محنت و مشقت اٹھائی ہوتی تو اس کا کوئی
خیال بھی کیا جاتا۔ باغ دوسرے کا پرورش کسی اور نے
کی پھر اس کے خزاں رسیدہ درختوں کی دیکھ بھال میں ہم
کیوں تکلیف اٹھائیں اسکا حقیقی مالک و وارث جب مشقت
شدیدہ برداشت کر کے اس کو سیر و سیراب کر دے گا تو اس
کے پھلوں میں برابر کے ہم بھی شریک و سہیم ہو جائیں گے" یہ تھا
وہ خیال جو اس وقت کے عام مسلمانوں کے دماغ میں گردش
کر رہا تھا۔

حسینؑ دنیا کے سب سے بڑے مدبر اور مفکر انسان یہ سب
کچھ دیکھ رہے تھے انھوں نے ٹھنڈے دل و دماغ سے یزید کی
افعال و اعمال و اخلاق و عادات کا جائزہ لیا۔ لیکن انھیں
اسلامی زندگی کی کوئی رمق کبھی نہ دکھائی دی اور انھوں
نے بجز بربریت و وحشت کے اس کے عادات و خصائل میں
انسانیت کا کوئی شائبہ بھی نہ پایا اور چونکہ اسلامی چہرہ
سے انقلابی کشش کے دلفریب و دلکش نقش و نگار غائب ہو
چکے تھے۔ اور ان کی جگہ جمود کے مہیب وحشت ناک رنگ
و روپ نے لے لی تھی۔ جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا تھا کہ
ان کے نانا کی پاک و مقدس یادگار کے عمیق غار میں جا رہتی
اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلام کا حسینؑ و درخشاں چہرہ کفر کی
گھنگھور گھٹاؤں میں روپوش ہو جاتا۔ اس لئے انھوں نے
ارادہ کر لیا تھا اور مصمم ارادہ کہ اپنے استقلال اور ثبات
سے انسانیت کی چولوں کو ٹھیک بٹھا کر رہیں گے اور دین
و مذہب کو کفر و نفاق کی چٹانوں سے پاش پاش نہ ہونے
دیں گے۔

اور چونکہ حسینؑ اعلیٰ انسان تھے اس لئے وہ حقیقی اصول کی
حمایت میں کوہ گراں کی طرح آزادی ضمیر اور حریت فکر کا درس
دینے کیلئے جم کر کھڑے ہو گئے۔

اگر ایسے نازک وقت میں حسینؑ اسلام کی حفاظت و
استحکام کی طرف متوجہ نہ ہو جاتے تو دنیا سے حق و راست
بازی کا جنازہ ہی نکل جاتا۔ اس لئے حسینؑ نے تہیہ کر لیا کہ
اور اپنے اعوان و انصار کے خون کے گارے سے انسانیت اور
مذہب و ملت کی در و دیوار کو مضبوط و مستحکم بنیادوں پر
اٹھا کر رہیں گے۔ اور اپنے انقلاب پرور ہاتھوں سے یزیدی

جمود پر ایسی کاری ضرب لگائیں گے کہ پھر وہ قیام قیامت تک نہ ابھر سکے۔

یزیدیت اور اس کی ابھرتی ہوئی طاغوتی قوتیں ایک طرف اور حسینیت اور حسینیت کے بہتر رفقاء کی مٹھی بھر جانیں دوسری طرف ایک سمت زر و جواہر سے بھرپور خزانے اور دوسری طرف فاقہ کش اور غریب الوطن انسان۔ ایک طرف آتشیں آلات حرب سے مسلح قطار فوجیں اور دوسری سمت اخلاقی و روحانی سلاح جنگ۔ اگر یزید کو اپنی سلطنت و حکومت پر گھمنڈ تھا تو حسینؑ کو اپنے خدا پر ناز۔ یزید شیطانی طاقت کے نشہ میں اندھا ہو رہا تھا اور حسینؑ حق کی قوتوں پر نازاں۔ ایک بہ ضد کہ اسلامی اصول و شرائع کو کفر کے حربوں سے لہولہان کر کے رہوں گا اور دوسرے کو یہ کد کہ اسلامی جمود میں انقلاب کی روح پھونک کر دم لوں گا ایک باطل کی پگڈنڈیوں پر چل کر قوم و ملت کو دوزخ کی آگ کا ایندھن بنانا چاہتا تھا اور دوسرا شاہراہ حق پر گامزن ہو کر باغ جنت کی سیر کرانا۔ مقابلہ سخت تھا۔ اور فتح و ظفر خدا کے ہاتھ میں تھی۔ دنیا کے جلد باز اور ظاہر بیں انسان حسینیؑ شہادت کو یزیدیت کی فتح پر محمول کریں گے بایں سبب کہ حسینی فوج کا ہر ایک سپاہی جام شہادت نوش فرما کر میٹھی نیند سو چکا تھا اور یزیدیت اپنی تمام قہرمانی قوتوں کے ساتھ تخت خلافت کے گلے کا ہار بن چکی تھی۔ یا یوں کہیے کہ اسلامی اخلاقیات و روحانیات کا دیوالہ ہی نکل چکا تھا اور کفر و شرک کی پونجی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی لیکن ایک معاملہ فہم اور دور اندیش انسان کی نظریں محسوس کریں گی کہ ان دوررس نتائج اور اثرات کو جنھوں نے نہ صرف انسانی ہیئت و صورت ہی بلکہ دنیا کی روش میں انقلابی روح پھونک دی اور قصر انسانیت کو منہدم اور شکستہ ہونے سے بچایا حسینؑ نے جس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے بیڑہ اٹھایا تھا اس میں کامیابی حاصل کی۔ دنیا نے انقلابی کروٹ بدلی اور جمود کی چولیں ڈھیلی کر دیں زمانے نے دیکھ لیا کہ ابھی یزید کا بیٹا سلطنت و حکومت کو ٹھوکر مار کر علیحدہ جا کھڑا ہوا اور کوئی شامی بھیڑئے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے یہ تھا حسینی شہادت کے دئیے ہوئے درس کا پہلا اثر۔

کربلا کی ہولناک جنگ کا اثر اسی جگہ ختم نہ ہوا بے گناہ انسانوں کا خون رائگاں نہیں جا سکتا۔ خون ناحق چھپ نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ تک اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا تھوڑے زمانے تک غلط فہمی کا شکار بنی رہے۔ اسی لئے جب مجاز کا پردہ چاک ہوا اور حقیقت کا صاف ستھرا چہرہ دکھائی دیا تو زمانے نے دوسری کروٹ بدلی۔ کوفہ و شام کے تخت الٹ کر رکھ دئے قصر شاہی میں خاک کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہ رہا اموی سلطنت، اموی سیاست بلکہ اموی نام تک دنیا سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا وہی یزید کہ کل تک جس کے نام کا کلمہ پڑھا جا رہا تھا اور جس کی خوشامد اور چاپلوسی میں دین کے عوض دنیا خریدی جا رہی تھی۔ آج لعن و طعن کا مرکز بنا ہوا ہے اور دنیا اس کے نام کو عزت سے لینا گناہ خیال کر رہی ہے یزیدیت باہمہ شوکت و حشمت دنیا سے ابدالآباد تک کالعدم کر دی گئی اور حسینیت آج تیرہ سو سال کے بعد بھی اسی طرح سے درخشاں اور تاباں ہے جس طرح قرن اولیٰ میں روشن و منور تھی۔

کارے کردی حسینؑ کارے کردی

اس میں شک نہیں کہ حسینؑ نے اپنی جان دے کر انسانیت کو حیات جاوید کا مستحق بنا دیا اور انسان اس قابل ہو گیا کہ وہ اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کر سکے ورنہ یزید نے تو انسان کو درندہ صفت اور وحشی بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ اور انسانیت حیوانیت سے پست ہو گئی تھی باطل نواز قوتیں مجتمع ہو کر حق کے قصر کو مسمار کرنے میں لگی ہوئی تھیں اگر حسینؑ ایسے نازک وقت میں اپنی جان بچا کر یزید کے ہاتھوں میں ہاتھ دیدیتے تو بتائیے آج دنیا کا کیا حال ہوتا اور اس وقت وہ کس مقام پر ہوتی۔

کیا ہمدردی اور رحمدلی جوہر انسانی نہ فرشتوں پر برتریت

کر چکی ہے اس کا ذرا سا بھی شائبہ انسانی دل کے گوشہ میں ہوتا۔ آج دنیا اپنے قومی اور ملکی مفاد کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں برداشت کر رہی ہے کیا اس کا وجود یزید جیسے خود غرض انسانوں کی موجودگی میں ہو سکتا تھا اور زمانہ کمزور اور بے دست و پا انسانوں سے کلی ہمدردی کا جذبہ رکھ سکتا تھا۔ حقیقتاً حسینؑ نے نہ صرف اسلام کو بلکہ انسانیت کو دوبارہ زندگی عطا فرما کر رسالت مآب کے اس قول کی تصدیق کر دی "حسینؑ منی و انا من الحسینؑ" اور اسی لئے دنیا کو کہنا پڑا کہ ؎

"بقا کر بنائے لا الہ است حسینؑ"

انقلاب نے حسینی انقلاب نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنا پیغام پہونچا دیا ذرے ذرے نے دل کے کانوں سے سنا۔ ہر مذہب و ملت نے حسینی پیغام پر غور و تعمق کی نظر ڈالی اور کمر ہمت باندھ کر اس کے پیغام پر عملی جد و جہد شروع کر دی لیکن آہ! دنیا کی چند اقوام جس محسن کے نقش قدم پر چلنے میں اپنی نجات کا راز مضمر سمجھتی ہوں اس کی یادگار قائم کرنے کو اپنی سعادت جانتی ہوں اسی کے پاک و مقدس نام کو مسلمان، بدبخت مسلمان مٹانے پر تلا ہوا ہے لیکن اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اس کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور اس کی یہ سعی نامشکور کبھی عملی جامہ نہیں پہن سکتی۔ اگر آفتاب پر خاک ڈالنے سے اس کی روشنی ماند پڑ سکتی ہے، اگر قدرت کا قانون بدل سکتا ہے۔ تو ضرور ذکر حسینیؑ نام اور یادگار دنیا کے پردہ سے مٹ سکتی ہے لیکن جب تک زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی رہے گی۔ اور جب تک ماہتاب اور سیارے سورج کے چاروں طرف چکر لگاتے رہیں گے اس وقت تک
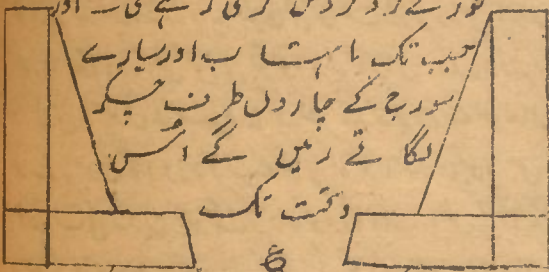
؎

"پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا"

محرم نمبر سنہ ۱۳۶۱ھ

ہندوستان کے

مغل بادشاہوں کی عزاداری

جناب سید مرتضیٰ حسین صاحب فاضل مشرقیات از لاہور۔

عزاداری حسینؑ کا ایک طریقہ تو وہ تھا۔ جو آل محمدؐ کے گھر سے شروع ہوا۔ یعنی مرثیہ خوانی، نوحہ و ماتم سارے شیعوں میں رائج ہوئی۔ ایک دوسرا طریقہ ہندوستان کا رائج کردہ ہے اس میں بہت سی چیزیں بعض عقیدت مندوں کی یادگاریں ہیں جو مصر، عراق و ایران سے یہاں آئے۔ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کا سلسلہ ان کے جد اعلیٰ امیر تیمور پر ختم ہوتا ہے یہی امیر تیمور "تعزیہ" کا موجد مانا جاتا ہے۔

امیر تیمور دنیا کے سلاطین میں واقعی "شہنشاہ اعظم" تھا اس کی تلوار یورپ اور دیوار چین تک چلی۔ اگر اس کی موت اسے شکست نہ دے دیتی تو چین اس کا باج گزار ہوتا۔ تیمور کے اجداد لٹیرے ہوں گے لیکن وہ خود امیروں کے گھر میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں چنگیز خاں کی اولاد میں سے تھی۔ اور باپ

"امیر طراغا" امیر الامرا تھا۔ باپ کی طرح بیٹا بھی مسلمان تھا اور صوفیا سے زیادہ ائمہ کا معتقد تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے امام علی رضا علیہ السلام کی آستان بوسی کی تھی۔

امیر تیمور ۱۲ رمضان ۷۷۱ھ یوم چہارشنبہ تخت نشین ہوا اور بلخ کی جامع مسجد میں ۱۴ رمضان کو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس وقت تیمور کی عمر ۳۵ برس کی تھی۔ اس نے باقاعدہ توسیع ملک کا پروگرام بنایا۔ فتح عراق کے بعد وہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ زیارت روضۂ سید الشہداء کو ضرور جاتا تھا۔ اس خاص عقیدت کا سبب خود اس نے "تزک تیموری" میں لکھا ہے جسے شہزادے مرزا حیدر شکوہ تیموری نے نظم کیا ہے

چو تیمور و قیصر بمیدان جنگ
صف آراستہ ہر دو سو بیدرنگ
کہ ناگاہ سادات ذوالاحترام
بشارت کناں باشکوہ تمام
رسیدند از کربلا و نجف،
چو فوج ملائک کشیدند صف
یکے زاں علم داشت بر امیر
مسمٰی بہ "بیضا" چو مہر منیر
بگفت ایں ترخاں بگیر ایں لوا
کہ آورد ام از حکم خیبر کشا،
تصرف نہ اہل قلم کردہ اند!
کہ صاحبقراں خود رقم کردہ اند!
برزم آں علم سر چو طوبی کشید
بہ ہر تیسیم نسیم ظفر می وزید
(مثنوی شوکت حیدری)

موصوف ہی "علم حیدری" میں لکھتے ہیں کہ جب دمشق پر حملہ کیا اور دمشق کے کوچہ و بازار دیکھے تو محبت حسینی جوش میں آئی اور قصاص خون حسینؑ کی نیت سے قتل عام کا حکم دیدیا۔ غرض کثرت مشاغل کی وجہ سے کچھ دنوں تک زیارت کے لئے حاضر دربار سید الشہداء نہ ہو سکا۔ تو ڈیڑھ تربتیں حسینؑ کے نام پر بنوائیں اور ان کی زیارت سے سکون حاصل کرنے لگا۔ (تعزیہ حسینؑ)

شہزادے صاحب کہتے ہیں کہ تیمور نے "تزک" میں یہ دونوں واقعے لکھے ہیں لیکن اس کے مترجم افضل بخاری نے جہاں اور بہت سے تغیرات کیے وہاں یہ چیزیں بھی تحریف سے نہ بچیں اس روایت کے بارے میں اس سند کے علاوہ موصوف اپنے بزرگوں کی توثیق بھی بیان کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ آگرہ میں اب تک تیمور کا تعزیہ بنتا ہے اور قلعہ سے اٹھتا ہے۔ اسی طرح تربت امام حسین علیہ السلام و امام حسن علیہ السلام کے نام سے لکڑی کے ایک چوبخانے میں کچھ خاک شفا تربت کے نام سے "لاہور" کی جامع مسجد کے تبرکات میں جسے تیموری کی طرف منسوب کیا جاتا ہے محفوظ ہے۔

ہندوستان میں تیموری بادشاہوں میں ہمایوں بابر کی طرح کھلم کھلا شیعہ تھا۔ اس لئے یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں نے عزائے حسینؑ سے کافی دلچسپی لی ہوگی۔ افسوس ہے کہ تفصیلات ہمیں معلوم نہ ہو سکے۔ ہمایوں کے بعد ہندوستان میں مستقل طور پر مغل راج شروع ہوا یہاں ڈھائی تین سو برس سے ایک خاص قسم کی اسلامی حکومت تھی۔ صوفیا، علماء اور تمام مسلمان اہل سنت تھے۔ یہ عالم تھا کہ فیروز شاہ جس طرح ہندوؤں کے معابد کے انہدام کو اپنے لئے باعث فخر جانتا تھا اسی طرح شیعہ مذہب ان کے کتب خانوں اور علماء کے تباہ و قتل پر بھی فخر کرتا تھا۔ اسی طرح مجدد الف وغیرہ تھے چنانچہ اکبر کی پرورش اور تعلیم مخدوم الملک، صدر الاسلام اور شیخ عبد النبی جیسے متعصب علماء کے ہاتھوں ہوئی۔ جب ہوش سنبھالا تو ہندوؤں کی آمیزش نے اسے نہ ہندو رکھا نہ مسلمان۔ اکبر کے بعد جہانگیر خود تو باپ کی طرح آزاد تھا لیکن نورجہاں تمام مراسم انجام دیتی تھی اور جہانگیر اس قدر متاثر تھا کہ آخر جز و کل کا اختیار نورجہاں ہی کو تھا۔

چنانچہ شیخ احمد سرہندی نے جہانگیر پر قبضہ حاصل کیا اور شیعہ علماء میں قاضی نوراللہ شوستری شہید کئے گئے۔ شاہجہاں

کے دور میں بھی اسی طرح حالات باقی رہے۔ عالمگیر پھر مذہبی آدمی نکلا اس زمانے میں شیعوں پر سختیاں بہت ہوئیں۔ وہ اپنے ظاہر و باطن کی دورنگی کی وجہ سے اور کردار کی پختگی نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ عزاداری پر پابندیاں لگاتا ہے۔ اور پھر یہ بھی لکھتا ہے (وصیت نامہ) میری پہلی وصیت یہ ہے کہ "ایں عاصی غرق معاصی را تحفہ و تشریش تربت مطہرہ مقدسہ حسینیہ علیہ السلام نمائند کہ مغرقان بحار عصیاں را بغیر از التجا بآں درگاہ رحمت و غفران پناہ نیست، و مصالح ایں سعادت عظمیٰ از دو فرزند ارجمند بادشاہ زادہ عالی جاہ است بگیرید" یعنی قبر میں خاک شفا بھی رکھی جائے اس لئے کہ گنہگاروں کی بخشش بغیر اس درگاہ سے توسل کے نہیں ہو سکتی۔ اور اس سعادت عظمیٰ کی مصلحت عالی جاہ محمد معظم شاہ بہادر کے پاس ہے ان سے لے لیا جائے۔

عالمگیر کے بعد بہادر شاہ اول نے اپنی شیعیت کا اعلان کیا علامہ شبلی لکھتے ہیں "نعمت خان عالی نے وقائع نعمت خان عالی میں سراپا عالمگیر کی ہجو لکھی لیکن عالمگیر کے جانشین بہادر شاہ نے شیعیت کی مناسبت سے نعمت خان کو دانشمند کا خطاب دیا اور وقائع نعمت خان درس میں داخل ہو گئی۔

قلعہ کے امام باڑے کی تصویر میں نے دیکھی ہے جس میں ایک چھوٹی سی شہ نشین ہے جس میں آگے دو بڑے بڑے علم لگے ہوئے ہیں۔ بیچ میں ایک جالی دار تحفہ ضریح دکھائی دیتی ہے۔ امام باڑے کے آگے ایک شامیانہ لگا ہے۔ منشی فیض الدین قلعہ میں جاتے آتے تھے اور موثق و معتمد لوگوں سے قطع نظر خود شاہزادہ مرزا احمد سلیمان شاہ نے ان کی تصدیق بھی کی ہے۔ وہ اپنی کتاب "بزم آخر" میں لکھتے ہیں۔

"دلی عام رائے عباسی، سیرت المتاخرین، تاریخ اسلام احسان النیر، روابط ادبی ہند و ایران، "فتوحات فیروز شاہی" ص ۳۶ وقائع عالمگیری ص ۲۴ انھوں نے خطبے میں

ائمہ اثنا عشر کے نام داخل کیے تھے، اور عوام کے ہنگامہ کی کوئی فکر نہ کی۔

"محرم کا چاند دکھائی دیا۔ ماتم کے باجے بجنے لگے، سبیلیں رکھی گئیں، حسینؑ و حسنؑ کے فقیر بنے، سبز کپڑے پہنے، گلے میں سبز کفنی جھولی ڈالی۔ جھولی میں الائچی دانے، سونف، خشخاش بھری۔ درگاہ میں جا کر سلام کیا۔ نیاز دی۔ دس دن تک صبح کو کھانا، شام کو شربت فقیروں کو بانٹا۔

چھٹی تاریخ۔ آج بادشاہ لنگر میں کھنچیں گے۔ دیکھو! چاندی کے دو پنجے بنے ہوئے دو لکڑیوں پر لگے ہوئے لال، سبز کپڑے بندھے ہوئے۔ ان کو شدّے کہتے ہیں۔ بادشاہ کے دونوں ہاتھوں میں ہے۔ ایک چاندی کی زنجیر میں جکڑ کر دو جا۔ قدم بادشاہ کو کھینچا۔ لے لو! وہ بادشاہ کے گلے میں ڈال دی دونوں شدے بڑے گئے

"ساتویں تاریخ ہوئی دیکھو ابرک کے کنول ان میں شمعوں کی بانس کی کھپچیوں میں ٹٹیاں لال کاغذ سے منڈھی ہوئی، ان پر لال لال کنول، بیچ میں دونوں کے روشن ہیں۔ مہندی اور مالیدہ کے خوان بڑی بڑی طوغیں روشن ساتھ ہیں آگے آگے تاشے باجے، روشن چوکی والیاں پیچھے پیچھے بادشاہ اور بیگمات حبشنیاں، اور ترکنیاں، خوجے، غمیرہ سب چلے جاتے ہیں۔ لو! مہندی امام باڑے میں پہونچی۔ آرائش سب لگ گئی۔ مہندی، مالیدہ، طوغیں درگاہ میں پڑھوا دیں۔

آٹھویں تاریخ ہوئی

"آئے لو! بادشاہ حضرت عباسؑ کے سقہ بنے۔ لال کھاروے کی ایک لنگی بندھی ہوئی۔ شربت پلا رہے ہیں! شربت پلا چکے مالیدے پر نیاز دی سب کو بٹوا دیا۔

آج دسویں تاریخ عشرہ کا دن ہے

مٹی کے آبخورے لینے لگے۔ بیچ میں سے پتلے، کورے کورے، ان کو کوزیاں کہتے ہیں دودھ اور شربت ان میں بھرا گیا لال لال کلاوے ان کے گلوں میں باندھے، تماشے

تازے ترحلوے کے کونڈے بھر کر رکھے گئے۔ نذر ہوئی، دیکھو! چھوٹے چھوٹے بچے دوڑے چلے آتے ہیں"۔

"ظہر کا وقت ہوا، بادشاہ برآمد ہوئے موتی مسجد میں عاشورے کی نماز پڑھی۔ دیوان خاص میں حاضری کی تیاری ہے۔ ایک بڑا سا دسترخوان بچھا کر اس پہ شیرمالیں چنی گئیں۔ شیرمالوں پر کباب، پنیر، مولی کا ٹکڑا۔ پہلے آپ چکھا پھر ایک ایک شیرمال اور کباب وغیرہ پہلے ولیعہد پھر شہزادوں اور عزیز امیروں کو اپنے ہاتھ سے دیا باقی سب بٹ گئیں۔

"اے لو! وہ جامع مسجد سے تبرکات پالکی میں رکھے ہوئے آگے آگے سپاہیوں کے تمن باجا بجتا ہوا آئے۔ بادشاہ تعظیم کو کھڑے ہو گئے، تبرکات پالکی سے نکال کر چوکی پر رکھے گئے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جبہ اور نعلین آنکھوں سے لگائیں، حضرت علیؑ کے ہاتھ کا قرآن شریف سر پر رکھا بوسہ دیا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی خاک شفا کو آنکھوں سے لگا دیا پھر حضرت صلعم کے موئے مبارک کو گلاب اور خوشبو میں غسل دیا۔

"لو اب زنانہ ہوا بیگمات آئیں، تبرکات کی زیارت کی، بادشاہ اور بیگمات محل میں داخل ہوئیں۔ تبرکات اسی طرح پالکی میں باجے گاجے سے جامع مسجد گئے شام کو اسی طرح محل کی درگاہ کے تبرکات کی زیارت کی۔

"دیکھو گو ثابت رہا ہے بن ڈلیاں، آپس میں بٹ رہا ہے اکثر سلاطین قلعہ میں تعزیہ داری کرتے تھے فقیر اور پیک بنتے تھے۔ کوئی نشانچی، کوئی نقیب بنتا تھا۔ کوئی تاشا کوئی ڈھول کوئی جھانجھ تعزیوں کے آگے بجاتا تھا کوئی مرثیے پڑھتا تھا۔

مرثیہ خواں کو درگاہ سے چار طشتریاں، اپن چکنی ڈلیاں بنے ہوئے خربوزے کے بیج اور دھنیے کی ملا کرتی تھیں۔ بڑی دھوم دھام سے علم اٹھاتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار دہلی نے اپنے بھتیجے مرزا حیدر شکوہ" کی معرفت لکھنؤ کی درگاہ حضرت عباسؑ میں علم بھیجا تھا۔ جو سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب قبلہ کے ہاتھوں بڑے تزک و احتشام اور شاہی جلوس کے ساتھ درگاہ میں چڑھایا گیا۔

بادشاہ کے اس اعلان شیعیت و مظاہرہ عقیدت سے دلی میں تہلکہ مچ گیا۔ اور بادشاہ کو یہاں تک مجبور کر دیا گیا کہ انھوں نے ان واقعات سے انکار کر دیا۔ حکیم احسن اللہ خاں یا صہبائی نے غالب سے ایک مثنوی کہلائی جس میں علم والے واقعہ کی تکذیب اور شیعوں کے عقائد پر طعن کیا گیا تھا۔ مرزا حیدر شکوہ کو جھوٹا کہا گیا بلکہ اس معاملہ میں ریزیڈنٹ لکھنؤ کو کچھ ہدایات بھی ہوئے۔ شہزادے صاحب نے ایک رسالہ "علم حیدری در عقائد تیموری" لکھا جس میں بتلایا کہ تیمور سے اب تک تمام مغل بادشاہ شیعہ تھے اور تقیہ میں بسر کرتے تھے ہر ایک کے بارے میں شواہد پیش کیے اور بتایا کہ بہادر شاہ اول نے کھلم کھلا اعلان کیا اور ائمہ اثنا عشرؑ کے نام داخل خطبہ کیے پھر ظفر کے تمام خطوط اور گفتگو بالتفصیل لکھی ہے۔ مرزا حیدر شکوہ صاحب ہی نے "کلمات طیبات" کی رد میں "شوکت حیدری" لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

جناب بہادر شہ نامدار!   کہ ہم عم ماہست و ہم شہریار
تخلص ظفر کینتش بوظفر   ظفر بے سپہ دارد آں نامور
از اں بادشہ تا بہ صاحبقراں   پدر بر پدر ہست شاہ جہاں
براد ودش کار فرمودہ اند   ہمہ شیعیان علیؑ بودہ اند
خصوصاً بہادر شہ نامدار   کی ہمہ شاہ عالی تبار
ز شمشیر زنگ تقیہ زدود   بگیتی رواج تشیع نمود
دل خسروا ازیں بیش تر   قوی بستہ بد بر تعصب کمر
خلاف بزرگان خود پا نہاد   بدرگاہ ہم دست غارت کشاد
تبہ کرد چوں تعزیہ خانہ را   ہمی ساخت از خیر کاشانہ را
از اں روز جز نام و حرمت نماند   دراں سلطنت ہیچ برکت نماند
چناں کار اعظام موقوف شد   کہ ہم تذ حکام موقوف شد
رہ دیں چو دریافت آں بادشاہ   طلب کرد ما را بعد عز و جاہ
ز اقران و امثال عزت فزود   بالطاف شاہی تفقد نمود

مرا این کہ از خویش ہمراہ دید — ز حساد بدکیش خلوت گزید
چو محفل تہی شد زہر اہرمن — بفرمود از من دراں انجمن
بہ تعبیر آں گشت چوں اہتمام — ہماں وقت با اعتقاد تمام
باٰل محمدؐ تولا نمود — ز اعدائے آنہا تبرا نمود
بہ صد شکر این علم ساختہ — زمانہ چو افسر لبر داشتہ
فرستاد در لکھنؤ بادشاہ — پئے نذر درگاہ عرش اشتباہ
دگر شقہ خاص خیر کتاب — بنام جناب ہدایت مآب
لعلم و عمل مقتدائے انام — سمیؑ محمد علیہ السلام
بما مرحمت گشت واز دست ما — رسیدہ بدرگاہ آں مقتدا
چو در لکھنؤ آمدم از جھلو — فریبی نمودم از اصحاب زر
چناں طبع را منحرف ساختند — کہ کردہ خود را نہ پنداختند
چو آں قوم بدکیش ناچار کرد — زاد سال واصرار انکار کرد
چوں توقیر شاہی غلط ساختند — بنام من این قرعہ انداختند
بنامم چو تاریخ رقم کردہ اند — ز انکار منصب علم کردہ اند

اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا طرفین سے برابر بیت بازی ہوتی رہی آخر میں جناب مفتی سید محمد عباس صاحب قبلہ نے "خطاب فاصل" لکھ کر اس سلسلہ کو ختم کیا اور مرزا غالب نے اپنی طرف منسوب کردہ مثنوی سے برأت ظاہر کردی غرض "ہنگام رست و خیز بے جا" نے دنیا بدل دی مغل تخت و تاج چھن گیا۔ مگر ان کی بہت سی یادگار دل کی طرح سید الشہداؑ، کے سلسلہ میں کئی چیزیں انکی یادگار میں باقی ہیں سچ ہے ——
"نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت"

محرم نمبر ۱۳۷۱ھ

کیا خدا نے بھی حسینیؑ یادگار قائم کی

حاجی سید جلال الدین حیدر صاحب ایم۔ اے مرحوم،
بانی انجمن وظیفہ سادات و مومنین

شیعوں کے یہاں احادیث سے یہ برابر بیان کیا جاتا ہے کہ جناب سیدہ صلوات اللہ علیہا کو جب واقعات کربلا اور امام حسین علیہ السلام کی بے جرم و قصور شہادت کی خبر ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانے میں نہ جناب رسولؐ ہونگے نہ حضرت علی مرتضیٰؑ اور نہ وہ خود تو آپ کو اس خیال سے بڑا صدمہ ہوا کہ پھر میرے بچہ کی صف ماتم کون بچھائے گا اور کون اس پر گریہ و زاری کرے گا۔

امین وحی کے ذریعہ سے جناب سیدہؑ کو تسکین دی گئی تھی کہ خداوند عالم نے وعدہ کیا ہے کہ وہ قیامت تک ایک قوم کو دوسری کے بعد پیدا کرتا رہے گا جن کے مرد، مردان اہلبیتؑ کے لئے اور جن کی عورتیں زنان اہلبیتؑ کے لئے گریہ کناں رہیں گی۔

کیا یہ خدائی یادگار حسینیؑ نہیں ہے جو اطراف واکناف عالم میں نمایاں ہے؟

دوسری بات یہ بھی سوچنے اور سمجھنے کی ہے کہ جناب رسولؐ کو جب حفاظت خود اختیاری اور اپنے مقاصد کے پھیلانے کی غرض سے اپنا گھر بار یعنی مکہ چھوڑنا پڑا اور یثرب میں پناہ لینی پڑی جو بعد میں مدینہ کہلایا تو یہ واقعہ مسلمانوں کی نظروں میں اتنی اہمیت رکھتا تھا کہ جب ان کو اپنا سن مقرر کرنے کی ضرورت پڑی تو انھوں نے اسی ہجرت سے اپنے سن کی ابتدا کی۔

ہجرت ربیع الاول میں واقع ہوئی تھی چاہیئے یہ تھا کہ سن کا پہلا مہینہ ربیع الاول اور گیارہواں محرم اور بارہواں صفر ہوتا لیکن سن کی ابتدا محرم سے کی گئی جو رونے پیٹنے اور ماتم کرنے کا زمانہ ہونے کو تھا۔ معلوم ہوتا ہے خدا ہی کو منظور تھا کہ مسلمانوں کے سال کی ابتدا ہی میں یہ یادگار حسینیؑ قائم رہے کہ وقوع واقعہ سے سالہا سال پہلے یہ یادگار قائم ہو گئی۔ واقعہ کے بعد میں سن کی نوبت آتی تو شاید عام مسلمان جو دین سے پھرے ہوئے تھے اس یادگار کو قائم نہ ہونے دیتے۔

(محرم نمبر ۱۳۹۱ھ)

حسین تشنہ کام کی پیاس کیونکر بجھ سکتی ہے؟

ہمارا فرض کیا ہے

سید امتیاز حسین صاحب ترمذی نونہرہ غازی پور

مادہ پرست طبائع کے نزدیک پانی نہ ملنے کی وجہ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا نام پیاس ہے اور پانی کے دستیاب ہو جانے کے بعد جب وہ کیفیت باقی نہیں رہتی تو اس کو سیرابی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک طبعی تعلق ہے یہ معیار بالکل صحیح و درست ہے۔ مگر خالق نے انسان میں جس کو اس نے اشرف المخلوقات ہونے کا گراں بہا خلعت عطا فرمایا ہے یہ دو صفتیں ودیعت فرمائی ہیں ؎

از بہائم بہرہ داری وز ملائک نیز ہم
از بہائم بگذری تا از ملک ہم بگذری

بہیمیت اور صفات ملکوتی دونوں کو خداوند عالم نے انسان میں مجتمع کر دیا ہے۔ اور پھر دنیا میں امتحان کی غرض سے چھوڑ دیا ہے اب انسان کو اختیار ہے ان دونوں صفتوں میں سے جس کو چاہے غالب کرے جس کو چاہے مغلوب کرے۔ ابلیس کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے جس نے ایک آن واحد میں اپنے کو اعلیٰ سے اسفل تک پہونچایا۔ ہر وقت اور ہر زمانے میں دنیا میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنھوں نے اپنے صفات ملکوتی کو بہیمیت سے مغلوب ہی نہیں کر دیا بلکہ بالکل کالعدم۔ بخلاف اس کے ایسے لوگ بھی ہر زمانے میں موجود رہے ہیں جنھوں نے اپنی ریاضت سے اپنی صفات ملکوتی کو درجہ کمال تک پہونچایا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد یہ کہہ دینا کہ حسینؑ پانی کے پیاسے تھے اور ان کی پیاس پانی سے بجھ سکتی ہے یا بجھ سکتی تھی حد درجہ کی کم ظرفی ہے۔ وہ ذات عالی جس کا باپ ساقی کوثر ہو اس کی آنکھوں میں فرات کا پانی کیا جچ سکتا تھا وہ حسینؑ جس کے اک استغاثہ ”ھل من ناصر ینصرنا“ پر فرشتوں میں کہرام مچ جائے اور فرشتے جوق کے جوق خداوند عالم کی اجازت سے نصرت کے لئے آئیں کیا اس بات کا محتاج تھا کہ لشکر ابن سعد پانی دے تو وہ پیئے۔ حسینؑ نے اپنی اطاعت سے اپنے خالق کو ایسا راضی کر دیا تھا کہ اگر حسینؑ چاہتے تو ساری دنیا پانی ہو جاتی کیا اس اختیار کے بعد حسینؑ مظلوم کو اس بات کی ضرورت تھی کہ اپنے شیر خوار فرزند کے لئے ایک جرعۂ آب کے واسطے دست سوال دراز کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ کی معمولی پیاس نہ تھی۔ جو پانی سے بجھ جاتی اس بات پر غور کرنے والے کو کہ حسینؑ کس چیز کے پیاسے تھے لازم ہے کہ وہ ادنیٰ سطح سے اعلیٰ کی طرف رجوع کرے ورنہ اس کو صحیح جواب نہیں مل سکتا۔

حسین مظلومؑ کی تشنہ کامی کے دریافت کے لئے اسلامی تاریخ کے اوائل کے صفحات پر نظر کرنے کی ضرورت ہے حسینؑ کی ذات وہ ذات تھی جس کے لئے بانی اسلام نے ”حسین منی و انا من الحسینؑ“ فرمایا۔ جس نے اسلام کی گود میں پرورش پائی۔ جیسے نانا کہ اسلام بنا۔ باپ ایسا پایا کہ جس کے لئے ارشاد نبوی ہوتا ہے کہ ”علیؑ مع الحق والحق مع علیؑ“ ماں طاہرہ صدیقہ نبیؐ کی بیٹی، غرض کہ جس ماحول میں

حسینؑ نے پرورش پائی اس کے اعتبار سے اگر کسی اور امر کا لحاظ نہ کیا جائے تب بھی حسینؑ کے دل میں اسلام کا جو درد نہ ہوتا کم تھا۔

حسینؑ ابھی بچے ہی تھے کہ شفیق نانا کا سایہ سر سے اٹھ گیا نانا کی آنکھ بند ہوتے ہی حسینؑ کے لئے اک انقلاب آگیا۔ ماں نے چکی پیس پیس کر اور باپ نے مزدوری کر کر کے اپنے بچوں کو پالا حسینؑ کو شروع ہی سے ایثار کا سبق سکھلایا گیا۔ گویا یہ تیاری تھی اس ایثار کی جو حسینؑ کو میدان کربلا میں دکھلانا تھا حسینؑ اپنے مکان کے گوشہ میں بیٹھے ہوئے ان تغیرات کا تماشہ دیکھ رہے تھے جو رفتہ رفتہ مگر تسلسل کے ساتھ عمارت اسلام میں نشو ونما کر رہے تھے ایک دور کی ابتدائی بے عنوانیاں قلیل مدت میں ختم ہو گئیں مگر اس بنیاد پر عمارت تعمیر کرنے کے لئے ایک سزاوار معمار چھوڑ گئیں جو اس بات سے کما حقہٗ واقف تھا کہ کن اینٹوں سے کام لیا جائے کہ بظاہر تو عمارت نہایت ہی شاندار اور استوار نظر آئے مگر باطناً ظاہر کے بالکل مخالف ہو۔ بہرنوع بنانے والے نے اپنی عمارت بنا ہی لی اور اپنا کام ایک معمار کے سپرد کر گیا۔ جو یا تو اس کے طرز معماری سے بالکل نابلد تھا یا اس کی ضرورت نہ سمجھتا تھا کہ ظاہر اور باطن میں تفریق کی جائے۔ اس کے بعد والے دور میں اس بات کا پتہ چل گیا کہ اگلے بنانے والوں کا کس قسم یا کس نوع کی عمارت بنانے کا ارادہ تھا۔ اب یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں شب تاریکی بھی آڑ کی ضرورت نہ تھی۔ دن دہاڑے پرانی اینٹیں نکالی جانے لگیں اور ان کے بجائے نئی اینٹیں پیوست کی جانے لگیں۔ دانستہ ہو یا نادانستہ۔ مگر یہ طرز آخر میں خود معمار کے لئے مہلک ثابت ہوا۔ وہ عمارت جس کی بنا بانی اسلام نے قائم کی تھی اگر وہی عمارت بنائی جاتی تو اس کے بنانے والے صرف تھوڑے تھے اور وہ ایک ہی بن سکتی تھی۔ اس کی نقل ناممکن تھی۔ مگر تیسرے دور کی پالیسی نے عمارت کا نقشہ بتلا دیا اور نقشہ بھی وہ نقشہ جس کا حوصلہ ہر شخص کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک عمارت مدینہ میں بن رہی تھی اور دوسری عمارت شام میں۔

تغیر کسی مقام پر یا کسی چیز میں جب کبھی ایسا فوری ہوگا کہ کایا پلٹ کہا جا سکے تو خواہ وہ اچھا ہو یا خراب خراب ہی نتیجہ دکھلائے گا خصوصاً ایسی صورت میں جب اپنے مفاد کے لئے خراب تغیر کیا جائے۔ گو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دور اول و مابعد کا جو رنگ تھا وہ بھی آخر میں وہی نتیجہ پیدا کرتا جو ظاہر ہوا مگر اس قدر ضرور کہیں گے کہ اگر اس کے بھی بعد والے دور میں وہی حکمت عملی پیش نظر ہوتی جو سابق میں تھی تو شاید اسلامی تاریخ کے اوراق اس قدر زائد خوں چکاں نہ ہوتے جس قدر ہوئے۔ بہرحال دور سیوم کے زہر آلود تغیرات باوجود خلائق ہمدردانہ اصلاح اور نیک مشورے کے اسی طرح جاری رہے ہندی کی مثل ہے۔

ایک تو کڑوا کریلا دوسرے چڑھا نیم

اس دور میں بالکل صادق آتی ہے۔ گو معمار وقت کی افتاد ہی مابعد بلحاظ اس ذمہ داری کے جو ان پر عائد کر دی گئی تھی اور جسے ان کو بہ حیثیت ایک ذمہ دار شخص کے پورا کرنا چاہیئے تھا کمزوری پر مبنی تھی تاہم ممکن تھا کہ نیک مشورے اصلاح پذیر ہوتے مگر خود اس وقت کا اسیر مصاحبوں کے ہاتھ میں کچھ ایسا کاٹھ کا پتلا بنا ہوا تھا کہ وہ جو چاہتے تھے کر لیتے تھے اور یہ منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ آخر جنبہ داری رنگ لائی اور جان پر بنی۔ اس موقع پر یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بظاہر امیر کوئی اور تھا مگر پبلک کی نظر جب متوجہ ہوئی تو امیر المومنینؑ ہی کی طرف۔ اگر امیر المومنینؑ کی رائے مان لی جاتی تو وہ برا دن دیکھنا پڑتا جو دیکھنا پڑا۔

میں نہیں واقعات خود کہیں گے کہ اگر جناب امیر المومنینؑ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ شام کی عمارت ٹوٹ جاتی اور اس کے ٹوٹ جانے کے بعد وہ مرکز جو بنی امیہ نے اپنی ریشہ دوانیوں کے لئے بنا رکھا تھا۔ کالعدم ہو جاتا۔ مگر حالت کچھ اس قدر دگرگوں ہو چکی تھی کہ اب عام پبلک میں حق و باطل کا امتیاز باقی نہ رہا تھا ایک طرف لوگوں نے آکر حضرت علیؑ کے ہاتھ پر

بیعت کی اور دوسری طرف پھر فسخ بیعت۔ وہ حضرات جن کی
بڑھتی ہوئی امید دل اور ولولہ انگیز امنگوں پر پانی پھر گیا
تھا اب کوشاں ہوئے کہ کسی طرح سے دل میں کھٹکتے ہوئے
کانٹے کو دور کرنا چاہئے۔ یہ وہ خیالات تھے جو روکے نہ رک
سکتے تھے۔ حق و ناحق کا خیال لوگوں نے بالکل اٹھا دیا حد
تو یہ ہے کہ قرن فی بیوتکن کی دیوار بھی ولولوں کو پامال
کیئے کہ داماد رسولؐ کی طرف سے جو بغض تھا اس کے اظہار
کو روکنے سے قاصر رہی۔

قوم کے باہر نکال دینے میں تیری ذات فرد
میرے قومی او فتنے لئے جنگ جمل کی یادگار

ذاتی مفاد پر قومی مفاد کی خوب ہی قربانی ہوئی۔ مدینہ
کا رہا سہا وقار جاتا رہا۔ اور امیر معاویہ بن ابی سفیان کی
حکومت دمشق میں استوار ہو گئی۔

کوئی کہا جاتا تھا کہ وہ مذہب جس کے متعلق خداوند
عالم ارشاد فرماتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو دین ہے وہ
اسلام ہے اس کی ترجمانی کج رفتاری زمانہ کے باعث ایسے
لوگوں سے متعلق ہو جائے گی جن کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو بالکل
بجا ہوگا کہ ان میں سے سوا ایک دو کے کل کے کل ابتدا ہی
سے دشمن اسلام رہے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ کسی کی پرورش
اس کے دشمن سے متعلق ہو جائے سنہ ۱۱ھ سے لے کر سنہ ۶۱ھ تک
اور اس کے بعد تک تاریخی صفحات کا مطالعہ فرمائیے تو معلوم
ہوگا کہ اسلام کیا سے کیا ہو گیا ایک انگریزی مورخ نے صحیح
واقعات کی ترجمانی یوں کی ہے۔ "عجیب کرشمۂ تقدیر جس کی
مثال تاریخ میں بس ایک ہی ہے دشمنان محمدؐ نے ان کی آل
کے ورثہ کو غصب کر لیا اور علمبرداران بت پرستی ان کے
مذہب اور سلطنت پر قابض ہو گئے" (ڈاؤرڈ گبن
ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر جلد ۵) اس
جملے کو اس مورخ نے بالکل ڈوب کے لکھا ہے۔ اب یہ علم
برداران بت پرستی کھلم کھلا اس بات کی کوشش
کرنے لگے کہ ان کی کارروائیوں کے لئے سد راہ کوئی نہ
رہ جائے۔

شراب کو اسلام نے حرام کر دیا تھا مگر یہ کبھی
بالکل بند نہیں ہوئی تھی۔ کبھی یہ نبیذ کے نام سے پی گئی اور
کبھی کسی دوسری صورت سے۔ عبداللہ ابن سعد ابن سرح کے
حالات ہوں یا ولید ابن عقبہ کے، ام الجمیل کے ہوں یا کسی اور
حکمران وقت کے محتاج بیان نہیں ہیں۔ ان ناگفتہ بہ حالات
کے متعلق جس قدر رقم کیا جائے اچھا ہے مگر یزید کی نامردگی
نے جو رنگ دکھلایا اس کی تصویر خواجہ حسن نظامی نے
اپنے محرم نامہ میں یوں کھینچی ہے۔

بڑا جوشیلا، بڑا متوالا، جگر خوار دادی کی گود
کا پروردہ، بڑے دادا کا پوتا حلال حرام میں
فرق نہیں کرتا تم کو شراب پینے کو منع کرتا ہے خود پیتا
ہے۔ ... دنیا اس کو سب کچھ
کہتی ہے تم کچھ نہ کہو کیونکہ دوزخ کے سب سے بڑے
شہریار کی شان میں تم کو کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے"

دمشق میں یزید کی تخت نشینی پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں
اور مدینے میں پنجتن پاک علیہم السلام کے تنہا یادگار یعنی جناب
امام حسین روحی لہ الفداء اپنے اہلبیتؑ کے ساتھ یاد خدا میں
مصروف تھے۔ یزید اتنے ہی پر قانع ہو جاتا تو بہتر تھا۔ بے
حیا بیعت حسینیؑ کا طالب ہوا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ حسینؑ ایک فاسق
و فاجر کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ جس خیال نے امام حسینؑ کو مدینہ
چھوڑنے پر، نانا کے روضہ، ماں کی لحد، بھائی کے مزار کو
ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔ جس نے امام حسینؑ کو ہر
مصائب کو برداشت کرنے کے لئے تیار و مستعد کیا وہ
خیال صرف یہ تھا کہ کسی صورت سے نانا کی محنت رائگاں نہ
ہونے پائے۔ اگر حسینؑ پیاسے تھے تو صرف اس لئے کہ مذہب
اسلام میں کوئی خرابی نہ آنے پائے۔ دل کی لگی وہی جانتا
ہے جس پر پڑی ہو۔ کیا دشوار تھا حسینؑ پر یہ دیکھنا کہ وہ
مذہب جس کو رسول خدا نے اپنی انتھک کوششوں کے بعد
رواج دیا تھا وہ نااہل ہاتھوں سے برباد ہو رہا تھا۔

تمام مصائب، کا خیال کرتے ہوئے حسینؑ کربلا روانہ ہوئے اور لشکر یزید کی کثیر تعداد سے مقابل ہوئے لشکر یزید نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ ترائی میں قیام نہیں کرنے دیا۔ پانی بند کر دیا۔ بھوکا رکھا اور اپنے زعم ناقص میں حسینؑ کو بھوکا پیاسا مظلوم بیکسی کے عالم میں شہید کیا۔ اور بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے مگر سطح پر نظر رکھنے والی نگاہیں عمق میں کہاں جا سکتی ہیں۔ حسینؑ نے اپنی پیاس بجھائی اور خوب بجھائی مخالفین تو یہ سمجھتے رہے کہ انھوں نے حسینؑ کو شکست دی اور بالکل مغلوب کر دیا مگر باطناً حسینؑ ہی کی فتح رہی اور آپ اپنے مطلب میں کامیاب ہو گئے

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہو گیا کہ حسینؑ کی غرض اصلی حفاظت اسلام تھی۔ اور اس میں آپ بدرجہ اتم کامیاب ہو گئے

شہادت حسینؑ نے ایک سنسنی خیز بے چینی پیدا کر دی بنی امیہ کی حکومت جو قبیحات کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اس میں زوال شروع ہو گیا۔ دنیا نے جان لیا کہ حق بھی کوئی چیز ہے اور ایسے لوگ موجود ہیں جو حق کے قائم رکھنے کے لئے طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کر سکتے ہیں۔

شہادت کے بعد اگر ہمارا شہید کسی چیز کا پیاسا نظر آتا ہے تو وہ یہ ہے کہ حق قائم رہے کتنی ہی بلائیں نازل ہوں، کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ پڑیں، مگر ہمت نہ ہارنا چاہئے حق کے استحفاظ کے لئے فوجی طاقت لازمی و ضروری نہیں ہے حق حق ہی ہے اور ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔

کہاں گئی بنی امیہ کی عظیم الشان سلطنت۔ کیا ہوا شاہان امیہ کا و فتر۔ آج کتنے لوگ ہیں جو یزید کو یاد کرتے ہیں سب مٹ گیا مگر اس کا نام جس کو یزید نے اپنے زعم ناقص میں بالکل مٹا دیا تھا ابھی تک باقی ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ باقی رہے گا

حسینؑ نے اپنی اور اپنے اعزا کی قربانی دے کر ایک بے مثال اور قابل قدر نمونہ قائم کر دیا۔ واقعہ یوں ہے کہ اسی شہادت عظیم کی وجہ سے اسلام قائم ہے۔ اس واقعہ کی وجہ سے جو قیامت تک کے لئے ادب میں، اخلاق میں، تمدن میں، اقتصادیات میں ترقیاں ہوئی ہیں ان کے بیان کے لئے ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہے۔ آج مجالس کے ذریعہ سے کتنی علوم اور فنون کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لڑکوں میں شروع ہی سے مذہب کے متعلق صحیح جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ آج کتنے ہیں کہ حسینؑ کا نام لے کر رزق حاصل کرتے ہیں اگر مسلمان عموماً اور شیعہ خصوصاً یہ چاہتے ہیں کہ شہید کربلا کی پیاس میں شدت نہ ہونے پائے تو اس کی صورت یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اس واقعہ کو پیش نظر رکھ کر زندگی بسر کریں۔ اگر اس واقعہ کو عبرت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو جو خرابیاں ہمارے اخلاق و عادات، تہذیب و ایمان میں آ گئی ہیں وہ سب دور ہو سکتی ہیں۔

اس وقت مسز اینی بیسنٹ کا قول مجھے یاد آگیا ہے "کسی شخص کو ایسا کرنا چاہئے لہٰذا میں ہی کیوں نہ کروں" "کسی شخص کو ایسا کرنا چاہئے لہٰذا میں کیوں کروں" انھیں دونوں جملوں میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ مستور ہے"۔ حسینؑ نے باوجود اس کے کہ ہمراہ بہت کم لوگ تھے اور ان میں بھی بچے بوڑھے شریک تھے مگر آپ نے یہ نہیں کیا کہ اپنے فرض کو دوسروں پر چھوڑ دیتے۔ کسی شخص کو اسلام بچانے کی ضرورت تھی۔ حسینؑ نے سوچا میں ہی یہ ابتدا کیوں نہ کروں آپ نے سبقت کی اور اسلام کو بچا لیا۔

یہ اصول سابق میں بھی صحیح تھا اب بھی صحیح ہے اور آئندہ بھی صحیح رہے گا ہر شخص کو اپنی ذمہ داری سمجھنا چاہئے اور جو کچھ امکان میں ہو کرنا چاہئے۔ کیا امید کی جا سکتی ہے کہ قوم واقعہ کربلا سے صحیح فائدہ اٹھانے کی کوشش کر کے اپنی حالت سدھاریگی؟

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

عشرۂ محرم میں ترک لذات

جناب مولوی سید علی نقی صاحب خلف جناب ممتاز العلماء
مولانا سید ابوالحسن صاحب عرف منن صاحب قبلہ مجتہد

ارباب ذوق اور اہل محبت سب سمجھ سکتے ہیں کہ مقتضائے محبت یہ ہے کہ جس مصیبت میں محبوب مبتلا ہو اس میں محب بھی شریک ہو جائے۔ سرکار اسلام میں جو لوگ سچے دوست خدا اور رسولؐ کے تھے ان میں ایسے نمونے موجود ہیں۔ حضرت اویس قرنی نے یہ سن کر کہ حضرت رسولؐ کے دندان مبارک جنگ احد میں شہید ہوئے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے۔ دیکھو طبقات شیخ عبد الوہاب شیرانی و لسان العیون۔

یہ کیا تھا؟ یہی تھا کہ جذب محبت مجبور کر رہا تھا کہ محبوب اپنی مصیبت میں تنہا نہ رہنے پائے۔ جن لوگوں کا پیمانۂ دل شراب محبت سے خالی ہے وہ اس کو مجنونانہ فعل اور اپنے ہاتھ سے اپنے تئیں ایذا رسانی سمجھیں۔ مگر ارباب وفا اس کو منتہائے کمال محبت خیال کرتے ہیں۔

یہ پورا مہینہ خصوصاً عشرہ محرم وہ زمانہ ہے کہ اہلبیتؑ رسولؐ نے راحت و لذات دنیا سے کنارہ کشی کر لی تھی اور سوائے تکالیف و مصائب کے کوئی دمساز نہ تھا۔ لہٰذا وفاداران محبت کیش کا یہ طرز عمل رہا ہے کہ وہ بھی اس زمانے میں اپنے نفس پر تکلیف برداشت کریں۔ اس ضمن میں شیعوں میں سے کسی فرد کا پتہ نہ دوں گا بلکہ سواد عظیم اہل اسلام کی آواز سناؤں گا۔ راحۃ القلوب مولفہ سلطان نظام الدین میں ملفوظات شیخ فرید الدین کو جمع کیا گیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ بغداد میں ایک بزرگ تھے جن کے سامنے واقعہ شہادت حسینؑ بیان کیا گیا۔ فرط محبت میں اپنا سر زمین پر اتنا پٹکا کہ سر سے خون جاری ہوا اور کچھ دیر بعد زمین پر گر پڑے لوگوں نے جو دیکھا تو انتقال کر چکے تھے۔ اسی شب ان بزرگ کو خواب میں دیکھا گیا کہ وہ امام حسینؑ کے پہلو میں ایستادہ ہیں پوچھا کہ خداوند عالم نے آپ کے ساتھ کیا کیا انھوں نے کہا کہ مجھکو پروردگار عالم نے بخش دیا اور فرمایا کہ چونکہ تم خاندان رسالت کے دوست ہو بہتر یہ ہے کہ امام حسینؑ کی خدمت میں رہو اور پھر اسی کتاب میں بتصریح مذکور ہے کہ "بیشتر مشائخ طبقات دریں عشرہ بر نفس خود عذاب اختیار کردہ اند"

یعنی اکثر مشائخ و بزرگان دین اس عشرہ میں اپنے نفس کو تکلیف دیتے تھے" اور اخبار الاخیار میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ شیخ احمد محمود شیبانی عشرہ محرم میں نیا لباس اور دھویا ہوا اجلا کپڑا نہیں پہنتے تھے اور اس عشرہ میں سوائے فرش زمین کے کسی بستر پر نہ لیٹتے تھے اور مقابر سادات میں متمکن ہو کے سوائے عبادت خدا کے اور کوئی شغل نہ رکھتے تھے اور جب عاشور کا دن ہوتا تھا تو کوزے شربت سے بھر کر اپنے سر پر رکھتے تھے اور سادات، یتیموں کو اور فقرا کو لے جا کے پلاتے تھے اور اس زمانہ میں اتنا روتے تھے کہ گویا یہ واقعہ ہائلہ ان کی نظر کے سامنے ہوا ہے۔

درحقیقت کمال محبت حسینیؑ جو مثل رسولؐ مدار ایمان ہے جیسا کہ صحاح میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ میں اور میرے اہلبیتؑ اس کی جان و مال و اولاد سے زیادہ اس کو محبوب نہ ہوں۔

اس کی شان یہی ہے کہ جب ان کی تکلیف کا زمانہ ہو اس

میں اپنے نفس کو بھی تکلیف دے نہ یہ کہ اہل بیتؑ تو مصیبت و
حزن والم میں مبتلا ہوں اور اس دن سامان مسرت کئے جائیں
اور لباس نو پہنا جائے اور اس دن کو عید قرار دے دیا جائے
اور آنکھوں میں سرمہ لگایا جائے (دیکھو غنیۃ الطالبین مولفہ
عبدالقادر) یہ ہرگز نشان محبت نہیں بلکہ انداز عداوت ہے چنانچہ
علامہ مجد الدین فیروز آبادی سفر السعادۃ میں لکھتے ہیں۔
قال ائمۃ الحدیث الاکتحال فیہا بدعۃ ابتدعہا
قتلۃ الحسینؑ ائمہ حدیث نے کہا ہے کہ سرمہ لگانا اس
دن بدعت ہے جس کی ابتدا قاتلان امام حسینؑ نے کی ہے"

اور واقعہ بھی یہی ہے اگر تتبع اور سیر و تواریخ کی ورق گردانی
کیجائے تو اس کا پتہ چلے گا کہ ابتدا اس کی یزید سے ہے جیسا کہ دفائے
کبیر اور درجۃ العلماء میں ہے
اکتحل یزید بن معاویۃ یوم العاشورا بدم الحسینؑ
و بالاثمد لیقر عینہ یزید بن معاویہ نے روز عاشورہ خون
امام حسینؑ اور اثمد کا اپنی آنکھوں میں سرمہ لگایا تا کہ اس کی
آنکھیں خنک ہوں۔
معلوم ہوا کہ اس دن سامان سرور کرنے والا یزید ملعون کا پیرو
ہے لعنہ اللہ۔

محرم نمبر ۱۳۲۵ھ

نواب آصف الدولہ

(اور)

عزاداری

شیخ تصدق حسین صاحب بی اے، ایل ایل بی وکیل لکھنؤ

پونے دو صدی قبل یعنی ۱۷۷۵ء سے پہلے لکھنؤ کی حیثیت ایک
قصبہ کی ایسی تھی جو ابھی بدرجہ کامل نہ ہوا تھا اس کی مختصر
آبادی حضرت پیر محمد شاہ سے لے کر نخاس تک متفرق طور
پر پھیلی ہوئی تھی تہذیب و تمدن کی لہریں پورے طور پر ابھی یہاں
تک نہیں پہنچی تھیں۔ صرف چند اکابر علماء اور بزرگان دین کے یہی
مراکز تھے یا فرنگی محل یا مدرسہ نظامیہ تھا جس نے بعہد حکومت
شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب غازی جنم لیا تھا اور اسی سرچشمہ
علم و فضل سے سب فرقے یکساں سیراب ہو رہے تھے۔
۱۷۷۵ء میں نواب شجاع الدولہ کے نور نظر نواب
آصف الدولہ مرزا یحییٰ علی خاں عرف مرزا امانی اپنی والدہ
ملکہ امۃ الزہرا بیگم کا غصہ جو نواب بہو بیگم صاحبہ کے نام سے
کبیدہ خاطر ہو کر فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور اسی مقام
کو اپنا دار الحکومت قرار دیا نواب کے دم قدم سے لکھنؤ کے بے رونق
چمن میں ایک تازہ بہار آگئی موصوف نے اس میں باون موضعات
شامل کر کے بڑی بڑی عالی شان فلک بوس محل عمارتیں اور کوٹھیں
بنوائیں اور بہت سے دلکش اور نزہت بخش باغات سے بھی اس
کو زیب و زینت دی اور جیتے جی دس لاکھ روپیہ سالانہ
کی تعمیرات صرف کرتے رہے۔ اس طور پر لکھنؤ کو شہر کا مرتبہ
بخشنے اور اس کو دلہن کی طرح آراستہ کرنے کا سہرا نواب
آصف الدولہ کے سر ہے۔ چنانچہ موصوف نے اپنی زرپاشیوں
اور کاوشوں سے اس ننھے سے پودے کو صرف بائیس برس کی
آبیاری سے ایک تناور درخت بنا دیا جس کے زیر سایہ بڑے
بڑے علماء و فضلاء کاملین فن، نامی گرامی شعراء اور مشہور
و معروف ادباء پناہ لینے لگے اور شہر لکھنؤ ہندوستان کا پیرس

اور فخر اصفہان ہو گیا۔

لکھنؤ میں تعزیہ داری کا عروج بھی انہیں کی ذات سے ہوا۔ چنانچہ جس دوکان میں سر بازار تعزیہ ملاحظہ کرتے تو ادھر سے پاپیادہ نکلتے اور کم سے کم پانچ روپئے اور زیادہ سے ہزار روپئے بطور نذر چڑھاتے اور کئی لاکھ روپئے ہر سال محرم میں صرف کرتے تھے ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ میں قیامت خیز قحط پڑا جبکہ آدمی کو آدمی کھائے جاتا تھا اور قحط زدہ لوگ اولاد جیسی محبوب چیز کو فروخت کر کے اپنا پیٹ پال رہے تھے۔ جب رحم دل اور بلند حوصلہ نواب کو رعایا کی تباہی و بربادی کا المناک نقشہ دکھایا گیا تو انھوں نے خزانے کا منہ کھول دیا اور امام باڑے کی بطور امدادی کام کے احاطہ مچھی بھون میں داغ بیل ڈال دی مگر سیر چشم اور دریا دل نواب نے اس خیال سے کہ میرا امام باڑہ بہترین قسم کی عمارت ہو اور اب تک جو امام باڑے تعمیر ہو چکے ہیں ان سب سے اعلیٰ و افضل ہو بہت سے نقشے مختلف معماروں سے تعمیر کرائے مگر کفایت اللہ دہلوی کا نقشہ سب سے زیادہ پسند خاطر ہوا اور اسی کے موافق عمارت تعمیر ہوئی۔ تہی دست اور مفلوک الحال شرفاء جو زمانہ کے ہاتھوں پامال ہو رہے تھے مگر آبرو کے رکھ رکھاؤ کے خیال سے مزدوروں کے ساتھ کام کرنا اپنی کسر شان اور شوکت عزت خیال کرتے تھے وہ شب کی تاریکی میں آکر مشعلوں کی روشنی میں معمولی سا کام کر جاتے تھے اور پاس شرافت میں ان کو پورے دن کی اجرت بغیر نام پکارے دے دی جاتی تھی جس سے ان کی کوئی توہین و تذلیل نہیں ہونے پاتی تھی۔ سات برس کے بعد بقول مرزا ابوطالب مصنف تفضیح الغافلین و معاصر نواب آصف الدولہ یہ مایۂ ناز و شہرۂ آفاق امام باڑہ بن کر تیار ہوا۔ مرزا کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ راوی ہیں کہ اس کی عمارت میں پچاس لاکھ روپیے کی لاگت آئی اور تخمیناً اسی قدر رقم اس کی تزئین و آراستگی میں صرف ہوئی۔

امام باڑہ تیار ہو جانے پر اس کے وسطی ہال میں تعزیہ داری ہونے لگی یہ ہال بقول مسٹر نیول (NEWILL) مصنف اور "گزیٹیر" ۱۶۳ فٹ لمبا ۵۳ فٹ چوڑا اور ۴۹ فٹ بلند ہے جو خشت اور چونے کی صناعی کا بہترین نمونہ ہی نہیں پیش کرتا ہے بلکہ اس کا شمار دنیا کے اعلیٰ ترین دالانوں میں ہے جس کی چھت بغیر لکڑی یا لوہے کی مدد کے محراب دار بنائی گئی ہے۔

مرزا ابوطالب کے بیان کے مطابق وسطی ہال کی لمبائی ۶۰ گز اور چوڑائی ۲۰ گز ہے۔

امام باڑے کے آگے ایک بڑا وسیع چبوترا تھا جس کے وسط میں ایک حوض بھی بنا تھا مگر اب کوئی حوض چبوترہ پر موجود نہیں ہے۔ امام باڑہ کے حدود میں ایک ضعیفہ کا مکان بھی آگیا تھا جس کی وجہ سے عمارت کا ٹی رہی جاتی تھی مگر بڑھیا اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی اور مکان دینے پر کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی۔ ہاں آخر وہ اس شرط پر رضامند ہوئی کہ مکان کے عوض اس کو دوسرا مکان بنوا دیا جائے اور امام باڑہ میں اس کے نام کا تعزیہ بھی ہر سال رکھا جائے۔ نواب نے اس کی دونوں شرطیں منظور کر لیں اور جب امام باڑہ میں تعزیہ داری شروع ہوئی تو عشرہ کے پہلے اور دوسرے دن کے نواب نے بڑھیا کے نام کا تعزیہ بھی مغربی جانب کی صحنچی میں اٹھا کر خود رکھا۔ اور اب تک اسی مقام پر بدستور سابق رکھا جاتا ہے۔

امام باڑے کی آراستگی اور سجاوٹ کے متعلق مرزا ابوطالب لکھتے ہیں:

"امام باڑہ کی تکمیل کے بعد سے نواب آصف الدولہ چار پانچ لاکھ روپے سالانہ اس کی آرائش و زیبائش پر صرف کرتے تھے۔ انھوں نے سیکڑوں چھوٹے بڑے تعزیے چاندی سونے کے بنوائے تھے۔ اور شیشہ آلات کی مد میں سفید اور رنگین کنول دار و بابا کنول جھاڑ اور فانوس مردنگیں جو خریدی جاتی تھیں وہ حدود حساب سے باہر تھیں۔ امام باڑے کے کل بڑے بڑے دالانوں کی چھتیں اور فرش شیشہ کے آلات

سے پڑے رہتے تھے۔ اسی لئے زیارت کرنے والوں کے لئے اندر بالکل گنجائش نہ رہتی تھی اور زائرین کھلے ہوئے چبوترے پر بیٹھ کر دور سے زیارت کرتے تھے اس قدر ساز و سامان موجود ہوتے ہوئے بھی نواب کی سیری نہ ہوئی اور جب ڈاکٹر بلین (DOCTOR BALUN) ولایت جانے لگے تو نواب نے ان سے ایک سنہرے اور ایک سرخ تعزیہ کی اور جھاڑ دیگر سامان شیشہ آلات کی فرمائش کی کل سامان کی قیمت ایک لاکھ روپیہ طے پائی۔ سنہ ۱۲۱۱ھ میں ایک تعزیہ آگیا اور دوسرے کے لئے آئندہ کا وعدہ ہوا۔

سنہ ۱۸۲۴ء میں بزمانہ حکومت شاہ غازی الدین حیدر ہیبر صاحب HEBER بسلسلہ سیاحت لکھنؤ بھی آئے تھے۔ امام باڑہ آصفی کے متعلق وہ حسب ذیل رقم طراز ہیں۔

> اس مقدس عمارت میں بہ کثرت جھاڑ لٹک رہے تھے جس کی سنہری اور روپہلی ڈالوں اور کچھل دار ترشی ہوئی خوش رنگ قلموں کی چمک دمک سے آنکھوں میں خیرگی پیدا ہوتی تھی اور جو جھاڑ بہت وزنی اور لٹکانے کے قابل نہ تھے وہ فرش پر رکھے ہوئے تھے ان جگمگاتے ہوئے بیٹھک کے جھاڑوں کا نچلا حصہ بہت گھیر دار تھا اور اوپر کی جانب گاؤدم ہوتے چلے گئے تھے۔ ان کے بیچ میں نقرئی مرصع کار روضے یا تعزیے جو آٹھ دس فٹ بلند ہوں گے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ نوابان اودھ کے پرانے زمانے زربفتی پٹکے جن پر آیات قرآنی کڑھی ہوئی تھیں بڑے بڑے نقرئی پنجے جن پر بخط طغرا الفاظ کندہ تھے، مقدس ڈھالیں جن پر خدا ئے قدوس کے اسمائے گرامی پر مرصع کاری کی گئی تھی خراسانی تلواریں نیزے اور بھالے، مشہور زمانہ سپہ سالاروں کے عمامے اور چند مخصوص قسم متبرک منبر بھی تھے جو امام باڑہ کی زیب و زینت میں اور چار چاند لگا رہے تھے۔

آصف الدولہ نے ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو انتقال کیا اور اپنے ہی تعمیر کردہ امام باڑے میں سپرد خاک کئے گئے۔ مگر بدقسمتی سے انھوں نے امام باڑے کی شکست و ریخت کی مرمت و مصارف امام باڑہ کے لئے کوئی جائداد وقف نہیں کی اس وجہ سے یہ عرصہ تک وقف حسین آباد کی زیر نگرانی رہا۔ اب کچھ عرصہ سے محکمہ تحفظ آثار قدیمہ نے اس کو باستثنائے مسجد اپنے تحت میں لے لیا ہے آصف الدولہ کے مرقد کے علاوہ ایک اور قبر بھی امام باڑے میں ان کی بیوی شمس النساء بیگم کی ہے۔ موصوفہ اور نواب سعادت علی خاں میں موافقت نہ تھی اس وجہ سے وہ الہ آباد میں سکونت پذیر تھیں اور وہیں رحلت کی مگر بزمانہ حکومت شاہ غازی الدین حیدر ان کی لاش الہ آباد سے لکھنؤ لا کر آصف الدولہ کی قبر کے مشرقی پہلو میں دفن کی گئی۔

مس سڈنی ہے MISS SIDNIEY HEY نے اپنی کتاب ہسٹارک لکھنؤ HISTORIK LUCKNOW میں بغیر جانچ تحقیقات لکھ مارا ہے کہ آصف الدولہ کی قبر کے برابر کفایت اللہ معمار کی قبر ہے مگر یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ کفایت اللہ کی مسجد موسومہ بلند ار مسجد اور امام باڑہ محلہ مصاحب گنج میں ہے۔ عہد آصفی کا یہ مایۂ ناز معمار جس کی تعمیر کی ہوئی عمارت کو دیکھ کر یورپ کے بڑے بڑے انجینیر انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں اپنے ہی امام باڑہ واقع مصاحب گنج میں موت کی میٹھی نیند سو رہا ہے

آصف الدولہ کے عہد دولت میں جھتوں کا کوئی ملا بہ ایسا نہ تھا جس میں کوئی جھاڑ ہانڈی یا جھالہ نہ آویزاں ہو۔ مگر وہ زمانہ اس کی بہار کا تھا اب خزاں رسیدگی کے زمانہ میں بیت جھاڑ ہو جانے کے بعد صرف چند قدیم آئینے جن پر پرانی وضع کے سنہرے چوکھٹے لگے ہیں اور تھوڑا سا شیشہ آلات باقی رہ گیا ہے۔ اس کمی سامان کے

کے متعلق منشی رام سہائے تمنا جو حضرت محمد علیشاہ کے ہمعصر تھے۔ اپنی کتاب افضل التواریخ میں تحریر کرتے ہیں کہ امام باڑہ حسین آباد کی آرائش کے لئے امام باڑہ آصف الدولہ کی قیمتی و نادر اشیا منگوالی گئی تھیں۔ زینت حسین آباد باعث بے رونقی امام باڑہ کلاں ہوئی اور روشنی بھی کم ہونے لگی۔ مگر "نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی" امام باڑہ آصفی کی عمارت خود اتنی پُرعظمت اور پُرعظمت ہے کہ اس ننگی بوچی حالت میں اپنے پرائے ملکی و غیر ملکی بھی اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اودھ کے دوسرے فرمانرواؤں کی آراستہ و پیراستہ عمارتوں کا اس کو سرتاج خیال کرتے ہیں۔ درحقیقت اس عمارت کے تناسب نے اور سونے پر سہاگہ کا کام دیا ہے۔ جس سے اس کی دلکشی اور دلفریبی میں اور چار چاند لگ گئے ہیں۔ اور بغیر امام باڑہ آصفی کے عمارات لکھنؤ کا تصور بے دولہا کی برات معلوم ہوتا ہے۔

(محرم نمبر ۱۳۶۳ھ)

درس انسانیت

مرزا جعفر حسین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ

واقعہ کربلا کے روحانی پہلو پر اظہار خیال کا حق کسی ایسے شخص کو کیا ہو سکتا ہے جس کا دامن دنیا کی کثافتوں سے آلودہ ہو اور جو مادیت کی دنیا میں صرف سیاسی میدان کا بادیہ پیما بن کر رہ گیا ہو لیکن پھر بھی دنیا کے اہم ترین واقعہ کا خالص سیاسی نقطۂ نظر اور حالات حاضرہ کی مادی کشمکش کے ماحول میں بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور دقیق نگاہیں خالص دنیاوی راہ عمل میں بھی ان کارناموں کو شمع ہدایت بنا سکتی ہیں۔ اور بناتی ہیں۔

سن اکسٹھ ہجری کی شب عاشور اور دہم محرم کے چند گھنٹے جو حقیقتاً ایک شبانہ روز بھی نہیں کہے جا سکتے اپنے دامن میں بلا کی وسعتیں لئے ہوئے تھے۔ صدیوں قبل کی معاشرت اور تمدن مختلف برباد شدہ ملکوں کی تہذیب و رسم و رواج ان سب کے اعلیٰ جوہر ایک ایسی تہذیب ایک ایسے تمدن اور ایک ایسی معاشرت میں کھینچ کر محفوظ ہو گئے تھے جن کو بچانے کے لئے حسینؑ ابن علیؑ نے ایک ایسا مستحکم ارادہ کر لیا تھا جو کسی خوف، کسی شدت اکسی دھمکی اور کسی حربے سے نہ ہل سکا اور نہ ٹوٹ سکا۔ وہ استحکام حقیقتاً اس صداقت کا استحکام تھا جو حسینؑ کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ حسینؑ اور صداقت کربلا کے تپتے ریگستان میں ایک ہی منزل پر نہیں بلکہ ایک ہی چیز تھے۔

یہ بات تو ہزاروں مرتبہ کہی جا چکی ہے اور طرح طرح سے کہی جائے گی کہ حسینؑ اور یزید دو متضاد اصول کے علمبردار تھے۔ جن میں سے ایک کو ظاہر اور دوسرے کو باطن فتح ہوئی لیکن دنیا میں ہمیشہ ہر لڑائی کو اصولی بتایا گیا ہے ہر جنگجو نے اپنی جارحانہ کارروائی کے لئے ایک نہ ایک مقصد تراشا ہے اور اس میں خوبیاں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے آج بھی ہر لڑائی کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی نہ

کوئی مقصد ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں بھی مقصد تھا اور دوسری جنگ عظیم بھی بڑے مقصد کے لئے لڑی گئی اور اب کوریا کے بے گناہ معصوم بچوں اور عورتوں پر بم باری میں بھی مقصد ہے۔

لہذا لڑائی اور مقصد یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے وابستہ کھی گئی ہیں اور کھی جائیں گی۔ لیکن ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کربلا کی لڑائی اور کربلا کے مقصد میں وہ کونسی ایسی خصوصیت تھی جس نے اس واقعہ کو اس طرح دنیا میں چار چاند لگا دیئے اور زندۂ جاوید بنا دیا۔

کربلا کی لڑائی کے مقصد کو سمجھنے کے لئے ہم کو عرب کی تاریخ کا دور دور اسلام سے قبل کا بھی مطالعہ کرنا ہوگا یہی نہیں بلکہ ہم کو بابی لونیا۔ ایران۔ یونان اور مصر کے ڈوبتے ہوئے کلچروں کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ اور اس تمام معلومات کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ رسولؐ اسلام نے اس وقت کے تمام موجودہ مواد میں سے کیا کچھ اپنایا اور کتنی باتیں کالعدم اور بے کار کر دیں۔ اس سارے کے سارے مطالعہ سے اسباب کا پتہ چلتا ہے کہ بہت سی گری ہوئی عمارتوں اور بہت سے منہدم ستونوں اور آثاروں پر ایک نئے اور حسین قلعہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ جو عمارت تیار ہوئی اس کو اسلام کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ اور اس تیاری سے جو جو سامان مسترد ہوا یا جس جس عمارت کو مسمار کر دیا گیا وہ ساری کی ساری چیزیں ان لوگوں کے لئے ایک مستقل وسیلۂ عظمت بن گئیں جو نئے نظام کو قبول نہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ قرنوں کے رسم و رواج کو یک لخت ترک کر دینا، آبا و اجداد کے صدیوں پرانے اعتقادات کو خیر باد کہہ دینا اور قدامت پسندی کے دور ابتلا میں کسی جدید اقدام پر لبیک کہہ دینا ہر شخص کے لئے آسان کام نہ تھا۔ تاریخیں ہم کو بتاتی ہیں کہ دنیا نے جدید اصولوں کو خواہ وہ کتنی ہی ٹھوس حقیقتوں پر بنائے گئے ہوں جو نئی اور آسانی سے قبول نہیں کیا۔ زوال پذیر اور رجعت پسند عناصر نے ہمیشہ پرے جوڑ کے جدت پسندی کا مقابلہ کیا ہے۔

رسولؐ اسلام کے بتائے ہوئے جدید اصولوں کا مقابلہ کیا جانا اس لئے اور زیادہ سختی سے ناگزیر ہو گیا تھا کیونکہ یہ اصول اس وقت دنیا کے سامنے پیش کئے گئے جبکہ تمام دوسرے اصول کمزور ہو چکے تھے اور ان کی بنیادیں بالکل ہی انہدام پر پہنچ گئی تھیں اور ان جدید اصول سے تمام پرانے عقائد کو یکساں ٹھیس لگ رہی تھی زمانہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا وقت کے تقاضے اور ارتقاء کی برق رفتار کے ساتھ ساتھ نئی نئی قدروں کو جلد جلد پیش کرنے پر آمادہ تھے۔ بنی نوع انسان ایک ایسے دور سے گزر رہی تھی جب ہر نئی چیز پرانی چیز کی جگہ لینے کے لئے حرکت میں آ چکی تھی۔ چنانچہ ان حالات کے ماتحت اسلام کو ویسا ہی نظام پیش کرنا تھا جو حالات کے مطابق ہو اور زمانہ کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ رسول اسلامؐ نے ویسا ہی نظام پیش کیا۔ لیکن یہ نظام رجعت پسند اور زوال پذیر عناصر کے لئے قبول ہو ہی نہیں سکتا تھا انکی رگ قدامت پرستی حرکت میں آئی اور انکے احساسات کو شدت کی ٹھیس لگی اختلافات ترشح ہوئے گر رسولؐ کی زندگی میں کوئی ایسا کھلا ہوا عملی اقدام نہ کیا جا سکا جس کے اثرات تاریخ میں واضح طریقے ظاہر ہو سکتے۔ مگر یہ بات ناممکن ہے کہ اختلافات اور سازشیں نہ ہوئی ہوں۔

سازشیں ہوئیں اور ضرور ہوئیں چاہے ہم کو ان کا تاریخی ثبوت مل سکے یا نہ مل سکے اگر نہ ہوئی ہوتیں تو خلافت کا مسئلہ طے کرنے کے لئے سقیفہ بنی ساعدہ کی سی جگہ منتخب نہ ہوتی۔ جن لوگوں نے عرب کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اس تاریخی جگہ کو کس بات کے لئے شہرت اور اہمیت حاصل تھی۔

اسلام کے ابھرتے ہوئے باثرات اسلام کی بڑھتی ہوئی ہردلعزیزی اور رسولؐ اسلام کی سیاسی سوجھ بوجھ نے مخالفین کی ہمتوں کو اونچا نہیں ہونے دیا لیکن ظاہر ہے کہ رسولؐ ہمیشہ اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتے

تھے انھوں نے اصول بتائے، سکھائے اور خود عمل کر کے دکھایا۔ کچھ لوگوں نے ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو سمجھا، قبول کیا اور ان پر اسی طرح عمل بھی کیا۔ کچھ لوگوں نے مصالح دنیا کے ماتحت گردنیں تو خم کر دیں لیکن نہ ان اصولوں پر دل سے ایمان لا سکے اور نہ ان پر عمل ہی کر سکے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے بظاہر واہ واہ تو کی مگر شورش کی آگ ان کے سینوں میں سلگتی رہی اور وہ صرف اس وقت کے منتظر رہے جب ان کو کھل کر اختلاف کرنے کا موقع مل سکے گا۔ یہ موقع رسولؐ کی وفات کے بعد ہی ہاتھ آ سکتا تھا چنانچہ رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی ایسے تمام عناصر ایک اچھا خاصا اختلافی محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ تمام اصول بھلا دئے گئے جن پر کم از کم زبانی ہی ادعائے ایمان کیا گیا تھا۔ اگر رسولؐ کا بتایا ہوا اسلام قائم رہتا۔ تو آج تاریخ اسلام دوسری ہی حرفوں میں لکھی ہوئی ملتی۔ نہ مصر کے گنبدوں میں سادات کے سر چنے ہوئے ہوتے، نہ شاہی قلعوں کی دیواروں میں مظلوم خون کی سرخیاں ہوتیں، نہ آج فتح و شکست، ایران و سرنا کی داستانیں کہی جاتیں اور نہ ملک گیری کے خونی جذبے کے واقعات دہرائے جاتے، نہ اسپین و حبش میں نام نہاد مسلمانوں کا وہ حشر ہوتا جو ہوا، نہ قصر خضرا، نہ قصر حمرا اور نہ بغداد کے زعفرانی قبوں کے نفس پرستی اور تعیش گری کے رومانی تذکرے ملتے،

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ کا زیادہ حصہ ایک ایسی بھیانک داستان ہے جس میں ظلم و تعدی، ملک گیری، کشت و خون، قتل و غارت اور شورش و فتنہ انگیزی کے سوا بہت کم ایسی چیزیں ملتی ہیں جو جاذب نظر ہوں اور جن سے بنی نوع انسان کو ارتقا و ترقی کے منازل طے کرنے میں مدد مل سکے یہ چیزیں تلاش کرنے کے لئے ہم کو تاریخ کے صرف ان چند درخشاں صفحات کو تلاش کرنا پڑتا ہے جن میں علیؑ اور اولاد علیؑ کی سیرتوں اعمال و احوال کے کچھ تذکرے مل جاتے ہیں یہ اوراق بھی ہم تک صرف اس لئے پہونچ سکے کہ ان سیرتوں میں وہ کشش وہ حسن و جمال اور وہ قوت و طاقت تھی کہ باوجود شہنشاہان اولوالعزم اور صاحبان جبروت و عظمت کی مسلسل جد و جہد کے یہ کارنامے نہ مٹائے مٹ سکے اور نہ چھپائے چھپ سکے اب ہم شہید کربلا کے اس لئے بھی رہین منت ہیں کہ انھوں نے اپنے خون سے ایک ایسی مضبوط اور بلند دیوار اٹھا دی ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ ورق جس میں آل رسولؐ کے کارنامے چمک رہے ہیں اس تمام طویل خونیں داستان سے جو صدیوں تک چلتی رہی اس طرح علیحدہ اور دور ہے کہ دونوں کا تضاد نہ کبھلایا جا سکتا ہے اور نہ مٹایا جا سکتا۔

حسینؑ نے اپنے نانا کی زبانی اسلام کا پیام سنا تھا وہ اسلام کی گود میں پیدا ہوئے، پلے اور اسلام کی آغوش میں کھیل کود کے بڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنے نانا کی زندگی قریب سے دیکھی تھی۔ انھوں نے اپنے باپ کے حالات کا مطالعہ کیا تھا۔ خلفائے ثلثہ کے دور میں جو کچھ ہوا، وہ بھی یاد تھا۔ جمل و صفین و نہروان کی لڑائیاں بھی آنکھوں کے سامنے تھیں۔ بھائی کی صلح اور اس کے نتائج بھی پیش نظر تھے باپ کا مسجد کوفہ میں شہید ہونا اور بھائی کو زہر دیا جانا بھی سامنے کی بات تھی حالات کا رخ دیکھ رہے تھے اور اپنے مجوزہ اقدام کے نتائج سے بھی واقف تھے ان کے لئے یہ بات بالکل ممکن نہ تھی کہ وہ ایسے حاکم جابر کی بیعت کر لیں جس نے اسلام کی سادگی کو قیصر و کسریٰ کی ملوکیت سے بدل دیا تھا جو صداقت کے خلاف ہی نہ تھا بلکہ جو ٹھوس اصولوں کو منہدم کئے اور ان پر تمسخر کرنے کو شعار ملی بنائے تھے اور جس کا یہ عقیدہ تھا کہ بنی ہاشم نے طلب جاہ کے لئے اسلام کا ڈھونگ رچایا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص سے خواہ وہ سلطان وقت ہی کیوں نہ ہو حسینؑ کا کوئی لگاؤ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر حسینؑ بھی جیتے

تھے کہ ان کا قتل آسان نہیں ہے اور جس وقت ان کی نس نس رگ رگ سے خون کا آخری قطرہ بہہ جائے گا تو سلطنتیں متزلزل ہو جائیں گی۔ وہ تمام حالات اور نتائج سے باخبر تھے مگر پھر بھی ان کے سامنے صرف قتل و بیعت کا مسئلہ نہ تھا۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ وفات رسولؐ کے بعد سے حالات کہاں سے کہاں تک بد سے بدتر ہو چکے ہیں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جیت پسندانہ ذہنیت آدمیوں کو ذلت کی کتنی گہرائیوں تک پہونچا سکتی ہے وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ مخالف عناصر کی سرگرمیاں کن کن حدود تک جا سکتی ہیں اور جو ابتدا ان کے سامنے تھی اس کی انتہا کہاں ہوگی۔

اس عاقبت بینی کے ماتحت اس مقصد کو بچا لانے کے لئے جو حسینؑ کو جان سے زیادہ عزیز تھا انھیں کچھ ایسی جد و جہد کرنا تھی جو صرف اسی زمانے کے لئے عدیم المثال نہ ہو بلکہ اس تمام آنے والے زمانہ میں بھی قابل قدر سے جبکہ اسلام کے نام سے ملک گیری ہوگی اور بنی نوع انسان کا خون نفس پرستی کی خاطر ارزاں کر دیا جائے گا۔ ان کا مقصد اپنے اصولوں کو بچانا اور محفوظ رکھنا تھا اور یہ مقصد ان کی نظر عاقبت بین میں انھیں کے وقت و زمانہ تک محدود نہ تھا وہ وقت اور زمانہ کی محدودیت سے بالا ہو کر مقصد کی عظمت کو ابد الآباد تک محفوظ رکھنے کی جد و جہد میں تھے۔

اپنے تمام مطالعات و تجربات کی روشنی میں پوری دقیقہ سنجی اور کافی غور و خوض کے بعد ایک عالی دماغ، بلند حوصلہ اور با اصول انسان کو اپنے لئے راہ عمل تیار کرنا تھی جو کی گئی جتنا مقصد بلند تھا اسی طرح یہ لائحہ عمل بھی اپنی آپ مثل و بے نظیر تھا۔ حسینؑ نے اپنا پروگرام کب سوچا کب مرتب کیا یہ سب کچھ بتانا ناممکن ہے لیکن ہر چھوٹے سے چھوٹا اقدام بھی اپنی جگہ پر ایک باضابطہ اور مکمل اسکیم کا ایک معقول و ضروری جز تھا۔ کس تعجیل کے عالم میں مدینہ چھوڑا حج کو عمرہ سے یکایک تبدیل کر دیا۔ اس اصول کے ماتحت کہ جب مطلوب عظیم ہوتا ہے تو ساتھی کم ہو جاتے ہیں تمام منازل سفر میں ساتھی کم کرتے گئے بجز ان لوگوں کے جو مقصد کے لئے مطلوب تھے۔ کربلا پہونچ کر بغیر اصول کو ٹھیس لگائے صلح کی کوشش کی اور مسلسل گفت و شنید جاری رکھی بے پناہ لڑائی کے دوران میں بھی مرنے کا یقین ہونے کے باوجود آخر وقت تک اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے رہے اور اس سب کے علاوہ کوئی منزل ابتلا باقی نہ رہی جو انسان کو درپیش ہو سکتی اور جس میں سے حسینؑ کے قدم بغیر لغزش کے گزر نہ گئے ہوں۔ یہ تمام کی تمام وہ چیزیں ہیں جن پر دماغ مبہوت ہو جاتے ہیں اور بڑے سے بڑے مفکر و مدبر انگشت بدندان حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

بہرحال وہ ایک شبانہ روز سے بھی کم کا دفقہ گزر گیا اور تمام دنیاوی صعوبتیں ختم ہو گئیں بچوں کی ہلاکت، اقربا و اعزا کا آنکھوں کے سامنے قتل، خیام میں کہرام اٹھنے والے حالات کی اطلاع اور بالآخر موج خون کا سر سے گزرنا سب کچھ ہو گیا۔ مگر مقصد اور حصول مقصد کا کام رکنے نہ پایا۔ حسینؑ مٹ گئے مگر کیا کیا چھوڑ گئے اس کی فہرست تیار کرنے کو دفتر کے دفتر درکار ہیں وہ نہ رہے۔ مگر آج بھی کربلا کا ذرہ ذرہ دنیا کو "درس انسانیت" دے رہا ہے اور آج بھی جو ہوا نینوا کے بیابانوں سے آتی ہے اس میں
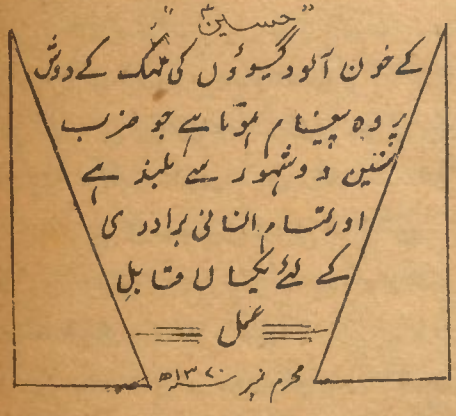
عزاداری امام مظلومؑ

کی

بلاوجہ مخالفت

مولانا سید عدیل اختر صاحب قبلہ ممتاز الافاضل مبلغ مدرسۃ الواعظین (مرحوم)

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

مظلوم سے ہمدردی اور ظالم سے تنفر نہ صرف شرافت انسانی کی دلیل ہے بلکہ انسانیت کے ساتھ وابستہ بلکہ فطرت کا مقتضا ہے لیکن نواسۂ رسولؐ جن کی مظلومیت کی گواہی مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی دیتے ہیں۔ غیر مسلم تو ایک طرف خود وہ یزیدی گروہ جو آپ پر تیروں کا مینہ اور تیغوں کے کھیل برسا رہا تھا آپ کے حق میں شہادت فضل دیا ہے۔ لیکن دعوٰی دوستی وادعائے محبت اہلبیتؑ کے ساتھ اگر مدعیان اسلام حسینؑ کی شہادت پر ملائے سرفندویں تو کس قدر حیرت انگیز بلکہ عبرت خیز ہے،

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد فرائض

حسین علیہ السلام کی محبت بحکم المودۃ فی القربیٰ فرض ہونے کے علاوہ من احب الحسن والحسین فقد احبنی ومن ابغضہما فقد ابغضنی (رسول اللہ نے فرمایا کہ جس نے حسنؑ وحسینؑ سے دوستی کی اس نے مجھ سے محبت کی جس نے ان دونوں سے بغض کیا اس نے مجھ سے بغض کیا) حکم رسولؐ کے موافق ہے ایمان ہے آپ سے عدم محبت کفر۔ پھر اس پہ آپ کا صحابی ہونا اور بھی طرہ ہے لیکن بایں ہمہ جب آپ کے شہید ہونے پہ کوئی اظہار غم وغصہ کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ مسلمان ہم آواز ہوتے کبھی کوئی بدعت کہہ کے کھڑا ہوتا ہے، کوئی نصیحت کا علمبردار بنتا ہے، کوئی مسرت کا اظہار کرتا ہے، کوئی عید منانے کی تدبیر بتاتا ہے، کوئی غیر مسلم ایسا کہتا تو اتنا بےجا نہ ہوتا جتنا کسی مسلمان کا یہ کہنا۔ الحمدللہ کہ ہم بعد شہادت حسینؑ اس وقت سے آجتک اور آج سے انشاءاللہ تا بہ قیامت حسینؑ کی مظلومی پر روتے رہے اور روئیں گے اور ان آنسوؤں کو موتیوں سے بہتر سمجھیں اور کہیں گے

یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ محبت کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ محبوب کی خوشی میں خوشی اور محبوب کے غم میں غم کرنا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ادھر تو خاندان رسالت تباہ کی گئی اور ادھر عالم میں تاریکی چھا گئی۔ انکسفت الشمس حتی بدت الکواکب نصف النہار، ادھر اس آسمان امامت کا عرش سرنگوں ہوا ادھر ان السماء بکت کا ظہور ہوا کبھی خون کے آنسو بہائے کبھی خاک اڑائی۔ اسی طرح جمادات نے ایسا اثر لیا کہ زمین کانپ اٹھی پتھر بھی پسیج گئے۔ یہاں تک کہ شام ومدینہ تک کے پتھر خون کے آنسو روئے۔ غرض کائنات نے جس سے جیسا ممکن تھا اس نے اس کی بڑھ کر اظہار غم کیا اور یہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر ان انسانوں سے کوئی کیا کہے جو پتھر سے بھی زیادہ سخت دل اپنے پہلو میں رکھتے

ہوں۔ کس قدر عبرت و حیرت سے آپ ذیل کی عبارت پڑھیں گے یعنی جو عاشورا کو غسل کرے تو سوائے مرض الموت کے کبھی بیمار نہ ہوگا۔ جو روز عاشورا سرمہ کشی کرے سال بھر اسکی آنکھیں نہ دکھیں گی۔ جو شخص روز عاشورا عیال پر توسیع کرے سال بھر خدا اس کی روزی میں وسعت دیتا ہے۔ جو شخص عاشورا کے روز روزہ رکھے تو سال بھر کے قضا روزے ادا ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں کے بعد بھی مظلوم حسینؑ سے ہمدردی اور محبت کا ادعا بیجا ہے یا نہیں ناظرین کے انصاف پر چھوڑتا ہوں۔ اس کتاب کی عبارت ذیل بھی بطور عبرت نقل ہے یوم عاشورا کو یوم مصیبت قرار دینے سے کہیں زیادہ اولیٰ یہ ہے کہ اس کو یوم فرح و سرور قرار دیا جائے۔

حسین علیہ السلام پر رونا بدعت ہے یا نہ رونا

محبت کے لباس میں بھی ہمارے ناصح اہل اسلام ہمیں بدعت سے بچانے کی کوشش کی صورت اختیار فرماتے ہیں لیکن کاش بدعت کے معنی پر غور کیا ہوتا کاش اپنے لکھے کو نہ بھولتے۔ اگر بدعت کی قسمیں اور تعریف یہی ہے جو مشکوٰۃ کے باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص۲۷ مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی ۱۳۲۵ھ کے حاشیہ پر اس طرح مرقوم ہے

البدعۃ اما واجبۃ واما محرمۃ واما مندوبۃ واما مکروھۃ واما مباحۃ[۳]

تو سب سے پہلے یہی دیکھنا چاہئے کہ حسینؑ پر رونا کہیں بدعت واجبہ نہ نکل آئے پھر اعتراض ہی کیا رہا۔

بدعت کی تعریف اور حسینؑ پر رونا

اس موقع پر بدعت کی تعریف بھی قابل لحاظ ہے۔

قال النووی بدعۃ شئ عمل علی غیر مثال سبق وفی الشرع احداث مالم یکن فی عہد رسول اللہ صلعم[۴]

(نووی نے کہا ہے کہ بدعت اس چیز کو کہتے ہیں جو اس طرح بنائی گئی ہو جس کی مثال پہلے نہ گذری ہو۔ اور شرع میں بدعت کے معنی یہ ہیں۔ وہ بات کرنی جو عہد رسول اللہ میں نہ ہو۔

اب کیا تامل ہے کہ میں کہوں کہ حسینؑ پر نہ رونا بدعت ہے اس لئے کہ حسینؑ پر رونا عہد رسولؐ میں تو درکنار سنت جاریہ انبیاء اللہ سنت انبیائے سابقین اور سنت ختم النبیینؐ اور صحابہ و تابعین ہے پس حسینؑ پر نہ رونا بدعت ہے۔

اس لئے کہ رسول صلعم حسینؑ پر روتے۔ وقت ولادت بعد ولادت، بعد شہادت اسی طرح علی ابن ابی طالب حسینؑ پر روئے۔ ام سلمہؓ روئیں، ابن عباس روئے، زمین روئی آسمان رویا، آفتاب رویا اس کے علاوہ بکثرت تابعین اور تبع تابعین، ملائکہ سموات و ارضین، حتیٰ کہ انسانوں کے علاوہ جنات تک نے نوحہ کیا۔ بلکہ ایک گروہ عظیم ملائکہ تو قیامت تک کے لئے اسی کام پر مامور ہے ملاحظہ ہو اسی روز شہادت امام حسینؑ ستر ہزار فرشتے نازل کئے گئے تاکہ قیامت تک حسینؑ پر گریہ و بکا کرتے رہیں

تعزیہ و علم و تابوت و ذوالجناح

جب رونے کا جواز بلکہ ثواب ملتا ہے تو ہمارے ہمدرد ارباب معروف کی دوسری صورت اختیار کرتے ہیں حالانکہ غیر جاندار کی تصویر کشی تک جائز ہے تعزیہ جو لکڑی کا چھوٹا مکان ہے۔ نہ جانے کس اصول پر ناجائز ہے حالانکہ لکڑی کے مکانات آج بھی بکثرت بنائے جاتے ہیں۔ علم میں کوئی ایسی شے نہیں جو عدم جواز کا سبب ہو بانس کا بنایا ہوا، کپڑا لپٹا ہوا، اگر ناجائز ہوتا یا براہ راست علم ناجائز ہوتا تو آنحضرت صلعم کی تمام جنگوں میں علم اور علمبردار کا سب حرام اور بدعت کہلانے کی مستحق تھی۔ ذوالجناح گھوڑا ہے۔ مخلوق خدا ہے۔ صرف اس کو جھول یا قیمتی

---

[۱] غنیہ مذکور ص۲۷۵ [۲] غنیہ مذکورہ ص۲۰۳ [۳] حاشیہ مذکورہ ص۲۷ مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۹۲۵ء [۴] مجمع المطالب ... ص۶۰ [۵] ... مذکور ص۱۱۵

زیورات سے آراستہ کرنے کا نام کس شریعت نے ناجائز رکھا ہے صاحبان بصیرت اس سے مطلع نہیں۔ تابوت میں کسی چیز کے ناجائز ہونے کا ثبوت ہونے کے بجائے عام طور سے جنازوں کے لیجانے کا ایسا دستور جیسا کہ بعض مقامات ہند میں موجود ہے ثابت کرتا ہے کہ یہ امر یقیناً ناقابل اعتراض ہے۔ غرض یہ ہے کہ مذکورہ بالا شبیہوں کو بدعت کہنا تو انوکھی منطق ہے۔ اس سے زیادہ قابل مضحکہ ان لوگوں کی عقلیں ہیں جو اسے بت پرستی کے نام سے موسوم کرتے وقت شرماتے بھی نہیں، کہ آخر لفظ بت اور لفظ پرستش کے کوئی معنے ہیں یا نہیں۔ اگر وقعتاً ان دونوں لفظوں کے کوئی لغوی، شرعی، عرفی معنی ہیں تو کیوں کر مذکورہ بالا اشیاء پر لفظ بت صادق ہو سکتی ہے یا کیونکر ہمارے متعلق یہ وہم ہو سکتا ہے کہ ہم ان کی پرستش کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم اس روضہ یا علم کو بھی معبود اور قابل پرستش نہیں جانتے جن کی یہ شبیہیں ہیں بلکہ ہم رسول و ائمہ وانبیائے طاہرین علیہم السلام کی پرستش کو بھی حرام و ناجائز جانتے ہیں۔ حسینؑ تو کیا ان کے جد بزرگوار سرور کائنات صلعم کو بھی ہم لائق پرستش نہیں جانتے۔ پھر ان چیزوں کی پرستش کا اتہام کیسے معنی ہے؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ بعد خدا وند عالم ہم تمام کائنات سے زیادہ واجب التعظیم اور مفروض الطاعۃ و الاحترام سرور کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کو مانتے ہیں اور آپ کے بعد آپ کی ذریت و عترت طاہرہؑ کو پھر اسی سلسلہ میں یہ بھی قابل فراموشی ہے کہ جو اشیاء ان حضرات کی طرف منسوب ہیں وہ بھی اپنی حیثیت سے قابل احترام ہیں۔ جس طرح قرآن کی طرف نسبت ہے اس کی جلد، خدا کی طرف نسبت سے جملہ شعائر اللہ جیسی کہ قربانی کا اونٹ اور اس کے گلے کا ہار، رسولؐ کی طرف منسوب ہونے سے آپ کی نعلین، آپ کی نعلین طرف منسوب ہونے سے [illegible] نہیں۔

حسینؑ نے ہمارے لئے کیا کیا اور ہم ان کے لئے کیا کریں

آخر میں مجھے امام حسین علیہ السلام کے احسانات کی مجمل فہرست بتانی ہے جس کی تفصیلات کے لئے متعدد علوم کی ضخیم کتابیں درکار ہیں۔ امام حسین علیہ السلام نے ہم کو مذہبی، اخلاقی، اسلامی درس عملی کے علاوہ بہت کچھ جائز اور مستحسن سیاسی سبق بھی دئے ہیں جس کے لئے ہم کو چاہیے کہ ان کی مذہبی، اخلاقی، اسلامی اور سیاسی یادگاریں قائم کریں جیسا کہ ہر مذہب و ملت کا ہر قوم و قبیلہ کا دستور اور فرض ہے۔

حسینؑ نے اسلام کو بچایا اور کفر کو مٹایا

سر داد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

اس لئے بہ حیثیت ایک مسلمان کے ہمیں حسینؑ کو کچھ بدلہ دینا چاہیے اور اگر ہم انسان ہیں اور صاحب عقل۔ تو دیکھنا چاہئے کہ خود سرور کائنات نے آپ کی اس خدمت گذاری کے لئے کو و انا من الحسینؑ کا تمغہ ہمیشگی عطا فرما دیا ہے۔

حسینؑ نے ایمان کو بچایا کیونکہ ان اصول چار گانہ کو بیک وقت شکست دی جن سے بعد رسول صلعم نیابت رسولؐ کا فیصلہ کرنے کی طبیعت ثانیہ مدعیان اسلام کو ہو چکی تھی اور بتلا دیا کہ اگر اجماع، اختلاف، شوریٰ و فرد استیلاد سب مجتمع ہو کر غیر معصوم کو ہادی مطلق بنا دیں تب بھی فرزندان توحید و متبعان نبوت ان کی کوئی ہستی نہ سمجھیں کیونکہ [illegible] اہلبیت احری و افی البیت کے اصول پہ ہم رسولؐ کے دین سے بہت زیادہ مطلع ہونے کے علاوہ آیت قرآنی کے واجب المودۃ اور [illegible] اتباع اہل الجنۃ بشریا طیبۃ ہو کر پھر بھی یزید کی بیعت کو حرام سمجھتا ہوں آپ چار شرطیں بیک وقت دوسروں سے بہت زیادہ کامل حیثیت میں موجود ہیں جن کا یہ ہے کہ انہیں کی کوئی ایک شرط اور اس مقصد کے لئے حسینؑ نے جان و مال و اولاد کی شہادت اور اہلبیت کی اسیری تک قبول کر لی اس کے بدلے کیا اگر ہم حسینؑ کے نام پہ

سب کچھ لٹا دیں تب بھی حق ادا نہ ہوگا۔ کیونکہ ہماری یہ چیزیں حسینؑ کی قربانیوں میں سے کسی کے مقابلہ میں نہیں رہیں گی۔ مظلوم ان کے جد، ان کی مادر محترمہ سے کچھ نہیں مانگتیں صرف ان کے غم میں غمگین ہوتا ہے

فردِ شفاعت وصلۂ رہبر بخونہا
ہیچ از کسے نخواستہ الا گریستن

امام حسین علیہ السلام کے جد اور مادر محترمہ والد بزرگوار اور برادر محترم ہمارے شفیع ہوں گے صرف اس لئے کہ ہم ان کے غم میں آنسو بہائیں اور ان کی مجلس عزا بتاسی رسول خدا برپا کریں۔

امام حسین علیہ السلام نے مدینہ سے مکہ سے سفر میں باوجود لوگوں کے مشورہ دینے اور ابن زبیر کی مثال پیش نظر ہونے کے پھر راہ مخفی اختیار نہ فرمائی جس میں اخلاقی سبق جرأت و ہمت و استقلال کے علاوہ یہ جائز اور صحیح سیاست بھی تھی کہ عام راستہ پر عام آمد و رفت کے سبب عام لوگوں پر اعلان و اطلاع عام ہو جائے گی کہ ظالم و جابر بادشاہ وقت کے ظلم سے مظلوم و عادل گروہ اپنا وطن چھوڑ کر جلا وطنی اختیار کر رہا ہے جس سے صحیح طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عملی سبق بھی دنیا کو دینا منظور تھا اور یہ بھی کہ آئندہ تا قیامت اگر یہ اعتراض کریں کہ حسینؑ کو ہوس سلطنت تھی تو اس کا جواب بھی ہو جائے گا کہ اگر یہ مطلب ہوتا تو ابن زبیر کی سی تدبیر اختیار فرماتے راہ میں بھی اور ولید سے گفتگو میں بھی جہاں ابن زبیر کا مخفی ہو جانا اور امام علیہ السلام کا یہ فرمانا سوچ رہے ہیں کہ غور کر لیں اور ہم بھی غور کریں گے کہ ہم احق بالخلافۃ ہیں یا یزید۔ اس لئے حسین علیہ السلام کی یادگار کو باقی رکھ کر ہم تعلیم اخلاقی اور سیاسی کا سبق کو دہراتے ہیں اور یہ ہمارا فرض عقلی ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے حرمت کعبہ کو محفوظ رکھا قال الحسین لابن الزبیر واللہ لان اقتل خارجا منھا بشبر احب الی من ان اقتل داخلا منھا بشبر ولئن اذا لو کنت فی جحر ھامۃ من ھذہ الھوام لاستخرجونی حتی یقضوا فی حاجتھم امام حسینؑ نے ابن زبیر سے فرمایا کہ واللہ اگر میں مکہ سے ایک بالشت باہر قتل کیا جاؤں یہ میرے نزدیک اس سے بہت زیادہ محبوب ہے کہ ایک بالشت مکہ کے اندر میرا خون بہایا جائے بخدا اگر میں حشرات الارض میں سے کسی کے سوراخ میں بھی جا چھپوں تو مجھے یہ لوگ وہاں جا کر قتل کریں گے۔ اس میں تمام اہل قبلہ کی ہدایت تھی کہ احترام کعبہ حرم کس قدر مہتم بالشان چیز ہے۔ اور جس حرم کو حرم امن قرار دیا گیا ہے اس کی عظمت فرزند رسولؐ کے دل میں اتنی ہے کہ وہاں رہ کر اگرچہ مقتول ہی ہونا تھا مگر پسند نہ فرمایا چاہا کہ وہاں کا احترام قائم رہے ظالم ان کو برباد کر نا گزیر اجرم ہوگا اس لئے جو کوئی کعبۂ حرم کی بربادی احترام کا باعث ہو اس کو چاہیے کہ اسے اچھی نگاہ سے نہ دیکھیں اور تمام اہل قبلہ پر ایک آئینہ بینا بنا ہے کہ اس کے لئے کتنا ہی زیادہ احترام ضروری ہے مجملہ ان کے کفار کا تسلط بھی ہے جس سے کعبہ و حرم کی توہین ہوتی ہے گویا حسینؑ کا یہ فعل اخرجوا الیھود و النصاریٰ من جزیرۃ العرب کی تفسیر و تائید تھا۔

حسین علیہ السلام کا آخر وقت اپنے قتل سے لوگوں کو باز رکھنے کی تاکید جو اپنی زندگی کی حفاظت میں نہ تھی کیونکہ بعد علی اکبرؑ علی الدنیا بعدک العفاء فرما چکے تھے بلکہ صرف امرا و نوجوں کا احترام اور رحمۃ للعالمین کے جگر بند ہونے کے سبب خود رحمت ہونے کے سبب امت رسول کے ہونے کے مدعیوں پر اتمام حجت تا کہ اب بھی کوئی جہنم سے بچ جائے۔ اس میں بھی وقت اضطرار اپنے فرائض سے غفلت نہ برتنے کی تعلیم بھی تھی۔ ان احسانات کے عوض ہمیں صرف یہ کہا جاتا ہے کہ تم ہمیں یاد کر کے غمگین ہو جس سے مطلب یہ ہے کہ تم ان اخلاق حسنہ کو یاد کرو۔ اس کے مسلم اور عامل ہو جاؤ۔

(دیوان بہادر پلایس ساردا بی۔اے، آر۔ ایس۔ ایل کے قلم سے)

بہادری زندگی کو علو بخشتی ہے۔ اگر ان بہادروں نے جو ہر ملک اور ہر زمانے میں نام آور ہوئے انسانی سوسائٹی کی اپنے اعمال سے قدر و قیمت نہ بڑھائی ہوتی تو دنیا زندگی بسر کرنے کے لئے ایک نہایت بے حقیقت جگہ ہوتی۔ ان کی زندگی اور ان کے اعمال نسل انسانی کی ہدایت کا ایک دائمی ذریعہ ہیں اور گذری ہوئی نسلوں کے ان بہادروں کے سوانح حیات کے مطالعہ یا ان کے حالات سننے سے مرد اور عورتیں اپنی زندگی میں اور تسکین حاصل کرتی ہیں۔ ان بہادروں نے کرۂ ارض کے ہر حصہ میں اپنے کارناموں سے زندگی کی قدر و قیمت کو بڑھا دیا اور یہ سکھا دیا کہ فرض کی راہ میں مردوں اور عورتوں کو کس طرح مضبوطی سے اپنے قدم جمائے رکھنا چاہیئے۔ بہادر مر جاتے ہیں۔ لیکن ان بہادروں کے کارنامے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہمیشہ کے لئے زندہ رہتے ہیں جب کوئی شخص نظم میں یا نثر میں ان بہادروں کے شجاعانہ کارنامے سنتا ہے تو جوش سے اس کا سر اٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنے کو ایک راحت بخش فضا میں پاتا ہے۔ اور رنج و مصائب اور اس تکلف وہ ماحول کو بھول جاتا ہے جو دنیا کی سرعت کے ساتھ میکانک کے محتاج ہوتے جانے کی وجہ سے زندگی کو روز بروز مصائب و آلام کی کشاکش میں مبتلا کئے ہوئے ہے

ہر ملک کے بے شمار مردوں اور عورتوں میں خاموشی کے ساتھ اپنے ہیرو کی عظیم الشان کارناموں کی سماعت ان کے کیریکٹر پر ایک بہت اچھا اثر ڈالتی ہے اور خاموشی کے ساتھ انسانی سینوں میں شریفانہ خیالات اور جذبات کے متحرک کرنے کا سبب ہوتی ہے اور اس کا طبائع پر لازمی طور سے خاص اثر پڑتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ اسلام کے مشاہیر کی صف میں ایک بلند مرتبت ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں۔

آپ نے جو بلند اور اعلیٰ قربانی پیش کی اور جس شریفانہ اسپرٹ میں صداقت و عزت کے لئے اپنی جان دی وہ اس کی روشن مثالیں ہیں کہ ایک انسان جس کے دل میں اعلیٰ ترین جذبات خدمت نوع انسانی متحرک ہوں کیا کر سکتا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیئے۔

امام حسینؑ کی زندگی ایشیا اور افریقہ کے کروڑوں مسلمانوں کی زندگی اور کیرکٹر کو صحیح راستہ پر لا رہی ہے اور انھیں یہ بتا رہی ہے کہ زندگی کے ان شدائد و مصائب کو جن سے مردوں کو اور عورتوں کو آئے دن دو چار ہونا پڑتا ہے اور جنھیں جدید تہذیب کی بدولت روز بروز اضافہ ہی ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے کس طرح مقابلہ کرنا چاہیئے۔

بہادر اڑیسہ پراونشیل شیعہ کانفرنس نے رسالہ گولڈن ڈیڈلس آف حسینؑ" شائع کر کے ایک بہت بڑی پبلک خدمت انجام دی ہے اور اس کے اس ارادے پر کہ وہ امام حسینؑ کے حالات کے متعلق ایک دوسرا مبسوط رسالہ نکالنا چاہتی ہے میں اسے مبارکباد دیتا ہوں۔

امام حسینؑ کے شجاعانہ کارناموں کے متعلق دنیا کو جتنی زیادہ معلومات حاصل ہوتی جائیں گی۔ اور ان کے حالات کو جتنا زیادہ مشتہر کیا جائے گا وہ ہم سب لوگوں کے لئے بہت

ہی مفید ہو گا۔

اس لئے کہ اس سے نہ صرف اسلام کی عظیم الشان ہستی کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی بلکہ امام حسینؑ کی زندگی سے ہم سبق حاصل کر سکیں گے۔ کہ دنیا کے ہر گوشہ اور ہر موسم رکھنے والے ملک میں ہم اپنی زندگی کے معیار کو کیونکر بلند کر سکتے ہیں۔ (حسین دی مارٹر)

(محرم نمبر ۱۳۵۲ھ)
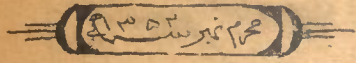
مقدس حسینؑ

بابو کالی پد ابنرجی پنّا ناتھ رائے اسکوائر

انسانی تاریخ میں یہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ شیطانی اور خدائی طاقتوں میں برابر تصادم ہوتا رہا ہے جب انسان کا شیطانی رجحان انصاف و صداقت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے تو کوئی نہ کوئی عظیم ہستی جو ہم ایسے معمولی انسانوں سے کہیں بلند تھی ظاہر ہوتی رہی ہے۔ معمولی انسان ان کی مثالوں سے ہدایت پاتے ہیں اور ان میں ان کے اعمال کی پیروی کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس انقلاب سے حیوانی طاقت مغلوب ہوتی ہے اور دنیا میں خدائی بادشاہت قائم ہوتی ہے خدا کی طرف سے بہت سے بار ایسے فوق البشر انسان دنیا میں بھیج گئے ہیں۔

گیتا میں کرشن نے کہا ہے کہ میں مختلف زمانے میں دنیا میں مذہب کی بنیاد کو مضبوط کرنے کے لئے ظاہر ہوتا رہتا ہوں۔ ... ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں جبکہ یزید فرمانروائے دمشق کی سرکردگی میں عوام کے ایک گروہ نے اسلام مقدس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو متقی و پرہیزگار حسینؑ نے مذہب اور صداقت کی حمایت میں کربلا کے میدان میں شجاعت و بہادری کے ساتھ اپنی جان کی قربانی پیش کر دی۔

مادی طور پر یزید کو فتح حاصل ہوئی لیکن روحانی حیثیت سے اس کی یہ فتح اس کی شکست ثابت ہوئی۔ وہ اسلام کی جو صورت دینا چاہتا تھا۔ اور باطل کی جس بنیاد پر اسلام کو قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ صورت و بنیاد بہت جلد معدوم ہو گئی۔

حسینؑ کی شہادت کا نتیجہ فتح و کامرانی کی صورت میں نکلا اور اسلام یعنی سچے اور حقیقی اسلام نے از سر نو نشو و نما حاصل کی۔

مافوق البشر ہستیوں کا یہ مذہبی فریضہ رہا ہے کہ وہ عوام کی دماغی تربیت و تعلیم کا سامان بہم پہونچائیں وہ اس راہ میں دنیا کے رنج و مصائب کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔ کرشن نے ایک شکاری کے ہاتھوں اپنی جان گنوائی مسیح کی زندگی کا خاتمہ بھی افسوسناک طریقہ پر ہوا۔ لیکن مذہب کے متعلق انھوں نے جو شاہراہ دکھائی وہ اب تک انسانوں کو منفعت پہونچا رہی ہے

مقدس حسینؑ کی الم انگیز قربانی نے ضلالت کی تاریکی کا خاتمہ کر دیا اور ایک نئی روشنی پھیلا دی۔ وہ قربانی آج تک ہزاروں مسلم اور غیر مسلم میں اس جذبہ کو متحرک کر رہی ہے۔ کہ فرائض کے ادا کرنے میں جان کے جانے اور موت کے آنے کی پروا نہیں کرنی چاہیے لہذا آج جبکہ

قومیت کی روح بیدار ہو رہی ہے، ہم کو دعا کرنی چاہیے کہ خدا مقدس حسینؑ کی روح کو عظمت و برتری نصیب کرے ——— (حسینؑ دی مارٹر)

محرم نمبر ۱۳۵۲ھ

فاتح کربلا

جناب سید محمد تقی صاحب وکیل ممبر سرفراز ہیجنگ بورڈ (الہ آباد)

دنیا نے اپنی طویل مدت حیات میں ہزاروں میدان جنگ ہزاروں نبرد آزما ہزاروں فاتح پیش کیے لیکن کربلا ایسا میدان جنگ کربلا کے میدان میں ایسے لڑنے والے سپاہی، حسینؑ ابن علیؑ ایسا فاتح آج تک دنیا پیش نہیں کر سکی ہے۔

کربلا کے میدان جنگ کی خصوصیات اس لئے نہیں ہیں کہ طرفین کی جانب سے کوئی بے پناہ ٹڈی دل فوجیں برسرپیکار تھیں یا پیشہ ور سپاہیوں نے اپنے فنی کمال کا مظاہرہ کیا۔ دنیا کی اور جتنی جنگیں ہوئی ہیں ان سے اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ دنیا کی اور جنگوں کے معیار پر اس کو پرکھنا ایک بہت بڑی بنیادی اور اصولی غلطی ہے اس جنگ میں جو نقشے ت درپیش تھیں ان سے گریز ہے۔

حسینؑ ابن علیؑ اس فقید النظیر جنگ اس عدیم المثال میدان جنگ کے فاتح اس لئے نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی بہت بڑی فوج تھی۔ جنگ کے اعلیٰ حربوں سے انھوں نے نبرد آزمائی کی یا اپنے غنیم کو تہ تیغ کر کے ارض کربلا کو انسانی خون سے لالہ زار بنا کر حصول مدعا کیا۔ اس کے برعکس جنگ کے جو مروجہ معیار تھے اور ہیں، جو مقررہ اصول تھے اور ہیں ان سب سے قطع نظر کر کے، ان سب کو ٹھکرا کے، ان سب سے متضاد راہ اختیار کر کے حسینؑ ابن علیؑ نے یہ جنگ لڑی اور اس عنوان سے اس کو فتح کیا جو آج تک کسی نے نہیں کیا۔

اس کے پہلے اور بعد کی جنگیں صرف زیب قرطاس ہیں لیکن اس عالم کی فضا کے لیے میں جہاں جہاں انسان سانس لیتا ہے جو اصول حسینؑ ابن علیؑ کے اس جنگ میں تھے وہ اس کی حیات کے ہر شعبہ میں تار و پود کی طرح داخل و شامل ہیں۔ اس جنگ کی عظمت یہ ہے کہ اس نے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کو متاثر کیا ہے اور کرتی چلی جا رہی ہے اور جب تک کہ آفتاب و مہتاب رونق افزائے عالم ہیں کرتی چلی جائے گی۔

حسینؑ نے اس جنگ کو فتح کیا لیکن قاتل بن کر نہیں مقتول بن کر، ظالم بن کر نہیں مظلوم بن کر۔ غارت گری اور تباہ کاری کر کے نہیں خود مٹ کر اور تباہ ہو کر۔ لیکن اللہ رے انداز مقتولی و مظلومی و تباہی کہ حسینؑ ابن علیؑ کے قاتل ان کے غارت گر اور تباہ کار ان پر ظلم و ستم ڈھانے والے خود لٹ گئے اور شکست خوردہ رہے اور حسینؑ فاتح۔ حسینؑ اپنے سب علائق دنیا کو بھی کھو کر اس شان سے

نکلے کہ دنیا میں آج تک ان کی کوئی ہمسری نہ کر سکا۔

انھوں نے اور ان کے رفقا نے کارزار جنگ کی جو یادگار زمانہ ہے انھوں نے شجاعت دکھلائی جو آپ اپنی مثال ہے لیکن یہ سب مدافعانہ تھا جارحانہ نہ تھا۔ انھوں نے روح فرسا واقعات میں، زہرہ گداز حادثات میں، انتہائی بے بسی کے بھیانک پیش منظر، غنیم کی دہشت زائی اور بہت سختی کی ساری کارروائیوں کے باوجود ہر قدم جما ہوا رکھا۔ ان کا ہر قول و فعل پورے طریقہ سے سوچا ہوا اور سمجھا بوجھا تھا۔ سکون و اطمینان کا وہ عالم تھا کہ گویا کوئی امر قطعاً خلاف معمول نہیں ہے دشمن کی موجوں کے پرے کے پرے چلے آرہے ہیں تو کوئی فکر نہیں آب و دانہ بند ہو گیا ہے تو کوئی پرواہ نہیں۔ ہمت اتنی ہی جوان، عزم اتنا ہی مستقل۔

معاویہ کا جبری شخصی حکومت کا دور جو خلافت کے نام سے موسوم تھا ختم ہوا اور یزید اس کا پسر تخت حکومت و خلافت پر جلوہ افروز ہوا۔ معاویہ کی حیات ہی میں پورے طریقہ سے کوشاں تھا کہ اس کے بعد یزید ہی اس کا جانشین ہو اور اس کی کوششیں بار آور ہو گئیں اب یہ ایسا دور آگیا تھا اگرچہ ابھی آغوش لحد میں رسول اسلامؐ کا کفن بھی پورے طور سے میلا نہ ہوا تھا کہ اس خطۂ پاک ہی میں جہاں کے زمین و آسمان ہی نے اسلام کی پہلی پکار سنی تھی۔ اسلام کی پوری خلاف ورزی شروع ہو گئی تھی

یزید بن معاویہ جبلۃً لہو ہی پر تُلا پڑا اور حسبہ احکام سے روگرداں تھا۔ اس کے نزدیک حق و باطل کا سوال بھی پیدا ہی نہ تھا شعائر اسلام کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ دنیا میں خدا کا آخری پیغام گویا اپنے پیغمبرؐ کی سرزمین میں فنا ہو گیا تھا۔

دنیا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی لیکن خاموش تھی وحشت اور سیم و زر نے لوگوں کے منہ بند کر دئیے تھے۔ دنیا کا ضمیر بالکل بے جان ہو گیا تھا۔ احساس قطعاً مردہ ہو گیا تھا۔

خلافت ظاہری پر متمکن نہ سہی لیکن فرزند رسولؐ کی حیثیت سے خلافت رسولؐ کے واقعی حقدار کے طور پر حسینؑ نے یہ سب باتیں دیکھیں۔ اسلام کے چند سرفروش اب بھی باقی تھے اور سب کی نگاہیں حسینؑ کی طرف تھیں معاویہ بھی حسینؑ کو مطمئن نہ تھا، اور یزید نے جس طرف سب سے پہلے اپنی نظر کیا وہ ذات والا حسینؑ ہی تھے اور دنیا خوب جانتی تھی کہ حسینؑ کی ذات دنیا کی تمام خواہشات سے پاک اور بری ہے لیکن ان کی پاک و مقدس زندگی، ان سے رسولؐ کی قربت و محبت، ایک عالم کا ان پر اعتماد یزید کے دل میں کانٹا تھا۔ جو ہر وقت کھٹکتا رہتا تھا۔

حسینؑ ابن علیؑ نے محسوس کیا کہ اگر دنیا میں حقانیت اور للہیت کو قائم اور باقی رکھنا ہے تو ان غیر معمولی واقعات اور حالات میں کوئی غیر معمولی عمل پیش کرنا چاہیے۔ یزید ابن معاویہ نے سریر آرائے حکومت ہوتے ہی حسین ابن علی سے مطالبہ بیعت کیا۔ حسینؑ اور بیعت یزید۔ گویا یزید کے سامنے غیر اسلامی اعمال اور طریق کار زندگی پر مہر تصدیق لگانی تھی اسلام کے پیغام حق کو سپرد خاک کرنا تھا۔

حسینؑ نے پورے عزم و استقلال سے اس مطالبہ کو حقارت سے ٹھکرا دیا جس کا وہ مستحق تھا خود اپنا لائحہ عمل مرتب کیا۔ یزید نے بھی اپنا لائحہ عمل مرتب کیا اس عزم مستحکم کے ساتھ کہ حسینؑ کی اس جرأت انکار کا پوری قوت سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور اس انداز سے اس جبر و تشدد سے اس ظلم اور ستم کے ساتھ جو یادگار عالم ہو اور دوسروں کے لیے سبق آموز ہو

یزید کے اس عزم میں حسینؑ کی کامیابی کا راز پنہاں تھا

ع　عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

حسینؑ کا لائحہ عمل تھا کہ ظلم کا مقابلہ مظلومیت سے، جبر کا مقابلہ صبر سے، جفا کا شرافت سے اور انسانیت سے، بے دینی کا دین پناہی سے، شر کا خیر سے، ستم کا طاقت برداشت سے کیا جائے۔ اور اس لائحہ عمل پر حسینؑ کے ہر رفیق کار نے بڈھے جوان اور بچے نے، مرد و عورت نے، انسان اور حیوان نے اس استحکام، اس عزم و استقلال، اس شان سے عمل کیا کہ دنیا آج بھی محو حیرت ہے انگشت بدنداں ہے اور ایک انسان آج بھی یہ محسوس کرنے سے قاصر ہے کہ انسانی کردار ان بلند پروازیوں پر بھی عامل ہو سکتا ہے۔

یزید بظاہر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا حسینؑ اور ان
کے رفقا کار، بوڑھوں، جوانوں، بچوں کو اس نے تہ تیغ
کیا انسانی تخیل جن مظالم کو سوچ سکتا تھا ان کو حسینؑ اور ان
کے ساتھیوں پر صرف کر ڈالا۔ معصوم بچوں کا بھی استیصال
کیا۔ شش ماہے بچے کو بھی جان کی امان نہ دی۔ لاشوں کو گھوڑوں
کی ٹاپوں سے پامال کیا۔ خیام آل رسولؐ کو لوٹا اور نذر آتش
کیا۔ مخدرات عصمت کو مقنع و چادر سے محروم کر کے بے کجاوہ
اونٹوں پر دربدر پھرایا۔ غرض کہ ظلم و ستم کے وہ مظاہرے
کئے کہ زمین و آسمان بھی خلاق عالم سے پناہ مانگنے لگے۔

لیکن یزید کا ہر ظلم و ستم حسینؑ کی مقصد براری کر رہا تھا
ان کو منزل فتح و ظفر سے قریب تر بنا رہا تھا۔ جب تک حسینؑ
سانس لیتے رہے اپنی کامیابی پر شاداں رہے اور موت سے
ہم کنار ہونے پر ان کی روح مقدس۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ظلم پر
ہر نئے انداز ستم پر حسینؑ مسکراتے رہے۔ ان کا خندہ پیشانی
سے استقبال کرتے رہے جبین مطہر پر کبھی شکن نہ آئی تکمیل
منزل کے ہر قدم پر حسینؑ درگاہ رب العزت میں شکر ادا کرتے رہے
وہ جوان بیٹے کی موت پر ہو یا شش ماہے کی تیر سہ شعبہ سے ہلاکت
پر ہو۔ یزید نے جو کچھ بھی کیا منزلت پر ہو، اکربلا
کے میدان میں ہو، اسیران کربلا کے سفر میں ہوا یا
دربار کوفہ و شام در دم میں ہو وہ حسینؑ کے مقصد اعلیٰ کی
دراصل تکمیل تھی۔

حسینؑ کی بے پناہ شان مظلومیت، بے نظیر انداز صبر و
رضا جوئی نے وہ کیا جو بڑی سے بڑی فوج مہلک سے مہلک
آلات جنگ، اعلیٰ سے اعلیٰ جنگی سپہ گری نہ کر سکتے تھے جس
نے انسانوں کے سوئے ہوئے ضمیر پر وہ ضرب کاری لگائی کہ
وہ تڑپ کر جاگ اٹھا۔ امتیاز حق و باطل جو مٹ گیا تھا
وہ پھر واپس آیا۔ حق کی حمایت میں جو آواز دب گئی تھی وہ
یکبیک پھر بلند ہو گئی۔ حقانیت اور للہیت کا آفتاب جو
ظلم و ستم کی بدلیوں میں چھپ گیا تھا پھر پورے آب و
تاب سے جلوہ گر ہو گیا۔ مختصر یہ کہ حسینیت پورے طریقے سے
کامیاب و مظفر و منصور ہوئی اور یزیدیت پست و
پسپا۔ حسینؑ کی عظیم المرتبت قربانی سے دنیا اب بھی کسب
ضیاء کر رہی ہے، درس عمل لے رہی ہے۔ حسینؑ نے میدان
کربلا میں وہ ابدی فتح حاصل کی۔ اس سرمدی ظفر سے
ہم کنار ہوئے جس کو لاتعداد انسان ہر انداز سے دہراتے
ہیں۔ اس کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ بلا قید وقت و زمانہ
لیکن ان کو سیری نہیں ہوتی۔

تمام عمر اس لاثانی واقعہ کا ذکر کرنے اور سننے
کے بعد بھی یہ تمنا باقی رہتی ہے کہ کاش اس بے نظیر
فتح و ظفر اس یگانہ قربانی کا ذکر کرتے سننے کے لئے
ہم کچھ اور دن جیتے۔

یزید پر کامیابی کی خوشی کی پہلی جھلک تو ضرور دو
دکھائی پڑی۔ لیکن وہ رنگ رلیوں کے نشہ سے فارغ
بھی نہ ہوا تھا۔ کہ اصل فاتح کربلا کی حقیقی فتح و ظفر نے
اسے آدبوچا اور اس کا تخت سلطنت ہی نہیں بلکہ
حدود مملکت اس زلزلہ کے تھپیڑوں سے پاش پاش ہو
گئے۔

حسینؑ فاتح کربلا کا نام آج بھی حیات انسانی
کی سب سے بڑی کائنات اور روح انسانی کا لازوال
نغمہ ہے۔

محرم نمبر ۱۳۷۷ھ

شری للتا پرشاد صاحب شاد میرٹھی

محرم کا مہینہ ہر سال آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ تعزیے نکلتے ہیں، مرثیے پڑھے جاتے ہیں، مجالس ہوتی ہیں، میلے اور تماشے ہوتے ہیں، ہجوم نظر آتے ہیں، دکانیں سجتی ہیں، بازار لگتے ہیں۔

تعزیہ داری، مرثیہ خوانی، اور انعقاد مجلس تو خیر لازمی اور موثر چیزیں ہیں۔ مگر دوسری سب باتیں ہوتی ہیں وہ عام کی تو کیا خاص کی بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ کون سوچے، کون سمجھے، کسی کو کیا غرض؟

کوئی کھوجی دماغ اتنی ہمت کرتا تو سرسری طور پر اتنا معلوم کر لیتا کہ مسلمانوں میں ایک بزرگ امام حسینؑ آج سے ۱۳ سو برس پیشتر گزرے ہیں۔ انھیں یزید نامی ایک ظالم بادشاہ نے بے گناہ و بے قصور دشمنی سے مار ڈالا تھا۔ اس کی یادگار منائی جاتی ہے بس۔ اس سے آگے تحقیقات بھی ختم اور جاننے والے جوابات بھی ختم۔

اب ناواقف کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ تو بتائیے کہ اتنی صدیاں گزر گئیں۔ مرنے والے رہے نہ مارنے والے۔ پھر اب تک یہ رونا دھونا اور ایامِ غم میں یہ میلا تماشا کیسا؟

یہ سوال اکثر محققوں کے دل و دماغ میں پیدا ہونا ممکنات سے نہیں۔ تعزیہ داری شیعہ بھی کرتے ہیں اور اکثر سنی بھی بلکہ بعض غیر مسلم بھی۔

شربت چڑھانا، سبیلیں لگانا، شرکت مجالس اور زیارت کرنا، یہ عام و اپنی اصول ہیں البتہ اب چند برسوں سے مذہبی مناقشات، مذہبی کشاکشی، فرقہ وارانہ خانہ جنگیوں اور سب سے بڑھ کر ملک کی تقسیم نے ان امور کی طرف سے متعدد لوگوں میں کشیدگی پیدا کر دی ہے۔

یہ سچ ہے کہ مسلمانوں میں ایک کثیر تعداد ایسے افراد کی بھی موجود ہے جو حسینی مشن کے سخت مخالف اور دشمن ہیں اور جی جان سے اسی تگ و دو میں منہمک و کوشاں رہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی معصوم و مظلوم حسینؑ کا نام لیوا ہی نہ رہے اور اس طرح یزید کی کارگزاریوں پر ہمیشہ کے لئے پردہ پڑ جائے۔ تاریخ الخلفاء کے علاوہ مودودی صاحبان اہلسنت کے یہاں یزید کا شمار خلفائے مستند میں ہو ہی گیا ہے۔ مگر اس تمام سرد مہری اور زمانے کی بے خبری یا پبلک کی ناواقفیت کا ذمہ دار میں ان حضرات کو جانتا ہوں جو نعرہ حیدری لگانے والے اور شہادت حسینی کی یادگار منانے والے تو ہیں۔ وہ تعزیہ داری کو ضروری و جائز بھی جانتے ہیں۔ عالم و قابل و ذی فہم بھی ہیں مگر اس جانب سے قطعی بے توجہ و بے نیاز ہیں۔ کہ ناواقف عوام کو اس سانحۂ عظمیٰ اور سبق آموز واقعۂ شہادت کے تفصیلی حالات سے باخبر بنائیں اور حسینی

شہادت کا مقصد اور اس جنگ کا فلسفہ لوگوں کو سمجھائیں۔

امام حسینؑ کون تھے؟ اسلام میں ان کا کیا درجہ تھا ان کی ہستی کیسی غیر معمولی تھی۔ ان پر کیا کیا مصیبتیں آئیں اور کیوں آئیں۔ کس کے ہاتھوں آئیں ان ظالموں کا کیا انجام ہوا وغیرہ وغیرہ — شیعہ ہی نہیں بلکہ تمام مسلمان۔ اور مسلمان ہی نہیں بلکہ تمام غیر مسلم اپنی شرکت عزاداری کو یقیناً باعث ثواب دارین تصور کرنے لگیں۔

امام حسینؑ کا ہندوستان سے خاص تعلق ہے۔ دشت نینوا میں جب یزیدی افواج نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا تو اتمام حجت اور حجھوٹوں کو دروازہ تک پہنچا سکنے کے لیے انھوں نے عمر ابن سعد سے کہا کہ کوفہ والوں نے مجھے خط پر خط لکھ کر بلوایا ہے اگر میرا آنا ناگوار ہے تو مجھے مدینہ واپس جانے دو یا کوفہ ہو جانے دو ورنہ میرا راستہ چھوڑ دو تاکہ میں ہندوستان کی طرف چلا جاؤں اور وہاں اطمینان سے اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار دوں۔

مگر یزیدیوں کا تو منشا ہی کچھ اور تھا وہ تو شرارت پر تلے ہوئے تھے ایسی خواہش کو کیوں پورا ہونے دیتے۔

بعد کی صدیوں میں خلفائے عباسی کے ستائے ہوئے کثیر التعداد شیعہ مہاجرین ہندوستان بھاگ آئے تھے جو یہاں راجہ داہر وغیرہ کے یہاں دکن و سندھ میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور مظلوم مہمان سمجھ کر عزت کے ساتھ پارسیوں کی طرح بسائے گئے۔

امام حسینؑ کی اہلیہ معظمہ نوشیرواں عادل کے خاندان سے تھیں جو یزدجرد شاہ ایران کی دختر تھیں۔ یہ خاتون تین سگی بہنیں تھیں جنمیں سے ایک ماہ بانو نامی ہندوستان میں آکر بسیں و یہ خاندان (شاہان اودے پور میواڑ) میں منسوب ہوئیں اور چند رجا گا کے نام سے پکاری گئیں۔

ان جملہ تاریخی اہم اور مستند واقعات کے باوجود ملک اب بھی ناواقف ہے اور بے خبر ہے کہ امام حسینؑ کون تھے اور ان کے واقعات زندگی کیوں دردناک دل سوز،

رقت خیز اور خون کے آنسو رلانے والے ہیں اور عزاداری کی کیوں ضرورت ہے؟

جب کوئی غیر مسلم گہری تحقیقات کرتا ہے اور ان حالات سے آگاہ ہوتا ہے تو وہ نہ صرف حیران و ششدر رہ جاتا ہے بلکہ اسے امام حسینؑ کی اہمیت، معصومیت اور مظلومیت کا صاف پتہ چلتا ہے اور ثبوت مل جاتا ہے۔ اور پھر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کیوں ۱۳ سو سال کے بعد بھی آج محرم منایا جاتا ہے۔ یہ نہ میلہ ہے، نہ تماشا ہے نہ تیوہار ہے بلکہ عاشور کا دن ایسا دن ہے جسے رنج و غم کا مرقع کہہ سکتے ہیں یہی سبب ہے کہ مداحان حسینؑ صدیوں سے اس زمانے میں سوگوار بنتے اور عزائے حسینؑ قائم کرتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ شیعہ مجتہد، علماء اور سربر آوردہ حضرات ایک خاص کمیٹی اس غرض کو لے کر بنائیں کہ ہر سال خواہ ایام محرم میں خواہ قبل و بعد ہر شہر و ہر قصبہ میں یوم حسینؑ منائے جس میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ تمام غیر مسلم ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی، وغیرہ خاص طور پر بلائے جائیں۔ مذہبی افراط و تفریط یا محض عقیدہ ہی مطابق نہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے سادہ الفاظ میں صاف اور بے لوث تقریروں سے صحیح واقعات پیش کیے جائیں اور غیر مسلموں کو بھی اسی موضوع پر بولنے کا موقع دیا جائے۔

بمبئی (کیسر باغ) میں کئی سال سے اس قسم کا ایک شاندار جلسہ محرم کے اگلے ہفتہ میں ہوا کرتا ہے جس میں چار بار مجھے بھی شرکت کا موقع ملا ہے بلکہ دو مرتبہ تو کرسی صدارت کے لیے بھی مجھے منتخب کیا گیا تھا۔ آگرہ شاہ گنج میں ایک باقاعدہ تنظیمی کمیٹی کے ذریعہ یوم حسینؑ منایا جاتا تھا اور تقسیم ملکی سے سال تک کامیابی سے پبلک کو فائدہ پہنچا رہا۔

میرا تو یقین کامل اور خیال پختہ ہے کہ ایسے جلسوں کے ذریعہ حیدری شان اور حسینی آن بان سے عام لوگوں کو بخوبی آگاہی ہو سکتی ہے۔

محرم نمبر ۱۳۷۲ھ

امام حسین علیہ السلام کے متعلق پریزیڈنٹ یوگانڈا

(افریقہ کے تاثرات)

انسانیت کو مختلف دور میں قلب کی قوت اور ہمت حاصل رہی ہے اور اس کا موقع کہ وہ آزادی اور انصاف کی راہ میں ظلم اور برائی کے سامنے سر نہ جھکائے - یہی ہمت اور یہی عظمت امام حسین علیہ السلام سے حاصل رہی اور اس لیے میں ان لوگوں سے وابستہ ہوکر خوش ہوں جو ان کی عظیم الشان قربانیوں کو آج بھی تیرہ سو برس کے بعد بھی اسی عزت و احترام کا مستحق سمجھتے ہیں جسکی وہ مستحق تھیں یہ امر تعجب خیز نہ ہوگا کہ گو صدیاں گزر گئیں کربلا میں گزرے ہوئے واقعات کروڑہا کروڑ انسانوں کے لئے اب بھی مشعل راہ ہدایت بنے ہوئے ہیں اور بے شمار انسانوں کی ہمدردی حاصل کر رہے ہیں - یہ تعجب خیز نہیں ہے اس لئے کہ انسانیت کے لئے اپنی قربانی ہر سچے مذہب کا بنیادی اصول ہے اور یہ قربانی جتنی خالص اور بلند نصب العین کے لئے ہوتی ہے اس سے تمام مردوں اور عورتوں پر جذبات کو ابھارنے والا ایک دائمی اثر قائم رہتا ہے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حادثہ کربلا اندوہ و غم کے ساتھ یاد کیوں کیا جاتا ہے میرے نزدیک یہ دردناک حادثہ نہیں ہے بلکہ امام اعظم نے اس کے ذریعہ انسانیت کے لئے ایک عظیم اور شاندار فتح حاصل کی - وہ لوگ جو ان واقعات کو سن کر صدمہ و ماتم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ جذبات غم کے ساتھ ساتھ اس مقصد کو بھی یاد کرتے ہیں جسکے لئے امام حسینؑ نے اپنی زندگی قربان کی اور اپنی اس قربانی سے یہ انسان اندر حوصلہ پیدا کر دیا کہ وہ مردوں کو کس طرح زندہ و مصروف جد و جہد اور کسی مقصد نیک کے لئے اپنے کو قربان کر دینا چاہیئے لیکن بدی اور برائی کو نہیں قبول کرنا چاہیے کربلا میں گھوڑے سے اترنے والوں نے جو بہتر نفوس پر مشتمل تھا ہزارہا ہزار دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی جانوں کو قربان کر دیا لیکن یہ ظاہری فتح و شکست حقیقت میں نیکی اور صداقت کے آثار قائم کرنے کا سبب ہوئی ـــــ مختلف جماعتوں اور مذہبوں کے پرستار امام حسینؑ کے ناقابل فراموش یادگار پر جمع ہو کر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں -

ان کو اس کی کوشش کرنا چاہیے - کہ وہ اپنے روز مرہ کے اعمال میں اس قسم کے نمونے پیش کریں جس کی تعلیم و ہدایت امام حسینؑ نے کی تھی

(آنریبل ال، ریزیڈنٹ
امر، ہائیڈ یوگانڈا)

محرم نمبر سنہ ۱۳۷ھ

جب ہجری سنہ بدلتا ہے، جب ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخ میں خنجر غم بن کر ہلال نو شب اول محرم میں فلک پر ضو فگن ہوتا ہے۔ جب ہر ہر بچے شیعہ کے گھر میں ماتم کی صف بچھتی ہے۔ لباس غم زیب جسم ہوتا ہے۔ ہر زن و مرد مجسمہ تن بر قیع غم بن کر اہلبیت رسول ؐ کی محبت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جنت کے فدائی اصحاب حسین ؑ کی طرح مظلوم پر جان فدا کرنے کی تمنا میں بے چین ہونے والے کہیں علمدار لشکر حسین ؑ کی یادگار میں علم نصب کرتے ہیں، کہیں زیارت قبر حسین ؑ کے مشتاق، بانس کاغذ، لکڑی یا چاندی یا سونے سے شبیہہ روضہ شہید کربلا بنا کے اصل سے دور رہ کر بھی شبیہہ دیکھ کر ثواب زیارت حاصل کرتے ہیں۔

ذکر حسین ؑ کو ہر اس انداز میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو دل نشین اور جاذب نظر ہو، عالم کے ہر اس انسان کے واسطے جذبات انگیز ہو، جس کے قلب کے کسی گوشہ میں بھی مظلوم سے ہمدردی کی لہریں پوشیدہ ہوں۔

انھیں افکار کا اظہار کہیں روضہ خوانی کہیں کتاب خوانی، کہیں واقعہ خوانی، اور کہیں نثر خوانی، مرثیہ اور سوز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اب آخر میں موعظہ کے نام سے بلندی کی آخری منزل تک پہونچا۔ مذکورۂ بالا ہیئت سے انداز وہ ہیں جو اب متروک ہیں، اور شاید سیکڑوں آدمیوں کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ محلس غم میں ان کے پیش کرنے کا طریقہ کیا تھا اپنی معلومات کی حد تک میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ طرز موعظہ عام ہونے سے پہلے ہر انداز ذاکری صرف فضائل و مصائب معصومین تک منحصر تھا جس میں مناظر کی شگفتگی ذوق سماعت بڑھانے کے واسطے لازمی سمجھی جاتی تھی۔

مگر تقریباً ایک صدی کے اندر اندر جب سے موعظہ رفتہ رفتہ ذاکری کے مختلف طرز نظر انداز کرنے لگا۔ اس وقت سے مختلف موضوع حاضرین بزم کی سماعت تک پہنچنے لگے۔ دگر قلت کے ساتھ، کثرت ایسے ہی مضامین، رعایات لفظی، خطابیات، نکات شاعرانہ کی تھی اور ہے۔ جو صلواۃ کے فلک شگن نعروں سے واعظ کے کلام کو عام پسند ہونے کی سند دیں۔ واہ واہ کے لالچ میں سننے والوں کو یہ بھی سمجھا دیا جاتا ہے کہ صرف محبت آل محمدؐ نجات کے واسطے کافی ہے۔ یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ ایک اشک غم تمام جہنم کی آگ گل کر دے گا۔

ایک مجلس ماتم میں بیٹھنا جنت کا مستحق بنا دے گا، مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ بیٹھنا دیکھنا یہ چیزیں صرف اسی وقت پروانۂ جنت بنتی ہیں جب ان کے ساتھ ایمان ہو وحدت ہو، رسالت، امامت، معاد، خدا کی عدالت اور تمام اصول دین کے صدق دل سے اقرار کے ساتھ، فروع دین، نماز، روزہ، حج و زکوۃ، خمس اور احکام حرام و حلال پر بھی عمل ہو۔ نماز کے واسطے سنی و شیعہ کا اتفاق ہے کہ اگر یہ عبادت قبول نہ ہوگی تو ہر عمل خیر رد ہو جائے گا۔ روزہ کے واسطے یہ اہمیت ہے کہ مومن ہو۔ بڑے سے

بڑا عزادار حسینؑ ہو لیکن ماہ رمضان میں تیسؔ دن بلا عذر شرعی حاکم شرع کی تنبیہ کے بعد بھی روزہ نہ رکھے تو اگر حکومت شرعی برسرکار ہو تو اس مومن کو قتل کر دو۔ حج جس پر واجب ہو اور وہ امکان کے بعد بھی حج نہ کرے تو وہ آخر وقت یہودی یعنی کافر ہو کر مرے گا۔ زکوٰۃ مومن کا حق ہے جو زکوٰۃ ادا نہ کرے اس کو خدا ہرگز معاف نہ کرے گا، جب تک وہ مومن معاف نہ کریں جن کا حق اسنے ادا نہیں کیا۔

خمس حق سادات و امامؑ ہے اور یقینا واجب ہونے کے بعد اپنے ہی مال میں تصرف کرنے والے بھی غاصب حق سادات اور غاصب حق امام ہیں۔ جس کے معاف کرنے سے ائمہؑ نے انکار فرما دیا ہے۔ جو چیزیں شرع نے حرام کی ہیں ان میں بعض ایسی بھی ہیں جن کے واسطے قرآن نے نص صریح کر دی ہے کہ اگر ان کا کوئی ارتکاب کرے تو چاہے وہ مومن ہو، چاہے مسلم ہو، دوستدار اہلبیتؑ ہو یا عزادار حسینؑ مگر اس کی جزا جہنم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ جیسے قتل مومن، زنا محصنہ کی سزا ایسے کہ سنگسار کر کے مار ڈالا جائے۔

”اور انہیں سب چیزوں کی تعلیم غرض شہادت حسینؑ تھی۔“

اگر ہمارے سید و سردارؑ کی شہادت صرف اس غرض ہی ہوتی کہ رونے والا کوئی بھی ہو سیدھا جنت میں جائے، مجلس حسینؑ میں بیٹھنے والا کسی مذہب کا پابند ہو مگر وہ نجات کا مستحق ہے۔ دوستدار اہلبیتؑ جیسا بھی بدکار اور تارک عبادات ہو مگر وہ ناجی ہے۔ تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے نانا کا دین بچانے کے واسطے کربلا کی محیر العقول فدا کاری دنیا کے سامنے پیش کی۔ نانا نے وحدت رسالت معاد، صفات الٰہی، نماز، روزہ، حج وغیرہ ہر شے کی تعلیم دی اور بغیر اس علم و عمل کے جنت بھی ملنا ناممکن بتا دیا مگر امام حسینؑ نے معاذ اللہ مثل عقیدۂ نصاریٰ امت کے گناہوں کا فدیہ بن کر امت کو عام اجازت دیدی کہ کوئی عمل خیر نہ کرنا، کسی بدکاری سے پرہیز نہ کرنا۔ بس صرف میری عزاداری کرنا اور جنت تمہاری ہے۔

لا واللہ ہرگز امام حسینؑ کی یہ تعلیم نہ تھی۔ ان کی شہادت کی غرض صرف حفاظت اسلام تھی، تعلیمات رسولؐ کی بقا تھی لوگوں کو گمراہی سے بچا کر اصول و فروع کے صحیح راستوں پر لگانا غرض حقیقی تھی۔

ایک زمانے میں اس ہندوستان میں، جو کبھی جنت نشان کہا جاتا تھا، اور اب جہنم کی تصویر ہے۔ جہاں اقتصادی تکلیفوں لوٹ مار، عام رعایا کی بد اخلاقیوں، قانون شکنیوں، حکام کی ناانصافیوں، حکومت کی غفلتوں اور بد انتظامیوں کی گرم گرانی کی شدت، ڈاکہ زنی، قتل و غارت، انسانی خون کی ارزانی، اور فرقہ پرست جماعتوں کی تبلیغی کوششوں نے ہر انسان کی زندگی موت سے بدتر بنا رکھی ہے، اگر ہم اپنے مذہب کو بچا سکتے ہیں تو صرف عزاداری کی بدولت مگر نہ اس صورت سے کہ نوحہ کو نوحہ کی حد سے نکال کر مدح کی نظم بنا دیں، اور اس پر ماتم کریں مصرع یہ ہو کہ علیؑ نے خیبر فتح کر لیا“ اور ہم اس پر ماتم کر رہے ہیں۔ نہ اس صورت سے کہ ہم صرف شق القمر اور رجعت شمس میں باریک بینیاں کریں نہ اس صورت سے کہ سوز خوانی میں بڑے بڑے گویوں کو مات کر دیں۔ نہ اس صورت سے کہ منبر کو تبرا بازی سے بھر کر خود اپنے ہی افراد کو مجلس سے اٹھ جانے پر مجبور کر دیں بلکہ اگر اس دور میں اسلام کو بچا سکتے ہیں تو صرف یہ بتا کر کہ حسینؑ وحدت کے کتنے زبردست معتقد تھے، منازل شہادت کی وہ عظیم الشان سختیاں جنکو دنیا کا کوئی بشر برداشت نہ کر سکا صرف اس جذبے میں طے کر گئے کہ میرے خالق کا یہی حکم ہے ہر وہ مصیبت جو انسان کے تحمل سے باہر تھی بڑی ہنسی خوشی سے صرف اس لئے انگیز کر لی کہ میرا اللہ اسی میں راضی ہے رسولؐ کی صداقت کا ثبوت امام حسینؑ نے ہر اس عبادت کو کربلا میں ادا کر کے دیا جس کی تعلیم خاتم النبیینؐ نے دی تھی۔ اور جس کو

اس مظلوم اور دیگر معصومینؑ کے علاوہ کوئی کربلا کے سے حالات میں ادا نہ کر سکا یعنی واجبات تو واجبات مستحبات بھی ترک نہ کئے جنکا تذکرہ اشاروں کنایوں میں کر دینے سے بعض حضرات غالی شیعوں کی نظروں میں قابل لعن وطعن ہو گئے۔ مذہبی امور میں یکجہتی، اتحاد، خلوص، نیت، صبر، جنت و نار، حساب وکتاب، ثواب وعقاب ایک ہر چیز میں یقین وایمان کی وہ منزل امام حسینؑ واصحاب حسینؑ نے پیش کی جس سے زائد مستحکم ایمان کسی عام انسان میں ہونا ناممکن ہے۔

آج ہندوستان میں یقیناً ہماری جان ومال اتنے خطرہ میں نہیں ہے جتنا ایمان خطرے میں ہے۔ اسکی وجہ یہ کہ حکومت کا مسلک لادینی ہے تو رعایا میں لامذہبیت کا اثر آنا ضروری ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ حکومت کا مسلک لادینی سہی مگر اکثر وبیشتر ارکان حکومت کسی نہ کسی مذہب کے جذبات سے یقیناً متاثر ہیں۔ جن کا اظہار کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی پیرائے میں ہو جانا ناگزیر ہے اور اسی لئے کہ ایک طرف عیسائی مشن دوسری طرف شدھی کے فدائی مذہب بدلو دینے پر تیار ہیں۔ اور اس میں ذرا سا بھی جھوٹ نہیں کہ گاؤں کے علاقہ میں بنگال کے اور اکثر دیہات میں صوبہ بمبئی وغیرہ کے قریات میں بہت سے مسلمان اپنا دین بدل چکے ہیں۔ اور اسی لئے کہ نام کے مسلمان اور محض خاندانی شیعہ یوں تعلیم نسواں کے فدائی بن گئے ہیں کہ ان کو نہ زناکاری عام ہو جانے کی شرم ہے، نہ بے پردگی کی غیرت ہے۔ نہ اغوا کے عام واقعات دیکھ کر آنکھیں کھلتی ہیں۔ نہ عورتوں کے غیر مذاہب کے ساتھ سول میرج کر لینے سے کان پر جوں رینگتی ہے، بالکل سچ ہے ——

الحیاء مع الایمان (اگر ایمان ہو تو شرم وحیا بھی ہوتی ہے) اگر ایمان نہیں تو شرم وحیا کا خدا حافظ، اس کلیہ کے مطابق یہ کہنا ناگزیر ہے کہ جو بے حیائی برداشت کرنے پر خوشی خوشی آمادہ ہیں ان کا ایمان یقیناً کمزور

ہے۔ آپ یاد رکھیں کہ بچوں کی ابتدائی اور گھریلو تربیت وتعلیم بہت زائد ہماری عورتوں کی ممنون احسان ہے اور اس وجہ سے یہ قول مشہور ہے کہ ایمانداری کی زائد بقا عورتوں کے دم سے ہے لہذا اب اگر عورتیں ہی دینوی تعلیم حاصل کر کے غیر مذاہب سے سول میرج کر کے ایمان واسلام سے باہر ہو جائیں گی۔ تو بڑی حد تک ایمان اور اس کے ساتھ عزاداری بھی ختم ہو جائے گی، اس لئے اس زمانے میں عزاداری امام حسینؑ میں وہ انداز اختیار کئے جانا لازم ہیں جن سے غیر مذاہب متاثر ہوں یا نہ ہوں لیکن کم از کم ہمارے ہم مذہبوں میں تعلیمات حسینی پر عمل کرنے اور ان کے نقش پا پر چلنے کا شوق پیدا ہو۔ ہماری عورتوں میں اہلبیت حسینؑ کی طرح ایمان اور عبادت اور اطاعت خالق کا جذبہ پیدا ہو۔

ہماری عورتوں اور مردوں کو سمجھنا چاہیئے کہ اگر ہم پر فاقہ گزر جائے، اگر ہم فقر کی حالت میں ہوں، اگر ہم کو کہیں ملازمت نہ ملے۔ اگر دنیا ہم کو ذلیل نگاہوں سے دیکھے جو کچھ بھی ہم پر مصیبت آئے تو ہر مصیبت کے بعد بھی ہماری تکلیفیں اسیران اہلبیتؑ کی تکلیفوں سے زائد کیا برابر بھی نہیں ہو سکتیں۔ تو کیا ان مصائب میں معاذ اللہ عورات بنی ہاشم نے اپنا دین چھوڑ دیا۔ کیا عبادات الٰہی سے غافل ہو گئیں۔ کیا اپنی بے پردگی کو بطیب خاطر منظور کر لیا۔

جناب سکینہؑ جن کا سن تین یا سات برس کا تھا۔ جوان عورتوں کی حد میں نہ تھیں مگر دربار یزید میں گریاں تھیں یزید کے سوال پر آپ نے جواب دیا کہ وہ عورت کیونکر نہ روئے جس کے منہ ڈھانکنے کو ذرا سا کپڑا بھی میسر نہ ہو کہ نامحرموں سے منہ چھپا سکے۔ سبق لیں شاہزادی کے ان الفاظ سے وہ جو کہتے ہیں کہ شریعت میں منہ کا پردہ لازم ہی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہماری شاہزادی منہ کھلا ہونے کا شکوہ نہ کرتیں اور یزید بھی جواب دے سکتا تھا کہ منہ کھلا ہے تو تم کیوں ہو شریعت میں تو منہ کا پردہ لازم ہی نہیں ہے۔

تو کیا جناب سکینہؑ کے ان بہتے ہوئے آنسوؤں کے بعد

وہ عورتیں اہلبیت رسولؐ کی بچی چاہنے والی کہی جاسکتی ہیں جو بے پردہ گھومیں، سینما جائیں، ہوٹلوں میں اغیار کے ساتھ گل چھرّے اڑائیں اور آخر انھیں خدا اور رسول میرج کے عذاب میں پھنسائیں، اور کیا وہ مرد سچے حسینؑ کے شیعہ ہوسکتے ہیں جو ان تمام بے حیائیوں کو بہ خوشی برداشت کریں، نہ خدا کو پہچانیں، نہ رسولؐ کو مانیں، نہ نماز پڑھیں نہ روزہ رکھیں نہ عذاب و ثواب کی فکر کریں۔ اور کیا وہ دولت مند سچے مومن کہے جاسکتے ہیں جو فرو عاتِ دین کے ہر جزو سے آزاد ہوں نہ حج کریں، نہ خمس دیں، نہ زکوٰۃ ادا کریں اور پھر دوستدار اہلبیتؑ ہونے کے مدعی ہوں۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

محرم نمبر ۱۳۷۶ھ

شہادت حسینؑ

کے بعد

اشقیا کے مظالم

جناب مولانا سید سبط الحسن صاحب فاضل ہنسوی مصنف فلسفۃ الصلوٰۃ ولسان صدق

(ہیڈ مولوی ایس ایچ، اڈی ہائی اسکول بسواں سیتاپور)

فرات کے کنارے غاضریہ اور نینوا کے متصل عرب کا ایک لق و دق ریگستان ہے جو افریقہ کے صحاری سے گوئے سبقت لے جانے کے لئے آمادہ۔ اس میں سایہ و سبزہ کا مطلق نام نہیں ہے۔ بدوی و صحرا نشین بھی اس ریگستان میں قدم رکھتے ڈرتے ہیں لیکن آج دسویں محرم سنہ ۶۱ھ کو یہ صحرا اسلامی فوجوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر جانب فوج ہی فوج نظر آرہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا ہے جو امنڈ رہا ہے۔ فوجیوں کے افعال و حرکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑی مہم میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ رہ رہ کر جوش مسرت میں اسلامی روایات کی بنا پر "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعرے بلند کر رہے ہیں یقیناً ان مسلمانوں کو ضرور کوئی ایسی کامیابی حاصل ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ آسمان کو اپنے سر پہ اٹھا رہے ہیں۔

اسی صحرا میں ایک دوسری جانب چند لاشیں بھی نظر آرہی ہیں جن سے باوجود مظلومیت برسنے کے "الٰہی جلال اور نور" درخشاں ہے اور تھوڑے ہی فاصلہ پر کچھ خیمے بھی دکھائی دے رہے ہیں جن سے آگ لگا دی جانے کی وجہ سے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور جن کے بھڑکتے شعلوں اور روشن چنگاریوں سے اپنے ڈیروں خیموں کو بچانے کے لئے یہ تکبیر بلند کرنے والا لشکر حفاظتی تدبیریں کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جلتے ہوئے خیموں کی تباہی پر اظہار مسرت بھی کرتا جاتا ہے۔ انھیں مشتعل خیموں کی رہ رہ کر ستم دیدہ بی بیوں کی سہمی ہوئی فریاد کی آوازیں بھی آرہی ہیں!

"اے نانا رسول خداؐ آیئے اور یہ ملاحظہ کیجئے کہ آپ کا فرزند حسینؑ بھوکا پیاسا شہید کر دیا گیا اور آپ کی نواسیاں قیدی بنائی جارہی ہیں"!!

آہ! اب معلوم ہوا کہ یہ مسلمان اپنے رسولؐ کے نواسے کو شہید کر کے خوش ہو رہے ہیں اور اسی خوشی میں تکبیریں بلند کر رہے ہیں ؎

ویکبرون بان قتلت وانما
قتلوا بک التکبیر والتھلیلا
وکانما بک یا ابن بنت محمدؐ
قتلوا جہارا عامدین رسولا

خداوندا! کیا تیری خدائی میں ایسے بھی بندے ہیں جن میں رحم مطلق نہیں ہوتا جو ظلم کے مجسمہ ہوتے ہیں جن کے قلوب پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں ہاں تو ایسے ہی سنگدلوں کے بارے میں خود ارشاد فرماتا ہے۔

ثم قست قلوبکم من بعد ذلک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ الخ (بقرہ)

یقیناً ایسے قلوب تھے اور وہ ان کلمہ گو مسلمانوں کے سینوں میں جو "حسینؑ" کو شہید کرنے کربلا میں آئے تھے۔ آہ! حسینؑ مظلوم کی شہادت ہی پر ان کے ظلم کا خاتمہ نہیں ہوتا ہے بلکہ بعد شہادت امام مظلومؑ کے جسم اطہر پر جو لباس تھا وہ اتار لیا جاتا ہے اور اس کے بعد یہ اشقیا خیام اہلبیتؑ پر چھاپا مارتے ہیں اور تمام ساز و سامان لوٹ لیتے ہیں حتیٰ کہ مخدرات عصمت کے زیورات اور چادریں بھی چھین لیتے ہیں۔ (تاریخ کامل ابن اثیر جزری و تذکرۂ خواص الامہ علامہ سبط ابن الجوزی) اس کے بعد یہ بدبخت خیموں میں آگ لگا دیتے ہیں (روضۃ الصفا جلد سوم) اس پر بھی ان کو چین نہیں آتا بلکہ اس کے بعد گھوڑوں کی ٹاپوں سے "حسینؑ مظلوم" کے جسم اقدس کو روند کر پامال کر دیتے ہیں (تاریخ کامل ابن اثیر جزری، علامہ سبط ابن الجوزی پامالی نعش امامؑ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

وقال عمر ایضا من یوطی الخیل صدرہ
فاوطئوا الخیول صدرہ وظھرہ ووجدوا
فی ظھرہ اثار سوداء فسألوا عنھا

فقیل کان ینقل الطعام علی ظھرہ فی
اللیل الی مساکین اھل المدینۃ (تذکرۂ
خواص الامہ)

عمر سعد نے آواز دی کہ کون ایسا ہے جو حسینؑ کی لاش کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند دے۔ پس سواروں نے مظلومؑ کی لاش کو پامال سم اسپاں کر دیا۔ اس وقت اشقیا نے پشت مبارک پر ایک نشان دیکھا دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ نشان اس وجہ سے ہے کہ حضرت ہر دو شب میں اپنی پشت پر کھانے پینے کا سامان لاد کر لے جاتے تھے اور مدینہ کے غریبوں کو تقسیم کرتے تھے۔

آہ فرزند رسولؐ! آپ کے احسانات کا مسلمانوں نے کیا اچھا بدلہ دیا!!

اب رات کی تاریکی تمام صحرا پر چھا جاتی ہے۔ آج یہ جنگل ہر روز سے زیادہ ڈراؤنا معلوم ہو رہا ہے۔ جلے ہوئے خیموں کے قریب آل رسولؐ ریگستان پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے خوف کی وجہ سے سہمے جا رہے ہیں بیوائیں بچوں کو سینوں سے لپٹائے ہوئے ہیں۔ سر حسینؑ کی چار سالہ بچی باپ کی یاد میں تڑپ رہی ہے اور کبھی کبھی اپنے کانوں تک ہاتھ لے جاتی ہے اور ماں سے درد کی شکایت کرتی ہے، ہاں دنیا آکر دیکھے اس حالت میں بھی ایک عبد خاص اپنے معبود سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا ہے۔ بیمار کربلا سید الصابرین علی بن الحسینؑ اس وقت بھی عبادت میں مصروف ہیں۔ سید الساجدینؑ اس شب کو سجدۂ معبود میں سر رکھ دیتے ہیں اور تمام رات سجدہ کی حالت میں رہتے ہیں۔

لما قتل ابوہ الحسینؑ بات فی کربلاء احیاء
تلک اللیلۃ بالسجود الی الصباح ویقول
فی السجود تلک اللیلۃ لا الہ الا اللہ
حقا حقا لا الہ الا اللہ ایمانا و صدقا
لا الہ الا اللہ تعبدا و رقا بکربلاء
انتہی مرآۃ الجنان طبع النجف ذخیرۃ المال ثانی

شرح عقد جواہر اللآلی علامہ شہاب الدین احمد بن عبد القادر العجلی الحفظی الشافعی)

جب امام مظلومؑ شہید ہو گئے تو اس شب کو امام زین العابدین علیہ السلام نے عبادت خدا میں ختم کیا۔ حضرت نے ایک ہی سجدہ میں پوری رات ختم کر دی اور صبح ہو گئی۔ اس شب کو حضرت نے سجدہ میں ہزار مرتبہ یہ کلمات ارشاد فرمائے لا الہ الا اللہ حقا حقا لا الہ الا اللہ ایمانا وصدقا لا الہ الا اللہ تعبدا ورقا"

(۲)

"۱۱ محرم کو عمر بن سعد نے اپنے لشکر کے کشتوں کو جمع کیا اور ان پر نماز پڑھ کر دفن کر دیا۔ (تاریخ کامل ابن اثیر) لیکن شہداؑ کی لاشیں اسی طرح بے گور و کفن پڑی رہیں۔ اس کے بعد اسلامی دنیا کے رسواترین سپہ سالار عمر بن سعد نے دو دن تک قیام کرنے کے بعد کوفہ کا ارادہ کیا لیکن اس موقع پر بھی اپنی قساوت قلب کی بنا پر یہ ظلم کرتا ہے کہ خاندان رسولؐ کے چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں اور .... رسولؐ زادیوں اور دیگر اہل حرمؑ کو گرفتار کر کے مقتل شہداؑ کی طرف لے جاتا ہے جہاں پامال شدہ لاشہائے شہداؑ بے غسل و کفن پڑی ہوئی تھیں اس جگر دوز منظر کو جب مخدرات عصمت نے دیکھا تو فریاد کرنے لگیں۔ جناب زینبؑ نے اپنے نانا جناب رسالتمآبؐ کو مخاطب فرما کر یہ ارشاد فرمایا۔

اے نانا! آپ پر آسمانی فرشتوں نے نماز پڑھی تھی لیکن آپ کے فرزند حسینؑ ریگ گرم پر آغشتہ بخون پڑے ہیں جن کے اعضا ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں۔ آپ کی اور اولادیں بھی قتل کر دی گئی ہیں جن کی لاشوں پر ہوا گرد اڑا رہی ہے اور آپ کی لڑکیاں قیدی بنا لی گئی ہیں۔

(تاریخ کامل ابن اثیر و تذکرۃ خواص الامہ)

یتیموں اور بیواؤں کا یہ لٹا ہوا قافلہ گریہ وزاری کرتا ہوا کوفہ چلا جاتا ہے اور شہداؑ کی لاشیں بے غسل و کفن پڑی رہ جاتی ہیں۔ اشقیا کے چلے جانے کے بعد قبیلۂ بنی اسد جو غاضریہ میں رہتے تھے وہ آ کر شہداؑ کو دفن کر دیتے ہیں (تاریخ کامل ابن اثیر) علامہ سبط ابن الجوزی امام مظلومؑ کی تکفین و تدفین کے بارے میں ایک دوسرا واقعہ یوں لکھتے ہیں۔

وکان زهير بن القين قد قتل مع الحسين فقالت امرأته لغلام له اذهب فكفن مولاك فذهب فرأى الحسين مجردا فقال اكفن مولاي وادع الحسين لا والله فكفنه ثم كفن مولاه في كفن آخر (تذكرة خواص الامة)

"زہیر بن قین جو امام حسینؑ کی رفاقت میں شہید ہوئے ان کی زوجہ نے زہیر کے غلام سے کہا کہ جاؤ اور اپنے آقا کو کفن دو۔ جب غلام گیا تو اس نے دیکھا کہ حسینؑ مظلوم کی لاش بے غسل و کفن پڑی ہے، یہ دیکھ کر کہنے لگا یہ کیا غضب ہے کہ میں اپنے آقا کو کفن دوں اور فرزند رسولؐ کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ دوں بخدا ایسا کبھی نہ ہوگا۔ اس نے امام مظلومؑ کو کفن دیا اور اپنے آقا کو دوسرے کفن میں دفن کیا۔"

علامہ بہائی علیہ الرحمہ دفن شہداؑ کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ تحریر فرماتے ہیں کہ فتح خیبر کے بعد کچھ یہودی جن میں ابراہیم اور رحیل نامی یہودی بھی تھے بھاگ کر سرزمین عراق میں صحرائے کربلا کی قریبی آبادی میں آباد ہو گئے تھے۔ یزیدی فوج کے چلے جانے کے بعد شب کو ان لوگوں نے لاشہائے شہداء سے نور کو تابندہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس مشاہدے کے بعد ان لوگوں نے وہاں کے دوسرے باشندوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ یہ لاشیں اولیائے خدا کی معلوم ہوتی ہیں آؤ ہم لوگ ان کو دفن کر کے سعادت حاصل کریں۔ اس کے بعد ان لوگوں نے شہداؑ کو دفن کیا۔ (کامل بہائی باب ۳۸)

(۳)

وہ شہر کوفہ جو قبۃ الاسلام سمجھا جاتا ہے۔ جس کی آبادی و رونق میں خلیفہ دوم عمر بن خطاب نے کافی اہتمام سے کام

لیا تھا اور حضرت زینبؑ و ام کلثومؑ بحیثیت شاہزادی قیام فرما ہو چکی تھیں، آج اسی شہر میں عجب چہل پہل ہے، خوشی و مسرت کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں۔ بازار سجائے گئے ہیں، ہزاروں تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ دختران علیؑ و بتولؑ اور اہلبیت رسولؐ اسیر کر کے لائے جا رہے ہیں (مفتاح النجا مرزا محمد معتمد بدخشی) سب سے پہلے ابن زیاد یہ حکم دیتا ہے کہ "حسینؑ" کا سر نوک نیزہ پر بلند کر کے تمام کوفہ میں گھمایا جائے (تاریخ کامل ابن اثیر) اس کے بعد دربار میں قیدیوں کے حاضر کیے جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ آج کوفہ کا دربار معمول سے زیادہ آراستہ ہے۔ دربار عام ہے ہر شخص بے روک ٹوک کے آ سکتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ دربار میں موجود ہیں یہاں تک کہ رسولؐ کی صحبت کے بیٹھے والے بھی خصوصیت کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ دربار میں ایک جانب خاندان رسولؐ مقید کھڑا ہے اور امیر تخت حکومت پر بیٹھا ہوا سر حسینؑ سے بے ادبی کر رہا ہے۔ اور بے حیا جناب زینبؑ سے ہمکلام ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور خاندان رسالتؐ کی شان میں بے ادبانہ الفاظ کہتا ہے۔ (تاریخ ابن اثیر جزری)

دربار برخاست ہوا لیکن قیدیوں کو اس وقت تک کے لئے قید خانے میں رکھے جانے کا حکم دیا گیا جبتک کہ دمشق سے ابن زیاد کا قاصد تہنیت نامہ کا جواب لے کر پلٹ نہ آئے (تاریخ کامل)

اسی زمانہ میں مورخ واقدی کے بیان کی بنا پر یہ واقعہ بھی ہوتا ہے جس کو اس نے امام زین العابدینؑ سے روایت کی ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ مجھکو ایک کوفی اپنے گھر لے گیا اور وہیں (چھپا کر) رکھا وہ (بظاہر) میری بڑی عزت کرتا تھا اور جب میرے پاس آتا جاتا تھا تو رو دیتا تھا میں نے اس برتاؤ پر اس سے ایک دن کہا کہ اگر کوفہ میں کسی کے پاس کچھ اچھائی ہے تو تیرے پاس ہے۔ ایک دن ابن زیاد کی طرف سے یہ منادی ہوئی کہ جس کے یہاں علی ابن الحسینؑ ہوں وہ اگر ان کو میرے پاس حاضر کر دے تو میں اس کو تین سو درہم انعام دوں گا۔ یہ سن کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا میں ان لوگوں سے ڈرتا ہوں۔ اس کے بعد میرے ہاتھوں کو پشت کی طرف سے گردن سے باندھ دیا اور لے جا کر ابن زیاد کے سپرد کر دیا اور انعام کی رقم لے لی۔

(۲)

اہل بیت رسولؐ اس وقت تک کوفہ میں مقید رہے جب تک کہ ابن زیاد کا قاصد دمشق سے یزید کا جواب لے کر نہیں واپس آیا۔ قاصد کی واپسی کے بعد ابن زیاد نے اطفال حسینؑ اور مخدرات عصمت کو جن کے سروں پر چادریں بھی نہ تھیں۔ ایک رسی سے باندھ کر بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کر کے دمشق روانہ کر دیا (تذکرۂ خواص الائمہ سبط ابن جوزی، ذخیرۃ المآل علامہ احمد بن عبدالقادر الحنبلی) اور بیمار کربلا امام زین العابدینؑ کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ حضرت کو طوق و زنجیر سے جکڑ دیا (تاریخ کامل ابن اثیر) یہ لٹا ہوا اسیروں کا قافلہ اس شان سے جا رہا تھا کہ آگے آگے نوک نیزہ پر شہدا کے سر بلند تھے اور اس کے پیچھے یہ قافلہ تھا۔

عراق سے دمشق جانے والا وہ راستہ اختیار کیا گیا تھا جو نہایت دشوار گذار اور تکلیف دہ تھا۔ اس راستہ میں ایسی ایسی تکلیفیں خاندان رسالتؐ نے برداشت کیں جنکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

شہر حلب کے غربی سمت جبل جوشن ہے یہاں محسنؑ ابن الحسینؑ کا مزار ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جب مخدرات اہل بیتؑ کا قافلہ مقید ہو کر دمشق جا رہا تھا تو اس قافلہ میں کوئی طفل تھا جو راستہ میں یہاں مر گیا اور دفن کر دیا گیا۔

غرض کہ طرح طرح کے اندوہ و مصائب کو برداشت کرنے کے بعد بنا بر تحقیق علامہ شہاب الدین احمد بن عبدالقادر العجیلی الحنفی الشافعی (ذخیرۃ المآل) ہشتم ماہ صفر کو اور بنا بر مختار علامہ بہائی علیہ الرحمہ (دز تیار) شنبہ شانزدہم ربیع الاول کو داخل دمشق ہوئے (کامل بہائی باب ۲۸)

جس دن اہل حرمؑ کا قافلہ دمشق میں داخل ہوا ہے اس دن وہاں کے بازار خاص اہتمام سے سجائے گئے تھے، تمام شہر میں آئینہ بندی کی گئی تھی، فتح کے شادیانے بجائے جا رہے تھے ہر طرف سے چنگ ورباب کی آوازیں آرہی تھیں، لباس عید سے لوگ آراستہ تھے۔ غیر مسلم نو وارد دیکھ کر یہ سمجھتے تھے کہ شاید مسلمانوں کی کوئی خاص عید ہے۔ مجمع کی یہ کثرت تھی کہ باوجود اس کے کہ آفتاب نکلنے کے ساتھ ہی "اسیران آل محمدؐ" داخل دمشق کر دیئے گئے تھے لیکن زوال کے وقت دربار یزید تک پہونچ سکے تھے۔

آج دربار بھی آراستہ کیا گیا تھا تخت مرصع پر یزید پلید بیٹھا تھا اور اس کے چپ و راست زریں و سیمیں کرسیاں (جن کی تعداد سات سو بتائی جاتی ہے) بچھائی گئی تھیں جن پر امراء اور صنادید شام بیٹھے ہوئے تھے غیر ممالک کے سفراء بھی خاص طریقہ سے مدعو کئے گئے تھے۔ کیا انقلاب ہے کہ اس بھرے دربار میں خاندان رسالتؐ مثل غلامان حبش و کنیزان ترک و دیلم کے پیش کئے گئے تھے۔ خود جناب سید سجادؑ ارشاد فرماتے ہیں ؎

اقاد ذلیلا فی الدمشق کانني
من الزنج عبد غاب عنه نصير

اسی دربار میں طشت طلا میں حسینؑ مظلوم کا سر یزید شقی کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت یہ شقی اپنے ندماء کے ساتھ بیٹھا ہوا شراب پی رہا ہے اور اپنا یہ شعر گاتا جا رہا ہے ؎

ادر کاسا وناولها
الا یا ایها الساقی

اور ساتھ ہی ساتھ فرق مبارک کے ساتھ بے ادبی بھی کرتا جاتا تھا اور اپنی بے دینی کا اظہار اس شعر کو پڑھ کر کرتا جا رہا تھا ؎

لعبت بنو هاشم بالملک فلا
خبر جاء ولا وحی نزل

فرق مبارک اور اسرائے آل محمدؐ کے ساتھ جو مظالم دمشق میں کئے گئے ان سے صفحات تاریخ رنگین ہیں۔ اسی دمشق میں خاندان رسالتؐ ایک مدت تک مقید رہے یہیں قید شام ہی میں حسینؑ مظلوم کی بچی باپ کی یاد میں انتقال بھی کر جاتی ہے (کامل بہائی باب ۲۵) حتیٰ کہ ایک روایت کی بنا پر جناب ام کلثومؑ بھی اسی زمانے میں دمشق میں انتقال فرماتی ہیں (کامل بہائی باب ۲۸) اس زمانہ میں حسین مظلومؑ کا فرق مبارک دمشق کے دروازے پر جو باب جیرون کے نام سے مشہور ہے اور جہاں حضرت یحییٰؑ کا سر مقدس لٹکایا جا چکا تھا ایک مدت تک نصب رہا۔ (تقویم البلدان عماد الدین اسمٰعیل بن ملک نور الدین صاحب حماۃ و کتاب المسالک والممالک لابی القاسم محمد بن حوقل البغدادی) یہی وہ باب ہے جس کے متعلق یزید بدبخت نے یہ شعر کہا ہے ؎

لما بدت تلك الرؤس فاشرقت
تلك الشموس على حصى جيرون

(۵)

جس زمانے میں اہل بیت رسولؐ قید شام میں تھے مملکت یزید میں انقلابی آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اس نے یہ خیال کیا کہ اس انقلاب کے روکنے کے لئے اہل بیتؑ رسولؐ کو قید سے رہا کر دینا چاہئے۔ بعض مورخوں کا یہ خیال ہے کہ مروان نے یزید سے یہ کہا تھا کہ مناسب یہ ہے کہ ملک میں جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے اس کو دبانے کے لئے اہلبیتؑ رسولؐ کو رہا کر دیا جائے ورنہ سلطنت تباہ ہو جائے گی۔ بہرکیف جو کچھ ہوا ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ یزید پلید نے اپنی سلطنت کو بچانے کے لئے اسیران بلا کو رہا کر دیا اور اس امر کی بھی اجازت دے دی کہ جہاں مناسب سمجھیں قیام فرمائیں۔ آل رسولؐ نے مدینہ جانا مناسب سمجھا اور وہیں چلے گئے۔ لیکن حسینؑ کے فرق مبارک کے متعلق آج تک تاریخ فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ کہاں دفن کیا گیا۔ وہ فرق مقدس جو شہر بہ شہر پھرایا گیا، جو درباروں میں نذر کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ جو کبھی تنور میں رکھا گیا، کبھی درختوں، مسجدوں کے مناروں، اور شہر کے

بقیہ صفحہ ۱۲۷ پر

حسینؑ انسان کو کیا بتلا گئے

جناب عماد العلماء مولانا سید محمد رضی صاحب قبلہ مجتہد (حال مقیم کراچی)

موضوع بالا پر کچھ عرض کرنے سے پیشتر مقدمہ و تمہید کے طور پر اس کی توضیح ضروری ہے کہ انسانیت کا صحیح مفہوم اور معیار کیا ہے اور حقیقی معنوں میں انسان کہے جانے کا مستحق کون ہو سکتا ہے۔

موجوداتِ عالم آب و گل میں سے کوئی شے خواہ نظر ظاہر میں کتنی ہی بے شعور بے حس اور قوت ادراک و تمیز سے محروم کیوں نہ دکھائی دیتی ہو دراصل ایسی نہیں ہے جو خود فراموشی کے مرض میں مبتلا ہو اپنی حقیقت سے ناآشنا اور اپنے لوازم ذاتیہ و خصوصیات طبعیہ سے غافل ہو۔ ہر شے میں حسب استعداد قوت ادراک و تمیز و عرفان حقیقت موجود ہے۔ جو اس کے درجہ کمال فطری تک پہونچنے کے لیے مناسب موافق یا غیر مناسب و غیر موافق ہوتے ہیں۔ ان کی تفریق و تمیز میں مطلق خطا نہیں کرتی اور اس سے غایت وجود اغراض خلقت کے پورا کرنے میں تقصیر و کوتاہی کچھ بھی واقع نہیں ہوتی۔

"ترجمہ" انواع عالم میں فقط انسان ہی ایک ایسی نوع ہے جس کے اکثر افراد خود فراموش اور اپنی حقیقت و غایات وجود و خصائص ذاتیہ کے صحیح تصور و حقیقی عرفان سے محروم ہیں۔ انسان کی مختلف جماعتیں انسانیت اور اس کے کمالات حقیقیہ مناسبات فطریہ کے متعلق جداگانہ تخیل رکھتی ہیں اور اختلافات تخیل کی وجہ سے ہر ایک کی سعی عمل اور اس کے طریقوں میں شدید اختلاف نظر آتا ہے ارشاد ربانی ہے وہ ضعف خلقت و نقص فطرت" جس کا تذکرہ کلام ربانی "خلق الانسان ضعیفا" میں ہے اس کے اجمالی ادراک و احساس سے کوئی انسانی دل و دماغ خالی نہیں افراد انسانی اس احساس میں برابر کے حصہ دار ہیں مگر یہ ضعف و نقص کس قسم کا ہے اس کا ازالہ کیونکر ہو سکتا ہے اس کا علاج کس عنوان سے ممکن ہے کس طرح کی قوت اور کس قسم کا کمال اس کا بدل قرار پا سکتا ہے۔ اس کی تعیین و تشخیص میں شدید اختلاف خیال و افتراق رائے واقع ہوتا ہے نکو ہر کس بقدر ہمت اوست کے مطابق ہر انسانی دماغ کمال کا جداگانہ تخیل اپنے اندر قائم کر لیتا ہے اور اس کی سعی عمل انھیں افکار و تخیلات کے مناسب موقع ہوتی ہے۔ کوئی شخص اس خیال و زعم ناقص میں مبتلا ہوتا ہے کہ کمال انسانی ملک بن جانا ہے اور وہ اس خیالی کمال کے مرتبہ پر پہونچنے کے لیے رہبانیت اختیار کر کے دنیا و ما فیہا سے منقطع ہو جانے کی سعی لاحاصل کرتا ہے اور وہ طرح طرح کی غیر فطری ریاضت کی جانب مائل ہو کر اپنی ہستی کو اغراض وجود کی تکمیل سے بے بہرہ اور اپنے قدرتی سرمایہ استعداد و قابلیت کو برباد کر دیتا ہے اس کی پرواز تخیل اس حقیقت تک نہیں ہو سکتی کہ جس ملکیۃ کو وہ اپنے لیے منتہائے کمال تصور کرتا ہے وہ خود نقص وجودی سے خالی نہیں ہے۔ عالم ملکوتی کے موجودات کمالات وجودی نے ایک مقام معلوم و مکان محدود میں لا کر ٹھہرائے گئے ہیں جہاں سے آگے بڑھنا ان کی فطرت کے خلاف ہے ان کا دامن ہستی مزید ترقی کے امکان و استعداد سے خالی ہے۔ اور اسی عجز و نقص کا احساس ان کو مخلوق انسانی کی ارتقائی شان کی طرف بنظر حسرت مڑ مڑ کے دیکھنے پر مجبور رہتا ہے۔ مقام انسانیت کو منزل ملکیۃ پر جو تفوق حاصل ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے یہ ارشاد ربانی کافی ہے۔ اولیک الذین ید عون یبتغون الی ربھم الوسیلۃ ایھم اقرب۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں یہ تو پکارتے ہیں اور وہ خود اپنے پروردگار کے حضور میں تقرب حاصل کرنے کے لیے وسیلہ ڈھونڈھتے ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ قرب باری رکھنے والا ہے"۔

اس جماعت کے مقابلہ میں دوسرا گروہ وہ ہے جو انسانیت اور اس کا کمال مادی اسباب میں منحصر تصور کرتا ہے۔ اس کی غلط بین نگاہوں میں انسان اور کامل انسان وہی ہو سکتا ہے جس کے پاس زر و جواہر کی کثرت مال و اسباب حشم و خدم کی فراوانی زخارف دنیوی کی افراط ہو اس گروہ کی پرواز تخیل مادیت کی فضا سے باہر نہیں ہو سکتی وہ زر و جواہر کے خزائن عامرہ و اطلس و زربفت کے ملبوسات فاخرہ سر بفلک عمارتوں اور پر تکلف غذاؤں کے مہیا کرنے میں اپنی روحانی و جسمانی قوتوں کا قدرتی سرمایہ صرف کرتا ہے اور یہی اس کے نزدیک معیار انسانیت اور معراج کمال انسانی ہے اور بس۔ اسی قسم کا نظریہ رکھنے والے الٰہی منصب داروں کی حقانیت و سچائی تسلیم کرنے سے اس بنا پر انکار کرتے تھے کہ وہ مالی وسعت نہیں رکھتے تھے۔ سونے کے کنگن موتیوں کے ہار اور ملبوسات فاخرہ سے آراستہ و پیراستہ نہیں ہوا کرتے تھے جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

"جناب موسیٰ و ہارون علیہ السلام فرعون کے باہر آئے بالوں کا لباس پہنے اور عصا ہاتھ میں لیے ہوئے تھے انھوں نے فرعون سے وعدہ کیا کہ اگر اسلام قبول کر لے گا تو اس کا ملک باقی اور اس کا اعزاز برقرار رکھا جائے گا فرعون نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ان دونوں کی باتوں پر متعجب نہیں ہوتے یہ لوگ مجھ ہی سے بقائے ملک و عزت کا وعدہ کر رہے ہیں حالانکہ ان کی فقیری و ذلت کی جو حالت ہے وہ تم خود ہی دیکھ رہے ہو کیوں نہ ان کو خدا کی طرف سے سونے کے کنگن عطا کیے گئے فرعون کا یہ کلام اس لیے تھا کہ سونے اور اس کے جمع کرنے کی عظمت اس کی نگاہوں میں تھی اور لباس صوف کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔
(نہج البلاغہ)

---

(۱) ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو خدا کی تسبیح حمد نہ پڑھتی ہو مگر تم ان تسبیح کو نہیں سمجھتے۔
(۲) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جتنے مخلوقات آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور پروں کو پھیلا کر اڑنے والے پرند سب کے سب کارگزار اور تسبیح خوان ہیں اپنی اپنی نماز اور اپنی اپنی تسبیح کو خوب جانتے ہیں۔

ایسے عرفائے الٰہیین ہر زمانہ میں کم ہوا کرتے ہیں جن کو حقیقت انسانیہ کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہو اور جو اس حقیقت کے عارف ہوتے ہوں کہ صورۃ انسانیۃ اعظم صحیح الٰہیہ و خلاصہ کائنات مجموعہ موجودات و نقطہ اتصال عوالم روحانیہ و جسمانیہ و مقام ارتباط تجرد و مادیۃ و صدرۃ المنتہیٰ معراج جمادیۃ و نباتیۃ و حیوانیہ بنائی گئی۔ وہ مختلف آثار پیدا کرنے والی قوتوں یعنی بہیمیۃ و سبعیۃ و شیطانیہ و ملکوتیۃ و ربوبیۃ کا ایک حیرت انگیز مجموعہ ہے ان چار قوتوں میں سے قوت ملکوتیہ، ربوبیۃ انسان کو مظہر اخلاق الٰہیہ و آثار و اوصاف ربانیہ بننے کا امکان عطا کرتی ہے اور وہ اس کے ذریعہ سے علم و عمل اپنے خالق سے مشابہت و مناسبت حاصل کر سکتا ہے۔

جب عالم اصغر یعنی وجود انسانی میں اس قوت ملکوتیہ ربوبیۃ کی ریاست و حکومت قائم ہو اور باقی قوی اس کے محکوم و فرماں بردار ہو کر اس کی معین کردہ حدود میں اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہوں تو اس صورت میں فضائل و کمالات و سعادات کے وہ بلند ترین درجات قائم ہوتے ہیں جہاں تک پہونچنے سے ملکیۃ بھی عاجز ہو جاتی ہے اور انسانیت کا صحیح مفہوم و مصداق اور مقصد تکوین عالم پورا ہو جاتا ہے۔

چونکہ انسان خود شناسی سے محروم تھا اپنی ہی معرفت کنہ ذات اس کو میسر نہ تھی مفہوم انسانیت کا تصور اس کے لیے مشکل اور قوۃ ملکوتیہ ربوبیۃ کو سرگرم عمل بنا کر انسان حقیقی بن جانا اس کے لیے مشکل تو تھا اسی لیے صانع حکیم و رب الکریم نے ایسے اعلیٰ نمونے بنی آدم کے پاس بھیجے جو خود کامل ترین انسان تھے۔ اور ناقص افراد کو کمال انسانی کی بلندیوں تک پہونچانے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ انبیا و رسل کی بعثت اور اولیاء و اوصیا کے تقرر کی علت غائی اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ اپنے اقوال و اعمال حرکات و سکنات سے انسانیت کا مکمل نمونہ بنی نوع انسان کے سامنے پیش کریں اور ان کو کامل انسان بن جانے کی سبیل بتائیں اور وہ صراط مستقیم جس پر منزل انسانیت تک پہونچنے کے لیے وہ خود چلتے تھے اور دوسروں کو اس پر چلنے کی قولی و فعلی دعوت دیتے تھے "اسلام" سے تعبیر کی جاتی ہے۔

اگر نظرِ عقل کو حقائق کی گہرائیوں تک پہونچنے کا موقع دیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام عالم امکان کے ہر موجود میں کارفرما ہے مخلوقات سماوی ہوں یا ارضی سب کے سب حلقہ بگوش اسلام نظر آتے ہیں اور اس اسلام کا حقیقی مفہوم بھی ہے کہ شے اپنی فطرت اصلیہ پر قائم اور حقیقت فطریہ پر ثابت رہ کر ان خواص و آثار و اوصاف کو ظاہر کرنے والی ہو جو اس کے ایجاد و تکوین کا مقصد اصلی ہوں اسی معنی سے "اسلام" دین فطرت ہے جو عالم شہود کے ذرہ ذرہ میں جاری و ساری ہے "وله اسلم من فی السموات والارض" کوئی موجود علوی یا سفلی ایسا نہیں جو اپنی حقیقت سے ناآشنا، اپنی فطرت سے غافل اور اپنے خواص ذاتیہ و آثار فطریہ کے اظہار سے قاصر رہتا ہو یہ کمزوری فقط انسان کے لیے مخصوص ہے کہ خود اپنی ہی حقیقت کے پہچاننے سے عاجز رہتا ہے اور اگر اس کو عارف حقیقت ہونا میسر بھی ہو جائے تو علمی حیثیت سے انسانیت کا مصداق حقیقی بننا اس کے لیے دشوار تر رہتا ہے اور جس طرح وہ مفہوم انسانیت کے صحیح طور سے عاجز اور عملی طور پر مصداق انسانیت بننے سے عاجز رہتا ہے۔ اسی طرح وہ اسلام حقیقی کے صحیح تصور اور حقیقی معنوں میں "مسلم" بننے سے عاجز رہتا ہے کیونکہ حقیقت انسانیت و کنہ اسلام اصل میں دونوں ایک ہیں جو مسلم حقیقی ہو گا وہی انسان حقیقی بھی ہو گا جس طرح انسان نہ صرف روح کا نام ہے اور نہ فقط جسم کا بلکہ وہ ان دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اور انسانیت کا تعلق جنبۂ روحانیت و جسمانیت دونوں سے ہے روح افعال روح کے ساتھ ساتھ اعضاء جو روح بدنی و آلات جسمانی کو بھی انسانیت حقیقیہ کے مستحق ہونے میں خاص دخل ہے اسی طرح اسلام کا تعلق بھی روح، بدن دونوں سے یکساں ہے جب تک روح و بدن دونوں میں اتحاد و عمل نہ ہو گا اسلام حقیقی کا وجود نہیں ہو سکتا اسلام فقط صورۃ خیالیہ و کیفیۃ نفسانیہ یا عقیدہ قلبی کا نام نہیں ہے بلکہ اعضاء و روح جسمانیہ کو اسلام کے اسم و مسمی سے خاص تعلق ہے جبتک وہ مصروف عمل نہ ہوں گے حقیقت اسلام کا وجود ممکن نہ ہو گا جناب امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے۔

میں اسلام کی حقیقت اس طرح بیان کروں گا جیسی مجھ سے بیشتر کسی نے بیان نہ کی ہو گی اسلام تسلیم اور تسلیم یقین ہے اور یقین تصدیق خدا و رسول ہے اور تصدیق اقرار ہے اور اقرار نام ادا کا ہے اور ادا عمل ہے۔ لہٰذا اسلام عمل کا نام ہے اور عمل ہے اس کی حقیقت۔

اگرچہ یہ تمہید کافی طویل ہو گئی مگر جن حقائق کی طرف ناظرین کو زحمت التفات دی گئی ہے۔ ان سے اس سوال کا جواب کی راہیں بالکل صاف ہو گئی ہیں کہ حسینؑ انسان کو کیا بتلا گئے؟ کربلا کے یادگار زمانہ معرکہ حق و باطل میں حقیقت اسلام و علم انسانیت امام حسینؑ کی جنگ جارحانہ تو کیا جنگ مدافعتی و حفاظتی بھی کہی جا سکتی کیونکہ حملہ آور کی طرح مدافعت کرنے والا حسب ضرورت و بقدر اختیار اسباب مدافعت و محافظت فراہم کرنے میں کمی نہیں کرتا وہ اپنے ہمدردوں اور مددگاروں کی بڑی سے بڑی جماعت اور حربی ساز و سامان کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب مدافعت کر سکے اور جو موانع کامیاب مدافعت و محافظت میں مشکلات پیدا کرتے ہیں ان کو مٹانے کی جد و جہد کرتا ہے ہر ممکن تدبیر سے لوگوں کو فتح و کامرانی کا یقین دلا کر جذبات نصرت کو اُبھارتا اور ہمتوں کو بلند کرتا ہے۔ وہ اس قسم کی ہمت شکن خبریں نہیں سناتا کہ میں اپنے بچوں کو اس غرض سے لیے جا رہا ہوں کہ انکو مقتول دیکھوں اور اہل حرم کو اس واسطے لیے جاتا ہوں کہ قیدی بنائے جائیں۔ مگر حسینی سیاست اس معمول دُنیا کے بالکل برعکس تھی۔ اسباب مدافعت اور اعوان و انصار کی طاقتور جماعت فراہم کرنے کے عوض جتنے رفقا آپ کے ساتھ جمع تھے آپ ان کو بھی منتشر ہو جانیکی ترغیب دے رہے تھے اور قدم قدم پر انجام سفر کو واضح فرما رہے تھے کہ کوئی شخص آپ کے اصل مقصد سفر سے بے خبر نہ رہ جائے صرف وہی حق پرست و خدا شناس باقی رہ جائیں جن کے دلوں میں ہوس دنیا و طمع زندگی کا ایک نقطہ بھی موجود نہ ہو مکہ معظمہ سے روانہ ہونے سے پیشتر آپ نے ایک خطبۂ مبارک میں یہ صاف اعلان فرمایا۔

ترجمہ از عربی:۔ "اولاد آدم کی گردنوں میں موت کے پھندے کی لکیر اس طرح پڑی ہے جس طرح لڑکی کے گلے میں گلوبند کا نشان

ہیں اپنے بزرگوں سے ملاقات کا ایسا مشتاق ہوں جیسے یعقوب دیدار یوسف کے مشتاق تھے اور میرے لیے ایک قتل گاہ منتخب کرلی گئی ہے جہاں میں پہونچنے والا ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ صحراوی درندے میرے اعضاء جوارح کو جدا کرتے اور ان سے اپنی بھوک کی انتڑیاں اور پیٹ بھر رہے ہیں جو دن قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے اس سے مفر نہیں۔ ہم اہلبیت عصمت کی رضا وہی ہے جو خدا کی خوشنودی ہو ہم اس کے امتحان پر صبر کرتے ہیں اور وہ ہم کو صابروں کا اجر پورا پورا عطا کرے گا۔ جو شخص ہماری محبت کی راہ میں اپنی جان دینا چاہتا ہو اور لقاء الٰہی کے لیئے اپنے نفس کو مطمئن بنا چکا ہو وہی ہمارے ساتھ چلے میں صبح انشاءاللہ یہاں سے کوچ کردونگا۔ (نہج البلاغہ)

اس سے قبل مدینہ منورہ سے رخصت ہونے سے پہلے آپ نے ایک نوشتہ بنی ہاشم کے حوالہ فرمایا تھا جس میں مندرج تھا۔ اما بعد فانہ من لحق منکم استشھد .. .. عورتوں اور بچوں کا ساتھ حفاظتی و مدافعتی پہلو کو کمزور کردیتا ہے اور ایسی مشکلات میں انسان کو مبتلا کردیتا ہے جن سے وہ کمزور اور دشمن قوی ہوجاتے ہیں عیال و اطفال کا ساتھ درحقیقت دشمنوں کی بہت بڑی مدد کرتا ہے۔ ایک شاعر عرب کہتا ہے۔

" البصفی بقری سیحبل یوم احلیت ۔ علینا الولا باو العدو المباسل " مگر حسینی طرز عمل یہ تھا کہ آپ نے تمام عیال و اطفال اور شیر خوار بچوں تک کو نینوا کے اُس چٹیل میدان میں لا کر جمع کردیا جہاں ٹڈی دل یزیدی افواج کا محاصرہ ہونے والا تھا جن اعزہ و احباب نے ہمدردی کے طور پر اس طرز عمل کے خلاف مشورہ دیا ان سے آپ نے فرمایا یہاں تک کہ آخر وقت میں خون کے پیاسے انسان نما درندوں کے سامنے اپنے شش ماہہ بچے کو ماں کی آغوش سے جدا کرکے پیش کردیا پھر کیا حسینی جہاد کے متعلق کسی ایسے عقلمند کو جو حالات و واقعات سے نتائج حاصل کرنے پر قدرت رکھتا ہو جہاد حسینی پر جنگ جارحانہ و کیا حفاظتی و مدافعتی جنگ کا بھی شبہ ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ممکن ہے کہ کسی پست نظر و محدود خیال شخص کیلیئے میرا یہ دعویٰ باعث تعجب و تحیر ہو اور اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ کھٹک پیدا ہو کہ میں حسینی جہاد کو جارحانہ تو کیا مدافعتی و حفاظتی جنگ بھی نہیں کہتا حالانکہ عموماً انسانی لڑائیوں کے یہی دو پہلو اور مقصد ہوا کرتے ہیں مگر واقعات و حقائق پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے والے اس نتیجہ تک پہونچ سکتے ہیں کہ جناب سید الشہداء کا مقصد نہ یزیدی خلافت و حکومت پر حملہ کرنا تھا اور نہ اپنے ازلی دشمنوں کے مقابلہ میں جان و مال عزت و ناموس کی عزت سے مدافعت مقصود تھی بلکہ حضرت کے پیش نظر ایک ایسا مقصد جو ان دونوں سے ارفع و اعلیٰ تھا اور جس کو آپ نے وصیت نامہ کے طور پر لکھ کر اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے حوالہ کردیا تھا۔

ترجمہ از عربی :- " مفصل وصیت نامہ بعد حمد و ثنا اظہار اعتقاد توحید و رسالت و معاد یہ ہے کہ بتحقیق میں نہ کسی غرور و گھمنڈ سے چلا ہوں اور نہ فساد و ظلم کے لیئے جاتا ہوں میرے سفر کا مقصد اور مدینہ سے نکلنے کی غرض جد بزرگوار کی امت کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں میں چاہتا ہوں کہ نیکی کی ہدایت کروں اور بدی سے روکوں اور اپنے نانا اور باپ کی سیرت پر چلوں پس جو شخص میری ہدایت کو قبول کرے گا حق کے لیئے تو خدا اس کو حق کی جزا عطا کرے گا اور جو میری ہدایت کو رد کرے گا تو صبر اختیار کروں گا اور میرے اور اس کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے گا وہ بہترین حکم اور فیصلہ کرنے والا ہے "

اس وصیت نامہ کا ایک ایک لفظ جناب سید الشہداء کے حقیقی زاویہ نظر اور واقعی نصب العین کا آئینہ موجود ہے اس کو بنظر اعتبار دیکھنے والے اس میں شبہ ہرگز نہیں کرسکتے کہ حضرت کے سامنے جو اہم تھی وہ صرف یہ تھی کہ اسلامی دنیا کو سیرت نبویہ و علویہ یعنی صحیح انسانیت اور حقیقی اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور اس مطلب کے حاصل نہ ہوسکنے کی صورت میں نہ صرف شہادت بلکہ لاثانی مظلومیت و قوت صبر و برداشت کا عدیم المثال مظاہرہ کیا جائے سیرت پیغمبر و روح اسلام و جوہر انسانیت کا اثر دنیا میں باقی رکھنے کے لیئے اپنی ساری بضاعت کی قربانی پیش کردی جائے۔ کمسن بچوں جوانوں اور بوڑھوں کی ایک مختصر فوج ترتیب دی جائے جس کا ہر سپاہی روح انسانیت کا پرستار اور شمع اسلام کا جانباز پروانہ ہو اور ان کی سرفروشیوں کے ذریعہ دین الٰہی کی بنیادی خصوصیات اس طرح عریاں کردی جائیں کہ مصنوعی اسلام سے

کبھی بھی مشتبہ نہ ہونے پائے اور حسینؑ نے اس مقصد میں جیسی کامیابی حاصل کی اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ عالم میں موجود نہیں ہے حسینؑ کا فخر ومباہات سے یہ فرمانا کہ میرے ایسے اصحاب میرے جد عالی مقدار و پدر بزرگوار کو بھی نہیں ملے۔ بالکل حق بجانب تھا حسینؑ ایک ایسے عہد میں زندگی بسر کر رہے تھے جس میں مادی و شیطانی جذبات کی حکومت مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں کی دنیا میں قائم ہو چلی تھی اصول خلافت سازی جن کو جوہر انسانیت و جوہر اسلامیت سے کچھ لگاؤ نہ تھا دینی اصول و قوانین کے ذیل میں جگہ پا چکے تھے جماعتی استبداد کو اجماع و شوریٰ کا خود ساختہ نام دے کر اسلام کا مقدس آئین قرار دے دیا گیا۔ امراء و حکام کا ہر قول و فعل نبوی سیرت کے برابر بلکہ عملی طور پر اس سے زائد واجب الاتباع متصور ہوتا تھا اسلامی حریت و اخوت و حسن دلی و ہمدردی کا مسلمانوں کے عملیات میں کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا تھا قریش اور دیگر قبائل عرب کے وہ جتھے جو بانی اسلام کے مقابلہ میں اسلام کی بیخ کنی سے عاجز رہ گئے تھے ظاہری اسلام کے بھیس میں اسلامی روحانیت اور حقیقی انسانیت پر غارت گری میں مصروف تھے جہل و نفاق جن مقاصد کو بدر و احد و خندق کی معرکہ آرائیوں میں حاصل نہ کر سکا تھا وہ اسلام کے پردہ میں توقع سے زیادہ حاصل کئے جا رہے تھے۔ حضرت رسالتمآبؐ کی صحبت میں بیٹھنے والے خواہ انکی صحبت نشینی کی نوعیت اور غایت و غرض کچھ بھی ہو دنیائے اسلام کے چپہ چپہ پر پھیلے ہوئے تھے و مسلم عوام خوش عقیدگی کے جوش میں ان کو پیغمبری سیرتوں کا حامل اور اسلامی دیانت کا علمبردار تصور کرتے تھے ان کا ہر قول و فعل اسوہ حسنہ پیغمبر اور روح عدالت و دیانت سمجھا جاتا تھا نام نہاد خلافتیں اور ان کی پشت و پناہ اور وہ خلافتوں کی بنیادوں کو استوار و مستحکم بنانے والے تھے امرا کا طرز عمل خواہ کتنا ہی اسلام کش و انسانیت سوز کیوں نہ ہو صحابہ نبیؐ کی اخلاقی و عملی ہمدردیاں بہرحال ان کو حاصل تھیں انکا علانیہ ظلم و جور و فسق و فجور بھی ان علمبرداران اصحابیت کے جذبہ اسلامی میں اضطرابی کیفیت پیدا نہ کر سکتا تھا وہ بہر صورت انکے وفا کیش و خیر اندیش تھے ان کی عدالت و تقدس کی چیتونوں پر کسی حالت میں بھی بل آجانا دشوار تھا انجام کار یہی ہوا کہ جو جماعتیں اسلام کے ابتدائی دور میں فنا کرنے سے عاجز رہ گئی تھیں وہ بعد جناب رسولؐ رفتہ رفتہ اس کی اصلی صورت اور بنیادی خصوصیات کو متغیر کرا دینے میں کامیاب ہو گئیں اور ان کی تمام کامرانیوں کی ذمہ دار دراصل صحابہ کی وہ کثیر تعداد تھی جس کو جاہل عوام کے عقاید و خیالات و جذبات پر پورا قابو حاصل تھا وہ لوگ اپنی روش کو اسلامی اصول اور نبوی سیرت تسلیم کرا سکتے تھے حقیقی اسلام اور سچی انسانیت کی جگہ ان بدعتوں نے لے لی تھی جو نفسانی خواہشوں یا تعلیمات اسلام سے جہالت کی پیداوار تھیں۔ جناب امیرؑ اپنے عہد تک کے قضاۃ و رواۃ احادیث کے حالات بیان کرتے ہوئے آخر کلام میں فرماتے ہیں:

ترجمہ از عربی:۔ خدا سے میں ان لوگوں کا شکوہ کرتا ہوں جو جیتے ہیں جہالت میں اور مرتے ہیں ضلالت و گمراہی میں کوئی جنس ان کے بازاروں میں کتاب خدا سے زیادہ ناقص و بے قدر نہیں ہے جبکہ وہ ٹھیک پڑھی جائے کوئی تحریف اس میں نہ کی جائے اور کوئی جنس اُن کے نزدیک قابل خریداری اور گراں قیمت کتاب خدا سے زیادہ نہ ہوگی جبکہ اس کو حقیقی مواضع سے منحرف کر دیا جائے اور معانی و مطالب حسب اغراض ذاتی بنائے جائیں اُن کے نزدیک نیکی سے زیادہ بُری۔ اور برائی سے زیادہ اچھی کوئی چیز نہیں ہے!! (نہج البلاغہ)

ترجمہ از عربی:۔ "دوسرا وہ شخص ہے جو عالم بنتا ہے مگر علم سے اس کو واسطہ نہیں کچھ جہالتیں جاہلوں سے اور کچھ گمراہ کن باتیں گمراہوں سے حاصل کر لی ہیں اور عوام الناس کے لیئے دھوکے کی ٹٹی کھڑی کر دی ہے اور فریب کا جال بچھا دیا ہے۔ کتاب خدا کو اپنی رایوں پر محمول کرتا اور حق کو اپنی نفسانی خواہشوں کی طرف پھیرتا ہے کہتا تو یہ ہے کہ میں شبہات میں توقف کرتا ہوں حالانکہ شبہات ہی میں پڑا ہوا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں بدعتوں سے دور رہتا ہوں حالانکہ بدعتوں ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہے صورت اس کی انسان کی مگر دل کمینوں کا ہے" (نہج البلاغہ)

ناظرین ان ارشادات کو دیکھکر اس کا اندازہ بآسانی کر سکیں گے کہ جب عہد جناب امیرؑ تک اسلامی دنیا میں وہ حالات پیدا ہو چکے تھے جن سے خالص اسلام کی ہستی خطرات میں مبتلا تھی تو اس کے بعد جبکہ امویہ کا تسلط انتہائی عروج پر پہونچ گیا تھا۔

اسلام کس دور انقلاب میں آگیا ہوگا جناب سرورعالم کی وفات حسرت آیات کے بعد جو انقلاب در عمل شروع ہوا اس نے رفتہ رفتہ ارتقائی منزلیں طے کرکے امویہ و یزیدیہ کی صورت اختیار کر لی انسانیت روپوش ہو گئی بہیمیت و حیوانیت و شیطانیت کا تسلط قائم ہو گیا روح دیانت اسلامیہ کچل دیگئی دین کی آڑ اور مذہب کے پردہ میں حیوانی و شیطانی اغراض حاصل کی جانے لگیں۔ امراء و خلفاء کے انسانیت سوز و اسلام کش افعال کے خلاف کسی صدائے احتجاج کے بلند ہونے کا امکان باقی نہیں رہ گیا تھا کیونکہ ان کی حکومتیں بھی انھیں اصول کے ماتحت قائم ہوئی تھیں جو بعد عہد رسالت ایجاد کئے گئے تھے اور وہی اجماع ساز و شوریٰ نواز و غلبہ پرست صحابہ کی جماعتیں جو ابتدائی دور خلافت سے حل و عقد کی ذمہ دار تھیں امویہ و یزیدیہ کی بنیادوں کو مستحکم کر رہی تھیں۔ تو مسلم عوام ظاہری شعائر اسلامیہ و مراسم دینیہ کے علاوہ حقیقت اسلام پر مطلع نہ ہو سکے تھے اور وہ ان اہل حل و عقد کی شہرت تقدس و عدالت سے مرعوب تھے ان کے مذہبی عقائد و جذبات کو اپنے موافق مقصد سانچوں میں ڈھالنے پر ان فرضی فضائل و مناقب کے مالک مقدسین و عادلین کو پوری قدرت حاصل تھی اور عوام کو یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ ہر وقت پیغمبرؐ کا جانشین ہے صاحب امر ہے جس کی اطاعت واجب ہے اس کی کسی روش پر نکتہ چینی اور کسی طرز عمل کے خلاف احتجاج بغاوت و خروج از اسلام ہے بہر صورت اس کے ہاتھوں متاع ایمان کو فروخت کر دینا ہی حقیقی اسلام ہے۔ یزیدیہ جو امویہ کا آخری درجہ کمال تھی اپنے پورے جاہ و جلال و ہمہ گیر اقتدار کے ساتھ انسانیت سوزی اسلام کشی۔ شیطنت و حیوانیت نوازی میں مشغول تھی دیگر بلاد اسلامیہ کے علاوہ کوفہ و شام میں صحابہ و تابعین کی نوآبادیاں قائم تھیں ان کی بڑی سے بڑی مقدس و عادل ہستیاں یزید و ابن زیاد کے درباروں کی زینت بنی ہوئی تھیں ان میں سے کسی میں اتنی حمیت نہ تھی کہ حاکم وقت کے خلاف عدم تعاون و ترک موالات کرتا یا ہلکی سی صدائے احتجاج بلند کر دیتا، اس عہد تاریک میں صرف حسینؑ کی ایک بلند ترین شخصیت ایسی تھی جس کی طرف روح اسلام و انسانیت مڑ مڑ کر بنظر حسرت دیکھ رہی تھی اگر یہ با حمیت و صاحب غیرت و عالی ہمت شخصیت بھی صحابہ و تابعین ہی کی حکمت عملی اختیار کر لیتی اور اس کا معیار ذہنیت بھی وہی ہوتا جو صحابہ و تابعین نے قبول کر لیا تھا۔ تو اسلام و انسانیت کا عالم سے استیصال کلی ہو جاتا اور اسلام و یزیدیہ میں تفرقہ و امتیاز کی کوئی صورت باقی نہ رہ جاتی اسلام یزیدیہ ہی کا دوسرا نام قرار پا جاتا۔ ان تمام حقائق و واقعات کو بچشم بصیرت دیکھنے والوں کے لیئے اس سوال کا جواب دشوار نہیں رہ سکتا کہ "حسینؑ انسان کو کیا بتلا گئے"

حسینؑ نے اسلام اور انسانیت کا صحیح معیار بتلایا مفاد نوعی اور اجتماعی پر مفاد شخصی کو قربان کرنے اور نفسانی خواہشوں پر رضائے خداوندی کو مقدم رکھنے کی لازوال مثال پیش کی خالص بہیمی و شیطانی طاقتوں کی دہشت انگیزی و سفاکی و ہیبت ناکی کے مقابلہ میں غیر متزلزل عزم و ہمت کے ساتھ فداکاری و قربانی پیش کرنا اور ہر قربانی کے بعد رنگ رخ کے نکھرنے اور مسرت و اطمینان کی لہروں کے موج کا محیر العقول منظر دکھلایا کہ۔

رحم۔ ہمدردی۔ عفو کرم۔ غیرت قومی۔ حمیت دینی۔ عزت نفس۔ حریت۔ ایثار۔ علو ہمت تسلیم و رضا وغیرہ اخلاق اسلامی و خصائص انسانیت کی تعلیم دی ہوا و ہوس نفسانی کے تاریک گردابوں میں ڈوبتے ہوئے سفینہ اسلام کو بچانے اور اسلام کا جاہلیت کے ہاتھوں دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کرنے کا طریقہ سکھلایا اور اس حقیقت کو ناقابل اشتباہ بنا دیا کہ اسلام حقیقۃ کا زاویہ نظر رائج الوقت اسلام سے بالکل مختلف ہے۔ دین اسلام کو نفس پرستی و ہوس رانی سے کچھ بھی علاقہ نہیں اس کی عظمت و برتری و حقانیت کا معیار اور عروج انسانی کا ذریعہ دہشت انگیز عسکریت۔ وسیع ملکی فتوحات۔ اموال غنیمت سے بھرے

ہوئے خزانے نہیں بلکہ اُس کے اعلیٰ نظریات اور پاک اخلاق و عملیات ہیں۔ اسلام کی قوت اور شوکت کا راز نام نہاد مسلمانوں کی ہمدردی کثرت اور مادی اسباب کی فراوانی میں مضمر نہیں ہے بلکہ دلائل صحیح و براہین کی قوت اس کی عظمت کا اصلی معیار ہیں جناب حبیب بن مظاہر نے اہل کوفہ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

مادی اسباب کی طاقت سے بسیط ارض پر دنیوی جبروت و جلال کا سکہ بٹھا دینے کو معیار عروج انسانی و ارتقائے اسلامی تصور کرنے والے کچھ بھی سمجھتے رہیں۔ نگاہ عبرت کے سامنے اُن کی خیالی ترقیاں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ بصیرت والے جب بھی متوجہ ہوتے ہیں تو ان کو وہی ترقیاں تنزل انسانیت کا آخری نقطہ اور انحطاط اسلام کا پست ترین درجہ دیانت و روحانیت کا انتہائی مرتبہ نظر آتی ہیں اور ان کی نگاہوں میں یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام کی عظمت و برتری اور انسانیت کے عروج و سربلندی کا مکمل ترین نمونہ وہی تھا جو حقیقت اسلام و روح انسانیت حسینؑ اور اولاد حسینؑ نے پیش کیا اور انھیں کا اسوۂ حسنہ اسلام و انسانیت کا بلند ترین معیار ہو سکتا ہے اور بس۔

(محرم سنہ ۱۳۶۱ھ)

بقیہ صفحہ ۱۲۰

پھاٹکوں پر لٹکا یا گیا، آج اس کے متعلق اسلامی مورخ مختلف اقوال پیش کر رہے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مدینہ میں جنت البقیع میں دفن کیا گیا (تذکرۂ خواص الامۃ) بعضوں کا خیال ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ فرق مبارک اموی خزانہ میں پایا گیا جس کو شہر دمشق کے باب الفرادیس میں دفن کیا گیا۔ (تاریخ البلاذری و اخبار الاول و آثار الاول علامہ ابی العباس احمد الدمشقی القربانی)

اکثر مورخین یہ کہتے ہیں کہ حضرت کا فرق مبارک جو دمشق کے باب الفرادیس میں دفن کیا گیا تھا اس کو خلفائے مصر نے ابتدا میں شہر عسقلان میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کے بعد عسقلان سے نکال کر مصر میں لے جا کر قاہرہ میں دفن کیا اور اس پر عمارت تعمیر کرائی جو "مشہد راس الحسینؑ" کے نام سے مشہور ہے (فواتح الانوار علامہ شعرانی، الخطط و الآثار علامہ مقریزی) لیکن علامہ عبد الدین عمر الوراق اپنے مقتل میں لکھتے ہیں کہ یزید پلید نے حضرتؑ کے سر اطہر کو عثمان کے سر کے عوض میں آل ابی معیط کے پاس بھیج دیا تھا جو دریائے فرات کے کنارے شہر رقہ میں رہتے تھے جس کو ان لوگوں نے دفن کر دیا تھا اور جس پر بعد میں مسجد تعمیر ہوئی۔ مگر باوجود تاریخی اختلاف کے "شیعہ" ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث سے استدلال کرتے ہوئے اس امر پر متفق ہیں کہ فرق مبارک جسد اطہر کے ساتھ کربلا میں دفن ہوا۔ یہی قول اہلسنت کے اکثر علمائے روحانیین کا بھی ہے۔

قال المناوی فی طبقاتہ ذکر لی
بعض اھل الکشف والشھود انہ حصل لہ
الاطلاع علی انہ دفن مع الجثۃ بکربلاء
(طبقات علامہ مناوی)

علامہ مناوی کتاب طبقات میں لکھتے ہیں کہ اکثر اہل کشف و شہود نے ان سے اس کا تذکرہ کیا کہ انکو اسکا علم ہے کہ فرق مبارک امام حسینؑ کربلا میں جسد اطہر کے ساتھ دفن کیا گیا۔ (محرم نمبر سنہ ۱۳۵۶ھ)

کربلا کا قیامت خیز واقعہ

(از عالیجناب حجۃ الاسلام سرکار شریعت مدار شمس العلما نجم الملۃ مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ مجتہد اعلی اللہ مقامہ)

کربلا کا قیامت خیز واقعہ جس طرح دنیا کے تمام دلخراش واقعات میں سخت و شدید تر ہے اور اس کی نظیر اولین و آخرین کہیں نظر نہیں آتی، اسی طرح حق و باطل کے امتیاز و تفرقہ کا اعلیٰ سے اعلیٰ ذریعہ بھی ہے، صفوف متقابلہ میں ایک جانب ایمان و خلوص و نورانیت و حقانیت کی تصویریں اور تسلیم و رضا و ایثار و تقرب کے نمونے اور دوسری جانب نفاق و الحاد و شقاوت و قساوت اور بہیمیت و سبعیت اور نفس پرستی و خدا فراموشی ہر طرف محیط۔ اگرچہ حسین مظلوم لا لشکرا مع رفقا و اصحاب درجۂ شہادت پر فائز ہوئے، اور یزیدی لشکر اپنے زعم میں فتحیاب ہوا لیکن درحقیقت حضرت سید الشہدا حق و باطل میں ایسا زبردست خط فاصل کھینچ گئے کہ تا قیامت یہ امتیاز خلل پذیر نہیں ہو سکتا، اسے دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ میدان کربلا میں جو جیش موجود اور متبعین حق و باطل کی صفوف متقابلہ نصرت دین اور نصرت ضلال میں مصروف ہیں مقتضائے زمانہ کے مطابق ہر جانب اہتمام ہوتا رہتا ہے لیکن یقین کر لینا چاہیے کہ باطل کو کتنا ہی عروج ہو جائے اور ظلم و جور کسی حد تک بھی معلوم ہو جائے لیکن فتح و نصرت و غلبہ حق ہی کے لیے ہے اور شہید دشت کربلا کی مظلومیت کی زبردست تاثیر سرکشوں اور غداروں کو بالآخر ذلیل و خوار و نیست و نابود کر کے دنیا کو عدل و داد سے ضرور بھر دے گی، رسول خدا کے اس مظلوم نواسے اور خاندان رسالت سے جن قلوب میں اب تک مخالفت کا جوش ہے اور دشمنان اہلبیت اور قاتلان شہدائے کربلا کی حمایت و طرفداری میں ہر امکانی کوشش سے دریغ نہیں کرتے وہ خوب سمجھ لیں کہ انھیں ذلت نصیب ہوگی اور خدا و رسول کی بیزاری کے سوا انھیں کچھ نہ ملے گا،

(محرم نمبر ۱۳۴۵ھ)

حسینؑ منی وانا من الحسینؑ

سید معجز حسن صاحب بی اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ
سابق آنریری سکریٹری سرفراز مینیجنگ بورڈ

یہ کلام ختمی نبوت دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک حسینؑ منی اور دوسرا انا من الحسینؑ، لفظی معنی یہ ہیں کہ میں حسینؑ سے ہوں اور حسینؑ مجھ سے ہیں، بلکہ ترتیب کے لحاظ سے یہ کہنا چاہیے کہ حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ سے ہوں، اس ترجمہ سے بات سمجھ میں نہیں آتی، حسین منی" کے معنی اگر یہ لیے جائیں کہ جسمانی تعلق کا اظہار مدنظر ہے تو اس میں دو امر شبہ کے پائے جاتے ہیں، جسمانی رابطہ امام حسین علیہ السلام کو رسالتمآب صلعم سے یہ تھا کہ ان کے نواسے تھے، پس یہ اولاد کے معنی لینا بین طور پر غلط معلوم ہوتا ہے، امام حسینؑ ہی اولاد رسولؐ تھے، اور امام حسینؑ کا ذکر خاص طور پر ان لفظوں سے

کرنا بے سود ہے، کوئی تخصیص ذات امام حسینؑ کی نہیں نکلتی، دوسرے یہ کہ من کے ربط سے تعلق جسمانی کا اظہار اس سبب سے بھی بیجا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عکس صحیح نہیں ہے وہی لفظ من دوسرے جز میں بھی ہے، یعنی انا من الحسینؑ، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اولاد کے معنی نہیں لیے جا سکتے، کوئی ایسے معنی ہونے چاہئیں جس سے کوئی خصوصیت امام حسینؑ کی نکلے، اور اس پر کوئی اعتراض بھی وارد نہ ہو، خیال اس طرف جاتا ہے کہ رابطہ روحانی مراد ہے،

یعنی مقصد رسالتمآبؐ یہ تھا کہ حسینؑ میں وہ صفات موجود ہیں جو میری ذات میں ہیں اور میرا بقائے وجود حسینؑ سے ہے، ظاہر ہے کہ وجود سے مراد یہاں مادی وجود نہیں رہ سکتا، بلکہ وجود روحانی ہے، یا یوں کہئے کہ مراد بقائے نبوت ہے یا تکمیل نبوت کہہ لیجیے، خلاصہ کلام رسولؐ یہ ہوا کہ تکمیل رسالت امام حسینؑ سے ہوئی،

اب ذرا غور کیجیے کہ کلام ربانی کی جرت ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ نبی "ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ"

اگر اس آیت کے معنی محدود بھی رکھے جائیں یعنی ہر کلام رسولؐ کے معنی پر وحی نہ بھی مانا جائے تو اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ ہر امر . . . . . . ہدایت کے متعلق یہ حکم ربانی ضرور ہے، باری تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے نبی کے احکام کی بابت یقین دلاتا ہے کہ وہ احکام ہمارے ہی احکام ہیں البتہ زبان نبی کی ہے،

لہذا قول خدا و رسولؐ مل کر ہم کو بتلاتے ہیں کہ رسالت کی متمم ذات حسینؑ ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی خصوصیات حسینؑ کو حاصل ہیں جن کے سبب سے وہ متمم رسالت قرار پائے، یوں تو جملہ ائمہؑ ایک طرح سے شریک رسالت کہے جا سکتے ہیں مگر ذکر مخصوص کے لیے کوئی وجہ ہونی چاہیے وہ تخصیصی امر واقعہ کربلا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ہے، اس میں گنجائش شبہ کی نہیں ہے، بلکہ بعد وفات رسالتمآبؐ اسلام کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اگر امام حسینؑ نے اپنی جان دینا اور اپنے رفقاء و اعزہ کو آمادہ شہادت ہو جانے دینا گوارہ نہ کر لیا ہوتا تو دین اسلام کا باقی رہنا ممکن نہ تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام مردہ ہو چکا تھا اس کا احیا ذات حسینؑ اور واقعہ کربلا سے ہوا جیسا کہ مولانا صفی مدظلہ العالی فرماتے ہیں ع

در اصل زندہ ہوا پھر حسینؑ کے دم سے
دگرنہ مٹ ہی چکا تھا یہ صحن عالم سے

دنیا میں واقعات ہزاروں ہوئے، بندگان خدا پر ظلم و ستم بھی ہوئے کشت و خون بھی ہوئے لیکن جو کچھ مصائب کربلا میں امام حسینؑ اور اُن کے رفقا پر پڑے ان کی نظیر تو کہیں اور کبھی بھی نہیں ملتی، سچ ہے کہ ع

حوصلہ تھا یہ جوانان حسینی کا فقط
ورنہ لاکھوں سے بہتّر کی لڑائی کیسی

حقیقت امر یہ ہے کہ ایسی لڑائیاں محض اخلاقی قوت سے لڑی جا سکتی ہیں، مادی نفع کے حصول یا مادی ضرر کے دفع کے لیے کوئی گروہ ایسی ہمت نہیں دکھا سکتا، اگر خطرہ فنائے اسلام سامنے نہ ہوتا اور یزید کی بدکاریاں اخلاق نبوی کا خاتمہ کر دینے کے قریب نہ ہوتیں تو کربلا میں بھی شاید یہ منظر نظر نہ آتا، نہ امام ہی اس کشت و خون پر آمادہ ہو جاتے، اور نہ اُن کے رفقا ہی ایسی بلند ہمتی کا ثبوت اور داد شجاعت دیتے ع

کارے کہ حسینؑ اختیار کردی
در گلشن مصطفےٰ بہار کردی
از ہیچ پیمبرے نیامد این کار
واللہ کہ اے حسینؑ کار کردی

۱۳۵۱ھ

"شہادت" اور "ہلاکت کے مفہوم میں جو فرق ہے وہ اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ زندگی کا مقصد کیا ہے اس لئے کہ جب تک مقصدِ حیات کی تعیین نہ کی جائے "یا مقصد موت" یعنی شہادت اور "خود اختیاری بے مقصد موت" یعنی ہلاکت کے الفاظ بے معنی رہیں گے

"انسان کا مقصدِ حیات کیا ہے ؟" یہ سوال ہمیشہ سے محلِ فکر و نظر رہا۔ مختلف زمانوں میں اس کے مختلف جوابات دیئے گئے اور مفکرینِ عالم اپنی اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف نتائج تک پہنچے۔ کسی نے کہا کہ مقصدِ حیات یہ ہے کہ "انسان کھائے پیے اور خوش رہے" کسی نے کہا کہ "دوسروں کی خدمت ہی اعلیٰ ترین نصب العینِ حیات ہے" کسی نے کہا کہ "تمام صلاحیتوں کی نشو و نما اور ارتقار اور اُن کا بروئے کار لانا مقصدِ حیات ہے" کسی کے نزدیک "یہ دنیا کچھ بھی نہیں ہے دوسری دنیا کی مسرتوں کو حاصل کرنا ہی اس دنیا کی زندگی کا مقصد ہے" کسی کے خیال میں "عزت، شہرت اور دولت ہی زندگی کا ماحصل ہے"۔ کسی کے نقطۂ نظر سے "زندگی ایک مصیبت ہے اور اس سے نجات پانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ آدمی مرجائے۔"

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام مختلف اصول جزوی حقیقت کے حامل ہیں اور انسانی فطرت کے کسی نہ کسی تقاضے کو پورا کرتے ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی اصول ایسا نہیں ہے جو انسان کے تمام تقاضوں کو پورا کرے:

کھانے پینے اور خوش رہنے کی خواہش جسے ابیقورس نے مقصدِ حیات قرار دیا ہے فطری خواہش ہے اور اُس کی اہمیت کا انکار ممکن نہیں ہے لیکن یہ محض ایک سیدھا سادا فلسفۂ حیات نہیں ہے۔ اُس کا فلسفہ "لذت پرستی" سے شروع ہو کر "ضبطِ نفس" پر منتہی ہوتا ہے اور نتیجۃً اچھا خاصا دشوار فلسفۂ اخلاقی عالمِ وجود میں آجاتا ہے۔

آخرت کو حیاتِ انسانی کا مقصد قرار دینے والے افراد بھی دنیا کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اور اگر زیادہ جانچ پڑتال کی جائے تو معلوم ہوگا کہ آخرت کے ماننے والے اس دنیا کی زندگی اور اُس کے تمام فطری تقاضوں کو اعتدال کے ساتھ پورا کرنے ہی کو نجاتِ اخروی کا باعث خیال کرتے ہیں۔ اس طرح محض یہ کہہ دینا کہ مقصدِ حیات دوسری زندگی میں مسرت حاصل کرنا ہے ناکافی ہے۔

اسی طرح عزت و شہرت کی خواہش بھی فطری خواہش ہے جس کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ عزت و شہرت ہی حاصل کرنے کی آرزو ہوتی ہے جو اوائلِ عمر میں انسان کو بڑے بڑے اُمور انجام دینے پر اکساتی ہے اور بعد میں وہ اُسے کبھی مصنف، کبھی مصلح اور کبھی قائد بنا دیتی ہے لیکن محض عزت و شہرت یا محض دولت و اقتدار ہرگز اس لائق نہیں کہ ساری زندگی اسی کے حصول کے لئے وقف کر دی جائے۔

زندگی کو مصیبت سمجھنے والے بھی زندگی کے محض ایک پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دے دیتے ہیں لیکن موت کی خواہش کے بعد بھی جو چیز زندہ رکھتی ہے اور مرنے سے روکتی رہتی ہے

وہ زندگی کی وہی مسرت اور جاذبیت ہے جسے وہ بالکل نظرانداز کردیتے ہیں۔

تاریخ فلسفہ سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر انسان کی فطرت کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اختلافِ خیال، اختلافِ مذہب اور اختلافِ ماحول کے باوجود انسانی فطرت میں یکسانیت ہے، اور ایک ایسا راستہ ہے جس پر ہر انسان فطرت کے ایک اٹل قانون کے ماتحت قہری طور پر چلنے کے لئے مجبور ہے۔

مختلف خیالات، مختلف طبائع اور مختلف مزاج کے انسانوں میں یکسانیت تلاش کرنے کے لئے ہمیں کوئی ایسا ہمہ گیر کلیہ دریافت کرنا ہوگا جو انسانی فطرت پر حاوی ہو تاکہ تمام انسانوں کے تمام افعال اُس کلیہ کے ماتحت آسکیں۔ انسانی فطرت کا تجزیہ اور انسانی محرکات کی تحلیل کے بعد ہم جس نتیجہ تک پہنچیں گے وہ یقیناً عملی زندگی میں تمام مابعدالطبیعیاتی اُصول سے زیادہ مفید ثابت ہوگا اور انسان اُس کشمکش سے بچ جائے گا جو اُس وقت پیش آتی ہے جب وہ کسی ایسے مسلک کا پیرو ہو جاتا ہے، جو اُس کی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوتا اور جس کے نتیجہ میں اُس کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ایک وہ حصہ جس کا تعلق اُس کے عقائد و تصورات سے ہوتا ہے اور جن کا وہ ہمیشہ اعلان کرتا رہتا ہے اور دوسرا وہ حصہ جس کا تعلق اُس کے عمل سے ہوتا ہے اور جسے وہ ہمیشہ دوسروں سے چھپاتا رہتا ہے۔ وہ ایسی باتوں پر ایمان رکھنے کا اعلان کرتا ہے جن پر وہ عمل نہیں کرسکتا اور ایسی باتوں پر عمل کرتا ہے جن کا وہ اظہار نہیں کرسکتا اور فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اندر ہی اندر اُس کے یہاں ایسے جراثیم پرورش پانے لگتے ہیں جو اُس کی اخلاقی زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کردیتے ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اس موضوع پر تفصیلی بحث کی جائے۔ اجمالی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان مسرت کا جویا ہے۔ زندگی کو ہم "مسرت" ہی کی بنیاد پر اللہ کی نعمت کہہ سکتے ہیں۔ اگر مسرت کا جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو انسان یقیناً موت کو زندگی پر ترجیح دے دیتا۔ مسرت ہی ہمارے ہر فعل کا محرک ہے، مسرت ہی شاہراہ عمل میں ہمارا ساتھی ہے، مسرت ہی ہمارا راہ نما ہے اور مسرت ہی ہمارا مقصدِ حیات!

اس کلیہ سے پست سے پست اور بلند سے بلند انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔

مقصدِ حیات پر غور کرتے وقت یہ امر پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ "مقصدِ زندگی" کی لفظ سے ہمارا تبادر ذہنی ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح "راستہ" اور "منزل" کے الفاظ سے ہوتا ہے یعنی پورا راستہ قطع کرنے کے بعد ہم جہاں پہنچیں گے وہ ہماری منزل ہوگی اور پوری زندگی ختم کرکے ہم جس نتیجہ تک پہنچیں گے وہ ہمارا مقصدِ حیات ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساری زندگی ہمیں جس مقصد کے حصول کے لئے صرف کردینا چاہیے وہ مقصد کیا ہے اور آیا ایسا کوئی مقصد ہے بھی یا نہیں؟ — اس سوال کا جواب صرف مابعدالطبیعیاتی فلسفہ ہی دے سکتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ زندگی کا یہ راستہ جسے ہم طے کرتے ہیں اس کا کوئی مقصد اس دنیا کی زندگی میں بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ کیا ہے اور کیا ہم اُسے نظرانداز کرسکتے ہیں؟ پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ مقصد ہمارے مابعدالطبیعیاتی عقائد کے ساتھ متصادم ہے یا ہم آہنگ؟

اگر دیانت داری کے ساتھ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی کا مقصد خود زندگی ہے۔ وہ لامحدود مقاصد کا مجموعہ ہے۔ اُس کا منتہیٰ خواہ موت ہو یا ابدی حیات لیکن اُس کا وجود خود ایک اہم مقصد کو پورا کر رہا ہے اور وہ مقصد ہے "کسبِ مسرت!"

بظاہر لذت پرستی کے فلسفہ کی طرح کسبِ مسرت کو زندگی کا ماحصل قرار دے دینا انسان کو اُس کی منزل سے پست بنا دینے کا مرادف نظر آتا ہے لیکن اس غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ "مسرت" کا تصور ہمارے ذہن میں ادھورا ہے، ہم نے اُسے محدود بنا دیا ہے جب ہم کہتے ہیں کہ مسرت ہی ہمارا مقصدِ حیات ہے تو ہر شخص کا تبادر ذہنی اُنھی مسرتوں کی طرف ہوتا ہے جن کو اُس نے منتخب کرلیا ہے یا جن کے دائرے میں اُس نے اپنی صلاحیتوں کو محدود کرلیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسبِ مسرت کی جتنی صلاحیت ایک شخص میں ہوتی ہے وہ اُس کو پورے طور پر بروئے کار نہیں لاتا اور زندگی کی بے شمار مسرتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ ایک پتنگ باز نہیں جانتا کہ فلسفہ کا ایک مسئلہ حل کرلینے میں بھی مسرت حاصل ہوتی

ہے۔ ایک فلسفی نہیں سمجھتا کہ کرکٹ کا میچ جیت جانا بھی مسرت کا باعث ہوسکتا ہے۔ ایک مصور نہیں محسوس کرتا کہ حساب کا کوئی سوال حل کر لینا بھی مسرت کا سبب ہے۔ ایک شاعر نہیں جانتا کہ مصوری بھی مسرت بخش ہوسکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہر شخص فطری طور پر شاعر نہیں ہوسکتا، ہر شخص مصور نہیں ہوسکتا، ہر شخص فلسفی نہیں ہوسکتا، اس لئے آرٹ، ادب اور علم کے حصول کے سلسلے میں ہمیں اس کا اندازہ لگا لینا چاہیئے کہ ہم صرف اُسی مسرت کے اکتساب کی کوشش کریں جس کے حصول کی صلاحیت قدرت نے ہماری فطرت میں ودیعت کر دی ہے۔

لیکن بعض مسرتیں ایسی ہیں جن کے اکتساب کی ہر شخص میں یکساں صلاحیت ہوتی ہے اور جن کے حصول کا ہر شخص کو برابر کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ ان مسرتوں میں سے کچھ تو حیوانی مسرتیں ہیں جو خواہشات نفسانی کی تکمیل سے وابستہ ہوتی ہیں کچھ مسرتیں وہ ہیں جن کا حواس خمسہ سے تعلق ہے وہ حیوانی مسرتوں سے برتر و بالا ہیں اور سب سے بڑی مسرت وہ ہے جو انسان کو ابنائے نوع کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے میں حاصل ہوتی ہے۔ میل جول، محبت و مودت اور ایثار و ہمدردی میں جو لطف اور جو لذت روپوش ہے اُسے ہم خالص انسانی مسرت کہہ سکتے ہیں۔ اگر اس مسرت سے کوئی شخص ناآشنا ہے تو یقیناً اُس نے اپنی مسرتوں کو محض حیوانی مسرتوں تک محدود کر لیا ہے اور بلند مسرت کو پست مسرت پر قربان کرکے قانون فطرت کی خلاف ورزی کی ہے

یاد رکھنا چاہیے کہ بھوک، پیاس، برہنگی، بے مائگی، بیماری، سیلاب، طوفان اور موت کے مصائب اُتنے تکلیف دہ نہیں ہوتے جتنے وہ مصائب جو انسانوں کی بداخلاقی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ زلزلہ کی تباہی لاعلاج ہے اس لئے اُس پر صبر کیا جاسکتا ہے لیکن انسان کی پھیلائی ہوئی تباہی لاعلاج نہیں ہے اس لئے اُس پر صبر کرنا اخلاقی جرم ہے۔ اسی طرح دنیا کی تمام مسرتوں اور نعمتوں کو یکجا کیا جائے تب بھی اُن سے حاصل ہونے والی مسرت اُس لافانی، مقدس اور بلند مسرت کا مقابلہ نہیں کرسکتی جو محبت کی صرف ایک نگاہ، ہمدردی کے محض ایک جملے اور ایثار کے صرف ایک معمولی سے عمل سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہر انسان مسرت کا جویا ہے لیکن بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ حقیقی مسرت کیسے حاصل کی جاسکتی ہے بہت سے لوگ ایسے افعال کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں جن کے نتیجہ میں انھیں مسرت حاصل ہونے کا تصور ہوتا ہے لیکن اُن کا تصور محض فریب نظر ہوتا ہے۔ بہت سے اپنی مسرتوں کو "حیوانی لذائذ" تک محدود کر لیتے ہیں اور نتیجۃً بلند مسرتوں کو پست پر قربان کرکے انسانی مسرت کی لذت سے محروم ہو جاتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو کسب مسرت کے حصول میں اعتدال کی حد سے آگے بڑھ کر "ہوس" کا شکار ہو جاتے ہیں اور نتیجۃً فطرت اُن پر مسرت کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔

قدرت نے انسان کو تخلیق تو اُسے جسمانی عطا کئے اور جسم کے ہر جزو کو کسب مسرت کی صلاحیت دی۔ اگر زندگی اللہ کی عطا کی ہوئی ایک نعمت ہے تو ہمیں اُس سے زیادہ لطف اندوز ہونا چاہیئے لیکن قدرت کا قانون یہ ہے کہ انسان اُس وقت تک مسرت نہیں حاصل کر سکتا۔ جب تک اُسے یہ نہ معلوم ہو کہ کسب مسرت کی کتنی لامحدود صلاحیت اُس میں موجود ہے اور محض علم حاصل کرنا ہی نہیں بلکہ مختلف صلاحیتوں کی نشو و نما اور جذبات و خواہشات کی تہذیب بھی ضروری ہے اسی لئے انسان کو تعلیم و تربیت اور عمل کی ضرورت ہے تاکہ اُسے کسب مسرت کا ملکہ حاصل ہو جائے اور وہ اپنی قوت اجتہاد کی مدد سے مسرتوں کی نئی نئی دنیائیں کو ڈھونڈھ نکالے۔ کسب علم تربیت اور عمل کی منزلوں کو طے کرنے کے بعد ہی انسان اُس لافانی مسرت کو حاصل کر سکتا ہے۔ جو زمانہ کے مصائب و آلام کی دسترس سے باہر ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ حیوانی مسرتوں میں اعتدال کی حد سے آگے بڑھنا غم و الم کو دعوت دینا ہے لیکن دماغی، ذہنی، روحانی اور انسانی مسرتوں کے حصول میں کوئی حدبندی نہیں کی جاسکتی۔ جتنی جس میں صلاحیت ہے اور جتنا

وسیع جس کا ظرف ہو اُسی قدر وہ لطف اندوز ہو سکتا ہے قدرت کے خزانے میں کبھی کمی نہ واقع ہو گی۔

ایک "انسان" جو واقعی انسانیت کی منزل پر فائز ہوتا ہے خوب واقف ہوتا ہے کہ انسانوں سے محبت کرنے میں کیا لطف ہے۔ وہ مرغن غذاؤں اور لذیذ کھانوں کی لذت سے ناواقف نہیں ہوتا لیکن وہ جانتا ہے کہ اچھی سے اچھی غذا کھانے کے بعد جو لطف اور جو آسودگی ایک شخص محسوس کرتا ہے اُس کا تعلق محض جسم سے ہوتا ہے لیکن خود کھانا نہ کھا کر بھوکوں کو کھلا دینے سے کتنی روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے یہ امیرالمومنین علی ابن طالبؑ سے پوچھئے جنھوں نے تین دن تک بغیر افطار کئے روزے رکھے اور اپنا کھانا دوسروں کو کھلا دیا ـــ پانی بے شک ایک بڑی نعمت ہے بالخصوص اُس وقت جب وہ نایاب ہو پیاس کی اذیت سے بھی ہر شخص واقف ہے اور پھر ریگستان کی پیاس۔ لیکن خود پیاس کا خطرہ مول لے کر دوسروں کو سیراب کر دینے سے روح کی پیاس کس طرح بجھتی ہے اس کی کیفیت امام حسینؑ سے دریافت کیجئے جنھوں نے دشمن کی فوج کو پانی پلا دیا۔

جو لوگ صرف اپنی ذات کو مسرت کا مرکز بنا لیتے ہیں وہ جسمانی لذائذ کو تمام مسرتوں پر فوقیت دے لیتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں ہم حیوان سے بدتر کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ حیوان کی حیوانیت اُس کی فطرت ہے لیکن انسان کی حیوانیت اُس کی انسانیت کی تابع ہے۔ یہ نوعِ انسانی کے فائدے کو ملک کے فائدہ پر، ملک کے فائدہ کو اعزا و اقارب کے فائدے پر اور اعزا و اقارب کے فائدہ کو اپنی ذات کے فائدہ پر یعنی اپنی حیوانی خواہشات پر قربان کر دیتے ہیں۔ اُن کا فلسفۂ حیات ایک بلند انسان کے فلسفۂ حیات کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ اُن اصول کو کبھی حق نہیں تسلیم کرتے جن میں ساری دنیا کا فائدہ ہو اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اُن کو حق تسلیم کرنے کے بعد انھیں پوری دنیا سے جنگ مول لینا پڑے گی۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حق کیا ہے، وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کس بات کو حق کہا جائے کہ لوگ خوش ہیں۔ وہ باطل کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن حق کا نام لے کے۔ اور

اس لئے بھی وہ حیوان سے بدتر ہیں کہ حیوان مکر نہیں کرتا۔ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اپنے دانتوں اور پنجوں کا استعمال کرتا ہے لیکن اخلاق کی تبلیغ کے نام پر نہیں، وہ لڑتا ہے لیکن ندا کا نعرہ بلند کر کے نہیں، وہ دوسروں کا خون کرتا ہے لیکن دھوکا دے کر نہیں ـــ اُس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے۔

بعض افراد انسانیت کی پہلی منزل پر فائز ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مسرت کا دائرہ ذات سے بڑھا کر اپنے خاندان تک وسیع کر لیتے ہیں اور اُن کی ضروریات، اُن کی خواہشات اور اُن کے جذبات اور اُن کے مفاد کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں ـــ یہ ایثار کی منزل ہے اور انسانی مسرت کا ابتدائی درجہ! بعض افراد وہ ہوتے ہیں جو ملک کے فائدہ کے لئے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے مفاد کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ انسانیت کی بلند تر منزل پر فائز ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے ایک انسان وہ بھی ہوتا ہے جو صرف نوع کے فائدہ کو پیش نظر رکھتا ہے اور اپنی ذات اور اپنی ذات کی وجہ سے جن جن چیزوں سے محبت ہوتی ہے یعنی خاندان، وطن، دولت اور وہ سب کچھ جو عالم انسانیت کے مقابلہ میں حقیر ہے مفادِ نوع پر قربان کر دیتا ہے۔ یہی انسانیت کا وہ نمونہ ہے اور اخلاق کا اعلیٰ ترین نمونہ! اسے ہم "انسانِ کامل" کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین اور ایثار کا اعلیٰ ترین نصب العین اختیار کرتا ہے۔ اس کے اخلاق، اُس کے کردار اور اُس کی مسرت کی بنیاد اُن ہمہ گیر اُصول پر ہوتی ہے جن سے زیادہ بلند اصول مرتب نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنے اخلاق کو درست رکھتا ہے لیکن دوسروں کے اخلاق سے بے پروا نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا ہے کہ جس مسرت سے وہ ہمکنار ہے اُسے ساری دنیا میں عام کر دے۔ اُسے صرف اپنے پیٹ کی فکر نہیں ہوتی بلکہ ساری دنیا کے بھوکوں کی فکر ہوتی ہے۔ "روٹی" کو مقصدِ حیات نہیں بنایا جا سکتا اس لئے کہ اُس سے زیادہ اہم چیزیں ہیں جنھیں مقصدِ حیات بنانا چاہئے لیکن جب تک دنیا میں بھوک ہے، فاقہ ہے اور مفلسی ہے اُس وقت تک خلقِ خدا کے لئے "روٹی" فراہم کرنے کی خواہش

ہر اعلیٰ انسان کے نصب العین حیات کا جزو رہے گی۔ اپنے پیٹ کی فکر میں نفسانیت ہے اور ساری دنیا کے پیٹ کی فکر میں روحانیت! وہ حیوانیت ہے اور یہ انسانیت!

انسانیت کا رہنما جب اپنے مسلک کا اعلان کرتا ہے تو ساری دنیا اُس کی مخالف ہو جاتی ہے۔ حکومت اُس کے تیوروں سے خائف ہوتی ہے اس لئے کہ ارباب اقتدار سمجھتے ہیں کہ اُس کی آواز اگر انسانوں کے کانوں تک پہنچ گئی تو اُن کا وہ اقتدار چھن جائے گا جس کا غلط استعمال کر کے وہ عوام کا حق غصب کرتے ہیں، وہ ایوان شاہی زمین دوز ہو جائیں گے جن کی دیواریں انسانوں کے خون کے گارے سے تعمیر ہوئی ہیں اور اُن کی ہوسناکانہ حیوانی لذتوں کا وہ عشرت کدہ تباہ ہو جائے گا جس نے دنیا کی مسرت کو مفلوج بنا دیا ہے۔ نام نہاد علماء اُس کے قتل کے فتوے صادر کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن کے بنائے ہوئے عقائد و تصورات کے گھروندے جن کی بنیاد ریت پر ہے منہدم ہو جائیں گے، اُن کی "روحانیت" کا نقاب جسے وہ رُخ پر ڈالے ہوئے ہیں چاک ہو جائے گا اور وہ اپنے اصلی روپ میں دنیا کے سامنے آجائیں گے۔ عوام اُس کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اس لئے کہ اُن کی زندگی حکومت کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوتی ہے اور اُن میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہوتی کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے ــــ پھر اُس پر بغاوت اور غداری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ حکومت "تحفظِ امن عامہ" اور "قانون عدل" کے نام پر ظلم و تشدد اور بربریت کے لئے جواز پیدا کرتی ہے۔ پہلے لالچ دی جاتی ہے، پھر دھمکیاں دی جاتی ہیں اور جب سب حربے ناکام ثابت ہوتے ہیں تو اُس کے قتل کے لئے اقدامات شروع کر دیئے جاتے ہیں۔

انسان اور حیوان میں صرف یہی فرق نہیں ہے کہ حیوان اپنے نفسانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور انسان انسانیت کے تقاضوں کو حیوانیت کے تقاضوں پر مقدم رکھتا ہے بلکہ یہ فرق بھی ہے کہ حیوان صرف "حال" کے ضروریات اور خواہشات پر نظر رکھتا ہے اور انسان "ماضی" اور "مستقبل" پر حاوی ہوتا ہے۔ وہ انسان جو حیوانیت کی منزل میں ہوتا ہے حیوان سے بدتر ہوتا ہے اس لئے کہ حیوان کے برخلاف وہ "حال" کے ساتھ اپنے جسمانی لذائذ کے "مستقبل" پر بھی نظر رکھتا ہے۔ وہ انسان جو اپنے خاندان کے فائدہ کو اپنی ذات پر ترجیح دے دیتا ہے اپنے خاندان کے مستقبل کا خیال رکھتا ہے اُسے اپنی فکر نہیں ہوتی لیکن اپنی اولاد کی فکر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک وطن کا پرستار وطن کے مستقبل کا لحاظ رکھتا ہے اور ایک انسانیت کا رہنما پوری نوعِ انسانی کے مستقبل پر نظر رکھتا ہے۔ وہ جس طرح اپنے جسمانی خواہشات پر اپنے روحانی خواہشات کو مقدم کرتا ہے اُسی طرح ساری دنیا کے روحانی ارتقاء کو مادی ترقی پر مقدم قرار دیتا ہے۔ اُسے دنیا کی معاشی اور اقتصادی ترقی کی فکر ہوتی ہے لیکن اُس سے زیادہ روحانی ارتقاء کا خیال ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ وہ انسان مردہ ہے جس کی انسانیت مردہ ہو چکی ہے۔ وہ واقف ہوتا ہے کہ حیاتِ حیوانی اور حیاتِ اخلاقی میں بڑا فرق ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص زندہ ہو لیکن حیاتِ اخلاقی سے محروم ہو اور ایک شخص مردہ ہو لیکن حیاتِ اخلاقی کا سرمایہ دار ہو، پھر افراد کی طرح اقوام و ملل اور پھر نوعِ انسانی کی ایک حیاتِ اخلاقی ہوتی ہے اور اُس کا ایک مستقبل ہوتا ہے۔ انسانِ کامل وہی ہے جو انسانوں کی حیاتِ اخلاقی کا نگراں اور اُس کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے کوشاں ہو۔

ایک وہ شخص جس کی نظر صرف مادی مفاد پر ہو جو صرف "حال" کے لئے جینا چاہتا ہو، جس کا مستقبل بھی محض خواہشات نفسانی سے متعلق آرزوؤں میں محدود و مقید ہو کبھی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ اُس انسان کے جذبات و خیالات و تصورات کیسے ہوتے ہیں جس کو پوری نوع کی حیاتِ اخلاقی اور آیندہ آنے والی نسلوں کے ارتقاء کی فکر ہوتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ روحانی مسرتوں کے حصول کے لئے جسمانی لذائذ کو ترک کر دینا بلکہ تکلیفیں برداشت کرنا بھی کتنا پُر مسرت اقدام ہے۔

وہ نہیں سمجھ سکتا کہ دوسروں کی بہبودی کے لئے اذیتوں کے اٹھانے میں کتنا لطف ہے اور وہ اُس بے پناہ مسرت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا جو انسانِ کامل کو نوعِ انسانی کے درخشاں مستقبل کے محض تصور سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہی نہیں وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ دوسروں کی تکلیف سے ایک بلند انسان کو کتنی تکلیف ہوتی ہے!

ہم سمجھتے ہیں کہ امام حسینؑ بڑی مصیبت میں تھے، ہم سمجھتے ہیں کہ امام حسینؑ کو بھوک اور پیاس کی بہت تکلیف تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جوان بیٹے کی موت اور شش ماہے بچہ کی شہادت امام حسینؑ کے لئے سب سے زیادہ اذیت کا سبب تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ امام حسینؑ کو جسمانی اذیتوں سے زیادہ روحانی تکلیف تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حیوانیت کی گھٹا پورے انسانی افق کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور انسانیت دریا سے دُور، جلتی ہوئی ریتی پر چند خیموں میں پناہ گزیں ہے۔ انھیں قاسم ابن حسنؑ کے مرنے کا غم اتنا نہ تھا جتنا اس بات کا غم تھا کہ تشدد نے رحم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اُنھیں علی اکبرؑ کے مرنے کا افسوس کم تھا، لیکن اس بات کا غم زیادہ تھا کہ حیوانیت نے اخلاق کے سینہ پر برچھی چلا دی۔ اُنھیں علی اصغرؑ کی گردن چھید جانے کی اتنی تکلیف نہ تھی جتنی اس بات کی تکلیف تھی کہ حرملہ نے انسانیت کے قلب پر تیر چلا دیا اور یقیناً اُن کے لئے زندگی میں کوئی کشش اور کوئی لطف اور کوئی مسرت اُس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک ساری دنیا حیوانیت کے دام سے رہا نہ ہو جائے۔

ایک طرف غم کا جذبہ تھا جو امام حسینؑ کو عملی اقدام پر آمادہ کر رہا تھا دوسری طرف نوعِ انسانی کے درخشاں مستقبل کا تصور تھا وہ سمجھتے تھے کہ بداخلاقی، حیوانیت اور بربریت کا واحد علاج اعلیٰ اصول کی تبلیغ ہے اور وہ جن اصول کو نوع کی فلاح کے لئے ضروری سمجھتے تھے اُن کی تبلیغ کرتے رہے اور جب انھوں نے دیکھا کہ اُن کے تحفظ کی بس ایک صورت باقی ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنی زندگی کی قربانی پیش کر دیں تو وہ اس کے لئے آمادہ ہو گئے۔ خواہ کسی کو اُن سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن یہ دنیا بھر کو ماننا پڑے گا کہ امام حسینؑ جن اصولوں کو نوعِ انسانی کی بہبودی کیلئے ضروری سمجھتے تھے اُنکے تحفظ کے لئے اُنھوں نے قربانی پیش کی لہٰذا وہ رہنمائے انسانیت ہیں شہیدِ انسانیت ہیں بلکہ محسنِ انسانیت!

یہ نہیں تھا کہ زندگی کی قیمت سے امام حسینؑ واقف نہ تھے لیکن وہ حیاتِ حیوانی سے زیادہ حیاتِ انسانی کو اہم سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ نوع کی حیاتِ اخلاقی کو زندہ کرنے کے لئے حیاتِ حیوانی کو قربان کر دینا عقلی طور پر نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، اور ایک ایسا شاندار اقدام ہے کہ مرنے والے کو مردہ کہنا اُس کی توہین کرنا ہے۔ جو نوعِ انسانی میں انسانیت کی روح پھونک دے اُسے کون مردہ کہہ سکتا ہے اُسے محض "حیوانیت" کے نقطۂ نظر سے مردہ کہا جا سکتا ہے۔ انسانیت ہمیشہ اُسے "شہید" کے نام سے یاد کرے گی جو کبھی نہیں مرتا، زندہ مر جاتا ہے اس لئے کہ اُس کی حیات حیاتِ حیوانی ہے لیکن "شہید" اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک نوعِ انسانی میں انسانیت زندہ رہے گی اور آنے والی نسلوں میں جتنی انسانیت بڑھتی جائے گی اتنی ہی "شہید" کی زندگی چمکتی جائے گی۔

موت اُسے آتی ہے جو اپنی انسانیت کو فنا کرے۔ ہلاکت محض خودکشی کا نام نہیں ہے بلکہ خود اختیاری طور پر اپنے جوہرِ انسانیت کو فنا کر لینے کا نام بھی ہلاکت ہے اور یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص زندگی ہی میں مر جائے۔ جس نے اپنی حیوانیت پر اپنی انسانیت کو قربان کر دیا وہ ہلاک ہو گیا، جس نے وطن کو تباہ کر کے خاندان کو فائدہ پہنچایا وہ ہلاک ہو گیا، جس نے ملک کو فائدہ پہنچا کر ساری دنیا کو برباد کر دیا وہ ہلاک ہو گیا اور جس نے اپنی زندگی پست چیزوں پر قربان کر دی یا خودکشی کر لی وہ ہلاک ہو گیا۔

کربلا کے معرکہ میں شہادت اور ہلاکت دونوں کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔ عمر ابن سعد نے "حکومتِ رے" کے لئے رسولؐ کے نواسے کو قتل کر دیا اور ہلاک ہو گیا۔ حُر نے منصب جاہ و دولت کو سچائی پر قربان کر دیا اور شہید ہو گئے۔ اصحابِ حسینؑ نے بھوک، پیاس اور تمام جسمانی اذیتوں کو برداشت کیا لیکن اُس روحانی سکون کو ترجیح دی جو حق کا ساتھ دینے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اور شہید ہو گئے۔ یزید کی فوج نے حیوانی خواہشات کی تکمیل کے لئے دولت و اقتدار کا ساتھ دیا اور اپنے انسانی نفس کو قتل کر ڈالا اور ہلاک ہو گئے ـــــ بخدا حرملہ واقعۂ کربلا کے بعد خواہ کتنی ہی مدت تک کیوں نہ زندہ رہا ہو لیکن وہ اُسی وقت ہلاک ہو گیا تھا جب اُس نے تیر چلّۂ کمان سے رہا کیا۔ علی اصغرؑ تیر کا نشانہ نہ بن سکے اس لئے کہ انھیں حیاتِ ابدی نے اپنے گہوارے میں لے لیا اور وہ اُس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک ستاروں میں نور اور آسمانوں میں بلندی باقی ہے ـــــ !!!

(محرم نمبر ۱۳۷۵ھ)

شرمندہ عمل

(جناب مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی مرحوم)

صلح کے امکانات ختم ہوتے ہی حر بن یزید ریاحی کی قلبی الجھنیں حد سے تجاوز کرنے لگیں ضمیر کی سرزنش جاری ہوئی اور رنج و تعب نے مضطرب کرنا شروع کردیا۔ وہ اپنے آپ کو اس عظیم حادثہ کا واحد ذمہ دار تصور کرنے لگا۔ کیوں کہ وہی کمینہ فطرت سردار کے ایما سے فرزند رسولؐ کو مجبور کر کے کربلا تک لانے کا باعث بنا تھا۔ اس کی جگر داری اور دلاوری میں کلام نہیں ہو سکتا۔ تیغ و تبر، تیر و نیزہ کے بہادرانہ کھیلوں میں اس کا بچپن بسر ہوا تھا جوانی میں بڑے بڑے معرکے سر کر کے معاصرین کی نگاہوں میں نام و نمود حاصل کی تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا کا کوئی سخت سے سخت خطرہ بھی اس کے شجیع دل کو مرعوب کرنے پر قادر نہ تھا لیکن عاقبت کے اندیشہ نے جوڑ جوڑ، بند، بند کو مرتعش کر رکھا تھا۔

جب تک مصالحت کی تسلی بخش امیدیں سہارا دیئے رہیں قلبی اضطراب و التہاب ایک حد کے اندر محدود رہا کیوں کہ صلح کے بعد جرموں کا بوجھ ہلکا پڑ جانا قطعی تھا۔ رسولؐ کی آلؑ اور ساقی کوثر کے فرزند پر نام نہاد مسلمانوں نے پانی بند کیا تو اس کی بے قراریاں لمحوں سے قرنوں تر ہوگئیں۔ آزاد روح محکومانہ پابندیوں سے گلو خلاصی کے لیے پھڑ پھڑانے لگی اگر درندہ خو لشکر سے کھلے بندوں نہ نکل سکا مظلوم کی خدمت میں حاضر ہو جانا دشوار ہی نہیں بلکہ محال نظر آیا

سالار فوج کا تعینات کیا ہوا دستہ عزائم سے مطلع ہو کر راستے ہی میں خاتمہ کر دے گا اور وہ تقصیر عفو کرانے سے پہلے ہی ندامت کا بار اٹھائے دنیا سے گذر جائے گا۔

رفتہ رفتہ دسویں کی رات نور کی بارش کرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اب حر کی بیتابیاں ضبط کے قابل نہ رہیں۔ جب تمام بڑے بڑے سردار سیر و سیراب ہو کر راحت رساں بستروں پر بے فکری اور آرام سے میٹھی نیند سونے مصروف تھے حُر دونوں ہاتھوں سے مضطرب دل کو سنبھالے کبھی خیمے سے باہر نکل کے ٹہلنے لگتا تھا، گاہ بستر پر مچھلی کے مانند تڑپنے لگتا تھا۔ اس کی اشک آمیز آنکھوں کے سامنے جہنم کے شرر افشاں شعلے بھڑک بھڑک کے روح کو گھلا رہے تھے۔

بادی النظر میں دنیا کی وسعتیں اس پر فراخ تھیں، شام کے جابر بادشاہ کی خوشنودی شریک حال تھی کیوں کہ وہ حر ہی تھا جو حسین بن علیؑ کے بڑے خطرے کو راستے سے ہٹانے میں کد و کاوش کر رہا تھا۔ اس گراں بہا خدمت کے صلہ میں جس قدر بھی بخشش و انعام کی توقع رکھی جائے وہ تھوڑی ہے لیکن یہ روشن حقیقت ہے کہ آخرت کا سادہ ورق بالکل سیاہ ہو چکا تھا۔ وہاں دوزخ کی آگ کے سوا اس کے حصے کی کوئی نعمت معلوم نہ ہوتی تھی، اور وہ اپنے آپ میں قہر الٰہی کو برداشت کرنے کا یارا نہ پاتا تھا۔

رات گذر رہی تھی، اور اتنے کرب و اضطراب سے گذر رہی تھی جس کا قیاس کرنا بھی دشوار ہے۔ وہ بد نصیب کیا سمجھ سکتے تھے جنہیں قتل حسینؑ کی صبح، روز عید کے مساوی تھی! کوئی سلطانی تقرب ملنے کے خیال سے مگن تھا۔ کسی کو رے کی حکومت پانے کی توقع عاقبت سے بے نیاز بنائے تھی، البتہ حر کی تنہا شخصیت تھی جس نے رات کے ہولناک سکوت اور سناٹے میں حقیقت کا بے نقاب چہرہ دیکھ کر بصیرت حاصل کی تھی۔ وہ صبح کا مشتاق تھا کہ دن کی تابانیوں میں جان سا گراں مایہ ہدیہ فرزند نبیؐ کے قدموں پر ڈال کر پیغمبر اسلامؐ کے فرمان کی تعمیل کر دے۔ ارادی طاقت آمادہ ہو چکی تھی خیال کو عمل کا جامہ پہنا دینے پر جو کچھ تاخیر تھی وہ یہ کہ ایسا ذریعہ عمل دستیاب ہو سکے جو مظلوم کربلا کی حضور میں باریاب ہو کر عفو تقصیر کی خواستگاری کر سکے۔

یہ منصوبہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا تھا جب وہ قلبی عزائم کو مستور رکھتے ہوئے کسی مخصوص حیلے کے ساتھ یزیدی لشکر کی حدود سے باہر نکل سکے۔ راز کے افشا ہو جانے کی حالت میں عمر سعد کی جانب سے ناقابل مدافعت رکاوٹیں پیدا کر دیا جانا یقینی تھا، یہی باعث تھا کہ حُر نے ہر ہر لمحہ احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ یہاں تک کہ سحر نے رسول زادگی کی بے انتہا مصیبتوں پر اپنا گریباں چاک کر ڈالا۔ سورج کی لرزتی ہوئی کرنیں زمین کی طرف مائل ہوئیں اور قتل گاہ کا ایک ایک ذرہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کفران نعمت کرنے والوں کی بد اعمالیوں کا جائزہ لینے میں منہمک ہو گیا۔

صبح کا اجالا پھیلتے ہی انسانیت کے گلے پر چھری پھیرنے والے حربی اسلحے سے آراستہ ہو ہو کر صف آرا ہونے لگے۔ سالار فوج نے لشکر کو ترتیب دینا شروع کیا، میمنہ و میسرہ قلب و جناح کے ساتھ قبائلی تقسیم بھی کی اور حر کو تمیم و ہمدان کے قبائل پر سردار مقرر کیا۔

اگرچہ مادی آنکھوں سے دیکھنے والوں کی نگاہ میں اعزاز و مراتب کا ارتفاع تھا لیکن حر کو اس سرداری نے خود اپنی ہی نظر میں ذلیل و خوار بنا دیا۔ فی الحقیقت یہ سرداری نبیؐ کے نواسہ کا خون بہانے کو عطا ہوئی تھی اور وہ کلمہ گو رہتے ہوئے کبھی بھی اسلام کشی کا اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی بے چینیاں دم بدم سوا ہوئی جاتی تھیں۔ حالات کی صورت کچھ بھی سہی پھر بھی وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ محمد مصطفیٰؐ کی رسالت کی گواہی دینے والے حسین ابن علیؑ سے جنگ کر سکیں گے۔

وقت گذرتا گیا۔ طرفین کی صفیں درست ہو چکیں اور وہ ہنگام شروع ہوا کہ اعدا کے نرغے میں گھرے ہوئے مظلوم نے دونوں لشکروں کے مابین قیام فرما کر بے نظیر و موثر خطبہ جاری کیا۔ خطبہ کی ایک ایک لفظ پر صداقت نثار ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا حق الفاظ بن کر زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ حیرت ہے اور بڑی حیرت ہے کہ گمراہوں کے قلوب متاثر نہیں ہوئے۔

حر کا عزم اور بھی پختہ ہو گیا! اس نے چاہا کہ خود جا کے عمر سعد سے گفتگو کرے لیکن نہ ہیرنا قین سے بڑھ کر کوفیوں اور شامیوں کو

ناصحانہ تقریر سے سیدھے راستہ پر لانے کی کوشش کرتے دیکھ کر تھم گیا۔ اس کے بعد اس نے محسوس کیا کہ مخالفین لڑنے پر آمادہ ہیں اور ان کے خونی ارادوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

اب اس نے ضبط و صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ گھوڑا چمکا کر عمر سعد کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ہر چند روحانی تشویش نے پُرشوکت چہرے کو کمھلا دیا تھا لیکن کفر و نفاق کی ضلالت سے نکل کر حق و راستی کا جادہ پالینے کا نور کشادہ جبین سے ساطع تھا۔ آنکھوں سے امید و بیم کی مخلوط کیفیت ٹپکی پڑتی تھی اور تہہ میں نگاہیں قلبی تفکرات کا انداز کئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔

چند لحظ سکوت کرنے کے بعد اس نے سوال کیا۔ "کیا تم ان سے واقعی جنگ کرو گے۔؟"

"ہاں۔ ہاں" عمر سعد نے سر اٹھا کے حاکمانہ لہجے میں جواب دیا۔ "خدا کی قسم ایسی جنگ! جس کا انتہائی کم نتیجہ یہ ہے کہ سروں کا دھواں دھار مینہ برسے اور ہاتھ کٹ کٹ کر زمین پر گریں"۔!

"کیا اتنے مطالبے"۔ حر نے پھر کہا۔ "جو حسینؑ نے ظاہر کئے ان میں سے کوئی تم لوگوں کے نزدیک قبول کرنے کے قابل نہیں"؟

"بخدا" عمر سعد نے مجبوری ظاہر کی۔ "اگر یہ معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو ضرور منظور کر لیتا لیکن کیا کروں؟ تمھارا سردار ابن زیاد نہیں مانتا۔"

حر نے پھر کوئی سوال کرنا ضروری نہ سمجھا۔ راہوار کی باگ موڑ کر اپنے رسالے میں آکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک تھی۔ دست و پا کسی مخفی خوف سے بید کی طرح لرز رہے تھے۔ وہ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ پر لگ جائیں اور اڑ کر کونین کے سردار کی خدمت میں جا پہونچوں۔ لیکن قرۃ ابن قیس کی موجودگی عنان گیر تھی۔ اس نے ٹالنے کے طور پر کہا۔

"قرۃ! آج تم نے اپنے گھوڑے کو پانی پلایا؟"

"نہیں" قرۃ نے جواب دیا "ابھی نہیں پلایا ہے"۔

"پھر پلاؤ گے نہیں؟" حر نے اس انداز سے کہا کہ قرۃ کچھ نہ جانتے پر بھی اتنا ضرور سمجھا کہ حر علٰحدگی چاہتا ہے۔ یہی باعث ہوا کہ وہ خاموشی کے ساتھ اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اور عزائم کو عملی جامہ پہنانا حر کے واسطے نسبتاً آسان ہو گیا۔ اب اس نے اپنے فرزند کی جانب توجہ پھیری اور سرگوشی کے طور سے کہا۔ یا ولدی! میں ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں جو سبزہ زار اور خارستان سے ہو کر گذرتا ہے۔ سبزہ زار کی انتہا بھڑکتے ہوئے شعلوں پر ہوتی ہے اور خارستان کا راستہ سدا بہار چمن پر منتہی ہوتا ہے۔ تمھاری رائے میں کون سی راہ اختیار کرنا چاہیے۔؟"

"جو آپ پسند کریں" علی نے عرض کی "میرا فرض تو صرف اطاعت ہے"۔

"مرحبا" حر نے رضامندی ظاہر کی "لیکن تمھارا باپ آگ میں جلنے کی طاقت نہیں رکھتا"۔

"پھر جیسی آپ کی مرضی" حر کے فرزند علی نے جواب دیا۔

"اچھا تو چلو" حر بولا "حسینؑ ابن علیؑ کی خدمت میں عفو تقصیر کی التجا پیش کریں"۔

حر نے اپنی دانست میں بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ اس نے باگ اٹھا کر گھوڑے کو قدم قدم بڑھانا شروع کیا۔ تاسی کرتا ہوا علی بھی تھوڑے فاصلے سے روانہ ہوا۔ اس وقت حر کا دل دھڑک رہا تھا۔ سینے کے اندر جذبات کا طلاطم مچا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں ظلمت سے نکل کر نور میں داخل ہو چکا ہوں۔ میرے دامن تک ضلالت و گمراہی کے دھبے نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی صورت قلبی انتشار کی غمازی کر رہی تھی۔

اب وہ ہنگام تھا کہ حجتیں ختم ہو کر جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اعدا کی طرف پانچ سو سے زیادہ کمانیں کڑک رہی تھیں۔ اور امام حسینؑ کے سمت اس کثرت سے تیر جا رہے تھے کہ ان سے چھن کر زمین تک پہنچنے تک کے لئے آفتاب کی باریک شعاعوں کو راستہ نہ مل سکتا تھا!

حر کا اضطراب کچھ اور سوا ہو گیا۔ گھوڑے کی رفتار میں قدرے تیزی پیدا کر دی۔ راہِ مقصود قدموں کے نیچے تھی۔ ہر ہر گام پر مراد کی منزل نزدیک ہو رہی تھی۔ ناگاہ ہوا نے کسی کے یہ الفاظ گوش گذار کئے "کیوں حر! کیا ارادہ ہے؟ کیا حملہ کرنا چاہتے ہو؟"

حر چونک پڑا۔ سوال کی نوعیت نے قوی جسم میں لرزہ ڈال دیا۔ وہ سمجھا کہ یہ تو اسے پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ خدا کی پناہ! سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دے؟ اس نے سکوت کو مہر لب بنا کے نظر اٹھائی تو

اپنے ہی قبیلے کی ایک فرد مہاجر بن اوس کو مقابل پایا۔

حر کو لرزہ براندام دیکھ کر مہاجر اپنی حیرت کو نہ دبا سکا۔ متعجبانہ لہجہ میں صورت تاکتے ہوئے پوچھا "حر! تمھاری کیا حالت ہو رہی ہے۔؟ میں نے تو تمھیں اس حال میں کبھی نہیں دیکھا تھا اگر مجھ سے دریافت کیا جاتا کہ کوفہ کا شجاع ترین مردم کون ہے! تو میں تمھارے سوا کوئی نام نہ پیش کرتا۔ مگر اس وقت تم کو عجیب رنگ میں دیکھ رہا ہوں! آخر ماجرا کیا ہے؟"

"مہاجر" حر نے کہنا شروع کیا "میرے سامنے دوزخ و جنت کا سوال ہے۔ میں تو جنت پر کسی چیز کو بھی مقدم نہ کروں گا چاہے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے جائیں اور آگ میں جلا دیا جاؤں!"

جملہ تمام کرتے ہی برق پا گھوڑے کو ایڑ دی وہ ادھر ہوا ہوا مہاجر حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھتا رہ گیا۔ نصیب کی سماعت نے حر کو منزل کے سامنے پہنچا دیا۔ مجاہدین کا مختصر گروہ نظر آنے لگا۔ علم کا سبز پھریرا جو تمام غزوں میں کبھی حمزہ کی دوش پر لہرایا کبھی جعفر طیار کے ہاتھ پر بلند ہوا کبھی علی ابن ابی طالب کے دوش مبارک پر معراج حاصل کرتا رہا تھا۔ اس وقت سلطان کربلا کی پس پشت عباس بن علی کے طاقت ور بازو پر اڑ رہا تھا۔ یمین و یسار خانوادہ سیادت کے جوان نورانی جسموں پر اسلحہ سجائے استادہ تھے۔ حسینی سرفروش معرکہ دار و گیر میں سرگرم تھے۔ ابن سعد کے لشکر سے جو تیر آتا تھا بڑھ بڑھ کے ڈھال پر لے لیتے تھے۔ مجال کیا تھی کہ کوئی خدنگ آل رسول کے نزدیک پہونچ سکے۔

حر کا جوش و خروش کچھ اور بھی بڑھ گیا۔ اس نے امان کا طالب ہو کر تلوار میان میں رہنے دی سپر کو الٹا کر کے چہرے کے سامنے کر لیا اور گھوڑے کو بے تحاشہ بھگا کر امام کے سامنے جا پہونچا۔ مجاہدین ہنوز اس کا منشاء دریافت نہ کرنے پائے تھے کہ اس نے عذر خواہی کے طور پر گذارش کی "یا ابن رسول اللہ! میری جان آپ پر نثار میں وہی گنہگار ہوں جس نے آپ کو واپس جانے سے روکا تھا۔ راستہ میں آپ کے ساتھ رہا اور اس مقام پر قیام فرمانے کو مجبور کیا۔ اس خدائے برحق کی قسم جس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے مجھے ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ یہ لوگ آپ کی جانب سے تمام ظاہر ہونے والی شرطوں کو رد کر دیں گے اور نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ کسی حد تک ان لوگوں کا ساتھ دینے میں کیا مضائقہ ہے! اگر انھیں معلوم نہ ہو سکے کہ میں ان کی اطاعت سے باہر ہوں آخر تو ان شرطوں کو قبول کر ہی لیں گے جو آپ کی طرف سے ظاہر ہوں گی۔ خدا کی قسم مجھے یہ معلوم ہوتا کہ یہ لوگ ان شرائط کو منظور نہیں کریں گے۔ تو میں کبھی آپ کے ساتھ یہ طریقہ نہ برتتا۔ بہرکیف اب انتہائے شرم و ندامت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ میں خدا کی بارگاہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اور آپ کی مصیبت میں شریک رہنا چاہتا ہوں حتیٰ کہ آپ ہی کے قدموں پر تصدق ہو جاؤں ——— کیا اس طرح میری توبہ قبول ہو گی؟" امام نے نہایت توجہ سے جرموں کی فرد کو سنا۔ از بسکہ حر کا چہرہ خود میں چھپا ہوا تھا اس لئے یا کسی خاص مصلحت سے خاطر جمعی کرتے ہوئے فرمایا۔

"ہاں ہاں، خدا تمھاری توبہ قبول فرمائے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا۔ ذرا اپنا نام تو ظاہر کرو۔

"میرا نام" حر نے عرض کی "حر ابن یزید ریاحی ہے"

"واقعی تم حر ہو"۔ امام نے فرمایا۔ اسی طرح جیسے تمھاری ماں نے تمھارا نام رکھا ہے۔ تم آزاد ہو انشاءاللہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اچھا گھوڑے سے تو اترو"

"میں آپ کی نصرت میں گھوڑے پر سوار رہوں تو" حر نے عرض کی "اس سے بہتر ہے کہ نیچے اتر دوں۔ پس تھوڑی دیر ان لوگوں سے جنگ کر لوں تو پھر گھوڑے سے نیچے اترنا ہی ہے"

"اچھا جو تمھاری مرضی ہو وہ کرو۔ امام نے اجازت عطا کی" خدا اپنی رحمت تمھارے شامل حال کرے" حر کا قلبی انتشار دور ہو چکا تھا۔ خطا بخش امام نے صرف قصور ہی بحل نہیں فرمایا۔ بلکہ مقبول دعاؤں کے مقدس خلعت سے سرفراز کرتے ہوئے میدان حرب و ضرب کی رخصت بھی عطا فرما دی۔ وہ نبرد آزمائی کا جذبہ لے کر بڑھا جب رزم گاہ کے وسط میں پہونچا تو رک گیا اور رک کر بیٹے کو حکم دیا "ہاں بیٹا! بڑھ اور منافقین سے جنگ کر"

بہادر باپ کا بہادر بیٹا "سمعاً وطاعۃً" کہ کر رجز پڑھتا ہوا بڑھا اور شامیوں کے سیاہ بادل میں ڈوب گیا۔ کفر کش تلوار بجلی کی طرح چمک چمک کر گرنے لگی۔ زندگی کو عزیز رکھنے والے قتل و ہلاک ہو ہو کر گرنے لگے۔ اور جہنم کو بھرنے لگے۔ مخالفین میں ہل چل پڑ گئی۔ سپاہی مضطرب الحواس ہو ہو کر بھاگنے لگے۔ حر ایک طرف کھڑا بیٹے کی عدیم النظیر لڑائی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب کوئی خارا شگاف تلوار سے کٹ کر گرتا تھا اس کے وجیہ چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ سترؔ دفعہ اس کے رخ سے شادمانی کے آثار ظاہر ہوئے۔ آخر ایک موقع ایسا بھی پیش ہوا جب اس نے اپنے شیر کو گرتے اور قتل ہوتے دیکھا اب اس کی صورت سے بے انتہا خوشی ٹپکنے لگی۔ بے اختیار زبان پر یہ کلمے جاری ہو گئے "مرحبا۔ مرحبا جزاک اللہ! بیٹا تو نے مجھے رسول اللہ کے سامنے سرخرو کر دیا"۔ کہا اور بڑھ کر کوفہ اور شام کے حق فراموش کردہ گروہ سے للکار کر خطاب کیا "اے کوفہ والو تمھاری مائیں تمھارے غم میں بیٹھیں تم نے اس بزرگ کو طلب کیا جب وہ تشریف لائے تو تم نے اسے دشمن کے سپرد کر دیا۔ تم مدعی تھے کہ ان پر جان نثاری کرو گے اور پھر خود ہی ان پر چڑھ دوڑے اور ان کے قتل پر آمادہ ہو گئے! ان کے نفس کی آمد و شد کو مسدود کر دیا ہے۔ ان کا گلا گھونٹنے کو تیار ہو۔ انھیں چاروں طرف سے محصور کر رکھا ہے۔ خدا کی وسیع زمین کو ان پر تنگ کر دیا ہے۔ اور ان کا راستہ روک رکھا ہے۔ وہ تمھارے ہاتھوں میں قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ تم نے ان پر ان کے اہلبیتؑ اور اصحاب و انصار پر فرات کا پانی بند کر دیا ہے۔ حالاں کہ اس پانی کو یہودی۔ مجوسی اور نصرانی تک استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو پیاس نے ہلکان کر رکھا ہے۔ کتنا برا ہے وہ سلوک جو تم نے محمد مصطفےٰ کے بعد ان کی اولادؑ کے ساتھ روا رکھا ہے۔ خدا تم کو پیاس کی اس شدت والے دن سیراب نہ کرے۔ اگر تم آج، ابھی اسی وقت توبہ نہ کر لو اور اپنے اعمال سے نادم ہو کر باز نہ آجاؤ"۔

اس وقت حر کے تیور اس حملہ ور شیر سے مل رہے جو نیستان سے باہر آکر شکار پر جست کرنا چاہتا ہو۔ علیؑ کی بے پناہ شمشیر زنی نے مخالفین کے حواس باختہ کر دیئے تھے۔ صفوں پر جمود طاری تھا۔ تیروں کی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سامعہ پر وارد نہ تھی۔ یکایک حر کے رسالے سے دو جوان بڑھے۔ ایک مرکب پر دوسرا پیادہ۔ دیکھنے والوں نے خیال کیا کہ شاید جری کی گوش مالی کا ارادہ ہے وہ دل ہی دل میں ان کی جسارت کو سراہنے لگے۔ اتنی دیر میں یہ دونوں حر کے سامنے پہونچ گئے۔ ان میں ایک تو عروہ حر کا غلام تھا جو اپنے آقا و سید کے قدم چومنے لگا لیکن مصعب بن یزید ریاحی نے شکوے کے طور پر کہا "بھیا آپ تو بہشت میں آگئے اور مجھے آتش دوزخ میں جلنے کو چھوڑ دیا"۔ "توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے" حر نے بھائی کو جواب دیا "چلو، آقا کے کونین سے اجازت لے کر بہادرانہ موت کا ذائقہ چکھو"۔

مصعب اور عروہ، حر کی معیت میں جواد و کریم امام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قصور معاف کرایا اور عصیان سے پاک ہو گئے۔ لڑائی شروع ہوئی تھوڑا عرصہ گذر چکا تھا مخالفین کے متعدد پہلوان حسینی شمشیروں کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ حر چند لمحوں تک ساکت رہ کر حق و باطل کی جنگ کا تماشہ دیکھا کیا۔ دلیرانہ جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا رہا۔ رگوں میں شریف خون جوش مارا کیا۔ لیکن حسینی سر فروشوں کا جہادی عزم فرصت نہ دیتا تھا کہ وہ اپنی فداکارانہ خدمتوں کا مظاہرہ کر سکے۔ لیکن کب تک جان نثاری کے شوق کو دبائے رکھتا؟ اس کا دل چاہتا تھا کہ حسینؑ کے ناصروں میں سب سے پہلے شہادت کا مرتبہ حاصل کرے۔ یہی جذبہ پھر تحریک کر کے امام کے سامنے لایا اور اس نے مودبانہ التجا کی۔

"فرزند رسولؐ میں سب سے پہلے آپ سے لڑنے آیا تھا۔ اور اب ملتجی ہوں کہ اذن جنگ مرحمت ہو کہ سب سے پہلے آپ کے سامنے قتل ہو کر آپ کے جد بزرگوار کی دست بوسی کا شرف حاصل کروں"۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟" امام نے فرمایا "تم تو میرے مہمان ہو۔ ٹھہر کر تھوڑا دم لے لو پھر جہاد کر لینا"۔

"نہیں مولا"! حر نے گذارش کی "میرا نفس تنگی کر رہا ہے۔ دل کو ضبط کا یارا باقی نہیں"۔

"اچھا یہی خواہش ہے تو" امام نے اجازت عطا کی "جاؤ خدا جزائے خیر دینے والا ہے۔

اجازت ملتے ہی حر کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا فداکاری کا جذبہ تیز سے تیز تر ہو گیا پر برش شمشیر علم کر لی اور کچھار سے شکار کی تلاش میں نکلنے والے شیر کی طرح جھومتا ہوا اشقیا کی طرف بڑھا۔ نظر دشمنوں پر تھی اور زبان پر یہ رجز جاری "میں حر ہوں اور مہمانوں کا پناہ دینے والا ہوں۔ میں تمھاری گردنوں پر تلوار چلاؤں گا۔ اس امامؑ کی طرف سے جو مکّہ کی زمین پر سب سے بہترین رہنے والا ہے۔ میں تم کو تلواریں لگاؤں گا اور اس کو مطلق ظلم نہ سمجھوں گا۔"

دشمن کی صف کے سامنے پہونچتے ہی شیرانہ حملہ کر دیا۔ جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ گمراہوں میں اضطراب و اضطرار پیدا ہو گیا۔ جگر داروں کو منھ چڑھنے کی ضرورت نہ تھی البتہ دور سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ اتفاقاً بعض لشکری مقابل ہو جاتے تھے تو ان کے گھبرائے آڑے ترچھے وار ہو جاتے تھے۔ وہ بھی گھوڑے کے سر و گردن کو چرکے دیتے ہوئے ختم ہو جاتے تھے۔ ان ضربوں اور تیروں سے حُر کا گھوڑا اچھا خاصہ مجروح ہو چکا تھا۔ زخموں سے جو خون برسا تھا اس نے سر و گردن اور پٹھوں کو سرخ کر دیا تھا، معلوم ہوتا تھا مرکب پر سرخ جھول پڑا ہے اس وقت شجاعت کے جوش میں حُر اس مضمون کا شعر پڑھ رہا تھا۔

"میں برابر ان کے اوپر پھینکتا رہا اپنے گھوڑے کی گردن اور اس کے سینے کو حتیٰ کہ اس گھوڑے نے سر سے پاؤں تک خون کی چادریں اوڑھ لیں!"

غازی جہاد کے جوش میں بڑھتا چلا جاتا تھا کہ یزید ابن سفیان نے ٹوک کر سوال کیا۔ "کیوں حر بن یزید مجھ سے مقابلہ کرو گے؟"

"ہاں۔ ہاں، ضرور" کہہ کر حر یزید کی جانب پلٹ پڑا۔ یزید نے مہلت دیئے بغیر بھرپور تلوار لگائی لیکن حر نے اس طرح خالی دے کر جوابی وار کر دیا کہ یزید نتیجہ معلوم کرنے سے پہلے دو ٹکڑے ہو گیا"

یہ اتنا ہیبت ناک سماں تھا کہ حریف کے حواس گم ہو گئے اور حر کے بار بار نبرد طلب کرنے پر بھی کسی کو مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد حر کو مجبوراً واپس ہونا پڑا۔

لڑائی برابر جاری تھی، طرفین سے نبرد آزما نکلتے تھے۔ اور باہم شمشیر زنی و نیزہ بازی کے جوہر دکھا کر شجاعت و بہادری کی داد دیتے تھے۔ حسینی سرفروشوں کا جوش و خروش حد سے بڑھا ہوا تھا جب میدان میں قدم رکھتے تو ان کا دل شہادت کے شوق سے بھرا ہوتا تھا۔ وہ اس شرف کو حاصل کرنے کے لئے کمال بے باکی سے حریف کی صفوں میں گھس پڑتے تھے۔ روڑے کی طرح جو بھی راستے میں حائل ہوتا تھا۔ اسے کبھی تلوار کبھی نیزے سے ہٹا دیتے تھے۔ یہی وہ عدیم النظیر اصول تھا کہ دشمن عاجز ہو کر سیکڑوں بلکہ ہزاروں کے اجتماع سے تنہا پر حملہ کر دیتے تھے اور نہایت ہی کد و کاوش کے بعد بپھرے ہوئے اسد کو مجروح کرنے کے بعد شہید کرنے میں کامیابی حاصل کرتے تھے۔ مگر اس ایک جان کی قیمت میں انھیں صدہا جانیں ضایع کرنا پڑتی تھیں۔ وہ اس طریقے کو دیر تک برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آخر حصین کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سالار فوج نے جنگ مغلوبہ کا حکم نافذ کر دیا۔ عمرو بن الحجاج نے فرات کی طرف سے میمنہ کے ساتھ حسینی میسرے پر شدید حملہ کر دیا۔

حسینی میسرے کے پچاس مجاہدین نے کمال پُرجگری سے نیزے کی نوکوں پر ہزاروں کا حملہ روکا۔ اس موقع پر حر نے بھی فطری شجاعت ظاہر کی یہاں تک کہ عمرو کو صدہا کشتے چھوڑ کر میدان خالی کرنا پڑا۔ اس ہزیمت نے حریف کی جھنجھلاہٹ کو بڑھا دیا۔ وہ یکے بعد دیگرے تابڑ توڑ حملے کرنے لگے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہر حملے میں انھیں بے گنتی جانوں کا اتلاف کرنا پڑتا تھا۔ لیکن کثیر تعداد میں ہونے کے باعث کوئی کمی ظاہر نہ ہوتی تھی۔ دس قتل ہوتے تھے تو ان کی جگہ سو آجاتے تھے۔ ان کے برخلاف شاہ کم سپاہ کی جانب ایک مجاہد کی شہادت بھی ضعف کا سبب بن جاتی تھی۔

یزیدی کمانداروں نے اس موقع پر تیروں کی بے پناہ بارش کرنا جاری کر دیا۔ مجاہدین چھد چھد کر گرنے لگے اور ان کی مقدس روحیں جسموں سے نکل نکل کر کوثر کے کنارے سیراب ہونے کو پہونچنے لگیں۔ ٹھیک اسی دار و گیر کے موقع پر ایوب بن مشرح حیوانی نے ایک تیر چلے میں جوڑ کر اس طرح رہا کیا کہ حر کا گھوڑا اپے ہو گیا، ادھر تو وہ تھرتھرا کر گرا ادھر حر چھلانگ مار کر زمین پر آگئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر غراں ہے کہ شکار پر جھپٹ رہا ہے۔ خونچکاں تلوار ہاتھ میں تھی اور زبان پر یہ الفاظ تھے "اگر تم نے میرا گھوڑا اپے کر ڈالا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں ایک شریف انسان کا فرزند ہوں اور شیر سے

زیادہ شجاعت کا مالک۔

آفتاب جلد جلد مسافت طے کرتا ہوا افق کی اس منزل تک پہونچ رہا تھا جہاں سے ظہر کا ہنگام شروع ہوتا ہے۔ جس طرح اس کی شعاعوں میں تب و تاب زیادہ سے زیادہ تھی اسی طرح جنگ بھی انتہائی صورت اختیار کر چکی تھی۔ دین حق کے محافظوں میں پچاس بہادر اپنی جانیں قربان کر چکے تھے کہ شمر نے اپنی فوج کے ساتھ امامؑ کے خیموں پر حملہ کر دیا۔ حسینؑ کے فدائیوں نے اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو حیرت انگیز دلاوری کے ساتھ روکا۔ زہیر بن قین اپنے دس شیر دل ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں یزیدیوں کو پسپا کرنے کا عزم لئے ہوئے ادھر متوجہ ہوئے۔

حر صبح سے اب تک متواتر حملے کرنے اور معرکۂ کارزار گرم رکھنے کے باعث بہت کچھ تھک چکا تھا لیکن فطری دلیری دم لینے یا ستانے کی اجازت نہ دیتی تھی' وہ دفاعی جد و جہد میں حصہ لینے کو بڑھا اور زہیر کے شانہ بشانہ بے پناہ حملوں میں مشغول ہو گیا۔ کہنے کو تو دس گیارہ سے زیادہ بہادر نہ تھے مگر نہ معلوم کس قیامت کی تلوار چلائی کہ ہزاروں کے قدم اکھڑ گئے۔ افسروں نے ہر چند میدان پکڑنے اور قدم جمانے کی سعی کی لیکن بھاگی ہوئی سپاہ نے کامیابی نہ ہونے دی!

رفتہ رفتہ آفتاب اس نقطۂ نظر پر جا پہونچا جب ایک خدا کے پرستار وضو کر کے عبادت میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ وقت نازک تر تھا، آسمان سے آگ برستے معلوم ہوتی تھی۔ لڑائی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس موقع پر کم لوگ ہوں گے جو فرض کو فرض کی حیثیت سے یاد رکھ سکیں۔ لیکن اس حق و باطل کی گھمسان میں ابو ثمامہ صیداوی نے امام کی خدمت میں حاضر ہو کر نماز کی خواہش کی اور انھوں نے عمر سعد سے مہلت طلب کی۔

کتنا واقعہ عجیب ہے کہ فرزند رسولؐ کو نماز کی مہلت نہ مل سکی اور کینہ فطری کا کچھ ایسا عبرت ناک مظاہرہ ہوا کہ حبیب ابن مظاہر برداشت نہ کر سکے اور اپنے آقا و سردار سے رخصت ہو کر جنت کی سمت کوچ کر گئے۔ انکی شہادت سے امام کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اب بھلا جان نثاروں کو کہاں تاب تھی؟ جسقدر بچ رہے تھے وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ نصف تو امامؑ کے ساتھ نماز میں مشغول ہو گئے۔ بقیہ آدھوں نے بڑھتی ہوئی فوج کو بے پناہ حملوں سے پیچھے ہٹانا اور درہم برہم کرنا شروع کیا۔

حر بھی شہادت کا پختہ عزم لیکر بڑھا۔ آنکھوں سے جوش و خروش اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ زبان پر رجزیہ اشعار تھے اور وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ "میں قسم کھاتا ہوں کہ قتل نہ ہوں گا جبتک حریفوں کو قتل نہ کر لوں اور مارا نہ جاؤں گا مگر پیشقدمی کی حالت میں۔ میں آج شمشیر زنی کروں گا فیصلہ کن شمشیر زنی؛ میرے قدم پیچھے سرکیں گے نہ کمزوری کا اظہار ہو گا۔ میں تیغ زنی کروں گا اُس بہترین انسان کی جانب سے جس نے حرم کی سرزمین پر کبھی قیام کیا تھا"

ادھر حر نے حریف پر سخت حملہ شروع کیا۔ ادھر زہیر بن قین نے اس کی متابعت کی دونوں بہادر صفوں میں ڈوب ڈوب کر دشمنوں کو تہہ تیغ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ چوں کہ فرزند نبی کی طرف صرف گنتی ہی کے اصحاب بچ رہے تھے۔ وہ بھی صبح سے اب تک لگاتار جنگ کرنے کے باعث نہایت زخمی ہو چکے تھے اور حریفوں کی خواہش تھی کہ سورج ڈوبنے سے قبل ہی ظاہری فتح حاصل کر لی جائے اس واسطے وہ بھی لڑائی میں پوری کد و کاوش کر رہے تھے۔ ایک ایک مجاہد پر ہزاروں کا نرغہ تھا۔ لیکن ان دونوں کی لڑائی ایک مخصوص انداز پر ہو رہی تھی جب حر دشمنوں میں گھر جاتا تھا تو زہیر بے پناہ قوت سے حملہ آور ہو کر مخالفین کو دفع کر دیتے تھے اور جب زہیر پر آنچ آنے لگتی تھی تو حر ان کی نصرت کو دوڑ پڑتا تھا۔

اس گھمسان کی لڑائی میں دو شیروں نے خدا ہی بہتر جانتا ہے کتنے روباہوں کو کاٹ چھانٹ کر ڈال دیا؛ لیکن اس کا کوئی علاج نہ تھا کہ لاکھوں کی تعداد میں سیکڑوں یا ہزاروں کی کمی کسی خاص کمزوری کا اظہار نہ کرتی تھی جب دلاوروں کی تلوار کے شرارے قریب پہونچتے تھے تو وہ متفرق ہو کر دور دور سے ڈھیلے آگ اور تیر برسانے لگتے تھے پھر موقع ملتے ہی نزدیک ہو کر نیزے اور تلواریں چلانے میں مشغول ہو جاتے تھے۔

حر کی عدیم النظیر دلاوری میں کلام نہیں ہو سکتا لیکن زخموں کی بہتات اور کثرت سے خون خارج ہو جانے سے مضمحل کرنا شروع کر دیا۔ اگر ایمانی طاقت اور مواسات کا جذبہ بازو نہ تھامے ہوتا تو کب کا گر کر جان بحق ہو چکا ہوتا۔ پھر بھی اس کی نقاہت ایک

نہ تھی۔ جو دشمنوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہ سکتی۔ تاڑنے والی نظروں نے تاڑتے ہی اسے سخت محاصرے میں لے لیا۔ فیصلے کن حملے شروع ہوگئے حر لڑا اور حیرت انگیز طریقے سے جم کر لڑا تاہم قوت کا زوال شہادت کے رتبہ سے قریب کرنے لگا۔

زہیر بن قین کسی قدر فاصلے پر شمشیر زنی میں مصروف تھے پہلے تو انھیں حر کے گھر جانے کا علم ہی نہ ہوگا مگر جب ایک قوی حملے کے ساتھ انھوں نے سامنے کی بھیڑ کو چھانٹ دیا۔ تو حر کی طرف توجہ کی۔ وہ خونچکاں تلوار چلاتے دشمنوں کے سر و گردن میں تفرقہ ڈالتے اس گروہ پر جا پڑے جو حر کو حلقے میں لئے وحشیانہ جنگ کر رہا تھا۔ انتہائی جد و جہد کے بعد بھیڑ چھنٹی تو زہیر نے دیکھا کہ حر زمین پر پڑا دم توڑ رہا ہے۔

حر کی شہادت نے زہیر کو غضبناک کر دیا انھوں نے غیر معمولی شدت سے حملہ کر کے حریفوں کو دور تک بھگا دیا۔ پھر واپس آکر حر کی میت اٹھائی اور امام کے سامنے لائے۔ اپنے فدائی کی لاش دیکھ کر امام زمین پر دو زانو بیٹھ گئے حر کا سر اٹھا کر گود میں رکھ لیا پھر اپنے گلے سے سیدہ پاک کا رومال کھول کر حر کے چہرے کا خون صاف کیا اور پیشانی کے زخم پر باندھ کر فرمایا "تم بے شک حر ہو" تمھاری ماں نے تمھارا نام حر بہت ٹھیک رکھا تھا۔ تم دنیا میں بھی حر ہو اور آخرت میں بھی حر ہو" اس کے بعد دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے دعا فرمائی! میرا مہمان تھا، میں اس کی کوئی مہمانی نہ کر سکا تو جنت میں اس کی مہمانی کرنا اور حور و قصور عطا فرمانا"

اہلبیتِ رسول کی مدینہ کو واپسی

(مولانا ابوالکلام آزاد)

یزید نے اہلبیت کو اپنے معتبر آدمی اور فوج کی حفاظت میں رخصت کر دیا۔ اس نے رستہ بھر ان مصیبت زدوں سے اچھا برتاؤ کیا۔ جب یہ منزل مقصود پر پہنچ گئے تو حضرت زینبؑ بنتِ علیؑ اور فاطمہؑ بنتِ حسینؑ نے اپنی چوڑیاں اور کنگن اسے بھیجے اور کہا "یہ تمہاری نیکی کا بدلہ ہے ہمارے پاس کچھ نہیں کہ تمہیں دیں"۔

اس شخص نے زیور واپس کر دیئے اور کہلا بھیجا "واللہ میرا یہ برتاؤ کسی دنیاوی طمع سے نہیں تھا۔ رسول اللہ صلعم کے خیال سے تھا۔"

مدینہ میں ماتم:- اہلِ بیت کے بہت پہلے مدینہ میں یہ جانگسل خبر پہنچ چکی تھی۔ بنی ہاشم کی خاتونوں نے سنا تو گھروں سے چلاتی ہوئی نکل آئیں۔ حضرت عقیل بن ابی طالبؓ کی صاحبزادی آگے آگے تھیں اور یہ شعر پڑھتی جاتی تھیں۔

ماذا تقولون ان قال النبی لکم ماذا فعلتم وانتم اخر الامم
(کیا کہو گے جب تم سے سوال کریں گے کہ اے وہ جو سب سے آخری امت ہو)

بعترتی وباھلی بعد مفتقدی منھم اساری ومنھم ضرجوا بدم
(تم نے میری اولاد اور خاندان سے میرے بعد کیا سلوک کیا۔ کہ ان میں سے بعض قیدی اور بعض خون میں نہائے پڑے ہیں)

مرثیہ:- حضرت حسینؑ کی شہادت پر بہت سے لوگوں نے مرثیے کہے۔ سلیمان بن قتہ کا مرثیہ بہت مشہور ہوا۔

مررت علی ابیات آلِ محمدؐ فلم ارھا کعھدھا یوم حلت
(میں خاندان محمدؐ کے گھروں کی طرف سے گزرا مگر وہ کبھی روئے نہ تھے جیسے اس دن جب ان کی حرمت توڑ دی گئی)

فلا یبعد اللہ الدیار واھلیا وان اصبحت اھلھا قد تخلت
(خدا ان مکانوں اور مکینوں کو دور نہ کرے اگرچہ وہ اب اپنے مکینوں سے خالی پڑے ہیں)

وان قتیل الطف من آل ھاشم اذل رقاب المسلمین فذلت
(کربلا میں ہاشمی مقتول کے قتل نے مسلمانوں کی گردنیں ذلیل کر ڈالیں)

وکانوا رجاء ثم صاروا رزیۃ فقد عظمت تلک الرزایا وجلت
(ان مقتولوں سے دنیا کی امیدیں وابستہ تھیں مگر وہ مصیبت بن گئے۔ آہ یہ مصیبت کتنی بڑی اور سخت ہے)

الم تر ان الارض اصبحت مریضۃ لفقد حسینؑ والبلاد اقشعرت
(کیا تم نہیں دیکھتے کہ زمین حسینؑ کے فراق میں بیمار ہے اور دنیا کانپ رہی ہے)

وقد اعولت تبکی السماء لفقدہ وانجمھا ناحت علیہ وصلت
(آسمان بھی اس کی جدائی پر روتا ہے ستارے بھی ماتم اور سلام بھیج رہے ہیں)

(محرم نمبر ۱۳۷۶ھ)

شہادت کا مفہوم

حسین ابن علیؑ شہید کی حیثیت میں

یزید سے آویزش

جابرانہ حکومت کے خلاف انقلاب آفریں احتجاج

——"جناب علامہ سید اختر علی صاحب تلہری مصنف ابتلائے عظیم"——

دنیا میں خونی آویزشیں برابر ہوتی رہتی ہیں اور اس سلسلہ میں بہت سے جانداروں کی لاشیں خاک و خون میں لوٹتی ہیں لیکن ان معرکوں میں کام آنے والوں کو بالعموم شہید نہیں کہا جاتا ان کے سروں کا گلوں سے جدا کیا جانا شہادت کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا۔

ڈاکوؤں کے دو قسمی انقلاب گروہ اجوع الارض میں مبتلا دو حکمراں اگر آپس میں ٹکرا جائیں اور تلواروں کی نوکیں اور برچھیوں کی انیاں ایک دوسرے کے سینوں میں پیوست ہو جائیں تو اس سے ان کے لہو کی چھینٹوں میں طہارت کا نور پیدا نہیں ہوتا۔ فرشتے ان کی لاشیں گود میں لینے کے لئے دوڑ نہیں پڑتے، قدرت کی طرف سے "حیات سرمدی" کا خلعت انھیں عطا نہیں ہو جاتا۔ ان کی تاریک مادیت بدستور مادیت رہتی ہے۔ ان کے خون سے نجاست کی بو نہیں جاتی۔ ملائکہ ان کے قریب نہیں پھٹکتے۔ قدرت کے قہر و غضب کی نگاہیں اب بھی ان پر سابق کی طرح پڑتی ہیں۔

سوال ہوگا پھر آخر شہادت کیا ہے؟ شہید کے خطاب سے کون مقتولین سرفراز ہوتے ہیں؟ جواب صاف ہے۔ خدا کے بندوں کا کسی طیب و طاہر روحانی مقصد کے لئے ایزد عزوجل کی خوشنودی مدنظر رکھتے ہوئے اپنے جسموں کو خون کی پیاسی تلواروں کے لئے پیش کر دینا، دار پر کھینچ جانا، پھانسی کے تختے پر چڑھ جانا، جام زہر شربت کے گھونٹ کی طرح پی جانا مختصر لفظوں میں فی سبیل اللہ جان دے دینا۔

جب کچھ عیش و عشرت کے بندے "نفس امارہ" کے احکام کے پرستار، روحانی دیانتوں کے گراں مایہ متاع کے دشمن، انسانی شرافتوں کے تابناک جواہر کے لٹیرے، خدا کی مخلوق کو غلام بنانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی آزاد روحوں کو مختلف غیر فطری قیدوں میں جکڑ دینا چاہتے ہیں۔ جب وحدہٗ لاشریک کے عباد کی زبانیں اپنی زبانیں نہیں رہتیں ان کے ضمیر کی آوازیں کچل دی جاتی ہیں۔ ایزدی احکام برابر روندے جاتے ہیں۔ مذہبی فرمانوں کا باقاعدگی کے ساتھ گلا گھونٹنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ ظلم و جور کا سکہ عام طور سے چلنے لگتا ہے۔ تو یہ حالت ان برگزیدہ بندوں کے تحمل سے باہر ہو جاتی ہے، جن کی رگوں میں ایثار و قربانی کا خون دوڑتا ہوتا ہے جو انسانی شرافت کے اصول یوں پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔

وہ پہلے ان گم کردہ راہوں کی فہمائش کرتے ہیں۔ انھیں بتاتے ہیں کہ یہ طور طریقے غیر انسانی ہیں۔ انصاف و معدلت کی بنیادیں اپنی مجرمانہ خواہشوں کی خاطر گرا دینا ذلیل ترین حیوانیت ہے۔ یہ کافرانہ اعمال و فاجرانہ افعال ایزد برحق کے

قہر و غضب کی بجلیوں کو دعوت دینے والے ہیں۔ سخت گیری و استبداد کی حکومت اس کی نگاہوں میں غیر قابل عفو تمدنی معصیت ہے۔ غرض کہ ان کے راہ راست پہ لگانے کی جو شریفانہ تدبیریں ہو سکتی ہیں انھیں ایک ایک کر کے آزما لیا جاتا ہے۔ یہ ضروری حجتیں سب ختم کر لی جاتی ہیں۔ جب کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا اور ان کے جبر و استبداد کی قوتیں سر نیچا نہیں کرتیں تو پھر یہ برگزیدہ بندے ان کے مقابلہ میں بہادری اور پامردی کے ساتھ صف آرا ہو جاتے ہیں۔ اور ان خودسروں کے خلاف وقت کے مناسب انقلاب پیدا کرنے کی سعی جمیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ امکانی حیثیت تک وہ اپنے نفوس تہلکہ میں نہیں ڈالتے۔ خواہ مخواہ بلا ضرورت اعدائے حق کے کھنچے ہوئے خنجروں پر اپنے گلے نہیں رکھ دیتے۔ لیکن جب حمایت دین و ملت کی جنگ و دو میں چمکتی ہوئی برچھیوں کی نوکیں سینوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ اور ان سے بچنا بزدلی کا نشان اور اصلی مقصد کو نقصان پہونچانے کا موجب ہوتا ہے تو پھر مسکراتے ہوئے اپنے طیب و طاہر خون سے اعدائے دین کے پیاسے نیزوں کو سیراب کرتے ہیں۔ پُر غرور اور پُر نخوت حکمرانوں کے قید و بند کی سختیاں جھیلتے ہیں۔ دار پر کھینچے ہیں۔ ان کی خون آشامی اور سفاکی کا نشانہ بنتے ہیں۔

یہی وہ محترم نفوس ہیں جو شہدا کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور اسی حکیمانہ جانبازی کو شہادت کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اور اسی روحانی مسافت کے طے کرنے والوں کے جسم سے جو خون کی چھینٹیں اڑتی ہیں وہ ایزدی طہارت کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ انھیں فرشتے اپنی آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں ایسی وہ مرتبہ ہے جو خاصان خدا میں سے بھی بہت کم افراد کو نصیب ہوتا ہے۔ حقیقی محبت کی داستان کی یہی وہ سرخی ہے جو کامیابی وفا کی سچی تشریح ہے۔ انھیں پُر دل و پُر جگر دلاوروں کا لہو یزداں شناسی کے راستہ میں امتیاز بین الحق والباطل کے واضح نشان قائم کر دیتا ہے۔ انھیں روحانی حوصلہ مندوں کا خون کی عبائیں تن تنکے اور صفا رہانی دیانتوں کو کفر و ضلال کے پھیلے ہوئے دامنوں کے سایہ سے محفوظ رکھتا ہے۔

انسانی تاریخ کے متعدد صفحے اس سر فروش گروہ کے نورانی خون سے شفق گوں بنے ہوئے ہیں۔ زمانہ کی نگاہوں نے بیسیوں بار احقاق حق کی بزم میں خاصان باری کو دار پر کھینچے ہوئے دیکھا ہے۔ آروں سے ان کے مطہر بدنوں کو دو نیم ہوتے مشاہدہ کیا ہے۔ زندان جفا میں حکومت کا تیار کیا ہوا زہر ہلاہل کا پیالہ خوشی خوشی پی کر دم توڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کے پاک جسموں سے سروں کے جدا کئے جانے کا نظارہ کیا ہے۔ لیکن سنہ ۶۱ھ والا یادگار واقعہ جس کے روحانی تصرف نے کچھ عرصہ کے لئے نظام عالم بدل دیا، زمین کو رلایا۔ آسمان کو محزون بنایا۔ اس نوعیت کے تمام واقعات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

رحمۃ للعالمین جناب محمد عربی کا پارہ جگر جسے باہوش زمانہ اب تک "حسین حسین" کہہ کر ماتم کرتا ہے، اپنے عدیم النظیر جانبازی اور فقید المثال سرفروشی کی اختصاصی حیثیت کی وجہ سے گروہ شہدا کا سالار قافلہ ہے۔

طاغوتی عساکر و افواج نے میدان نینوا میں فرات کے کنارے خدا کے اس برگزیدہ بندہ پر یزید سے سرکش جو متمرد و جابر سلطان کے عبودیت کا قلادہ گردن میں نہ ڈالنے کے جرم پر جو مظالم توڑے تھے ان کے دیکھنے اور سننے کا کیا ذکر کسی بشر کے دل میں کبھی ان کا خطور بھی نہ ہوا ہوگا

کون ظلم ایسا تھا جو اس شہید پر روا نہ رکھا گیا ہو لیکن اس کے مقدس ارادے میں کوئی اضمحلال نہ پیدا ہو سکا وہ اس قہرمانی حکومت کے خلاف جس ضروری انقلاب کے پیدا کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اسے پیدا کیا اور جان دے کر پیدا کیا۔

وہ اور اس کے جاں نثار احباب اور باوفا عزیز ضرور اس روحانی جد و جہد میں اپنے خون میں لوٹے۔ ان

کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے ان کے اہلبیتؑ کے
کانے ظلم کی رسیوں میں کسے گئے - ان کے خیمے اور دوسرے
سامان راکھ اور خاک کا ڈھیر بنا دئے گئے - ان ظلم
آفرینیوں کا نتیجہ کیا ہوا - انقلاب ، انقلاب ، انقلاب
اس کامل و مکمل شہید کا سر نیزہ پر برابر قرآنی تہدید " و
سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون " کی تلاوت
کر رہا تھا - گویا اس عنوان سے وہ دنیا کو سمجھا رہا تھا کہ اس
کی شہادت مقبول ہوئی - اس نے جس انقلاب کے پیدا
کرنے کا ارادہ کیا تھا اس کی بنیو پڑ گئی - اس کے بے گناہ
خون کے قطرے عنقریب چنگاریوں میں تبدیل ہو کر یزیدی
سطوت اور اس کی دراز دستیوں کا خرمن پھونک دیں گے

حسینؑ یقیناً شہید تھے - ان کا مقصد خالص ربانی تھا
ان تمام جانبازیوں سے ان کا مقصد محض خوشنودی خدا کا
حاصل کرنا تھا - " تحفظ نفس کا ضروری حد تک لحاظ رکھا
گیا تھا تمام حجتیں ختم کی جا چکی تھیں شہادت کا خیر انہیں امور
سے تیار ہوتا ہے
ان مسخ شدہ فطرتوں سے ہمیں بحث نہیں جو دنیا کے اس
سب سے بڑے شہید کے مقاصد کو دنیوی اغراض میں آلودہ
بتلانے پر تلے ہوئے ہیں - انہیں یہ تمام کشمکش مادی اقتدار میں
برتری حاصل کرنے کی جد و جہد معلوم ہوتی ہے -
حسینؑ کا فلسفۂ حیات فقیروں اور مسکینوں کی مواسات
ہو جس نے دنیوی عیش و عشرت کو ہمیشہ ٹھکرایا ہو وہ یزیدی
سلطنت کے لعل و جواہر پر کیا نگاہ ڈال سکتا ہے - جس نے
عصمت و طہارت کے مقدس جھونپڑے میں زندگی بسر کی ہو
اسے دنیوی فرمانرواؤں کے طلائی و نقرئی ایوانوں سے کیا
واسطہ ہو سکتا ہے -
حسینؑ ایزد بے ہمتا کا سچا بندہ تھا - اپنے معبود کی مرضی
پر چلنا اس کا واحد نصب العین تھا - رسولؐ کی خلافت
پر جو ایک خالص ربانی منصب تھی دنیا کے بوالہوسوں

کے ہاتھوں بدترین سلطنت میں جس طرح تبدیل ہو رہی تھی
اس کے لئے ناقابل تحمل امر تھا - اس کے نانا کی امت جو
حقیقی حریت و آزادی کی نقیب قرار دی گئی تھی - اور جس
کا مسلک یہ بتایا گیا تھا کہ اس کا سر واحد قہار کے سوا
اور کسی کے سامنے نہ جھکیں ذلیل طریقہ سے غلام بنائی جائے
اس کے سر پر چند فاسق و فاجر خود سر حکمراں " اربابا من
دون اللہ " بن کر بیٹھ جائیں - حسینؑ سا شریف انسان
کیوں کر گوارا کر سکتا تھا - وہ جانتا تھا کہ سچے مسلمانوں کا
کام غلاموں کے کانوں سے عبودیت کے حلقے توڑ کر پھینک
دینا ہے - خود غلام بن جانا نہیں - پر استبداد و فسق و
فجور اور ملحدانہ طغیان و سرکشی کے منصوبوں کی بنیادیں
گرا دینا ہے - اپنی بے وقت کی خاموش ہمدردیوں سے ان
کا اور مضبوط کر دینا نہیں -
یزید حرص و ہوس کے کھیل جس طرح کھیلتا رہا تھا -
اور ابلیسی لذتوں اور شیطانی عشرتوں کے حصول کے لئے
انسانی شرافتوں کا خون جس بے دردی سے بہانے کا عادی
تھا - ان سے کون بے خبر تھا - اس کی مے نوشی کی سیہ
مستیاں اس کی بوالہوسی کی دراز دستیاں کس سے پوشیدہ
تھیں -
اسلامی اصول شراب کے مٹکوں میں ڈبوئے جا رہے
تھے - شریعت محمدیہ نے عفت و پاکبازی کی جو دیواریں اونچی
کر دی تھیں - انہیں مکروہ ترین سیہ کاریوں سے گرایا جا
رہا تھا - ایسی حالت میں کیا مکارم اخلاق کی تکمیل کرنے
والے رسولؐ کی آغوش کے پروردہ حسینؑ کے لئے یہ کسی طرح
سے مناسب ہو سکتا تھا کہ وہ ایسے تباہ کار ایزد فراموش
بادشاہ کی غلامانہ بیعت کر کے دین و ملت کو مٹ جانے
دیتے - ؟ اسلام کی کشتی یزیدی طغیان و عدوان کے گرداب
میں ڈوب جانے دیتے ؟
ناممکن تھا کہ حسینؑ کی فطری جانبازی اس صورت
میں کروٹ نہ لیتی اور موجودہ سلطنت کے الٹ دینے کے

لئے مردانہ وار تیار نہ ہو جاتے۔ وہ اٹھے اور پورے عزم و استقلال کے ساتھ اٹھے اور حکیمانہ طور پر انقلاب کے کالبد میں روح پھونکنا شروع کر دی۔

حسینؑ یہ تمام مراحل بشری حیثیت سے طے کر رہے تھے۔ مقصد کی تکمیل ملحوظ رکھتے ہوئے "اہلاک نفس" کے الزام سے بھی حتی الامکان محفوظ رہنے کی سعی پیش نظر تھی۔ اپنے انصار کی تعداد بڑھانے کی دیانتدارانہ کوشش کئے بغیر تن تنہا یزیدی لشکر کے مقابلہ میں جان دے دینا آنے والی نسلوں کے لئے اچھا سبق نہ ہوتا۔ کوفیوں نے خطوط کے ذریعہ سے ساتھ دینے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ ان کی دعوت کو وقتی ظاہری حیثیت سے قبول کرنا ناگزیر تھا۔ آپ نے حضرت مسلمؑ کو اپنی بیعت کے لئے کوفہ بھیجدیا۔ اور بعد میں حضرت محمد حنفیہ وغیرہ کی مخالفت کے باوجود آپ بھی مع اپنے اہلبیتؑ کے چل کھڑے ہوئے۔

واقعات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ حضرت مسلمؑ کوفہ میں مع جناب ہانیؑ شہید ہوگئے اور آپ بہتر رفقاء و اعزہ کے ساتھ میدان نینوا میں، آپ کا حضرت مسلمؑ کو کوفہ بھیجنا حکومت طلبی کا نتیجہ نہ تھا۔ جاہ دنیا حاصل کرنے کی خواہش اس اقدام کی محرک نہیں ہوئی تھی۔

حسینؑ فی الحقیقت اگر حکمرانی ہی کے خواہشمند ہوتے تو مدینہ ہی میں آپ عبداللہ بن زبیر وغیرہ سے ناجائز سازشیں کرکے ایسی طاقت بہم پہونچا سکتے تھے جو بہت ممکن تھا کہ اس اموی بادشاہ کا سر کچل دیتی۔ لیکن یہاں تو مقصد ہی اور تھا ظلم و استبداد کے خلاف ایک باقاعدہ روحانی انقلاب کی بنیاد ڈالی جارہی تھی۔ اس میں غیر شریفانہ سازشوں اور اندرونی منافقتوں کے در خور پانے کا کوئی محل ہی نہ تھا۔ راست بازی و دیانتداری ہی اس کے اصلی عنصر تھے۔

حسینؑ کی اس جد و جہد پر آغاز سے انجام تک نظر ڈالی جائے کوئی بات نظر نہیں آسکتی جو سیاسی عیاری یا خدائی کے تحت میں درج ہو سکے۔ کوئی بات راز نہیں، تمام معاملات بالکل واضح اور صاف احاکمانہ نخوت و استبداد کو کھلی ہوئی دعوت مقابلہ۔ حسینؑ کا نعرۂ جنگ ابتدا سے "عزت نفس یا موت" تھا۔ وہ یزید کی بیعت کرکے اپنی روح کو جو خدا کی خالص عبادت کا شرف رکھتی تھی۔ ذلیل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ برابر یہ کہتے رہے کہ انہیں حکومت سے سروکار نہیں۔ وہ عرب چھوڑ دینے کے لئے تیار ہیں لیکن بیعت نہیں کر سکتے۔ آپ نے حکومت وقت سے خود دارانہ مصالحت کا کوئی طریقہ اپنی طرف سے اٹھا نہیں رکھا اور اس طرح اپنی مظلومیت کی تصویر پورے طور سے مکمل کر دی۔ فی الحقیقت شہادت کا وجود اسی قسم کی بے لوث مظلومیت میں ہوتا ہے۔ شہادت اپنی تکمیل کے لئے اسی قسم کی معصومانہ مظلومیت کی جو یا رہتی ہے۔

حسینؑ نے اس کا بڑا خیال رکھا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کی عجیب و غریب جنگ جو بظاہر ان بہترؑ نفوس کی ہلاکت اور بباطن اموی سلطنت کا تختہ الٹ دینے پر ختم ہوئی۔ غیر شریفانہ عناصر کی آمیزش سے بالکل محفوظ رہے اور کوئی کام روحانیت کے جادے سے ہٹ کر نہ پڑے۔

عاشور کی شب ہے۔ آپ بے شمار مخالف فوجوں میں گھر چکے ہیں۔ آنے والی صبح کے ساتھ قیامت کا سامان مصائب کا آغاز ہونے والا ہے۔ آپ نے اپنے اصحاب کو جمع کیا۔ سید سجادؑ کا بیان ہے کہ میں بیمار تھا۔ کوشش کرکے کچھ اور قریب گیا تاکہ امام وقت کے ارشادات اچھی طرح سن سکوں آپ نے یوں فرمانا شروع کیا۔

"میں خدا کی بہترین ثنا کرتا ہوں اور ہر مسرت و نفرت کے موقع پر اس کی حمد کرتا ہوں۔ اے خدا میں تیری حمد کرتا ہوں اس امر پر کہ تو نے ہمیں نبوت کے ساتھ مکرم بنایا اور تو نے ہمیں قرآن کی تعلیم دی اور ہمیں دین میں فہم عطا کی۔ ہمیں تو نے

آنکھیں، کان اور دل بخشے ہیں تو ہمیں اپنے شکر گزار بندوں سے قرار دے۔ اما بعد۔ میں نے اپنے اصحاب اور اہلبیتؑ سے زیادہ نیک اور زیادہ باوفا نہیں دیکھے خدا میری طرف سے تمہیں جزائے خیر دے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس جماعت سے ایک ہی دن کی اور مہلت ہے۔ میں تم کو اجازت دیتا ہوں میں نے اپنا عہد تم سے اٹھا لیا۔ اب تم بالکل آزاد ہو اس رات کی تاریکی میں تم لوگ خوشی سے جہاں چاہو چلے جاؤ۔"

اس مقام پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حسینؑ مصیبتوں کے آتشیں سمندر میں کھڑے ہوئے ہیں۔ حسینؑ کا اپنے اصحاب کی تعریف میں یہ فرمانا کہ میں نے ان سے زیادہ نیک اور باوفا اصحاب نہیں دیکھے، شاید مبالغہ پر محمول کیا جاتا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس میں مبالغہ بالکل نہیں ہے۔ اوروں کا ذکر کیا خود رسول اللہؐ اور جناب امیرؑ کے اصحاب مجموعی حیثیت سے یقیناً اتنے نیک اور باوفا نہیں تھے۔ اصحاب رسولؐ و اصحاب علیؑ نے مجموعی طور پر کب ثبات قدم اور جاں بازی کے اتنے مکمل نمونے پیش کئے ہیں اور پھر انھیں نے معرکہ ہائے جنگ میں جو سرفروشیاں دکھائی تھیں ان کا موقع دوسرا تھا۔ کامیابی کی بھی امیدیں تھیں، اصحاب حسینؑ کی حالت ہی دوسری تھی۔ انھیں ظاہری کامیابی کی سرے سے کوئی امید ہی نہ تھی۔ موت سامنے کھڑی تھی اور پھر بھی وہ موت کا پیالہ پینے میں ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اب اصحاب حسینؑ خود امامؑ کے ارشاد کے بموجب آزاد تھے اگر وہ چھوڑ کر چلے جاتے تو ان سے کوئی ظاہری مواخذہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کی خداشناسی دیکھئے کہ وہ اپنے اس بلند مرتبہ روحانی قائد کی جدائی گوارا نہ کر سکے۔ اس شہادت کا فلسفہ وہ اس کا عمل اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ انھوں نے امامؑ کے ارشاد کا جواب ان لفظوں میں دیا "خدا کی قسم ہم آپ کو اس زندگی میں نہیں چھوڑ سکتے۔ جب تک اسلحہ ہمارے قبضہ میں ہیں ہم ان سے لڑیں گے جب وہ ٹوٹ جائیں گے تو ہم پتھر ماریں گے خدا کی قسم ہم اگر قتل کئے جائیں اور پھر جلا دئے جائیں اور پھر زندہ کئے جائیں اور قتل کئے جائیں اور یہی عمل ستر مرتبہ کیا جائے تو بھی ہم آپ کے قدموں سے جدا نہیں ہو سکتے۔ مرنا اور قتل ہونا تو ایک مرتبہ کا ہے اور اس کے بعد ابدی کرامت ہے۔ خدا کی قسم ہم سے یہ بے وفائی نہیں ہو سکتی۔" وہ اصحاب رسولؐ و اصحاب علیؑ کتنے تھے جو اپنے قائد و رہنما پر اتنے فدا ہوں؟ دنیا کی اس سب سے بڑی شہادت کے تکملہ کے لئے حسینؑ کے لہو میں ان جانثاروں کے خون کی آمیزش یقیناً ضروری تھی۔ نیزے زہر میں بجھی ہوئی تلواروں اور برچھیوں کی مہمانی درپیش ہے۔ چند ساعتوں کے بعد خون میں نہانا ہے۔ لیکن آپ کس قدر اطمینان کے ساتھ ان لفظوں میں خدا کی حمد کر رہے ہیں جن سے تسلیم و رضا کا انتہائی مرتبہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس جنگ کی مذہبی حیثیت غیر مشتبہ رکھنے کے لئے آپ اسی موقع کی حمد و ثنا کے متعلق اپنے جد امجد کے رسولؐ ہونے پر اپنے کو قرآن کے رموز و نکات کا حامل اور دین کے اسرار سے واقف ہونے کو قرار دے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کا یہ فرمانا کہ تو نے ہمیں آنکھیں، کان اور دل عطا کئے ہیں اس لئے تو حمد کا مستحق ہے اعلیٰ درجہ کی حکیمانہ بلاغت پر مشتمل ہے۔ گویا آپ اس طریقہ سے یہ بتلا رہے ہیں کہ میرا یہ اقدام نافہمی کا نتیجہ نہیں ہے۔ میں نے ان نزلہ سامان مصائب کو غیر دانشمند سیاست کی وجہ سے اپنے سر پر دعوت دی ہے۔ میری آنکھیں اس گمراہ گروہ کے اعمال کی شاہد ہیں۔ میں اپنے کانوں سے ان کی کافر اعمالیوں کے دائم افسانے سن چکا ہوں۔ پھر میرے پاس حساس دل تھا انسانی درد رکھنے والا دل۔ تمہارا میں یہ طرز نہ اختیار کرتا تو کیا کرتا۔ میرا یہ اقدام دل و دماغ دونوں کے مجموعی اثرات کا نتیجہ ہے۔ موقع کی نزاکت دیکھو اور پھر اس حکیمانہ بلاغت کے ساتھ حمد الٰہی کا طریقہ

بجالا کر اپنے احباب و اہلبیتؑ کا حق وفا کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت صفائی کے ساتھ یہ فرمانا دیکھو کہ تم اس شب کی تاریکی میں جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ میں نے اپنی بیعت تم سے اٹھالی ہے۔ دشمنوں کو مجھ سے غرض ہے۔ تم سے نہیں۔ یہ وہ نازک مقامات ہیں جن میں گھر کر انسان اپنے بچنے کی گھاتیں سوچتا ہے اپنے بچوں اور عورتوں کی فکر کرتا ہے لیکن اس وقت حسینؑ کا انداز دوسرا ہے۔ ان کی بشریت دوسرے رنگ میں شرابور ہو چکی ہے۔

یزیدیت اور شمر طینتی کا اس کے بعد کچھ بھی فیصلہ ہو لیکن اے حسینؑ ہماری جانیں تجھ پر فدا ہوں۔ تو شہید ہے شہید۔ تو نے کربلا میں شہادت کا بہترین "مثالیہ" قائم کر دیا۔ ایثار و قربانی میں تو نے اپنے اس خوں چکاں اقدام سے حیات تازہ ڈال دی۔ دنیا کو نہایت کامیاب طریقہ سے اس حکیمانہ شجاعت کی تعلیم دے دی۔ جو ہمیشہ جبر و استبداد کو سرنگوں بنا سکتی ہے اور انہیں سرمیدان للکار کر شکست دے سکتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ قومیں جو تجھ سے معصوم جاں بازوں اور باعرفان سرفروشوں کو اپنا روحانی پیشوا بنائیں اور اپنے اعمال و افعال کو تیرے ایثار و قربانی کی روح سے متاثر کریں۔

محرم ۱۳۷۹ غرہ سنہ

واقعہ کربلا کی نشر و اشاعت کیلئے ایک مقتدر برادرِ وطن کا گرانقدر عطیہ

آج سے تیرہ سو سال قبل جب ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود بھی نہ تھا حضرت سید الشہداء حسینؑ مظلوم دار داخلہ الفداء ہندوستان آنے پر آمادہ تھے۔ حضرتؑ کی یہ آمادگی بتاتی ہے کہ ہمارے برادران وطن کی قدردانی امام مظلومؑ کے پیش نظر تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے وطنی بھائیوں کے دلوں میں حسینیت گھر کر چکی ہے۔ وہ بارگاہ حسینؑ میں جو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں وہ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں سے کچھ زائد حسین مظلومؑ سے محبت کا جذبہ موجود ہے۔

مسلمان فرزند رسولؐ سمجھ کر حسینؑ اور حسینیت سے جتنی بھی محبت کریں وہ کم ہے۔ غیر مسلمین باوجود مغائرت مذہب، حسینؑ اور حسینیت سے جس شیفتگی کا اظہار فرماتے ہیں وہ حد درجہ قابل ستائش ہے۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں محترمی عالیجناب چندر موہن صاحب نگم آئی۔ اے۔ ایس ایڈمنسٹریٹر میونسپل بورڈ و امپرومنٹ ٹرسٹ بنارس نے مبلغ دوسو پچاس روپیہ کا گرانقدر عطیہ ترویج و اشاعت واقعہ کربلا کے لئے بذریعہ محسن ملت عالی جناب سید محمود اطہر صاحب زائر سیتاپوری منیجر ریاست محمود آباد امامیہ مشن کو مرحمت فرما کر اپنی حسینیت دوستی کا بیّن ثبوت دیا ہے۔

جناب نگم صاحب موصوف محتاج تعارف شخصیت کے حامل نہیں ہیں۔ آپ کے خاندان کے افراد ہر عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے علم دوستی اور ادب نوازی اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ جناب منشی دیانرائن صاحب نگم مدیر "زمانہ" کانپور موصوف کے عم محترم تھے جن کے علمی و ادبی خدمات اور اردو نوازی کی دنیا معترف ہے اور رہتی دنیا تک بار تشکر و امتنان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ہمارے نگم صاحب بھی اپنی خاندانی روایات پر عامل ہیں۔ موصوف کے دل میں بھی علم دوستی اور ادب نوازی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسکے علاوہ ممدوح کو حسینیت سے بھی ایک خاص لگاؤ ہے اور آپ واقعہ کربلا سے بے حد متاثر ہیں۔ موصوف کا یہ گرانقدر عطیہ صد ہزار ستائش اور ارباب ملت کیلئے نمونۂ عمل ہے۔ ہم درگاہ احدیت میں اپنے اس محسن کیلئے دست بدعا ہیں کہ وہ منعم حقیقی ان کو طول عمر و جاہ عطا کرے اور انکے توفیقات میں اضافہ کرے۔ آمین ثم آمین۔

سید ابن حسین نقوی۔ آنریری سکریٹری امامیہ مشن۔ نخاس۔ لکھنؤ

محبت اہلبیت مسلمانوں کو اتحاد کا مرکز بنانا چاہیئے

مصنفہ حضرت عالیجناب خواجہ حسن نظامی صاحب (مرحوم)

مسلمانوں کا ہر فرقہ اہلبیت رسول اللہؐ سے محبت کرتا ہے، فرق صرف طریق محبت یا طرز محبت کا ہے، اگر ایک فریق دوسرے کے طرز طریق پر اعتراض نہ کرے اور سب فرقے مل کر ایک ایسا مشترکہ طریقہ بھی اختیار کر لیں جو کسی فریق کو ناگوار نہ ہو تو اہلبیت کی محبت سب مسلمانوں کے اتحاد کا مرکز بن سکتی ہے، مگر اس قسم کی تجویزیں مسلمانوں کے خیرخواہ ہمیشہ پیش کرتے رہے ہیں اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس واسطے میری رائے ہے کہ چھوٹے بچوں میں اس تحریک کو پھیلایا جائے، اسکولوں اور کالجوں کے طلباء اہلبیت کی سیرت کے محاسن سے واقف کئے جائیں تو بڑے ہونے کے بعد وہ سب اہلبیت کی محبت کے مرکز پر جمع ہو جائیں گے اور اس مقصد سے میں نے عملی کام شروع کر دیا ہے،

اگر شیعہ سنی جماعتوں نے محدود خیالی سے کام نہ لیا اور مقصد کی اہمیت کو سمجھ کر فروعات میں دخل نہ دیا تو مجھے امید ہے کہ سنہ ۱۹۲۹ء میں جس کام کی ابتدا کی گئی ہے اس کا نتیجہ سنہ ۱۳۵۱ھ کے محرم تک مسلمان جماعتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی اور میرا خیال ہے کہ اگر ہم سب نے مل کر اتحاد کی کوشش نہ کی تو دو چار سال کے بعد مسلمان نوجوان نہ شیعہ رہیں گے اور نہ سنی رہیں گے بلکہ مجھے تو یہاں تک اندیشہ ہے کہ شاید بہت سے نوجوان اسلام پر بھی نہ قائم رہیں کیونکہ وہ مذہبی بلبیوں کی خانہ جنگیوں سے عاجز آگئے ہیں اور ان کے دلوں میں مذہب اور اہل مذہب کی طرف سے نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ جو رفتہ رفتہ ایک خطرناک حد تک پہونچ سکتی ہے، اس واسطے ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر اس طرف متوجہ ہوں

یادگار حسینؑ ہمیشہ قائم رہے گی !!

عالی جناب پنڈت منوہر لال تیواری بی اے - ایل ایل بی ایڈوکیٹ - وائس چیرمین میونسپل بورڈ لکھنؤ

تاریخی نظر سے بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کی ایک بڑی ہستی ہو گئی ہے، ان کے اوصاف ایک کمال کی حد تک پہونچ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یادگار اس وقت تک تازہ ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ حضرت کا نفس پر قابو پانا، خدا کی ذات پر توکل رکھنا سچائی برتنا، نیک اور سچے اصولوں پر قربانی کرنا، مصیبت کا دلیری سے مقابلہ کرنا، ظالم اور غدار کے روبرو سخت سے سخت تکالیف پہونچنے کے باوجود سر نہ جھکانا، یہ ان کے ایسے اوصاف ہیں جنھیں ہر انسان کو اپنی زندگی کا معیار بنانا چاہیئے۔

باوجود ایسے نیک خصائل ہونے کے جو جو مصائب انھوں نے اور ان کے بھائی اور بال بچوں نے اٹھائے ہیں ان کے تذکرے سن کر ضرور ہر شخص کو رونا آتا ہے اس سے میں یہی ایک نتیجہ نکالتا ہوں کہ خدا اپنے نیک بندوں کا امتحان بہت سخت لیتا ہے، اور اگر کل سختیاں جھیل کر بھی وہ سچے راستہ پر قائم رہتا ہے تو وہی پھر خدا کی ذات میں ملنے کے قابل ہوتا ہے۔ ایسی ذات حضرت امام حسین علیہ السلام کی تھی

محرم نمبر سنہ ۱۳۵۳ھ

نینوا اور حسین علیہ السلام

(سید عابد حسین صاحب (مرحوم)، ساکن کھجوہ، بی اے، بی ال، ایڈیٹر مسلم ریویو جریدہ مدرستہ الواعظین، لکھنؤ)

جسوقت میں ان دونوں الفاظ یعنی نینوا اور حسینؑ پر تاریخی نظر ڈالتا ہوں تو مجھے عجیب و غریب واقعات یاد آتے ہیں جو دوسرے مقامات اور دوسری ہستیوں کے ساتھ وابستہ نظر نہیں آتے، آپ نینوا کہئے، ماریہ کہئے، قادسیہ کہئے، کربلا کہئے، اپنی تاریخی عظمت اور گوناگوں تغیرات اور مصائب میں بے نظیر ہے۔

اسی طرح حضرت آدم صفی اللہ سے خاتم الانبیاء جناب سرور کائناتؐ تک جس قدر نبی ہادی اور رسول گزرے اس مقدس صف میں اپنے اپنے فرائض اپنے مصائب، اپنی بیکسی، اپنی مظلومی کے نظریہ سے حسینؑ بھی عدیم المثال ہیں اور منفرد ہیں،

معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا یہ فیصلہ تھا کہ احیاء دین الٰہیہ کے لیے اسلام کو از سرنو تر و تازہ کرنے کے لیے کفر و الحاد کو ابدی طور پر سرنگوں کرنے کے لیے طاغوت کی حکومت مٹانے کے لیے سردار دو عالم کا نواسہ زہرا خاتون جنت کا لاڈلا، مرتضیٰ کا پیارا حسن کا قوت بازو، زینب کا ماں جایا تلواروں کے سایہ میں برچھیوں کی چھاؤں میں تیروں کی بارش میں، تشنہ اور گرسنہ جلتی ریگ پر نہر کے کنارے جہاں شہید ہو وہ ارض مقدس بھی اپنی نوعیت میں عظیم الشان ہو،

کربلا کی ارضی نوعیت اس وقت وہ نہیں ہے جو سنہ ۶۱ھ میں تھی اور جو کیفیت سنہ ۶۱ھ میں تھی وہ دو چند ہزار برس قبل موجود نہ تھی آفرینش کی ابتدائی تاریخ ناپید ہے، البتہ کھنڈروں کے کھودنے اور سنگی کتبوں کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دجلہ و فرات کے مابین جو دوآبہ ہے پہلے پہل انسانی آبادی اسی جگہ عالم شہود میں نظر آئی اور اسی مرکز سے ایک طبقہ نے یورپ جاکر آباد کیا، ایک نے افریقہ آباد کیا اور ایک نے ایران و ہندوستان آباد کیا، یہ ایک طولانی بحث ہے جس کا بیان کرنا فضول ہے لیکن یہ بات پایہ ثبوت تک پہونچی ہوئی حقیقت ہے جس سے انکار مشکل ہے،

اسی دوآبہ میں تاریخ بتاتی ہے کہ سومیریا کی حکومت قائم ہوئی اور جناب عیسیٰ ابن مریم کے چھتیس ہزار برس قبل یہ حکومت وجود میں آئی، اسکے بعد کلدانیوں کی شہنشاہیت کا دور دورہ رہا، پھر اسیریں ایمپائر وجود میں آئی۔ مرکز یہی دوآبہ رہا اور اردگرد کے تمام طبقات الارض دائرۂ حکومت میں شامل رہے۔ میڈیسن کی شہنشاہیت بابل کی حکومت کا آغاز بھی اسی مرکز سے ہوا۔ اور یہ دونوں سلطنتیں بڑی زبردست گذری ہیں، اسی مرکز پر قبضہ کرکے پرشین ایمپائر نے اپنا جلوہ دکھایا،

پھر رومن ایمپائر عالم شہود میں آئی اور پرشین ایمپائر سے تصادم ہوا اور رومن ایمپائر کا سکہ چلا۔ اسی مرکز سے جو لوگ افریقہ گئے مصر و فلسطین میں اپنی حکومت قائم کی، یورپ میں آباد ہوئے، ہندوستان اور ایران کو آباد کیا۔ پس انسانی آبادی کا معدن مخزن مرکز اور گہوارہ یہی دوآبہ جو درمیان دجلہ اور فرات کے ہے بنا اور رہا۔

گزشتہ صدی کے اہل یورپ مدتوں شہروں ہی کی طرف متوجہ رہے، ابھی تک قدما کے حالات کے متعلق انکی نگاہیں تھیں یونان و روم کی تاریخوں تک محدود تھیں اور انھیں کو مہذب قوم جانتے تھے، لیکن توریت میں بابل و نینوا کی گذشتہ عظمت و جلال دیکھ کر سمجھتے تھے کہ یہ ایشیائی مبالغہ ہے، مگر فرات و دجلہ کے کنارے عظیم الشان تودوں اور بلند میناروں کو دیکھ کر ان کو خیال گذرا کہ

ان کو کھود کر عہد عتیق کے حالات دریافت کئے جائیں،

آخر ۱۸۴۲ء میں مسٹر بوٹا جو موصل کا فرانسیسی قونصل تھا اس طرف متوجہ ہوا اور قو یخیق کے تودے کے بعض حصوں کا کمال جانفشانی اور عرق ریزی سے کھدوانا شروع کیا۔ وہاں ایک عظیم الشان محل کے نشانات ملے جس میں پتھروں پر بہت کتبے کندہ پائے گئے اسکے بعد ایک انگریز جس کا نام لیارڈ تھا اسی سال موصل پہونچا۔ اس شخص نے اپنی زندگی اسی کام میں وقف کردی۔ اسی شخص نے قو یخیق اور ایک دوسرے تودے کو جس کا نام تل نمرود تھا کھود کر کثرت سے ایسی چیزوں کو ڈھونڈھ نکالا جس سے قدیم اسیریا اور بابل والوں کے بہت کچھ حالات معلوم ہوئے۔ ان تودوں میں قدیم بادشاہوں کے نام کندہ تھے اور دو بڑے دربار عام کا پتہ لگا ایک کو اسیریا کے بادشاہ "ہنسا شرب" نے آٹھ سو برس قبل جناب عیسیٰ ابن مریم اپنے دور حکومت میں بنوایا تھا اور دوسرے کو اُسکے پوتے "اسور بن بال" نے تعمیر کرایا تھا، اس میں بے شمار کتبے پائے گئے جو کمال احتیاط سے لندن کے عجائب خانہ میں محفوظ تھے اور قبل از جنگ تک موجود تھے۔ یہ کتبے خط بیکانی میں تحریر تھے، ان کتبوں سے کلدانیوں کے قدیم حالات جو اسیریا اور بابل کے مورث اعلیٰ تھے معلوم ہوئے، انھیں سے پتہ لگا کہ "شومیر اور عقاد" کی سرزمین میں جسے اب عراق عرب کہتے ہیں آباد تھے،

۱۸۸۱ء میں ایک فرانسیسی ڈی سارزک نے قدیم بابل کے تودے کو جسے تل کوہ کہتے ہیں کھود کر ایک قدیم کتب خانہ کا پتہ لگایا جس سے اس کا علم ہوا کہ کلدانیوں کا ایک قدیم کتبخانہ "سرغولہ" تھا، اس کتب خانہ میں جو کتبے ملے اس سے اس قوم کے حالات معلوم ہوئے اور پایہ ثبوت کو یہ تحقیقات پہونچی کہ یہ نہایت قدیم قوم تھی جو حضرت عیسیٰ ابن مریم ایک روایت سے ۳۶۰۰۰ اور دوسری سے ۴۵۰۰۰ ہزار برس پیشتر فرات و دجلہ کے دوآبہ میں آباد تھی۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت نوحؑ قدیم کلدانیوں ہی کی طرف مبعوث کئے گئے تھے اور آپ کی بددعا سے دجلہ اور فرات ابل پڑے تھے اور خلیج فارس کا سمندر جوش میں آیا تھا اور آسمان سے بھی موسلادھار بارش نے بھی ہر طرف عالم آب پیدا کر دیا تھا اور کلدانی جہاں آباد تھے سارے کے سارے غرق ہو گئے تھے اور حضرت نوحؑ کا سفینہ کوہ جودی پر جا کر پناہ گزیں ہوا تھا،

ان جیسے یورپیوں کی تحقیقات ہی سے اس امر کا پتہ چلا ہے کہ فرات اور دجلہ کی سرزمین قدیم طاقت ور سلطنتوں اور حکومتوں کا گہوارہ رہی ہے، اسی جگہ کلدانیوں اسیریا بابل کی زبردست شاہنشاہیت قائم ہوئی اور با اقبال فاتح پیدا ہوئے۔ جن کا سکہ دور دور تک بیٹھ گیا۔ اسی مرکز سے ایک گروہ مصر پہونچا اور فراعنہ کی طاقتور سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ دوسرا گروہ جنوبی عرب میں آباد ہوا، وہیں کی قدیم تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ دریائے فرات کے کنارے بڑے بڑے شہر آباد تھے، مثلاً سپار، سرغولہ، اعراق جسے اب درقہ کہتے ہیں۔ کلدانیہ زمانۂ حال کا مغرب ہے۔ مصریوں کے آبا و اجداد اسی سرزمین کالڈیا سے نکل کر خاک نائے سوئیز طے کرتے ہوئے وادیٔ نیل میں پہونچے۔ آباد ہوئے۔ اور "آل مزرائیم" کہلائے اسی جگہ یوسفؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل اولاد یعقوبؑ مصر میں آباد ہوئے اور جناب ابراہیمؑ نے مکہ کی تعمیر کی تھی، حضرت موسیٰؑ انھیں بنی اسرائیل کی ہدایت کو آئے تھے، یہ انسانی آبادی ہر برگزیدہ رسول کی مخالفت کرتی رہی اور ان کو تنگ و پریشان کر کے شاد ہوتی رہی، ان کی بداعمالیوں ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ پچھلے اسیریا والے ان پر غالب آئے اور بہتوں کو قید کر کے نینوا لے گئے۔ بعد ازاں بخت نصر فرمانروائے بابل نے ان کی بیخ و بن کھود ڈالی۔ ہیکل سلیمانؑ جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ توریت و زبور کے اصلی صحیفے فنا کر دیئے اور تمام بنی اسرائیل کو پچاس برس تک دریائے فرات کے کنارے مقید رکھا۔ آخر کار کیخسرو شاہ ایران نے بابل پر چڑھائی کی اور اسکی ساری عظمت خاک میں ملا دی یہ واقعہ قبل حضرت مسیح ۵۸۳ میں ہوا تھا،

پہلے تاریخی موحد حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ آپ کی قوم نے جب آپ کو آگ میں جھونک دیا اور حافظ حقیقی نے آپ کو نجات دی ہے تو آپ نے

ہجرت فرمائی، دریائے فرات کو عبور کر کے ملک شام کی راہ لی۔ وہاں سے مصر پہونچے۔ آخر کار ارض کنعان میں سکونت اختیار فرمائی۔

ان تفصیلی واقعات سے ایک حد تک ثابت ہوا کہ یہ سرزمین اور اسکے ملحقات جو فرات و دجلہ کے مابین واقع ہے گوناگوں تغیرات، اقبال، زوال اور بعثت انبیاء رسل اور ان کے مصائب کا مرکز رہی ہے، مدنی حیات کے ابتدائی منازل اسی ارض پر طے کئے گئے۔ گہوارۂ گیتی یہی ارض مقدس بنی ہے تو حسینؑ جو شہید اعظم تھا اور جس حسینؑ نے ذبیحۂ انبیاء و مرسلین کو بدرجۂ اتم کمال اطمینان و بمثال عزم و استقلال کے ساتھ بلکہ عید کی مسرت کے ساتھ انجام دینے میں شہادت کو قبول کیا ہو اور منازل شہادت کو اس شان سے تکمیل کو پہونچایا ہو کہ خود لفظ شہادت کو اپنی عظمت و افتخار پر ناز ہو اور اس شہادت سے کلمۂ توحید کا کائنات عالم میں مستقل طور پر نقارہ پٹ گیا ہو تو ایسے حسینؑ کے بعد شہادت دائمی آرام گاہ کے لیے قدرت کو بھی ایسی ہی زمین منتخب کرنا تھی ایسا ہی مرکز پسند کرنا تھا جو تاریخی عظمت سے مالامال ہو اور جو اپنے قرب وجوار میں انبیاء سلف کے مدفن سے مرصع و مزین ہو،

معلوم ہوتا ہے کہ جوہر کی مناسبت سے صدف تجویز کیا گیا۔ یہ کونسا جوہر تھا جو ایسی عظیم الشان تیمو کے لیے یدِ قدرت نے منتخب فرمایا تھا یہ جوہر جوہر حسینی تھا جو آدمؑ صفی اللہ سے منتقل ہوتا ہوا سردار دو عالمؐ تک منتقل ہو کر آیا اور ان کی اکلوتی بیٹی خاتون جنت کے بطن سے اس عالم شہود میں ظہور پذیر ہوا۔ جناب شیر خدا علی مرتضیؑ کا نور نظر تھا، گر فرزند رسولؐ کہلایا۔ پہلی غذا ختم الانبیاء کا لعاب دہن تھا آغوش رسولؐ میں جذبات رسالت اخذ کرتا رہا، اُن کے گہوارہ سے مظلومی و بیکسی کی میراث ملی، باپ سے غیر فرار شجاعت ملی بھائی حسنؑ سے صبر و رضا ملی، اور پنجتنی مقدس جماعت میں جب تن تنہا رہ کر اسلام کی نورانی صورت منقلب پائی تعلیمات اسلام پر دنیاداری کو غالب پایا تو دین الٰہیہ یعنی اسلام کے زندہ کرنے کے لیے نانا کے عزم و استقلال کے جوہر کے ساتھ سربکف ہو کر تیار ہو گیا،

حسینؑ کی شہادت وہ عالمگیر شہادت ہے، اور وہ شہرت رکھتی ہے کہ اب تو لندن میں مجلس حسینؑ ہونے لگی ہے، دور افتادہ جزائر میں مجلس حسینؑ منعقد ہوا کرتی ہے، تمام امصار و دیار میں اس مظلوم کا ماتم یوم عاشور کو برپا ہوا کرتا ہے، ہندو راجواڑوں کو حسینؑ سے حسن عقیدت ہے، یورپ کے مورخوں نے بھی اس شہادت کی عظمت کو تسلیم کیا ہے، ہندی ہمدردوں نے آپ کی قربانی کو تسلیم کرتے ہوئے حسن عقیدت کے ہدیئے نذر کئے ہیں۔ ایشیا کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں ہے جہاں حسینؑ کا سوگ نہ منایا جاتا ہو،

اور یہ کیوں نہ ہو حسینؑ کائنات عالم کا مایۂ ناز افتخار ہے، ہر مذہب کے حق پسند کو حسینؑ محبوب ہے اُسکے آستانہ پر سر نیاز خم ہے، اسکے احترام کرنے سے دل کو سکون ہے،

گوتم بدھ کے دھرم میں دو جماعتیں اعظم ہیں، ایک ہمایانا، دوسرا ہنایانا، ایک خدا کے وجود کا معترف ہے، دوسرا منکر ہے ان ہر دو قدیم جماعتوں میں کوئی ایسا شہید نہیں گذرا ہے جس نے دین کی حفاظت کی خاطر اپنے کو، اپنے قبیلے کو اپنے اصحاب کو اپنے اطفال کو، اپنے عیال کو قربان کر دیا ہو، جس طرح حسینؑ نے کیا اور کل اپنی کائنات بقاء دین الٰہیہ کے لیے نذر دشمن کر دی ہو۔ گوتم بدھ کا دھرم اس وقت جاپان اور ملک چین میں پھیلا ہوا ہے، اگرچہ سات کروڑ مسلمان چین میں موجود ہیں اور وہ حسینؑ کے گرویدہ ہیں اور حسینؑ کی عظمت کرنے میں اپنی دینی فلاح کے تمنائی رہا کرتے ہیں،

ہندوستان کا قدیم دھرم سناتن دھرم رہا ہے، برہمو سماج دھرم، آریہ سماج، سکھ دھرم، قادیانی مذہب ایک صدی کے اندر کی ایجادیں ہیں، مگر ان تمام مذاہب اور دھرم میں کوئی ایسا شہید اس شان کا نہیں گذرا ہے جو اصحاب حسینؑ کی صف میں استحقاقاً بٹھایا جا سکے ہندوستان کی تاریخ اسکی شاہد ہے،

عیسائی مذہب میں جناب مسیح ابن اللہ صرف شہید راہ خدا خیال کئے جاتے ہیں مگر ان کی شہادت تحقیق طلب ہے، مرزا غلام احمد قادیانی

تو ان کی صلیب کے بعد حیات کو ثابت کرنے کی سعی بھی کی ہے، اور بزعم خود ثابت بھی کر دیا ہے کہ وہ صلیب نہیں دیئے گئے اور عرصہ تک زندہ رہے، پولوس پر اگر مصائب ٹوٹے اور وہ شہید کیے گئے تو اتنا ہوا کہ سر قلم کر دیا گیا، اور جہاں سر بریدہ گرا آج بطور یادگار گرجا تعمیر موجود ہے۔ یہ مذہب بھی دو جماعتوں میں تقسیم ہے، رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ۔ دونوں جماعتوں کی تاریخ کسی کم پایہ کا بھی شہید جو اصحاب حسینؑ کے مقابل لایا جا سکے پیش کرنے سے لاچار ہیں،

یہودی مذہب بھی دو حصوں میں تقسیم ہے، اور ہر دو جماعت میں کوئی ایسا شہید اب تک مجھے نہ معلوم ہو سکا جسے اصحاب حسینؑ کے صف میں باوقار پوزیشن دی جا سکے،

تاریخ اسلام میں جن انبیاء پر مصائب کے پہاڑ توڑے گئے ان کا تذکرہ موجود ہے، سرسری طور پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ جناب نوحؑ اپنی امت کے ہاتھوں بہت ستائے گئے۔ روزانہ حضرت پر سنگ باری ہوا کرتی تھی اور آپ اپنے کو سنگریزوں کے تودوں سے برآمد کیا کرتے تھے، آخر عاجز آکر آپ نے بددعا فرمائی اور اسوقت کی دنیا غرق ہو گئی اور امت فنا ہو گئی۔ جناب ابراہیم کو ان کی امت نے آگ میں جھونک دیا۔ جناب یعقوبؑ فراق فرزند میں رلائے گئے۔ جناب یوسفؑ اسیر زنداں بنائے گئے۔ جناب موسیٰ جلا وطن کیے گئے، ابن مریمؑ صلیب پر چڑھائے گئے۔ جناب ذکریاؑ پر آرہ چلایا گیا، ان اولو العزم انبیاء پر اپنی نافرمان امت کے ہاتھوں مختلف زمانے میں انواع و اقسام کے مصائب کے پہاڑ توڑے گئے، مگر میں اہل زمانہ سے انصاف کی نظر سے انصاف طلب ہوں کہ تدبر کریں اور غور کریں کہ ہر نبی پر جو مصیبت آئی اسکی نوعیت واحد ہے یعنی اگر جناب عیسیٰ ابن مریمؑ صلیب دیئے تو ان کو گرسنہ اور تشنہ رکھ کر صلیب نہیں دیا گیا۔ جناب موسیٰ کو جلا وطن کیا گیا تو وہ دوسرے اقسام کے مصائب میں گرفتار نہ کیے جا سکے جناب یعقوبؑ اگر فراق فرزند کے صدمہ جانکاہ میں مبتلا ہوئے تو دوسرے مصائب سے مامون و مصئون رہے۔ جناب یوسفؑ اگر زنداں میں اسیر رہے تو ان کے خون کا وہاں کوئی پیاسا نہ تھا اور اسکے برعکس حسینؑ کو اہل نظر دیکھیں اور ان کے مصائب کا شمار کریں، مدینہ کی روانگی کے وقت سے لاشہ ہائے شہداؑ کی پامالی کے وقت تک، خدارا انصاف سے کہیں، اور بتائیں کہ مصائب کی وہ کون سی قسم تھی کہ جو حسینؑ پر کمال سنگینیت کے ساتھ مہیب صورت میں نہ ڈالی گئی تھی اور بہ یک وقت اور بہ یک ساعت حسینؑ اس کے شکار نہ بنائے گئے مصائب کا تو کربلا کے میدان میں ایک طوفان عظیم تھا۔ مگر اس بے پناہ طوفان طاغوتی میں حسینؑ ہی کوہ جودی کی طرح باعزم و استقلال نور الٰہیہ دین اسلام کی پاسبانی کے فرائض کمال طمانیت اور کمال سرور و انبساط کے ساتھ انجام دیتا رہا، ظلم و جور کے تھپیڑوں کو سہتا رہا۔ تمازت آفتاب میں جلتا رہا، جلتی ہوئی زرہ میں بھنتا رہا، پیاسا رہ کر ٹھنڈے فرات کو تکتا رہا، اکبرؑ ایسے فرزند کو پیاسا سپرد اجل کرتا رہا، عباسؑ ایسے باوفا بھائی کو ہاتھ سے کھوتا رہا، قاسمؑ اور عونؑ و محمدؑ کی کمسن شہادت پر خاموش رہا، اہلبیتؑ کو صبر و سکون کی تلقین کرتا رہا، اصحاب کو اسلام کی حقانیت کا یقین دلاتا رہا، جفاکار دشمن امت سے نانا کا واسطہ دیتا رہا، اہلبیتؑ کی اسیری کے خیال سے لرزتا رہا۔ خیام کی سوختنی کو سوچتا رہا، عابدؑ کو راز باطنی سونپتا رہا، اس تمام روحانی کشمکش میں گھلتا رہا اور دوش بدوش ان روحانی مصائب کے تیروں سے حسینؑ کا جسم مثل ماہی بھنتا رہا، نیزوں کی انیوں سے جسد اطہر غربال ہوتا رہا، تیغ زنوں سے بدن پارہ پارہ بنتا رہا، سنگ باری سے خون بہتا رہا مگر حسینؑ امت کو تلقین و ہدایت کرتا رہا، ان کو دعائے خیر دیتا رہا، اسلام کی حفاظت دم واپسیں تک کرتا رہا، ان مظالم کی گھنگھور گھٹاؤں نے تاثیر شیر زہراؑ اور صبر و رضائے علیؑ و حسنؑ اور عزم و استقلال مصطفویؐ کے جوہر دکھاتے ہوئے شمشیر زنوں کی تلواروں کے سایہ میں قاتل کے سینہ پر رہنے کی حالت میں عبادت خلاق عالم مالک دوجہاں کی کرتا ہوا رحمت الٰہی میں نہاں ہو گیا اور تاریخ عالم میں شوق شہادت اور ذوق عبادت کی اپنی آپ نظیر قائم کر گیا اور ادیان عالم کے شہدا میں منفرد اور لاثانی ہو گیا، اسی طرح اس شہید اعظم کی ابدی آرام گاہ بھی اپنی تاریخی عظمت میں بے مثل و بے نظیر ہے،

مضمون بہت طویل ہوگیا اور میرا مدعا ابتک قارئین کرام کو نہ معلوم ہو سکا۔ بہر حال چند الفاظ میں بس اتنا ادر عرض کرنا ہے کہ اے حسینؑ کے سوگوارو اے زہراؑ اور ثانی زہراؑ و ام کلثومؑ کو تسکین دینے والو اس شہید اعظم کی یادگار کو اس ماتم و مرثیہ تک اور عشرۂ محرم تک محدود نہ کرو۔ حسینؑ ہمارا ہیرو ہے۔ بے نظیر ہادی ہے۔ بے مثل رہنما ہے، لاثانی شہید ہے۔ ہمارا فرض ہے حسینؑ کے ماتمداروں کا فرض ہے شہید نینوا کی مجلس کرنیوالوں کا فرض ہے۔ تمام تعزیئے داروں کا فرض ہے، کل حسینی جماعت کا فرض ہے کہ حسینؑ کی قربانی کی اس شہادت کی، اس عظیم الشان قربانی کی نشر و اشاعت کائنات عالم میں مختلف زبانوں میں کی جائے مختلف زبانوں میں لٹریچر پیدا کیا جائے اور دنیا کو حسینؑ کے احسانات سے آگاہ کیا جائے اور یہ نہیں ہو سکتا، جب تک اپنی جیب سے یا خود مجالس کے اخراجات سے بچا کر تم تبلیغی کاموں کے لیے کوئی رقم معین اور مخصوص نہ کر دوگے، زمانہ بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے، اہل زمانہ نے اربعہ عناصر پر حکومت کر رکھی ہے اور ہم ابھی تک قافلہ کی حدی خوانی اور نغمہ سنجی سے لطف لے رہے ہیں، خدارا اپنے قومی اداروں کی مدد کرو، اپنے قومی معاملات میں دلچسپی لو۔ اپنے قومی جرائد کی خبر لو۔ اپنی قومی عمارت کی تعمیر کو پورا کرو۔ سخن پروری ترک کرو۔ نکتہ چینی چھوڑ دو، کام کرو اور کام کی بات کرو، افتراق و اختلاف پر لعنت کرو،

(محرم نمبر ۱۳۶۰ھ)

عزاداری شہید کربلا

اڈیٹر مدینہ کا گمراہ کن فتویٰ

مولانا ابوالارشد رفیق احمد قادری حنفی بی اے ایل ایل بی وکیل بجنور

فاضل مدیر اخبار مدینہ بجنور نے ایک مبسوط مقالہ افتتاحیہ بعنوان شہید اعظمؑ کی یادگار اور اسکی تحتانی سرخی جزع فزع اور ماتم یا فخر و مباہات اور مسرت قائم فرما کر ۶ محرم الحرام ۱۳۵۰ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو زیب قرطاس فرمایا ہے آپ کے اڈیٹوریل نوٹ کی تمہید اور آخری گذارش ذیل میں حرف بحرف نقل کی جاتی ہے،

تمہید۔ محرم الحرام کا مبارک و سعید مہینہ آگیا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں عالم اسلام کے لیے دو قابل فخر و مسرت اور لائق ابتہاج و انبساط و افتخار (ہجرت و شہادت) پیش آئے ہیں، اسلام مکہ میں غریب تھا، مظلوم تھا، بیکس و بےبس تھا، مسلمان مظلوم تھے، ظلم و ستم کے تختۂ مشق تھے، اپنے پروردگار کو ایک اور لاشریک ماننے کے جرم کی پاداش میں ان پر کفار مکہ و مشرکین عرب کی . . . . طرف سے وہ وہ مظالم توڑے جاتے تھے کہ ریگ کے خشک ذرے بھی کانپ اٹھتے ہیں۔ آسمان بھی فرط غم سے رونے لگتا تھا، انسان الامان پکار اٹھتے تھے،

جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے، دشمنوں کے دل بھی نرم پڑ جاتے تھے، جب ظلم کا پیالہ لبریز ہو گیا مظلومی انتہا کو پہونچ گئی۔ امتحان و ابتلا کی حد ہو گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی، ارشاد ہوا کہ مکہ سے نکل کر مدینہ طیبہ کا رُخ کرو، اب کفر و اسلام میں انقلاب پیدا ہونے والا ہے کفر مجبور و مقہور ہو گا اور اسلام غالب و قاہر۔

آخری گذارش

ہمارے نزدیک حضرت حسینؑ کی شہادت کی یادگار منانا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے طریقہ کی اصلاح ہونی چاہیئے، تعزیہ داری، ماتم گساری، جلوس بازی، لٹھ بندی اور دوسرے خرافات تو قطعاً بند کر دینے چاہئیں اور سیرت حسینؑ کے جلسے اور واقعات شہادت بیان کرنے کی مجلسیں ہونی چاہئیں، اور مسلمانوں کو جمع ہو کر عہد کرنا چاہیئے کہ ہم حضرت امام حسین کی طرح اسلام اور صداقت کے لیے اپنی جانیں دینے کے لیے آمادہ رہیں، حسینؑ نے جس مقصد کیلئے تمام مصائب اور شدائد برداشت کئے ان کی تکمیل کی صورت وہ نہیں جو اختیار کی گئی، بلکہ وہ ہے جو ہم عرض کر رہے ہیں، دوسری قومیں اپنے بہادروں کی موت پر بھی ماتم نہیں کرتیں، بلکہ فخر و مسرت کے جلسے کر کے تقلید اتباع کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ جزع و فزع حضرت حسین کے ساتھ ایک ظلم ہے، اللہ اکبر کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ امام رضی اللہ عنہ نے دشمنوں سے بھی دُکھ اُٹھائے اور ان کے دوست بھی ان کو تکلیف ہی پہونچا رہے ہیں، شاید کمال شہادت و انتہائی مظلومی کے لیے یہی ضروری تھا، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم حضرت سید الشہداء پر ظلم کرنا چھوڑ کر ان کے ساتھ دوستی کا ثبوت دیں یعنی ان کی شہادت پر ماتم کرنے کے بجائے مسرت اور فخر و مباہات کا اعلان کریں"

اڈیٹر صاحب کی ایک فاش منطقی غلطی

فاضل مدیر نے تمہید میں مسلمانوں کی مظلومیت اور کفار مکہ کے مظالم کے اشتداد کے احساس سے ذرات ارضیہ کا کانپ اُٹھنا، آسمان کا دور غم سے رونا، انسانوں کا الاماں پکار اُٹھنا، جگر کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا، دشمنوں کے دل کا بھی نرم پڑ جانا، پھر رحمت حق کا جوش میں آجانا، بیان کر کے اپنی آخری گذارش کے مقطع پر مظلومیت و مصائب حسینؑ پر ماتم کرنے کے بجائے مسرت و فخر و مباہات کے اعلان کرنیکی نسبت مشفقانہ نصیحت فرمائی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اڈیٹر صاحب جیسا ادیب شاعر اور کہنہ مشق مضمون نگار اس خاص مضمون کی ترتیب میں ایسی فاش منطقی غلطی کرے اور مخالفین کی طرح ترتیب دلائل سے نتیجہ غلط نکالے الحق یعلوا ولا یعلیٰ (حق ہمیشہ غالب رہتا ہے اور مغلوب نہیں ہوتا ہے)، دیکھیے ادعا کے لیے استدلال کی صورت یہ تھی کہ مظالم کفار پر اور مسلمانان مکہ کی مظلومیت پر ذرات ارضیہ لرزہ براندام ہونے کے بجائے رقص کناں ہوتے۔ آسمان نے رونے کے بجائے خندہ زنی کی ہوتی، انسانوں نے الاماں پکارنے کے بجائے فخر و مباہات کے مظاہرے کئے ہوتے، جگر ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بجائے باغ باغ ہوئے ہوتے، اور دشمنوں کے دل نرم پڑنے کے بجائے مزید سختی و شقاوت پر مائل و آمادہ ہوئے ہوتے اور انتہائی حد مظلومی و مظالم پر رحمت حق میں جوش نصرت پیدا ہونے کے بجائے آثار مسرت و ابتہاج نمایاں ہوئے ہوتے۔ اور پھر ان تمام نشاط انگیز و طرب افزا عبارات و استعارات سے آپ کی تمہید مزین ہوئی ہوتی تو تمہید اور آخری گذارش کی خیال پرستیوں اور شاعرانہ اڈیولوں کی چولیں ٹھیک بیٹھ جاتیں اور آپ یقولون مالا یفعلون کا مصداق نہ بنتے۔

اڈیٹر صاحب کی تاریخی غلطی

محترم اڈیٹر نے واقعہ ہجرت کو محرم سے متعلق کر کے "بپیر و مرشد را علاوہ کشف و کرامات از فن تاریخ چہ قدر کمال حاصل است" کا کیا

تو یہ جواب دیا ہے۔ کاش آپ صرف نسخہ مدارج النبوۃ ہی کو ملاحظہ فرماتے تو اس کی جلد دوم صفحہ ۶۳ پر یہ عبارت آپ کو نظر آ جاتی کہ "دبر آمدن از مکہ در بست و ہفتم ماہ صفر بود و خروج از غار ثور اول ربیع الاول یعنی مکہ کرمہ سے ہجرت ۲۷ صفر کو ہوئی اور غار ثور سے برآمدگی یکم ربیع الاول کو یعنی صحیح تاریخ ۲۷ صفر ہے۔ جس کو آپ خلاف واقعہ زبردستی محرم سے متعلق کئے دے رہے ہیں۔ دیکھئے! بیچارے تارکان وطن کہ جن میں رسولؐ خدا شامل ہیں) کی بددعا سے قدرت نے ہماری نقادانہ نظر سے آپ کی تاریخی منطقی غلطیاں برآمد کرا کے آپ کے ہجرت والے مضمون کے فلک رسا محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جو شدادی نقطۂ نظر سے تیار کیا گیا تھا۔ اب ہم آپ کے شہید اعظم کی یادگار والے بقیہ مضمون کا انتقاد زیر حکم آیات قرآنی فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والی الرسول اگر باہم تنازعہ ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف فیصلہ کے لیے رجوع کرو) ولقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ یعنی تمھارے لیے رسولؐ کی سیرت بہتر نمونہ ہے اکر کے آپ کے مقطع والی زہریلی گذارش کے عالیشان عمارت کو بھی بعون اللہ ہم اس طرح عنقریب زمین کے برابر کر دیں گے جس طرح جناب رسولؐ خدا نے بہ تعمیل حکم خداوندی مسجد ضرار کو جو شر و فساد پیدا کرنے کے خیال سے فتنہ پرداز نام نہاد مسلمانوں نے مسجد رسولؐ کے مقابل تیار کی تھی مسمار کرا دیا تھا۔

ذکر بعض مظالم کفار مکہ

فاضل مدیر نے جن مظالم کفار مکہ کا بہ ضمیر "وہ وہ" اپنی تمہید میں اشارہ کیا ہے ہم ان میں سے از روئے کتب سیر معتبرہ اہلسنت مثل مدارج النبوۃ، روضۃ الاحباب، حبیب السیر وغیرہ صرف ایک دو چوٹی کے مظالم کا مختصر سا تذکرہ باقتضائے مقام کئے دیتے ہیں۔ اسی ماہ محرم میں نبوت کے ساتویں سال کفار مکہ نے جناب رسول خدا صلعم اور جملہ بنی ہاشم سے باستثنائے ابولہب ازراہ عناد دینی تمام تمدنی و معاشرتی معاملات میں یک قلم بائیکاٹ کر کے آنحضرت کو معہ جملہ بنی ہاشم شعب ابوطالب میں کامل تین سال تک محصور رکھکر ان پر عرصہ دنیا تنگ کر دیا تھا۔ بالآخر آنحضرت سے ایک نمایاں معجزہ دیکھکر کچھ کفار نے تعاون کیا اور اس طرح آنحضرت نے معہ بنی ہاشم نظربندی سے چھٹکارا پایا۔ خلاصی کے بعد نبوت کے دسویں سال آنحضرت کے محترم حامی و ناصر اور شفیق چچا حضرت ابوطالب جناب علی مرتضےٰؑ کے والد ماجد نے وفات پائی جن کے زمانہ حمایت میں کفار مکہ آنحضرتؐ کی جان کو ضرب پہونچانے پر ہرگز قادر نہ ہو سکے تھے۔ اس حادثہ فاجعہ کے چند روز بعد ہی آنحضرت کی محبوب ترین معزز بیوی ام المومنین جناب خدیجۃ الکبریٰ جناب فاطمہ زہراؑ کی والدہ ماجدہ نے رحلت فرمائی۔ ان ہر دو پیہم جانگسل حادثات نے آنحضرت کو سراپا تصویر غم بنا دیا اور آنحضرت نے بطور اظہار رنج و الم اس سال کا نام ہی عام الحزن۔ سال غم قرار دیدیا۔

جناب رسولؐ خدا نے وفات جناب خدیجۃؑ الکبریٰ پر انتہائی غم کیا یا عید مسرت منائی

ام المومنین جناب خدیجۃؑ الکبریٰ سابق الاسلام ہونے کی خاص فضیلت سے ممتاز ہونے کے علاوہ اپنے عالی مرتبت شوہر جناب رسول خداؐ کی محبت اور نصرت میں نشانہ مظالم کفار ہو کر مظلومی کی انتہائی حدود پر پہونچکر ثابت قدم رہی تھیں اور مدارج عالیہ اخروی پر فائز ہو گئی تھیں جو ان کے لیے سرمایۂ افتخار و سعادت تھا۔ حسب بشارت آیہ قرآنی والذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثم قتلوا او ماتوا لیرزقنھم اللہ رزقاً حسناً و ان اللہ لھو خیر الرازقین لیدخلنھم مدخلا یرضونہ و ان اللہ لعلیم حلیم یعنی جنھوں نے خدا کی راہ میں گھر بار چھوڑا اور پھر وہ قتل ہو گئے یا مر گئے خدا انھیں ضرور عمدہ روزی عطا فرمائے گا اور بیشک تمام روزی دینے والوں میں خدا سب سے بہتر روزی دینے والا ہے اور وہ انھیں ضرور ایسی جگہ پہونچا دے گا کہ وہ راضی ہو جائیں گے اور خدا تو بڑا واقف کار اور بردبار ہے (پارہ ۱۷ سورۃ الحج) اور کیوں اڈیٹر صاحب آپ کے اجتہادی فتوے کی رو سے جو ایکٹ موسوم "نافرمانی احکام فطرت" سے مستنبط کیا گیا ہے اور جس کا صدور و نفاذ بھی تحریک سول نافرمانی کے ایجی ٹیشن کی دولہ خیز فضا ۱۹۳۰ء میں

بارگاہ ادارت "مدینہ" اور کینیبٹ کانگریس سے اندھادھند ہوا ہے) آنحضرت کے لیۓ ہر نہج سے مقام فخر و مسرت اور لائق ابتہاج و انبساط تھا۔ لہذا آنحضرت کو سب سے پہلے اپنی محبوب خدا کی پیاری معزز بیوی کی وفات پر جبکہ وہ مظلومہ مظالم کفار سے نجات پاکر اور امتحان خداوندی میں کامیاب ہو کر حسب بشارت آیۂ مذکور الصدر شہدا اور انبیاء کے مثل درجات آخرت پر فائز ہو چکی تھیں عید مسرت کا مہتم بالشان مظاہرہ فرمانا چاہیئے تھا (معاذ اللہ) اور اس رحلت والے سال کی خوشی کی یادگار میں عام الحزن کے بجاۓ عام السرور (سال خوشی) سے موسوم کر کے آپ جیسے بیباک، آزاد خیال، شیدائے بہجت وحظ کو غم میں غم کرنیکے بجاۓ خوش فعلیاں اور اٹھکیلیاں کرنے والوں کے بجاۓ اسوۂ حسنہ قائم فرما دینا چاہیئے تھا۔ اور دنیاۓ اسلام میں تعزیت و ماتم پرسی کی خصوصی اسلامی سنتوں کے بجاۓ ایک دوسرے کو تہنیت و مبارکباد و معانقہ اور صاحبان عزا کو حاضری کا کھانا دینے کے بجاۓ دعوت ولیمہ پیش کرنیکی سنتوں کا اجراء نفاذ اس خیال سے فرما دینا چاہیئے تھا کہ ہر کلمہ گو کی آخری مستقل قیام گاہ جنت ہے۔ اڈیٹر صاحب! صائب مرحوم کے اس شعر کو پڑھ کر ذرا پہلے سرنگر بیاں ہو جایئے۔

لائق صحبت نہ باشد ہر کہ خندد بے محل
کفش چوں دندان بر آرد دورش از پا می کنند

پھر ذرا سر اٹھا کر شرمیلی نظروں سے ادھر دیکھیئے کہ افسوس آپ کے فتوے اور مشفقانہ نصیحت کے برخلاف جس پر جملہ کتب سیر اسلامی بلا اختلاف گواہ ہیں کہ جناب رسول خدا نے جو خود صحیفۂ فطرت کے جلی و روشن عنوان تھے کوئی عید مسرت نہ منا کر اس تمام سال ہی کا نام عام الحزن (سال غم) رکھ دیا۔ اور اس پر بس نہ کرتے ہوۓ آنحضرت ام المومنین کی مفارقت دائمی پر تا حیات اکثر گریہ فرماتے رہے یہاں تک کہ بعض دیگر امہات المومنین کے قلوب صافیہ مطہرہ بھی رشک و حسد کے غلیظ غبار سے مکدر ہو گئے (دیکھو حبیب السیر و روضۃ الاحباب وغیرہ)

یادگار عزا قائم کرنے اور رونے کا صحیح جواز

واقعات متذکرہ صدر سے وفات ام المومنین پر جناب رسول خدا کا یادگار عزا قائم فرمانا اور وفور اندوہ سے اتنا گہرا متأثر ہو جانا کہ آپ کی مفارقت دائمی پر تا حیات اکثر گریہ و بکا فرماتے رہنا روز روشن کی طرح ثابت ہے تو پھر ہیں فعل رسول اللہ کی تقلید میں عین شریعت، موافق فطرت اور مقتضاۓ انسانیت ہے۔ محبوب خدا کا اپنے نواسہ جناب امام حسینؑ (جن کو محترم اڈیٹر نے بھی اپنا مقتدا مان کر باعتبار ان کے بزرگ ترین مصائب و شدائد کے تمام اسلامی شہدا کی گذشتہ و آئندہ فہرست میں اعظم اور سرتاج شہدا قرار دیا ہے) کی مفارقت دائمی کے غم میں یادگار عزا قائم کرنا عین سنت رسول اللہ قرار پاتی ہے اور واقعات شہادت جناب امام مظلوم جو انتہائی رقت خیز دلدوز اور جگر سوز ہیں بلا پابندی وقت بیان کیۓ جانے اور توجہ سے سننے پر اہل اسلام کو از راہ حق شناسی وازروۓ عقیدت و محبت اندوہناک ہو کر گریہ و بکا میں مصروف رہنا چاہیئے جو عین مطابق فعل رسول اللہ ہے۔ اڈیٹر صاحب جناب امام حسینؑ کے پُر درد واقعات کی تفصیلات کسی اہل محبت کے گوش گذار کر کے اس سے ضبط گریہ و بکا کی توقع رکھنا قطعاً محال ہے بقول شخصے۔ ع

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ ۔۔۔ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

جناب ابو بکر صدیق نے محرم میں کیا کیا

برہنماۓ مسلمات اڈیٹر صاحب محرم کو ہجرت کا مہینہ فرض کر کے بھی ہم یہ دکھلاتے ہیں کہ افسوس ذی علم اڈیٹر صاحب کے

فتوے کے برخلاف حضرت صدیقؓ نے بھی جو شہادت نص قرآنی و کتب سر غار ثور میں محرم کے آغاز ہی پر حزن و غم سے خوب گریہ کناں ہو کر بیچاری گریہ کن ملت کے لیے سیرت کا ایک عمدہ نمونہ قایم فرما دیا۔ جو لائق شکریہ ہے۔ حالانکہ اڈیٹر صاحب کے سرراہ والے مضمون کے لحاظ سے یہ صدیقؓ کا مستحسن فعل معاذ اللہ بدشگونی میں داخل ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

اڈیٹر صاحب! ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ حضرت آپ نے اپنی تیر اندازی کی دھن میں کچھ نہ سوچا اور جگا بالغیب اپنے تیر اعتراض کا غار ثور کو ہدف بنا ہی لیا (اے معاذ اللہ) حضرت صدیقؓ کا حزن و غم سے گریہ و بکا کرنا خود ان کے لیے بمقابلہ خلفائے راشدین ایک فضیلت خاص ہے۔

محرم میں غم منانیکی فلاسفی

جملہ اہل اسلام جو محرم کو بلحاظ اس امر کے کہ اس میں لڑائی بھڑائی شرعاً حرام کر دی گئی ہے محترم سمجھتے ہیں۔ جناب امام حسینؑ کے مصائب و شدائد کے امتیازی غم میں مبتلا ہو کر اپنے قلوب سے ان تمام بد اخلاقیوں کے پیدا کرنے والے جذبات کو جن کا نتیجہ بالآخر جنگ و جدل و شر و فساد برآمد ہوتا ہے دفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور سال بھر اسی عمل خیر کی مشق پے در پے کرتے رہنے سے سفاکانہ و وحشیانہ جذبات کا قلوب سے ازالہ کر کے رقت قلب کی استعداد پیدا کرتے ہیں۔ جو نشان سعادت و ایمان ہے اور بالآخر اسی گریہ و بکا کی ریاضت شاقہ سے تزکیہ نفس و تصفیہ قلب حاصل کر کے رفتہ رفتہ مکارم اخلاق سے آراستہ و پیراستہ ہو جاتے ہیں جو عین مقصد رسالت و نبوت ہے (بعثت لاتمم مکارم الاخلاق) اور حقیقی اسلام کی روحانی و مادی ترقیوں کا راز اسی غمناک دور میں پوشیدہ ہے اور یہی محرم میں غم منانیکی فلاسفی ہے اسی فلاسفی پر اکثر نکتہ رس و دقیق النظر دوربین مورخین نے از راہ حق پسندی اپنی تصنیفات میں شاندار ریمارکس دیے ہیں اور یادگار سید الشہداء کے جملہ متعلقات (مجلس، ماتم، علم، تعزیہ وغیرہ) کو تبلیغ اسلام مطلق کا اہم مشن قرار دیکر عیسوی مشن کے کم حیثیت و ناقص ہونے کا مقابلتاً اعتراف و اقرار کیا ہے (دیکھو تصنیفات مسٹر گبن، اسکے، ڈاکٹر جوزف فرانسیسی، و مسٹر سومار بین فلاسفر جرمنی وغیرہ)

مظالم کربلا کا اظہار کرنے والے مسلمان مبلغ دین اور واعظ اسلام ہیں

استفادہ حکم استثنا مندرجہ آیہ کریمہ "لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم" یعنی خدا بلند آواز سے برائی کرنے کو ناپسند فرماتا ہے مگر باستثنا مظلوم کی آواز کے (پارہ ۶) دیندار مسلمان کفار سیرت مسلمانوں کے مظالم کربلا کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے اس واسطے کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں پر جو اسلام کی اشاعت بزور شمشیر و ظلم خیال کرکے خود اسلام سے نفرت کرتے اور دوسروں کو کراتے ہیں بخوبی واضح و آشکارا کر دیا جائے کہ خالص اسلام کسی وقت میں بھی ظلم کا ہرگز روادار نہیں ہے خواہ وہ ظلم نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں [illegible] بہر حال قابل نفرت اور لائق تشہیر ہے اور جس طریقہ سے اسلام کی عدالت اور منصف مزاجی کے اوصاف کا [illegible] کرتے ہیں اور یوں محاسن اسلام کا اظہار کرنے: اے مسلمان بمقابلہ معاندین و معترضین اعلیٰ مبلغ کا فرض اور عام اہل اسلام کے لیے ظلم و ظالمان سے نفرت پیدا کرا کر ایک عمدہ واعظ کا اہم فرض انجام دیتے ہیں۔

کیا ذکر ہے حسینؑ کا، ذکر حسینؑ نے
لاکھوں کو حق گزار مسلمان بنا دیا

عزاداری و ماتم گساری روحانی تبلیغ اسلام ہے یا مادی سیاسی پروپگنڈا!

دیندار مسلمان ہر سال بقائے یادگار عزائے امام مظلوم کی بےنظیر مظلومیت کا عام چرچا کر کے سب سے پہلے امام کی اعلیٰ پوزیشن کا دنیا میں تعارف کراتے ہیں اور پھر امام کے شدید ترین مصائب کے اثر سے متاثر ہو کر بے اختیار روتے ہیں رُلاتے ہیں اور بحالت بے اختیاری سینہ کوبی کر کے تمام دنیا کے قلوب میں باستثنائے خوش فکر اڈیٹر صاحب ہمدردی و محبت کی تیز اسپرٹ پیدا کرا کے اس اپنے اچھوتے، فطری، بے ضرر اور بے عیب تبلیغی طریقے سے رفتہ رفتہ ان کو اسلام کی طرف مایل کر کے اپنا انسانی فریضہ اسلامی تبلیغ کے صحیح مفہوم میں ادا کرتے ہیں، لہٰذا ان تمام روحانی افعال کو جو اسلام کی تبلیغ کی خاطر عمل میں لائے جاتے ہیں۔ مادی سیاسی پروپگنڈے کے ذیل میں اپنی کوتاہ نظری سے شمار کرنا انصاف کا خون کرنا ہے اور ان کی حقانیت و صداقت سے بے خبر رہ کر اپنی تحریر و تقریر سے ان کو بے اثر بنانے کی ناکامیاب کوشش کرنا اسلام سے ہاتھ اٹھا لینا ہے۔

عزاداران حسینؑ کے مدارج

امام مظلوم کے محب مسلمان، مبلغین و واعظین درجات اُخرویہ کے مستحق ہو جانے کے علاوہ امام کی بے مثل مظلومیت کے اثر سے بے قرار ہو کر اپنا سر دھنتے ہیں، سینہ زنی کر کے نصرت و حمایت دین کے موقع پر اپنے ثابت قدم رہنے اور کٹ مرنے کا عملی ثبوت نمونۃً پیش کر کے اور یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا۔ اے کاش میں (آپ) حسینؑ کے ہمراہ ہوتا تو بڑی مراد کو پہونچتا) جوش نصرت میں وردِ زبان کر کے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ' اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے)۔ کی صحیح حدیث شریف کی رو سے ناصران امام میں اپنے کو محسوب کرا کر مدارج انصار امام کے حقیقی مستحق ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح مظلومیت کی عظمت اور شدت، واہمیت کی عملاً تصدیق کر کے درجات صدیقین کے بھی واجبی طور پر حقدار بن جاتے ہیں

شریعت موسوی میں محرم کے متعلق غم کے احکام

توریت کے مختلف حصوں میں مجلس عزا کا تذکرہ ہے کتاب گنتی باب ۲۹ آیت ۷ "اے بنی اسرائیل تم سب ساتویں مہینہ کے عاشورہ کو ایک مقدس مجلس برپا کرو اپنی روحوں کو غمزدہ بناؤ۔ (کتاب احبار، باب ۱۶، آیت ۲۹) "تمھارے لیے یہ ابدی قانون ہوگا، ساتویں مہینہ کے عاشورہ کو خود کو غم زدہ بنا دو۔ اور بالکل کام نہ کرو خواہ کوئی دیس میں ہو یا پردیس میں" کتاب احبار، باب ۲۹، آیت ۲۹ :) جو روح اس دن غمزدہ نہ ہوگی وہ اپنی جماعت سے کٹ جائے گی" (آیت ۳۰) جو انسان سوائے غم کے اور کام کرے گا اس کو قوم سے فنا کر دوں گا آیات مذکورہ کے علاوہ کتاب احبار ۲۳ تا آیۃ ۳۲ میں بھی غم کے احکام مفصل مندرج ہیں جو بخوف طوالت نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ آیات مذکورہ مندرجہ توریت کی یہ عبارت کہ "ساتویں مہینہ کے عاشورہ کو ایک مقدس مجلس کرو" (میں) ایسا راز سربستہ تھا جس کا انکشاف محرم ۶۱ھ کی دسویں تاریخ کو ہوا۔ یہودیوں میں ساتویں مہینہ کا نام تشرین ہے جسکو انگریزی میں تھسری کہتے ہیں جبکہ آفتاب برج میزان میں ہوتا ہے۔ جس طرح شمسی و قمری مہینوں کی تاریخیں مطابق ہوتی رہتی ہیں اسی طرح موسوی اور اسلامی تاریخیں بھی مطابق ہو جاتی ہیں چنانچہ تاریخ طبری مطبوعہ مصر سے واضح ہے کہ یکم محرم الحرام ۶۱ھ مطابق یکم تشرین ۶۸۰ء ہے جیسا کہ یعقوبی نے بھی اپنی تاریخ میں لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یکم محرم الحرام ۶۱ھ کو ماہ تشرین کی بھی پہلی تاریخ تھی۔ بعض عجمی شہروں میں اس دن آفتاب برج میزان میں ساڑھے ۱۷ درجہ پر اور چاند برج دلو کی بیسویں منزل پر تھا۔ غرضکہ محرم ۶۱ھ نے ماہ تشرین کی تاریخیں توام ہو گئی تھیں

ہزاروں برس کا پردہ راز اٹھ گیا تھا کہ اہل عالم بچشم ظاہر دیکھ کر سمجھ لیں کہ تشرین کا یوم غم اور عاشورہ محرم ایک ساتھ جمع ہو کر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اس دن کی یادگار کو دو ہزار دو سو برس پہلے جناب موسیٰؑ قائم فرما گئے ہیں (یہ احکام غم جناب رسول خداؐ کی نبوت و رسالت کی صداقت پر زبردست اور معجز گواہ ہیں) ہر دو مذہب کی تاریخوں نے ایک ہو کر اس سبق کی تعلیم دی کہ واقعہ غم اور سبب ماتم ایک ہے جس کی مجلس دو جگہ قائم ہے۔ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ مرثیہ گو ہیں اور بنی اسمٰعیلؑ میں حضرت خاتم النبیینؐ حدیث خوان ہیں۔ کلیم اللہؑ کی آواز ہے کہ جو عاشورہ کو شریک غم نہیں وہ ہماری جماعت سے خارج ہے اور ادھر رسول رحمۃ للعالمینؐ کا فرمان ہے کہ جس نے ہمارے اہل بیت کا حق محبت ادا نہیں کیا ہیں اس کا رسول نہیں ہوں (قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ) یعنی میں امت سے بجز اس کے کہ وہ اہل بیت رسالت سے محبت کریں اور کوئی تبلیغی اجر نہیں چاہتا ——————

خانۂ خدا ماتم حسین میں سیاہ پوش ہوگیا

ہجرت رسولؐ سے اکہزار برس پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو اسعد بن تبع حمیری (جس کو طبری و صاحب حبیب السیر نے تبع اصغر کے نام سے پکارا ہے) کے ہاتھوں سے سیاہ پوش کرا دیا تھا (دیکھو رسالہ براہین رحمیہ فی اثبات الرسالۃ محمدیہؐ مولفہ ناصر الدین ابوالامیر محمد رحم الٰہی منگلوری) چنانچہ اہل اسلام اور ہر سال آٹھ ذی الحجہ کو سیاہ رنگ کا غلاف (جو رنگ عام دنیا میں نشان غم مانا گیا ہے) بیت اللہ کو پہناتے ہیں۔ اس کا حقیقی راز یہ ہے کہ اسی آٹھ ذی الحجہ کی تاریخ کو حسب تصریح جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی مصنف سر الشہادتین جناب امام حسینؑ معہ اپنے اہلبیت کے (اپنے آخری حج کو بحالت خوف) عمرہ سے تبدیل کر کے زمانۂ حج میں خانہ خدا سے اندوہ گیں رخصت ہو کر بہ سمت مقتل کربلا روانہ ہوئے تھے۔

ترجمہ اقتباس سرّ الشہادتین

جناب شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی عالم جید اہلسنّت اپنی کتاب سر الشہادتین میں جو بزبان عربی ہے تحریر فرماتے ہیں کہ "اتمام شہادت اسوقت ہوتا ہے جب کوئی شخص عالم غربت و کربت میں قتل کیا جائے۔ اور اس کے گھوڑے کی کوچیں کاٹ ڈالی جائیں اور اس کی لاش پڑی ہوئی چھوڑ دی جائے اور اس کے گرد و پیش کثرت سے اس کے اعزا و اقارب و اصحاب قتل کیے ہوئے پڑے ہوں اس کا مال لوٹ لیا جائے، اس کی عورات اور یتیموں کو اسیر کر لیا جائے اور یہ باتیں تمام محض قربۃ الی اللہ ہوں۔ پس حکمت بالغہ الٰہیہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ بعد وفات آنحضرت یہ کمال عظیم بھی حضور کے دیگر کمالات سے ملحق کر دیا جائے۔ پس خداوند عالم نے حضرات حسنینؑ کو ان کے جد بزرگوار کا نائب بنایا اور ان دونوں صاحبزادوں کو آئینہ جمال مصطفویؐ قرار دیا کیونکہ شہادت دو قسم کی تھی ایک شہادت خفی اور دوسری جلی۔ پس یہ دونوں قسمیں ان دونوں صاحبزادوں پر یوں تقسیم کی گئیں کہ قسم اول بڑے صاحبزادے کو اور قسم دوم کیساتھ چھوٹے کو مخصوص کر دیا گیا۔ اور چونکہ یہ بات شہرت پر موقوف تھی سب سے پہلے وحی کے ذریعہ سے حضرت جبرئیل و دیگر ملائکہ کے توسط سے اس کی اطلاع ہوئی پھر تخصیص مکان اسم مکان اور تخصیص وقت کے ساتھ اطلاع دی گئی کہ وہ ۶۱ھ کا شروع ہوگا پھر یہ بات مشہور ہوگئی اور اس کا ذکر زبان امیر المومنینؑ پر جاری ہوا جبکہ وہ سفر صفین میں تھے۔ پھر جب یہ واقعۂ ہائلہ ہوا تو اس کی شہرت اس طور پر ہوئی کہ مٹی خون ہوگئی آسمان سے خون تازہ برسا۔ ہاتف غیبی کے مرثیے سنے گئے۔ جنوں نے گریہ و زاری کیساتھ نوحے پڑھے، جسد اطہر کی پاسبانی کے لیے درندے دورہ کرتے ہوئے پائے گئے اور اس برگزیدہ باری کے قاتلوں کی ناک میں سانپ داخل ہو گئے۔

اور اس کے علاوہ بہت سی باتیں باعث شہرت تھیں تاکہ حاضر و غائب اس واقعہ سے مطلع ہو جائیں۔ بلکہ بُکا و حزن دائمی باقی رہے اور یہ واقعۂ ہائلہ امت رسولؐ میں روز قیامت تک بیان کیا جائے۔ پس اس کی شہرت ملاءِ اعلیٰ سے لے کر اسفل تک غائب و حاضر جن و انس اور ناطق و صامت میں ہو گئی۔" بقدر حاجت

شاہ صاحب کے گھر میں مجلس حسینؑ

انھیں فخر المحدثین جناب شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ سے کسی سُنّی بزرگ نے بابت مجلس عزا و مرثیہ خوانی وغیرہ تحریری فتویٰ طلب کیا تھا شاہ صاحب موصوف نے جو کچھ جواب ترقیم فرمایا وہ بزبان فارسی ان کی فقہ کی کتاب موسومہ "فتاولئے عزیزیہ" مطبوعہ مجتبائی دہلی کے صفحہ ۱۰۴ پر درج ہے جس کا ترجمہ ہم پیش کرتے ہیں "میرے گھر میں دو مجلسیں ہوتی ہیں ایک مجلس وفات رسولؐ اور دوسری مجلس شہادت حسنینؑ۔ ساتویں عاشورہ تک محرم میں ہر روز چار سو سے ہزار آدمی تک جمع ہوتے ہیں اور درود پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد بندہ ذکر فضائل حسنینؑ اور اخبار شہادت' اور ان کے قاتلوں کی بداعمالی کا حال از روئے احادیث معتبرہ اس مجلس میں بیان کرتا ہے۔ اسی سلسلۂ ذکر میں بعض ان مرثیوں کے مضامین کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے جس کو حضرت اُمّ سلمہؓ و دیگر صحابہ نے جن و پری سے سُنے تھے اور ان متوحش خوابوں کا حال بھی بیان کیا جاتا ہے جن سے جناب رسولِ خداؐ کی بے حد پریشانی اور وفور حزن و غم کا صحیح پتہ چلتا ہے اور ان خوابوں کو ابن عباس و دیگر صحابہ نے دیکھا تھا۔ اس مجلس میں اگر کوئی خوش الحان شخص مرثیہ یا سلام پڑھتا ہے تو اکثر حضّار مجلس اور خود بندہ پر رقت و بکا طاری ہو جاتی ہے اور اس کے بعد پنج آیات تلاوت کر کے ماحضر پر فاتحہ دے کر تبرکاً تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہے بندہ کا قلیل معمول۔ پس اگر یہ باتیں جو مذکور ہوئیں بندہ کے نزدیک جائز و باعث ثواب نہ ہوتیں تو بندہ ہرگز اقدام نہ کرتا۔ آخری گذارش کے طور پر ہم معزز اڈیٹر صاحب سے ایک سوال کرتے ہیں کہ کیا وہ از راہ کرم یہ بتلا سکتے ہیں کہ بنی آدم کی تاریخ میں کبھی ایسا جانگداز واقعہ اس قدر تفصیل کے ساتھ قلمبند ہوا ہے اور اگر قلمبند ہوا ہے تو کیا ان تفصیلات کو سنکر سامعین وفور مسرّت سے تالیاں بجاتے ہیں؟ کیا اڈیٹر صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ترقی یافتہ قوموں کے زمرہ میں شامل ہونے کی استعداد پیدا کرنے کے لیے ہم اپنے قلب کی ماہیت کو اس طرح تبدیل کر دالیں کہ روداد غم سنکر مارے خوشی کے اچھل پڑیں۔ اڈیٹر صاحب محرم کے آنسو کسی تاجر کے آنسو نہیں ہوتے جن کا تعلق کاروباری سود و زیاں سے ہو بلکہ یہ آنسو وہ ہیں جن کی بابت انگریزی شاعر شیلے نے یہ کہا ہے کہ

OUR DEEPEST THOUGUT ARE THOSE THAT TELL OF SADDEST THEMES

یعنی یہ حزن و ملال معرفت کی روح ہے۔

(محرم نمبر ۱۳۵۱ھ)

پندرہ روزہ رسالہ حیات کراچی نے جس کا مقصد ہے حقائق حیات اور مسائل سائینس سے سادہ اور عام فہم زبان میں بحث کرنا اپنے پہلے شمارے میں ایک مضمون "آنسو" کے عنوان سے سپرد قلم کیا ہے جس میں گریہ پر سائنٹیفک اصول سے بحث کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ تحریر فرمائے ہیں:-

"رونا ایک حد تک مفید چیز ہے۔ اگر کبھی آپ کا ڈاکٹر آپ سے دل بھر کر رونے کو کہے تو اُس کی ہدایت پر عمل کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام نہ لیجئے۔ ہر آنسو میں ایک مصفی مادہ Lycozyme ہوتا ہے جو بعض جراثیم کو ہلاک کرتا ہے۔ یہ مادہ اتنا تیز ہوتا ہے کہ اگر اپنے آنسوؤں کو ساٹھ لاکھ گنا پانی میں ملا دیں تب بھی Lycozimes میں جراثیم ہلاک کرنے کی قوت باقی رہتی ہے۔ درحقیقت رونے سے آنکھ، ناک اور گلے کو نقصان دہ جراثیم سے نجات مل جاتی ہے۔"

رونے کے متعلق مندرجہ بالا خیال و انکشافات کو پڑھ کر آسانی سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گریہ صحت انسانی کے لئے مضر نہیں بلکہ بسا اوقات مفید ہوا کرتا ہے اور یہ کہنا غلط ہے کہ گریہ جُبن و بزدلی پیدا کرنے کا سبب ہے۔ رونے سے جبن و بزدلی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض بزدل اور کمزور طبیعت کے انسان بھی خوف یا مصیبت کے وقت رونے لگیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ گریہ ہمیشہ جبن و بزدلی کا نتیجہ ہو یا ہمیشہ گریہ جبن و بزدلی ہی پیدا کرتا ہو۔ رونا انسانی فطرت میں شامل ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جسے اپنی عمر میں کبھی اشک فشانی کا اتفاق نہ ہوا ہو اور اگر وہ کبھی نہیں رویا ہے تو ہم اُسے انسان نہیں بلکہ پتھر سمجھیں گے۔

عام طور پر گریہ کی مخالفت مسلمانوں کے ایک ایسے طبقہ کی طرف سے ہوتی رہتی ہے جو کربلا کے خون چکاں حادثہ کی یاد دنیا سے مٹا ڈالنا چاہتا ہے اور جو اپنی حسینیت دشمنی اور یزیدیت دوستی کا اظہار طرح طرح سے کرتا رہتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ یوم عاشور پہلے سے عید کا دن تھا، حضرت امام حسینؑ کی شہادت کی وجہ سے وہ یوم غم نہیں بن سکتا اس لئے عشرے کے دن مسلمانوں کو بجائے حزن و ملال کے خوشی منانا اور ہر طرح کی زینت کرنا چاہیے، کبھی کہا جاتا ہے کہ امام حسینؑ شہید ہوئے اور شہید زندۂ جاوید ہوتا ہے اس لئے اُس کا غم منانا عبث ہے۔ چنانچہ اسی خیال کو ایک حسینیت دشمن شاعر دوستی کے انداز میں اس طرح نظم کرتا ہے:-

روئیں وہ جو قائل ہوں ممات شہداء کے
ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

کبھی واقعۂ شہادت کی اہمیت کو کم کرنے کی غرض سے کہا جاتا ہے کہ حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے شہید ہوئے، مطلب کہ رسول نے بادشاہِ وقت کی اطاعت کا حکم دیا تھا اور عذر و بغاوت کرنے والے کی سزا قتل مقرر کی تھی حسینؑ نے خلیفۂ وقت یزید سے سرکشی کی جس کی پاداش میں وہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے اس لئے یزید پر اُن کے قتل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ خود رسول پر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات ایسی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ

حضرت حمزہ کی شہادت کی ذمہ داری ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں پر عائد نہیں ہوتی ہے بلکہ رسولِ اسلام پر عائد ہوتی ہے اس لئے کہ اگر رسول انھیں جنگِ احد میں نہ لاتے تو وہ کفارِ قریش کے ہاتھ سے کس طرح شہید ہو سکتے تھے اور ہندہ کو ان کے مثلہ کرنے کا موقع کاہے کو ملتا۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ان بے حرمتیوں اور مصیبتوں کا ذکر کرنا جو خاندانِ رسالت کو میدانِ کربلا میں پیش آئیں غیر مناسب ہے اس لئے کہ اس سے رسول کے گھرانے کی بے عزتی اور توہین ہوتی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ منبروں پر عام شاہراہوں پر اور عام مجمعوں میں خاندانِ نبوت کی مستورات مخدرات کے نام نہ لینا چاہیئے اس لئے کہ ایسا کرنا اسلامی غیرت و حمیت کے منافی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ واقعات کربلا کا سننا اور بیان کرنا حرام ہے اس لئے کہ ان کے سننے اور سنانے سے بغض صحابہ پیدا ہوتا ہے غرض کہ جتنے منھ اتنی ہی باتیں اور جتنی زبانیں اتنی ہی دلیلیں ہیں خواہ کوئی دلیل کسی حق پسند سننے والے کو متاثر کرتی ہو یا نہ کرتی ہو۔ کبھی خالص معترضانہ انداز میں ایراد کیا جاتا ہے اور کبھی ہمدردانہ اور ناصحانہ انداز میں مخالفت کی جاتی ہے — لیکن ایسے تمام ایرادات اور اعتراضات کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے یعنی واقعۂ کربلا کی یاد کو انسانی قلوب سے محو کر دینے کی سعی ناکام!

گریہ کو کبھی جبن و بزدلی کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے اور کبھی جبن و بزدلی کو گریہ کا نتیجہ۔ یہ ایک انوکھا طریقہ اور نرالی تحقیق ہے۔ یہ استدلالی صلاحیت کی بوکھلاہٹ ہے کہ کبھی سبب کو مسبب قرار دیا جاتا ہے اور کبھی مسبب کو سبب!

بروئے تجربہ و مشاہدہ ہر شخص بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ آنسو کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خوف و ہراس کی حالت میں آنکھوں سے جاری ہو جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کسی ستم رسیدہ اور مصائب میں مبتلا شخص کو دیکھ کر ایک دردمند انسان کی آنکھوں سے بہنے لگیں جنھیں ہم ہمدردی کے آنسو کہتے ہیں تیسرے وہ آنسو جو محبت و الفت کی بنا پر انسان کی آنکھوں میں بھر آتے ہیں مثلاً کسی عزیز کی جدائی یا کسی محبوب کے فراق پر رونا، اور چوتھے وہ آنسو جو انتہائی خوشی کے موقع پر بے ساختہ آنکھوں سے رواں ہونے لگتے ہیں۔ ایسے رونے کو ہم گریۂ مسرت کہتے ہیں پانچویں وہ آنسو جو غصہ اور غیظ و غضب کے عالم میں کسی شخص کی آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں۔ چھٹے وہ آنسو جو انفعال و ندامت کے موقع پر انسانی آنکھیں بہانے لگتی ہیں۔ چھٹے انتہائی جوش اور بہادری کے موقع کے موقع پر بھی کسی شجاع و دلیر شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جایا کرتے ہیں۔ ہر شخص کی نظروں سے ایسے مناظر گزرے ہوں گے کہ دو عزیز دوستوں کے درمیان کسی بات پر ملال و شکر رنجی ہو گئی ہے اور پھر کسی غیر جانبدار شخص نے بیچ میں پڑ کر صفائی کرا دی ہو اس وقت جب دونوں دوست ناراضگی کے بعد آپس میں گلے ملتے ہیں تو آب دیدہ ہو جاتے ہیں۔ ان تمام اقسام کے آنسوؤں کو ہم جبن و بزدلی کے آنسو نہیں کہہ سکتے۔ ان میں سے کچھ آنسو بربنائے محبت و الفت ہوتے ہیں، کچھ بربنائے ندامت و انفعال، کچھ بربنائے طیش و غصہ، کچھ بربنائے جوش و شجاعت، کچھ بربنائے مسرت و انبساط۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ آنسو بربنائے جبن و بزدلی بھی ہوتے ہیں لیکن ہر قسم کے آنسوؤں کو جبن و بزدلی کے آنسو کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔ دنیا کے مانے ہوئے تاریخی بہادر اور شجاع افراد کا گریہ کرنا ثابت ہے اور ہم صحیح بہادری کا جزوِ لاینفک رقتِ قلب اور نرم دلی کو تسلیم کرتے ہیں۔ بہادر شخص اپنی شخصی اور ذاتی تکالیف کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتا ہے لیکن دوسرے انسان کی تکلیف و مصیبت پر اس کا دل بےچین ہو جاتا ہے اور جذبۂ ترحم اُس کی آنکھوں کو نمناک بنا دیتا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ مسلسل گریہ وزاری سے جبن و بزدلی پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح مان لیا جائے تو بچہ جو پیدائش کے وقت سے رونا شروع کرتا ہے تو برسوں تک مسلسل رویا ہی کرتا ہے۔ اُس کے پاس اظہارِ مطلب کے لئے رونے کے سوائے اور کوئی ذریعہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ کچھ بڑا ہونے کے بعد بھی وہ اپنی ضدوں کو اپنے چاہنے والوں سے روکر ہی پورا کراتا ہے اور بچہ بچہ کا یہ رونا بالکل فطری ہوتا ہے لیکن انھیں رونے والے بچوں میں سے رستم و سہراب، ارجن و بھیم اور انھیں جیسے پہلوان روزگار بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت آدم، حضرت یعقوب اور حضرت

نوحؑ کا گریہ اسلامی تاریخوں میں یادگار حیثیت رکھتا ہے لیکن کیا ہم خدا کے ان اولوالعزم انبیاء کو معاذ اللہ اس بنیاد پر بزدل قرار دے سکتے ہیں کہ وہ اپنی عمر میں گریہ مسلسل کرتے رہے تھے۔ گریہ کو ضعفِ قلب کی علامت قرار دینا یا ضعفِ قلب کو گریہ کا سبب ٹھہرانا نہ تو تجربہ و مشاہدہ کی بناء پر صحیح قرار پاتا ہے نہ تاریخ کی بناء پر، نہ انسانی فطرت کے تقاضہ کی بناء پر اور نہ طبی تحقیقات کی بنیاد پر بلکہ جیسا کہ ہم اوپر رسالہ "حیات" کراچی کا اقتباس پیش کر چکے ہیں گریہ مضرت رساں نہیں بلکہ آنکھ، ناک اور حلق کے نقصان دہ اور زہریلے جراثیم کو ہلاک کر دینے میں تریاق کا حکم رکھتا ہے۔

اسلام میں بھی گریہ کی ممانعت کہیں نظر نہیں آتی۔ اس معاملہ میں سیرتِ رسولؐ ہی مسلمانوں کے لئے حکم ہو سکتی ہے۔ جناب ختمی مرتبتؐ کے سوانح حیات پر نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت اپنی زندگی میں ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد بار روئے ہیں وہی نہیں بلکہ صحابۂ کرام، حضرت عائشہ اور جناب سیدہ نے بھی گریہ فرمایا ہے میں ایسے چند مواقع مشہور انگریز مؤرخ واشنگٹن اروِنگ کی تاریخ "لائف آف محمدؐ" سے پیش کرتا ہوں:-

(۱) "رسولؐ کا گریہ حضرت خدیجہ کی وفات پر"

She was sixty-five years of age, Mohamet wept bitterly at her tomb and clothed him-self in mourning for her and for Abutalib, so that this year was called "the year of mourning."

"خدیجہ کی عمر ۶۵ سال تھی۔ محمدؐ اُن کی قبر پر پھوٹ پھوٹ کر روئے اور خدیجہ اور اپنے چچا ابوطالب کے غم میں ماتمی لباس پہنا چنانچہ وہ سال "عام الحزن" کہلایا جانے لگا (صٹ)

(۲) حضرت جعفر طیار اور جناب زید کی شہادت پر گریہ

جنگ موتہ میں حضرت جعفر طیار اور جناب زید (رسول کے آزاد کردہ غلام) کی شہادت پر رسول شدت سے روئے اور صحابہ نے بھی گریہ کیا۔

"All bewailed the fate of Jafar. He left behind him a beautiful wife and an infant son. The heart of Mohamet was touched by afliction. He took the orphan child in his arms and bathed it with tears. But most was affected when he beheld the young daughter of his faithful Zeid. approaching him. He fell on his neck and wept in speechless emotion. A by-stander expressed surprise that he should give way to tears for a death which according to muslim doctrine was a passport to paradise. "Alas!" — replied the prophet, "these are the tears of friendchip for the loss of a friend."

"تمام (صحابہ) جعفر کی موت پر دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ جعفر کے پس ماندگان میں اُن کی خوبصورت بیوی اور ایک کمسن لڑکا تھا۔ محمدؐ کو جعفر کی موت کا دلی صدمہ ہوا۔ وہ جعفر کے یتیم بچہ کو گود میں لے کر اتنا روئے اتنا روئے کہ بچہ رسول کے آنسوؤں سے تر بتر ہو گیا۔ لیکن رسولؐ کے غم و الم کی اُس وقت انتہا نہ رہی جب رسولؐ نے اپنے وفادار زید کی یتیم بچی کو اپنی طرف آتے

دیکھا۔ رسول نے لڑکی کو گلے سے لگا لیا اور اتنا گریہ کیا کہ شدت اندوہ و غم کے باعث آواز گلوگیر ہوگئی۔ پاس کھڑے ہوئے ایک صحابی نے اس پر اظہار تعجب کرتے ہوئے کہا کہ آپ ایسی موت پر آنسو بہا رہے ہیں جو اسلامی نظریہ کے مطابق پروانۂ جنت کی حیثیت رکھتی ہے۔ جواب میں رسولؐ نے افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دوستی کے آنسو ہیں جو ایک دوست کی دائمی مفارقت پر بہائے جا رہے ہیں۔"

(۳) جناب ابراہیم کی وفات پر گریہ!

Ibrahim, his son, a child but fifteen months old, was seized with mortal Malody and expired before his eyes. Mohamet could not control a father's feelings as he bent in agony over his belighted blossom of his hope — "My heart is sad," murmured he, "and mine eyes overflow with tears at parting with thee, Oh my son! and still greater would be my grief did I not know that I must follow thee for we are of God, for him we came and to him we must return."

Abdal Rahman, seeing him in tears, demanded, "Hast thou not forbidden us to weep for dead?" "No, replied the prophet, "I have forbidden ye to utter shrieks and out-cries, to beat your faces and rend your garments. These are the suggestions of the evil one, but tears shed for the calamity are as balm to the heart and are sent in mercy."

"آپ کے (رسولؐ کے) صاحبزادے ابراہیم جن کی عمر صرف پندرہ مہینے کی تھی مرض الموت میں مبتلا ہو کر باپ کی نظروں کے سامنے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ محمدؐ اپنے پدرانہ جذبات و احساسات پر قابو نہ رکھ سکے اور بے چین ہو کر اپنی تمناؤں اور اپنے ارمانوں کی اس کمھلائی ہوئی کلی پر جھک گئے اور اس طرح بین کرنے لگے:

"اے پارۂ جگر! مجھے جدا کرتے ہوئے میرا دل غم و اندوہ سے ڈوبا جا رہا ہے اور میری آنکھیں اشک افشانی کر رہی ہیں۔ میرے لئے تیری موت کا صدمہ اور بھی عظیم ہوتا اگر مجھ کو اس کا علم نہ ہوتا کہ میں بھی جلد ہی تیرے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔ ہم خدا ہی کے لئے ہیں اُس کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں بازگشت کرنا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"

(ایک صحابی) عبدالرحمٰن نے رسول کو روتا دیکھ کر عرض کیا "کیا آپ نے ہمیں مردہ پر رونے کو منع نہیں کیا ہے" جس کے جواب میں رسولؐ نے فرمایا۔ "نہیں میں نے رونے کو منع نہیں کیا ہے بلکہ چیخنے، دھاڑیں مار کر رونے، اپنے منھ پر طمانچے مارنے اور کپڑے پھاڑ ڈالنے کی ممانعت کی ہے۔ یہ باتیں شیطانی ہیں لیکن جو آنسو کسی کی مصیبت پر بہائے جائیں وہ زخم دل پر مرہم کا کام کرتے ہیں۔ یہ آنسو رحم کی بنا پر جاری ہوتے ہیں۔" (صفحہ ۲۱۱ و ۲۱۲)

(۴) حضرت آمنہ کی قبر پر گریہ:

طائف کے محاصرے کے بعد مدینہ کو واپس ہوتے ہوئے جب رسالتمآب موضع الابواء میں پہنچے جہاں آپ کی والدۂ گرامی مدفون ہیں تو آپ نے قبر پر جا کر بہت گریہ فرمایا چنانچہ دو شخص

اردنگ لکھتا ہے :-

His heart yearned to pay a filial tribute to her memory. He burst into tears on arriving at this trying place of tender affections.

"آپ کا دل اپنی والدہ گرامی کی قبر پر فرزندانہ عقیدت کے پھول چڑھانے کے لئے بیچین ہوگیا۔ چنانچہ آپ اس صبر آزما مقام پر پہنچے جہاں مادرانہ شفقتوں اور محبتوں کا مدفن تھا تو آپ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے" (صفحہ ۱۸۹)

(۴) جناب سیدہ عالم کا گریہ

ام المومنین حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ مرض الموت میں ایک موقع پر جناب سیدہ باپ کے پاس آئیں تو

"Welcome my child," said the prophet and made her sit beside him. He then whispered something in her ears at which she wept. Perceiving her affection he whispered something more and her countenance brightened with joy. "What is the meaning of this?" said I (Ayesha) to Fatima. The prophet honours thee with a mark of confidence never bestowed on any of his wives." "I can not disclose the secret of the prophet of God," replied Fatima. Neverthe-less after his death she declared that at first he announced his impending death; but seeing her weep consoled her with assurance that she would shortly follow him and become a princess in heaven among the faithful of her sex."

رسول نے انھیں خوش آمدید کہا اور اپنے برابر بٹھا لیا۔ اس کے بعد رسول نے سیدہ کے کان میں کوئی بات کہی جس پر وہ رونے لگیں۔ صاحبزادی کے جذبات محبت میں طوفان کا اندازہ کرتے ہوئے رسول نے پھر اُن سے کچھ چپکے سے کہا۔ اب کی مسرت سے سیدہ کا چہرہ چمک اٹھا۔

ام المومنین نے حضرت فاطمہ سے پوچھا کہ پہلے تمھارے رونے اور بعد میں ہنسنے کا کیا سبب تھا۔ رسول نے تمھیں اپنا معتمد قرار دیا ہے اور یہ وہ شرف ہے جو اُن کی کسی بیوی کو بھی حاصل نہیں۔ فاطمہ نے جواب دیا کہ میں رسول خدا کے اس راز کو افشا نہیں کرسکتی۔ بہرحال رسول کے انتقال کے بعد جناب فاطمہ نے بتایا کہ پہلے رسول نے اپنے انتقال کی خبر دی تھی جس پر میں روئی تھی لیکن مجھے روتا دیکھ کر تسکین دینے کے لئے پھر مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ سب سے پہلے تم میرے پاس پہنچو گی اور جنت میں مومنات کی سیدہ ہو گی۔ صفحہ ۲۲۲

(۵) جناب عائشہ اور دیگر ازواج کا گریہ

رسول خدا کی رحلت کا حال بیان کرتے ہوئے جناب عائشہ خود بیان کرتی ہیں :-

In a few moments his (prophet's) hands were cold and life was extinct. Ayesha laid his head on the pillow and beating her head and breast gave way to loud lamentations.

Her out-cries brought the other wives of Mohamet and their clamourous grief soon made the event known throughout the city.

"چند لمحوں میں اُن کے ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ میں نے اُن کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور اپنا سر و سینہ پیٹنے لگی اور دھاڑیں مار مار کر آہ و فریاد کرنے لگی۔ میری گریہ وزاری کو سُن کر رسول کی دوسری ازواجِ مطہراتؓ بھی آگئیں اور سب کے نالہ و فغاں کی صداؤں نے رسولؐ کے انتقال کی خبر مدینہ بھر میں پہنچا دی (صفحہ ۲۲۶)

(۵) صحابہ کا گریہ

رسول کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ کو یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ رسول کا انتقال ہو گیا یا رسول کا انتقال ہو بھی سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی رائے کو اتنا صائب سمجھ رہے تھے کہ تلوار بلند کر کے یہ اعلان فرمانے لگے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسولِ خدا انتقال کر گئے اُس کی گردن اس تلوار سے قلم کر ڈالوں گا۔ انھیں سمجھانے کے لئے حضرت ابوبکر نے آکر صحابہ کے مجمع میں جو تقریر کی اس سے مجمع اتنا متاثر ہوا کہ :—

The people listened to Abubakr with tears and sobbings.

لوگ (صحابہ) حضرت ابوبکر کی تقریر کے دوران میں رو رہے تھے اور سسکیاں لے رہے تھے۔

(۶) شہدائے احد پر گریہ کی اجازت

حضرت حمزہؓ کی شہادت پر رسولؐ کا گریہ فرمانا بلکہ اہلِ مدینہ کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ جناب حمزہ پر روئیں تاریخ کا ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے۔ جنابِ سرورِ کائنات کی اسی ہدایت و خواہش کا اثر تھا کہ مدینہ میں ایک عام رواج ہو گیا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی موت ہو جاتی تو عورتیں پہلے حضرت حمزہ پر گریہ کر لیتیں جب کہیں اپنے مردہ پر گریہ کرتیں۔

اس سلسلے میں واشنگٹن اروِنگ نے جنگِ احد کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

Mohamet forbade his followers to mourn the dead by cutting of their hair, rending their garments and the other modes of lamentations usual among the Arabs; but he consented that they should weep for the dead, as tears relieve the overladen heart.

" محمدؐ نے اپنے متبعین کو مرنے والے کے غم میں بال نوچنے، کپڑے پھاڑنے اور اظہارِ غم کے اسی طرح کے دوسرے طریقوں پر عمل کرنے سے منع کیا جو کہ اُس وقت عربوں میں رائج تھے لیکن اُس وقت رسولؐ نے اس کی اجازت دے دی تھی کہ وہ مرنے والے پر روئیں اس لئے کہ اُس کے آنسوِ غم، وہ دل کی تسکین کا سبب ہوتے ہیں۔"
(صفحہ ۱۲۸)

متذکرۂ بالا تاریخی اقتباسات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موتی پر گریہ شرعاً ناجائز نہیں ہے بلکہ رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں گریہ باعثِ ثواب نظر آتا ہے۔ شرعی حیثیت کے علاوہ طبی حیثیت سے بھی گریہ مفیدِ صحت ہے جیسا کہ اس مقالہ کے شروع میں رسالہ "حیات" کے اقتباس سے واضح ہوتا ہے۔ ان حالات میں حسینؑ پر گریہ کی مخالفت کرنے والے مسلمان گویا رسولِ اسلام کے فعل پر اعتراض کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

(محرم نمبر ۱۳۷۵ھ)

ہمارا نیا سال ہمیں کیا سبق دیتا ہے

از جناب مولوی محمد عثمان صاحب احمدی قادیانی

مسلمانوں کا سال ماہ محرم سے شروع ہوتا ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ جہاں دیگر اقوام کے سال خوشی کے دنوں سے شروع ہوتے ہیں مسلمانوں کا سال رنج و غم کے گھنگھور گھٹاؤں سے شروع ہوتا ہے ادھر محرم کا چاند نظر آیا اور مسلمانوں کے یہاں صف ماتم بچھ گئی اور رنج و غم کے آثار مسلمانوں کے چہروں سے نظر آنے لگے اور اس واقعہ ہائلہ کی جو اس مہینے کے اول عشرہ میں ظہور پذیر ہوا تھا یاد تازہ ہو گئی۔

قطع نظر اس کے کہ وہ بعض امور جو محرم کے دنوں میں مسلمانوں کی جانب سے ظہور میں آتے ہیں جائز ہیں یا نہیں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر مسلمان اپنے سال ہجری کے اس مہینہ محرم کے فلاسفی پہ غور کریں تو اُن کی ترقی کرنے کے اس میں ہزارہا اسباق موجود ہیں!

مسلمانان عالم کو یہ مہینہ اس امر کا سبق دیتا ہے کہ ایک مسلمان کی پیدائش کا صرف یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ کھائے پئے اور اس دنیا سے گذر جائے بلکہ محرم ان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ دنیا میں حق اور راستی کو پھیلانے آیا ہے۔ اہل دنیا کو ایثار سکھلانا اور حق کی خاطر قربان ہو جانا اُس کی پیدائش کا مقصد اصلی ہے۔ اگر ایک مسلمان کی پیدائش کا بھی وہی مقصد ہوتا جو دیگر اقوام کے افراد نے اپنی پیدائش کا مقصد سمجھا ہے۔ تو مسلمان کا سال بھی خوشی سے شروع ہوتا۔ لیکن برخلاف اس کے مسلمان کا سال "قربانی" سے شروع ہوتا ہے۔ اور قربانی پر ہی ختم ہوتا ہے۔ اگر سال کی ابتدا ہمیں یہ سبق دیتی ہے۔ کہ جس وقت حق یا ناحق کا سوال پیش ہو۔ تو ہمیں اپنے مال و اسباب و بیوی بچوں اور خود اپنی قربانی سے دریغ نہ کرنا چاہیئے بلکہ ان سب کو خدا کی راہ میں پیش کر دینا چاہیئے تاکہ ہم چند روزہ زندگی کو قربان کر کے ہمیشہ کی زندگی حاصل کریں اسی طرح بارہ مہینے کا اختتام بھی ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ جس وقت اشارہ خداوندی کسی امر کے لئے ہمیں ہو جائے، تو ہمیں اپنے عزیز لڑکے تک کی قربانی سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کا سال ہجری جو ان کو اس قسم کے سبق دیتا ہے۔ ہر سال آتا ہے اور ۲۹ یا ۳۰ دن کر کے چلا جاتا ہے لیکن مسلمان جہاں ہوتے ہیں وہیں رہتے ہیں۔ ان کے جمود میں کوئی کمی نہیں آتی ہے

قرآن شریف میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ ہم نے جن اور انس کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ یہ ہماری عبادت کریں ظاہر ہے کہ ہماری عبادت کی خدائے تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے۔ اُس کی ذات غنی ہے لیکن اصل مطلب خداوندی یہ ہے کہ انسان کامل عبد بنے اپنی عبدیت کے مظاہرے کرے جس وقت ہم اپنی عبدیت کے مظاہرے کریں گے۔ تو ہم اپنی پیدائش کی اصلی غرض کے پورا کرنے والے ہوں گے۔ ماتحت ہو یا نوکر یا غلام ان میں سب سے اچھا خادم یا غلام وہی خیال کیا جائیگا جو اپنے مالک کے اشاروں پر چلے اپنے مالک کے عادات اور اخلاق اختیار کرے۔

ایک انسان بھی اُسی وقت اصلی عبد کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔ جس وقت وہ خدائے تعالیٰ کے اشاروں پر چلے اور تخلقوا باخلاق اللہ کا اصلی مظہر بنے۔

اب آیئے ذرا ہم اپنے حبیب محمد مصطفٰے احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیارے نواسے حضرت امام حسینؓ کی اس عظیم الشان قربانی پہ غور کریں جس کو آپ نے اس محرم میں پیش کر کے ہمارے لئے بطور اسوۂ حسنہ کے پیش کیا ہے۔

اگر ہمارے امام حسینؑ چاہتے تو مدینہ منورہ ہی میں یزید کی بیعت کر کے دمشق چلے جاتے اور چند روزہ زندگی کے فوائد حاصل کر لیتے اُس کے درباری ہو جاتے اُس کے داہنے بازو پر بیٹھتے اس کا قرب حاصل کرتے لیکن آپ نے اس کو منظور نہ فرمایا۔ کیونکہ آپ اُس کو حق پر نہیں خیال کرتے تھے اس لئے آپ نے اُن فوائد کو جو آپ

چند الفاظ کے اعادہ سے حاصل کر سکتے تھے چھوڑ دیا اور نہ صرف اپنی جان دے دی بلکہ اپنے سامنے اپنے عزیزوں اور بچوں تک کو ذبح کرا دیا۔ تاکہ مسلمانوں کے لئے یہ قیامت تک سبق ہو جائے کہ جس وقت حق اور ناحق راستی یا ناراستی کا سوال پیش ہو تو ہمیں حق کو قبول کرنا چاہئے راستی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے۔ اور اگر اس کے خاطر روپیہ پیسہ جاہ و منصب بیوی بچوں حتیٰ کہ خود اپنی جان کی قربانی دینا پڑے تو اُس میں بھی مضائقہ نہ کرنا چاہئے۔

یہ سبق ہے جو یہ ہمیں دیتا ہے۔ اور اگر ہم اس کو مضبوط طور پر پکڑ لیں تو ہم اپنی پیدائش کی اصلی غرض پوری کر سکتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ شہادت امام حسین علیہ السلام کا جو مقصد تھا۔ اُس پر مسلمانوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ حالانکہ اگر وہ اس پر توجہ کرتے تو یہ امر نہ صرف اُن کے باعث فلاح اُخروی ہوتا بلکہ اُن کی دُنیا بھی درست ہو جاتی ایک مسلمان جس کو قرآن شریف نے ہمیشہ کائنات عالم کے ایک ایک ذرہ کے دیکھنے اور حقیقت کے دریافت کرنے پر بار بار توجہ دلاتی ہے اُس کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ اِس عظیم الشان واقعہ پر کوئی توجہ نہیں کرتا اِس کو نہایت سرسری نظر سے دیکھتا ہے حالانکہ اگر وہ بہ نظر تعمق غور کرے تو اس میں اِس کی دینی و دنیوی کامیابی کے لئے ہزار ہا راز مضمر ہیں اور وہ اِس سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

بخاری ج ۹ ص۳۳ اور جامع صغیر سیوطی ج ۲ ص۱۴۵ میں ہے کہ رسولخداؐ نے فرمایا "من راٰنی فی المنام فقد راٰنی فان الشیطان لا یتمثل بی"، جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے واقعاً مجھی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔

ام سلمہ کا خواب

ترمذی اپنی صحیح میں ناقل ہیں سلمی الغاریہ کا بیان ہے کہ میں ام سلمہ زوجہ نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں میں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو اُنھوں نے کہا میں نے ابھی ابھی رسالتمآبؐ کو خواب میں دیکھا آپ کے سر اقدس اور ریش مبارک پر خاک پڑی ہوئی تھی اور آپ رو رہے تھے میں نے یہ حالت دیکھ کر عرض کیا یا رسولؐ اللہ یہ آپ کی کیا حالت ہے؟" فرمایا میں نے ابھی حسینؑ کو قتل ہوتے دیکھا ہے (اسد الغابہ ج ۲ ص۲۲ و مطالب السؤل ص۷۱)

ابن عباس کا خواب

ابن عباس کہتے ہیں، دوپہر کو خواب میں رسولخداؐ کو دیکھا آپ کے بال پریشان اور آپ گرد آلود تھے، دست اقدس میں ایک شیشہ لئے ہوئے تھے میں نے عرض کیا یہ شیشہ ہے؟ آپ نے فرمایا" اس میں حسینؑ اور ان کے اصحاب کا خون ہے۔ جسے میں آج صبح سے چنتا (جمع کرتا) رہا ابن عباس کہتے ہیں بعد میں معلوم ہوا کہ حسینؑ اسی دن شہید ہوئے تھے (تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص۱۴۲ تاریخ ابن عساکر ج ۴ ص۳۴۰ الاصابہ ج ۱ ص۳۲۵ الاستیعاب ج ۱ ص۱۴۷ مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص۲۸۳ تذکرہ خواص الامۃ ص۱۵۲)

شہادت حسینؑ کس قدر عظیم تھی کہ رسول اسلامؐ نے اپنے تاثرات کو اس طرح ظاہر فرمایا اور نہ صرف حسینؑ بلکہ ان کے اصحابؓ کا خون بھی کس قدر گراں قیمت تھا جس کو صبح عاشور سے دوپہر تک رسالتمآبؐ

ایک شیشہ میں جمع کرتے رہے۔ کیا اسی میں خون غلام ابوذر غفاری کا خون بھی تھا؟ بے شک ہوگا۔ جون تم کو مبارک ہو تم نے حسینؑ سے کہا تھا۔ مولا؟ میں اپنے سیاہ خون کو آپ کے خون سے ملا دوں گا جو تمہاری زبان سے نکلا تھا۔ وہی رسولؐ نے کیا اور ابن عباس کے خواب میں تشریف لاکر بتا بھی دیا کہ اسی شیشہ میں حسینؑ اور ان کے اصحاب کا خون ہے

کیا اسی شیشہ میں علیؑ اصغر کا بھی خون تھا؟ نہیں اس بےزبان مظلوم کا خون حسین نے زمین پر نہیں گرنے دیا اور اپنے چہرہ پر یہ کہکر مل لیا تھا کہ میں اسی طرح اپنے نانا سے ملاقات کروں گا

اس شیرخوار کا خون اپنے خاص رنگ میں تمام شہدا کے خون سے الگ رہ کر ممتاز رہا۔

علیؑ اصغر تیرا خون ایسا عظیم ہدیہ تھا جس کے لئے حسینؑ نے یہ نہ چاہا کہ بارگاہِ الٰہی میں رسالتمآبؐ کے توسط سے تمام شہدا کے خون کے ساتھ ملا ہوا پیش ہو۔ بلکہ حسینؑ نے چاہا کہ اسے خود علیحدہ پیش کرکے بارگاہ خدا اور رسولؐ میں سرخرو ہوں۔

رسالتمآبؐ کے ان تاثرات کو دیکھنے کے بعد کیا کسی مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ شہادت حسینؑ پر ہمارے ماتم کو قابل اعتراض خیال کرے۔ حسینؑ کے غم میں ہمارا ماتم کرنا اور رونا رسول اسلامؐ کی تاسی ہے۔ رسولؐ واقعہ شہادت کے قبل ہی حسینؑ پر رو چکے ہیں۔

---

(۱) اعلام السوہ ماوردی شافعی میں عائشہ سے مروی ہے حسینؑ رسولخداؐ کی خدامت میں حاضر ہوئے اس وقت آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی حسینؑ آپ کے پشت اقدس پر بیٹھ گئے رسالتمآبؐ جھکے رہے حسین پشت پر بیٹھے کھیلتے رہے (یہ دیکھ کر) جبرئیل نے عرض کیا آپ کی اُمت آپ کے بعد ہی فتنہ میں پڑ جائے گی اور آپکے اس فرزند کو شہید کر ڈالے گی۔ پھر جبرئیل نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور سفید مٹی اُٹھا کر رسولؐ کو دکھائی اور کہا کہ اسی سرزمین پر آپ کا فرزند شہید ہوگا۔ اس کا نام "طف" ہے جب جبرئیل چلے گئے رسول اصحاب کے پاس باہر تشریف لائے، وہی مٹی آپ کے دست اقدس میں تھی اور آپ روتے جاتے تھے۔ حاضرین میں ابوبکر، علی، حذیفہ، عمار اور ابوذر تھے ان سب نے سبب گریہ دریافت کیا آپ نے فرمایا کہ میرا فرزند حسینؑ میرے بعد سرزمین طف پر قتل ہوگا یہ خاک جبرئیل نے لاکر مجھے دی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اسی میں حسینؑ کی خوابگاہ ہوگی (تاریخ ابن عساکر ج ۴ ص ۳۲۸ میں یہ بھی ہے۔ کہ حضرت نے وہ خاک جناب اُم سلمہ کے پاس رکھوا دی) (۲) مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۸۵ تاریخ ابن عساکر ۴ ص ۳۲۵ اسد الغابہ ج ص ۱۶۹ تذکرہ سبط ابن جوزی ص ۱۴۲ میں حسب ذیل واقعہ جزئی اختلافات کے ساتھ ملتا ہے)

جب حضرت علی علیہ السلام صفین تشریف لیجاتے وقت کربلا کی طرف سے گذرے، تو آپ نے توقف فرمایا اور دریافت کیا اس مقام کو کیا کہتے ہیں؟ عرض کیا گیا "کربلا!" یہ سنتے ہی آپ نے گریہ فرمانا شروع کیا یہاں تک کہ زمین آپ کے آنسوؤں سے تر ہو گئی اور حضرت نے فرمایا کہ میں ایک روز خدمت رسولؐ میں حاضر ہوا دیکھا کہ آپ مصروف گریہ ہیں میں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ابھی میرے پاس جبرئیل تھے اُنھوں نے مجھے خبر دی ہے کہ میرا فرزند فرات کے کنارے ایک سرزمین پر قتل ہوگا جسے "کربلا" کہتے ہیں پھر جبرئیل نے اس زمین کی خاک سے ایک مٹھی لیکر مجھے سونگھائی میں اپنی آنکھوں پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار ان سے آنسو جاری ہو گئے

حسینؑ! ہم تیری مصیبت میں جتنے بھی آنسو بہائیں اور اُمت اسلام تجھ پر جتنا روئے لیکن ہمارے آنسوؤں کا سمندر اتنا گران قیمت نہیں ہو سکتا۔ جتنے وہ قطرات اشک ہیں جو تیرے غم میں رسول اسلام اور علیؑ ابن ابیطالبؑ کی آنکھوں سے جاری ہوئے ہمارے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ ہم تجھ پر اتنا روئے کہ اب دنیا ہمیں ملت گریہ کن کہتی ہے کیا تیری بلند بارگاہ میں بھی کوئی قطرۂ اشک مقبول ہوا؟

حسینؑ ہم نے تیرے ماتم میں رو کر یہ شرف پایا کہ اگر ایک طرف رسالتمآبؐ ایک شیشہ میں تمام شہدا کا خون جمع کرتے ہیں تو دوسری

طرف ان کی پارۂ جگر فاطمہ زہراؑ اپنے رومال میں ہمارے آنسو جذب کرتی ہیں ہمیں جو شرف ملا وہ تیری ہی بارگاہ کا صدقہ ہے۔

محرم نمبر ۱۳۵۹ھ

حسینؑ

مکمل انسانیت کا ایک بہترین نمونہ ہیں

نوشتہ پرنسپل پیٹر اسکوائر از پریگ یگوسلا

رسالہ موسومہ گولڈن ڈیڈس آف حسینؑ مرتبہ پراونشیل شیعہ کانفرنس بہار نے مجھے بیدار کر دیا اور اس رسالہ کے ذریعہ سے مجھے مشرق کی اس اہم شخصیت کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں۔ اس رسالہ سے مجھے اس امر کی ترغیب ہوئی کہ میں اس شخصیت اور اُس کے حالاتِ زندگی پر گہری توجہ منعطف کر دوں۔

امام حسینؑ کی تاریخی حیثیت ہم پر ایک بار اور یہ امر ظاہر کرتی ہے کہ کوئی نہ کوئی خدائی آواز موجود ہے۔ جس کے مطابق ہر ملک کے افراد اور ہر قوم کی رہبری ہوتی رہتی ہے۔

اور اس کا ان پر اثر پڑتا رہتا ہے، دنیا میں بڑے بڑے معلم خدا کے پیغامبر کی حیثیت سے آئے تاکہ وہ خدائی برکتوں کا مظاہرہ کریں اُسکی ہدایتوں پر وضاحت سے روشنی ڈالیں اور وہ ایسے طریقے بتائیں جو ہمارے مشترکہ مقاصد کے حصول کا براہ راست اور قابل اعتماد و یقین کا ذریعہ ہوں ہرگاہ کہ ہم لوگ اُس انفرادی کڑی کی سی حیثیت رکھتے ہیں جو روحانی ارتقا کی زنجیر کو جوڑے ہوئے ہے اور یہ خدائی پیغامبر اُن مناروں کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر یہ زنجیریں بھروسہ کئے ہوتے ہیں ہم ہم اُن پر بھروسہ رکھتے ہیں اُنھیں بنیادوں پر عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ اور ان کی طرف توجہ کر کے بلندی خیال حاصل کر سکتے ہیں۔

امام حسینؑ نے مکمل انسانیت کا بہترین نمونہ پیش کرنے میں ایک بہت اہم اور نمایاں خدمت انجام دی۔ اس کے علاوہ اُن کی وہ کوشش اور وہ ہمت بھی تھی جو آپ نے اصلاح قوم اور اپنے مقصد کو تکمیل تک پہونچانے کے لئے ظاہر کی۔ آپ واقف تھے کہ صرف خدائی صداقت کی حمایت میں قربانی کی عظمت انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو بڑھاتی ہے یہ ظاہر ہے کہ یہ خدائی مجاہد قوت کے بل بوتے پر اہی اپنے مقصد کے لئے جنگ کر سکتے تھے لیکن اس پر بھی اُنھیں اخلاقی اور روحانی حلقہ میں فتح حاصل ہوئی۔ چونکہ اخلاقی اور روحانی دنیا کی بنیاد جسمانی طاقت و اقتدار کی دنیا پر ہے اور اس کے ذریعہ سے تمام انسانی افعال اور جسمانی قوت و اقتدار کے جذبہ کو بھی متحرک کیا جا سکتا ہے لہذا اُن تھوڑے آدمیوں کی شکست وقت آنے پر جسمانی طاقت و اقتدار کی دنیا میں بھی فتح سے مبدل ہو جائے گی۔

اسی طرح ایسے مجاہد ساتھ ہی ساتھ دنیا میں خدائی حکومت کے قائم و تعمیر کرنے والے ثابت ہوئے کیونکہ خدا صرف تمناؤں تمناؤں کی روحانی دنیا اور بلندی تخیل کی فضا میں بادشاہت نہیں کرتا بلکہ ہمارے روزانہ کام اور دنیا سے بھی تعلق رکھتا ہے اور دنیا کی بھی بادشاہی کرتا ہے۔

عیسیٰ مسیح کی اس دعا کا جو انھوں نے خدا کو پکار پکار کر کی تھی یہی مفہوم ہے "تیری حکومت آئے اور تیری مرضی جس طرح آسمان پر حکمران ہے اسی طرح دنیا پر بھی حکمران رہے"

اب ہمارا یہ فرض ہے ان معلمین کی زندگی کے حالات کو موجودہ حالات پر تطبیق دیں ہمیں ان کی تاریخی حیثیت سے اپنے کو بالکل ہی مربوط رکھنا چاہئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پیش کردہ مضامین آئندہ نسل کے لئے محض رسم و رواج بن کر رہ جائیں اور ایک ایسی عبادت و پرستش کی صورت اختیار کر لیں جس سے ہماری موجودہ زندگی یا کیرکٹر

پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے خدائی منشا کے حقیقی مفہوم کو بھلا دیا، غلط فہمی میں مبتلا ہوئے اور اصل مقصد کی صورت و نوعیت کو بدل دیا مفہوم و مقصد کے اس قسم کے توڑ مروڑ کا نتیجہ خود نمائی اپنے کو سب سے بلند سمجھنا دوسروں سے غیر دوستانہ رویہ رکھنا، فرقہ وارانہ تنگ دلی اور ان لوگوں کا عدم لحاظ ہوگا جو مختلف عقائد رکھتے ہیں۔

امام حسینؑ نے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ ہم اپنے زمانہ میں بھی صداقت اور نیکی سے محبت رکھیں اور اس کی حمایت میں جنگ کریں نہ صرف اپنے حقوق کے لئے لڑیں بلکہ ان کے حقوق کے لئے بھی جنگ کریں جن پر ظلم کیا گیا نہ صرف اپنے ہی لئے انصاف چاہیں بلکہ ان کے لئے بھی انصاف چاہیں جو ناانصافی کا شکار ہو رہے ہیں جس چیز کو ہم یہ محسوس کریں وہ مبنی بر صداقت ہے بلا اس لحاظ کے کہ شکست حاصل ہوگی یا قربانیاں دینی پڑیں گی ہمیں ایسی صداقت کی حمایت کرنی چاہیئے۔

بہرحال خدا کی مرضی اور خواہش ہے کیونکہ اس نے اپنے نبیوں کے ذریعہ جو ہمارے بشیر دستے تھے ہم پر یہ ظاہر کر دیا کہ اس طرح کی لڑائی تشدد کے ہتھیار اور جسمانی قوت کے بل بوتے پر نہ لڑنی چاہیئے کیونکہ اس میں بھی سنگدلی کی جھلک ہے بلکہ اس لڑائی کو محبت اور تقویٰ کے اسلحوں سے مسلح ہو کر لڑنا چاہیئے۔

یہی وہ محبت ہے جو آج کی موجودہ دنیا میں نایاب ہو رہی ہے وہ محبت جو تمام جماعتوں اور قوموں کو ایک عظیم الشان برادری میں سمیٹ کر متحد کر دیتی ہے (حسینؑ دی مارٹر)

سنہ ۶۰ھ میں رجب کا مہینہ عجیب خونی مناظر کے ساتھ رونمائے عالم ہوتا ہے کہ جب تک صفحۂ ارض باقی ہے اُس وقت تک اس مہینہ کے تاریخی واقعات بھی ورق عالم سے محو ہونے والے نہیں۔ نصف رجب گذرتا ہے معاویہ کی موت واقع ہوتی ہے اور سانحہ کربلا کی نیو پڑتی ہے جب سنہ ۶۰ھ میں معاویہ کا انتقال ہوتا ہے یزید تخت خلافت پر بیٹھ کر پہلا حکم یہ نافذ کرتا ہے کہ حسینؑ ابن علی سے بیعت لو۔ اگر انکار کریں تو قتل کر دو۔ ابھی پندرہ دن بھی گذرنے نہیں پائے تھے کہ فاطمہؑ کا لال رسولؐ کا نواسہ ترک وطن پر آمادہ کیا جاتا ہے بقول علامہ طبری ۲۸ رجب یوم یکشنبہ اور بقول مشہور چہارم شعبان کو قبر رسولؐ کا مجاور ماں کا سوگوار نانا اور ماں کی قبروں سے جدا ہو کر مکہ کا عازم ہوتا ہے چھوٹا سا لشکر اور کچھ مخدرات عصمت ساتھ ہوتی ہیں اور کچھ اعزا و اقربا مصلحتہً چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ راستہ میں عبداللہ ابن مطیع ملتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں فرزند رسولؐ کہاں کا ارادہ ہے فرمایا ابھی تو مکہ جاتا ہوں آئندہ خدا جانے۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ حضور کوفہ کا قصد نہ کیجئے گا وہاں کی حالت بہت خراب ہے میرے ماں باپ فدا ہوں وطن نہ چھوڑیئے وہ لوگ قابل اطمینان نہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جو مشیت الٰہی میں گذر چکا وہ ہو کے رہے گا۔

امام مظلوم روانہ ہوتے ہیں اور سوم شعبان یوم جمعہ (طبری) یا نو شعبان کو مکہ میں داخل ہوتے ہیں۔ شوال اور ذیقعدہ کسی طرح وہیں گذارتے ہیں، آخر میں خبر ملتی ہے کہ حاجیوں کے بھیس میں لوگ قتل حسینؑ کے لئے روانہ کئے گئے ہیں۔ اسلام کے حامی نے حرمت حرم کا خیال کیا سب لوگوں کو مسجد میں جمع کر کے پہلے حمد خدا کی، اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔ "اگر میں ایک بالشت بھی اُس سے الگ قتل کیا جاؤں تو یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اس بات سے کہ میں حرم میں قتل کیا جاؤں جہاں مچھر کا خون بہانا جائز نہ ہو وہاں سید کا لہو کیونکر بہایا جائے مجبوراً آٹھویں ذی الحجہ یوم الترویہ یا بقولے سوم ذی الحجہ (روضۃ الصفا) کو مولود کعبہ کا فرزند مکہ چھوڑنے پر تیار ہو جاتا ہے اور اہل عراق کے متواتر خطوط کی وجہ سے کوفہ کا ارادہ فرماتے ہیں۔"

مکہ سے چلتے وقت عمر ابن عبدالرحمان ابن حرث ابن ہشام ملاقات کرتے ہیں۔ (بعض تاریخوں میں بن حرث کے بجائے حارث ہے) عرض کرتے ہیں کہ حضور ایک حاجت لیکر آیا ہوں اگر قبول فرمائیں۔ ارشاد ہوا کہو۔ عمر ابن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ آقا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کوفہ جارہے ہیں۔ میں وہاں سے بہت خائف ہوں، کوفیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے وہ سب عبید الدنیا و الدرہم ہیں۔ قصد ملتوی کیجئے۔ حضرت نے فرمایا جو کچھ کہتے ہو ٹھیک کہتے ہو لیکن جو مقدر الٰہی ہو چکا ہے وہ ہو کے رہے گا تمھاری رائے مانوں یا نہ مانوں۔ اس کے فوراً بعد ابن عباس آتے ہیں۔ انھوں نے بھی ایسی ہی گفتگو کی اور حضرت نے ویسا ہی جواب دیا (تاریخ کامل)

نوٹ:۔ (غور کرنے کے قابل یہ مسئلہ کہ اگر حضرت کی منفعت دنیاوی کے واسطے جنگ کرتے یا دنیاوی جنگ مقصود ہوتی تو متواتر خبروں کے بعد اس قلیل لشکر کو لیکر کبھی بھی قصد نہ فرماتے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ محض شجر اسلام کو ہرا کرنا اور نانا کی محنت کا خیال تھا)۔

حضرت مکہ سے روانہ ہوتے ہیں اور عمرو بن سعید بن عاص جو یزید کی طرف سے حجاز کا امیر تھا۔ امام سے تعرض کرتا ہے مگر حضرت اس کی روک ٹوک کا قطعاً خیال نہیں فرماتے اور روانہ ہو جاتے ہیں۔ مکہ سے روانہ ہو کر مقام تنعیم سے گذرتے ہوئے منزل صفاح پر پہنچتے ہیں۔ وہاں فرزدق مشہور شاعر سے ملاقات ہوتی ہے۔ امام علیہ السلام دریافت فرماتے ہیں کہ فرزدق کچھ حالات سفر بیان کرو۔ وہ کہتا ہے کہ حضور قلوب ناس تو آپ کی طرف ہیں لیکن تلواریں بنی اُمیہ کے ہاتھ میں ہیں۔

(حضرت امام حسینؑ نے فرمایا خدا ہی کے لئے سب احکام ہیں جو چاہے کرے" (تاریخ کامل) منزل صفاح سے چل کر سید الشہداء بطن الرمہ پہنچے یہاں سے حضرت نے کوفیوں کو ایک خط بھی لکھا اور قیس بن مسہر صیداوی کو دے کر روانہ کیا (روضۃ الصفا)

تاریخ طبری میں ہے کہ یہ خط مقام "حاجز" سے روانہ کیا گیا وہ خط یہ تھا "کہ حسینؑ ابن علیؑ کا مومنین و مسلمین کی طرف۔ سلام علیکم۔ بعد حمد خدا کے یوں ارشاد ہے کہ مسلم ابن عقیل کا خط میرے پاس آیا تھا اور تمھارا اجتماع ہماری نصرت پر سب حالات معلوم ہوئے خدا تم کو اس کا اجر عظیم عطا کرے۔ مکہ سے روز سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ یوم الترویہ کو روانہ ہو چکا ہوں جس وقت میرا قاصد تمھارے پاس پہونچے اس وقت سے انتظار کرنا عنقریب انشاء اللہ تمھارے پاس پہونچتا ہوں" (تاریخ طبری) [illegible] نے قیس ابن مسہر کو روانہ کیا قیس چلے منزل قادسیہ پر پہونچے تھے کہ حصین بن نمیر [illegible] ابن زیاد کی طرف سے پہلے سے موجود تھا گرفتار کیا اور اس نے کوفہ روانہ کر دیئے۔ ابن زیاد نے ان کو دیکھ کر حسینؑ ابن علیؑ کو بُرا کہنا شروع کیا۔ تاریخ کامل کا یہ فقرہ ہے کہ "فسب الکذاب ابن الکذاب الحسین بن علیؑ" یعنی ایسا جھوٹے کا بیٹا جھوٹا حسینؑ ابن علیؑ کو دشنام دینے لگا۔ بھلا غلام یعنی اپنے آقا کی بُرائی کب سن سکتے تھے۔ وہ بھی منبر پر گئے اور بعد حمد و ثنا فرمایا۔ ان هذا الحسينؑ ابن عليؑ خير خلق الله ابن فاطمة بنت رسول الله انا رسوله اليكم قد فارقته بالحاجر، حسینؑ ابن علیؑ بہتر مخلوقات رب الارباب ہیں اور صدیقہ کبریٰ فاطمہ زہرا بنت رسولؐ خدا کے لال ہیں، میں ان کا پیغامبر ہوں اور منزل حاجر پر ان کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس کے بعد قیس نے ابن زیاد اور اس کے آباؤ اجداد پر لعنت ملامت کرنی شروع کی۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ ان کو کوٹھے سے نیچے گرا دیا جائے۔ چنانچہ کوٹھے سے گرا دیئے گئے اور شہید ہوئے۔ مقام حاجر سے آگے بڑھ کر حضرت ایک چشمہ پر وارد ہوئے۔ وہاں پھر عبداللہ ابن مطیع کو پاتے ہیں اور عبداللہ اصرار شروع کرتے ہیں کہ آپ حرمت اسلام ہیں، حرمت عرب و قریش ہیں تشریف نہ لے جائیے۔ حضرت نے انکار فرمایا اور کہا کہ "قل لن یصیبنا الا ما کتب الله لنا" جو خدا نے معین کیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ وہاں سے بھی مسافر کربلا آگے بڑھتے ہیں اور اب منزل زرود پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔ اس جگہ ایک خیمہ دیکھا۔ پوچھا یہ خیمہ کس کا ہے؟ لوگوں نے کہا زہیر ابن قین کا۔ اسی جگہ سے زہیر کا اور حضرت کا ساتھ ہوتا ہے۔ زہیر بنا سک حج سے فارغ ہو کر کوفہ جاتے تھے۔ امام نے زہیر کو طلب فرمایا۔ زہیر نے کچھ تامل کیا تو ان کی بیوی نے کہا واہ رے ہو، فرزند رسولؐ طلب کرے اور تم تامل کرو۔ یہ کلام ان کا موثر ہوا اور خدمت امامؑ میں حاضر ہوئے تھوڑی دیر حضرت کے ساتھ خیمہ میں رہے جب باہر آئے تو حکم دیا کہ میرا خیمہ بھی امام کے خیمہ کے قریب نصب کرو۔ اپنی بی بی کو طلاق دے کر چھوٹے بھائی کے حوالے کیا زہیر نے آواز دی کہ جس کو شوق شہادت ہو میرے ساتھ آئے ورنہ گھر جائے۔ ہمراہی ان کے روانہ کوفہ ہو گئے۔ زہیر تو امام حسینؑ کے ساتھ رہے (طبری)۔ اب حضرت زہیر کو لیکر روانہ ہوتے ہیں اور منزل ثعلبیہ پر پہونچتے ہیں

ایک شخص کو دیکھا کہ کوفہ کی طرف سے آ رہا ہے امامؑ نے استفسار حال کیا اس نے بیان کیا کہ میں کوفہ ہی میں تھا کہ مسلم ابن عقیلؑ اور ہانی بن عروہ کی خبر قتل آئی تھی۔ وہ تو قتل کردا ے گئے۔ چنانچہ بچوں کو دیکھا تھا کہ ان کے پاؤں میں رسیاں باندھ کر کھینچتے پھرتے تھے (روضۃ الصفا)

حضرت نے فرمایا "انا للّٰہ وانا الیہ راجعون" بعض اصحاب جب اس سے مطلع ہوئے تو کہنے لگے کہ یہاں سے اب آگے مت جائیے۔ اپنے عیال پر رحم کیجئے لیکن بنی عقیل نے کہا کہ مسلم کے بعد ہم کو اپنی زندگی کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ ہم بغیر گلا کٹائے باز نہ آئیں گے۔ امام نے بھی فرمایا کہ "لاخیر فی العیش بعد ھولاء" (تاریخ کامل) منزل ثعلبیہ سے روانہ ہو کر حضرت منزل ذبالہ پر آئے۔ خبر قتل عبد اللہ بن یقطر معلوم ہوئی یہ بزرگوار آپ کے رضاعی بھائی بھی تھے (تاریخ کامل) منزل ذبالہ کے بعد قریب بطن عقبہ میں پہونچے تو ایک عرب سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے بھی کہا کہ وہاں کا ارادہ مت کیجئے راستہ خطرناک ہے لوگ برگشتہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سب مجھے معلوم ہے لیکن مصلحت خدا میں کیا چارہ ہے۔ امام غریب وہاں سے بھی روانہ ہوئے۔ یہ سب منزلیں چہارم شعبان سنہ ۶۰ھ سے آخری الحجہ سنہ ۶۰ھ تک میں طے ہوئیں۔ اس کے بعد حضور منزل شراف پر پہونچتے ہیں اس مقام پر لوگ درخت کی کچھ ایسی چیزیں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ درخت تو یہاں کوئی نہ تھا۔ پھر لوگوں نے کہا ہمیں تو گھوڑوں کی ہنہناہٹ بھی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا مجھے بھی گھوڑوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور نیزہ کی انیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک طرف ہو کے خیمے نصب کرو۔ اتنے میں دس ہزار سواروں کا لشکر حُر کے ہمراہ ٹھیک دوپہر کو حسینؑ کے مقابل آکر کھڑا ہوتا ہے حسینؑ اور اصحاب حسینؑ تلواریں حمائل کئے صف بستہ کھڑے تھے دیکھا گھوڑوں کی زبانیں پیاس سے باہر نکلی ہیں شہ سواروں کا دل پانی کی لہروں پر لوٹا جاتا ہے کریم ابن کریم کا دریائے سخاوت موجزن ہوتا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ فوراً گھوڑوں کو اور سواروں کو پانی پلا دو۔

لشکر حر کو دیا پیاس میں پانی شہ نے تھا سخی ابن سخی آنکھ چرائی نہ گئی

اصحاب حسینؑ نے مشکوں کے دہانے کھول دیئے جب تک پیاسے منھ نہ ہٹاتے تھے ظرف آب دور نہ کیا جاتا تھا۔ علی بن طعان محاربی کہتا ہے کہ میں بھی حُر کے رسالہ میں تھا۔ گرسب کے بعد دوپہر پر پہونچا۔

حضور نے جب میری حالت دیکھی تو آواز دی کہ جلدی اونٹ بٹھاؤ اور پانی پلاؤ۔ غرضکہ حضرت برابر لوگوں کو سیراب کرتے رہے یہاں تک کہ ظہر کا وقت آگیا۔ حسینؑ نے حجاج بن مسروق جعفی کو حکم دیا کہ اذان کہو۔ اذان ہوئی اقامت کے بعد آفتاب امامت برج شرف سے باہر ہوا۔ حمد وثنائے باری کے بعد ارشاد ہوا:

"اے لوگو یہ معذرت ہے خدائے عزوجل اور تم سب لوگوں کی طرف میں تم لوگوں کی طرف نہیں آیا جب تک کہ تمھارے متواتر خطوط میرے پاس نہ آئے اور تمھارے بہت سے سفیر آئے کہ چلئے ہمارا کوئی امام نہیں ہے شاید آپ کی وجہ سے ہم راہ راست پر آئیں پس اگر تم لوگ اپنے اس قول پر قائم ہو تو میں تمھارے شہر میں آیا ہوں، تم اپنے عہد وپیماں سے مجھ کو اطمینان دلاؤ تو میں آؤں اور اگر ایسا نہیں کرتے اور میری باتوں سے کراہیت کرتے ہو تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں پلٹ جاتا ہوں (طبری ص ۲۲۸) حضرت کے اس ارشاد کے بعد کسی نے کوئی جواب نہ دیا اور موذن سے کہا "اقم فاقام الصلوٰۃ" پس نماز شروع ہو گئی۔ اس وقت امام حسینؑ نے حُر سے یہ بھی کہا کہ تو بھی اپنے اصحاب کے ہمراہ نماز پڑھ اُس نے کہا "ابو نصلی انت ونصلی نصلوا تک" یہ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ آپ نماز پڑھائیں ہم سب آپ کی اقتدا میں پڑھیں گے اس کے بعد امام حسینؑ نے نماز جماعت ادا فرمائی اور سب کے سب اپنے خیموں میں جاگزین ہوئے۔ یہاں تک کہ عصر کا وقت آیا۔ حسینؑ نے حکم دیا کہ نماز عصر کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔ نماز عصر پڑھا کر سید الشہداء نے قوم کی طرف متوجہ ہو کر حمد وثنائے باری کے بعد ارشاد فرمایا کہ "ایہا الناس تقویٰ کو اختیار کرو اور حق کو پہچانو تمھارے متواتر خطوط اور سفراء میرے پاس آئے اس لئے تمھارے پاس آیا ہوں۔ حضرت کا یہ ارشاد سُن کر حُر نے کہا جن خطوں کا آپ ذکر کرتے ہیں ہم ایک بھی نہیں جانتے امام نے عقبہ بن سمعان کو آواز دی کہ دونوں خورجیں جن میں خطوط رکھے ہیں میرے پاس لاؤ خطوں سے بھری ہوئی دو خورجینیں سامنے کر دی گئیں۔ حر نے کہا ان خط لکھنے والوں میں تو نہیں ہوں لہٰذا آپ کو بغیر ابن زیاد کے پاس حاضر کئے باز نہ آؤں گا" فقال لہ الحسین الموت ادنی من ذالک" یہ کہکر حسینؑ نے اپنے اصحاب سے کہا کہ اُٹھو اور چلو جب سوار ہوئے اور چلنے لگے تو حُر نے آکر روکا۔ حسینؑ نے کہا "ثکلتک امک ما تریدُ" تیری ماں تیرے غم میں روئے۔ کیا چاہتا ہے

حُر نے کہا خدا کی قسم اے حسینؑ اگر آپ کے علاوہ عرب میں سے کوئی شخص میری ماں کا نام لیتا تو میں بھی اس کو یوں ہی کہتا لیکن واللہ مالی الی ذکر امك من سبیل الا فاحسن ما نقدر علیه۔ میرے لئے کوئی چارہ کار نہیں کہ میں آپ کی مادر گرامی کا ذکر کروں لیکن بہترین عنوان سے (تاریخ طبری صـ۲۲۸) غرض اس گفتگو کے بعد حضرت منزل اشراف سے بھی کوچ فرماتے ہیں۔ حُر بھی ساتھ ساتھ بائیں طرف ہو کر روانہ ہوتا ہے۔ وہاں سے مقام "مصمہ" ہوتے ہوئے جب "ذی حسم" میں پہونچے تو وہاں بھی ایک پرزور خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ناگفتہ بہ حالتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "میں کسی کو اپنی نصرت پر مجبور نہیں کرتا جس کا جو جی چاہے وہ کرے"

یہ سُن کر زہیر قین اُٹھے اور مجمع سے خطاب کر کے کہا ایہا الناس اس کا جواب تم دوگے یا میں عرض کروں۔ لوگوں نے کہا زہیر تم ہی کہو زہیر عرض کرتے ہیں کہ آقا اگر دنیا ہمیشہ باقی رہنے والی ہو اور ہمیشہ اُس میں رہنے والے ہوں جب بھی آپ کی نصرت سے منھ نہ موڑیں گے۔

یہ سُن کر سید الشہداءؑ نے ان کے لئے دعائے خیر کی اور آگے بڑھے اُس کے مقام عذیب پر پہونچے جہاں چار سوار کوفہ سے آتے ہوئے دکھائی دیئے جن میں طرماح بن عدی ہو رہبر بن کر آئے تھے۔ حُر نے ان سب کو روکا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "اے حر یہ سب میرے انصار و اعوان ہیں"

حر نے کہا یہ تو آپ کے ساتھ نہیں آئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا شل ساتھی کے ہیں طرماح یا اور ساتھیوں کی جو گفتگو ہوئی بخیال طوالت مضمون ترک کی جاتی ہے۔

امام مظلومؑ مقام عذیب سے چل کر قصر بنی مقاتل کے پاس پہونچے یہاں بھی ایک خیمہ نصب پایا۔ پوچھا یہ خیمہ کس کا ہے۔ لوگوں نے کہا عبداللہ بن جعفی کا حضرت نے کہا بلالاؤ جب قاصد نے کہا کہ اے عبداللہ حسینؑ بن علیؑ بلاتے ہیں"

یہ سُن کر عبداللہ جعفی نے کلمہ "انا للہ وانا الیہ راجعون" زبان سے جاری کیا اور خدمت امام حسینؑ میں حاضر ہوئے۔

عبدالرحمٰن بن حرث کہتے ہیں کہ جب آخر شب ہوئی اور یہاں کوچ کا حکم ہوا تو دیکھا میں نے کہ حسینؑ نے سر کو جنبش دی اور فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون والحمد للہ رب العلمین یوں ہی دو تین مرتبہ اس کلمہ کو حضرت نے ارشاد فرمایا تو جناب علی اکبرؑ خدمت پدر میں پڑھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ بابا آخر یہ کلمہ کیوں زبان پر جاری فرمایا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ابھی میں نے ایسا خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر سوائے ہماری موت کے اور کچھ نہیں ہے یہ سُن کر شبیہ پیغمبرؐ باپ سے عرض کرتا ہے کہ اے پدر گرامی کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ حسینؑ نے فرمایا کہ بے شک ہم حق پر ہیں قسم ہے اُس کی جس کی طرف تمام عباد کی بازگشت ہے۔ جناب علی اکبرؑ نے فرمایا ایسی حالت میں "موت" سے مجھے کوئی خوف نہیں ہے (طبری صـ۲۳۱) غرض شب کو یہاں قیام رہا۔ نماز صبح پڑھکر چلنے کا حکم دیا حُر بھی ساتھ ہی روانہ ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں ایک سوار مسلح نظر آیا سب رُک کر انتظار کرنے لگے یہاں تک کہ جب قریب آیا تو اس نے حُر کو سلام کیا مگر لم یسلم علی الحسین (طبری صـ۲۳۶)

اس کے بعد اس نے ایک خط ابن زیاد کا حُر کو دیا جس کا مقصود یہ تھا کہ حسینؑ کو چھوڑنا مت۔ امام مظلوم نے وہاں سے ایک بستی کو ملاحظہ کیا۔ فرمایا یہ کون سا مقام ہے کسی نے کہا غاضریہ کسی نے نینوا۔ زہیر نے کہا کہ آقا یہ فرات کا کنارہ ہے یہیں چل کر قیام کیجئے تو مناسب ہے۔ حضرت نے زہیر سے پوچھا "یہ کون سا مقام ہے" زہیر نے کہا "عقر" حسینؑ نے کہا۔ اللھم انی اعوذ من عقر۔ یہاں پہونچ کر سید الشہداءؑ نے ختم سفر کا حکم دیا اور فرمایا کہ سفر ہمارا تمام ہوا۔ منزل ہماری آخر ہوئی۔ یہ کہہ کر کربلا کا مسافر دوسری محرم پنجشنبہ سنہ ۶۱ھ کو زمین نینوا پر اُتر پڑتا ہے۔

وہ کافر کیا کریں گے جو کیا اسلام والوں نے

جناب محمد اسحاق الحسینی صاحب بارہ ضلع غازی پور

قرآن کنند حفظ و بہ طاہا کشند تیغ
یٰسیں کنند حرز و امام مبیں کشند

واقعات عالم میں شہیدان راہ خدا کی مختلف تصویریں دیکھی گئیں جو ہر ایک بجائے خود نمونۂ عبرت تصویر مصیبت اور انتہائے ظلم کہی جاسکتی ہیں خصوصاً ہادیانِ برحق کے حالات جسے حکایۃً زبان قدس نے بھی کہہ سنایا کم قابل ذکر نہیں کیا حضرت آدم کی مصیبت حضرت نوح کی اذیت حضرت یحییٰ کی شہادت حضرت زکریا پر آرہ کشی حضرت ابراہیم پر آتش افروزی حضرت عیسیٰ کی سولی۔ اپنی اپنی جگہ پر یہ کل واقعات یا ایسے ہی جیسے دیگر انبیاء و رسل کی مصیبتیں اس دار فانی کے باشندوں کے لئے اس قابل نہیں کہ انسان اسے غور سے دیکھے اور ہمیشہ آنسو گرائے یہ مظالم ایسے نہ تھے جو بھلائے جاسکیں مگر ۶۱ھ نے دنیا میں جو بے انتہا ظلم و جور کا نمونہ پیش کیا وہ ایک ایسا دلسوز واقعہ ہے اور ایسی وحشیانہ کاروائی عمل میں آئی ہے جو انسانیت سے گزر کر بہیمیت تک پہونچ جاتی ہے جس نے تاریخ عالم کے تمام مصائب کو اپنا خونی منظر دکھا کر خاموش کر دیا۔

اس عبرتناک واقعہ میں جو جو راز پنہاں ہیں وہ نہ صرف مظالم ہی کے اہمیت کو دوبالا کر کے دکھاتے ہیں بلکہ دوسری جانب اُس لاثانی مظلومیت کا بھی پتہ دیتے ہیں جس پر ثابت قدم رہنے والا دنیا میں سوائے ذات حسین ابن علیؑ روحی لہ الفدا کے دوسرا نہیں گذرا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک کا مقابل ایک ہوا کرتا ہے مگر میدان نینوا میں اس مظلوم کے لئے اگر ایک طرف یزیدی گروہ برسرپیکار تھی تو دوسری طرف آسمان و زمین و ہوا پانی و شجر و حجر سب نے منھ موڑ لیا تھا آفتاب کی تمازت نے زمین پر آگ کی چادر بچھا رکھی تھی اور تپتی ہوئی زمین اس قابل ہو گئی تھی جو بقول میر انیس مرحوم

(بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر)

گرمی سے پھکتے ہوئے قلب کے لئے آب فرات پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے کہ ذریت رسول کے حلق پانی سے تر نہ ہونے پائیں۔ کھلے ہوئے آسمان اور پھیلی ہوئی طپش آفتاب کے لئے کوئی ایسا نہ تھا جو حائل ہوتا اور تکلیف دہ کرنوں کو روکتا یہی وجہ تو تھی جو شیر خدا کا بہادر فرزند حضرت جبرئیل کے سایہ فگنی پر بول اُٹھا

(ہٹ جاؤ جبرئیل یہ وقت امتحاں کا ہے)

دنیا میں تمام جنگ قوت و بہادری کے مقابلے سے کی جاتی ہے۔ اور شجاعان فن سپہگری کو موقع داد شجاعت کا ملتا ہے کہ وہ اپنی قوت سے کسی مستحکم قلعہ کو فتح کر سکیں، مگر کوئی متمدن اور شجاع اس کو بہادری نہ سمجھے گا کہ بے قصور طرف مقابل کے لئے آب و دانہ بند کر دیا جائے نہروں پر چوکیاں بٹھلا دی جائیں اور مسلسل تین روز تک بھوک و پیاس کی شدت میں اسی جلتی ہوئی ریت پر تڑپا تڑپا کر تہ تیغ کیا جائے اور اطفال خورد سال بلکہ شیر خوار بچہ کو ہدف ناوک بنایا جائے آج جنگجو تو پیما جو ملک گیری کی ہوس میں ڈوبی ہوئی ہیں انھوں نے بھی باوجود مختلف سامان حرب مہلک آلات جنگ یہ پسند نہیں کیا کہ وہ کسی کو بھوکا پیاسا قتل کریں اور لاشوں پر گھوڑے دوڑائیں بچوں اور عورتوں کو مقید کریں اور انھیں رونے تک کی اجازت نہ دیں بلکہ مجرمانہ حیثیت سے جس کو وہ پھانسی کا مستحق سمجھتے ہیں آب و دانہ سے سیراب کر کے آغوش قضا میں دیتے ہیں۔

اسی پر تو دنیا آج تک رو رہی ہے اور ہر قوم و ملت جس کے پہلو میں درد بھرا دل ہے چشم پُرآب ہے اور ظالمین پر لعنت و نفرین کر رہی ہے۔ آج شہادت حسین مظلوم نے نہ صرف خاندان

رسالت کی شجاعت و شرافت، بزرگی و انسانی اخلاقی تعلیم کا سبق دنیا کو دیا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بتلا دیا کہ یہ کمینہ نسل حیوانی خلقت جو تھا بصورت انسانی میں یکجا ہو کر خاندان رسالت کی تباہی کا باعث ہوئی وہ در اصل فرعون و نمرود و ہامان سے کہیں بڑھ کر دولت یزید کے پجاری تھے مگر افسوس کہ ان حالات کے معلوم ہونے پر بھی ضلالت و گمراہی کی سیاہی قلوب سے دفع نہیں ہوتی اور عجیب و غریب تاویلوں سے کام لیا جاتا ہے۔

بعض یتیم العقل زمین کربلا کے خونی منظر کو حضرت سید الشہداء روحی لہ الفداء کی کمزوری سے تعبیر کرتے ہیں مگر حسینؑ جیسے شجاع فرزند رسول کے لئے جس کا ہر فعل سیرت رسول تھا اور جو نقش رسول پر چلنا اپنا فرض سمجھے ہوئے تھا اس کے لئے یہ لفظیں کب صحیح ہو سکتی ہیں جس نے تمام دنیا کو یہ کہہ سنایا۔

انا الحسین بن علی الیت ان لا انثنی احمی عیا لات ابی۔ امضی علی دین النبی (میں علیؑ کا فرزند ہوں میں نے حلف کیا ہے کہ جنگ سے منہ نہ موڑوں گا اپنے باپ کے عیال کی ضمانت کروں گا اور دین نبیؐ پر چلتا رہوں گا) یا یہ ارشاد ہوتا ہے۔

وان تکن الابدان للموت انشات۔ فقتل امرء بالسیف فی اللہ افضل (اگر بدن انسان کا موت کے واسطے پیدا ہوتا ہے تو راہ خدا میں تو اسے قتل ہو جانا سب سے بہتر ہے) یا غیرت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

الموت خیر من رکوب العار والعار اولی من دخول النار ننگ و عار اختیار کرنے سے موت بہتر ہے اور جب آتش جہنم کا مقابلہ ہو تو عار لازم ہے جاہل فرزند معترضین فرزند رسول کی بزرگی اور شجاعت کو شامیوں کی اسلام کش پالیسی سے دیکھنا چاہتے ہیں یہی سبب ہے کہ وہ آج تک تعلیم اسلام سے کوسوں دور ہے تعلیم اسلام یہ ہرگز نہیں کہ مظلوم پر ظلم کرو مسافروں کو ستاؤ مہمان بلا کر دغا دو اور اسے ہر طرح سے مجبور کر کے بچوں عورتوں تک سے انتقام لو خیموں میں آگ لگاؤ سروں سے مقنع و چادر تک اتار لو اور انھیں مقید کر کے کربلا سے شام تک پھراؤ اور پھر رسول کا کلمہ پڑھتے ہو مت رسول کی امت میں اپنے تئیں کہو یا شفاعت کی امید رکھو۔

اترجو امۃ قتلت حسینا شفاعۃ جدہ یوم الحساب (کیا اُمت حسینؑ کو قتل کر کے بروز قیامت اُن کے جد کی شفاعت کی اُمید وار ہو سکتی ہے ہرگز نہیں) وہ مسلمان جو یزید کو خلیفہ رسول یا مسلمان جانتے ہیں وہ ابد الآباد تک ان مظالم کی تاویل نہیں کر سکتے اور یزید کی جماعت قیامت تک دنیا میں قابل عزت سمجھی جا سکتی ہے۔ خاندان رسالت سے یزید کی عداوت و دشمنی ذاتی طور پر نہ تھی بلکہ یہ سلسلہ خاندانی چلا آتا تھا کیونکہ اگر ابو سفیان نے حضرت ختمی مرتبت سے جنگ کی تو اُس کے سپوت معاویہ نے جناب امیر المومنین سے جنگ کی اور یہاں تک دشمنی برتی کہ چالیس سال تک منبروں پر لعن کیا جاتا تھا اور عام مسلمانوں کا پانچواں خلیفہ اسے ٹھنڈے دلوں سے سنتا۔ شعرا سے ہجو کہلائی جاتی اور انعام و اکرام زر و جواہر کی تھیلیاں کھول دی جاتیں چنانچہ یہ سلسلہ یوں ہی قائم رہا اور یزید پلید نے خاتمہ پنجتن کر کے اپنا نام زیادہ بلند کیا۔ اس مقام پر شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

داستان پسر ہند مگر نشنیدی ۔ کہ از وہ و سہ تن او بہ پیمبر چہ رسید
پدر او در دندان پیمبر بشکست ۔ مادر او جگر عم پیمبر بمکید
او بنا حق حق داماد پیمبر بگرفت ۔ پسر او سر فرزند پیمبر ببرید

الغرض یہ سلسلہ اولاد در اولاد پھیلتا ہوا اب تو سواد اعظم کی صورت اختیار کر چلا اور دنیا میں خاندان رسالت کی عزت و توقیر کرنے والے اور انھیں معصوم جاننے والے بہت کم دکھائی دینے لگے اور غریب اسلام کے ساتھ کھُلے کھُلے وہ کیا جانے لگا جو دائرہ انسانیت سے خارج سمجھا جا سکتا ہے۔

یوں تو دشمنان اسلام کی فہرست طویل ہے مگر تیرہ سو برس کے بعد ایک دوسرا وجود ابن سعود کا ایسا ہوا کہ جس نے بتا دیا کہ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ یعنی اگر یزیدی گروہ نے بغض دیرینہ کو پامالی نعش و آتش زدگی خیام تک پہونچایا تھا تو پسر نا مسعود نے گوشہ مرقد اُکھیڑے اور خفتگان راحت ذریات رسولؐ کی ہڈیاں بکھیریں۔ آہ اے پیروان رسول مسلمانان عالم کیا بضعۃ الرسول کا مزار اسی قابل تھا کہ نجدیوں کے بیلچے اسے خاک کا تودہ بنا دیں اور مزبلہ قرار دیں کیا اسلام کی یہی تعلیم تھی اور مسلمان اسی کے متمنی تھے۔ آج دنیا میں یہ غلغلہ پھیلا ہوا ہے مگر مدعیان اسلام صم بکم

میں خاموش دکھائی دیتے ہیں اور آریہ و عیسائی کے مقابلے میں آستینیں چڑھاتے ہیں۔ آخر یہ کیوں۔ شدھی پر غصہ کس بات کا۔ کیا کسی ہندو نے اس درجہ بے حرمتی اسلام کی کی ہے کیا عیسائیوں نے تمھارے مقدس مقامات کو برباد کیا ہے۔ ذریت رسول کی قبریں مسمار کی ہیں نہیں ہرگز نہیں مگر آج عیسائیوں کے وجود پر غصہ ہے وہ عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے خارج کرنے کے لئے حدیث نبوی اخرجو الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب کو پڑھ پڑھکر سنا رہے ہیں اور ظالم ابن سعود کے حرکات سے دل ملول نہیں ہوتا بلکہ اسے خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

مسلمانو! تم نے ابتدا سے اسلام کی بیخکنی کی اور آج تک تمھارے دل میں اسلام کی محبت نہ آئی اسلام کو جو کچھ صدمہ پہونچا وہ انھیں ہاتھوں سے جنھیں تم اسلامی علمبردار کہتے ہو مگر وہ اصل اسلام کا علم ہمیشہ کے لئے زمین کربلا پر ٹھنڈا ہوگیا اور پھر دوبارہ اُسی وقت بلند ہوگا جبکہ مالک جزیرہ خضرا اپنے چہرے سے نقاب اُٹھا دے۔ عجل اللہ فرجہ وسہل اللہ مخرجہ

لہذا فریاد الحق ہے کہ اسے یادگار خاندان رسالت اسلام تباہی میں ہے منافقین اور ظالموں کا نرغہ ہر طرف ہے آفتاب اسلام غبار آلود ہو رہا ہے یزیدی اور سعودی گروہ نے ذریت رسول کی ہڈیاں بکھیر دیں مدینہ وہ مدینہ جہاں سرمایۂ امامت کا چمن لہلہارہا تھا جہاں کی خاک پاک مسلمانوں کی آنکھوں کا سرمہ تھی۔ جہاں بضعۃ الرسول کی خوابگاہ تھی حسنین کا گہوارہ تھا۔ نزول وحی کی جگہ تھی ملائکہ کا مسکن تھا۔ خدائے پاک کی عبادت سے گلی کوچے آباد تھے تہلیل و تقدیس کی آوازیں گونج رہی تھیں، حی علی خیر العمل کی پکار تھی، اصحاب کا جائے قیام تھا۔ وہ آج سعودی فوج کی چاندماری ہے۔ پتھروں کا ڈھیر ہے بربادی کے میلے ہیں اور حقیقی مسلمانوں کے لئے مصائب کی جگہ ہے۔ جہاں زیارت رسول و اصحاب رسول کے لئے دُرے اور تازیانوں سے روکا جاتا ہے۔ بس اے ناخدائے کشتیٔ اُمت تو جلد شمشیر انتقام بلند کر اور ظالمین کو اسفل السافلین میں پہونچا کر پھر اُسی علم حسینی کو بلند کر جو عباس ابن علی کے ہاتھوں بروز عاشورہ زمین کربلا پر بلند ہوا تھا۔

شہید کربلا کی مبارک زندگی پر جس پہلو سے روشنی ڈالی جائے وہ کامل نظر آتی ہے حسین مجموعۂ کمال تھے یا یوں سمجھ لیجئے کہ مجسمہ کمال تھے اُن کی سوانح حیات پر کسی زاویہ سے نگاہ ڈالئے آپ کو وہ دنیا کے عظیم ترین انسان معلوم ہوں گے، حسینؑ کے تدبر کو دیکھئے تو آپ کو ایک مُدبر کامل کی شکل نظر آئے گی، حسینؑ کو ایک مفکر کی حیثیت سے جانچئے تو ایک عظیم ترین مفکر کی تصویر پیش نظر ہو جائے گی۔ حسینؑ کو ایک عبادتگزار انسان کی حیثیت سے ملاحظہ فرمایئے تو تلواروں میں سجدے کرتے نظر آئیں گے۔ حسینؑ کو ایک سپاہی کے روپ میں دیکھئے

تو ان کی تلوار سے کوفہ والے پناہ مانگتے دکھائی دیں گے۔ غرضکہ کسی نقطۂ نظر سے بھی کیوں نہ امام مظلوم کی زندگی کا تجزیہ کیجئے۔ ان کی نظیر تاریخ میں آپ کو نہ مل سکے گی۔

ذیل میں ہم امام کو ایک جنرل کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں

آج ساری دنیا ایک ہولناک جنگ میں مبتلا ہے اور لڑائی کے واقعات آپ روزانہ سنا کرتے ہیں اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ متحارب طاقتیں حسب ذیل امور پر جنگ کی فتح کے لئے خاص طور پر زور دیتی ہیں۔

(۱) مقاصد جنگ کا اظہار تاکہ زیادہ سے زیادہ حمایت

حاصل کی جا سکے۔

(۲) پروپیگنڈہ۔ تاکہ اول تو اپنے ساتھیوں میں جوش پیدا ہو سکے اور دوسرے یہ کہ دشمن کو یہ یقین دلایا جائے کہ وہ حق پر نہیں ہے تاکہ جنگ کے متعلق اس کے سپاہیوں اور حامیوں کا جوش ختم ہو جائے۔

(۳) دشمن کے خاص مراکز پر جہاں تک ہو قبضہ کر لیا جائے۔

(۴) اپنے عقبی مورچوں کو اتنا مضبوط رکھا جائے کہ دشمن ان کی جانب سے حملہ نہ کر سکے

(۵) ایسے مقامات پر جنگ کی جائے جہاں امداد آسانی سے مل سکے۔

(۶) اپنے سپاہیوں میں ایسا ولولہ پیدا کر دیا جائے کہ وہ آخر تک جنگ کے میدان سے قدم نہ ہٹائیں اور نہ بدون فتح میدان سے پلٹیں۔

اب آپ امام حسین علیہ السلام کی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔

جہاں تک آپ کے مقاصد جنگ کا سوال ہے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ آپ "اسلام کی خاطر" لڑ رہے تھے، آپ کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ اسلام یزید اسلامی طریقہ حیات کا دشمن تھا اور آپ اس کے سب سے بڑے علمبردار۔

اس عظیم الشان مقصد کا آپ ساری زندگی پروپیگنڈہ کرتے رہے اور کربلا کے میدان میں آپ نے ایک سچے مسلمان کی زندگی کا جو عملی نقشہ پیش کیا اس کی تو نظیر تاریخ میں ملنا محال ہے۔ آپ کا مقصد جنگ کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا پوری اسلامی دنیا اس سے واقف تھی اور آپ کی قربانی کے بعد یزید کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں وہ اسی کا ایک ادنیٰ نتیجہ تھیں۔

پروپیگنڈہ بھی آپ نے بے نظیر کیا۔ آپ مدینہ میں رہتے تھے جو اسلامی دنیا کا مرکز تھا، دنیا کے ہر گوشہ سے مسلمان ہر سال مدینہ آتے تھے جن میں آپ اپنے خیالات اور اسلامی تحریک کا برسوں تک پروپیگنڈہ کرتے رہے اور پھر مدینہ سے چلتے وقت بھی وہاں ایسے افراد چھوڑ آئے جو آپ کی روانگی کے بعد آپ کی تحریک کی زبردست اشاعت کرتے رہے۔ مکہ چھوڑنے کے لئے آپ نے جو وقت مناسب تصور کیا وہ بھی پروپیگنڈہ کے نقطہ نظر سے بہترین تھا، اسلامی دنیا کے ہر ہر گوشہ سے ہزارہا فرزندان توحید فریضۂ حج کے لئے جمع ہو چکے تھے۔ مگر عین اس وقت جب حج کو محض دو روز باقی رہ گئے تھے فرزند رسول نے مکہ سے رخت سفر باندھ لیا اور اس طرح مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ امام ایک خاص مقصد کے لئے حج سے بہت قبل مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں اور وہ مقصد احیائے اسلام ہے!

یہ ایسی چیز نہ تھی جس کا چرچا پوری اسلامی دنیا میں نہ ہوتا اور حاجی اپنے اپنے وطنوں میں جا کر جس کا تذکرہ نہ کرتے۔ امام نے محض حاجیوں ہی کو نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا کو ایک سوچ میں ڈال دیا تھا میدان کربلا میں آپ نے بار بار ایسے خطبے پڑھے جس میں اپنی صداقت کے ثبوت پیش کر کے دشمن کے دل میں اپنی عظمت اور اپنی بزرگی کا سکہ جما دیا، آپ کے خطبوں سے جہاں آپ کے ساتھیوں میں حق پسندی کا نہ مٹنے والا جذبہ پیدا ہو گیا وہیں دشمنوں میں بھی یہ یقین پیدا ہو گیا کہ وہ حق پر نہیں ہیں اور محض ایک "شاہی ضد" کو پورا کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں۔

دشمنوں کے دلوں کو ان کے مقاصد جنگ کے متعلق امام نے محض مشکوک ہی نہیں کیا بلکہ ان کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ آپ حق پر ہیں اور یزید نیز اس کے ہمنوا گمراہی کے شکار ہیں اس نقطۂ نگاہ سے امام نے یہ ایک بڑی فتح حاصل کر لی۔

آج متحارب طاقتیں، ریڈیو، پمفلٹ، نہ معلوم کن کن ذرائع سے اپنے دشمن سپاہیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ان کے مقاصد جنگ ظلم پر مبنی ہیں اور جو حکومتیں ان کو لڑا رہی ہیں وہ حق و انصاف کے خلاف جارحانہ قدم اٹھا رہی ہیں اس پروپیگنڈہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن سپاہیوں کا جوش ختم ہو جائے، ان کا ولولہ دب جائے اور اپنے کو ناحق پر سمجھنے کی وجہ سے ان کے دل کھوکھلے ہو جائیں۔ امام نے اپنے چند ہی خطابات میں یہ مقصد حل کر لیا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ دشمن سپاہی، جو عرب کے بہادروں پر مشتمل تھے! حسینی جاں نثاروں کے سامنے اس طرح بھاگ نکلتے تھے جس طرح شیروں کے سامنے سے ہرن!

وقت عصر جب امام نے تلوار کھینچی تھی اس وقت مخالف

لشکر کی صفیں کی صفیں جاگ کھڑی ہوئی تھیں اور اس کی وجہ بھی شاید یہی تھی کہ وہ خود کو باطل کی راہ پہ دیکھتے ہوئے امام سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے!

دمشق کو چھوڑ کے اسلامی دنیا میں تین شہر بڑی اہمیت رکھتے تھے مکّہ، مدینہ اور کوفہ یہ شہر خاص مراکز تھے جن پر قبضہ کر لینا فتح کے لئے ضروری تھا۔ امام نے مکہ اور مدینہ میں عبداللہ بن جعفر اور محمد بن حنفیہ جیسے بہادر چھوڑ دیئے اور کوفہ میں مسلم بن عقیل کو روانہ کر دیا اور اس طرح پہلے سے ہی دشمن کے خاص مراکز پر کنٹرول حاصل کرنے کا انتظام کر لیا۔ چند منٹ کے لئے سوچئے کہ اگر حسین علیہ السلام کو ظاہری فتح ہو جاتی تو کیا ان شہروں پر کنٹرول ہونے کی وجہ سے وہ چند ہی روز میں صرف دمشق فتح کرنے کے بعد اسلامی دنیا کے بادشاہ نہ بن جاتے؟

حسین علیہ السلام کے اس حربی تدبر کی داد کوئی تجربہ کار جنرل ہی دے سکتا ہے!۔

میدان جنگ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے موقع پر قائم کیا جائے جہاں کمک آسانی سے پہونچ سکتی ہو اور رسل و رسائل میں ایسی دشواریاں پیدا نہ ہوں جن سے فوج کو شکست اُٹھانا پڑے اب اس وقت کی اسلامی دنیا کا نقشہ دیکھئے اور امام حسین علیہ السلام کے حربی تدبر کی داد دیجئے۔ کربلا ایک ایسا مقام جہاں اگر حسین علیہ السلام واقعی لڑنے کی ٹھان لیتے (اس لئے کہ میرے خیال میں تو آپ لڑے نہیں بلکہ آپ نے دراصل اپنی قربانی پیش کی) تو ایران، کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ اور یمن کی امداد بہ آسانی آ سکتی تھی اور یزید اس امداد کو نہیں روک سکتا تھا اس لئے کہ وہ صرف مصر سے آنے والی راہوں پر قابض تھا اور حسین علیہ السلام کی پشت کی تمام راہیں آپ کے لئے کھلی ہوئی تھیں جن سے اگر آپ واقعی چاہتے تو زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کر سکتے تھے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اگر آپ عراق پر قبضہ کر لیتے تو ایران، یمن اور حجاز سب دمشق سے جدا ہو جاتے اور یزید محض ایک ہی لڑائی میں ۳/۴ اسلامی دنیا اپنے ہاتھوں سے کھو دیتا!

تیسری اہم چیز یہ ہے کہ مکہ کے بعد کوفہ سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا اور مشرق نیز شمال کی طرف جانے والے تمام قافلے اسی راستہ سے ہو کر گزرتے تھے، اگر امام کوفہ پر قبضہ کر لیتے تو وہ اپنے مخالفین کی تجارت بند کر سکتے تھے اور اس طرح ان پر مالی پابندیاں لگا کر ان کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتے تھے۔

یہیں اس چیز کی داد دیجئے کہ امام نے ان تمام امکانات کے بعد بھی فتح حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور باوجود اس امر کے تمام اسباب آپ کی فتح کے لئے میسر تھے پھر بھی آپ نے محض قتل ہو جانے کو ترجیح دی اور اس طرح تلوار سے نہیں بلکہ صداقت اور مظلومیت سے اسلامی دنیا کو اس پر مجبور کیا کہ وہ آپ کی تحریک کے سامنے سر جھکا دے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تلوار کی فتح چند روزہ ہوتی ہے اور مظلومیت کی فتح دائمی۔!

امام نے فتح کے اسباب فراہم کر کے بھی شکست کھائی مگر اس شکست میں فتح کے وہ جوہر پوشیدہ تھے جنھوں نے ظلم و جبر کے ایوانوں کو چند ہی روز میں مسمار کر دیا!

روز عاشور امام نے اپنی حربی مہارت کے بعض بہترین ثبوت پیش کئے جن کو تاریخ آج بھی اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ آپ کے مقابلہ میں کم سے کم ۲۵ ہزار عرب سپاہی موجود تھے اور آپ کے ساتھیوں کی تعداد محض بہتر تھی اور ان میں بھی بچوں اور بوڑھوں کی کافی تعداد موجود تھی اتنی مختصر سی جماعت کے باوجود آپ نے دن بھر اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور یہی آپ کی بہترین جنرل شپ کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔

دریائے فرات کے کنارے سے خیمہ ہٹا لینے کے بعد آپ نے جس مقام پر خیمے نصب کئے وہ کربلا میں عسکری نقطۂ نظر سے بہترین تھا اس لئے کہ تین جانب اونچے اونچے ٹیلے تھے اور اس طرح دشمن صرف سامنے ہی سے آپ کی فوج پر حملہ کر سکتا تھا ان ٹیلوں کے درمیان جو جگہ خالی تھی وہاں آپ نے خیام نصب کرا دیئے تھے اور اس طرح بالکل قلعہ بند ہو گئے تھے، بعض تاریخوں میں یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ دشمن نے عقب سے حملہ کرنا چاہا تو آپ نے ہر خیمہ میں ایک مجاہد کو کھڑا کر دیا چونکہ خیمہ میں دشمن ایک ہی ایک کر کے داخل ہو سکتے تھے اس لئے ان مجاہدین نے دشمن کے بہت سے سپاہی ہلاک کر دیئے آخر مجبور ہو کر دشمنوں نے

خیموں میں آگ لگانے کا ارادہ کیا۔ امام نے اس وقت اپنے ساتھیوں کو ہدایت کردی کہ وہ دشمن کو ان خیام میں آگ لگانے سے منع کریں۔ نتیجہ جو ہوا وہ عسکری حیثیت سے بڑا شاندار تھا، دشمن نے ان خیام میں آگ لگادی اور جب شعلے اچھی طرح ابھر گئے تو اسے احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی اس لئے کہ پشت کی جانب سے حملہ آور ہونے کے بعد جو راستے تھے ان کو آگ نے بند کر دیا تھا!

چونکہ خیموں میں عورتیں اور بچے تھے اور ان کا تحفظ ضروری تھا اس لئے امام نے خیام کے گرد خندق کھد وادی تھی اور اس خندق میں آگ روشن کرادی تھی تاکہ دشمن اہل حرم پر حملہ آور نہ ہوسکیں شاید ”حصار آتشین“ کی حربی دنیا میں یہ اولین مثال ہوگی

امام کی فوج کے ایک حصہ پر جو محض چالیس افراد پر مشتمل تھا، دشمن کے تیس ہزار سواروں نے ایک مرتبہ حملہ کردیا۔ ظاہر ہے کہ تیس ہزار کی یلغار کے مقابلہ میں چالیس فرد کیا حیثیت رکھتے تھے مگر یہ چالیس انسان حسینؑ جیسے تجربہ کار جنرل کے لشکر کے سپاہی تھے انھوں نے اپنے زانو زمین پر ٹیک دیئے اور اپنے نیزے سامنے کی طرف اٹھا دیئے اور بڑھتے ہوئے لشکروں کو چھیدنا شروع کردیا۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ اس حملہ میں بہت سے مجاہدین مارے گئے مگر انھوں نے بھی دشمن کو ایسا سبق دیا کہ دوبارہ اسے اجتماعی یلغار کی ہمت نہ پڑ سکی۔

نیزوں سے اس طرح دشمن کا منھ توڑ دینے کی مثال ایک تو ہم کو سکندر اور پورس کی جنگ میں ملتی ہے جس میں یونانی سپاہیوں نے اپنے برچھوں سے پورس کے ہاتھیوں کا منھ توڑ دیا تھا اور دوسری مثال کربلا کے میدان میں ملتی ہے جہاں حسین کے چالیس جانبازوں نے تیس ہزار کے لشکر کے دانت کھٹے کر دیئے۔

امام حسین علیہ السلام کی سب سے خوبصورت اور سب سے پر اثر حربی تجویز علی اصغر کا میدان میں لیجانا تھا۔ اس ننھے سے شہید کے سوکھے لبوں نے لشکر مخالف کے سپاہیوں کو رونے تک پر مجبور کردیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو سپاہی اپنے مخالف کے سامنے رو دیں وہ ان کے مقابلے میں تلوار اُٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتے اس لئے کہ ان کے دل میں وہ طاقت باقی نہیں رہ سکتی جو اپنی صداقت پر اعتماد کی وجہ سے انسان میں ہوتی ہے۔

خود امام علیہ السلام نے جو جنگ کی ہے اُس کے متعلق ”جمیس کا کرن“ جیسے عیسائی مورخ کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ رستم اور سکندر کا نام بہادری کے لئے لینا بیکار ہے اس لئے کہ یہ دنیا حسینؑ جیسے بہادر بھی پیدا کرچکی ہے!

آج دُنیا بھر کے حربی ماہرین یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس وقت جب اس کی فوجیں میدان میں لڑ رہی ہوں ملک کے عوام کا نظم اچھا رہے اور ان میں بیدلی پیدا نہ ہونے پائے اس مقصد کے لئے زیادہ وحشت انگیز خبریں ایک دم سے نہیں سنائی جاتیں تاکہ کہیں ان کے سننے سے عوام میں گھبراہٹ اور انتشار نہ پھیل جائے۔ امام بھی یہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھ عورتیں اور بچے ہیں اس لئے آپ اول تو حضرت عباسؑ علمبردار کی لاش خیمہ میں نہیں لائے اس لئے کہ عورتوں اور بچوں پر حضرت عباس کی شہادت کا اثر اچانک طریقہ پر بہت ہی برا پڑتا اور ان میں عام مایوسی اور خستگی پیدا ہوجاتی دوسرے یہ کہ خود آپ نے میدان میں شہادت گوارا نہ کی اس لئے کہ مبادا عورتیں آپ کی حالت دیکھ کر بدحواس ہو جائیں۔ اور اسی لئے آپ نے خود اپنے قاتل کو یہ حکم دیا کہ وہ آپ کو ایک نشیب میں لیجا کر قتل کرے۔ اس چیز کا واحد مقصد یہ تھا کہ عورتیں بدحواس نہ ہوجائیں اور ان میں ایک مرتبہ ایسی افتادگی اور شکست خوردہ ذہنیت نہ پیدا ہوجائے جس سے بعد میں وہ اس مشن کو پورا نہ کرسکیں جس کی غرض سے ان کو کربلا لایا گیا تھا۔

عورتوں کے کربلا کے میدان میں لائے جانے پر لوگ اعتراض کرتے ہیں حالانکہ ان کو یہ نہیں معلوم کہ عورتیں جنگی مقاصد کے لئے بھی کتنی ضروری ہوتی ہیں۔ امام نے اپنی عورتوں سے حسب ذیل کام لئے جو سب کے سب آپ کی جنگ ہی سے متعلق تھے۔

(۱) شہادت کے بعد عورتوں نے آپ کے مشن کا خوب پروپگنڈہ کیا۔ اگر عورتوں کو نہ لایا جاتا تو یہ مقصد کبھی پورا نہ ہوتا اس لئے کہ مردوں کا قتل کر دیا جانا یقینی تھا۔

(۲) عورتوں کی آمد نے یہ ظاہر کردیا کہ آپ امن پسند تھے اور اس چیز کا اثر فوج مخالف پر پڑنا ضروری تھا اس کے علاوہ دنیا پر آپ نے یہ ظاہر کیا کہ آپ کے مخالف لڑنے کے لئے آئے تھے

اور آپ امن پرور تھے۔

(۳) عورتیں مجاہدین کی ہمت بڑھانے کے لئے کام آئیں انھوں نے اپنے شوہروں اور فرزندوں کے جوش کو باقی رکھا۔

(۴) بچوں کی پرداخت اور حالت زخمداری میں مجاہدین کی خدمت بھی عورتوں کا کام تھا ان تمام مقاصد کو عورتوں نے بحسن و خوبی پورا کیا امام کی حربی مہارت پر یہ ایک مجمل تبصرہ ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ ایک اعلیٰ پایہ کے جنرل تھے!۔

محرم الحرام اس کی نوعیت اور اہمیت

ایک انگریز ڈپٹی کلکٹر کے پاکیزہ تاثرات

مترجمہ جناب سید مجتبیٰ حسن صاحب (مرحوم) جونپوری

کیپٹن ال۔ ایچ۔ نبلٹ۔ جے۔ پی ڈپٹی کلکٹر ممالک متحدہ نے ایک کتاب سنہ ۳ ۶ میں لکھی تھی اُس میں بعض شاہان اودھ کے حالات ہندوستان کے خاص خاص مذہبی تہواروں کا ذکر اور بعض دوسری حکایتیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک مضمون محرم و تعزیہ داری پر ہے جس کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے لائق مصنف نے دوران مضمون میں بعض امور کے متعلق اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا ہے اس وجہ سے اور بھی قابل قدر ہے کہ ایک غیر جانبدار اور غیر مسلم کے قلم سے ہے۔

سید مجتبیٰ حسن

عشرہ محرم وہ زمانہ ہے جس میں تمام دنیائے اسلام اپنے رسول کے نواسے حسینؑ کا سوگ مناتی ہے اور تعزیے جو شبیہہ ہیں روضۂ اقدس کے رکھے اور دفن کئے جاتے ہیں اُس زمانہ میں نوحہ و ماتم کے ساتھ طبل بجایا جاتا ہے اور مختلف عزاخانوں میں عزا منعقد کیجاتی ہیں جس میں امام حسینؑ اور ان کے نانا محمد مصطفےٰؐ کی مدح و ثنا کے ساتھ ان بزرگواروں کے مصائب کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے اور حدیث خوانی ہوتی ہے آہ آہ و واہ واہ کی آواز سے تمام امام باڑہ گونج جاتا ہے۔ مصائب سن کر لوگ روتے ہیں اور سینہ زنی کرتے ہیں۔ کربلا کے واقعات جب اُن کو سُنائے جاتے ہیں تو ان کے سینے جذبات سے ملو ہو جاتے ہیں خصوصاً جب اس کا ذکر آتا ہے کہ تحت دھوپ اور پیاس کے باعث آپ کی کیا حالت ہو گئی تھی بعض سامعین بہ آواز بلند گریہ وزاری کرتے ہیں اور بعض چپکے چپکے آنسو بہاتے ہیں۔ مرثیہ یا حدیث خوانی کے ختم ہونے پر لوگ دعا کے لئے ہاتھ بلند کرتے ہیں۔ بعد ختم مجلس حسنؑ و حسینؑ کے نعروں کے ساتھ ماتم ہوتا ہے زنجیروں کا ماتم بھی ایک یادگار چیز ہے سلاحدار زنجیروں سے تمام جسم لہولہان ہو جاتا ہے اور بعضوں کو تو غش تک آجاتا ہے اس کے بعد تلواروں کا ماتم ہوتا ہے اور چہرہ تمام خون آلود ہو جاتا ہے' اس طرح سے دُنیائے اسلام اُس واقعہ کی یادگار مناتی ہے جو نہایت ہی دردناک تھا اور تاریخ میں بے نظیر، خصوصاً اس وجہ سے کہ جام شہادت پی کر اپنے اسلام کو صفحۂ ہستی سے محو ہونے سے بچا لیا۔ محرم کی اہمیت سمجھنے کے لئے واقعات ماسبق پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ صدیاں گذر گئیں کہ سردار کفار کے پوتے یزید پلید نے امام حسینؑ سے طلب بیعت کی۔ آپ نے انکار کیا اور فرمایا کہ میں سوائے خدا کے اور کسی کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔ اس دوران میں یزید کی زیادتیوں سے عاجز آکر اہل کوفہ نے امام حسینؑ کو بلوا بھیجا تھا کہ وہاں آکر اس کے مظالم سے گلو خلاصی کرائیں آپ نے منظور فرمایا اور مع انصار و رفقا روانہ کوفہ ہوئے جب آپ کربلا کے میدان میں پہنچے تو ایک فوج کثیر نے آپ کو بڑھنے سے روکا اس فوج کا سردار شمر تھا۔ اور فوج میں بتیس ۳۲ ہزار آدمی تھے یکم سے ہفتم تک آپ برابر افواج اعدا کو سمجھاتے رہے کہ ظلم و ستم اور ناحق کے کشت و خون سے باز آئیں لیکن انھوں نے

ایک نہ سنی، نہ منت، سماجت سے کوئی فائدہ نکلا اور نہ دلائل کا کچھ اثر ہوا جب آپ ہر طرح سے اتمام حجت فرما چکے اور یقین کامل ہوگیا کہ لڑائی ہونا لابدی ہے اور ایک فوج کثیر کے مقابلہ میں آپ کو فتح نہیں ہوسکتی اور آپ معہ انصار واعزہ کے شہید ہو جائیں گے خصوصًا اس وجہ سے کہ یزید کا حکم جاری ہو چکا تھا کہ سر حسینؑ اس کے سامنے پیش کیا جائے آپ نے ۲۴ گھنٹے کی مہلت مانگی جو کہ مل گئی شب عاشور اپنے تمام انصار ورفقا کو جمع کیا اور نہایت ہی پر درد لہجہ میں ایک طولانی تقریر فرمائی جس میں بعد پند ونصائح آپ نے فرمایا کہ کل سخت سے سخت مصیبت کا سامنا ہے میں تم سب کو متنبہ کرتا ہوں بعد ختم نماز وتقریر اپنے وہ کام کیا جس کی مثال صفحہ عالم میں ملنا ناممکن ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو انسانی کمزوریوں کا کس قدر احساس تھا اور کس درجہ آپ سخی اور رفیق القلب تھے اور جذبہ ایثار کس حد تک آپ میں موجود تھا آپ نے حکم فرمایا خیموں کے تمام چراغ گل کر دیئے جائیں اور جس کا جہاں دل چاہے اس اندھیرے میں چلا جائے میں نے اپنی بیعت تم سب سے اٹھالی ہے۔ دوسرے دن جب سفیدہ صبح آسمان پر ہویدا ہوا تو بہتر جان نثار جام شہادت پینے پر کمربستہ نظر آئے آپ کی قلیل فوج کا ذکر ہی کیا ایک ایک کرکے آپ کے تمام انصار میدان میں کام آئے تمازت آفتاب بڑھ رہی تھی پیاس کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا لیکن خیموں میں پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہ تھا آپ کے شیرخوار بچے نے سوکھی زبان دکھا کر طلب آب کیا اس کو ہاتھوں پر لئے ہوئے میدان جنگ میں آئے اشقیا سے پانی مانگا اس کے جواب میں ایک تیر دہن وحلق اصغر کو چھیدتا ہوا گزر گیا اور بچہ تڑپ کر امام کے ہاتھوں میں راہی ملک بقا ہوا۔ آپ قلب لشکر میں آئے بہت سے اشقیا کو فی النار کیا۔ سیکڑوں لاشے میدان میں پڑے ہوئے اور سیکڑوں زخمی ایڑیاں رگڑ رہے تھے خود امامؑ مظلومؑ زخموں سے چور چور تھے آخر کار رزغہ اعدا میں گھر گئے اور کثرت زخم کی وجہ سے جب نہیں سنبھلا گیا تو گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے آپ کی شہادت کے بعد آپ کے حرم قید کر لئے گئے خیموں میں آگ لگادی گئی۔ اور طرح طرح کی مصیبتیں اٹھانی پڑیں اس شہادت عظمیٰ کی یادگار محرم میں منائی جاتی ہے۔ اس میں کون سی تعجب کی بات ہے کہ پیروان امام مظلومؑ ایسے عدیم المثال واقعات اور ایسے حربی کے کارنامے سن کر آنسو بہاتے ہیں اور اُن کے سینہ وجگر غم سے فگار ہو جاتے ہیں۔ اُن میں ایک خاص قسم کا مذہبی جوش پیدا ہو جاتا ہے اور جذبۂ وفاداری وجان نثاری اور انتقام اُن کے رگوں میں بھر جاتے ہیں اور تعزیے دفن کرتے وقت اُن کی آنکھوں سے بے اختیار سیلاب اشک رواں ہونے لگتے ہیں جب طبل بجنے لگتا ہے تو کربلا کے میدان کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے خصوصًا اس خیال سے دل تڑپ اٹھتا ہے کہ امامؑ یکہ وتنہا بے یار ومددگار پر نرغۂ اعدا میں گھر گئے تھے پیروان حسینؑ مذہب کو زندگی کا ایک جزو تصور کرتے ہیں اس میں تعجب کی کون بات ہے اگر وہ ایسے دل ہلا دینے والے مصائب کا خیال کرکے اپنے بال نوچنے لگیں سینے پیٹنے لگیں اور صدائے حسنؑ حسینؑ ان کی زبانوں پر جاری ہو اس لئے کہ لوگ امام مظلومؑ کے کام نہ آسکے تو کیا اتنا بھی ممکن نہیں ہے کہ اس واقعہ کی یادگار میں روئیں پیٹیں اور نوحہ وماتم کریں محرم اسی کو کہتے ہیں۔

تعارف

حسینؑ کی شہادت اپنے اعلیٰ کیرکٹر اور دوررس نتائج کے لحاظ سے ایک ایسی عظیم الشان شہادت ہے کہ جس سے بنی نوع انسان کا ہر طبقہ متاثر ہوتا ہے کیپٹن ایچ نبلٹ جے پی ڈپٹی کلکٹر ممالک متحدہ کا یہ قابل قدر مضمون بھی ہمارے اس نظریہ کی حرف بحرف تائید کر رہا ہے اس مضمون کے ترجمہ پر ہم سید مجتبیٰ حسن صاحب کے ممنون ہیں کہ آپ نے ان پاکیزہ خیالات کو عوام تک پہنچانے کا مبارک فرض انجام دیا۔

(مدیر)

محرم ۱۳۵۹ھ

عاشور کی رات میں وفاداریوں کے چند سین

سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ

محرم کا نواں دن گزر چکا ہے، جلتے جھلستے آفتاب کو ڈوبے ہوئے آدھ گھنٹے کے قریب ہوگیا ہے، مگر صحرائے نینوا میں اب تک لو چل رہی ہے، اور تپتے ہوئے بالو کے سوا دور تک سبزے یا درخت کا نام نہیں۔ البتہ فرات نامی ندی کے کنارے کچھ بے برگ و بار اشجار دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں کے نیچے ساحل دریا پر میلوں تک ایک بہت بڑا لشکر فروکش ہے۔ اس وقت چاند کی دھندلی روشنی میں عام سپاہی دریا میں خود بھی نہا رہے ہیں اور اپنے جانوروں کو بھی نہلا اور سیراب کر رہے ہیں۔ ایک طرف جہاں قدرے سبزہ ہے ایک بڑا سا خیمہ نصب ہے، جس پر ایک سیاہ نشان لہرا رہا ہے۔ خیمے کے اندر کافوری شمعیں روشن ہیں۔ مختلف مسندوں پر، گاؤ لگائے، افسران فوج یزیدی متمکن ہیں! جام چل رہے ہیں اور مستی و سرخوشی کے قہقہوں میں کل کی لڑائی کا لائحہ عمل اور نقشہ جنگ تیار کیا جا رہا ہے۔

خیمے کے آس پاس باہر بیٹھے ہوئے سپاہی ہونے والی جنگ کے بعد ملنے والے اسباب غنیمت کا ذکر کر رہے ہیں۔ ہر طرف انعام اور خلعتوں کے چ ہیں۔ حاصل ہونے والے زر و جواہر کی امید سے کی آنکھیں بار بار چمک اٹھتی ہیں اور وہ رندی و مستی کے حیا سوز گیت گاتے جاتے ہیں اور اسلحہ . . . . . صاف اور تلواروں کو صیقل کرنے میں بڑے شوق سے منہمک ہو جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی وفور مسرت و انبساط میں، خوش فعلی کے طور پر، دو چار سو قدم آگے بڑھ کر ان خیموں پر تیر اندازی کی مشق بھی کر لیتے ہیں، جو سفر سے شکستہ دریچۂ فرات سے کچھ ہٹ کر ریت کے ڈھیر پر استادہ ہیں۔

ان پھٹے پرانے خیموں میں کچھ عصمت مآب عورتیں ہیں اور کچھ صغر سن بچے، مگر سب تشنہ لب، پریشان حال، چہرے خاک میں اٹے ہوئے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے اور ناقوں کی شدت سے حد درجہ مضمحل و ناتواں! گو ان کے پژمردہ پھول سے گالوں پر ان کے آنسوؤں نے خطوط ڈال دیئے ہیں، مگر ان کی پیشانیوں سے نور برس رہا ہے اور ان کے گرد آلود کپڑوں میں بھی وہ رعب و وقار ہے جو شہزادوں اور شہزادیوں کی خصوصیت ہے۔

ایسا نہیں کہ ان خوشزادیوں کے پاس بدلنے کو کپڑے نہ ہوں، مگر انھیں تن بدن کا ہوش ہی نہیں۔ ان کا آقا ان کا سردار مصیبتوں کا شکار بنا ہوا ہے۔ مہینوں ہوئے کہ دیس نکالا ملا۔ مدفن رسولؐ چھوٹا۔ بیت اللہ میں پناہ نہ ملی، کوفیوں نے بلایا، ادھر بڑھے، ابھی راستہ ہی میں تھے کہ حسینؑ کے ایلچی حضرت مسلم کی سنانی آئی۔ سوچ رہے تھے کہ کیا کریں جو حر ریاحی ایک ہزار سواروں سمیت آ پہونچا، زبردستی نینوا کے بن میں گھیر لایا۔ یہاں آتے ہی یقین ہو گیا کہ مولیٰ کی جان کی خیر نہیں۔ شامیوں کا ہجوم روز بروز بڑھنے لگا، عمر ابن سعد نے چڑھائی کی، شمر ذی الجوشن اپنے سوار لئے گیتی ہلاتا آ پہونچا، راہ چارہ مسدود ہو گئی۔ دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پانی بند کر دیا گیا اور قتل حسینؑ کی قسم کھالی گئی!

اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر ان بیویوں کے دلوں کی حالت کا اندازہ کرو، کس حد کی حسرت، کس بلا کی یاس ان پاک سینوں میں موجزن ہوگی مگر واہ ری وفا و محبت، واہ رے خلوص و عقیدت! بوڑھی ہو یا جوان، سہاگن ہو یا بیوہ، کسی کو اپنی مانگ اجڑنے اور کوکھ جلنے کی فکر نہ تھی۔ اگر کاوش تھی تو یہی کہ کسی طرح فاطمہؑ کا جایا نبی کا لاڈلا صحیح سلامت بچ جائے۔ بس ہر زبان پر یہی دعا تھی۔

"الٰہ العالمین، تو آمنا حسینؑ کو بچا لے۔ ان کی جان کی خیر کر! ارحم الراحمین تو ہمارے سروں کا سہاگ، ہمارے دلوں کی ٹھنڈک چھین لے اور ہمارے شوہروں اور ہمارے بچوں کو اس ذبح عظیم کا فدیہ قرار دیدے! قادر مطلق! زہراؑ کے جائے کو ہر آفت اور ہر بلا سے محفوظ رکھ!"

مردان خانے میں ایک شامیانے کے نیچے ایک چاند کے گرد ستارے جمع تھے۔ ابھی ابھی سب نے نماز مغرب سے فراغت پائی تھی۔ مومنین مصلوں پر بیٹھے ہی تھے کہ امامؑ ہاتھ میں تسبیح لیئے جریب کے سہارے اُٹھکر کھڑے ہو گئے۔ سب کی نظریں چہرۂ اقدس پر جم گئیں۔ خدائے قادر و توانا کی حمد اور محمدؐ عربی کی ثنا کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔

"دغاکیش مومنو! شامیوں کے بادل میرے خرمن ہستی پر بجلی گرانے گھر کے آئے ہیں تم اپنی جانیں تہلکے میں نہ ڈالو، تم سے ان کی کوئی لڑائی نہیں، یہ میرے اور صرف میرے خون کے پیاسے ہیں۔ اس لیئے میں تم سے اپنی بیعت اُٹھائے لیتا ہوں اور تم سے خواہش کرتا ہوں کہ تم میں سے ہر ایک میرے قافلے سے ایک ایک اونٹ لے لے اور میرے اعزا میں سے کسی ایک کا ہاتھ پکڑ لے اور اس خطرے سے خاموش نکل جائے!

عزیزو! اس امر میں شرم و حجاب سے کام نہ لو، میں چراغ گل کیئے دیتا ہوں جس کا جہاں جی چاہے چلا جائے، خیر و برکت ہر ایک کے ساتھ ہوگی اور میری دعائیں زاد راہ!"

اس وقت مسجد کا چراغ بُجھا دیا گیا، صفوں میں اس طرح کا اضطراب و ارتعاش تھا کہ تاریکی میں بھی محسوس ہوتا تھا۔ مگر جاتے ہوئے پاؤں کی چاپ کہیں بھی سنائی نہ دی جب تھوڑی دیر بعد شمع پھر روشن ہوئی تو پروانے اپنی جگہ ہی پر ملے۔ ہاں اتنا فرق ضرور تھا کہ کسی صحابی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ تو کسی عزیز کی چشم سرگیں پُرنم تھی کوئی اپنے ہونٹ دانتوں سے چبا رہا تھا، تو کوئی قبضے پر ہاتھ رکھے داہنے بائیں گھور گھور کے دیکھ رہا تھا۔

حسینؑ نے ان وفا کے مجسموں پر ایک محبت آمیز نظر ڈالی اور مسکرا کے پوچھا "رفیقان با اخلاص تم یہیں بیٹھے رہے کیا تم میں سے کوئی نہیں جائیگا؟ جاں نثارو! موت کا چہرہ بہت ہی خوفناک اور اہل و عیال کی حفاظت حد درجہ ضروری ہے!"

چند جوان، چند بوڑھے، چند بچے بیتاب ہو کر کھڑے ہو گئے۔

بوڑھے نے کہا "دو جہان کے سردار! اگر ہم ہزار مرتبہ مارے اور جلائے جائیں جب بھی آپ کی رفاقت نہیں چھوڑ سکتے!"

جوان نے عرض کی "فاطمہ کے لال! حق و صداقت کے لیئے مرنا ابدی زندگی ہے!"

بچے نے ننھے سے ہاتھ جوڑ کے کہا "محترم بزرگ! موت سے ڈر کیسا! وہ تو شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے!"

اور سارا مجمع یک زبان ہو کر بول اُٹھا "ہم دین حق کی حمایت اور نبیؐ کے نواسے کی رفاقت کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ موت و شہادت کا خوف اور شمشیر و نیزے کا ڈر ہمارے ہاتھوں سے آل عبا کا دامن نہیں چھڑا سکتا!"

عشاء کے بعد حسینؑ اصحاب کے جھرمٹ میں آل اطہار کے خیموں تک آئے سب کو رخصت کیا، چھوٹے بھائی کو محافظوں کا سردار مقرر کیا اور خود بہن یا بجائی زینبؑ کے پاس گئے۔ فاطمہؑ زہرا کی بیٹی بال بکھرائے چہرے پر خاک ملے خیمے میں منتظر حد درجہ بیچین بیٹھی تھیں۔ ماں کی بوڑھی نفہ نے نماز مغرب کا خطبہ اور اس کے بعد کی روداد کہہ سنائی تھی۔ بھائی کی سلامتی کی طرف سے مایوس ہو چکی تھیں، مگر زندگی رامید تو ہے، دل میں ایک مٹا سا خیال تھا شاید اب بھی بگڑی بات بن جائے۔ ماں جائے کو دیکھتے ہی بڑی حسرت سے پوچھتی ہیں۔

"بھیّا کیا یہ لال سی جان کسی طرح نہیں بچائی جا سکتی؟"

حسینؑ نے بہن کی تکلیف کو محسوس کیا، مگر جھوٹی امیدوں سے نبیؑ زادے ڈھارس نہیں دلاتے، اس لیے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔
بہن نے گھبرا کر پوچھا "پھر اصحاب کے کیا ارادے ہیں؟ کہیں دغا تو نہ دیئے گے؟ ایسا تو نہیں کہ شب کی تاریکیوں میں یہ وفا و اخلاص سے منھ موڑ کر آپ کو یکہ و تنہا چھوڑ کر، فرار کا راستہ اختیار کریں؟"
حسینؑ بہن کو جواب نہ دینے پائے تھے کہ اصحاب میں سے ایک نے خیمے کے قریب سے گزرتے ہوئے امام زادی کے یہ الفاظ سن لیے۔ بے اختیار دوڑ کر ساتھیوں کو آواز دی۔ "اے مسلم! اے حبیب! اے زہیر! جلدی ادھر آؤ! بھائی علیؑ کی بیٹی کو اب تک ہماری وفا میں شک ہے!"
سب لپکے ہوئے آئے، پرے باندھ کے خیمے کے سامنے کھڑے ہو گئے، تلواریں کھینچ لیں، میانیں توڑ کر پھینک دیں۔ حضرت فضہ کو آواز دی۔
"اے فضہ! شیر رب دلطحا کی شہزادی سے ہمارا اسلام کہو اور عرض کرو کہ جب تک کہ ہم غلاموں کی مٹھیوں میں تلواریں ہیں، اور جب تک ہماری رگوں میں خون ہے اس وقت تک روح ایمان حسینؑ کا کوئی بال بیکا نہیں ہو سکتا! آپ آرام سے سوئیں۔ ہم شب بھر آل محمدؐ کے خیموں کے گرد طلایہ پھریں گے، کہ اس سے بہتر کوئی ریاضت و عبادت نہیں!"
حیدرؑ کرار کی بیٹی اس اظہار وفا پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں! حسینؑ چشم پُر آب، بہن کے سر پہ ہاتھ رکھے دیر تک دلاسا دیا کیے!

شب کے بارہ بج چکے ہیں، دسویں کا چاند غروب ہونے کو ہے، فضائے عالم پر سکوت طاری ہے، البتہ یہ پردہ خاموشی کبھی کبھی بُری طرح چاک بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ کبھی دریا کے پاسبان فوج حسینیؑ کو پانی سے دور رکھنے کے لیے بھیانک طور پر چیخ اٹھتے ہیں اور کبھی آس پاس کے درندے، کل کے کشتوں کی امیدیں، سونے والوں کے قریب آ کے چنگھاڑتے ہیں، ان مہیب آوازوں سے ڈر کر فوجوں کے گھوڑے ہنہنانے لگتے ہیں اور حسینی خیمہ گاہ میں چھوٹے چھوٹے بچے سہم سہم کر رونے لگتے ہیں۔
یزیدی فوج کے افسر کرکھولے اطمینان سے غافل سو رہے ہیں۔ کوئی حکومت رے کے مل جانے کا خواب دیکھ رہا ہے، تو کوئی سلطنت عراق پا جانے پر وثوق کے مست پڑا ہے، کوئی رندی و مے آشامی کے خواب دیکھ رہا ہے تو کوئی معشوقہ ہائے نازنین دلپسند کے!
غرض ان کے بستر نرم، ان کی نیندیں میٹھی اور ان کے خواب اچھے ہیں!
لیکن حسینیؑ خیموں میں نیند حرام ہے، کمریں کسی ہوئی ہیں، شامیوں کے مکر و دغا کے دل میں وسوسے ہیں۔ خیمہ کے گرد، خندق کھودی گئی ہے، اس میں لکڑیاں روشن ہیں، اصحاب میں سے کوئی طلایہ گھوم رہا ہے، کوئی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہے، دو دو چار چار کی ٹولیاں بنائے لوگ بیٹھے ہیں کہیں محمدؐ و آل محمدؐ کی مدح و ثنا۔ . . . . ہو رہی ہے کہیں کرار غیر فرار کے سفر کے بیان ہو رہے ہیں اور کہیں مالک اشتر کی رفاقت و جانبازیاں یاد دلائی جا رہی ہیں ہر زبان پر یہی ہے "بھائیو کل کا دن حشر کا دن ہوگا! کھوٹے کھرے پہچان لیے جائیں گے، دیکھو دلوں میں نفس کا خیال نہ آئے، قدموں میں لغزش نہ ہونے پائے، وہ تلوار چلے کہ قیامت تک نام رہ جائے! دلیرو! یہ بھی دھیان رہے کہ جب تک ہم میں سے ایک بھی زندہ رہے، بنی ہاشم میں سے کوئی بوڑھا، جوان، یا بچہ میدان کا رُخ نہ کرنے پائے۔ کالے دانے کی طرح ہم پہلے آل محمدؐ پر سے نچھاور ہو لیں، پھر امامؑ کو اختیار ہے جسے جی چاہے رن کی اجازت دیدیں، مگر ہمارے جیتے جی اگر ابن سعد یا اس کا لشکر ان شہزادوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے تو ہم بخدا اپنی انگلیوں سے گھورنے والوں کے دیدے نکال کے خاک پر پھینک دیں گے!"
پھر حمد و ثنا کی آوازوں میں تلواروں کی جھنکاریں مل کر وہ آسمانی نغمہ پیدا کر دیتی تھیں جس کے سننے سے انسانیت زندہ ہوتی ہے اور مردہ روحوں میں پھر سے جان آ جاتی ہے!

ادھر زنان خانے میں عصمت مآب بیبیاں اپنے اپنے جگر پاروں کو سامنے بٹھائے استقامت و وفا، حق پرستی و حیا کی تعلیم دے رہی ہیں جس

خیمے میں، دیکھیے، جوان بوڑھے یا بچے یہی سمجھائے جا رہے ہیں کہ اسلام کی سلامتی حسینؑ کی ذات پر منحصر ہے اور تمہاری ابدی بقا اس محسن انسانیت کے قدموں پر نثار ہونے میں۔

دیکھیے، وہ رہا مقام حضرت زینبؑ مصلّی بچھائے بیٹھی ہیں۔ سامنے جناب عونؑ و محمدؑ دو زانو ہیں، ان شیروں کو ابھی جعفر طیارؑ اور حیدرِ کرار کے معرکے یاد دلا چکی ہیں۔ آنکھوں میں مامتا کی بےکسی پر بار بار آنسو چھلک آتے ہیں، مگر چہرہ تمتایا ہوا ہے، بیٹوں کو حسرت و یاس نہیں بلکہ جرأت و بہادری کے سبق دیتی ہیں، تاکید پر تاکید ہے کہ "دیکھو، خبردار، بھول نہ جانا! میں تمہیں اچھی طرح سمجھائے دیتی ہوں! تم دونوں سب سے پہلے ماموں پر فدا ہونا ایسا نہ ہو کہ اعزا میں کسی سے پیچھے رہ جاؤ! خوب یاد رکھو اگر تمہارے جیتے جی بھائی کے دشمنوں پر آنچ آئی یا تمہارے آقا زادے علی اکبرؑ کا بال بیکا ہوا تو ہرگز ہرگز دودھ نہ بخشوں گی!"

"دوسرے خیمے میں حضرت ام لیلیٰؑ ہیں اور جناب علی اکبرؑ شبیہ رسولؐ کے گیسو سنوارتی جاتی ہیں، بار بار شمع اٹھا کر رخ زیبا کے قریب لیجاتی ہیں اور سبزہ آغاز چہرہ کی نظروں نظروں میں بلائیں لے لے کے کہتی جاتی ہیں۔

"بیٹا! تم ماشاءاللہ جوان ہو، فاطمہؑ کے جائے پر وقت پڑا ہے۔ تم ہی ان کی پیری کا سہارا ہو، بڑے بھائی بیمار ہیں، لاغر اور کمزور ہیں، تم اکیلے کو دو کے فرائض انجام دینے ہیں، اس طرح لڑنا کہ دیکھنے والے بول اٹھیں کہ تم کس کے پوتے اور کس کے بیٹے ہو اور یوں جان دینا کہ میں اپنی بی بی زہراؑ کے سامنے سرخرو ہوں!"

دوسرے مقام پر حضرت ام فروہ جناب قاسمؑ کو سامنے بٹھائے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو اس امر پر گواہ ہیں کہ دل میں بیٹے کے بیاہ رچانے کا بڑا ارمان تھا، مگر زبان پر حسرت کی جگہ جرأت کے الفاظ ہیں۔

میرے لال! مجھ بیوہ کا، تمہارے سوا کوئی نہیں! میری ساری عمر کی کمائی تم ہی ایک اپنے باپ کی یادگار ہو، لیکن آج انھیں کے بھائی دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ اس لیے تم کو وہی کرنا چاہیے جو اس وقت تمہارے باپ کرتے۔ خواہش تھی کہ تمہیں دولہا کے کپڑے پہنے دیکھوں، مگر آج آرزو ہے کہ تمھیں چچا کی حمایت میں اپنے خون میں رنگی ہوئی پوشاک میں دیکھوں۔

بیٹا اس سرخ پوشی میں عروسی سے زیادہ دو جہاں کی بہار ہے! بس ماں کی اتنی بات یاد رکھنا کہ کوئی امر ایسا نہ ہونے پائے جس سے میری آنکھیں پچھتاووں میں جھک جائیں!"

حسینؑ کی چھوٹی بہن حضرت ام کلثومؑ اپنے خیمہ میں زیر آسمان بال کھولے کھڑی ہیں، زار زار روتی اور اپنے خالق سے فریاد کرتی جاتی ہیں:

"پالنے والے! تو نے زینبؑ کو عونؑ و محمدؑ سے بیٹے دیئے، تو نے ام فروہ کو قاسمؑ سا لال دیا، تو نے ام لیلیٰ کو علی اکبرؑ سا جوان دیا۔ میرے آقا! یہ سب کی سب اپنے اپنے فرزندوں کو کل بھائی پر قربان کریں گی، مگر میں کو کھ جلی، کسے فدیہ دوں، کسے نثار کروں؟ میں عورت ذات تو نے مجھ پر جہاد حرام کر دیا، میرے کوئی بیٹا نہیں، کہ میں بھینٹ چڑھاؤں اور اس ذبح عظیم میں حصہ لوں۔ میرے مالک! کیا تیری کا اس کنیز سے زیادہ بھی کوئی تیری بندی محروم کی جا سکتی تھی؟ اے رب الارباب! میں تیرے بھرے دربار میں اپنی ماں کے سامنے خالی ہاتھ کس منہ سے جاؤں گی؟"

معصومہ کی زبان سے نکلی ہوئی فریاد کنگرۂ عرش سے ٹکرائی تھی۔ دفعۃً خیمہ کا پردہ اٹھا اور ایک خوش رو بلند بالا جوان جس کے چہرے سے رعب و جلال آشکارا تھا، اندر داخل ہوا، غزالی آنکھیں رنج و غم سے شہابی ہو رہی تھیں اور عنابی ہونٹ تکلیف سے کانپ رہے تھے، جلدی سے آگے بڑھ کے بڑے درد سے کہا "فاطمہؑ کی جائی! کیا آپ اپنے غلام عباسؑ کو بھول گئیں؟ کل وہ آپ کی طرف سے اپنے آقا و مولا اور آپ کے بھائی پر نثار ہو گا۔ معظمہ! آپ دل نہ تھوڑا کریں، عباسؑ موجود ہے۔ آپ بلا پس و پیش اس کے سر کو جگر گوشۂ زہراؑ پر سے صدقہ کر کے رن میں پھینک دیں۔"

حسینؑ کی بہن لپٹ پڑیں، بےساختہ گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور "بھیا! بھیا!" کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

(محرم نمبر ۱۳۵۳ھ)

امام حسینؑ اور نجات

جناب سردار سید محمد ذکی صاحب رضوی (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ سیشن جج علی گڑھ)

پورے تیرہ سو برس سے ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ امام حسینؑ تمام دنیا کی نجات کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں اس دعوے کے لیے بیشمار دلائل موجود ہیں۔ مگر جب یہ دعویٰ خاص شیعوں کے سامنے پیش ہوتا ہے تو دلائل دوسرا اور قسم کے پیش کئے جاتے ہیں، اور جب عام مسلمانوں کے روبرو پیش ہوتا ہے، تو دلائل دوسرا ہیں اور قسم کے ہوتے ہیں، اور جب یہی دعوے تمام دنیا کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے تو اس کے لیے اور ایک خاص، خاص قسم کا ثبوت درکار ہوتا ہے۔ سارے کے سارے مسلمان دنیا اور آخرت دونوں کے معتقد ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگ اصولاً اور دنیا اور آخرت دونوں ہی کے قائل ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آخرت پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے مگر وہ بھی محروم نہیں بلکہ امام حسینؑ کا فیض سب کے لیے یکساں ہے۔ کیونکہ امام حسینؑ نے ساری دنیا کے سامنے وہ تدبیر عملی طور پر پیش کردی جو تمام انسانوں کو دنیا میں بھی نجات دیگی اور آخرت میں بھی اب یہ امر ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم محض دنیا کے فوائد حاصل کریں، یا دنیا اور آخرت دونوں کے۔

رجب ۶۰ھ میں یزید تخت نشین ہوا۔ اس نے اسلام کو مٹانا چاہا اور تدبیر یہ نکالی کہ امام حسینؑ سے بیعت لی جائے کیونکہ جب امام حسینؑ ہی یزید کی بیعت کرلیں گے، تو پھر اسلام کا کوئی حامی باقی نہ رہے گا۔ لیکن امام حسینؑ نے اسلام کا غم کھایا اور اسلام کو باقی رکھنے کا بیڑا اٹھالیا، اور اس کی تدبیر یہ تھی کہ ہر چیز میں تغیر کردیا جائے اصول عمل پر غور کرنے کے لیے ذیل کے واقعات کو جن پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام غم اور تغیر کے فلسفہ پر کس طرح سے عمل فرماتے تھے مثالاً سامنے رکھنا چاہیے۔ مدینہ سے جدا ہونا، حج کو عمرہ سے بدل ڈالنا، مکہ کو چھوڑ دینا عراق کی طرف چل پڑنا، منزل قصر مقاتل (منزل شراف) میں دشمن کے پیاسے اور پیاس سے بیتاب لشکر کی خاطر سے اپنے پانی کے ذخیرہ کو بیدریغ خرچ کرڈالنا، اثناء سفر میں حُر کی مزاحمت کے سبب سے اپنا راستہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرنا خاص میدان کربلا میں پانی کے قرب کو چھوڑ کے پانی سے اور چٹیل میدان میں خیام لگانا، ساٹھ ہزار درہم میں کربلا کی چار میل رقبہ کی زمین خرید کرلینا اور پھر اس کو وقف کردینا، شب عاشور کو خیام اہلبیتؑ کے چاروں طرف خندق تیار کرانا اور اس میں آگ جلوانا، حضرت علی اصغر کی شہادت کے بعد قبر کھودنا اور ان کو دفن کرنا۔

صرف یہی نہیں کہ امام حسینؑ نے امور مذکورہ وغیرہ وغیرہ پر عمل فرمائے فلسفہ غم و تغیر پر عمل فرمایا بلکہ آپ اور تمام ضروری امور میں بھی ہر وقت تغیر پر تیار رہتے تھے جیسا کہ نویں محرم کی رات کو حضرت نے عمر سعد سے فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو کہ میں واپس ہو جاؤں اور مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں قیام کروں یا اسلامی شہروں میں سے کسی سرحدی مقام پر چلا جاؤں اور عاشور کے دن حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کے بعد بھی عمر سعد سے فرمایا کہ میری تین باتوں میں سے ایک کو مان لے۔ اور ان تینوں باتوں میں سے ایک بات یہ تھی کہ "حضرت" مدینہ سے واپس چلے جائیں۔

جلدی میں بعض لوگوں کو تعجب ہو سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ اپنے تمام رفقا و اقرباؑ کہ شیرخوار بچہ کی شہادت کے بعد بھی مدینہ واپس جانے کو کیا کرتے لیکن یہ اصول کی بات تھی، اگر حضرت کو اجازت ملتی تو فوراً تغیر فرماتے اور مدینہ چلے جاتے۔ یہ ایک بعد از وقت بات ہے جب اجازت ہی نہ دی گئی اور امام حسینؑ شہید ہو گئے۔ یزید نے اپنا مقصد ظاہر میں کامیابی ہوئی لیکن ہر صاحب عقل اور ہر اہل دانش جانتا ہے کہ یزید کو بہت ہی بُری طرح سے ناکامی ہوئی کیونکہ اس کا مطلب کسی طرح حاصل نہ ہوا اور اسلام مٹ نہ سکا۔ اور اس کے مقابلہ میں امام حسینؑ کو حیرت انگیز و لازوال

کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اُن کا مقصد پورے طریق پر حاصل ہوگیا اور اسلام باقی رہ گیا۔

اب ہم تمام ساکنان کرّہ زمین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کامیاب فلسفہ پر غور فرمائیں جس کے ذریعہ سے لاکھوں مسلح اشخاص کے مقابلہ میں صرف بہتر بھوکوں اور پیاسوں نے نہ صرف کامیابی بلکہ دائمی اور لازوال کامیابی حاصل کی اور غور کرنے کے بعد اپنے لیے اس فلسفہ کو مشعل ہدایت قرار دیں اور اس کی پوری پیروی کریں۔

غم اور تغیر کا فلسفہ کیمیا کا ایک نسخہ ہے جو امام حسینؑ کے عمل سے سارے اہل دُنیا نے سیکھا۔ ہر چھوٹا اور بڑا کمزور اور قوی اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے آج کل عالمگیر جنگ ہو رہی ہے اس میں بھی یہی فلسفہ کامیاب بنائے گا اور تمام مسلمانوں کو جو جھگڑے در پیش ہیں اُن میں یہی فلسفہ اُنھیں مظفر و منصور کرے گا اور شیعوں کو جس قدر مذہبی، سیاسی اور معاشی تفکرات گھیرے ہوئے ہیں ان سب سے یہی فلسفہ کا عمل نجات دے گا۔ ہماری جو جماعت یا جو فرد اپنی کامیابی چاہتی ہے وہ غم اور تغیر کے فلسفہ پر عمل کرے اور یقینی کامیابی حاصل کرلے اور یہ دیکھے کہ امام حسینؑ علیہ السلام نے کیسی بہترین ترکیب سے تمام دنیا کو نجات قطعی کی تدبیر عملاً بتلائی۔

یہ واضح رہنا چاہیئے کہ غم اور تغیر کے فلسفہ پر عمل کرتے وقت صبر کی لازمی طور پر ضرورت ہے جس کا تصور امام حسینؑ کے نام کے ساتھ ہر شخص کے ذہن میں خود بخود آجاتا ہے اور وہ حضرت کے نام سے کبھی جدا بھی نہیں ہوسکتا۔

شیعوں کو آج کل سب سے بڑا کام یادگار محرم سلسلہ ھ کا ہے اس کے سلسلہ میں جو حضرات غم اور تغیر کے فلسفہ پر عمل فرمائیں گے وہ قطعی طور پر کامیاب ہوں گے اور دوسرے لوگ ہرگز نہیں۔ اس یادگار کے علاوہ ہر قومی کام میں اور ہر شخص کی ہر ایک کی ذاتی ضرورت میں (خواہ وہ کوئی بھی ضرورت ہو) وہی شخص کامیابی حاصل کرے گا جو غم اور تغیر کے فلسفہ پر عمل کرے گا۔ اس فلسفہ کی تشریح کے سلسلہ میں اس قدر اور عرض کرنا ضروری ہے کہ غم اصطلاح میں اس کیفیت کو کہتے ہیں جو کسی امر کی تدبیر کے سوچنے کی حالت میں انسان پر طاری ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ کیفیت اس طرح چھا جاتی ہے جس طرح بادل آسمان پر۔

مضمون زیر بحث کے ثبوت میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مثالیں پیش ہوسکتی ہیں لیکن آج کل اخبار میں اتنی گنجائش کہاں اس لیئے تمام انسانوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ہر ہر چیز میں غم اور تغیر کے فلسفہ پر عمل فرما کے نتیجہ خود ہی دیکھ لیں۔ (محرم نمبر سنہ ۶۱ ۱۳ھ)

من بکیٰ علی الحسینؑ

(مولانا سید محمد صاحب قبلہ مجتہد امروہہ)

بیشک خامس آل عبا جناب سید الشہداء روحی لہ الفداء پر کسی مومن کا گریہ کرنا باعث دخول جنت ہے اور قطرۂ اشک کے جو مدارج احادیث سے ثابت ہیں ان کا مفصل بیان دشوار کیونکہ یہ تاثیر اشک غم اس کارنمایاں کا اجر و ثمرت ہے جو فرزند رسولؐ نے روز عاشورہ زمین کربلا پر انجام دی اور جس کی عظمت و جلالت کا اظہار احاطہ طاقت سے باہر ہے اسی وجہ سے یہ امر لازمی ہے کہ جو امر منشاء شہادت جناب سید الشہداء اور اس قیامت خیز واقعہ کا نتیجہ تھا وہی فلسفہ ہمارے رونے رلانے میں مضمر ہے۔ اس واقعہ کی سالانہ یادگار منانا محض اس میں محدود ہو کر گریہ و بکا ہو جائے بلکہ یہ بھی مدنظر رہے کہ امام حسینؑ نے کیوں گھر بار لٹا یا کس بات پر اپنا سر دیا اس سے احقاق حق اور ابطال باطل کا کیا نتیجہ ظاہر ہو کر سید الشہداء کے وفادار اصحاب جاں نثار بہادر بیٹے بھتیجے بھانجے برادر کن کن صفات سے آراستہ و پیراستہ سپاہی تھے۔ جب ان مسائل کی طرف توجہ رہیگی تو پھر ہدایات کا میدان پیش نظر ہو جائے گا۔ شجاعت و سخاوت کیا مروت و فتوت کیا" تقویٰ و طہارت کیا" شرم و حیا کیا" حلم و کرم کیا، خلوص و وفا کیا، صدق و صفا کیا، صبر و رضا کیا، جملہ اصول تہذیب، اخلاق و سیاست مدن و تدبیر منزل ایک واقعہ کربلا کے اندر مل سکیں گے اور معلوم ہو جائے گا کہ اولاد اس طرح کام آیا کرتی ہے بھائی بھائی کا اس طرح ساتھ دیا کرتا ہے، بھتیجے بھانجے یوں سر دیا کرتے ہیں دوست و احباب اس طرح فدا ہوتے ہیں، بہنیں بیٹیاں اور بیویاں اپنے وارث کے بعد اس استقلال کے ساتھ مظالم و مصائب برداشت کیا کرتی ہیں۔ پس ان حالات کے ہوتے ہوئے مجالس عزا کا لطف ہی کچھ اور ہو گا اور معلوم ہو جائیگا کہ وہ عزاداری ماتم صرف ماتم و عزاداری نہیں ہے بلکہ یہ مجلس غم ایک بڑی زبردست و بے نظیر تعلیم گاہ ہے اور یہ آنسو محض ایک قطرہ ہی نہیں ہے، بلکہ اشاعت و ہدایت ملت کا سرچشمہ ہے لہذا اس کا اجر بھی یقیناً موجب جنت کا باعث ہے ظلم و جور کی بیخ کنی استبداد

و استبداد کا مٹانا آزادی کی حریت کی مساوات کی سب سے عظیم تعلیم اسلام اور وہ بھی عملاً مخصوص عظمت کے ساتھ صرف واقعۂ کربلا سے وابستہ ہے، انتہائی صبر و استقلال کے ساتھ زمین و آسمان کے ہلا دینے والے مصائب کا مقابلہ اور سارے گھر کا لٹا دینا اور حفاظت اسلام کے لیے بیش بہا قربانیاں یہ فرزند رسول کی وہ تعلیم تھی کہ جس نے دنیا کو خودداری و آزادی کا سبق دیدیا، دوسری قومیں بھی جا ہے اسلام سے ان کو انکار ہے لیکن بانیٔ اسلامؐ کے فرزند کی اس عظیم الشان تعلیم کو دنیا میں یکتا تعلیم اور واقعہ کربلا کو بڑا سبق آموز واقعہ سمجھتی ہیں پھر بھی اگر ہمارے تبلیغی سلسلے مستحکم نہوں تنظیمی بنیادیں مضبوط نہوں ہم میں علم و عمل اور محبت و اخلاص مفقود ہو، اخلاقی کمزوریاں کام کر رہی ہوں، عزم و ارادہ میں ثبات نہو تو ہر ذی حس یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ یہ تمام امور اس عظیم شہادت کی اصلی غرض و غایت سے بعید ہوئے، اور اس واقعہ سے جو آسمان اسلام پر مثل آفتاب کے روشن ہے پوری طرح مستفید نہ ہونے کا نتیجہ ہے آج تمام دنیا کے سامنے یہ کیسا کھلا ہوا معجزہ امام حسین علیہ السلام کا ہے کہ باوجود کیسی کیسی زبردست مزاحمتوں کے سارے عالم میں یہ ماتم قائم ہے، شاید کوئی حصۂ زمین ایسا ہو جہاں حسینؑ کے یاد کرنے والے نظر نہ آئیں۔ اس واقعہ کو قریب تیرہ سو برس گذر چکے ہیں مگر جس قدر زمانہ گذرتا ہے اس ذکر کی ترقی ہوتی چلی جاتی ہے جتنا دبایا جاتا ہے، اتنا ہی ابھرتا ہے، جتنا چھپایا جاتا ہے اتنا ہی چمکتا ہے، برخلاف دنیا کے دوسرے واقعات کے بوجہ امتداد زمانہ رفتہ رفتہ اُن کے آثار مضمحل ہوتے ہیں اور قدرتی طور پر ہر رنج و غم ختم ہو جاتا ہے، کتنے غریب و مسافر عالم غربت میں دنیا سے سدھارے ہوں گے، کتنے ہوں گے جو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہو کر دنیا سے اٹھے" کتنے بیخطا تلوار کے گھاٹ

اُتارے گئے کتنے مظلوم تیروں کا نشانہ بنے، مگر ان کا نہ کسی صحبت میں چرچا ہے نہ کسی مجلس میں تذکرہ ہے، غیروں کا کیا ذکر خود ان کے خاندانوں میں کوئی یاد کرنے پر آمادہ نہیں، اخلاف میں اپنے ان اسلاف پر کوئی آنسو بہانے کے لیے تیار نہیں۔ پس رسم لیل ونہار کا مقتضی تو یہ تھا کہ اور سیکڑوں ماتموں کی طرح یہ ماتم بھی محو و سہو ہو جاتا، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ماتم کی بقا میں قدرت اپنا کام کر رہی ہے اور اسی کے تصرف کا یہ نتیجہ ہے کہ ذکر حسینؑ ابتک قائم ہے اور آئندہ ہمیشہ ہمیشہ قیامت تک یہ رنج و غم باقی رہے گا کیونکہ عام طور پر اس سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز وضاحت کے ساتھ حقیقت اسلام کو روشن کرنے والی نہیں ہے جس نے غور و فکر کے ساتھ واقعات کربلا کا مطالعہ کیا اس پر حقیقت دین و ملت پوشیدہ نہیں رہی اور حقیقی اسلام کا تعارف کرنا چہ جناب سید الشہداؑ کے بےمثال کارنامے نہایت سہولت کے ساتھ صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہیں اور یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے ہم دنیا کو حق کی طرف مائل کر سکتے ہیں لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ ہم اول فلسفۂ شہادت اور اُسکے رموز سے واقف ہو جائیں اور جیسا کہ چاہیے ویسا ہی اس مجلس عزا سے سبق حاصل کریں، اگرچہ رونا رُلانا یقیناً اس کا رکن اعلیٰ ہے، لیکن اصل مقصد صرف اسی میں محدود نہیں ہے اور اسی کو کل غرض نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس سانحۂ عظیم کے جزئیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے،

شخصیت سید الشہداؑ کی معرفت فرزند رسولؐ کے حقوق سے واقفیت کے بعد اس گریہ و بکا میں اس حق کا بھی اعلان ہوتا چلا جائے گا جو اصول خمسہ (توحید عدل و نبوت و امامت و قیامت) پر حاوی ہے کیونکہ یہ رونا اداے اجر و رسالت ہے اور اداے اجر و رسالت ہو گا اور اجر و رسالت ہی ہے جو توحید و اقرار رسالت وغیرہ کے ساتھ ہو اور توحید و رسالت وغیرہ کا سچّا اعتراف بھی وہی ہے جو اداے اجر و رسالت کے ساتھ ساتھ ہو تو وہ ایک آنسو ہی جو غم میں کسی رُخسار پر بہہ جائے یقیناً جنت کا پروانہ اور بروز قیامت علم و عمل کا ذخیرہ ثابت ہو گا اور دریائے رحمت الٰہی سے آتشِ جہنم سرد ہو جائے گی،

یہ امر ناقابلِ انکار ہے کہ دنیا میں اسلام کا نام فرزند رسول انام نے اپنی اور اپنے عزیز و انصار کی قربانیاں دے کر باقی رکھا کیونکہ چلتے چلتے وہ زمانہ آ گیا تھا کہ احکام اسلام بدل گئے تھے، تعلیم رسالت سُبک ہو چکی تھی عبادات اپنی صورتوں پر نہ رہی تھیں اور حق ایسا مشتبہ ہو گیا تھا کہ یزید جیسا شرابخوار، زناکار خلافت الٰہیہ کا دعویدار ہو کر یہ جرات کرتا ہے کہ فرزند رسولؐ اس سے بیعت کریں اور اپنے نجس ہاتھ ان پاکیزہ ہاتھوں کی طرف بڑھاتا ہے جو رسولؐ اللہ کے ہاتھ تھے۔ فرزند رسول اسلام کی نبض پر اپنا ہاتھ رکھتے ہیں دیکھا کہ دم توڑ رہا ہے اور اب خاموشی میں اسلام کی موت ہے، بس میرا خون ہی اس کی دوا ہے، پھر تو سب کچھ کیا اور سب کچھ اسلام کے نام پر دیا۔ گھر بھی دیا، سر بھی دیا۔ مگر اسلام کو موت سے بچا لیا۔ بیت رسالت میں جو موتی تھے وہ سب دربار الٰہی میں نذر کر دیئے جو بیش بہا قربانیاں تھیں سب اسکی بارگاہ میں خریدی گئیں اس کے عوض میں اگر خداوند عالم بھی سید الشہداؑ کو آخرت کا مختار بنا دے تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ بس یہ امر بھی منجملہ انھیں مراحم الٰہیہ کے ہے کہ حسین کو حسین سمجھنے والے اور انکے ماتم میں رونے والے مستحق جنت ہیں اور کسی طرح اس اشک غم پر جنت کا وجوب قابل استعجاب نہیں،

(محرم نمبر سنہ ۱۳۴۹ھ)

پنڈت ویاس دیو صاحب مصرا۔ ایم ، اے۔ ایل۔ ایل۔ بی بیرسٹر ایٹ لا۔ نئی دہلی

زمانہ فانی۔ زمانہ والے فانی، زمانے کی ہر شے فانی دنیا کی کسی چیز کو بقائے دائمی نہیں۔ چاہے وہ بیل بوٹے ہوں۔ گل و غنچہ ہوں دشت و چمن ہوں غریب و امیر ہوں۔ بادشاہ و فقیر ہوں سب فانی ہیں یہاں تک کہ تاریخیں اور واقعات بھی فنا ہو جاتے ہیں۔ کوئی بادشاہ یا کوئی لیڈر مرنے کے بعد چند سال تک زندہ رہتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا نام بھی فنا ہو جاتا ہے۔ اگر اعمال نیک ہیں تو دنیا ذرا دیر تک یاد رکھتی ہے اور اگر چال چلن خراب ہیں تو یاد بھی دیر تک قائم نہیں رہتی تمام نظام دنیا اس قانون کے ماتحت ہے انسان اگر اسے بدلنا چاہے تو نہیں بدل سکتا۔ جب تک دنیا قائم ہے یہ تبدیلیاں ہوتی ہی رہیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی بدلتے جائیں گے۔ تاج و تخت بھی بدلیں گے۔ طبل و علم بھی تبدیل ہونگے زمانہ بھی بدلے گا۔ زمانے والے بھی بدلیں گے۔ آج جہاں بڑے بڑے محل ہیں بے شمار عیش و عشرت کے سامان مہیا ہیں شاید کل وہاں ویرانی کا دور دورہ ہو آج جہاں گلستان اندر گلستاں ہیں اور فصل گل کی حکومت ہے۔ شاید کل صحرا ہی صحرا نظر آئے۔ انقلاب آتے دیر نہیں لگتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستیاں ویران ہو جاتی ہیں گھر برباد ہو جاتے ہیں، خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں جو گھر صبح کو بھائی، بھتیجوں، بال بچوں چھوٹے بڑوں اور یار و احباب سے بھرا رہتا ہے دوپہر ہوتے ہوتے وہاں خاک اڑنے لگتی ہے بھائی سے بہن چھوٹ جاتی ہے بچوں سے ماں کی گودیں خالی ہو جاتی ہیں، سر سے مالک کا سایہ اٹھ جاتا ہے، سہاگنیں بیوہ ہو جاتی ہیں، لوگ مخالف ہو جاتے ہیں، مقدر برگشتہ ہو جاتا ہے زمانہ تاریک معلوم ہوتا ہے، تبسم گریہ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھئے بجز یاس و حرماں، رنج و غم اور جور و ستم کے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

جو شے بن گئی وہ بگڑے گی ضرور۔ ایک چیز کا پیدا ہونا ہی اسکے فنا ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ درند۔ پرند۔ چرند سب فنا ہو جائیں گے مہر و ماہ مٹ جائیں گے۔ آسمان ستاروں سے خالی ہو جائے گا۔ آسمان کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ سینۂ گیتی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، موت کا فرشتہ ہر طرف دوڑتا ہوا نظر آئیگا اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب موت کو بھی موت کا سامنا کرنا ہوگا۔ کہیں کوئی چیز نہ باقی رہے گی بجز اس ہستی کے جو ان تمام حوادث کو اٹھا چکی ہے جس کی ثابت قدمی سے عرش بھی کانپتا ہے جسکے صبر و استقلال مشیت پر چھا گئے ہیں، جسکی ہمت اور جراءت سے انقلابات زمانہ انگشت بدنداں ہیں، جس کی تین دن کی بھوک اور پیاس دونوں عالم کو ہلا سکتی ہے۔ ایسی زندہ جاوید ہستی کون ہے! وہ خدا کا بھیجا ہوا امام، حبیب کبریا کا نواسہ یداللہ کا لخت جگر، بنت رسول کا لال، حسنؑ مجتبیٰ کا بھائی حسینؑ ہے وہ حسینؑ جو اہل اسلام کے لئے شمع ہدایت اور دیگر مذاہب کے لئے چراغ معرفت اور دنیا کے لئے کل ایمان بنکر آیا۔ کیونکہ وہ زمانہ انتہائی پستی کی طرف مائل تھا لوگوں کے کردار جتنا گر سکتے تھے گر چکے تھے۔ مئے خواری جائز ہو چکی تھی جور و جفا، ستم و استبداد روا تھے، انسانیت خونخواری کا نام تھا، جو راہ راست پر چلنے کا ارادہ کرتا ذبح کر دیا جاتا۔ جو شراب خواری کے خلاف

خلاف آواز بلند کرتا وہ جان سے جاتا۔ جو ذرا ابھرنے کی کوشش کرتا وہ اور اسکے اہل و عیال نذر تیغ کر دئیے جاتے۔ باطل اتنا مضبوطی سے دنیا پر غالب تھا کہ خدا کے نیک بندے بھی اسکے سائے میں پناہ لیتے تھے۔ ایسی مضبوط مہم کا مقابلہ کرنا معمولی انسان کا کام نہ تھا۔ اس مجسمۂ باطل حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے حسینؑ ابن علیؑ کل ایمان بنکر میدان عمل میں آیا۔ اکیلا نہیں آیا۔ ایمان کو بچانے کے لئے محض اپنی جان نہیں پیش کی بلکہ ایک کنبہ لے کر آیا، بھائی بھتیجے لے کر آیا لڑکے لڑکیاں لیکر آیا، چھوٹے چھوٹے بچے ہمراہ لایا، تمام اہل حرم ساتھ لایا۔ المختصر یہ کہ علیؑ و فاطمہؑ کی عمر بھر کی تمام کمائی نذر دینے کے لئے لایا۔ وہ دنیا کو بتا رہا تھا کہ جس چیز کو میں بچانے کے لئے آیا ہوں وہ بہت قیمتی ہے۔ اس کے بچانے کے لئے لڑکے قربان ہو سکتے ہیں۔ بھائیوں کی جانیں جا سکتی ہیں شیر خوار نذر ناوک ہو سکتا ہے۔ سیدانیاں بیوہ ہو سکتی ہیں، خیمے نذر آتش کئے جا سکتے ہیں، نبی زادیوں کی ردائیں چھین سکتی ہیں۔ مگر شمع ایمان نذر طوفان نہیں کی جا سکتی۔ یہ وہ شمع ہے جس کو رسولؐ خدا نے خانۂ خدا میں روشن کیا، جس نے ذوالفقار کے سائے میں پناہ لی، جس کو فاطمہؑ کی عصمت نے چار چاند لگائے، جس کو حسینؑ کی شہادت نے بجھنے نہ دیا۔ یہ رسولؐ کی امانت اب حسینؑ کے پاس پہونچی اور کس دور میں پہونچی جبکہ ہر طرف باطل کی سیاہ آندھیاں چل رہی تھیں ظلمت کا دور تھا۔ وحشت کا زمانہ تھا۔ اکثریت اس کی خواہاں کہ یہ شمع ہدایت ہمیشہ کے لئے خاموش کر دی جائے۔ حسینؑ کا منشا کہ جان جاتی ہے تو جائے، بچے قربان ہوتے ہیں تو ہوں، خیمے لٹتے ہیں لٹیں، سیدانیاں مقید ہوں تو ہوں مگر شمع محمدیؐ بجھنے نہ پائے، رسولؐ کا قول پیش نظر "حسینؑ منی و انا من الحسینؑ" حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ قول کا نصف حصہ یعنی "حسینؑ مجھ سے ہے" ایک نمایاں حقیقت ہے مگر "میں حسینؑ سے ہوں" یہ ثابت ہونا باقی ہے۔ رسولؐ کا مقصد شاید یہی تھا کہ حسینؑ مجھے اور میرے نام کو زندہ کرے گا اور اسی لئے کہا تھا کہ "میں حسینؑ سے ہوں" اور یہی سبب تھا کہ حسینؑ اپنی تمام بضاعت لے کر میدان کربلا میں قربان کرنے کے لئے لائے تاکہ دنیا سمجھ لے کہ نواسۂ رسولؐ کا مقصد بہت بلند اور عین ایمان ہے۔ حامیان باطل کے مقابلہ میں حسینی سپاہ کی وہی نسبت تھی جو شاید روز حشر اہل جنت و اہل دوزخ میں ہو۔ اور حسینؑ کی اس مختصر سی فوج میں حبیب ابن مظاہر جیسے ضعیف العمر اور علی اصغر جیسے شیر خوار بھی شامل ہیں حسینؑ نے قاسم جیسا بھتیجا، عباس جیسا بھائی راہ حق میں قربان کر دیا۔ مگر پھر بھی سنگدلی نہ پگھلی۔ یہ دیکھکر کہ رسولؐ کا کلمہ پڑھنے والے ہیں رسولؐ کی شبیہ یعنی علی اکبرؑ کو میدان جنگ میں بھیجا کہ شاید گمراہوں کو رسولؐ یاد آجائیں اور وہ راہ حق پر آجائیں یہ آخری نشانی تھی جس سے رسول اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ مگر اللہ رے سنگدلی کہ زمانہ رسول اور رسالت کے اتنا مخالف ہو گیا تھا کہ رسولؐ کی شبیہ کا بھی پاس نہ کیا اور علی اکبرؑ کا خون حسینؑ کے نظروں کے سامنے بہا دیا۔ رسولؐ کے نواسہ کے سامنے رسولؐ کی شبیہ مٹا دی گئی اور اسی پر ہی ختم نہیں کیا۔ بلکہ نواسۂ رسولؐ کو بھی شہید کیا۔ خیموں میں آگ لگا دی بچوں کے گوشوارے اتار لئے اور سیدانیوں کو اسیر کر لیا۔ حسینؑ نے چند گھنٹوں میں اپنا تمام گھر لٹا دیا۔ راہ حق پر مٹنے کے لئے آئے تھے۔ شہید ہو گئے جس مقصد کے لئے نکلے تھے وہ پورا کیا دنیا کو دکھا دیا کہ راہ حق پر چلنے والے اس طرح قربانیاں دیتے ہیں۔ آج کسی قوم میں ایسی مثال نہیں ملتی حسینؑ نے دنیا کے ہر فرقے اور ہر مذہب کو راہ حق پر مرنا سکھایا۔ حسینؑ کی شہادت اس نکتہ کو ظاہر کرتی ہے کہ اگر ایمان پختہ ہو تو مرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اذیت محسوس نہیں ہوتی۔ ایک کربلا ہی کا مخصوص سانحہ ہے جس نے اسلام کی تاریخ کو رنگین بنایا اور ایمان کی سب سے بڑی تبلیغ کی۔ مجھے یقین ہے کہ آہستہ آہستہ دنیا واقعہ کربلا سے سبق حاصل کرے گی اور ایک ایسا زمانہ یقیناً آجائے گا جب "حسینیت" ہی ہر شخص کا مذہب ہوگا اور دنیا کے بغض و عناد، جور و ستم، فتنہ و فساد ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔

محرم نمبر
۱۳۷۶ھ

شمس العلماء مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ

مخالفین کے خیالات اور قسم کے ہیں اور احباب کے خیالات اور طرح کے ہیں۔ میں ہر ایک کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا لیکن ایک مختصر تقریر لکھنا چاہتا ہوں جس سے ممکن ہے کہ اہل عناد کو ہوش اور قلب مومن میں ایمان آئے۔

بشری ارادہ اس امر سے قاصر ہے کہ وہ اپنے منصوبوں کو شرق و غرب تک پھیلا دے کیونکہ دنیا میں ہزاروں ارادے اس کے مقابلہ کے لئے موجود ہو جاتے ہیں جو کسی قلبی خواہش کو چلنے نہیں دیتے خصوصاً اگر وہ مراد مشکلات پر مبنی ہو اور ان چیزوں پر مشتمل ہو جو مقتضائے خواہش انسانی سے بہت دور ہیں۔ رسم مسرت کا جاری کرنا سہل ہے کیونکہ قلب انسانی نشاط طلب ہے وہ اور اس کی خواہشیں ایسے مقصود کی طرفدار ہیں لہذا اگر کبھی ایسی رسم کی ترویج کا خیال پیدا ہو تو ایسی چیز میں آسانیاں نظر آئیں گی اور مخالفت کا وجود مشکل سے ملے گا۔ لیکن اگر ایسی رسم کا رواج مقصود ہو جس میں انسانی خواہشوں کا کوئی حصہ موجود نہ ہو تو تمام افراد عالم اس رسم کے دشمن نظر آئیں گے۔ لمبی اور طویل راتوں کا بزم رقص و سرود میں کاٹ دینا نہایت آسان ہے کیونکہ تمام جذبات جو دل میں مضمر ہیں وہ اس کی دعوت پر لبیک کہہ رہے ہیں، لیکن عبادات میں اور ان روحانی ریاضتوں میں جو خواہشوں سے ہمیشہ برسر جنگ ہیں۔ ثلث شب۔ رات کا تہائی حصہ چھوٹی سی چھوٹی رات کا بھی بسر نہیں ہو سکتا۔ میلوں اور بازاروں میں اجتماع سہل ہے لیکن کسی مسجد میں مشکل ہے۔ یہ مطلب محتاج دلیل نہیں بلکہ اگر زبان منکر اس کا انکار کرے گی تو اس کا دل اقرار کرتا ہوا نظر آئے گا۔ جب یہ ثابت ہے تو اب اس رسم عزا پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے کہ وہ ان چیزوں میں داخل ہے جن کا رواج دے دینا سہل ہے یا ان امور میں محسوب ہے جن کی ترویج تنہا مشکل نہیں بلکہ سخت مشکل ہے۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کو دل ڈھونڈتا ہو کیونکہ ہمیشہ دل غم سے نفرت کرتا ہے مجبوری آپڑے یہ دوسری چیز ہے لیکن اختیار سے اس کی خواہشیں نہیں ہو سکتیں وہ کسی خواہش کے موافق نہیں ورنہ وہ ہر جانور میں پائی جا سکتی ہے۔ دنیا کا نام ایسا ڈراؤنا نام ہے جس کو دیکھنے کے لئے نہ آنکھ آمادہ ہے نہ سننے کے لئے کان تیار ہیں۔ پھر باہم مخالفت ہوا و ہوس کس کے امکان میں ہے کہ وہ ایسی رسم کو چار دانگ عالم میں پھیلا دے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے رواج اور ترویج میں خواہشیں ہرگز بدنام نہیں ہو سکتیں اور جب خواہشیں اس سے الگ ہیں تو یقیناً اس غم کی محرک کوئی اور قوت ہے جو غیر محبوب کو محبوب بنا رہی ہے اگر ہم اس قوت کو تلاش کرنے میں سعی کریں تو ہمیں آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ عالم۔ جو ما سوا اللہ۔ کا نام ہے کوئی ایسی قوت نہیں رکھتا جس کو یہ اقتدار حاصل ہو کہ وہ غیر مراد کو مراد بنا دے سب سے زیادہ قوی چیز سلاطین کے جابرانہ فرمان ہیں جو بزور تعمیل حکم کی تکلیف دیتے ہیں لیکن اس کے محرک وہ بھی نہیں معلوم ہوتے، اس لئے اکثر سلاطین اس عزا اور صاحب عزا کے دشمن گذرے ہیں جیسا کہ تاریخ اس مطلب پر گواہ ہے۔ اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو سلاطین کے اقتدار صرف اپنے حدود مملکت میں تسلیم کیے جا سکتے ہیں نہ ان حدود میں جو ان کے اقتدار کے احاطہ سے بالکل خارج

ہوں۔ پھر یہ بھی خیال کرنیکے قابل بات ہے کہ اگر کبھی ترویج سے رواج ہو بھی اور ایسا فرض بھی کر لیا جائے تب بھی بقائے رواج ناممکن ہے، کیونکہ مخالف مطلوب دل باتیں محرک کے وجود کی تابع ہیں، جب تک محرک موجود ہے وہ بھی ہیں اور ادھر وہ ہٹا یہ بھی ندارد۔ اگلی تاریخوں کے اوراق دیکھو وہ بھی ہیں گل نہیں گئے ہیں۔ تو تمہیں نظر آئے گا کہ اموی سلطنتوں کے فرمانرواؤں نے اپنے اقتدار چند روزہ کے بل پر اہلبیت طاہرین پر جو مرکز عصمت اور منبع طہارت تھے ان پر لعن طعن کرنا۔ العیاذ باللہ سنت قرار دے رکھا تھا۔ یہ وہی لعن ہے جس کے متعلق نادانستہ یا جان بوجھ کر چشم پوشی کرنے والے لوگ کہتے ہیں کہ لعنت کسی پر نہ کرنا چاہیئے چہ جائیکہ مسلم پر، لیکن برسوں اور قرنوں ہزاروں منبروں پر خطیبوں کے گندہ دہنوں سے یہ بوئے بدنکلی اور عالم میں پھیلی اور منزل رحمت خاندان اہل لعنت کا مورد معنت رہا اور اس قوت کے ساتھ اگر کوئی اس رسم شنیع کو ترک کرتا تھا تو وہ تارک سنت سمجھا جاتا تھا اگر عمر بن عبد العزیز اسے اپنی بیدار مغزی سے موقوف نہ کرتا تو یقیناً یہ رسم بد زوال اقتدار اموی کے ساتھ زائل ہوتی کیونکہ اس کا محرک طمع مال وزر کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی، جب وہ کم ہو جاتا تو اس کا پتہ بھی نہ ملتا۔ رسم عزاداری ہرگز ممنون ترویج سلاطین نہیں ہے، بلکہ اسکی بقا باآواز بلند ندا دیتی ہے کہ محرک موجود ہے اور باقی ہے لہذا یہ اثر بھی باقی ہے۔ پھر اب فانی سلسلوں میں اس کے محرک کو نہ ڈھونڈو بلکہ جس کی ذات کیلئے ہے [illegible] وہی ہے نہ آسمان سے بعد قتل سید الشہداؑ لہو برستا نہ تمہیں اس ماتم میں رونے کا شوق پیدا ہوتا۔ تمہیں معلوم ہے بلکہ جتنے خدا کے نیک بندے ہیں سب کو معلوم ہے کہ جب تک لہو برسایا نہیں گیا اس وقت تک نہیں برسا وہ ایک چیز نہیں جس کا ذکر آسان ہو بلکہ وہ ایک طویل فہرست ہے جس میں صف ماتم قدرتی طور سے بچھتی ہوئی نظر آتی ہے اور ایسی ناحق خلافتوں سے جیسے یزید اور اسکے امثال ہیں بچ نہ سکیگی ہے، ملائکہ کا انکار وقت خلافت آدم قرآن کی زبانی مشہور و معروف ہے جس کا انکار کسی اسلامی فرد سے ناممکن ہے کیونکہ تمام ملائکہ معصومین کی یہ کھلی ہوئی آواز ہے۔

اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء

کیا تو زمین میں ان لوگوں کو منصب خلافت دیگا۔ جو زمین پر فساد برپا کریں گے اور خونریزی ناحق کریں گے اس نہاد کا پتہ اسی دن سے لگ گیا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یزید کی خلافت اور وہ تمام سلسلہ جس کے ذریعہ سے یزید تک خلافت پہونچی ہے وہ سب باطل ہیں تمام ملائکہ کا اس کے بطلان پر اجماع ہے اور جناب باری نے اس کلام کو رد نہیں کیا۔

سرفراز محرم نمبر ۱۳۴۵ھ

لاثانی قربانی

(پنڈت برج ناتھ شرما ایم اے ایڈوکیٹ ممبر کورٹ لکھنو یونی ورسٹی)

فلسفہ ہمہ اوست کے مطابق تخلیق عالم ذات والا صفات کی بہت بڑی قربانی ہے، وحدت کے بے پایاں سے کثرت کی لہریں اٹھیں، سکون میں ہیجان پیدا ہوا جو ذات وصفات کی منت کش نہ تھی۔ اس نے رنگ برنگی صفات کا خرقہ اوڑھا، حقیقت کی عریانی نے مجاز کا جامہ پہنا۔ عبد ومعبود، شاہد ومشہود، عاشق ومعشوق کی تفریق نمودار ہوئی، ان میں سے ہر ایک اپنے کو دوسرے سے جدا سمجھنے لگا، ہجر کی صعوبتیں جھیل کر ہر ایک وصل کا کوشاں ہوا، یہ کوشش بھی آسان نہ تھی، اپنے آپ سے جب فصل پڑ گیا تو وصل کا مسلک نہایت سخت ہو گیا۔

چوں شانہ ہفت سر نہ نہی در تہ ارہ — ہرگز بسر فرق نگارے نہ رسی
گر ہمچو حنا سودہ نگردی تہ سنگ — ہرگز بہ کف دست نگارے نہ رسی

کتنی قربانی کی ضرورت اس راہ میں ہے۔ خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ سے صاف ظاہر ہے کہ کوزہ گر کو چاک چلانا ہوتا ہے۔ مٹی کو اس پر ناچنا پڑتا ہے اور دہکتی آگ میں تپنا پڑتا ہے۔ تب کوزہ تیار ہوتا ہے، جو ذات عقل وفہم کے پھندے میں پھنسی نہ تھی جو اس خمسہ کے پنجے میں گرفتار ہو گئی جس وجود میں اسم وشکل کا نام ونشان نہ تھا اس پر نام اور روپ کا اتہام لگا، لیکن تغیرات عالم میں کوئی اصلیت نہیں ہے اور نہ ان سے ذات مطلق پر کوئی اثر پڑتا ہے، وہ تغیرات سے مبرا ہے، سالک کی حقیقت بیں نگاہ بالآخر دیکھ لیتی ہے کہ ان تغیرات کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ اسلئے یہ قربانی بھی سراب ہی کے مانند ہے
نظام عالم کا دار ومدار بھی قربانی ہی پر ہے، تخم درخت کے لیے، ماں بچہ کے لیے، شہری وطن کے لیے ہر لمحہ قربانی کیا کرتا ہے اپنی ترقی وبہبودی کے لیے بھی ہوتی ہے۔ نیکی وبدی کی قوتوں میں کشمکش ازل سے آج تک جاری ہے، اس کشمکش میں نیکی کی قوتیں اپنی قربانی کی بدولت بدی کی قوتوں پر فتحیاب ہوتی ہیں۔ تاریخ اس کی شاہد ہے، بے شمار صدیاں گذر گئیں ایک ایسی ہی کشمکش میں نیکی کی طاقت کو یہ محسوس ہوا کہ اسے کامیابی کسی نیک نفس خدا پرست زاہد کی قربانی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اس نے دوہیچ سے عرض کیا کہ آپ کی ہڈیوں سے بنے ہوئے آلات حرب اگر استعمال کیے جائیں تو ہماری کامیابی ہو سکتی ہے، دوہیچ نے بخوشی جان دے کر اپنی ہڈیاں نذر کر دیں، کچھ زمانہ بعد تو گرنتی دیو نے اپنی قربانی اس لیے کی کہ بنی نوع انسان اپنے گناہوں سے محفوظ رہیں، حضرت عیسیٰ نے بھی اسی غرض سے صلیب پر جان دی۔ ان قربانیوں کا ناخوشگوار اثر ایک شخص واحد ہی تک محدود رہا، ان میں سے کسی نے اپنے کنبہ کو حق کی راہ میں قربان نہیں کیا، البتہ ایسی مثال ایک حضرت امام حسینؑ نے ہی قائم کی اپنے والد کی وفات کے بعد یزید خلاف معاہدہ خلیفہ بن بیٹھا اور حضرت امام حسینؑ کو خلافت سے محروم رکھا۔ اگر امام حسینؑ طاقت کے دلدادہ ہوتے تو ان کے لیے مشکل نہ تھا کہ فوج جمع کر کے یزید پر حملہ کرتے اور بے شمار خدا کے بندوں کا خون بہا کر اپنی امامت قائم کرتے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ یزید اپنے اعمال سے مسلمانوں کو گمراہ کر رہا ہے تو انھوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے

انکار کر دیا۔ اگر وہ عیش و راحت کے متمنی ہوتے تو دنیا کی تمام راحتیں ان کے قدموں پر لوٹتی ہوتیں، بشرطیکہ وہ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے، ان کے بزرگوں نے ہمیشہ دنیا کی دولت و راحت کو ہیچ سمجھا تھا اور راہ حق پر چلنا، دوسروں کو چلانا اپنا فرض اولیں مانتے تھے، یہی راہ امام حسینؑ نے اپنے لیے پسند کی۔ جس وقت وہ کعبہ سے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ روانہ ہوئے وہ جانتے تھے کہ وہ موت کے منھ میں جا رہے ہیں، پھر بھی ان کے ۷۲، بہتر آدمیوں کی جماعت میں چھوٹے چھوٹے بچے عورتیں اور بوڑھے بھی شامل تھے، ان کا ہر متنفس راہ حق پر جان دینے کو تیار تھا، راستہ میں یزید کی وہ فوجیں جو آپ کے قتل کے لیے بھیجی گئی تھیں پیاس سے تڑپتی نظر آئیں، آپ نے اپنے ساتھ کے مشکیزے کھول کر ان کے سوکھے گلوں کو تر کیا۔ اس کے صلہ میں انھیں نام نہاد مسلمان فوجوں نے آپ اور آپ کے ہمراہیوں کو پانی سے ترسایا۔ اور ایک بوند بھی پانی کی آپ تک نہ پہنچنے دی، کربلا کے جلتے میدان میں آپ کے ڈیروں کو دشمنوں نے گھیر لیا اور تیروں کی بوچھار کرنے لگے۔ اور آپ کے ساتھیوں کے خون سے زمین کی تشنگی بجھانے لگے اس حالت میں بھی حضرت امام حسینؑ نے یزید کے سامنے سر نہیں جھکایا، اور نہ ان کے ہمراہیوں نے یہ گوارا کیا کہ جان بچا کر چلے جائیں۔ یزید کے تنے ہوئے مکے کے سامنے کسی طرح سر جھکانے کو تیار ہوئے، یہاں تک نوبت پہونچی کہ آپ کے خیمے میں اہل حرم اور معصوم بچے پیاس کے مارے تڑپتے رہے اور باہر آپ کے اقرباء جاں بحق ہوتے رہے۔ ننھے سے بچے علی اصغرؑ کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں، گلے میں کانٹے پڑ رہے تھے، کھال خشک ہو رہی تھی حضرت اپنے خیمے سے اُسے لے کر باہر نکلے، اس امید سے کہ شاید اس معصوم بچے کو دو بوند پانی مل جائے، لیکن یزید کے بے رحم سپاہیوں نے شربت موت سے بچے کی پیاس بجھائی۔ بوڑھے، بچے، آزاد، غلام سب ہی کام آئے، امام حسینؑ کا سرسبز چمن ان کی آنکھوں کے سامنے لٹ گیا لیکن انھوں نے باطل پرستی قبول نہ کی۔ بالآخر جب گھوڑے سے گرے اور گویا سر بسجود تھے، ایک سفاک کی شمشیر نے ان کی گردن تن سے جدا کر دی۔ عورتیں بے پردہ یزید کے سامنے حاضر کی گئیں،

حضرت امام حسینؑ نے اپنے اور اپنے خاندان والوں کو اس لیے قربان کیا کہ حق کی فتح باطل پر ہو، حیوانی طاقت کے مظاہرے سے راہ حق پر چلنے والے خائف نہوں بلکہ دلیری سے مقابلہ کریں، حسینؑ جان دیکر زندۂ جاوید ہوئے، یزید زندہ رہکر موت سے ہم آغوش ہوا تکبر اور انکسار، صدق اور کذب دنیا میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے رہے ہیں حسینیت اور یزیدیت کی یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جس وقت تک خود غرض دنیا میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے رہیں گے، یزیدیت کے شکست دینے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے حسینیت،

ایک اہم بات

کربلا کا ایک واقعہ اس ملک کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے جب حضرت امام حسینؑ دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے انھوں نے یزید کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر انھیں راستہ دے دیا جائے تو وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ہندوستان چلے جائیں لیکن یزید نے منظور نہیں کیا یہ واقعہ بھارتیوں کے لیے ہمیشہ فخر کا باعث رہے گا کہ نام نہاد مسلمانوں پر بھروسہ نہ کر کے حضرت امام حسینؑ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی اور عزت بھارتیوں کے ساتھ ہیں محفوظ سمجھتے تھے، آج بھی خدا کے فضل سے اسلامی اقلیت ہندوؤں کی اکثریت میں آزادی اور عزت سے زندگی بسر کرتی ہے اور دونوں میں تعلقات برادرانہ ہیں۔ حسینؑ کی یادگار رہیں خدا کرے تعلقات دن بدن گہرے ہوتے جائیں اور دونوں مل کر خدا سے دعا کریں "باطل سے حق کی طرف، تاریکی سے روشنی کی طرف اور فنا سے بقا کی طرف تو ہماری رہبری کر"

(محرم نمبر ۱۳۷۱ھ)

سید کلب مصطفیٰ صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ

خون دل ہے دوام رنگینی ——— غم ہے موجد چمن طرازی کا

یوں تو خیر و شر کے تصادم، حق و باطل کی دار و گیر اور انسانیت و شیطنت کی ٹکر کی آوازیں فضائے تاریخ میں گونج رہی ہیں اور گونجتی رہیں گی کاشانہ تاریخ کے جھروکوں نے عبرت انگیزی کے بہتر سے بہتر مناظر دکھائے ہیں اور آئندہ بھی ایسے مناظر دیکھے جا سکیں گے، جامۂ تاریخ خون کے چھینٹوں سے رنگین ہے اور بے گناہوں کا خون اس کی رنگینی میں اضافہ ہی کرتا رہے گا لیکن ۱۳۶۱ھ کے روز عاشورہ کو اپنے عبرت انگیز و حیرت خیز مناظر کی دوام رنگینی اور اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے جو خصوصیت اور انفرادیت حاصل ہے وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے — روز عاشورہ کی ہنگامہ در کنار صبح کی وہ موذنی اذان حق میں غلاموں کا آزادوں پر سبقت لے جانے کا وہ حوصلہ، بوڑھوں کا جوانوں سے بازی جیت لینے کا وہ ولولہ، بچوں کا جوان مردوں سے پہلے جان دینے کا وہ ہمہمہ، زخموں سے چور چور ہو جانے کے بعد بھی "قول سدید" کہنے کا وہ طنطنہ، عین لڑائی میں وہ نماز پڑھنا اور باز دو کے لئے فضا کو پر سکون بنانے کی غرض سے ساتھیوں کا تیروں کی شدت امسٹ کو وہ سینہ تان کر روک لینا، وہ تیروں کا سینوں سے ریلنا، وہ تلواروں کی باڑھ میں دھنسا، وہ تیروں کی چھاؤں میں چلنا وہ برچھیوں کے پھلوں سے کھیلنا وہ سقائی وہ باخدائی۔ وہ ثابت قدمی وہ پامردی وہ بے جگری!

العظمت للہ یہ وہ مناظر ہیں جنھوں نے گویا فطرت کی دنیا کو بدل کر نئی زمین اور نیا آسمان اور صاحبان فکر و نظر کے لئے ایک نیا میدان تیار کر دیا تھا۔!!

مختصر یہ کہ مظالم کی سنگینی اور شیطنت کی شر انگیزی کے مقابلہ میں انسانیت کی بلندی، روحانیت کی پرکیفی اور معصومیت کی دلکشی کے جو مناظر عاشورہ کی ایک دوپہر پیش کرتی ہے شاید جگوں اور صدیوں کی تاریخ اجتماعی طور پر بھی پیش نہ کر سکے اور پیش کر بھی سکے تو تمنائیاں شہادت کا وہ مقصد سرفروشی و حق گوئی کہاں سے لائے گی۔ شیب میں شباب کا رنگ کہاں سے پیدا کرے گی اور اگر یہ بھی فراہم کر سکی تو بے زبان مجاہد کی قربانی کہاں سے پیش کرے گی۔ یہی وجوہ تو ہیں کہ روز عاشورہ کے مناظر میں سے ہر ایک منظر دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست!!

——— کہیں بچپن کا کوئی حبیب، ابروؤں پر پٹی باندھ کر جوانی کے تیور پیدا کرنا چاہتا ہے تو کہیں ایک بوڑھا غلام بقول خود اپنے سیاہ خون کو حق پرست آقا کے سفید خون میں ملا کر سرخروئی حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہا ہے۔

——— ایک ماں بیٹے کے کٹے ہوئے سر کو میدان جنگ کی طرف یہ سمجھ کر پھینک رہی ہے کہ راہ حق میں جو دیا اسے ہم واپس نہیں لیتے تو دوسری ماں اپنے بچوں کو نزدس موت سے ہمکنار ہونے کے لئے ہتھیاروں سے سج سجا کر میدان جنگ کی طرف بھیج رہی ہے۔

——— ایک طرف جوان بیٹا زخموں سے چور شدت عطش سے بیتاب ہو کر باپ سے پانی مانگ رہا ہے تو دوسری طرف کم سن بھتیجا مرنے کی رضا — لیکن بوڑھے مجاہد کو نہ اس پر قدرت ہے اور نہ اس کی تاب۔ چشم نظارہ ششدر ہے کہ کس منظر کو دیکھے اور کس کو نظر انداز کر دے اور عقل حیران ہے کہ کس کو بلند درجہ دے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فوج مخالف کے ایک جرأت پسند سردار کے کھلے

حر انے حسینی قافلے کی طرف شجاعانہ انداز میں بڑھے چلے آنے کا منظر زیادہ نظر فروز تھا یا کسی باوفا کا اس آنے والے کو ٹوکنے کا انداز ـــ روز عاشورہ کا وہ منظر زیادہ ہمت افزا تھا جب، ایک ایک مجسمۂ شجاعت آقا اپنے غلام سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ارادہ ہے یا وہ منظر جب ایک مجسمۂ وفا بھائی اپنے چھوٹے بھائیوں سے یہ کہہ کر راہ حق میں لڑنے مرنے کی خواہش کرتا تھا کہ بڑھو تمہارے تو بیوی بچے بھی نہیں ہیں۔ یا اسی مجاہد کے خیمے سے برآمد ہونے کا وہ منظر کہ گویا اقتدار اسلام کا خود سر پر ہے اور ملوکیت کو کچلنے والی کفش پاؤں میں۔ وفا کی زرہ بر میں ہے اور امیدوں سے بھری ہوئی بھتیجی کی مشک دوش پر جبل اللہ بہ شکل لجام فرس ہاتھ میں ہے اور اسلام کے روشن ماضی اور روشن تر مستقبل کا پرچم پہلو میں، انسانیت کو مٹانے والوں کو فی النار کرنے آقا کے دشمنوں کے دلوں کو پر درد کرنے والا نیزہ کنوتیوں کے بیچ میں ہے اور شعاع مہر کو ماند کر دینے والا نور پیشانی میں۔ اور یہ سب سمجھ میں آبھی جائے تو یہ کیسے سمجھ میں آئے کہ جوان مردوں کی لاشوں پر لاشیں اٹھا لانے کے بیسوں مناظر زیادہ صبر آزما تھے یا کسی ششماہے کی لاش کو سینے سے لگا کر خیمے کی طرف بڑھنے اور پھر ٹھہر جانے کا وہ ایک منظر۔ یا روز عاشورہ کے ہنگام عصر کا وہ منظر جب ستاون برس کے سن اور جھکی ہوئی کمر کے باوجود ایک بوڑھا مجاہد تن تنہا اعلان کلمۂ حق کر رہا تھا ـــ وہ سینۂ آج بھی بلندی سے هل من ناصر ینصرنا و هل من مغیث یغیثنا کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے!!

نہ معلوم اس بوڑھے مجاہد کی لرزتی آواز استغاثہ میں کس غضب کا زور تھا کہ اس نے بہ یک وقت دو اہل دل کو متاثر کیا۔ اس آواز کو سن کر ایک نے تو شدت تشنگی بھلا کر اپنے کو جھولے سے گرا دیا اور دوسرے نے غش سے آنکھیں کھول کر بستر بیماری پر کروٹ لی فرمایا۔

”پھوپی اماں! ذرا میری تلوار تو دیجئے“ ـــ پھوپھی نے پوچھا ”بیٹا تم اس شدت تپ میں تلوار کیا کرو گے“

بیمار نے جواب دیا ”آپ سنتی ہیں بابا آواز استغاثہ بلند فرما رہے ہیں“ ”بیٹا خوب سن رہی ہوں لیکن تمہاری منزل جہاد تو کربلا نہیں شام ہے اور تمہارا آلۂ حرب شمشیر آبدار نہیں طوق خاردار ہے!!

اس آواز استغاثہ کے بعد عرصۂ کربلا پر کچھ دیر کے لئے ایک خاموشی اور سناٹا چھا گیا جو اسی بوڑھے مجاہد کی اس آواز سے ختم ہوا۔

اے فضہ! اے زینب! اے ام کلثوم اور اے اہل خیمہ میرا آخری سلام قبول کرو، بوڑھے مجاہد نے عورتوں کو تو یوں رخصت کیا اور بیمار بیٹے سے گویا یہ کہہ کر جہاد آخر کا ارادہ کیا۔

ناؤ منجدھار میں ہے شور تلاطم ہے بپا
ناخدا جاتا ہے گھر جانے اور اب تم جانو

رہوار پاس کھڑا ہے لیکن بدن زخموں سے اس قدر چور ہے کہ گھوڑے پر چڑھنا دشوار ہے ـــ کون ہے جو سوار کرائے ـــ بوڑھا مجاہد داہنے دیکھتا ہے .... کوئی نہیں۔ بائیں دیکھتا ہے کوئی نہیں ـــ پردہ دار لیکن نباض فطرت بہن نے ضرورت و مصلحت وقت کا احساس کیا۔

سراپا پردۂ عفت و طہارت سرکا بہن نے آکر رکاب تھامی اور بھائی کو جہاد آخر کے لئے رخصت کر دیا۔

ادھر شجاع بوڑھے مجاہد نے میدان کا رخ کیا ادھر اہل دل فضا میں مختلف قسم کی آوازیں گونجتی ہوئی سنائی دیں ـــ بوڑھے مجاہد کے کانوں میں ”یا ایتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة“ کی صدا آئی ـ اور بہن اور بہن کے کانوں میں قادذ لیلاً کی آواز ـــ انہیں آوازوں میں ملی ایک کراہ بھی سنائی دیتی تھی ـــ میرے لال دیکھا ماں تیری ہمت و استقلال کے نثار!!

دوپہر کی دھوپ سر پر گزر جانے، ساتھیوں اور عزیزوں کا غم اٹھانے، باوفا بھائی کے مرنے سے کمر ٹوٹ جانے، جوان بیٹے کے ساتھ آنکھوں کی بصارت چلی جانے کے بعد بھوکے پیاسے بڈھے مجاہد میں تنہا جنگ کرنے کا حوصلہ اور نبرد آزمائی کا ولولہ

کیا ہوگا لیکن کربلا کا ذرّہ ذرّہ اور نہر فرات کی ہر موج گواہ ہے کہ جب یہ غم زدہ اور بھوکا پیاسا مجاہد تلوار لے کر حملہ آور ہوا تو گذشتہ بہادروں کے کارنامے محو ہوگئے اور تاریخ نے شجاعت و جراءت کے مظاہرے کو اپنے دامن میں ابدالآباد تک کے لئے محفوظ کر لیا۔ ستم شعاروں نے الاماں و الحفیظ کی آوازیں بلند کرنا شروع کر دیں۔

—— شریف النفس مجاہد کو رحم آگیا اور تلوار میان میں رکھ لی لیکن ادھر ظلم نے زور پکڑا۔ تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینہ برسنے لگا اور بوڑھا مجاہد سیکڑوں زخم کھا کر گھوڑے سے زمین پر گر پڑا۔ ایک شقی خنجر بکف میدان سے اور ایک ننھا کمسن بچہ ماں کے روکنے کے باوجود خیمے سے اس زخمی کی طرف دوڑے۔ قریب پہونچکر بچے نے للکارا "خبردار جو میرے چچا کو قتل کیا"، کھنچی ہوئی تلوار نہتے بچے کے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر پڑی ہاتھ جھول گیا اور بچہ چچا کی گود میں جا رہا۔ چچا نے بھتیجے کو سینے سے لگایا منہ پر منہ رکھا — اور ابھی شجاعت و شفقت کا یہ منظر ادھورا ہی تھا ایک تیر نے چچا کی گود میں اس بچے کا کام تمام کر دیا۔ بوڑھے مجاہد نے بھتیجے کے تارِ نفس کو ٹوٹتے دیکھا مگر رشتۂ صبر کو ٹوٹنے نہ دیا۔ اس عاشق جانباز نے خون آلودہ چہرہ آسمان کی طرف بلند کر کے خدا کو گواہ قرار دیا اور پھر زخمی پیشانی کو زمین گرم پر رکھ کر نماز عصر کا آخری سجدۂ شکر ادا کیا۔
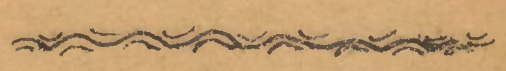
اس منظر کو گزرتے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ "قتل الحسین بکربلا و ذبح الحسین بکربلا" کی آوازیں فضا میں بلند ہوگئیں ان آوازوں کے ساتھ ساتھ اہل حرم کے دل بھی ہل گئے اور شاید یہ صدائیں کانوں میں دیر تک گونجا کرتیں اگر لاشہائے شہدا کو پامال کرنے والے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں نے انھیں دبا نہ دیا ہوتا۔ لیکن ابھی ظالم کے ترکش کے سب تیر ختم نہیں ہوئے تھے یعنی آتش زنی خیموں کا لوٹنا اور چادروں کا چھننا۔ پھر جب کوئی روکنے والا بھی نہ ہو تو بہیمیت کا زور جس قدر بھی نہ ہو کم ہے۔

دیکھ آئے عدو بے ادبانہ ہوئے داخل
گھر فاطمہ کا بن گیا بازار حسینا!!

جب تک بس چلا ایک جلے خیمے کے بعد دوسرے خیمہ میں عورتوں اور بچوں نے پناہ لی اور جب نوبت آخری خیمے کی بھی آگئی تو بیمار بھتیجے کے پاس غم زدہ پھوپی نے جا کر پوچھا "بیٹا کیا حکم ہے جل کر مر جائیں یا خیموں سے باہر نکل جائیں۔ امام وقت نے فرمایا "پھوپی یہ آتش زنی دربدری کا پیش خیمہ ہے۔ بالوں سے منہ چھپا لیجئے اور ہلاکت سے جان بچا لیجئے۔"!

بے پردہ عورتوں اور طمانچوں سے زخمی اور خوف زدہ بچوں کے شیون و شین سے فضا گونج اٹھی خیموں سے شعلے اٹھ رہے تھے آفتاب غائب ہو کر تمام غریباں کی آمد کی خبر دے رہا تھا اور بیمار کے ذہن میں ہلال کے تصور کے ساتھ ہی طوق اسیری کا منظر سامنے آگیا۔

(محرم نمبر ۱۳۷۱ھ)

ہندوستان کے غیر معروف آثار متبرکہ

(سید اختر حسین رضوی جرنلسٹ)

شاہی امام باڑہ بیجاپور

بیجاپور میں بُرید شاہی دور کا شاہی جامع مسجد کے قریب اور جلوخانہ شاہی (جس میں آجکل کلکٹری آفس ہے) کے پہلو میں ایک بہت وسیع تین دالانوں پر مشتمل یہ شاہی امام باڑہ بحیثیت آثار قدیمہ موجود ہے جس میں اسی زمانہ کے برنجی علم اور زرنگار پٹکے موجود ہیں

اس امام باڑہ کی نگرانی منجانب محکمہ آثار قدیمہ ہوتی ہے عود وگل کے لیے کچھ رقم محکمہ سے دی جاتی ہے امام باڑہ کے پہلے دالان میں جہاں علم نصب ہیں ایک گوشہ میں چمکدار پتھر کا ایک کتبہ موجود ہے جو فن خطاطی کا نادر الوجود نمونہ ہے۔ اس کتبہ میں یہ خوبی ہے کہ اگر اس کو داہنی جانب سے پڑھیے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا جاتا ہے، اور بائیں جانب سے داہنی طرف پڑھیے تو اسمائے پنجتن پاک لکھے ہوئے ہیں اور اگر اوپر سے نیچے کی طرف پڑھیے تو نادعلی ہے اور نیچے سے اوپر کی جانب پڑھیے تو پورا سورۂ اخلاص ہے۔

شاہی امام باڑہ حیدرآباد

یہ عاشور خانہ شاہان قطبیہ کے دورِ حکومت کی یادگار ہے جو شہر کے مرکزی بازار (پتھر گٹی) میں ایک احاطہ کے اندر مدینہ بلڈنگ کے سامنے واقع ہے، یہ امام باڑہ شاہان گولکنڈہ میں سے علی قطب شاہ نامی بادشاہ کا بنوایا ہوا ہے۔ اصل امام باڑہ چوبی نقشی کھمبوں کے دالانوں پر مشتمل ہے پورا امام باڑہ سبز رنگ سے رنگا ہوا ہے، پہلے دالان میں قدیم طلائی اور برنجی آمیزش کے علم اور زربفت کے پٹکوں سے آراستہ نصب ہیں دوسرے دالان میں ایک چوبی نقشی ممبر رکھا ہے، اس دالان کے بعد تھوڑا سا صحن ہے جس میں ایک حوض بنا ہوا ہے، احاطہ میں حوض کے قریب اس کافوری شمع کی جگہ اب تک بنی ہوئی موجود ہے جو مثل ستون کے کھڑی کی جاتی تھی اور جس کی روشنی سے تمام امام باڑہ روشن ہو جاتا تھا، امام باڑہ کے سامنے احاطہ کے آخری سرے پر جلوخانہ بنا ہوا ہے جہاں بادشاہ سوگواری کا لباس پہنے ہوئے ننگے سر اور ننگے پاؤں جلوس ۱۰۶ ملاحظہ کیا کرتا تھا، احاطہ کے اندرونی رُخ کی ہر دیوار پر دس دس قطاریں طاقوں کی بنی ہوئی ہیں، جس کو روشن کر کے اس زمانہ میں تاریخ بتائی جاتی تھی — مثلاً پہلی تاریخ کو پہلی قطار روشن کی جاتی تھی اور دوسری تاریخ کو دو قطاریں روشن کی جاتی تھیں، اسی طرح عاشور کی شام کو کل قطاریں روشن کر دی جاتی تھیں، پہلے یہ امام باڑہ محکمہ امور مذہبی کے تحت تھا اب چونکہ محکمہ امور مذہبی توڑ دیا گیا ہے اس لیے اب محکمہ آثار قدیمہ حکومت حیدرآباد کے زیر نگرانی ہے،

کوہ مولا علی سرونج

قصبہ سرونج جو ریاست ٹونک کا علاقہ ہے اور جنوبی مالوہ میں واقع ہے، قصبہ کے قریب ندی کے کنارے ایک پہاڑی پر شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی مولا علی کی درگاہ موجود ہے۔ جو ایک بہت وسیع سنگی چہار دیواری کے اندر واقع ہے، احاطہ کے پہلے حصہ میں ایک نقارخانہ بنا ہوا ہے جس میں عالمگیر اورنگ زیب کے نذر کیے ہوئے دو نقارے اب تک موجود ہیں۔ احاطہ کے دوسرے حصہ میں چہار دیواری کے اندر ایک طرف چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے۔ اسی مسجد کے صحن میں ایک حوض بنا ہوا ہے جس کے اندر چنبیلی کا ایک درخت لگا ہوا ہے جس میں بہت بڑے اور تیز خوشبو کے سرخی لیے ہوئے سفید پھول کھلتے ہیں (میں نے آجتک چنبیلی کا اتنا بڑا پھول نہیں دیکھا) یہی حوض درگاہ کہلاتا ہے اور اسی درخت میں زائرین اور

حاجتمند اپنی اپنی عرضیاں یا چلے باندھ دیتے ہیں۔ اسی مسجد کے ایک گوشہ میں چار دیواری کے اندر روضۂ جناب خاتون جنت کی شبیہ بھی بنی ہوئی ہے، شیر شاہ سوری کے زمانہ سے آج تک اس درگاہ کے متعلق کچھ معافیات ہیں اور موجودہ نواب صاحب ٹونک اس درگاہ کے متولی ہیں۔ ہر نوچندی جمعرات کو مقامی مومنین اور بوہیر حضرات نذر و نیاز کرتے ہیں، تمام مسلمانوں کی جانب سے رمضان میں عرس ہوتا ہے جس میں گرد و نواح کے مسلمان کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں،

اس درگاہ کی قائمی کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز شیر شاہ سوری مالوہ میں فتوحات کرتا ہوا اس طرف سے گذرا تو اس کو اس پہاڑی نالہ کے اندر (جو اب بھی قصبہ کے باہر موجود ہے) ایک بزرگ بیٹھے ہوئے ملے جیسے ہی اُن بزرگ کو پاؤں کی چاپ معلوم ہوئی تو اُنھوں نے شیر شاہ کا نام لیکر کہا کہ میں تیرے ہی انتظار میں بیٹھا ہوں تو سب سے پہلے ندی کے کنارے جو پہاڑی ہے اس پر مولا علیؑ کی درگاہ بنوا دے اور میرے پاس جو تبرکات ہیں ان کو اسی درگاہ میں رکھ دے (اب ان تبرکات کا پتہ نہیں ہے) اور اس کے بعد تین دن کے اندر اس مقام کو آباد کر دے۔ چنانچہ شیر شاہ نے تعمیل حکم کی اور آبادی کا نام "سہ روزہ" رکھا جو کثرت استعمال سے اب "سرونج" کے نام سے پکاری جاتی ہے، ندی کے دوسرے کنارے پر آبادی کے اندر انھیں بزرگ کا مزار ہے۔ بزرگ کا نام یاد نہیں رہا"

کوہ مولا علیؑ حیدرآباد

بیان کیا جاتا ہے کہ جس زمانہ میں علی قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ اپنی محبوبہ بھاگ متی کی خواہش پر شہر حیدرآباد کی تعمیر کرا رہا تھا اسی زمانہ میں عراق سے کوئی سید صاحب یا مجتہد صاحب خاک شفا کا بنا ہوا ایک پنجہ لیکر وارد ہوئے، جیسے ہی بادشاہ کو اطلاع ملی اس نے اپنے تمام ارکین دولت کے ساتھ شہر سے باہر دو فرسخ کے فاصلہ پر جا کر اس پنجۂ مبارک کا استقبال کیا اور اپنے سر پر رکھ کر اسکو اسی پہاڑی پر لایا جس کو کوہ علی مولا کہتے ہیں۔ اور رجب تک وہاں ایک حجرہ بنوا کر علم کو نصب نہیں کر دیا اس وقت تک تمام ارکین سمیت اسی پہاڑی پر مقیم رہا۔

اسی پہاڑی شریف کی مناسبت سے اس نے بجائے بھاگ پور کے نو تعمیر شہر کا نام حیدرآباد رکھا۔ یہ پہاڑی شہر سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر ہے۔ پہاڑی کے قریب ہی "مولا علیؑ" کے نام سے ایک ریلوے اسٹیشن بھی نظام ریلوے کا موجود ہے ہر سال ۱۳ رجب کو مومنین شہر کا اجتماع ہوتا ہے، دوکانیں سجائی جاتی ہیں اور سہ پہر کو خود اعلیٰ حضرت شہر یار دکن مع ارکین پہاڑی پر تشریف لاتے ہیں اور زر نگار منقش سہرا اور نذر چڑھاتے ہیں اس پہاڑی کے گرد و نواح میں شہر کے شیعہ رؤسا، جاگیردار اور اُمرا کے مکانات بنے ہوئے ہیں، اسی درگاہ کے صحن میں جناب سید علی صاحب شوستری کی قبر بھی ہے جو اعلیٰ حضرت کے اتالیق بھی تھے اور خود بھی بہت بڑے فقیہ اور عامل تھے،

درگاہ مولا علیؑ جوگی پورہ

گو یہ درگاہ عالیہ بہت کچھ مشہور و معروف ہو چکی ہے لیکن ایسے بہت کم حضرات ہوں گے جو اس کی وجہ تسمیہ سے واقف ہوں، میں سید علی کوثر صاحب چاند پوری مرحوم کی ایک مطبوعہ کتاب سے اس واقعہ کو نقل کرتا ہوں جو مرحوم نے ۱۹۱۳ء میں طبع کرائی تھی وہ لکھتے ہیں کہ سید راجو صاحب بانی درگاہ شہنشاہ اکبر کی فوج میں کسی نہ کسی عہدہ پر ملازم تھے۔ جب جہانگیر (جو اس وقت ولیعہد تھا) کا سید صاحب پر کسی وجہ سے عتاب نازل ہوا تو یہ بیچارے بے سر و سامانی کی عالم میں سخت گرمی اور لوؤں میں پیدل سفر کرتے ہوئے جوگی پورہ پہونچے یہ مقام اس وقت جوگیوں کا مسکن تھا، جوگیوں کے سردار کو جب واقعات معلوم ہوئے تو اس نے سید صاحب کو یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ جب تک ہم میں ایک آدمی بھی زندہ ہے، آپ کو کوئی گرفتار نہیں کر سکتا، سردار نے اپنے مکان کے بالائی حصہ میں آپ کو ٹھہرایا جس

مقام پر درگاہ واقع ہے یہ اسوقت ایک بہت بڑا گھنا جنگل تھا جس میں ڈاکو اور درندے اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے سید صاحب کا معمول تھا کہ وہ بعد نماز صبح وظیفہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس جنگل کے پاس آتے تھے اور تین مرتبہ "یا علی ادرکنی" بلند آواز سے کہتے تھے، جوگیوں کے سردار نے بھی قریب گاؤں کے ایک گھسیارے کو مقرر کر دیا تھا کہ وہ دہلی کی طرف سے اگر کسی فوجی دستہ یا سوار کو آتے ہوئے دیکھے تو فوراً اطلاع کرے۔ غرضیکہ قریب قریب ایک ہفتہ اسی صورت سے گذرا کہ اسی جنگل کے قریب گھسیارے کو ایک جرار فوج آتی ہوئی نظر پڑی، یہ دیکھ کر گھسیارے نے کوشش کی کہ میں سید صاحب کو مطلع کر دوں کہ اس لشکر سے ایک سوار بڑھا اور اس گھسیارے سے کہا کہ چلو تمھیں ہمارے سردار بلاتے ہیں گھسیارا یہ سُن کر ڈرا سوار نے اسکو تسلی دی اور اپنے ساتھ لشکر میں لے گیا۔ گھسیارہ کا بیان ہے کہ مجھے ایک بلند قامت گھوڑے کے سامنے لیجا کر کھڑا کر دیا جسپر ایک شخص نقاب ڈالے ہوئے سوار تھا۔ نقاب پوش کے چہرے سے ایسی تیز روشنی نکل رہی تھی جس سے سارا جنگل روشن ہو رہا تھا، اس نقاب پوش کو دیکھ کر مجھپر ایسی ہیبت چھائی کہ میں اپنی گردن جھکائے رہا، جس مقام پر درگاہ کے اندر گھوڑے کے سم بنے ہوئے ہیں اسی مقام پر گھوڑا کھڑا ہوا تھا، اور اس کے دہن سے کف نکل رہا تھا۔ نقاب پوش نے کہا کہ تمھاری بستی میں سید را جو رہتا ہے اسکو ہمارے آنے کی اطلاع کر دو۔ گھسیارے نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید یہ شاہی لشکر ہے، جو سید صاحب کو گرفتار کرنے آیا ہے۔ سید صاحب کی موجودگی سے انکار کیا۔ نقاب پوش بزرگ نے کہا کہ ہم اُن کے دشمن نہیں ہیں بلکہ — دوست ہیں۔ لہٰذا تم جا کر اُن سے کہو کہ تم جس کو روز جنگل میں پکارا کرتے ہو وہ آیا ہے اور تم کو تنہا بلایا ہے۔

گھسیارہ یہ سُن کر دوڑا، ابھی کچھ ہی فاصلہ پر گیا ہوگا کہ اس کو واپس بلایا گیا اور نقاب پوش بزرگ نے فرمایا کہ ہم کو معلوم ہے کہ وہ تنہا نہیں آسکے گا۔ اس لیے ہم سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ سید سے کہنا کہ یہاں ہماری آمد کی یادگار قائم کر دے۔ چنانچہ جب سید صاحب کو اس کی اطلاع ملی تو وہ شوق زیارت میں بے تحاشا جنگل کی طرف دوڑے، جوگیوں نے بھاگنے کی وجہ پوچھی تو سید صاحب نے کچھ نہ بتایا اور بھاگتے ہی چلے گئے۔ جوگی بھی بپاس میزبانی ان کے پیچھے چلے۔ بہت کچھ ان لوگوں نے روکا، لیکن وہ نہ مانے۔ غرضکہ یہ کل مجمع اس مقام پر پہونچا جہاں گھسیارے نے نشاندہی کی تھی تو وہاں سید صاحب کو سوائے گھوڑے کے تازہ کف اور سموں کے نشان کے اور کچھ نہ ملا۔ آخرکار سید صاحب نے اس کو چوما چاٹا اور مقام درگاہ پر ایک خام چبوترہ بنوا دیا اور اسکی مجاوری کرنے لگے۔ جب عتاب شاہی ہٹا تو سید صاحب نے شہنشاہ اکبر سے اس واقعہ کا ذکر کیا بادشاہ خود اس مقام پر آکر زیارت سے شرفیاب ہوا اور اس درگاہ عالیہ کیلیے ایک بہت بڑی آراضی وقف کی جو آج تک سید صاحب کے خاندان کے قبضہ میں ہے۔ جب سید صاحب کا انتقال ہوگیا تو ان کی اولاد نے اس چبوترہ کو پختہ کرا دیا بعد میں اس مقام پر درگاہ تعمیر ہوئی اور اسی کے ساتھ ایک مسجد اور مختصر سا مسافر خانہ تھا،

چاند سلطانہ کا امام باڑہ

احمد نگر میں نظام شاہی دور کا ایک قلعہ موجود ہے جسمیں عام طور سے جانے کی ممانعت ہے بلکہ ضرورت کے وقت اس سے جیل خانہ یا فوجی ہیڈ کوارٹر کا کام لیا جاتا ہے نہیں کہا جا سکتا کہ اس قلعہ کے اندر کوئی ایسی عمارت ہے، جو امام باڑہ کہی جا سکے، البتہ شہری آبادی سے ۵ میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی پر چاند سلطانہ کا مقبرہ بنا ہوا ہے جس کے مشرقی جانب میں ہر چہار دیواری پر برج کے علم بنے ہوئے ہیں۔ اس کے سوا اور وہاں کوئی سامان ایسا دیکھنے میں نہیں آیا جس سے یہ کہا جا سکے کہ وہاں اب بھی ایام عزا میں مجلس یا تعزیہ داری ہوتی ہے،

(محرم نمبر سنہ ۱۳۷۱ھ)

خدا مجھے معاف کرے مگر میں یہ عرض کرنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ واقعہ کربلا اسلام اور مسلمانوں کی روشن تاریخ کا ایک سیاہ ورق اور اسلام کے صاف دامن پر اک بدنما داغ ہے، ذرا خیال تو فرمائیے کہ ایک سب سے قوی التاثیر اور کامیاب ترین رسولؐ کو دنیا سے گئے ہوئے مشکل سے نصف صدی گذرتی ہے کہ اس کی محبوب ترین صاحبزادیؑ کے صاحبزادے جو حقیقتاً اور عرفاً اسی رسولِ مقدس کی اولاد، فرزند اور جانشین کہلاتے ہیں کس اخلاقی۔ نعوذ باللہ یا سیاسی جرم پر اپنے صغیر السن بچوں کے ساتھ شدید ترین بے دردی سے شہید نہیں بلکہ مثلہ کئے جاتے ہیں۔ ان کا جرم صرف اس قدر ہے کہ تم اس گھر کے چشم و چراغ ہو جس سے اس رسول کا مذہب نکلا جس کا اور پھیلا۔ بے دینی اور مکابرہ شئے آخر ہے مگر للہ مجھے انصاف سے بتائیے میرے آقا اور سید سیدنا حسینؑ سے اس دور میں سوائے ترقی اسلام اور تقویت حق کے اور کس چیز کا خطرہ تھا اور اس مقصد پر ان کا جماعت کے ہاتھوں تباہ ہونا جو اپنے کو انکے نانا کا کلمہ گو اور ان کے گھر سے ترقی پانے والے دین کا پیرو کہتے تھے مسلمانوں کے لئے کس قدر عبرتناک اور شرمناک ہے یہی تخیل تھا جو اوائل عہد طالبعلمی میں اس واقعہ کے ذکر و اشاعت سے مجھے روکا کرتا تھا اور میں اس ذکر مقدس کو غیر ضروری بلکہ ایک اقرار جرم کے مرادف سمجھتا تھا لیکن برکات ہدایات یا اس مقدس جماعت کی کرامت یا خود واقعہ کی غیر فانی قدوسیت کا یہ کرشمہ سمجھیے کہ آج میں اس واقعہ کی یاد کو مریض اسلام کے لئے دم عیسوی سمجھتا اور یقین کرتا ہوں میرا ایمان ہے بلکہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ پر ہر ایمان رکھنے والے کا یہ ایمان ہے کہ شب و روز خلوت و جلوت، نوم و یقظہ بلکہ ہر حالت میں رسول اسلام صلوات اللہ علیہ و آلہ کا ہر عمل ہر حرکت بلکہ ہر ادا ہدایتوں کا وہ بیش قیمت خزانہ اپنے اندر رکھتی ہے جو دنیا کی بڑی سی بڑی راہ نمائی اور ارشاد میں نہیں، بعینہ یہی حال اس محترم اور پاکیزہ جماعت کا ہے جس نے مشکوۃ نبوت سے اپنے قلوب کو منور کر لیا تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ اسی سانچہ میں ڈھل گئے تھے اس لئے سیدنا و امامنا حضرت حسین لخت جگر رسولؐ و فرزند بتولؑ صلوات اللہ علیہم کی مبارک زندگی تو تھی ہی آپ کی شہادت آپ کے جسد اطہر کی پامالی آپ کے سر مبارک کی بے حرمتی ایک برگزیدہ اور برگزیدہ ترین خاندان کی بے عزتی اور آپ کے بے قصور صاحبزادوں بھتیجوں بھانجوں، بھائی اور اہل خاندان اور رفیقوں کی توہین اور اذیتیں۔ قسم اس ذات کی جو سب سے بڑا منتقم اور سب سے بڑا اجر دینے والا ہے ان برکات ہدایات، دفتر ہائے پند و موعظہ کی حامل ہے جو دنیا کے کسی واقعہ میں نہیں مل سکتا۔

آج کی پولیٹکل دنیا ان برکات و موعظہ کی عجیب اور پر لطف تفصیل کرتی ہے۔ کوئی آپ کی قربانی کو ذبح عظیم کہتا ہے کوئی کہتا ہے کہ اس قربانی میں حفاظت حقوق کی اسپرٹ کام کر رہی تھی کوئی آپ کو نان کو آپریشن کا مبلغ و معظم کہتا ہے کوئی کہتا ہے کہ ان شدائد اور مظالم کو انگیز کر لینا محض خلافت کی روحانی عظمت اور اس کی اصلی شان کے تحفظ کے لئے تھا۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین نگاہ تو ز داماں گلہ دارد

کے اصول پر ان گلچینوں کے پھولوں کی خوشبو سے انکار نہ کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں، ہاں کربلا کے میدان میں جو باغ ان مقدس خونوں سے سینچا گیا تھا اس میں یہ بھی پھول ہیں لیکن میرے رسولؐ کا پارہ جگر اور اپنے وقت کا جانشین رسولؐ کوئی پولیٹیکل لیڈر نہ تھا کہ اس سے محض سیاسی منافع ہوں بلکہ میرے خیال میں اس مقدس واقعہ کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ وہ انا اعطینٰک الکوثر فصل لربک وانحر ان شانئک ھو الابتر کی روشن ترین تفسیر تھا۔ ناظرین واقف ہیں کہ آنحضرت سرور عالمؐ کے صاحبزادوں کے مسلسل انتقال پر کافروں میں شادیانے بجنے لگے اور ہر طرف چرچے ہونے لگے کہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیوا کون ہے ان کا نام مٹا جاتا ہے یہ اب ابتر (نکھٹو) ہو گئے ان کا فاتحہ درود کون کرے گا، لیکن خدا نے فرمایا تم کو کثرت اجر اور حوض کوثر اور کثرت اولاد دی ہے تمہارے بدگو ہی ابتر ہیں۔ خدا نے یہی چیز آنحضرتؐ کے مظہر میں بھی رکھی تھی۔

کل سنہ ۶۱ھ میں جب ابن سعد کی جماعت کے تیر و خنجر پوری قوت اور ہمت سے کام کر رہے تھے اس وقت کس کو یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ اس پامال قافلہ کا نام لیوا کون رہے گا اب نعوذ باللہ حسینؑ اور ان کا خاندان ہمیشہ کے لئے ختم ہوا جاتا ہے لیکن قدرت کا کرشمہ دیکھو کہ حسینؑ اس زندگی سے قوی حیات رکھتے ہیں اور رکھیں گے۔ قیامت اور قیامت تک زندہ رہیں گے لیکن بتاؤ آج یزید کا نام لیوا کون ہے شمر ذی الجوشن کے خلف کہاں ہیں، ابن سعد کی قبر پر چراغ جلانے والا کدھر ہے، اور خولی کا فاتحہ درود کرنے والا کس دنیا میں ہے، نہیں ہے اور قسم برب حی قیوم نہیں ہے۔ کیا اتفاق ہے کہ سیکڑوں آدمی جو ظاہر میں، مٹنے اور شکست کھانے والے حسین علیہ السلام کی نسل میں نہیں ہیں وہ اپنا شرف و وقار بڑھانے کے لئے جھوٹ موٹ اپنے کو سید کہدیتے ہیں اور بہت لوگ جو حقیقت میں یزید، ابن سعد اور شمر خارج شمر کی اولاد میں ہیں اپنے جد اکبر کا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ کی شکست فتح عظیم اور یزید کی فتح شکست عظیم تھی۔ پس آج جو لوگ اس دردناک واقعہ کو یاد کر کے روتے ہیں وہ کسی میت پر بین نہیں کرتے بلکہ اپنے زندہ آقا کے تصور سے اپنے قلب میں والہانہ اور فدایانہ جذبات پیدا کرتے ہیں تو کتنا پاک ہے یہ جذبہ اور کتنی مقدس ہے یہ شیفتگی۔

سرفراز محرم نمبر
۱۳۴۵ھ

قطب شاہی عہد کی عزاداری

ایک مورّخ کا چشم دید بیان

(پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے (سابق) صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونی ورسٹی)

دکن میں قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں نے ۹۱۶ھ سے ۱۰۹۸ھ تک فرمانروائی کی، اس خانوادہ جلیلہ کے تمام بادشاہ اہلبیتؑ اطہار سے نہایت عقیدت اور عزاداری سید الشہداؑ میں بہت انہماک رکھتے تھے۔ اس سلسلہ کے ایک بادشاہ یعنی محمد قلی قطب شاہ جس کا عہد حکومت ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک رہا۔ بعض مورّخین کا خیال ہے کہ وہ مذہباً اپنے اسلاف و اخلاف کے طریقہ پر نہ تھا لیکن وہ بھی عزاداری میں کسی سے کم نہ تھا۔ اسی بادشاہ نے مشہد مقدس کے نمونہ پر شہر حیدرآباد آباد کیا اور روضہ امام رضاؑ علیہ السلام کی جگہ پر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کروائی جو اب تک موجود، اور چار مینار کے نام سے مشہور ہے۔ چند سال ہوئے راقم حروف کو حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا تو اس عمارت کے اندر بہت بلندی پر علموں کی تصویریں بنی ہوئی دیکھکر یہ خیال گذرا تھا کہ یہ عمارت بھی عہد قطب شاہی کی عزاداری سے کچھ تعلق رکھتی ہے۔ قطب شاہی سلسلہ کا ساتواں بادشاہ عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵-۱۰۸۳ھ عزاداری میں بیحد شغف رکھتا تھا۔ تاریخ حدیقۃ السلاطین کا مصنف میرزا نظام الدین احمد شیرازی اس بادشاہ کے زمانہ میں حیدرآباد میں موجود تھا۔ اس نے ایام عاشورا میں عزاداری کی جو کیفیت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اس کا مفصل بیان اپنی مذکورہ کتاب میں لکھا ہے، اس کا بیان فارسی زبان میں ہے ذیل کے مضمون میں وہی بیان زوائد کو حذف کرکے اردو میں پیش کیا گیا ہے۔

عشرۂ محرم میں بادشاہ تخت سلطنت پر جلوس نہیں کرتا، تاج شاہی سر پر نہیں رکھتا، لباس شہریاری کی جگہ لباس سوگواری پہن لیتا ہے۔ نشاط اور انبساط کی بساط اُلٹ دیتا ہے اور عیش و عشرت کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ تمام ممالک محروسہ میں حکم شاہی صادر ہو جاتا ہے کہ نقارخانہ خاموش، گانا بجانا موقوف، گوشت ممنوع، پان متروک حجاموں اور حمامیوں کا کاروبار معطل، تاڑی، سیندھی، بھنگ وغیرہ کی دکانیں بند، مختصر یہ کہ تمام جائز تکلفات اور مباح لذات بھی ممنوع ہو جاتے ہیں۔ ممالک محروسہ میں کوئی مقام اور کسی طبقے اور کسی مذہب کا کوئی شخص ان احکام سے مستثنیٰ نہیں۔ شاہی جامدارخانہ سے کالے اور نیلے رنگ کے جوڑے، کپڑے، اور سبز اور سیاہ عصا امیروں وزیروں درباریوں، ملازموں، ذاکروں اور مدّاحوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ دو عظیم الشان شاہی امامباڑے ہیں، ایک دولت خانہ کے اندر اور دوسرا دارالسلطنت کی بازار میں، انکی دیواروں پر رنگ رنگ کاشی کاری سے ائمہ اثنا عشر کی دعائیں لکھی ہوئی ہیں۔ عشرۂ محرم میں ان دونوں وسیع عمارتوں کے صحن میں سبز اور سیاہ بانات کا فرش بچھایا جاتا ہے اور چھتوں میں نیلے رنگ کی مخمل اور اطلس کی چھت گیریاں لگائی جاتی ہیں۔ دونوں جگہ چہاردہ معصومین علیہم السلام کے نام کے چودہ علم کھڑے کیے جاتے ہیں، جن کے فولادی پنجوں پر سونے چاندی کا کام بناتے ہیں۔ ماہر صناعوں

نے اپنی صنعت کا کمال دکھایا ہے۔ ان علموں پر چودہ چودہ گز کے زربفتی پھریرے چڑھے ہوئے ہیں؛ جن پر باکمال شعربافوں نے سورۂ قرآنی اور ادعیہ ماثورہ بڑی خوبصورتی سے بُنے ہیں۔ ان دونوں امام باڑوں کی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے طاقوں کی دس دس قطاریں ہیں، اور ہر طاق پر چراغ رکھنے کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ محرم کی پہلی شب میں سب سے نیچے والی قطار روشن کی جاتی ہے، دوسری شب کو دو قطاریں تیسری شب کو تین، اسی طرح ہر شب کو ایک قطار بڑھا دی جاتی ہے، یہاں تک کہ دسویں شب کو دسوں قطاریں روشن کی جاتی ہیں۔ ان چراغوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ پیتل کے بڑے بڑے جھاڑ ایوانوں کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ ایک ایک جھاڑ میں سو سو اور دو دو سو شمعیں اور چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ایوانوں پر اور اس کے حوض کے گرد آدمی کے قد سے بڑی کافوری شمعیں، ہر شب کو روشن کی جاتی ہیں۔ شہدائے کربلاؑ کے سیاہ پوش عزادار صبح و شام ان امامباڑوں میں جمع ہوتے ہیں، خوش الحان ذاکر غمگین آواز سے دردناک مرثیے پڑھ کر عزاداروں اور ماتمیوں کو رُلاتے ہیں۔ اور مدّاح ائمہ معصومینؑ کے فضائل اور اعدائے دین کے مطاعن غم انگیز لہجہ میں پڑھتے ہیں۔ عصر کے وقت بادشاہ سلامت۔ (سلطان عبداللہ قطب شاہ) بنفشی لباس پہنے ہوئے قصر داد محل سے برآمد ہوتے ہیں۔ اور نہایت نرم رفتار گھوڑے پر یا سیاہ اطلس، یا مخمل کے سنگھاسن پر جو ایام عاشورہ کے لیے مخصوص ہے سوار ہو کر امام باڑے کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ امراء، وزراء، اہل دربار اور مختلف درجوں کے ملازمین سب کے سب سیاہ پوش شاہی سواری کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور سنگھاسن کے داہنے بائیں دو خوش آواز مدّاح بادشاہ کے تصنیف کیے ہوئے مرثیے پڑھتے چلتے ہیں۔ امام باڑے کے پھاٹک پر پہونچکر۔ بادشاہ سواری سے اتر پڑتے ہیں اور جس ایوان میں علم کھڑے ہوتے ہیں اُس میں پا برہنہ داخل ہوتے ہیں، اور علموں پر پھولوں کے ہار ہاتھ سے چڑھاتے ہیں۔ شام کے وقت ایوانوں کے سامنے والی کافوری شمعیں اور چراغ بھی دست مبارک سے روشن کرتے ہیں۔ اُس وقت ذاکر مرثیہ خوانی میں اور مدّاح فضائل ائمہؑ پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جب پھول چڑھانے اور چراغ روشن کرنے سے فراغت ہوتی ہے تو ایک فصیح البیان خطیب خدّام شاہی کی صفوں کے سامنے کھڑا ہو کر ارواح شہدا کی ترویح، ثواب عزا کی تحصیل اور سلطنت بادشاہ کی بقا کے لیے بلند آواز اور دلپسند عبارت میں فاتحہ پڑھتا ہے۔ اس کے بعد حضرت اعلیٰ اس کار خیر کی توفیق حاصل ہونے پر سجدۂ شکر ادا کر کے قصر شاہی کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ تمام اہل مجلس، امراء اور خدّام شاہی امام باڑے میں ٹھیرے رہتے ہیں؛ اور واقعات کربلا اور مصائب سید الشہداء کو سنکر خون کے آنسو روتے ہیں۔ مراسم عزا ختم ہونے کے بعد، کندوری تقسیم ہوتی ہے۔ جس میں گوشت کے علاوہ طرح طرح کے پُر تکلف کھانے ہوتے ہیں، ہر شخص کو ایک طشتری میں گوٹا پیش کیا جاتا ہے، جو لونگ، الائچی، مصری، قند اور دیگر خوش ذائقہ اشیاء سے بنتا ہے، اور پان کی جگہ پر کھایا جاتا ہے۔ مصری، قند اور گلاب کا شربت پیالوں میں بھر کر بڑے بڑے خوانوں میں رکھکر مجلس میں لاتے ہیں اور تمام اہل مجلس تک مکرر پہونچاتے ہیں، ذاکر اور مدّاح باری باری سے ذکر کرتے ہیں اور مدح پڑھتے ہیں۔ اسی طرح نصف شب تک مجلس عزا اور ماتم کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ جو امام باڑہ دولت خانۂ شاہی کے باہر ہے اس کا انتظام کوتوال شہر کے سپرد ہے، وہاں بھی عزاداری کے اوّل سب مراسم اسی طرح بجا لائے جاتے ہیں۔ اس امام باڑے میں بھی بڑا مجمع ہوتا ہے اور سپاہی، تاجر، اہل شہر، خاص و عام سب جمع ہوتے ہیں۔ یہاں بھی لوگوں کو سیاہ لباس تقسیم کیے جاتے ہیں، اور کندوری اور گوٹا اسی طرح دیا جاتا ہے۔ اس امامباڑے کے تمام اخراجات اور تکلفات بھی بادشاہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی آدھی رات تک لوگ مراسم عزا و ماتم بجا لاتے ہیں اور مرثیہ مدح اور روضۃ الشہداء پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں۔ دار السلطنت اور گرد و نواح میں تین چالیس جگہ مثلاً قصبہ حیات آباد، کلثوم پور، بالاپور، خیریت آباد، لنگر فیض اثر فیل خانہ طویلہ وغیرہ میں بادشاہ کے اعزا، اقرباء، اور متوسلین ایام عاشورا میں

عزاداری کرتے ہیں ان سب امام باڑوں کے تمام ضروریات اور تکلفات کا سامان سرکار کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

محرم کی چھٹی شب کو دولت خانہ کے باہر والے امامباڑے سے کوتوال شہر کے زیر اہتمام علم اٹھتے ہیں اور داد محل کے میدان میں آتے ہیں۔ اسوقت راستہ کی بازاروں میں' اور میدان کے چاروں طرف چراغاں ہوتا ہے۔ تابوت اور تعزیہ نہایت زیب و زینت کے ساتھ اٹھائے جاتے ہیں؛ ان پر طرح طرح کی پر تکلف نقاشی ہوتی ہے' اور اُن کے اندر باہر بہت سی شمعیں روشن ہوتی ہیں۔ لکڑی کے بڑے بڑے جھاڑ اور طرح طرح کی جسیم شکلیں بنا کر ان میں بھی خوب چراغاں کیا جاتا ہے۔ بہت سے فانوس اور بے شمار مشعلیں علموں کے آگے آگے ہوتی ہیں۔ عربوں' ایرانیوں' شیعوں اور محبتوں کی ایک کثیر جماعت دو رویہ شمعیں ہاتھوں میں لیے ہوئے اور درمیان میں ذاکر اور مداح مرثیہ اور مدح پڑھتے ہوئے چلتے ہیں' یہ جلوس آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔ اور داد محل کے قریب پہونچ کر میدان میں ٹھہر جاتا ہے اس طرح کہ میدان کے چاروں طرف چراغاں' بیچ میں علم' اور علموں کے گرد سیاہ پوشوں اور ذاکروں کا مجمع' مرثیہ خوانوں اور عزاداروں کا جوش و خروش' داد محل کی چوتھی منزل تک پہونچتا ہے۔ بادشاہ محل کے اوپر سے اس جلوس کو دیکھکر عزادارانِ سید الشہداؑ کے شور و شیون پر گریہ کرتے ہیں۔ اور سیاہ پوشوں کے لیے گوٹے کے خوان بھیجتے ہیں۔ اس کے بعد کوتوال شہر اور تمام مجمع بادشاہ کی سلطنت اور شوکت کی بقا کے لیے فاتحہ پڑھ کر اسی ترتیب سے امامباڑے کو واپس جاتا ہے۔ اسی طرح عشرہ بھر ہر شب کو محلات مذکورہ کے امام باڑوں سے علم آتے ہیں۔ ساتویں شب کا جلوس خصوصیت رکھتا ہے' اس شب کو بادشاہ کی والدہ مکرمہ کے یہاں کے علم حیات آباد سے اُٹھتے ہیں۔ ان کے ساتھ بے شمار چراغ فانوس اور مشعلیں ہوتی ہیں۔ اور لکڑی کی طرح طرح کی شکلیں بنا کر اور مختلف وضع کے ٹھاٹھ باندھ کر ان میں بھی خوب روشنی کیجاتی ہے۔ درباریوں' امیروں اور وزیروں اور ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوتا ہے' یہ جلوس سرخیل خاصی کے زیر اہتمام داد محل کے میدان میں آتا ہے' اس رات کو راستہ کی تمام دوکانوں اور داد محل کے میدان میں بہت روشنی ہوتی ہے۔ بادشاہ داد محل پر سے عزاداروں کا جوش و خروش اور چراغاں کی کیفیت ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اور حسب دستور گوٹا بھیجتے ہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد یہ جلوس واپس جاتا ہے۔ ساتویں محرم کی صبح کو بادشاہ نادری محل میں تشریف لے جاتے ہیں' اور اس محل کی شہ نشین پر کھڑے ہوتے ہیں' ایران اور ہندوستان کے شاہی حاجب جو دار السلطنت میں موجود رہتے ہیں طلب کیے جاتے ہیں۔ تمام اہل دربار' امرا وزرا' مقربین اور ہر طبقے کے ملازمین سب کے سب سیاہ پوش ادب اور قاعدے سے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہ معظم مختلف امام باڑوں کے علموں کو دروازۂ دوازدہ امامؑ سے دولت خانہ کے اندر طلب کرتے ہیں۔ اور شہر کے تمام لوگ جو علموں کے ساتھ ہوتے ہیں ان کو اذن عام دیدیتے ہیں' ہر مذہب و ملت کے لوگوں کا اتنا کثیر مجمع ہوتا ہے کہ نادری محل کا میدان رُوزِ محشر کا نمونہ دکھاتا ہے۔ بادشاہ تمام محلوں کے علموں کو ترتیب وار ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اسوقت عزا و ماتم کا شور و شین گوش فلک تک پہونچتا ہے' اور لوگ تعزیوں' تابوتوں اور محملوں کو دیکھکر شہدائے کربلا کی مظلومی اور اہل حرمؑ کی اسیری کا تصور کرکے بے اختیار آنسو بہاتے ہیں۔ بادشاہ گیتی پناہ بھی ان مصائب کو یاد کرکے گریہ کرتے ہیں۔ شاہی جاندارخانہ کے ملازمین ہر امام باڑے کے علم پر بادشاہ کے . . . . ملاحظہ کے بعد ایک ریشمی پھریرہ چڑھا کر اس کے خادموں کو روپیوں کی ایک تھیلی عنایت کرتے ہیں۔ تمام محلات کے علم ظہر کے وقت دولت خانہ سے واپس جاتے ہیں۔

محرم کی آٹھویں شب کو بادشاہ بطریق مذکور داد محل سے شاہی امام باڑے کو تشریف لے جاتے ہیں اور علموں پر پھول چڑھاتے ہیں' اور شمع و چراغ روشن کرنے کے بعد سلاطین مصر کے حاجبوں کو طلب فرماتے ہیں اور مجلس عزا میں شرکت کرتے ہیں۔ ارکان دولت' اعیان حضرت اور منظر بان سریر سلطنت سب کے سب سیاہ پوش اپنے اپنے مقام پر خدمت کے لیے حاضر

رہتے ہیں۔ ملک معظم شہدائے کربلا کے مصائب سُن کر اپنے دل کو محزون اور آنکھوں کو گریاں کرتے ہیں اور تمام اہل مجلس گریہ و بکا میں مصروف رہتے ہیں۔ محرم کی نویں شب کو بادشاہ ذیجاہ دولت خانہ کے اندر والے امامباڑے کے علم آراستہ کرنے کے بعد اپنے ہاتھ سے کافوری شمعیں درباریوں، حاجبوں اور مقربوں کو تقسیم کرتے ہیں اور سپہ سالار کل فوجوں اور سپاہیوں کو شمعیں تقسیم کرتا ہے اس کے بعد علم اُٹھتے ہیں۔ اور جلوس اس ترتیب سے روانہ ہوتا ہے کہ آگے آگے سرخیل شاہی بادشاہ کی خاص تلوار لیے ہوئے پیچھے پیچھے تمام اہل دربار، اعیان دولت، اکابر سلطنت اور ملازمین درگاہ کیا چھوٹے اور کیا بڑے سب کے سب شمعیں ہاتھوں میں لیے اُن کے پیچھے بے انتہا مجمع اور بے شمار شمعیں اور چراغ اور فانوس میدان دربار کے پیش ایوانوں میں زمین سے چودہ پندرہ گز کی بلندی تک اور اس میدان کے چاروں بلند محرابوں میں نیچے سے اوپر تک ہزارہا چراغ اس ترتیب سے روشن کیے جاتے ہیں کہ روشنی کے طاق، محرابیں درخت جانور وغیرہ بن جاتے ہیں، اور میدان بھر میں لکڑیوں کی ٹٹیاں لگا کر ان پر بھی خوب روشنی کی جاتی ہے۔ بادشاہ نہایت مخصوص لوگوں کے ساتھ اس چوڑی دیوار پر جن کے قریب سے علم جاتے ہیں تقریبًا پانچسو قدم علموں کے چل کر ان چار بلند محرابوں میں سے ایک پر پہونچ جاتے ہیں، اور وہاں سے ایوانوں اور محرابوں کے چراغاں کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ اس وسیع میدان میں وضیع و شریف صغیر و کبیر ذکور و انات حد و حساب سے زیادہ جمع ہو جاتے ہیں اور اس گلزار آتشیں کی بہار دیکھتے ہیں۔ اس شان کی روشنی چشم فلک نے بھی کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ سیاحان عالم کے سیاحت نامہ اور تواریخ و سیر کی کتابیں ایسے چراغاں کے ذکر سے خالی ہیں۔ غرضیکہ بڑے مجمع کے ساتھ یہ علم آتے اور میدان کے بیچ میں کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ ذاکروں اور مداحوں کے دستے ذاکری اور مداحی میں مصروف رہتے ہیں۔ کوئی دو گھنٹہ چراغاں رہتا ہے۔ اسکے بعد بادشاہ جس طرح علموں کے ساتھ آئے تھے، اسی طرح دیوار دیوار علموں کے ساتھ واپس جاتے ہیں۔ اور مقربان درگاہ اور ہمراہان بادشاہ

دعا اور فاتحہ کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں۔ دسویں محرم کی صبح کو علم اُٹھتے اور شاہی امام باڑے کو جاتے ہیں۔ ان علموں کے ساتھ بادشاہ سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے ننگے پاؤں پیدل راہ چلتے ہیں۔ تمام اعیان سلطنت، مقربان حضرت، اہل دربار، امرار، وزرا، ملازمین خدام، سب کے سب سیہ پوش اور پا برہنہ ہوتے ہیں۔ غلامان خاص کی ایک جماعت نوحہ و شیون کرتی چلتی ہے۔ ذاکروں اور مداحوں کا ایک گروہ پر درد مرثیے پڑھتا ہوا علموں کے آگے آگے ہوتا ہے۔ خود بادشاہ غمزدہ اور گریہ کناں ہوتے ہیں، تمام مجمع سے گریہ و زاری کی آواز بلند ہوتی ہے۔ کوئی تین ہزار قدم راہ پیادہ اور پا برہنہ آہستہ آہستہ طے کرکے بادشاہ اس مسجد تک آتے ہیں جو شاہی امامباڑے کے قریب ہے۔ مسجد میں مجلس عزا برپا ہوتی ہے اور شہدائے کربلا کے مصائب امام حسینؑ کی بیکسی و مظلومی اور حضرت کے حرم محترم کی گرفتاری کا بیان سُن کر نوحہ و گریہ کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ ذاکری ختم ہونے کے بعد ایک فصیح البیان خطیب ارواح شہداؑ کی ترویح، ثواب عزا کے حصول اور سلطنت بادشاہ کی بقا کے لیے دلپذیر اور مسجع عبارت میں بلند آواز سے فاتحہ پڑھتا ہے۔ اب مجلس ختم ہو جاتی ہے بادشاہ دولت خانہ کو واپس جاتے ہیں اور زیارت حضرت سید الشہداؑ اور دیگر اعمال عاشورہ بجا لاتے ہیں۔ اس کے بعد خاص و عام کو کندوری تقسیم کیجاتی ہے شاہی حکم کے مطابق دو سو یتیم سید زادے لائے جاتے ہیں اور ان کو شاہی جامدار خانے سے ایک ایک قمیص پوشاک اور کچھ نقد دیا جاتا ہے تاکہ اس روز غم و اندوہ میں یتیم نوازی کا ثواب بادشاہ کو حاصل ہو۔ کل ممالک محروسہ تلنگانہ کے ہر شہر قصبہ و قلعہ وغیرہ میں یہ طریقہ مقرر ہے کہ ایام عاشورہ میں مقامی عمال دیوانخانوں میں علم کھڑے کرکے رسوم عزاداری بجا لاتے ہیں تمام ممالک میں ایام عاشورہ کے اخراجات کے لیے بڑی بڑی رقمیں مقرر ہیں۔ شاہی دفتر میں ان اخراجات کا حساب کرکے کل رقم عہدہ داروں اور عاملوں سے مجرا کر لی جاتی ہے۔ سرکاری انتظام سے جو عزاداری ہوتی ہے اس کے علاوہ

عشرۂ محرم میں کل اہل اسلام اعلیٰ وادنیٰ اپنے اپنے مکان میں علم کھڑے کرتے اور رسوم عزا بجالاتے ہیں۔ بادشاہ کو ائمہ ہدیٰؑ سے جو بے ریا محبت اور ولا ہے اُس کی برکت ہے کہ گردش فلکی سے جو حوادثات و بلیات رُونما ہوتے ہیں وہ سب نہایت آسانی اور خوش اسلوبی سے حسب خواہش دُور ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ دین پناہ کے حسن عقیدت اور شیعیان حیدرؑ کرار اور محبان ائمہ اطہارؑ کے حسن نیت کے اثر سے اس ملک کے ہندو بھی امام حسینؑ پر راسخ اعتقاد رکھتے ہیں، ان کے مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں، امیر، غریب سب ایام عاشورا میں غسل کرکے پاکیزہ کپڑے پہن کر قند و شکر کے شربت کے گھڑے اپنے سروں پر رکھ کر امام باڑوں میں آتے ہیں اور وہاں کے خادموں کو شربت پلاتے ہیں۔ طلائی اور نقرئی علم چڑھاتے ہیں اور سونا چاندی، کثرت سے نذر کرتے ہیں، اپنے دلی مطالب کے لیے نہایت خلوص و نیاز مندی کے ساتھ دعا کرتے ہیں، ان میں سے اکثر کی مرادیں سال کے اندر ہی پُوری ہو جاتی ہیں اگر کسی کے یہاں ایام عاشورا میں لڑکا پیدا ہوتا ہے تو اس کا نام حسین رکھتے ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم طبقوں میں سے وہ لوگ جن پر رُوزی کے دروازے بند ہو گئے ہیں اپنے لب و دہن پر قفل لگا کر امام باڑے کے سامنے کھڑے ہو کر نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ دعا مانگتے ہیں۔ محرّم کی دسویں شب کو قفل خودبخود کھل جاتے ہیں اور دوران سال ہی میں ان لوگوں پر کامیابی کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں، حضرت سید الشہداؑ کی روح مقدس کی اس حیرت خیز کرامت کو ہر مذہب و ملت کا آدمی دیکھتا ہے۔

محرم نمبر ۱۳۵۵ھ

عشرۂ محرم اور ملی تنظیم

فخر قوم مولوی سید کلب عباس صاحب ایڈوکیٹ آنریری جنرل سکریٹری
آل انڈیا شیعہ کانفرنس

زمانہ حال کا مروّجہ اور سب سے زیادہ مقبول طریقہ کسی تحریک کے ابھارنے اور اس کی رفتار اور قوت کو تیز کرنے کا یہ ہے کہ اس تحریک کے لئے کوئی دن یا ہفتہ مخصوص کرکے اوس کے ہمدردوں کو اس کی اشاعت اور ترقی کیطرف متوجہ کر دیا جائے۔ ایسے دن یا ہفتے یا ایام ایسے رہبر اور رہنما مقرر کرتے ہیں جو اپنی ہر دل عزیزی یا اثر کی وجہ سے اس تحریک کے مویدین پیدا کر سکتے ہیں اور اون کو اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ اس کی نشر و تبلیغ کے لئے شغف اور انہماک سے کام لیں ایسے ایام کے کسی تحریک کے لئے مخصوص ہو جانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اس کے جو مویدین اور حامی ہوتے ہیں ان کی توجہ اسکی طرف خصوصیت سے مبذول ہو جاتی ہے اور ان کی توجہ دوسروں کو بھی اس کی طرف متوجہ کر دیتی ہے عوام کی توجہ اس طرح سے اسی تحریک کیطرف منعطف ہو جاتی ہے اور وہ تحریک عوام کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اس طرح بر اوس تحریک کا حلقہ مقبولیت بڑھتا جاتا ہے اور اس کا چرچا اسی ہفتہ میں یا اون ایام مخصوصی میں اتنا ہو جاتا ہے کہ اس تحریک کے لئے آئندہ سال بھر کیلئے کوئلہ اور بھاپ فراہم ہو جاتا ہے اور اس کی گاڑی اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔

قدرت نے اہل اسلام کی خوش نصیبی سے بلکہ تمام دنیائے انسانیت کی خوش نصیبی سے ان کی اخلاقی اصلاح و تنظیم اور ان کے روحانی تصفیہ و تزکیہ کے لئے ایک عشرہ عشرۂ محرم کے نام سے معنون کر دیا اور ان ایّام کو کچھ ایسے پاکباز، راست کردار نمونۂ اخلاق اور مجسمۂ روحانیت بزرگوں کے تذکرہ سے مخصوص کر دیا ہے۔ جو تمام بنی نوع انسان کو ایسے سبق دیتا ہے جو اون کے اخلاقیات کی درستی اور روحانیت کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں محض اخلاقی اور روحانی اصلاح و ترقی ہی نہیں، یہ تذکرہ ہر قسم کی تنظیم اور ترقی کے جواہر ریزوں سے مملو ہے۔ اس میں ہماری معاشرتی تمدنی اور سیاسی شیرازہ بندی کے لیے لائحہ عمل اور موثر لائحہ عمل موجود ہے۔ روحانی حیثیت سے تو واقعۂ کربلا حق و باطل کے تصادم اور اوس تصادم کے بہ ظاہر بربادکن اور بہ باطن تعمیری نتائج کا مرقع ہے اور یہ ثابت کرتا ہے۔ کہ روحانی تصرف مادیت کی دَل بادل فوجوں کو کسطرح شکست دیتا ہے فسق و فجور کو کسطرح کیچڑ کے خشک دھبے کی طرح دامن انسانیت سے پاک کر دیتا ہے اور کیسے غیر محسوس مگر موثر طریقہ سے انسانی رگ و پے میں روحانیت کو سرایت کر کے قرآن پاک کی آیۂ محکمہ جاء الحق زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا کی صداقت کو ثابت کرتا ہے مگر اخلاقی حیثیت سے اس حادثۂ عظیم میں بہترین اخلاقی تعلیم مضمر ہے اور یہ تعلیم اصولی عنوان سے نہیں عملی عنوان سے دی گئی ہے جتنی اعلےٰ صفات اخلاقی ہیں ان سبکی عملی مثالیں خیالی نہیں گوشت پوست جسم اور ہڈی رکھنے والے مجسموں کے ذریعہ سے پیش کی گئی ہیں اور اون کو بدترین اور مذموم انسانی بدکرداریوں کے محاذ میں لاکر اون کی غالب آنے والی فوقیت کو اور نمایاں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ان مثالوں کو اپنے پیش

نظر رکھ کر گروہ انسانی سبق لے اور یہ نہ سمجھ لے کہ مادی جبر اور تشدد، ظلم اور تعدی۔ ضد اور ہٹ دھری ضمیر انسانی پر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں اور اسکو جادۂ حق سے ہٹا سکتے ہیں۔ مرقع کربلا کی اسی اخلاقی تعلیم کی ابتدا مدینہ سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا زمین نینوا پر شمر کے خنجر کے نیچے ہوتی ہے درمیانی منزلیں ان اخلاقی درسیاست سے پر ہیں جو آج تک سرمایۂ اخلاقیات ہیں کوفہ والوں کی دعوت کو رد نہ کرنا اور موسم کی ناسزاواری کے باوجود سفر اختیار کرنا۔ مدینہ والوں سے انتہائی حسن اخلاق کے ساتھ رخصت ہونا۔ رخصت ہوتے وقت روضۂ نبی پر جانا اور حسرت آمیز الفاظ سے رخصت ہونا کہ :-

کاہے کو اس مزار پہ اب آئیگا حسین "

راستہ میں یہ جانتے ہوئے کہ دشمن سامنے ہے اور دشمن کا رسالہ ہے حر کے لشکر کو سیراب کرنا اور ایسے مقام پر اثنائے سفر میں سیراب کرنا جہانکہ پانی ناپید ہو حسن اخلاق کی معراج کہی جا سکتی ہے پھر آگے چل کر اپنے ایلچی حضرت مسلمؑ کی سنانی سنا اور اس کے بعد بھی ایفائے عہد کی امکانی سعی یہ سمجھتے ہوئے کرنا کہ اس میں خطرات ہیں اور یہ شعر زبان حال سے پڑھنا۔

اجل رسیدہ و من می روم بہ کرب و بلا
گذشت نوبت مسلمؑ رسید نوبت ما

توکل بہ خدا رکھنے اور راضی بہ رضا رہنے کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ کربلا میں لب دریا اترنے کی اجازت نہ پاکر ایک ایسے شخص کا جسکا فرات میں روائتی حق چلا آتا ہو حلم اور ضبط کا مظاہرہ کرنا اور اپنے ساتھیوں کو بھی ضبط اور تحمل کی تلقین کرنا ضبط نفس کا اخلاقی کارنامہ ہے۔ اپنے تیغ بعد اعدا میں پاکر ثابت قدم رہنا اور متزلزل نہ ہونا استواری عزیمت کا کاخ بلند ہے۔ یہی نہیں جب خطرات مہیب ترین صورت اختیار کر چکے ہوں اور جان جوکھم میں پڑ چکی ہو اس وقت جو ساتھی ہوں ان کو بھی آزاد کر دینا اور ٹھہرنے یا نہ ٹھہرنے کا اختیار دیدینا طمانیت نفس کی انتہائی منزل ہے۔ اور اصحاب حسینؑ کا باوجود اختیار و آزادی خطرہ میں حسینؑ مظلوم کا شریک رہنا اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اچھا مقصد اچھے ساتھی پیدا کر دیتا ہے حسینؑ کا اطمینان نفس اور اصحاب حسینؑ کی شان وفا اخلاقی دنیا کے ایسے درخشندہ ستارے ہیں جو ہر دور میں ضیا باری کرتے رہیں گے۔

قربانی حسینؑ خود اپنا جواب ہے
وجہ بقائے دین رسالتمآب ہے
روشن کیا ہے دین کو مشکر حسینؑ نے
چمکا پس غروب یہ وہ آفتاب ہے

حسینؑ کے ان باوفا اصحاب کی قدر دانی ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ " حسینؑ کو جیسے باوفا اصحاب ملے کسی کو نہ ملے یہ قدر دانی ایک بڑا اخلاقی سبق اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے لیکن استحسان وفا باعث تخلیق وفا ہے۔ اس فطرت انسانی کے بناص نے اولاً امتحان وفا دیا اور پھر وفا شعاروں کی یہ قدر دانی کی کہ ایک ایک کی لاش پر گئے ان کو مرتے دم اپنے دامن کی ہوا دی اور ہر ایک کا ماتم بقدر وفا کیا۔

انتہا یہ ہے کہ اصحاب تو درکنار غیر بھی اگر طالب عفو ہو کر بارگاہ حسینی میں آیا۔ تو اسے گلے لگا لیا۔

واہ رے ہمت کرم آتش غیظ پھونک کر
حرؑ نے کہا خطا ہوئی شہ نے کہا معاف ہے

حسینؑ کا حسن اخلاق یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا اس نووارد پشیمان معترف قصور کی یہ قدر دانی کی کہ اس کی لاش خیمہ تک لے آئے اور اس کا ماتم اپنوں کی طرح کیا۔

سر حرؑ گود میں شہ نے لیا اللہ اللہ
بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے

حسینؑ کے حسن معاشرت کو دیکھئے۔ شہدائے کربلا کے پس ماندگان کو اور ان کے یتیموں اور بیواؤں کو اس معدن خلق و کرم نے حسن خلوص کے ساتھ پرسا دیا ہے اس سے پتہ

چلتا ہے کہ انسانی ہمدردی اس میں کس پایہ کی موجود تھی اور اس نے اپنے پرائے کا کوئی امتیاز اس کے اظہار میں۔۔۔ نہیں برتا۔ بیوہ عباسؓ کو اور بیوۂ وہبؓ کو ایک ہی عنوان سے دلاسا دیا۔ مساواتی حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ حبشی جونؓ کو بھی ایسی سوز و الم کے ساتھ رخصت کیا۔ جس کے ساتھ عباسؓ جیسے جلیل القدر بھائی کو رخصت کیا اور قدیم خدمت گذار اور پالنے والی کنیز فضہؓ سے بھی اوسی احترام کے ساتھ رخصت لی جس احترام کے ساتھ اپنی چاہنے والی بہن سے لی تھی۔ غرض کہ حسینی حسنؑ اخلاق اور حسن کردار کا کہاں تک تذکرہ کیا جائے انتہا یہ ہے کہ شمر جیسے سفاک اور سنگ دل قاتل نے بھی اس کا اعتراف کیا کہ زیرِ خنجر بھی اسکی اصلاح اور انسانیت کی اصلاح کی دعا اس محسن انسانیت نے یوں کی کہ یہ لوگ گمراہ ہوگئے ہیں بار الہا ان کو توفیق خیر دے" آیئے۔

آیئے اب محسن انسانیت کی تمدنی شیرازہ بندی کا جائزہ لیں وحشی پن اور بربریت کے ازالہ کے بعد جو اجتماعی صورت انسانی اخلاق اور تہذیب کی پیدا ہوتی ہے اس کا نام تمدن ہے کربلا میں اہل عرب نے جو نمونے بربریت اور بہیمیت کے پیش کئے اس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی غریب الوطن جماعت کی راہ بندی ان کا محاصرہ ان پر دانہ پانی کا بند کرنا ان کی جماعت کے ہر فرد کو بے گناہ قتل کر دینا۔ کمسن اور شیرخوار بچوں کو بھی باقی نہ چھوڑنا ان کی لاشوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندنا۔ اور بے گور و کفن چھوڑنا۔ ان کے لاوارث یتیموں اور بیواؤں کو لوٹنا۔ ان کے خیموں میں آگ لگانا ان کو قید کرنا ان کے ورثاء کو لاشوں کی طرف سے لے جانا اور ان کے ورثاء کے سروں کے ساتھ ساتھ ننگے سر در بدر پھرانا ان کو طعنے دیکر ان کے زخموں کو تازہ کرنا۔ دربار عام میں اس سفاکی کا مظاہرہ کرنا اور ان مظالم کا اعادہ بفخر کرنا کیا ان افعال سے بڑھ کر کوئی بہیمانہ اور وحشیانہ افعال خیال میں بھی لائے جا سکتے ہیں۔ اور کیا ان کا ازالہ اس سے بہتر عنوان سے کیا جا سکتا ہے جس عنوان سے اس مظلوم جماعت نے کیا اس بربریت کا اور بہیمیت کے خلاف احتجاج کی لہر حسینؑ مظلوم کے لطف و کرم نے حرؑ اور اس کے پسر اور غلام کے واک آدٹ نے اور شیرخوار علی اصغرؑ کی بے زبانی کی طلب آب نے میدان کربلا ہی میں دوڑا دی اِن مصیبت زدہ اسیروں اور بیبیوں کے چہروں کی خاک اور بندھے ہوئے ہاتھوں نے جن راستوں سے وہ گزرے اس بربریت کے خلاف جذبات ہمدردی اُبھار دیئے اور دربار یزید میں تو کھلے بندوں اس کے خلاف غیظ و غضب غم و غصہ اور تنفر کی موجیں یزید کے استبداد سے ٹکر لینے لگیں۔ اس کو ٹوک ٹوک کر اس کی سفاکی کی شکایت ہونے لگی اور سر دربار ایک اسیر اور بیمار کا خطبہ حریت اور ایک دُکھ زدی رسن بستہ خاتون کی پر زور زجر و توبیخ سب اہل دربار کے کانوں تک پہنچ گئی۔ رسالے کے رسالے اس کے خلاف تیغ بکف ہو گئے۔ دربار یزید میں فتح کا مظاہرہ شکست کا منادی بن گیا۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یزیدی بربریت کی بیخ کنی کے لئے تمدنی تیشے اُسی دربار سے تیار ہونے لگے۔ سلطنت بنی اُمیہ کی بنیاد ہل گئی۔ اس کے بعد خون شہیداں رنگ لایا۔ معاویہ کے بچھائے ہوئے جال کے تار و پود ٹوٹ گئے۔ بنی عباسؑ بر سر اقتدار آئے۔ مگر جب انھوں نے بھی سر اُٹھایا اور بیکسوں کے نشان مزار مٹانے کے غیر متمدن اور وحشیانہ اقدامات ہل چلوانے یا نہر کے پانی کے کاٹ دینے کی ذریعہ سے کئے۔ تو جانوروں اور سیل آب رواں نے بھی ایسے تمدن سوز افعال کے خلاف ایسا احتجاجی مظاہرہ کیا۔ کہ انسانی سفاکی اور بربریت بے دست و پا ہو گئی۔ بقول امیر مینائی ؎

سب مٹاتے رہے پر نقش امامت نہ مٹا
آپ ہی مٹ گئے تھے جو کہ مٹانے والے

وہ ویران اور بہیڑ ریگستان جو نینوا کے نام سے مشہور تھا جس کی تھوڑی سی زمین خرید کر حسینؑ نے بنیاد تمدن ڈالی تھی اور جس کو غریب الوطن واردین و صادرین کی مہمانداری کے لئے وقف کیا تھا مرکز تمدن بننے لگا۔

بے گور و کفن شہدا کے قبروں کے نشان ابھرنے اور آیات الٰہی کی طرح چمکنے لگے۔ اور اپنی طرف نہ صرف عراق اور حجاز کے باشندوں

کو ملکہ ایران و شام، روم و فلسطین، ہند و چین ہر جگہ کے حق پرست اور حق پسند متمدن اور مہذب لوگوں کی توجہ منعطف کرنے لگے دور دور سے زائرین آئے۔ ایک غیر آباد و غیر متمدن خطۂ ارض مختلف تمدنوں کا سنگم بن کر تمدن کی ترقی کا باعث بننے لگا۔ اس خطہ میں بستیاں آباد ہوئیں۔ کارواں کے لئے سرائیں بنیں نئی نئی تجارتیں پیدا ہوئیں۔ نئے راستے کھلے اور آج یہ مقام مرجع خلائق ہے۔ یہی نہیں کہ شہادت حسینؑ اور واقعہ کربلا صرف اہل عراق یا حجاز کی تمدنی تنظیم کا باعث ہوا ہے اس واقعہ کا اثر تمدن عالم پر بھی ہوا ہے۔ اس کا تذکرہ ہر متمدن جماعت کی تاریخ اور ادب میں پہونچ گیا۔ اس کی یادگار قائم کرنے کا ذوق ان میں پیدا ہوا۔ تقریر کے ذریعہ سے تحریر کے ذریعہ سے مجالس کے ذریعہ۔ مرقعوں کے ذریعہ سے، جلوسوں کے ذریعہ سے غرضکہ اپنے اپنے ماحول کے مطابق مختلف عنوان سے اس کی یاد منائی جانے لگی اس کی تخصیص کسی مذہب اور ملت کے ساتھ نہ تھی جس طرح دنیا کے اہم ترین واقعات کم و بیش بلا قید ارضی اپنے تاثرات پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس واقعہ کربلا نے اپنے ہمہ گیر اثرات عالم انسانیت پر ڈالے ہیں۔ لیکن سیاسیات عالم پر اس یگانۂ روزگار واقعۂ شہادت کا خاص اثر پڑا ہے۔ اس کی ابتدا اس کا مقصد اس کا طریقۂ عمل، اس کا محل وقوع اور اس کے عواقب کچھ ایسے مخصوص عنوان کے ہیں کہ انھوں نے اس واقعہ کو سیاست کا مشعل ہدایت بنا دیا ہے۔ اس کی ابتدا گوشہ نشین امن پسند شہری کو اس کے حقوق شہری اور توطن سے محروم کرنا تھا۔

اس کا مقصد حق کو ظلم کا نشر کر کے حاصل کرنا تھا۔ اس کا طریقہ عمل قرآنی آیت کے تعلیم کردہ اصول تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (تعاون کرو نیکی اور پرہیزگاری سے اور عدم تعاون کرو برائی اور بدکرداری کا سے) کی بنا پر عدم تعاون اور اپنے تئیں مٹانے والی ستیہ گرہ کرنا تھا۔ مجادلہ جو کیا گیا اس کا مقصود مجادلہ نہ تھا بلکہ ظلم کی انتہا اور صبر کی قوتوں کا مظاہرہ تھا۔ اگر بلا مجادلہ ظلم کے ہاتھوں میں یہ صابرین اپنے تئیں دیدیتے تو یہ واقعہ عالمگیر اہمیت حاصل کرتا۔ اس کا محل وقوع غربت اور بے کسی کا وہ انسانی ہمدردی حاصل کرنیوالا منظر ہے جو تمام بنی نوع انسان کو ایک دوسرے سے فطرتاً وابستہ کرتا ہے۔ اور اس کے مراتب و سیاسی انقلابات ہیں۔ جو اس کے وقوع کے بعد پیدا ہوئے اور گروہ خوانین کے اسا جوگ سے پیدا ہوئے۔ شہدا نے سر کی قربانیاں کیں، خواتین نے ہر قسم کی مصیبت جھیل کر اسیر ستم رہ کر وہ ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ جو سیاسی انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اسی اسا جوگ نے یزید کو پشیمان کیا۔ اسی نے اس کی حکومت کے خلاف سیاسی ہیجان پیدا کیا۔

یہ ہے واقعہ کربلا کا اخلاقی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی پس منظر جس کی یادگار کے لئے عشرہ محرم قدرت کی طرف سے مقرر ہوا ہے یا اگر اس کو قدرت کا مقرر کردہ نہ بھی مانئے تو تاریخی یا روایتی حیثیت سے یہ عشرہ اسی یادگار کے لئے مخصوص ہے۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس یادگار کے منانے کا جو عنوان ابتدا سے رہا ہے وہ ایسا موزوں، موثر اور دلکش ہے کہ تمام متمدن جماعتوں نے اُسے اختیار کر لیا ہے۔ یعنی مجلسوں کے ذریعہ سے اس واقعہ کے تاریخی حالات بیان کرنا اور جو روحانی، اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی سبق اس میں مضمر ہیں ان کو شہدا کی سیرت اور سوانح کا ذکر کر کے اہل مجلس کے ذہن نشین کرنا، برمحل اور متعلق بیرقوں اور نشانوں کے ساتھ جلوس نکالنا اور ان کے ساتھ ان کے حالات پر مشتمل نوحوں اور مرثیوں یا نظموں کا پڑھنا اپنے جذبات غم کا مظاہرہ سینہ زنی یا کسی اور عنوان سے کرنا۔ اس امر کے اظہار کے لئے کہ ہم ایسے شہید کی یادگار مناتے ہیں کہ جن کو قبر تک نصیب نہیں ہوئی۔ ان کی تربت کی نقل بنا کر اس کو احترام کے ساتھ اٹھا کر اس عقیدت کا ثبوت دینا کہ ہم اگر ہوتے تو ایسے بیکس کی لاش بے دفن نہ چھوڑتے اور اس کا جنازہ اسی شان سے نکالتے تعزیہ رکھنا اور ان کو عاشور یا چہلم کے دن دفن کر دینا، ذوالجناح کا جلوس اسی یادگار میں نکالنا کہ حسینؑ مظلوم کے قتل کے بعد خالی گھوڑے ہی نے آپ کی شہادت کی اطلاع خیمہ گاہ میں کی تھی معلوم نہیں کیوں ذوالجناح کے جلوس پر ہمارے بعض برادران معترض ہوتے ہیں حالانکہ جب ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہوا ہے

اور ان کا جنازہ تزک واحتشام شاہی کے ساتھ لندن میں نکلا ہے تو اس کے ساتھ ان کا سفید عرب گھوڑا جس پر وہ ہمیشہ سوار ہوا کرتے تھے۔ ان کی سواری کی یاد تازہ کرنے کے لئے گشت کرایا گیا تھا۔ کیا شہسوار دوش رسول کے دلدل کی یادگار اتنے احترام کی بھی مستحق نہیں ہے۔

اوپر کے مراسم عزا کی تفصیلات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حسینیوں کے پاس تمام وہ موثر تبلیغی اور اشاعتی وسائل صدیوں سے موجود چلے آتے ہیں۔ جن کو آج دنیا اپنے مقاصد اور تحریکوں کے لئے اختیار کر رہی ہے اور جن کو وہ اپنی تنظیم و ترقی کے لئے کام میں لاتے ہیں مگر پھر بھی ہم موثر اور نتیجہ خیز طریقوں پر ان کو اپنی تنظیم اور ترقی اور فلاح کے لئے استعمال نہیں کرتے۔

ہماری مجلسیں صرف انھیں لوگوں تک محدود رہتی ہیں جو پہلے ہی سے شمع حسینی کے پروانے ہیں۔ ہم اپنی مجالس کو دوسروں کے لئے جو ان کے فیوض سے ناواقف ہیں دلآویز نہیں بناتے۔ یہ سچ ہے کہ ہماری مجالس کسی کو شرکت سے نہیں روکتیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ دوسروں کو اس طرح سے دعوت بھی نہیں دیتیں کہ وہ بن آئے نہ رہیں۔ ہمارے یہاں دوسروں کے بلانے کا ذریعہ بس تقسیم تبرک ہے۔ مگر اس وجہ سے جو لوگ آتے ہیں یا تو ان کو مجالس سے محض تبرک ہی پانے تک دلچسپی رہتی ہے یا وہ ان کے بیانات کو ایسے عنوان کا پاتے ہیں کہ وہ ان کو پوری طور سے سمجھ نہیں پاتے "کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم" پر ہمارے ذاکرین عمل نہیں فرماتے اور ایسا صاف اور عام فہم بیان نہیں کرتے کہ ایسے شریک ہونے والوں کی سمجھ میں آئے عموماً یہ بیان کچھ ایسے منقولی روایتوں پر یا منطقی اور فلسفی مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں جو ان کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ زبان ایسی معرب اور مفرس ہوتی ہے اور اس میں ایسے ایسے شاعرانہ نکات ہوتے ہیں کہ صرف محدود تعداد سامعین کی ان سے لطف اٹھا سکتی ہے اور ان کے لئے یہ بیان صرف مجلس ہی تک اثر رکھتا ہے اس کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔

اب جب کہ اردو بھی قربان گاہ حکومت پر بھینٹ چڑھ چکی ہے اس کی شدید ضرورت ہے کہ ہم اپنے بیان کو ہر طبقہ کے سامنے پیش کریں اس کے فہم کے مطابق بنائیں۔

معلوم نہیں فرسودہ روزگار قصص اور روایتوں کے بیان کرنے سے ہمارے واعظین کیا فائدہ سمجھتے ہیں۔ کیا تاریخی واقعات آئمہ کے سوانح اور ان کی سیرت اور تعلیمات اور ان کی وہ تعلیم جو معقولات سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے موضوعات بیان کے لئے کافی مواد فراہم نہیں کرتے کیا بغیر مناظرہ کی چاشنی دیئے ہوئے ان کا بیان مقبول نہیں ہو سکتا کیا بغیر حملہ کئے ہم اپنے دین حق اور اصول دین کی تبلیغ نہیں کر سکتے۔ کیا حسینی سیرت اور فلسفۂ شہادت کو ہم ایسے عنوان سے پیش نہیں کر سکتے کہ اغیار پکاریں کہ ہمارے ہیں حسین۔

ہمارے جلوس اور ماتمی گشت مقبول عام ضرور ہیں لیکن بڑے بڑے شہروں میں ہمارے برادران اسلام ان کو اس غلط فہمی میں بند کرتے جاتے ہیں کہ وہ فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ حالانکہ انھیں شہروں میں تلنگوں کے ذریعے ہی جلوس برادران وطن کی شرکت و تعاون حاصل کرتے ہیں۔ اور بلا کسی شر اور فساد کے نکلتے ہیں۔ جب سے یہ جلوس اور گشت بند ہو گئے ہیں نہ صرف وہ جوش عمل جو عشرۂ محرم میں تمام اہل اسلام میں پیدا ہو جاتا تھا کم ہو گیا ہے۔ بلکہ وہ اشتراک عمل جو اس سلسلہ میں معاصر اقوام سے پیدا ہوا تھا بالکل مفقود ہو گیا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔

جس سے ہمارے مشن پر بہت بڑا اثر پڑ رہا ہے میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ پست ذہنیت حقیقت میں ان روایتی اسلامی مراسم عزا کے ترک کر دینے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے محض اس موہوم خوف سے کہ فساد ہو جائے گا اپنے مراسم مذہبی کا ترک کر دینا اپنی شکستہ ذہنیت کو ترقی دینا ہے۔ ہمارے جلوس اور گشت

جو نکلتے تھے اُن سے ہمارے روایات مذہبی اور
....
.... شعائر اسلامی جاگتے رہتے تھے اور ہم میں ایک جوشِ عمل پیدا ہوتا تھا مجھے امید ہے کہ ہمارے برادرانِ اسلامی میری اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور جو مراسم محرم میں ان بڑے شہروں میں ہوتے تھے اُن کو جاری کریں گے عشرۂ محرم ہم میں روح عمل پھونکنے کا ذریعہ ہے۔ اس کے ساتھ کچھ ایسے مراسم نذر و نیاز کے وابستہ ہوگئے ہیں کہ انھوں نے اس کو ایک سماجی تقریب بنا دیا ہے۔ اپنے اپنے یہاں کے مخصوص مراسم عزا ہر شخص کو اس قدر محبوب ہوتے ہیں کہ وہ عشرہ محرم میں اپنے گھر ضرور پہنچنے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر بستی کی آبادی محرم میں بڑھ جاتی ہے۔ مدتوں کے بچھڑے دور دراز سے آکر اکٹھا ہوتے ہیں۔ اس موقعہ کو اپنی بستی کی صحیح مردم شماری معلوم کرنے اور معاشی امداد اور چندے فراہم کرنے کے لیے کام میں لایا جاسکتا ہے اور اسی اجتماع اور جوش سے فائدہ اٹھا کر اپنی تنظیم ملت کے لیے لائحہ عمل کم از کم آیندہ سال تک کے لیے بنایا جاسکتا ہے۔

جناب امیر علیہ السلام نے ہدایت فرمائی ہے کہ ہر شب جب بستر پر جاؤ تو اپنے عمل کا جائزہ لو کہ کون کام اچھے کیے کون بُرے کیے۔ کون فروگذاشت کیے اس طرح ہم کو اپنے قومی اعمال کا محاسبہ اور اپنی ضروریات ملی کا جائزہ لے کر یہ اندازہ لگانا چاہئے کہ ہم نے اُن میں کیا حصہ لیا ہم کو اُس پر غور کرنا چاہئے کہ ہمارے یہاں کی عزاداری انحطاط پر ہے یا ترقی پر اور اگر انحطاط پر ہے تو اسکے کیا اسباب ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ ہماری اقتصادی حالت اُس کے انحطاط کا باعث ہوئی ہے۔ کتنے امام باڑے دوران سال میں شکست ہوگئے، کتنے کسی جوشیلے منتظم کے مرنے یا چلے جانے کی وجہ سے غیر آباد ہوگئے، کتنوں میں جو تبرک تقسیم ہوتا تھا وہ بند ہو گیا، کتنوں کے جلوس کم مائیگی کی وجہ گھٹ کر بے رونق ہوگئے، کتنی مجلسیں گنتی کے آدمیوں سے ہوتی ہیں، کتنے ذاکرین کم ہوگئے۔ مختصر یہ کہ عشرۂ محرم میں یا اُس کے عین مابعد ہم کو ایک دن ایسے تبصرے اور محاسبے کے لیے مخصوص کر دینا چاہئے۔ اور ایسی ضروریات ملی اور قومی پر غور کرکے ایسی اقتصادی اور معاشی تدبیریں بھی سوچنا چاہئیں جو ہماری عزاداری کو باقی رکھ سکیں اور وہ معاشی اور اقتصادی بحران جو اس وقت ہماری جماعت کو بالخصوص ہلاک کر رہا ہے کم ہو اور ہم زندہ رہ سکیں۔ اس تنظیم کے سلسلہ میں آیندہ عشرہ محرم میں کم از کم ہر شیعہ بستی حسب ذیل پروگرام پر عامل ہو کر ایک لائحہ عمل مرتب کرسکتی ہے۔

(۱) اپنے یہاں کی مردم شماری کی بناڈالے اور اپنے یہاں کے بیواؤں، یتیموں اور بے روزگاروں اور محتاج لوگوں کی فہرست تیار کرکے اور اُن کے لیے کوئی معاشی وسیلہ نکالے۔

(۲) اپنے یہاں کے معابد اور مساجد کی ایک فہرست بنائے اور اُن میں سے جو سب سے زیادہ شکستہ حال ہو اُس کی آیندہ محرم کے قبل درستی کی فکر کرے اور اُس کے لیے تمام شرکائے عزا سے امداد حاصل کرے اور اسکو محفوظ ہاتھوں میں رکھ کر اُس کی مرمت کا انتظام کرے

(۳) اپنے یہاں کے اوقاف کی فہرست مرتب کرے اور صحیح واقعات جانچنے کے بعد ان میں سے جو قابل اصلاح ہوں ان کی اصلاح کرے یا اپنے صوبے کے مرکزی وقف بورڈ کو اُس کی طرف متوجہ کرے۔

(۴) اپنے یہاں کے مجالس اور گشت اور دیگر مراسم عزا پر اپنی بستی کا ایک جمہوری جلسہ طلب کرکے تبصرہ کرے اور جو امور قابل اصلاح ہوں اُن کے متعلق رائے عامہ کی تائید حاصل کرکے اُن کی اصلاح کرے۔

(۵) قومی اداروں نے جو تجاویز تنظیم قومی پاس کی ہیں یا جو لائحہ عمل اقتصادی ترقی کے لیے مرتب کیا ہے یا جن مسائل حاضرہ کے متعلق آپ کی تائید چاہی ہے ان پر اپنے یہاں کے مقامی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کریں اور جہاں تک ان کی تعمیل ہوسکے انکی تعمیل کریں۔

اس سلسلہ میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور اس کی مرکزی کمیٹی نے جو تجاویز اقتصادی پروگرام پر مشتمل اور اجتماعی مطالبات پر مشتمل

شدہ انجمنوں اور شیعہ بستیوں میں بھیجی ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ توجہ کی محتاج ہیں۔ اسی طرح سے قومی اداروں نے جو اپیلیں شائع کی ہیں اور جو مرکزی حیثیت سے ہمارے قومی بوجھ کو اٹھائے ہیں مثلاً شیعہ یتیم خانہ لکھنؤ ان کی طرف بھی ہمارے ابنائے قوم کو اس متبرک عشرہ میں متوجہ ہونا چاہیئے۔ کیا ایام حسینؑ کے نام پر ہم عشرہ محرم میں اپنے قوم کے یتیم بچوں کو فراموش کر سکتے ہیں۔

اسی طرح خواتین میں بھی اپنی بیوہ اور صاحب احتیاج لاوارث بہنوں کے لیے کوئی تحریک ضرور ہونا چاہیئے۔ ان کی خوزادیوں نے نام حسینؑ پر اولاد کی قربانیاں پیش کیں۔ ہماری صاحب استطاعت خواتین عشرۂ محرم میں اپنی ہمجنس نادار مستورات کے لیے کوئی نہ کوئی صورت معاش کی نکال سکتی ہیں۔ اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ میں بیوگان کی دادرسی اور امداد کا فنڈ کروڑہا پونڈ کا عورات نے جمع کیا ہے مگر ہماری عورتیں عشرۂ محرم میں سوائے نذر و نیاز دلانے کے۔۔۔ کوئی خبر اپنی مجبور بہنوں کی نہیں لیتیں۔

میرے محترم بھائیو! عشرۂ محرم خدا کی نعمت ہے اس سے مستفید ہو اور اسے اپنے ملت کی تنظیم کا ذریعہ بناؤ۔

میری معزز بہنو۔ اپنی خوزادی حضرت زینب سے سبق لو دیکھو انھوں نے لاوارث بی بیوں کا شیرازہ کیسی سخت مصیبتوں میں جمع رکھا اور کس طرح ان کی نگہبانی کی۔ تم بھی اپنی بہنوں کی دستگیری کرو۔

میرے عزیز نوجوانوں! قوم کی لاج تمھارے ہاتھ ہے، تم ہماری امید ہو، تم ہماری ریڑھ کی ہڈی ہو۔ تمھارا سینہ زنی کا جوش قابل صد تحسین ہے۔ مگر سینہ زنی کے ساتھ تم کو اپنے تئیں مستقبل کے زمانہ کی اقتصادی مشکلات کے لیے بھی کمر بستہ ہونا چاہئے اس لیے کہ عزاداری کا انحصار تمھاری اقتصادی خوش حالی پر منحصر ہے۔

(محرم نمبر ۱۳۷۰ھ)

رضاکارانہ خدمات کی بہترین مثال

(بیگم صاحبہ مولانا محمد علیؒ مرحوم)

میرے بھائیو اور میرے پیارے بچو!

تم مسلمان ہو۔ ان مسلمانوں کے بچے ہو۔ جنہوں نے صدیوں تک پوری انسانیت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھا تو کیا تم ان کے بچے ہو کر ایک قوم کا بوجھ بھی نہیں سنبھال سکتے۔ آج اسلام ہند میں تمہاری نصرت کا طلبگار ہے۔ ہندوستان کے مسلمان زندہ ہیں۔ جی رہے ہیں، سانس لے رہے ہیں لیکن ان کی ہر سانس موت کی آخری سانس ہے ان کی نیند گورستان میں سونے والوں کی گہری نیند سے زیادہ گہری ہے اس لئے کہ ایک رضاکار ہونے کی حیثیت سے تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے پرجوش نعروں سے ان کی نیند کو اچاٹ دو۔ ہمیشہ کے لئے اچاٹ دو۔ تم رضاکار ہو اور رضاکار اُسے کہتے ہیں جو اپنے سود و زیاں کا خیال کئے بغیر اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر خدمت خلق کیلئے معرکہ عمل میں کوہ استقلال کی طرح کھڑا ہو۔ رضاکار اسے کہتے ہیں جو تلواروں کی چھاؤں میں سوئے انگاروں سے کھیلے اور طوفان سے جنگ کرے۔ اسلام کی تاریخ رضاکارانہ خدمات کی مثالوں سے پُر ہے لیکن میں اسوقت تمہارے سامنے صرف چند مثالیں پیش کروں گی تاکہ انہیں سُن کر تمہاری مرجھائی ہوئی روحیں ہری ہو جائیں۔

تمھیں معلوم ہوگا جب تمہارے رسولؐ نے کفرستان عرب میں اپنی رسالت کا اعلان کیا تو اُس وقت رسول اکرمؐ نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی دعوت کر کے ان کے سامنے سب سے پہلے اسلام کو پیش کیا اور پکار کر کہا کہ تم میں کون ہے کہ جو خدا کی راہ میں میرا بوجھ بانٹے، یا میری نصرت کرے اور میرے پیچھے چلے،، تو اس وقت اس مجمع سے کوئی نہ اٹھا مگر ایک بچہ یہ تھا اسلام کا پہلا رضاکار چونکہ رضاکار کے لئے امتحان ضروری ہے اس لئے بہت جلد قدرت نے اس کا امتحان لیا۔ ہجرت کی اس تاریکی رات کو جب تمہارا رسولؐ مکہ کو خیرباد کہہ رہا تھا اور خانۂ رسالت کو دشمنوں کی تلواروں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا، ضرورت تھی کہ کوئی ان کے بستر پر ان کی جگہ سو رہے، رسول اکرم نے اپنے رضاکار سے پوچھا بحیثیت رسولؐ کے اِس متوالے نے ”سمعاً و طاعۃً“ کہہ کر تسلیم کی گردن جھکادی اور تلواروں کی چھاؤں میں رسولؐ کی چادر اوڑھ کر سو رہا۔ جانتے ہو یہ رضاکار کون تھا۔ وہی جو کچھ دنوں بعد شیرِ خداؑ کے لقب سے ملقب ہو کر اسلام کی سپر اور اسلام کی تلوار بنا رہا۔

رضاکارانہ خدمات کی سب سے بہتر مثال کربلا کے جنگل میں ملے گی، تمہیں معلوم ہوگا کہ رسولؐ کا پیارا حبیب دشمنوں کے زغہ میں گھرا تو اس کے علم کے گرد بجز چند جان نثار رضاکاروں کے اور کوئی نہ تھا اور جب وہ رضاکار بھی سچائی کے نام پر کٹ گئے تو کاروان سالار حریت نے استغاثہ کیا نصرت کے لئے اپنی آواز فضا میں بلند کی جانتے ہو اگر ایک طرف اِس آواز کا جواب تیروں کی بوچھار سے دیا گیا تو دوسری طرف شیر خوار بچوں نے اپنے پاؤں گہواروں سے نکال دیئے۔ بیمار عصا کے سہارے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عورتوں نے بیلچے اُٹھا لیئے، کمسن لڑکے اپنی ماؤں کے ہاتھوں دامن چھڑا کر خیمہ سے بیقرارانہ نکل پڑے، کس لئے؟ مظلوم کربلا کی نصرت کے لئے حسینؑ کو تلواروں سے، خون کی پیاسی تلواروں سے بچانے کے لئے۔

سید الشہدا کی فریاد کا جواب تو بیماروں، عورتوں اور بچوں نے دیا لیکن آج اسلام پکار رہا ہے۔ اور تمہاری جماعت سے اس کی پکار کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ کیا ہو گیا اے مسلمانوں! تمہاری روحوں کو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ یہ زندگی زندگی نہیں، زندگی کا مضحکہ ہے، موت کا مرقع ہے، موت کی تفسیر ہے کیونکہ سہ۔ زندگی نام ہے احساس کی بیداری کا۔

محرم نمبر ۱۳۵۵ھ

سلام

از اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں صاحب بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نظام دکن۔

اے حسین ابن علیؑ لطف الٰہی یار تو
در رہِ حق ہمت تو قافلہ سالار تو

نور یزداں در رُخ و نور پیمبر در جبیں
جلوۂ مہرِ سعادت طرۂ دستار تو

اکبر گلرو کجا۔ اصغر کجا۔ قاسم کجا
آہ شد نذر خزاں آں گلشن بے خار تو

مروحہ جنباں پر جبریل بالائے سرت
روح سرکار دو عالم سر بسر در کار تو

ایں چنیں آقا و بندہ در جہاں کم دیدہ ام
تو امام پاک و عثماںؔ غاشیہ بردار تو

دیگر

خنجر ماتم سرور کا اثر دیکھیں تو
کس قدر روتے ہیں خوں دیدۂ تر دیکھیں تو

چاک ہر نسخہ اکسیر ہوس کر دیں
خاصیت خاک شفا کی وہ اگر دیکھیں تو

رفقا صبح سے کرتے تھے یہ آپس میں کلام
کون ہو شہ کیلئے سینہ سپر دیکھیں تو

رو دیئے شاہ جو دیکھا یہ خطِ صغراؑ میں
کاش حالت مری آپ ایک نظر دیکھیں تو

جنگ کی پیاس میں لاکھوں سے جنھیں دعویٰ ہو
خلفِ ساقیٔ کوثر کا جگر دیکھیں تو

نیمچے تول کے کہتے تھے یہ زینبؑ کے پسر
کون کرتا ہے قلم شمر کا سر دیکھیں تو

مدحِ شبیرؑ میں کیا رنگ سخن ہے عثماںؔ
میرے اشعار ذرا اہلِ نظر دیکھیں تو

(محرم نمبر ۱۳۵۳ھ)

(مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید انصاری فرنگی محلی از لکھنؤ)

جو گریہ بہر شہ تشنہ کام کرتا ہوں — مئے مراد سے لبریز جام کرتا ہوں

درود پڑھتے ہیں لکھتے ہیں کاتبانِ عمل — وہ نام وِرد میں ہر صبح و شام کرتا ہوں

شہید تشنہ و بیکس حسین ابن علی — جواب دیجئے مولا سلام کرتا ہوں

وہ آپ کا رُخِ پر خوں وہ زلف رنگیں ہے — کہ جس کی یاد میں ہر صبح شام کرتا ہوں

بروز حشر مقدر میں سرخروئی ہے — کہ ہر شہید کا میں احترام کرتا ہوں

زباں سے آہ نکلتی ہے آنکھ سے آنسو — جو یاد سرورِ عالیمقام کرتا ہوں

خیال بھولے سے آتا نہیں ہے جنت کا — جو کربلا و نجف میں قیام کرتا ہوں

سوائے اک دلِ پُرخوں نصیب ہی کیا ہے — سو نذر دلبر خیرالانام کرتا ہوں

ملیں گے ساقی کوثر سے مجھکو جام پہ جام — کہ اہلبیت کا میں احترام کرتا ہوں

مرادیں میری بر آئیں غم و ملال ہوں دور — توسل آپ سے میں یا امام کرتا ہوں

جو دل جلاتا ہوں گرمیِ کربلا سے شہید
سمجھ لو آتش دوزخ حرام کرتا ہوں

(محرم نمبر ۱۳۵۱ھ)

شہادت کی قبا کیا خوشنما معلوم ہوتی ہے

(نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ جانشین جناب امیر مینائی مرحوم)

چمن میں آمدِ فصلِ عزا معلوم ہوتی ہے
کہ درد انگیز بلبل کی صدا معلوم ہوتی ہے

وہی دلکش نوا سنجی جو کل تک روح افزا تھی
فغان و نالہ و آہ و بکا معلوم ہوتی ہے

علی اکبرؑ کی صورت دیکھ کر دشمن بھی کہتے تھے
کہ تصویرِ نبی صلّے علےٰ معلوم ہوتی ہے

وہ کہنا ہائے صغراؑ کا کہ یارب خیر بابا کی
کئی دن سے تڑپ دل کی سوا معلوم ہوتی ہے

جما ہے گلشنِ ایجاد میں کیا رنگ ماتم کا
لہو میں تر ہر اک گل کی قبا معلوم ہوتی ہے

چلے ہیں حضرت قاسمؑ کچھ اس شانِ جلالت سے
کہ رن میں آمدِ شیرِ خداؑ معلوم ہوتی ہے

فرشتوں میں یہ چرچا تھا کہ جسمِ ابنِ حیدرؑ پر
شہادت کی قبا کیا خوشنما معلوم ہوتی ہے

گلا کٹتا تھا پیاسوں کا تو یہ آواز آتی تھی
کہ آبِ تیغ بھی آبِ بقا معلوم ہوتی ہے

غمِ سرور میں شاید خاک بھی اس نے اڑائی ہو
غبار آلود جو بادِ صبا معلوم ہوتی ہے

ثباتِ شاہ دیکھو اور وہ کرب و بلا دیکھو
یہیں صبر و رضا کی انتہا معلوم ہوتی ہے

زبانِ شہ کے قرباں بات جو منہ سے نکلتی ہے
کلامِ حق حدیثِ مصطفےٰؐ معلوم ہوتی ہے

یہ غل تھا اشقیا میں دیکھ کر عباسؑ کے تیور
اسی کے ہاتھ میں اپنی قضا معلوم ہوتی ہے

گرفتاروں کا سن کر حال اپنی جانِ محزوں بھی
اسیرِ حلقۂ دامِ بلا معلوم ہوتی ہے

جلیلؔ آٹھوں پہر خونبار رہتی ہے جو آنکھ اپنی
عزادارِ شہیدِ کربلا معلوم ہوتی ہے

(محرم نمبر سنہ ۱۳۵۳ھ)

راہ است حسینؑ و خضر راہ ست حسینؑ
برسلکِ توحید گواہ ست حسینؑ
تن گفت حسینؑ متنِ الا اللہ ست
سر گفت کہ سرِ لا الٰہ ست حسینؑ

آئینۂ جاوید نگاہ ست حسین
لاریب کہ زندگی پناہ ست حسین
ہر سال غمش زندہ کند عالم را
بر ہستی خویش خود گواہ ست حسین

خورشید جہانِ جاوداں است حسین
پیوستہ رواں است و تپاں است حسین
در سیزدہ صد سالہ حجابِ تقویم
چوں جلوۂ دیروز عیاں است حسین

(محرم نمبر ۱۳۷۲ھ)

کربلا میں آج گُل شمع اِمامت ہو گئی

منشی منی لال صاحب جوان سندیلوی تلمیذ جناب آرزو لکھنوی

کربلا میں دفن جب اصغر کی میت ہو گئی
آئینہ بیداد کا چھوٹی سی تربت ہو گئی

تشنہ لب اصغر کا ایسا امتحان سخت تھا
شیر مادر کی اجل سے پہلے رخصت ہو گئی

کاٹ کر رستہ پہونچ جا شہ تک اے نہر فرات
تو بھی اعدا کی طرح کیا بے مروت ہو گئی

وقت پرسش اُٹھ کے آئی جب زمین کربلا
حشر میں رنگین ہر ذرے کی صورت ہو گئی

روز عاشورہ یہ کہتی تھی سیہ پوشی دہر
کربلا میں آج گل شمع امامت ہو گئی

بڑھ گئے ہاتھوں کے ناخن جم گئی بالوں پہ خاک
قید میں آل نبی کو اتنی مدت ہو گئی

غم میں شہ کے چار اشکوں کی حقیقت ہی تھی کیا
اے جوان محشر میں بخشش بے مشقت ہو گئی

(محرم نمبر سنہ ۱۳۵۳ھ)

مٹا سکے گا بھلا کون یادگار نبیؐ

از حضرت غفراں مکاں اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علیخاں مرحوم نظام سادس المتخلص آصف

حسنؑ حسینؑ ہیں واللہ یادگار نبیؐ
یہ نونہال نبیؐ ہیں یہ گلعذار نبیؐ

بنی ہے دل پہ مرے شوق پائے بوسی میں
خدا کا شکر کروں گر ہو سر نثار نبیؐ

بیاں جو حال کیا کربلا کا زینبؑ نے
ہوا یہ حال کہ ہلنے لگا مزار نبیؐ

فدا رسولؐ کی امت پہ جان دیکے ہوئے
ہوے فدائے الٰہی ہوے نثار نبیؐ

وہ قتل ہو کے ہوئے اور خلق میں مقبول
مٹا سکے گا بھلا کون یادگار نبیؐ

یہ آرزو ہے کہ لخت جگر کو گوندھ کے ہم
چڑھائیں پھول کی چادر سر مزار نبیؐ

اسیر شام رہا ہو کے آرہے ہیں اُدھر
کھلی ہوئی ہے اِدھر چشم انتظار نبیؐ

خدا ہمیں بھی دکھائے بہار یثرب کی
سُنا ہے گلشن فردوس ہے بہار نبیؐ

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر سب اکبر کو
وہی جمال نبیؐ تھا وہی وقار نبیؐ

کھلی ہوئی ہیں تو خنجر جفا آنکھیں
دم اخیر ہے سرور کو انتظار نبیؐ

ستم ہے اہل ستم نے نہ اس کو بھی دیکھا
کہ تھے نواسہ پہ الطاف بے شمار نبیؐ

ہمیں تو ڈر نہیں کچھ آفتاب محشر کا
رہیگی سایہ فگن زلف مشکبار نبیؐ

نگاہ ابروے اکبر نے قتل عام کیا
یہ ذوالفقار علیؑ تھی وہ ذوالفقار نبیؐ

ترا کرم رہے یارب ہمیشہ آصف پر
فدائے آل نبی ہے یہ جاں نثار نبیؐ

(محرم نمبر ۱۳۵۲ھ)

متولیان وقف حسین آباد سے خطاب

(جناب جوش ملیح آبادی)

سن سکو تو چند نالے ہیں دل برباد کے
اے گرامی ممبرو وقف حسین آباد کے
مشعلوں کی جگمگاہٹ کی ہوا کرتی ہے شو
ہر محرم کی نویں اور آٹھویں تاریخ کو

۲

وہ اداس افسردہ دل راتیں سر جوئے فرات
جن کے سناٹے کے اندر گم تھی روح کائنات
جن کی رو میں درہم و برہم تھا عالم کا نظام
جن کی خاموشی میں تھا غلطاں شہادت کا پیام
جن کی ہلچل سے تلاطم تھا دل آفاق میں
جھلملائی تھی وفا کی شمع جن کے طاق میں
جن کی عظمت کو منور کر رہے تھے دل کے داغ
گل ہوا تھا جن کی آندھی سے مدینے کا چراغ
پرفشاں تھے جن کے سناٹے جرس کے واسطے
تم نے اُن راتوں کو چھانٹا ہے ہوس کے واسطے

۳

مشعلوں میں جس جگہ خون شہیداں کا ہو رنگ
سیر کرنے کو بلائے جائیں واں اہلِ فرنگ
کیا حمیت ہے کہ اپنوں کے لیے ہو روک تھام
روپ میں بھی غیر کے آئے کوئی تو اذن عام
بزم عصمت میں سر آنکھوں پر لیا جائے گناہ
مقبرے کو اور بنائے آسماں تفریح گاہ
منعقد ہو جشن اشکوں کی بھری برسات میں
دعوت حرف و حکایت زلزلے کی رات میں
یہ تملق، یہ خوشامد یہ زبوں اندیشیاں!
غمکدۂ مسلم کا اور نصرانیوں کا بوستاں
باب شیشوں پر کھلے موج تبسم کا علم
خون کے قطروں پہ ہوں ارباب عشرت کے قدم
کشتی صہبا چلے اہل وفا کے خون میں
آخری ہچکی بھری جائے گراموفون میں
دیدۂ ناہید ہو جس بزم میں افسانہ گو
اُس جگہ دی جائے دعوت فتنۂ مریخ کو
داغہائے دل میں کھولا جائے میخانے کا باب
قہقہے ہیں آنسوؤں کی انجمن میں باریاب
چنگ و بربط کا تسلط ہو دیار آہ میں
اہل ماتم لاش کو رکھیں نمائش گاہ میں
دیدۂ عشرت اُٹھے مجروح لاشا دیکھنے
ہنسنے والے آئیں رونے کا تماشا دیکھنے
ذکر اُس کا آئے محفل میں غزل خوانی کے ساتھ
ذہن میں آتا ہے جس کا نام قربانی کے ساتھ
لشکر شادی سے ہو پامال غم خانے کی خاک
غازۂ رنگیں بنائی جائے پروانے کی خاک
ہو خرام عیش سے سبزے کی صورت پائمال
غم کی دارائی بساط سوگواری کا جلال
جوئے خوں پر اور پیراکی کا میلا الحذر
غیرت اسلام تجھ کو کھا گئی کس کی نظر

روح مومن کو عطا بار خدا ادراک ہو
یہ نہیں تو صور پھنک جائے کہ قصہ پاک ہو

محرم نمبر ۱۳۵۲ھ

صداقت آخر کار آفتاب بن کے رہی

لکھنؤ کے مشہور و معروف بلند پایہ شاعر جناب سراج لکھنوی کے قلم سے

سلام فاطمہؑ زہرا کے لال حق کے ولی
سلام تجھ پہ سلام اے حسین ابن علیؑ

اگر رسولؐ نے پہنا فراز عرش کا تاج
حیات تیری بھی انسانیت کی ہے معراج

تو وارثِ ازلی ہے پیام حق کی قسم
ترے حقوق ابدی ہیں کلام حق کی قسم

ہے ہر نفس کی صدا میں ترا پیام حسینؑ
زباں پہ آتا ہے رہ رہ کے تیرا نام حسینؑ

سب اپنا کہتے ہیں تجھ کو کسی سے بیر نہیں
تو اجنبی کی نگاہوں میں بھی تو غیر نہیں

ہے شرح دین نبیؐ تیرا قتل بے تقصیر
ہے تیرا حسن عمل لا الٰہ کی تفسیر

دلوں پہ نقش ہیں تیری وفا کے نقش قدم
نشاط خاطر کونین بن گیا ترا غم

سکون قلب ہے خاک شفا کے ذروں میں
نہاں ہیں طور تری کربلا کے ذرّوں میں

طلسم توڑ کے کفار کی سیاست کا
لکھی ہے خون سے تاریخ مِلّتِ بیضا

حقیقت آئینۂ انتخاب بن کے رہی
صداقت آخر کار آفتاب بن کے رہی

عمل عمل ترا آئینۂ شریعت ہے
نفس نفس ترا قرآن کی تلاوت ہے

ہر اشک آئینہ دار لطافت غم ہے
دلِ سراج میں تیری امانت غم ہے

(محرم نمبر سنہ ۱۳۷۲ھ)

ہلالِ محرّم

لسان القوم جناب مولانا صفی (اعلی اللہ مقامہٗ)

فلک نے مہِ نو کی صورت دکھائی — کلیدِ عزاخانہ جنبش میں آئی
دلوں پر یکایک گھٹا غم کی چھائی — ہوئی خلق مصروفِ نوحہ سرائی

لبِ خشک شیون خمِ دستِ ماتم
ہلالِ محرّم۔ ہلالِ محرّم

رگِ ابرِ مژگانِ تر اس کو سمجھیں — خراشِ رخِ نوحہ گر اس کو سمجھیں
سرِ ناخنِ اہلِ نظر اس کو سمجھیں — رگِ جاں پہ اک نیشتر اس کو سمجھیں

لبِ خشک شیون خمِ دستِ ماتم
ہلالِ محرّم۔ ہلالِ محرّم

مہِ نو کہ اک افسرِ واژگوں ہے — کہ وہ کاسۂ سر جو لبریزِ خوں ہے
قلم بیدِ مجنوں کی یا سرنگوں ہے — کہ خارِ کفِ پائے اہلِ جنوں ہے

لبِ خشک شیون خمِ دستِ ماتم
ہلالِ محرّم۔ ہلالِ محرّم

خطِ نسخ میں نونِ قرآں کا دامن — ہے کشتِ زارِ عمل را اس خرمن
کہ ہے ساعدِ حورِ جنّت کا کنگن — گراجیِ دمِ سینہ کوبی یقیناً

لبِ خشک شیون خمِ دستِ ماتم
ہلالِ محرّم ہلالِ محرّم

تہِ آب یا ماہیِ بحرِ قدرت — نمک پاشِ دلِ خستگانِ محبّت
کہ قاشِ تراشیدۂ سیبِ جنّت — ہے سینہ چاکانِ سرِ خوانِ نعمت

لبِ خشک شیون خمِ دستِ ماتم
ہلالِ محرّم ہلالِ محرّم

سر محضر اک مہ صبر آزما ہے ‏— کہ طغرائے فرمان دست قضا ہے
نمودار نقش سُم بادپا ہے ‏— کہ ابروئے سلطان گلگوں قبا ہے

لب خشک شیون خم دست ماتم
ہلال محرم ہلال محرم

مہ نو ہے یا خاتم بے نگینہ ‏— رواں دجلہ اشک ہیں یا سفینہ
کہیں حلقہ گوش دُرّ سکینہ ‏— کہ مشکیزہ بنت شاہ مدینہ

لب خشک شیون خم دست ماتم
ہلال محرم ہلال محرم

مہ نو کہ چین جبین ستمگر ‏— خجل، منفعل، سرنگوں مثل خنجر
رگ خستہ بوسہ گاہ پیمبر ‏— جگر دوز چاک گریبان حیدر

لب خشک شیون خم دست ماتم
ہلال محرم ہلال محرم

مہ نو نہیں قامت ناتواں ہے ‏— کہ پشت دوتائے شہ انس و جاں ہے
بندھے تھے جو بازو وہ عابد کا نشاں ہے ‏— کہ اے چشم تر عکس طوق گراں ہے

لب خشک شیون۔ خم دست ماتم
ہلال محرم۔ ہلال محرم

مہ نو کہ محراب طاق عبادت ‏— سر انگشت اٹھائے بقصد زیارت
کہ اک نوحہ خواں محو ذکر شہادت ‏— جھکائے سر اپنا بفرط نقاہت

لب خشک شیون۔ خم دست ماتم
ہلال محرم۔ ہلال محرم

مہ نو کہ اک جام زہر ہلاہل ‏— مہ نو کہ آئینہ تیغ قاتل
مہ نو کہ رستا ہوا حلق بسمل ‏— مہ نو کہ بجھتی ہوئی شمع محفل

لب خشک شیون۔ خم دست ماتم
ہلال محرم۔ ہلال محرم

گروہ کماں ہے چلا تیر جس سے ‏— چھدا بے خطا حلق بے شیر جس سے
ہوا منشق قلب شبیر جس سے ‏— شفق گوں رخ شاہ دلگیر جس سے

لب خشک شیون۔ خم دست ماتم

ہلال محرم۔ ہلال محرم

مسیحائے اسلام فرد یگانہ شہید فرات آبروے زمانہ
یہ ہفتم ہے جس کو ملا آب و دانہ دہم کو ہوا سوئے جنت روانہ

لب خشک شیون۔ خم دست ماتم
ہلال محرم۔ ہلال محرم

عدو شاہ دیں کا عدو اُن کے جد کا نہ کیوں مستحق ہو عذاب اشد کا
سمجھئے اُسے ناخنہ چشم بد کا فتیلہ ہے یا زخم قلب حسد کا

لب خشک شیون۔ خم دست ماتم
ہلال محرم۔ ہلال محرم

نمونہ حسین ایسا جس قوم میں ہو کرے پست یوں نفس امارہ اُس کو
فنا جلد ہو جاؤ گے ورنہ سنبھلو یہ کیا کہہ رہا ہے صفی کچھ سنو تو

لب خشک شیون خم دست ماتم
ہلال محرم۔ ہلال محرم

(محرم نمبر ۱۳۴۴ھ)

مہ ذکر حسین ابن علی مرتضا آمد

(مفتی علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر ضیا سابق عدالت العالیہ سرکار عالی حیدر آباد دکن)

خوش آں اشکے کہ در چشم از حدیث کربلا آمد
مہ ذکر حسین ابن علی مرتضا آمد
قیامت چوں نہ خیزد در محرم کیں مہ خونیں
مہ ایفائے عہد خاتم آل عبا آمد
ز آب دیدہ می شویند گرد چہرۂ خاطر
مہ روشنگر سیمائے مردان خدا آمد
ز کف در سینہ می مالند خون زخم پنہاں را
مہ دست آزمائے ماتم اہل عزا آمد
ز خجلت چوں نگردد آب خون دشمناں یارب
کہ حُر از بہر آمرزش بہ میدان وغا آمد
فرات از رہزناں باید اماں گر ہمتے دارد
کہ خضر تشنہ کاماں ساقیٔ آب بقا آمد
کجا علم لدنی را کسے دیگر کند حاصل
کہ این خلعت برائے اہل بیت مصطفےٰ آمد
شراب الصالحین عشق کمیاب است در دنیا
کہ این مینا شکن در کام مستان ولا آمد
ز یک شب بیش و کم پندار عہد زندگانی را
بدنیا ہر کسے ہمچوں مسافر در سرا آمد

ندیدم ہمسرے رنگیں قبایان شہادت را ؛ ضیا ایں جامہ زیبی در شہیداں از کجا آمد

(محرم نمبر ۱۳۵۳ھ)

حسینؑ

لفٹننٹ پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب (مرحوم) ایم اے صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی

خدا گواہ ہے سو جاں سے ہوں میں اسیر نشاط
کہ جس کے شوق میں ہے قلب مضطرب کو قرار

تصور اس کا ہے دل کی مصیبتوں کا علاج
کہ جس کے نام سے پاتا سکوں ہے قلب زار

جو ذکر اس کا کریں تو ہو قلب کو تسکیں
جو چھیڑیں اس کا فسانہ تو روح کو ہو قرار

پھنکے جو دل تو شگفتہ ہوں داغہائے جگر
دکھائے آہ بھی خاصیت نسیم بہار

جو اسکی یاد میں آنکھوں سے اشک غم نکلیں
تو زخم دل کے لیے ہوں وہ مرہم زنگار

سنائیں قصۂ جور و ستم جو محفل میں
نفس کے تار سے نکلے صدائے استغفار

کسی کے لطف کی خواہش نہ بے رخی کا ملال
یہ طرفہ عشق ہے جو خود دوا ہے خود آزار

یہ عشق جس کو خدا دے اسی کو آتا ہے
ہزار سعی کرے کوئی ہوتی ہے بے کار

وہ اہل ہے جو بنایا گیا ہو اس گِل سے
کہ جس سے خلق ہوئے ہیں ائمۂ اطہار

وہ اہل ہے کہ ہو جبکی سرشت میں ہو درد
وہ اہل ہے کہ ہو دل جس کا اس کا آئینہ دار

کہ جو ہے چشم و چراغ بتول و نفس رسولؐ
جسے چڑھاتے تھے کاندھے پہ احمد مختار

ملا نہ چین جسے زندگی میں بعد رسولؐ
پچاس سال ستاتے رہے جسے اشرار

خوشی ہوئی نہ جسے دہر میں کبھی حاصل
رہا جو ظلم و ستم ہی کا نیم کشتہ شکار

وہی کہ مرتبہ جس کا نہ جانا دنیا نے
وہی کہ جس کو ستاتے رہے سدا غدار

وہ جس نے ہم کو بتایا حیات کے معنی
وہ جس نے فاش کئے زندگی کے سب اسرار

وہ جس نے ہمکو پڑھایا ہے حریت کا سبق
وہ جس کے طرز عمل نے کیا ہمیں ہشیار

وہ جس نے ہم کو مساوات کے بتلائے طور
وہ جس نے ظلم پرستی سے کر دیا بیزار

وہ جس نے ہم کو سکھائی ہے راست کرداری
وہ جس نے جان کو اپنی کیا ہے حق پہ نثار

وہ کون بندۂ حق جاں نثار ملت ہے
کہ جس نے خواب گراں سے کیا ہمیں بیدار

حسینؑ تشنہ لب و تشنہ کام و خستہ جگر
کہ جس کے غم میں ہو قلب شکستہ نشتر زار

شہید تیغ جفا۔ جاں نثار دین خدا
کہ جس پہ روتے ہیں سب اہل درد زار و قطار

"حسینؑ مجھ سے ہیں میں ہوں حسینؑ سے" جس کو
کہا رسولؐ خدا نے زباں سے لاکھوں بار

شرارے کفر کے بڑھنے لگے جو بعد رسولؐ
اُسی حسینؑ سے دیکھا گیا نہ آخر کار

کہے تو کس سے کہے جو گزرتی تھی دل پر
نہ تھے علیؑ و حسنؑ اور نہ تھا کوئی غمخوار

بہا کے اپنا ہی آخر کو خون مقتل میں
بنایا پھر سے خزاں دیدہ باغ کو گلزار

اسی نے دھر میں اسلام پھر کیا جاری
اسی نے زندگی دی دینِ حق کو دیگر بار

اسی نے صفحۂ عالم پہ ہو کے خاک بسر
نجاتِ امتِ عاصی لکھی بخطِ غبار

مٹائیں لاکھ عدو یاد مٹ نہیں سکتی
مزار پاک ہے امین قلب ہر دیندار

زمین روضۂ اقدس ہے سجدہ گاہ ملک
ہے غازۂ رخ خورشید اس زمیں کا غبار

(محرم نمبر سنہ ۱۳۵۳ھ)

سلام

سید فاروق احمد صاحب بزمی وارثی حنفی لکھیم پوری

آگیا ماہ محرم لے کے فطرت کا پیام
جس نے تازہ کر دیا ہے دل میں ایثار امام

گھر لٹا کر، تیر کھا کر سر کٹا کر اے حسینؑ
کر دیا ہے امت عاصی کا تو نے انتظام

سامنے ہو لاشِ اکبر لب پہ ہو شکر اللہ
صبر ایوبی کا تو نے کر دیا ہے اختتام

اس طرف کل ہیں بہتر تن جوان و پیر سب
اس طرف آئی امنڈ کر ہی تمامی فوج شام

اس طرف مشتاق باغِ خلد ہی ہر طفل و پیر
اس طرف لے کی حکومت کا ہی دل میں التزام

جرعتیں یہ ہمتیں یہ واہ رے فاقہ کشو
کر دیا ہے حیدرؑ صفدر کا روشن تم نے نام

دیکھتے کیا ہو لعینو یہ علیؑ کے شیر ہیں
طفل کمسن گو ہیں اور ہیں تین دن کے تشنہ کام

روئے گا تجھ پر ہمیشہ عالم انسانیت
حضرت شبیرؑ کے چھ ماہ کے اے لالہ فام

حق کی مظلومی نے دیدی زعم باطل کو شکست
کربلا کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے یہ پیام

بیڑیاں پہنے ہوئے کانٹوں پہ چلتا ہی اسیر
کون؟ جو ہے آخری شمع شبستاں کی امام

آگیا بزمی بھی لے کر تحفۂ ناچیز کو
اے شہید کربلا مقبول ہو اس کا سلام

(محرم نمبر سنہ ۱۳۶۱ھ)

نواب حیدر یار جنگ۔ نظم طباطبائی لکھنوی (مرحوم)

بے ردا فاطمہ زہرا کی جو دختر نکلے
کیوں نہ اشکوں کی مری آنکھ سے چادر نکلے

ایک پر شاہ کا سر ایک پہ خورشید بنیں
دونوں نیزوں کو جو ناپا تو برابر نکلے

روتے روتے مری آنکھوں نے دکھایا فردوس
بہتے بہتے یہ پیالے لب کوثر نکلے

جمع ہیں عرصۂ محشر میں مبصر کیا کیا
ہم جنھیں اشک سمجھتے تھے وہ گوہر نکلے

آئی عاشور کے دن پردۂ قدرت سے ندا (قطعہ) امتحاں دینے کو ہاں آل پیمبر نکلے

موجیں تیغوں کی اٹھیں نیزوں کا طوفاں ہو بلند
جو ہو دریائے شجاعت کا شناور نکلے

لٹتی ہے جنس شہادت جسے لینا ہو وہ آئے
جو کہ مظلوم کا ہو ناصر و یاور نکلے

سن کے اس مژدۂ جاں بخش کو دوڑے مشتاق
رکھ کے سر ہاتھ پر وہ فدیۂ داور نکلے

مسکراتے ہوئے مسلم کے پسر رن پہ چڑھے
شادماں زینبؑ ناشاد کے دلبر نکلے

شادیٔ مرگ کی نوشاہ کو اللہ ری امنگ
آستیں چھوڑ کے دامن کو چھڑا کر نکلے

آگئی لہر ترائی میں جو شور ہنے کی
شیر کی طرح سے عباس دلاور نکلے

ہاتھ میں لے کے علم سایۂ طوبیٰ میں چلے
مشک کاندھوں پہ دھرے طالب کوثر نکلے

چھوڑ کر باپ کو بسمل علی اکبر اٹھے
گود سے ماں کی مچل کر علی اصغر نکلے

تھا سکینہ کی اسیری کا نہ زینب کا خیال
مرنے کے شوق میں فرزند پیمبر نکلے

اس سعادت کی تمنا تھی ہزاروں کو مگر
مرنے والوں میں جو نکلے تو بہتر نکلے

کس طرح غم علی اصغر کا بھلاؤں اے نظم
تیر جو دل میں ہو پیوست وہ کیونکر نکلے

کیا عجب مر کے بھی روؤں غم شبیر میں میں
خاک سے سبزے کے بدلے مژۂ تر نکلے

(محرم نمبر ۱۳۵۳ھ)

سلام

جناب سید علی حسین صاحب زیبا ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ

نینوا کے بن میں یہ شانِ الٰہی دیکھنا
کشمکش میں ہیں گناہ بے گناہی دیکھنا

مطلعِ اسلام پر اُمڈے ہیں بادل کفر کے
چھا رہی ہے دینِ احمدؐ پر تباہی دیکھنا

کوششیں ہیں بت پرستوں کی کہ ہو باطل کا دور
کچھ خدا والوں کی لیکن حق پناہی دیکھنا

مر کے زندہ ہو رہے تھے جان نثارانِ حسینؑ
ذرہ ذرہ اب بھی دیتا ہے گواہی دیکھنا

غنچہ اور شاخِ گل سے بھی سبک تر غنچہ
قبضۂ قاسم میں اسکی بے پناہی دیکھنا

ایک بجلی سی ہے دستِ بازوئے شبیرؑ میں
چھٹ رہی ہے کفر کی گہری سیاہی دیکھنا

وہ کڑے تیور جسے دیکھا تڑپ کر رہ گیا
تیغِ اکبر کی ذرا جوہر نگاہی دیکھنا

تیر کھا کر سکا اٹھا کوئی بھی آفاق میں
آخری فوجِ خدا کا اک سپاہی دیکھنا

چل رہے ہیں کچھ عجب جھونکے ہوائے ظلم کے
لٹ رہا ہے باغِ محبوبِ الٰہی دیکھنا

عصر کا ہنگام سورج زرد منظر سوگوار
پھیلتی جاتی ہے دنیا پر سیاہی دیکھنا

وہ شفق سی خون کی پھیلی گیا ظلمت کا دور
رنگ لائی ہے کسی کی بیگناہی دیکھنا

وہ نظر آتا ہے نیزہ پر درخشاں آفتاب
شام کا ہنگام و نورِ صبحگاہی دیکھنا

السلام اے کاروانِ عشق و پیرِ کارواں
اس طرف بھی شاہراہِ حق کے راہی دیکھنا

کیا فقط زیبا تھیں دنیا ہے اشکوں کا خراج
حشر تک ہر دل پر اپنی بادشاہی دیکھنا

(محرم نمبر ۱۳۵۹ھ)

پیاسا رہ کر تو نے سینچا ہے چمن اسلام کا

(مہاراج کمار محمد امیر حیدر خاں صاحب المتخلص بہ حب و مسحور)

السلام اے شہسوارِ دوشِ ختم الانبیا — السلام اے شاہِ مظلوم اے شہیدِ نینوا

نیرِ اوجِ شہادت شاہدِ دینِ خدا — مطلبِ صبر و رضا و معنیِ مہر و وفا

سبطِ احمدؐ ابنِ حیدرؑ، نورِ چشمِ فاطمہ — روحِ نفسِ مطمئنہ اور شریکِ ہل اتیٰ

بچپنے میں منہ ترا تھا اور پیمبرؐ کی زباں — یعنی کوثر کو تھا قرآں کے ورق سے واسطا

شاہِ دیں حبل المتیں مہرِ نبوت کا نگیں — جانشینِ مصطفےٰ اور مالکِ ارض و سما

لیکے گودی میں تجھے کیا سوچ کر روئے رسول — اے امامِ تشنہ لب اے بے دیار و بے نوا

درۃ التاجِ شرف نورِ دو عینینِ رسول — گوہرِ بحرین عصمت، کوثرِ جود و سخا

تو ہے فرزندِ شہِ لولاکؐ و ابنِ بوترابؑ — فیضِ ہستی سے ترے قائم ہوئے ارض و سما

خوں سے تیرے دوڑی سرخی چہرۂ اسلام پر — خاک سے تیری ہوئی ہے دیں کی مستحکم بنا

بچپنے میں تھا ترا گہوارہ جنبانِ جبرئیل — تو تھا قرآں اور رحل آغوشِ پاکِ مصطفےٰؐ

حلے اور میوے جناں سے آئے ہیں تیرے لیے — تو تھا مہماں میزباں تیری تھی ذاتِ کبریا

اختر چرخِ امامت روشنیِ چشمِ دیں — روحِ زہراؑ جانِ پیغمبرؐ امام دوسرا

کربلا سے تا بہ کوفہ فوج پل کر رہ گئی — تشنگی میں شل حیدر تو نے جب حملہ کیا

باعثِ آرائشِ کونین شاہِ مشرقین — زینتِ تاجِ امامت گوہرِ عرشِ خدا

نورِ احمدؐ سے ہے تو اور دینِ احمدؐ تجھ سے ہے — فرع میں اور اصل میں کوئی نہ حاجب رہ گیا

تیغِ حیدرؑ نے ملک کے پر لئے تو نے دیئے — تھا وہ نقشہ غیظ کا اور یہ تھی تصویرِ عطا

اک ترا آزاد کردہ ایک شاگردِ علیؑ — بس یہی وحی اور فطرس میں اتنا فرق تھا

نسل میں تیری امامت کیوں نہ ہو بعدِ حسنؑ — تو نے چوسی ہے زبانِ پاکِ مرسل بارہا

حاملانِ عرش کیوں آتے نہ خدمت کے لیے — تیرا جھولا عرش تھا تو گوشوارہ عرش کا

جو رسالت سے نہ نکلے وہ کیئے ہیں تو نے کام — راہِ حق میں جان دے کر دین کو زندہ کیا

گریۂ صد عالمِ امکاں اگر ہو، تا ابد — ایک خوں کی بوند کا تیری نہ ہوگا خوں بہا

خشک ہونٹوں پر ترے موجِ تبسم کی تھی آب — پیاسا رہ کر تو نے سینچا ہے چمن اسلام کا

رنگِ وحدت میں بھرا ہے ہو کے غلطاں خون میں — اے علیؑ کے گوہرِ نایاب کیا کہنا ترا

دھوپ میں مرجھا رہا تھا گلشنِ دینِ نبیؐ — تو نے یہ دیکھا تو اپنا خون پانی کر دیا

کی تلاوت سر نے اے مسعورؔ راہِ شام میں
بعد مرنے کے بھی قرآں آپ کا ہمدم رہا

(محرم نمبر سنہ ۱۳۵۹ھ)

نیزے پہ ایک سر ہی کہ قرآں کہیں جسے

خواجہ اسد اللہ صاحب اسدؔ (مرحوم) ایڈیٹر سرفراز

لوٹا گیا وہ گھر کہ گلستاں کہیں جسے
برباد یوں ہوا کہ بیاباں کہیں جسے

وہ گھر کہ جو عرب میں نبوت کا تھا چمن
رنگینی بہار گلستاں کہیں جسے

وہ گھر کہ جس سے پرتو ایماں تھا جلوہ ریز
سرچشمہ ہدایت و عرفاں کہیں جسے

خاک اُڑ رہی ہو آج اسی بارگاہ میں
ہے اس طرح کہ بے سر و ساماں کہیں جسے

تر ہو رہی ہے ساری زمیں کربلا کی آہ
اس خون سے کہ خون شہیداں کہیں جسے

لاشیں ہیں چند جو کہ ہیں بے سر پڑی ہوئی
نیزہ پہ ایک سر ہی کہ قرآں کہیں جسے

اونٹوں پہ بی بیاں نظر آتی ہیں کچھ اسیر
پردہ یہ ہو کہ گرد بیاباں کہیں جسے

چادر بھی اک نہیں ہو کہ مُنھ کو چھپا سکیں
لائیں کہاں سے گوشۂ داماں کہیں جسے

اک ساربان ہے جو کہ رسن میں اسیر ہو
اک طوق ہو بجائے گریباں کہیں جسے

برباد ہو رہی ہے بضاعت رسول کی
لٹتا ہے وہ نبی کا گلستاں کہیں جسے

بس اے اسدؔ خموش کہ تاب سخن نہیں
پھر ہو رہی ہے سوزش پنہاں کہیں جسے

(سرفراز محرم نمبر ۱۳۴۴ھ)

ہوا رشکِ گلستاں داغِ ماتم سے جگر بھر کے

(سیّد ظفر حسین صاحب فائقؔ مرحوم خلف الصدق حضرت عارفؔ مرحوم و نبیرہ خدائے سخن میر انیسؔ مرحوم)

منوّر ہو جبیں خاکِ درِ شہ میں اگر بھر کے
نہ دیکھے آفتاب روزِ محشر بھی نظر بھر کے

بنے گر آبِ نیساں آنسوؤں سے چشمِ تر بھر کے
صدف رومالِ زہرا کا ہو اشکوں کے گہر بھر کے

وہ ہوں میخوار گویا بن گیا ہے دوسرا کوثر
مرے دل میں شرابِ حبِّ حیدر کا اثر بھر کے

نگہ اٹھتی نہ تھی اللہ رے رعبِ ضیغمِ حیدرؑ
بوقتِ جنگ کیونکر دیکھتے اعدا نظر بھر کے

بھرے ہیں ذہن میں چن چن کے باغِ مدح سے مضموں
سبد میں جس طرح گلچیں رکھے گلہائے تر بھر کے

جلال آیا ہے عبّاسِ جری کو سرخ آنکھیں ہیں
قیامت ڈھائے ہیں خوں میں تیغِ تر بھر کے

رضا رن کی ادھر لیتے ہیں شہ سے تشنہ لب ناصر
رکھے جاتے ہیں ساغر نہر کوثر پر ادھر بھر کے

جواں کے مشتری ہیں قصرِ جنت دینگے قیمت میں
رکھے ہیں اس لیے آنکھوں میں اشکوں کے گہر بھر کے

غمِ شبّیر میں در پردہ کیا تزئین ہوتی ہے
ہوا رشکِ گلستاں داغِ ماتم سے جگر بھر کے

جوانی پر جو آئے تھے تو ماں اک اک سے کہتی تھی
کوئی دیکھے نہ لوگو میرے اکبر کو نظر بھر کے

بمجبوری نکالا تیر تو منہ پھیر کر لیکن
نہ دیکھا شہ نے زخمِ گردنِ اصغر نظر بھر کے

کہا زینبؑ نے مر جائے وہ دلبر کھا کے یوں برچھی
کبھی ماں باپ نے دیکھا نہ ہو جسکو نظر بھر کے

زہے قسمت خوشا تقدیر ان رندوں کی اے فائقؔ
پلائیں خود جنھیں ساقیٔ کوثر جام بھر بھر کے

(محرم نمبر ۱۳۴۶ھ)

میرا انجامِ وفا

قطعہ در شان والاشان قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباس ع

شاعر حقیقت نگار مسیح العصر جناب حکیم صاحب عالم سید محمد قاسم صاحب سرپرست دواخانہ معدن الادویہ لکھنؤ

اے کہ تیرے نام سے روشن ہوا نامِ وفا
تیرے پرتو سے چمک اٹھے در و بامِ وفا

سرخیِ خونِ رگِ جاں سے تری حق کی قسم
حشر تک تاباں رہیگا روئے گلفامِ وفا

جانِ احمدؐ روحِ حیدرؑ خنکیِ چشمِ حسینؑ
صبحِ امیدِ حرم تسکین و آرامِ وفا

تجھ کو خود خاتونِ جنت نے کہا اپنا پسر
اللہ اللہ یہ جلیل القدر انعامِ وفا

نام تیرا کشورِ ایماں کا پرچم ہوگیا
دیکھ اے ابن امیرؑ و میرِ انجامِ وفا

تو نہ تھا معصوم لیکن یہ شرف صلِّ علیٰ
عصمتیں تجھ پر فدا دل سے باکرامِ وفا

تو ہے میرِ میکشانِ الفتِ آلِ رسول
وہ صبوحی ہو کہ دورِ ساغرِ شامِ وفا

جوش کھا کھا کر رہا خونِ شہادت اُف نہ کی
یوں تری ہر سانس تھی پابندِ احکامِ وفا

خود تو پیاسا ہی رہا لیکن یہ سقائی کا فیض
ہوگیا سیراب ذوقِ تشنۂ کامِ وفا

صد ہزاراں جامِ کوثر ایک تیری تشنگی
سو بہاریں خلد کی اور اک ترا گامِ وفا

جانِ دیگر تو نے رکھ لی آبروِ اسلام کی
موت تیری بن گئی دارا ئے اکرامِ وفا

حسرتیں حرب و وغا کی دل کی دل میں رہ گئیں
اے اسیرِ بندگی پابندِ آلامِ وفا

مدتیں گذریں تری آواز کو لیکن ہنوز
دہر میں گو نجا ہوا ہے تیرا پیغامِ وفا

تیرے جد کا ہوں گدا اے ساقیِ کوثر کے لال
آج دے بھر بھر کے مجھ کو بادۂ جامِ وفا

(از محرم نمبر ۲۷ھ)

کلامِ حامد

ذیل میں چند بندوں میں انصار امام حسین علیہ السلام کی شان وصفت دکھائی گئی ہے، عاشور محرم کی قیامت خیز سحر ہو، نعمائے امام نماز سحر میں مصروف ہیں اور مح نماز ہیں صبح سے خطاب کیا گیا ہو۔ جس طرح نظم میں یہ چیزیں ادا کی گئی ہیں اس سے جناب سید حامد علی صاحب سب جج جیسے کہنہ مشق اور اپنے رنگ میں بے مثل اور یکتا مرثیہ گو کے انتہائی کمال کا اظہار ہوتا ہے یہ غیر مطبوعہ کلام محرم نمبر کے لیے مخصوص طور پر جناب ممدوح نے مرحمت فرمایا ہے جو اُن کی دیرینہ عنایت کا ایک یادگار ضمیمہ ہے

وقار فوج شہ کربلا دکھاتا ہوں ۔۔۔ کمال جرأت شان وفا دکھاتا ہوں
فروغ جلوۂ دشت وغا دکھاتا ہوں ۔۔۔ سماں سحر کا چمن خلد کا دکھاتا ہوں
سہانا وقت ہے پھیلی ہوئی صباحت ہے
بہار باغ بنی اُسے زمیں بھی جنت ہے

زبان حال سے سنیئے ثنائے فوج حسینؑ ۔۔۔ ستارۂ سحری ہے جمال فوج حسینؑ
عیاں ہے ڈوبتے تاروں سے حال فوج حسینؑ ۔۔۔ بقائے دیں کیلئے ہے زوال فوج حسینؑ
خجل شفق کو کریں گے لہو میں یہ بھر کے
فروغ مہر شریعت دکھائیں گے مر کے

وہ ابتدائے سحر وہ فلک کے نظارے ۔۔۔ رواں زمیں کی طرف نور کے وہ فوارے
اُٹھے ہیں خواب سے یوں چرخ دیں کے سیارے ۔۔۔ بنے ہیں نیند بھری آنکھیں ڈوبتے تارے
صغیر ہوئے فلک دیکھتے ہیں تن تن کے
جوان لیتے ہیں انگڑائی کہکشاں بن کے

عیاں ہر اک سے کیا شوق اقتدائے امام ۔۔۔ ملی جبیں پہ تیمم میں خاک پائے امام
پئے نماز مصلے پہ اپنے آئے امام ۔۔۔ ہوئے شریک جماعت درود لائے امام
ملی جلی ہوئی طاعت کا خاتمہ دیکھے
سحر گندھی ہوئی تسبیح فاطمہ دیکھے

نہ دیکھی ہو گی کبھی اے سحر یہ شان نماز ۔۔۔ بلند چرخ سے ہے رفعت جہان نماز
نہ دے سکے ترے تارے جو امتحان نماز ۔۔۔ کیا نہ رب نے انھیں انجم آسمان نماز
وہ زیر سقف فلک انجم حق زمیں پر ہیں
خدا کے پاس وہ ہیں اور یہ عرش دیں پر ہیں

سحر بتا خط ابیض پہ کیوں تو نازاں ہے ۔۔۔ وہ مثل آہ شہ دیں سے خود پشیماں ہے
کب اسکے طول میں یہ نور شوکت و شاں ہے ۔۔۔ جماعت اہل مودت کی سطر قرآں ہے

کھلی ہوئی ہے یہ آیت کہ نور کی صف ہے
جگہ چھٹی ہوئی بین السطور مصحف ہے

ضیا سے اس کی جو جام پھولوں کے چھلکے   برائے سجدہ ملے رنگ جسم پرنم کے
ہیں خوف سے رخ آل براخر غم کے   گل فسردہ پہ قطرے پڑے ہیں شبنم کے
عیاں ہر چہرول پہ صنعت یہ دست قدرت کی
ہیں لوح نور پہ گلکاریاں عبادت کی

محیط شوق میں دیکھئے سحر یہ منظر دیں   بلند کیوں نہ ہو موج قیام سرور دیں
جبیں سے انکے بنے سجدہ گاہ اختر دیں   دم قعود وہ شان خدیو کشور دیں
تمام بندگی حق شہ حجاز نے کی
سلام پڑھ کر انہیں تسلیم خود نماز نے کی

فلک کا پیرہن اے صبح گو کہ آبی ہے   شفق کے رنگ میں ملجانے سے گلابی ہے
گل رسول جو ہر ایک بوترابی ہے   لباس خاک کا شان خدا گلابی ہے
زمیں جو عکس رخ شہ سے نور پاتی ہے
فلک کو باغ شہادت کی ضو دکھاتی ہے

بتا سحر اثر سوز انقلاب بڑھا   وہ کیا ہوئی تری ٹھنڈک کچھ التہاب بڑھا
پس از دعا جو فروغ رخ جناب بڑھا   زیارت رخ مولا کو آفتاب بڑھا
زبان ضو سے ثنائے امام کرنے لگا
کرن کی ہاتھ بڑھا کر سلام کرنے لگا

جو دھوپ پھیل گئی اہل شام بڑھ آئے   ادب کو چھوڑ کے سوئے امام بڑھ آئے
ادھر بھی شیر اٹھا کر حسام بڑھ آئے   پئے حفاظت مولائے انام بڑھ آئے
نہ چھوڑا تاروں کے ہالے نے دین کے مہ کو
خدا کی فوج نے حلقے میں لے لیا شہ کو

خیال جنگ جوانوں کو بے حساب بڑھا   عطش کے سوز میں کچھ اور التہاب بڑھا
قدم جو پیروں کا سوئے رہ ثواب بڑھا   ادھر سے یہ بڑھے اس سمت سے شباب بڑھا
یہ جزرومد تھا نیا قلزم شجاعت میں
جوان ہو گئے بڈھے بھی جوش جرأت میں

بڑھی خیال وغا میں جو فوج شہ سیدھی   غضب میں بات نہ بچوں نے کی ادھر سیدھی
جوان ابل پڑے کج ہو گئی نظر سیدھی   جو پیر تن کے اٹھے ہو گئی کمر سیدھی
لہو کے کھولنے سے تہلکہ تھا بدنوں میں
تھے ہاتھ تیغوں پہ ایسی کشش تھی قبضوں میں

(محرم نمبر ۱۳۴۶ھ)

تائید ایزدی

ذیل کا مخمس محترمہ روپ کنواری صاحبہ (تلمیذ جناب سید فضل رسول صاحب المتخلص بہ فضلؔ شاگرد حضرت "انسؔ" اعلی اللہ مقامہٗ) کی تصنیف لطیف ہے اس خمسہ کے پانچ شعر پر مصنفہ نے مصرعے لگائے ہیں۔ مابقی خمسہ خود مصنفہ ممدوحہ کی تصنیف ہے۔ موصوفہ فارسی میں منشی کامل کا امتحان پاس ہیں۔ اور انگریزی میں سکنڈ ایر کی طالبہ ہیں۔ آپ ایک ممتاز معزز برہمن خاندان سے ہیں۔ مبدأ فیض سے آپ کو ملکۂ شاعری خاص طور سے ودیعت ہوا ہے۔ چنانچہ گذشتہ چار سال سے آپ مداحی اہل بیت و ائمہ علیہم السلام کا شرف حاصل کر رہی ہیں۔

جزاک اللہ فی الدارین خیرا

ترا کیسا پیارا یہ نام ہے کہ جو حق سے تجھ کو عطا ہوا
جبھی حق سے اتنا تو مل گیا کہ نہ فرق نام کو بھی رہا
تری شان دیکھ کے مرتضیٰ یہ کسی نے خوب ہی ہے کہا
لمعات وجھک اشرقت سکنات حسنک اعتلا
بہ طلوع عارض شمس تو شب تار ما قمر الدجیٰ

ہے تری ولا میں سلامتی جو ترا عدو ہے وہ لعنتی
مجھے میں بھی اتنا ہوں جانتی تو ہے فاطمہؑ کا دھرم پتی
ترا در ہے باب اجابتی تو ہے شمع قصر رسالتی
در بحر فضل و کرامتی گل باغ حسن و لطافتی
چہ بہار رحمت آیتی تو لوائے دولت ھل اتیٰ

تو ہے نفس سید مرسلیں ترا آسمان تری زمیں
جو نہ ہوتا کعبہ کا تو مکیں بھلا بنتا پھر یہ حرم کہیں
تو امام خلق و امام دیں تو اماں ہے سب کی تو ہی امیں
بہ نگاہ لطف و کرم ببیں کرمے بجن بمن حزیں
کہ سزد ترا ہمہ آں چنیں دل و جان حضرت مصطفیٰؐ

نہیں کس پہ امر یہ منجلی تجھے حق نے اپنا کیا ولی
ترے در پہ سب کو اماں ملی تجھے جب پکارا بلا ٹلی
ترا نام لیتے ہی یا علیؑ ہوئی شادمانی گئی بیکلی
توانیس خاطر بیدلی تو نصیب عاشق بسملی
گر ہے گشا کہ تو کاملی مثل السفینۃ النجا

جو نصیریوں نے تجھے کہا وہی میں کہوں تو نہیں روا
تو خدا کے بعد ہے تا خدا تو نبیؐ کے بعد ہے پیشوا
ہے لقب ترا شہ لافتا تو ہے زور بازوئے مصطفیٰ
تو ولی سرور اتقیا تو وصی احمد مجتبیٰؐ
بفروغ آیت انما تو علیؑ و حیدر و مرتضیٰ

تری ذات دافع درد و غم یہی روپ کماری کا ہے بھرم
کوئی بعد احمدؐ ذی حشم نہیں مثل تیرا شہ امم
جو نہ لیتا کعبہ میں تو جنم نہ خدائی ہوتی بتوں کی کم
یوں ہی پوجتے عرب و عجم کہ تھا جہل ان میں تری قسم

وہ خدا کے گھر میں جو تھے صنم انھیں دم میں تو نے مٹا دیا

تو بہار باغ نعیم ہے تو خدا کا فضل عمیم ہے — تو ہی مجز نوحؑ و کلیم ہے ترا خُلق خلق عظیم ہے
تو حلیم ہے تو رحیم ہے تو علیم ہے تو حکیم ہے — ترا قلب قلب سلیم ہے ترا نفس نفسِ کریم ہے
وہ خدا کا دشمن خاص ہے جو لعین تیرا عدو ہوا

تو قسیم جنت و نار ہے تو شفیع روز شمار ہے — ترے دم سے جی کو قرار ہے تو ریاض دیں کی بہار ہے
مدد اے جہاں کے گرہ کشا مرا غم سے سینہ فگار ہے — دم یاس تو ہی انیس ہے تری ہر جہت میں پکار ہے
تو شکستہ حالوں کی آس ہے تو ہی ٹوٹے دل کا ہے آسرا

تو امیر عرش سریر ہے تو زمین کا بدر منیر ہے — تو ہزبر رب قدیر ہے تو رسول حق کا وزیر ہے
تری حرص کوئی اگر کرے وہ ذلیل ہے وہ حقیر ہے — تو بشر کی فرد میں فرد ہے نہیں تیرا مثل و نظیر ہے
تو جواں کی تیغ اصیل ہے تو ہر اک ضعیف کا ہے عصا

سر عرش جب گئے مصطفےٰ تو وہاں بھی تیرا ظہور تھا — جو ادھر حبیب تھا جلوہ گر تو ادھر تو حق کے حضور تھا
اُسے فاصلہ دو کماں کا تھا تو قریب رب غفور تھا — کہوں کیسے بندہ کی بات ہے کوئی راز اسمیں ضرور تھا
وہ جو ہاتھ نکلا حجاب سے وہ کسی کا تیرے سوا نہ تھا

تو زبانِ حق تو بیانِ حق تو نشانِ حق ہے حقیقتاً — وہی تیری بات ہے یا علیؑ جو رسول پاک کا تھا سخن
وہی عادتیں وہی خصلتیں وہی نفس تیرا وہی چلن — میں نثار تیرے تہ زمن نظرے بمن کرمے بمن
تو ہی عاجزوں کا معین ہے تو ہی بیکسوں کا ہے آسرا

تو ہی منتخب تو ہی منتجب تو امیر ہے تو شہ عرب — تو خدا کا بندہ خاص ہے تو رسولؐ پاک کا ہم نسب
کہیں مرتضےٰؑ کہیں مقتدا کہیں ایلیاؑ ہے ترا لقب — تو خدا کے گھر کا مکین ہے ہوا کعبہ تیرے سبب
جو رہا تھا برسوں صنم کدہ اُسے قبلہ تو نے بنا دیا

تو شہید ہے تو شہود ہے تو ولی رب ودود ہے — وہ بلند تیرا وجود ہے کہ خدا کا جس پہ درود ہے
ترے دم سے حق کی نمود ہے تو خدا کے دیں کا عمود ہے — تو قیام ہے تو قعود ہے تو رکوع ہے تو سجود ہے
تو غرضکہ کُل نماز ہے ترا ذکر ذکر خدا ہوا

کوئی بعد احمد مجتبیٰ نہیں مثل تیرا شہِ ہدیٰ — تو رئیس کشور قل کفیٰ تو امیر مسندِ انما
تو ہی دست حق تو ہی وجہ حق تو ہی عین حق تو ہی حق نما — تو خدا کے خلق کا ناخدا ہے نصیریوں کا تو ہی خدا
تو اسد کی بیٹی کا لال ہے تو حسنؑ و حسینؑ کا ہے پتا

تری گفتگو ہے کلام حق ہے پیام تیرا پیام حق — وہی نام تیرا جو نام حق وہی کام تیرا جو کام حق
ترے ساتھ حق ہے حقیقتاً تو مطیع حق تو امام حق — تری شان کیوں نہ بلند ہو ترا نام جبکہ ہو نام حق
تجھے حق نے بخشا ہے وہ شرف جو کسی کا بعد نبی نہ تھا

تو خدا کا فضل ہے یا علی تجھے کیوں نہ فضل خدا کہوں — نہ خدا کو تجھ سے ملا کہوں نہ خدا کو تجھ سے جدا کہوں
جو خدا کہوں تو خطا کروں نہ خدا کہوں تو بجا کہوں — تجھے جبکہ میں نہ سمجھ سکوں تو تو ہی بتا تجھے کیا کہوں

تجھے سمجھا کوئی تو بس خدا جو خدا کے بعد تو مصطفٰے

وہ جو مُہرِ کتفِ نبی پہ تھی ترا نقشِ پا تھا وہ یا علیؑ
تجھے بعد ختمِ پیمبری ملی حق سے مسندِ سروری

ہوئے جس قدر بھی مُشی رشتی تری کر سکے نہ برابری
جو کسی نے کی تری ہمسری ہوئی اُس سے ذہن میں ابتری

کیا غصب جس نے کہ حق ترا اُسے کچھ بھی خوفِ خدا نہ تھا

تری اور نبی کی ثنا میں پُر ہے کتابِ حق کا ورق ورق
وہ درودِ پاک کا اہل ہے تو سلامِ حق کا ہی مستحق

جو نبی حق وہ ولیِ حق جو ولی حق وہ نبی حق
ہے کتاب دونوں کی ایک ہی وہی مدّعا وہی اک سبق

وہ رسول ہے تو امام ہے یہی فرق گویا ہے ظاہرا

جو خدا کا سرِّ خفی ہے تو تو نبی کا محرمِ راز ہے
ترے اختیار میں کیا نہیں تو خدا کے گھر کا مجاز ہے

ترا نام اسی سے علیؑ ہوا تیری ذات بندہ نواز ہے
مرے قلبِ زار و نزار کا تو ہی سوز ہے تو ہی ساز ہے

مری ناؤ عین بھنور میں ہے مری کر مدد مرے ناخدا

ہیں رسول مہرِ مبیں اگر تو تجھے خدا نے کیا قمر
میں فدا ترے تہِ بحر و بر ترے در پہ سب کے جھکے ہیں سر

مجھے شام ہووے کہ ہو سحر ترا نام جپتی ہوں ہر پہر
نہیں رُوپ کنوآری کو کچھ خطر کہ علیؑ سا اُس کا ہے راہبر

جو ہو ظلِّ فضلِ رسول میں اُسے خوفِ روزِ حساب کیا

(محرم نمبر ۱۳۵۴ھ)

(سر جُدا ہو جائے گا سجدہ ادا ہو جائے گا)

(سید آل رضا صاحب رضاؔ، گورنمنٹ ایڈوکیٹ" از کراچی)

شرحِ غم یوں بھی کبھی شغلِ عزا ہو جائے گا
مُنہ سے نکلے گا حسینؑ اور مرثیا ہو جائے گا

جی بھر آئے گا، چلے جیسے مدینہ سے حسینؑ
اشک ٹپکیں گے، ورودِ کربلا ہو جائے گا

دل جو تڑپا، بندھ گئی نیت نمازِ عشق کی
دم جو نکلا، آخری سجدہ ادا ہو جائے گا

مل گیا پیاسے کو پانی، آ گیا ذکرِ حسینؑ
موجِ کوثر کا یہیں سے سلسلا ہو جائے گا

روح پرور ہے یہ کیفِ لذتِ کام و دہن
اور باتیں کیا کریں مُنہ بدمزا ہو جائے گا

ناتمامی کی دوامی مُہر ہے اس ذکر پر
جب مکرّر تذکرہ ہو گا نیا ہو جائے گا

عالمِ تخلیق میں یکتا تھی، یہ وضعِ نماز
سر جُدا ہو جائے گا، سجدہ ادا ہو جائے گا

ہم کہاں، اے دل! ہمارے کربلا والے کہاں
ہاں اگر جنت دلا دیں، سامنا ہو جائے گا

جاں بحق ہو جا درِ شاہِ شہیداں پر رضاؔ
کچھ نہ کچھ وابستگی کا حق ادا ہو جائے گا

(محرم نمبر ۱۳۷۲ھ)

اصحابِ حسینؑ

(لسان الہند عالیجناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ لکھنوی اعلی اللہ مقامہ)

اصحابِ حسینؑ ابن علیؑ جانِ وفا تھے — ایمان سے کہتا ہوں کہ ایمانِ وفا تھے
تابندہ رُخ اُن کے تھے کہ قرآنِ وفا تھے — دِل تھے کہ چراغ تہِ دامانِ وفا تھے

گنجینۂ اسرار تھا سینوں سے نمایاں
باطن کی تجلّی تھی جبینوں سے نمایاں

دیکھے نہیں دُنیا نے کہیں ایسے وفادار — مرنے کے لیے موت سے پہلے ہوئے تیّار
پہنے ہوئے زرہوں پہ دلوں کو دمِ پیکار — سامان مسرّت تھے اُدھر موت کے آثار

تکلیف میں آفاق سے منھ موڑ رہے تھے
ہنس ہنس کے مگر خاک پہ دم توڑ رہے تھے

وہ خطبۂ سلطانِ حجازی شبِ عاشور — اصحاب سے کہنا کہ ہوئی عافیت اب دُور
ہاں ساتھ مرا چھوڑ دو گر زیست ہے منظور — کہنا وہ رفیقوں کا کہ اے سیدِ محصور

مرجائیں مگر رشتۂ بیعت کو نہ توڑیں
کھاجائیں درندے ہمیں گر آپ کو چھوڑیں

یہ سن یہ بن عوسجہ کی ہمت عالی — وہ دبدبہ وہ شان وہ آثار جلالی
بل ابروؤں پر دل غمِ اِنساں سے خالی — باندھے ہیں ہلال بجلی تیغ ہلالی

فردوس کی نکہت دلِ عالم میں بسی ہے
مرنے پہ کمر ابن مظاہر نے کسی ہے

اے سعد و رذی مرتبہ کے مرتبہ دانو — پوری ہوئی حجت مگر اعجاز بیانو
جو کام کیا تم نے یہاں شیر جوانو — انساں سے دشوار تھا وہ تشنہ دہانو

جس شان سے میدان میں لی خلد کی جاگیر
تاریخ دکھاتی نہیں ایسی کوئی تصویر

جنت کے لیے قلب صفا کیش تھے بے تاب | ہیچ اُن کی نگاہوں میں رہا عالمِ اسباب
اخلاق کے دفتر میں وفا ان کی ہے وہ باب | جس سے کہ نکالے گئے ہیں سینکڑوں ابواب
ہر باب ہے رنگین چمنِ طبعِ نکو سے
لکھا ہے جنھیں تام وفا دل کے لہو سے

اسلام کے خادم تھے مگر اصل میں مخدوم | اسرارِ وفا جن سے جہاں کو ہوئے معلوم
توصیف اُن اصحاب کی کس طرح ہو مرقوم | جن کو بابی انت و اُمی کہیں معصوم
لاریب کہ خجلت دہِ افلاک ہوئی وہ
یہ دفن ہوئے جس میں زمیں پاک ہوئی وہ

یہ ولولہ یہ جوش یہ ہمت ہو مبارک | خونیں کفنو تم کو یہ خلعت ہو مبارک
تا شامِ ابد سایۂ رحمت ہو مبارک | پھیرے ہوئے شیرو تمھیں جنت ہو مبارک
گرداب بلا خیز سے کیونکر اُبھر آئے
ڈوبے جو ہویں لب کوثر اُدھر آئے

جب فوج مخالف ہوئی آمادۂ پیکار | یوں بیٹھ گئے ٹیک کے گھٹنے وہ وفادار
تانے ہوئے نیزوں کی انی جان سے بیزار | جس طرح کہ جنبش نہ کرے کوہ گراں بار
کی فوج نے جس دم حرکت سیل کی صورت
سینوں کو سپر کر دیا اللہ ری جرأت

یوں فوج میں اعدائے الٰہی کے در آئے | جس طرح پئے صید زبوں شیر نر آئے
دامن جو پھٹا گرد کا داغ اور ابھر آئے | دم توڑتے میدان میں مسلم نظر آئے
کی ہے جو وصیت کوئی بھولے گا نہ زنہار
اے بھائیو! احمدؐ کے نواسے سے خبر لو

تھے خون کے قطروں میں شجاعت کے شرارے | رخ سرخ تھے سوکھی تھی زباں پیاس کے مارے
ٹوٹے تھے پہاڑ اس پہ بھی ہمت نہیں ہارے | انگڑائیاں لیتے ہوئے جنت کو سدھارے
نصرت کا تقاضا سبق آموزِ وفا تھا
بڑھنے سے صحابہ کے لہو اور بڑھا تھا

وہ رعب و جلالت کہ ہر اک دیکھ کے ششدر
شیرانہ نظر ڈالی تو تتر بتر ہوا لشکر
تھے رزم میں اس بات سے بے خوف دلاور
موت ان پہ گرے یا وہ گریں موت پہ جاکر
تیغ اس پہ لگائی تو کبھی اس کی سپر لی
ڈوبے صفِ اوّل میں تو آخر کی خبر لی

سمجھے ہوئے تھے خوب کہ یہ موت ہے جینا
یہ ہمّتِ دل ہے یہ شجاعت کا قرینا
ابرو پہ شکن آئی نہ ماتھے پہ پسینا
مینھ تیروں کا برسایا، تانے رہے سینا
مرکرنے مگر ایک قدم بھی نہ بڑھنا پایا
جب تک کہ رہی جان ثبات اپنا دکھایا۔

طوفانِ مصائب کا بلاؤں کا وہ سیلاب
لرزے میں زمیں دشت کی تھی صورتِ سیماب
اک بوند تھی پانی کی جہاں گوہرِ نایاب
بھرپور جوانی پہ تھا خورشید جہاں تاب
کانٹوں کی زبانوں میں سنانوں کی خلش تھی
لودے رہے تھے خاک کے ذرے وہ تپش تھی

دکھلائی بیاباں نے بہت شعلہ فشانی
ہمّت کو بڑھاتی ہی رہی تشنہ دہانی
جب آئی نظر دور سے موجوں کی روانی
منھ پھیر لیا دیکھ کے بہتا ہوا پانی
دل شاد تھا بخشش کے سہانے پہ کھڑے تھے
سیراب تھے کوثر کے کنارے پہ کھڑے تھے

ثابت کیا اسبات کو تم نے سرمیداں
یہ قدرتِ انساں ہے یہ عظمتِ انساں
شیرازۂ دل ہو نہ کسی وقت پریشاں
ثابت قدمی چاہئے ہر کام ہے آساں
مرجاتے ہیں ہوتا ہے جنھیں پاس وفا کا
طے ہوتا ہے یوں مرحلہ تسلیم و رضا کا

کمہلائے ہوئے پھول تھے خاروں کے مقابل
یا صبح کے تارے تھے ستاروں کے مقابل
محدود پیادے تھے سواروں کے مقابل
گنتی کے مجاہد تھے ہزاروں کے مقابل
یوں ہوتی ہے تعداد بہتّر کی بہ مشکل
جب فوج میں گہوارۂ اصغرؑ بھی ہو شامل

دل میں نہ دغا جس کے ہو محتاج اُسے سمجھو
جو لوٹ لیا جائے نہ تاراج اُسے سمجھو

گیسو ہوں اٹے خاک میں گر تاج اُسے سمجھو ۔۔۔ سر نوک سناں پر ہو تو معراج اسے سمجھو
گلزار خلیل آتش سوزاں کا بھڑکنا
قوسین کی منزل ہے کمانوں کا کڑکنا

اے مسلم خوابیدہ ذرا ہوش میں آجا ۔۔۔ کیوں دور ہے اسلام کی آغوش میں آجا
پی بادۂ سر جوش ذرا جوش میں آجا ۔۔۔ بے کیف ہے رندان قدح نوش میں آجا
ہے درس و فا شوکت اسلام عیاں ہو
یہ پیر کہن سال نئے سر سے جواں ہو

گاڑا ہے نشاں جس کا پیمبر نے وہ اسلام ۔۔۔ دی جس کو غذا حمزہ و جعفر نے وہ اسلام
آغوش میں پالا جسے حیدر نے وہ اسلام ۔۔۔ سینچا ہے جسے خوں سے بہتر نے وہ اسلام
راحت اُسے ہو سجائی مگر ظلم سہے خود
اسلام کو آزاد رکھا قید رہے خود

اسلام جو قانون رسول مدنی ہے ۔۔۔ اسلام دلاور جو دم تیغ زنی ہے
اسلام کہ دل اُس کا ہمیشہ سے غنی ہے ۔۔۔ اسلام کہ کھیل اس کا فقط بُت شکنی ہے
گلرنگ ابھی خون سے دامان قبا ہے
یہ شیر کہیں کفر کی ہیبت سے دبا ہے

اسلام کہ تائید خدا جس کی ہے ہمراز ۔۔۔ ہر وقت رہی قوت حق ہمدم و دمساز
توحید کے نعروں میں نہاں صور کی آواز ۔۔۔ ہر سانس میں پوشیدہ ہیں اعجاز پہ اعجاز
مُردوں کو جلانا فقط اک بات ہے اسکی
کہتے ہیں شب قدر جسے رات ہے اسکی

اے معشر اسلام محبت میں بسر ہو ۔۔۔ ہر دم رہو پابند وفا مرد اگر ہو
بڑھ جائے اگر وقت کوئی خون میں تر ہو ۔۔۔ اصحاب حسینی کی طرح سینہ سپر ہو
یوں صاف محبت میں رکھو باطن و ظاہر
ہر فرد بنے تم میں حبیب ابن مظاہر

محرم نمبر سنہ ۱۳۴۵ھ

ایامِ عزا کیلئے مخصوص لٹریچر

نام کتاب	مصنف	قیمت	نام کتاب	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	مصنف	قیمت
مجالس خاتون	مولانا ظفر الحسن صاحب قبلہ	للعہ	گریۂ فغاں	حیدر رضوی	۸ر	دوح فرات	فضل صاحب	۱۲ر
زینتہ المجالس	سید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ	ہے	آئینہ کربلا	اولاد حسین صاحب	۸ر	موج فرات حصۂ اول	"	۱۲ر
ذاکری کے جدید سودات		عہ	نہج البکاء	رقیہ بیگم صاحبہ	۶ر	" حصۂ دوم	"	۱۲ر
تبلیغی ذاکر (حصۂ اول)		عہ	خون دل	راز اجتہادی	۴ر	" حصۂ سوم	"	۱۲ر
بستان المجالس		۸ر	دقار غم	سید تاجدار حسین صاحب	۸ر	" حصۂ چہارم	"	۱۲ر
ذاکری کی پہلی کتاب حصۂ اول	مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ	۱۰ر	تصویر درد	محترمہ کنیز فضہ	۹ر	" حصۂ پنجم	"	۱۲ر
" " حصۂ دوم	" "	۱۰ر	تنویر غم	جعفر رضا صاحب	۵ر	فرات کی لہریں (جدید)	"	۱۲ر
ذاکری کی دوسری حصۂ اول	" "	۱۴ر	ساغر تسنیم	مرغوب حسن صاحب	۱۲ر	پیاسں	قرار لکھنوی	۸ر
چودہ ستارے (چودہ مختصر قصائد)		۶ر	حدائق مرغوب	"	۱۲ر	نورانی آنسو	"	۸ر
جلوۂ طور		۲ر	معراج	عارف رضوی	۳ر	سہمے آنسو	"	۸ر
چودہ ساقی		سہر	اشارات غم حصۂ اول	نجستم آفندی	عہر	آئینہ صبر	"	۸ر
(نوحہ جات)			" حصۂ دوم	"	عہر	اسیر کربلا	تاریخوار	۳ر
گلزار حقیقت		۸ر	" حصۂ سوم	"	۸ر	تصویر کربلا	"	۳ر
بزم کربلا	سید شبیہ الحسن صاحب	۱۰ر	آیات ماتم	"	۱۲ر	دفتر ماتم	"	۳ر
روداد کربلا	سید رضی حسن صاحب عابدی	۱۰ر	کربل نگری	"	۴ر	افسانۂ کربلا	"	۳ر
حیات غم	"	۱۰ر	حسینی سنسار	"	۴ر	مظلوم فرات	"	۳ر
خونیں مناظر	محترمہ بانو سید پوری	سہر	زین العزا	سید زین العابدین صاحب	۱۰ر	یادگار کربلا	"	۳ر
جذبات	محمد عادل صاحب	سہر	یاقوت والماس	سید عظم حسین صاحب اعظم	۶ر	ہمہ ماتم	رزم ردولوی	۸ر
چاند زہرا	والدہ سید انصار حسین صاحب	۱ر	صراط کربلا		۶ر	منظر درد	"	۱۰ر
بہتر ستارے		۳ر	مرقع کربلا		۳ر	معرکۂ غم	"	۱۰ر
آفتاب کربلا	صدر اجتہادی	سہر	قندیل فرات	شبیر حسن صاحب قبتی	۶ر	شاہراہ حسینی	ساحر نجمی	۸ر
شام غریباں	قرار لکھنوی	سہر	شمع فرات	فضل صاحب	۱۲ر	تمثیل درد	بانو سید پوری	۸ر
حسینی پرچم	خنداں "	سہر	عروج فرات	"	۱۲ر	ماتم کدہ	زائر سیتاپوری	۶ر
بیاض عابدیہ	سید ہاشم رضا صاحب عابدی	عہر	جلوۂ فرات	"	۱۲ر	تنویر کربلا	شارب لکھنوی	
چراغ وحدت	سید مظفر حسن نقوی	سہر	چراغ معرفت	"	۸ر	کرب و بلا	"	۸ر
						معرکۂ فرات	قرار لکھنوی	۶ر

قرآن مجید (مولانا فرمان علی صاحب) عمہ

حمائل " " عہر

تحفۃ العوام .... ہے

وظائف الابرار .... عہر

مراثی سوز خوانی

نمبر	مطلع	قیمت
۱	زنداں میں جبکہ دختر شبیرؑ مر گئی	ار
۲	روانہ نہر لبن کو جو شیر خوار ہوا	ار
۳	مرقوم ہے یہ حال قیامت علی العموم	ار
۴	لاش اکبرؑ کی جو مقتل سے اٹھا لائے حسینؑ	ار
۵	مالک سلطنت کوفہ جو مختار ہوئے	ار
۶	مومنو اشک بہاؤ کہ محرم آیا	ار
۷	جب ذوالفقار ماتم اصغر میں رہ گئی	ار
۸	آج مقتل میں عجب بے سروساماں ہیں حرم	ار
۹	حاکم کا حکم یہ ہے کہ پانی بشر پئیں	ار
۱۰	کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے	۳ر
۱۱	کربلا میں شہ والا کے حرم لٹتے ہیں	ار
۱۲	جب داخل بہشت رسول خداؐ ہوئے	ار
۱۳	شہید ہو گئے جب رن میں سید والا	ار
۱۴	جب ہوئے بازوئے عباس قلم دریا پر	ار
۱۵	گھر سے جب بہر سفر سید عالم نکلے	ار
۱۶	رن میں جس دم صبح عاشور عیاں ہونے لگی	ار
۱۷	شہ پہ عباسؑ نے جب پیاس کی شدت دیکھی	ار
۱۸	جب کہ مسلم کے پسر گھر میں قضا کے آئے	ار
۱۹	سجادؑ کو بلوایا دوبارہ جو شقی نے	ار
۲۰	تنہا سپاہ شام میں جب گھر گئے حسینؑ	ار
۲۱	یا علی آیئے زنداں میں حرم روتے ہیں	ار
۲۲	عزیزو آج یہ نیرنگ ہے زمانے میں	ار
۲۳	جب حرم قلعہ شیریں کے برابر آئے	ار
۲۴	جب گل ہوا چراغ حرم قید شام میں	ار
۲۵	جب مشک بھر کے نہر سے عباسؑ غازی گھر چلے	۲ر
۲۶	چہلم کے روز شام سے جب آئے اہل بیت	ار
۲۷	جب شاہ کو طاقت نہ رہی تیغ زنی کی	ار
۲۸	انیسویں شب آئی جو ماہ صیام کی	ار
۲۹	واحسرتا کہ ماہ محرم گزر گیا	ار
۳۰	عزیزو شام کے زنداں میں جب حرم آئے	ار
۳۱	جب ذوالجناح بانو کے گھر رواں ہوا	ار
۳۲	جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا	ار
۳۳	خزاں بہار میں یارب کوئی نہال نہ ہو	ار
۳۴	جب قصد کیا شاہ نے کوفہ سے وطن کو	ار
۳۵	عباسؑ کے حصہ میں وفا حق نے عطا کی	ار
۳۶	کربلا میں حق و باطل کی وغا کیونکر ہوئی	ار
۳۷	پہنچا دیار شام میں جب سر امامؑ کا	ار
۳۸	عزیزو آج پہلی رات ہے ماہ محرم کی	ار
۳۹	جب جشن کا یزید سرانجام کر چکا	ار
۴۰	جب رن میں صبح قتل غریباں عیاں ہوئی	ار
۴۱	جب قتل رن میں ہو چکا لشکر حسینؑ کا	ار
۴۲	جب کٹ گیا زہراؑ کا چمن دشت بلا میں	ار
۴۳	لاش نوشاہ کی میدان سے لاتے ہیں حسینؑ	ار
۴۴	جب نونہال گلشن زہراؑ قلم ہوا	ار
۴۵	اے مومنو اولاد کا مرنا بھی ستم ہے	ار
۴۶	شیر خدا کے وصف کہاں تک رقم کروں	ار
۴۷	کوفہ میں جو پابند بلا ہو گئے مسلمؑ	ار
۴۸	دربار میں جب کٹ کے یتیموں کے سر آئے	ار
۴۹	تلف ہوئی جو شہ خوش خصال کی دولت	ار
۵۰	جب ہاتھ قلم ہو گئے سقائے حرم کے	ار
۵۱	اے مومنو کیا تعزیہ داروں کا ہو توقیر	ار
۵۲	خیمہ تاراج کیا جب کہ ستمگاروں نے	ار
۵۳	جب آئی شام کی بستی میں ننگے سر زینبؑ	ار
۵۴	سر کھلے قید میں جب دختر زہراؑ آئی	ار
۵۵	جب سبط مصطفےٰؐ نے وطن سے سفر کیا	ار
۵۶	سگرا بی بی کہ پرانچرا ڈارے بین سناوت ہو	ار
۵۷	دشت بلا میں گم علی اکبرؑ کی لاش ہو	ار
۵۸	حضرت سے کربلائے معلیٰ قریب ہے	ار
۵۹	مسجد میں قتل جب شہ خیبر شکن ہوئے	ار
۶۰	مجموعہ مہندی	ار/۶
۶۱	ہو روایت شترا سوار کسی کا نہ رسول	۳ر
۶۲	دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے	ار
۶۳	دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ	ار
۶۴	قریب کوفہ جو غم زدوں کا قافلہ آیا	ار
۶۵	جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیرؑ	ار
۶۶	آمادہ نبرد جو فوج خدا ہوئی	ار
۶۷	زنداں کے اندھیرے سے گھٹا دم جو حرم کا	ار

—۔ضروری۔—

ایک روپیہ سے کم کا وی۔ پی۔ نہ بھیجا جائے گا۔ علاوہ اس کے ہر قسم کی کتب خریدتے وقت ہم کو یاد کیجیے

ایّام عزا کی رونق مجالس اور مجالس کی زینت نوحہ و ماتم اور گریہ و بُکا سے ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ ہمارے سرفراز قومی بکڈپو نے امکی سال ایک ایسی جامع اور مفتخر بیاض "ریاض محن" خاص اہتمام سے چھاپی ہے کہ جس کی مثال سابق و حال کی بیاضی دنیا میں شائد نہ مل سکے۔

اس بیاض میں ندرت و خصوصیت یہ ہے کہ چہاردہ معصومین علیہم السّلام کے علاوہ اور بھی جن جن بزرگان دین و مخدرات عظمہ کی یادگاریں مجلس اور تابوت کے ذریعے اُنکی تاریخ وفات میں منائی جاتی ہیں ان سب کے حال میں مُکی نوحوں کے علاوہ ان کے تاریخی حالات زندگی بھی بطور تعارف مع تاریخہائے ولادت و وفات شریف درج ہیں جو نوحہ سے قبل حاشیہ خوانی میں بھی کام آسکتے ہیں۔

چونکہ یہ امر مسلّمہ ہے کہ رکن عزاداری مستورات ہوا کرتی ہیں۔ لہذا اُن کی دلچسپی اور گریہ و بکا کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔

اس بیاض کے مصنف و مولف سید ریاض علی صاحب ریاض جرولی ہیں جسے سرفراز بکڈپو نے شایع کیا ہے۔ علاوہ ٹائیٹل کے ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ باوجود ان خوبیوں کے قیمت علاوہ محصولڈاک صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔

(ملنے کا پتہ)

سرفراز قومی بکڈپو، قومی گھر، نادان محل روڈ، لکھنؤ (بھارت)

حصّہ دوئم

جسمیں امسال کے تازہ مضامین و منظومات شامل ہیں

رُوئیدادِ ذبحِ عظیم

۱۹۵۶ء
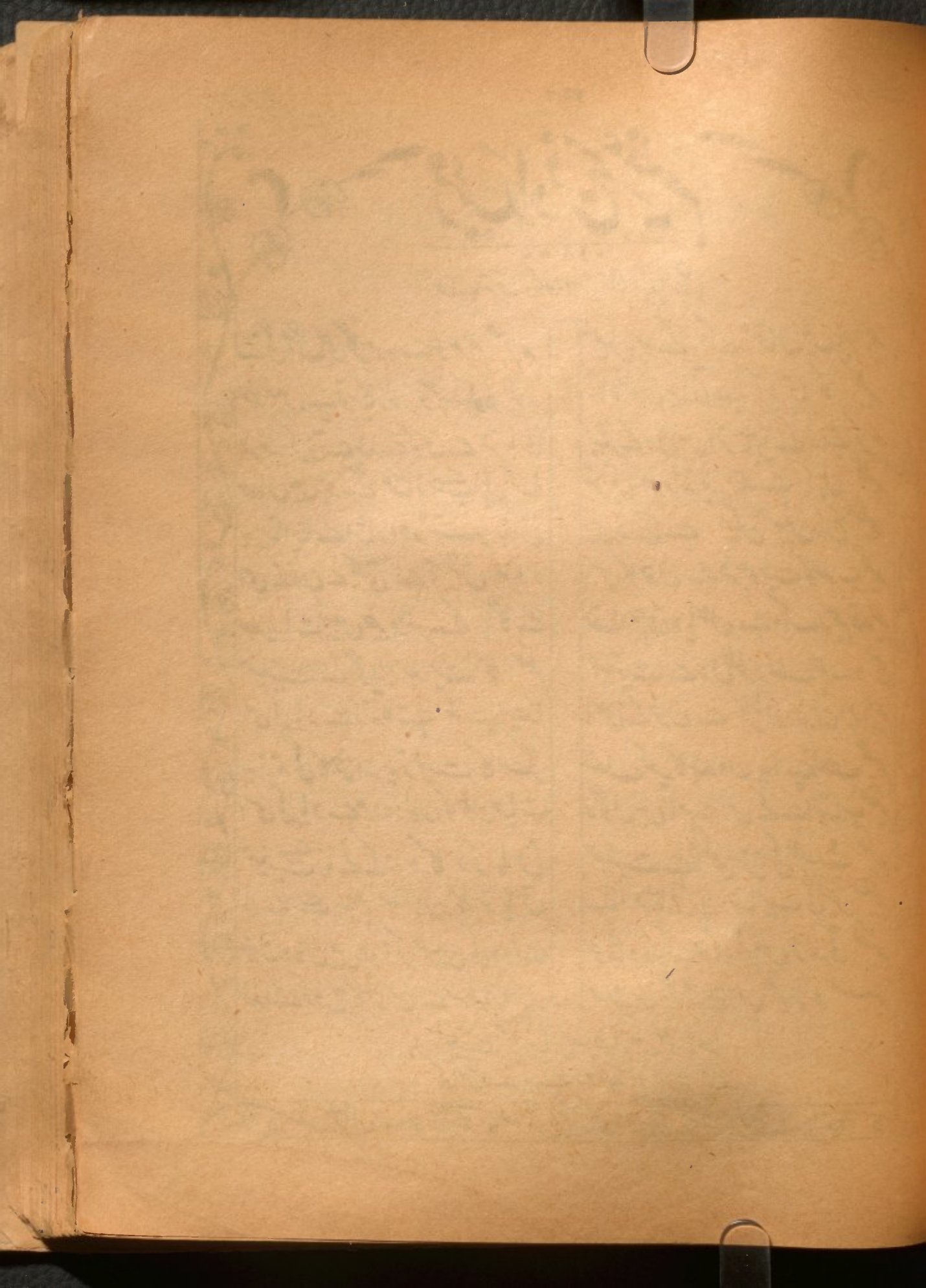
(جناب شرق نوگانوی وزیر آباد مغربی پاکستان)

بنے گی آگ بھی گلزار ہے جو عزم صمیم
خلیل ہو گئے اک امتحاں میں ابراہیم

نظر نہیں ہے تو بیکار طور و جلوۂ طور
نگاہِ شوق بناتی ہے آدمی کو کلیم

قریب کرتی ہے بندے کو حق سے قربانی
بشر کے دل میں اُترتا ہی آ کے ربِّ کریم

جہاں میں ہو گئے ممتاز سب اہلِ کسا
مُزمِّل اور مُدثِّر بنا ہے اہلِ گلیم

یہ اپنا اپنا ہے ایثار اور قربانی
نبی ذبیح ہے لیکن حسین ذبحِ عظیم

اسی کے خون سے بجھتی ہے آتشِ نمرود
اسی کا خون ہے فرعونیت کو ضربِ کلیم

جدید بات نہیں خیر و شر کے ہنگامے
تصادمِ حق و باطل ہے ایک رسمِ قدیم

حسینیت نے گرایا یزیدیت کا علَم
حسینیت سے دلِ ظلم و قلبِ جور دو نیم

اسی کی یاد سے زندہ ہے ملّتِ بیضا
اسی کے خون سے گلزار دینِ ابراہیم

یہ زندگی کا خزانہ یہ زیست کا لنگر
خدائے کعبہ کا بندوں پہ اپنے لطفِ عمیم

اسی کی یاد ہے مردہ دلوں کو خونِ حیات
رگوں میں نام سے اس کے ہے التہابِ عظیم

حسینیت ہے زمانے کے درد کا درماں
حسینیت ہے دکھی روح کی طبیب و حکیم

ملا ہے جسے پیامِ حسین کا تریاق
ہے اعتدال پہ انسانیت کی نبضِ سقیم

خوشا وہ جن میں ہو ذکرِ حسین کی دولت
خوشا وہ لوگ جو کرتے ہیں زندگی تقسیم

غذائے روح کا خرمن ہے سرفراز اخبار
حسینیت کے اُبلتے ہیں کوثر و تسنیم

حسینیت کا بیاں سرفراز میں جو پڑھا
کہا خرد نے یہ ہے رُوئیدادِ ذبحِ عظیم

۱۹۵۶ عیسوی

سرفراز محرم نمبر کے لیے

"الحسینؑ" کے تبصرہ کا علمی جائزہ

(سرکار سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ)

عبدالحق صاحب کے رسالہ "اردو" کے جنوری ۱۹۵۶ء کے شمارہ میں م۔ اے۔ ع (محمود احمد عباسی امروہوی) کے قلم سے عمر ابوالنصر کی کتاب "الحسینؑ" کے ترجمہ مطبوعہ لاہور پر جو تبصرہ شائع ہوا ہے اُس پر ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ کے اخباروں میں کافی احتجاج ہو چکا ہے مگر اس احتجاج کی نوعیت اظہار کربِ تکلیف اور مظاہرۂ رنج و ملال سے زیادہ نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس تبصرہ کے مندرجہ مضامین کا علمی و تحقیقی جائزہ بھی لے لیا جائے ـــــ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر اس وقت قلم اٹھایا جا رہا ہے۔

(۱)

تبصرہ نگار کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ "مولف نے ایک خاص فرقہ کے نظریہ کو پیش نظر رکھ کر اس تالیف کو مرتب کیا ہے۔ تحقیق و تنقیش سے مطلق سروکار نہیں رکھا۔ ابومخنف وغیرہ شیعہ راویوں کے بیانات ہی پر حصر کیا ہے"

جبکہ واقعہ یہ ہے کہ مولف کتاب (عمر ابوالنصر) خود شیعہ فرقہ سے تعلق نہیں رکھتے جس کا خود اُن کے نام سے ثبوت ملتا ہے کیونکہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کم از کم کئی سو برس سے شیعوں میں عمر وغیرہ نام بالکل متروک ہو گئے ہیں اور کوئی شیعہ یہ نام نہیں رکھتا ـــــ تو اس کے بعد یہ تصور کہ انھوں نے اپنی کتاب ایک خاص فرقہ کے نظریہ کے مطابق لکھی ہے مضحکہ خیز ہے بلکہ انصاف کی دنیا میں یہی نتیجہ صحیح سمجھا جا سکتا ہے کہ مؤلف کے جمہوری نقطۂ نظر کے باوجود اگر اُس کے مضامین میں کچھ اقلیتی نقطۂ نظر کی جھلک پیدا ہو گئی ہے تو یہ مؤلف کی آزاد فکری، وسیع المشربی اور صفائی دل و دماغ کی دلیل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُنھوں نے اس کتاب کی تالیف میں تنگ نظری کو صرف کر کے تعصب سے کام نہیں لیا ہے اور بہت حد تک حقیقت پسندی کو پیش نظر رکھا ہے خصوصاً جبکہ انھوں نے دیباچہ میں لکھ دیا ہے کہ اس کتاب میں وہ واقعات درج کیے جائیں گے جن کی ثقہ مورخین اور مشہور و معروف مؤلفین نے تائید کی ہے چنانچہ اپنے ماخذوں میں گیارہ عربی اور پانچ یورپی مورخین اور مؤلفین کی فہرست دی ہے ـــــ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں اور ان کے مولفین جن میں ابن اثیر۔ بلاذری وغیرہ کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام یا برٹنیکا بھی شامل ہیں کسی حساب سے شیعہ نہیں ہیں۔ اب یا تو تبصرہ نگار کو ثابت کرنا چاہیے کہ مؤلف نے جو کچھ درج کیا ہے وہ ان ماخذوں کے خلاف ہے ـــــ مگر ایسا نہ تبصرہ نگار نے ثابت کیا ہے اور نہ ثابت کر سکتا ہے اور یا پھر اس اعتراض کو غلط ماننا چاہیے کہ مؤلف نے تمامتر ایک فرقہ کے نظریہ کو پیش نظر رکھ کر کتاب تالیف کی ہے جبکہ اُس نے جو کچھ لکھا ہے وہ وہی ہے جس کے شواہد ان ماخذوں میں موجود ہیں اور یہ ماخذ کسی ایک فرقہ کے نظریہ کو پیش نظر رکھ کر نہیں لکھے گئے تو جو کتاب انہی ماخذوں سے ماخوذ ہے اسے ایک فرقہ کے نظریہ کا ترجمان کیونکر سمجھا جا سکتا ہے؟

---

(۲)

تبصرہ نگار کو دوسری شکایت یہ ہے کہ مؤلف نے کتاب کو (۱۴۲) عنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے جس میں پہلا ہی عنوان ہے "خلافت پر اہل بیت کا حق"

وہ کہتے ہیں کہ "مؤلف کی یہ سراسر غلط بیانی ہے اور اس غلط بیانی کی پوری تکذیب خود اس کے ماخذ طبری کی روایتوں سے ہو جاتی ہے" اس کے بعد انھوں نے ایک مفروضہ روایت درج کی ہے کہ حضرت عباس نے حضرت علیؑ سے قبل وفات رسولؐ کہا تھا

کہ آؤ چلیں اور ان سے پوچھیں کہ یہ امر (خلافت) کن میں ہوگا۔" اس پر حضرت علیؑ نے کہا تھا "واللہ اس بات کو ہم رسول اللہؐ سے ہرگز نہیں پوچھیں گے۔ کیونکہ انھوں نے اگر منع کر دیا تو پھر کبھی ہمیں لوگ نہیں ہونے دیں گے اور واللہ میں تو اس کے بارے میں ہرگز رسول اللہؐ سے نہیں پوچھوں گا" وہ کہتے ہیں "کیا ان روایتوں سے جو خود مولف ہی کے ماخذ میں موجود ہیں اس کے اس بیان کی کہ خلافت "اہلبیت" کا حق تھا پوری تردید نہیں ہو جاتی"

مگر جو شخص احادیث وسیر پر مطلع ہو وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ روایت، اس سے قوی تر بلکہ متواتر احادیث و روایات کے خلاف ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متعدد صورتوں سے اہل بیت طاہرین اور بالخصوص حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ولی امر ہونے کا اعلان فرماتے رہے تھے۔ پھر اس صورت میں جناب عباس کیوں کہتے کہ اسے رسول اللہ سے پوچھ لینا چاہیے اور حضرت علی کیوں یہ جواب دیتے۔

اس کے علاوہ اہلبیتؑ کا اس امر (خلافت) میں حق وہ خود طبری کی اس روایت سے ثابت ہے جو صفحہ ۲۰۲ پر درج ہے کہ حضرت علیؑ نے خلیفۂ اوّل ابوبکر سے کہا کنا نری ان لنا فی ھذا الامر حق فاستبددتم به علینا ثم ذکر قرابته من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وحقه۔

ہم برابر یہ سمجھتے رہے ہیں کہ اس امر (خلافت) میں ہمارا حق ہے مگر تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا۔ اس ذیل میں آپ نے رسول سے اپنی قرابت اور اپنے حق کا تذکرہ کیا۔

فلم یزل علیّ یقول ذالک حتی بکی ابوبکر
"برابر حضرت علیؑ اس بارے میں کہتے رہے یہاں تک کہ ابوبکر رونے لگے ——"

اس سے ظاہر ہے کہ اہلبیت کا حق وہ تھا جسے صراحت کے ساتھ حضرت علیؑ نے خلیفۂ اول کے سامنے بیان کیا اور اس کا ان کے پاس کوئی جواب سوا رو پڑنے کے نہ نکلا۔

اب اس دور کے گواہ مدعی سے زیادہ چست نکلے ہیں جو اہلبیت کے حق ہی کو جھٹلانے کی جسارت کر رہے ہیں اب جب تبصرہ نگار کی درج کردہ روایت کی تردید خود اسی ماخذ میں موجود ہے تو مؤلف الحسنینؑ اس روایت کی طرف توجہ ہی کیونکر کر سکتے تھے"

اس ذیل میں لکھنؤ کے مشہور رسالہ "نگار" میں خلافت و امامت کے سلسلہ والے مضامین کا پڑھنا مفید ہوگا جن کا آغاز "سرنام" ایک ہندو کے نام سے ہوا تھا اور سرنام نے بدلائل ثابت کیا تھا کہ رسول اللہؐ کی جانشینی کا حق صرف حضرت علی بن ابی طالب کو تھا ——

اس پر جناب نیاز فتحپوری کا محاکمہ ایک غیر جانبدار کی حیثیت سے (کیونکہ موصوف چاہے سنی نہ بھی سمجھے جائیں لیکن شیعہ تو بہرحال نہیں ہیں) خاص وقعت و اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے فروری ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں لکھا ہے"

"سرنام کا استدلال دو باتوں پر مشتمل تھا۔ ایک یہ کہ جناب امیر اپنے خصائل و عادات کے لحاظ سے بھی مرجح حق خلافت کا رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ خود رسول اللہ نے بھی غدیر خم میں اور اسکے قبل و بعد متعدد بار اپنے بعد ولایت و وصایت علی کی صراحت فرمائی تھی۔ اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار نے تمام روایات و اسناد وہی پیش کیے تھے جو اہل تسنن کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور اسلیے سنیوں کی طرف سے جواب کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ وہ سرے سے ان روایات کے وجود ہی سے انکار کریں یا یہ کہ وہ ان روایتوں کا مفہوم اور بتائیں۔ ظاہر ہے کہ اول صورت جواب کی اختیار نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ روایات تو کتابوں سے نکالی نہیں جا سکتیں۔ اس لیے عموماً دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے یعنی بعض تو ان روایتوں کو ضعیف قرار دیکر ناقابل اعتنا خیال کرتے ہیں اور بعض الزامی جواب کے انداز میں ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جو فضائل جناب شیخین میں ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

درآنحالیکہ ان دونوں میں سے کوئی طریقہ جواب کا مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جن روایتوں کو آج ضعیف کہہ کر ناقابل استناد قرار دیا جاتا ہے وہ قدماء کے نزدیک حد درجہ قابل وثوق سمجھی جاتی تھیں اور فضائل شیخین کو جناب امیر کے حق ولایت و خلافت سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ آپ کی فضیلت نہ دوسرے کی فضیلت سے

انکار کی مرادف ہوا کرتی ہے اور نہ اس سے کسی دوسرے کا حق محو ہوسکتا ہے"؟

پھر آخر میں ہر دلیل پر بحث کے بعد لکھا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ ان روایات و واقعات سے نہ صرف یہ کہ جناب امیر کی غیر معمولی فضیلت ثابت ہوتی ہے بلکہ بڑی حد تک یہ بھی کہ رسول اللہ اپنے بعد آپ ہی کو جانشین بنانا چاہتے تھے"

پھر جولائی ۱۹۵۶ء کے شمارہ میں لکھا ہے

"یقیناً حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہ جناب امیر کی خلافت چاہتے تھے اور اپنی اس خواہش کا اپنے اظہار بھی فرما دیا تھا۔ اہلسنت دیگر خلفاء کے صرف فضائل بیان کرکے اس حقیقت کے مٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ سوال خلافت کا ہے نہ کہ محض فضیلت کا۔ اسی کے ساتھ اہل سنت کا مناظرانہ پہلو اس لیے اور بھی زیادہ کمزور ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے شیعہ روایات سے ثابت نہیں کرسکتے اور شیعی حضرات خود اہل سنت کی روایات سے حضرت علی کی وصایت و خلافت کو ثابت کر دکھاتے ہیں"

اب ایک مسلمان کی نظر میں تو رسول اللہؐ کا منشا ثبوت استحقاق کے لیے کافی ہے۔ اس لیے مزید لکھنے کی ضرورت نہیں ورنہ اہلبیت کے استحقاق کے لیے خود خلیفۂ دوم جناب عمر اور ارکان شوریٰ (جسے خلیفۂ دوم نے اپنے بعد کے لیے مقرر کیا تھا) کے بھی اعترافات موجود ہیں

(۳)

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مؤلف نے "جابجا حضرت معاویہ جیسے بزرگ صحابی پر سب و شتم کرنے سے بھی اجتناب نہیں کیا"

جہاں تک ہم نے "الحسینؑ" کے انداز تحریر کو دیکھا ہے اس میں متانت و شائستگی کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ رہ گئی کسی کے افعال پر بحث اور اس پر نقد و جرح اسے مطلقاً سب و شتم میں داخل کیا قرآن و حدیث کی روشنی میں قطعاً درست نہیں ہے ——

رہ گیا معاویہ کو "بزرگ صحابی" کہنا تو یہ افسوسناک واقعہ ہے کہ موصوف کا اصطلاحی معنی میں صحابی ہی ہونا ثابت نہیں ہے

"بزرگ صحابی" ہونا تو بہت دور ہے جن پر علامہ محمد بن عقیل حضرمی نے اپنی کتاب "النصائح الکافیہ لمن یتولی معاویہ" میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۴)

تبصرہ نگار رقمطراز ہے کہ "حضرت عبداللہ بن عمر نے ابن الزبیر اور حسین دونوں سے فرمایا تھا کہ "اللہ سے ڈرو اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ مت ڈالو ——

ہم نہیں کہہ سکتے کہ عبداللہ بن عمر نے ایسا کہا تھا یا نہیں —— بالفرض اگر کہا ہو تو چاہیے تبصرہ نگار اپنے "خلیفہ زادہ" کی عظمت کے اظہار کے لیے اُن کے قول کو بڑی اہمیت کے ساتھ درج کرے مگر ہم ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ خود جناب عبداللہ بن عمر کے عمل کی روشنی میں اُن کے قول کا وزن باقی نہیں رہتا کیونکہ خود انھوں نے اس کے پہلے حضرت علی بن ابی طالبؑ ایسے مسلم الثبوت خلیفۂ راشد کی بیعت نہیں کی اور اس بارے میں اللہ سے نہ ڈرے اور نہ مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ سے اجتناب کیا۔ پھر یہ واقعہ ہے کہ خود بیعت یزید سے انکار کرنے والوں میں ابتداً یہ جناب عبداللہ بن عمر بھی تھے —— اور معاویہ کی تمام کوششوں کے باوجود انھوں نے بیعت نہیں کی اور پھر یزید کے برسر اقتدار آنے کے بعد بھی وہ بیعت سے کنارہ کش ہی رہے یہاں تک کہ امام حسینؑ شہید ہوگئے —— جب حضرت کی شہادت ہوگئی اُسوقت عبداللہ بن عمر نے بیعت کر لی اس سے صاف ظاہر ہے کہ حق و انصاف کے رُو سے وہ بیعت یزید کو باطل اور انکار بیعت کو حق ہی سمجھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ شہادت امام حسینؑ کو دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہوگئے —— یہ سمجھنا چاہیے کہ انکار بیعت تو اللہ کے ڈر سے تھا اور اب جو بیعت فرمالی وہ تلوار کے ڈر سے۔ پھر کیا یہی کردار وہ ہوسکتا ہے جیسے حضرت امام حسینؑ ایسے بطل جلیل کے سامنے بطور مثال پیش کیا جائے؟

---

(۵)

تبصرہ نگار کا ارشاد ہے کہ

"حضرت حسینؑ کے بزرگوں، عزیزوں، دوستوں اور

ہمدردوں نے انھیں طرح طرح سمجھایا تھا، منع کیا تھا، خطرات سے آگاہ کیا تھا"

ہم نہیں سمجھتے کہ یہ بزرگ کون ہیں، عزیز کون ہیں، دوست کون ہیں اور ہمدرد کون؟ جن لوگوں کے مشورے تاریخ میں مذکور ہیں وہ لے دے کر چند آدمی ہیں :-

(۱) محمد بن حنفیہ (۲) عمر بن عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام مخزومی (۳) عبد اللہ بن عباس (۴) عبد اللہ بن زبیر (۵) عبد اللہ بن جعفر

یہی گنے چنے اشخاص ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تبصرہ نگار نے ان میں سے کس کو امام حسینؑ کا بزرگ قرار دیا ہے۔ کسے عزیز کسے دوست اور کسے ہمدرد ——— بہرحال ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ رائے نہیں دی کہ یزید کی بیعت کر لی جائے بلکہ سوال صرف قیام مکہ، قیام مدینہ، سفر عراق یا کسی اور جانب توجہ کا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یزید کی بیعت کو یہ سب ہی ناجائز سمجھتے تھے۔

(۶)

تبصرہ نگار نے بڑی جسارت کے ساتھ یہ ادّعا کر دیا ہے کہ "عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس ——— "سن و سال کے اعتبار سے" رسول اللہؐ کے شرف صحبت کے لحاظ سے" اپنے علم و فضل" اتقاء و پرہیزگاری کے اعتبار سے حضرت حسین اور ابن الزبیر سے بدرجہا فائق تھے ——— "

معلوم نہیں تبصرہ نگار نے فوقیت کا پیمانہ کیا قرار دیا ہے؟ اور کیا معیار ہے جس سے فوقیت کی جانچ کرتے ہیں۔ صرف سن و سال تو ظاہر ہے کسی فریق نے معیار فوقیت نہیں قرار دیا ہے ورنہ ابو قحافہ کی موجودگی میں خلافت اُن کے فرزند کو کس طرح مل سکتی تھی اور اگر شرف صحبت کو بھی سن و سال ہی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی جناب ابو قحافہ کے شرف صحبت کو مافوق ماننا پڑے گا۔ رہ گئے دوسرے اوصاف و فضائل اُن کے لحاظ سے ہم نہیں جانتے کہ پیغمبر خداؐ کے احادیث سے زیادہ کوئی معیار تفوق کسی مسلمان کی نظر میں ہو۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ ہر ایک کے مراتب و اوصاف کی مقدار کو چودہ سو برس کے بعد پیدا ہونے والے عباسی صاحب سے زیادہ جانتے تھے۔ آخر آپ نے کچھ سمجھ کر فرمایا تھا الحسن والحسین سید اشباب اھل الجنۃ ——— اس کے بعد شیعوں کا ذکر نہیں جو عبد اللہ بن عمر کے اہل الجنہ میں داخل ہونے ہی کو تسلیم نہ کریں گے۔ دوسرے فرقہ کے افراد جو انھیں جنتی تسلیم کرتے ہیں، بفضلہ حضرت امام حسینؑ کے تحت سیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

(۷)

حبر الامہ عبد اللہ بن عباس کے متعلق یہ حکایت کہ انھوں نے یزید کی معاذ اللہ بیعت کر لی تھی اور یہ کہ انھوں نے یزید کو "صالح و نیکوکار" بتایا ہے بالکل غلط ثابت ہوتی ہے اُن کے اُس خط سے جو انھوں نے یزید کے نام لکھا ہے اور جسے ابن اثیر وغیرہ مورخین نے درج کیا ہے ——— اُس میں انھوں نے انتہائی اخلاقی جرأت سے کام لے کر خود یزید کو مخاطب کر کے لکھ دیا ہے کہ

"مجھے اپنی جان کی قسم ہے میں نے کبھی تمھاری تعریف نہیں کی۔ اور کبھی تم سے محبت کا دم نہیں بھرا۔

نیز اس خط سے اس کی بھی رد ہو جاتی ہے کہ ابن عباسؓ معاذ اللہ تفرقہ پردازی کا ذمہ دار امام حسینؑ کو سمجھتے تھے ——— انھوں نے صاف یزید کو مخاطب کر کے لکھا ہے۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اس بات کو بھلا دوں گا کہ تم نے حسینؑ کو قتل کیا ——— میں نہیں بھولوں گا اور کبھی نہ بھولوں گا۔ یہ کہ تم نے حسینؑ کو حرم خدا اور حرم رسول سے نکالا اور تم نے ابن مرجانہ کو حسینؑ کے قتل کا حکم دیا۔ میں تو خدا سے امید کرتا ہوں کہ وہ منتقم حقیقی بہت جلد تمھاری گرفت کریگا اور اپنے عذاب میں مبتلا فرمائے گا۔"

یہ خط کافی طولانی ہے۔ بنظر اختصار چند سطور کے نقل کرنے پر اکتفا کی گئی۔

علامہ سبط ابن جوزی لکھتے ہیں کہ جب یہ خط یزید نے پڑھا تو سخت برافروختہ ہوا اور ابن عباس کے قتل کا ارادہ کیا مگر ابن

زبیر کے ساتھ معرکۂ جنگ میں مشغول ہو کر قتل ابن عباس کی تدبیر نہ کر سکا۔

کیا اس خط کے بعد کسی سلطنت دمشق کے تنخواہ دار کا یہ حکایت تصنیف کرنا کہ ابن عباس نے یزید کی بیعت کی اور اسے "صالح و نیکوکار" کہا صریحی جھوٹ نہیں ثابت ہوتا؟

(۸)

عباسی تبصرہ نگار کا ایک اموی (دمشقی شامی) مورخ کے یہاں سے ڈھونڈھ کر محمد بن الحنفیہ کی زبان سے یزید کی پابندی شرع، نیکوکاری اور دینداری کی تعریف نکالنے سے اُس حقیقت پر کیونکر پردہ پڑ سکتا ہے جو تواتر تاریخی سے ثابت ہے کہ مختار نے یزید کے مقابلہ میں جو خون امام حسین ؑ کے انتقام کا علم بلند کیا تھا وہ جناب محمد بن الحنفیہ کے نائب کی حیثیت سے ——— یہ ممکن ہے کہ اُس خط کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے جو محمد بن الحنفیہ کی طرف سے ابراہیم بن مالک اشتر کے نام لکھا گیا تھا لیکن پھر بھی یہ امر مسلّم ہے کہ محمد بن الحنفیہ کی امداد کے لیے ابن زبیر کے مقابلہ میں مختار ہی کی فوج گئی تھی اور جناب محمد بن الحنفیہ نے ان کی امداد قبول کی تھی اور ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا تھا۔ نیز وہ برابر مختار کے حالات کے جویا رہتے تھے ———

اگر یہ واقعہ ہوتا کہ محمد بن الحنفیہ نے معاذاللہ یزید کی بیعت کی ہوتی اور وہ اُس کے مداح ہوتے تو بھلا مختار کے لیے یہ کیونکر ممکن ہوتا کہ وہ اُن کی نیابت کے مدعی ہو سکتے اور پھر یزید کی طرف سے مختار کے پروپگنڈے کو غلط ثابت کرنے کے لیے کیوں نہ جناب محمد بن الحنفیہ کو دعوت دی جاتی کہ وہ کھلم کھلا مختار سے برأت کا اعلان کریں بلکہ مختار کے مقابلہ میں عملی سرگرمیوں میں شریک ہوں یہ کچھ نہ ہونا اور کئی سال تک مسلسل جناب مختار کی سرگرمیوں کا بنام محمد بن الحنفیہ جاری رہنا اس کا ثبوت قطعی ہے کہ اُن کی طرف یزید کی بیعت اور مدح کی نسبت صریحی بہتان اور عظیم افترا ہے جو یزید کے بعض پرستاروں کی طرف سے حرکت مذبوحی کے طور پر وجود میں آیا ہے اور اسی لیے طبری۔ ابن اثیر۔ ابوالفداء۔ دینوری ابن قتیبہ۔ ابن واضح۔ مسعودی۔ سیوطی وغیرہ کسی مورخ نے اسکی طرف کوئی اعتنا نہ کی اور صرف دمشق کی سرزمین پر وہ حکایت تصنیف ہو کر وہیں کی لکھی جانے والی تاریخ میں محدود ہو کر رہ گئی۔ لیکن تیرہ سو برس کے مورخین نے اُسے ہرگز قابل قبول نہیں سمجھا۔

(۹)

کسی کی یہ گواہی یزید کے حق میں کہ

"وہ نماز کی پابندی کرنے والا، نیک کاموں میں سرگرم مسائل فقہ پر گفتگو کرنے والا، سنت نبوی کا التزام رکھنے والا ہے" کیا وزن رکھتی ہے جبکہ اس کے خلاف

(۱) خود یزید کے پدر مشفق جناب معاویہ کی گواہی ہے کہ

لولا محبتی یزید لابصرت طریق الرشد

"اگر یزید کی محبت نہ ہوتی تو میں سیدھا راستہ اختیار کر لیتا"

جسے علامہ ابن حجر مکی نے فضائل معاویہ کی کتاب (تطہیر الجنان واللسان) میں درج کرتے ہوئے اُس کی تشریح کی ہے کہ یزید کی محبت نے انھیں راہ راست سے ایسا اندھا کر دیا تھا کہ انھوں نے اُس فاسق و فاجر کو ولیعہد بنا کر مسلمانوں کے سروں پر مسلط کر دیا۔

(۲) یزید کے (ادّعا کردہ) چچا زیاد بن ابیہ کی گواہی ہے ان یزید صاحب مساھلۃ و تھاون مع ھنات وھنات۔

"یزید لاابالی اور مطلق العنان، ناگفتہ بہ کردار والا ہے"۔

(۳) یزید کے بیٹے معاویہ بن یزید کی گواہی ہے جو اس نے بر سر منبر دی کہ

"یہ منصب میرے والد کو پہنچا اور وہ بھی اس کے مستحق نہ تھے۔ اب اُن کی عمر ختم ہو گئی اور وہ قبر میں اپنی گناہوں کی قید میں پہنچ گئے" ———

سب سے بڑی مصیبت ہمارے لیے اس امر کا احساس ہے کہ اُن کا انجام بُرا ہو۔ انھوں نے اولاد رسول کو شہید کیا اور شراب کو مباح کر دیا اور کعبہ کو برباد کیا۔

(۴) خود یزید کی گواہی ہے کہ جو اسکے اشعار میں درج ہے اور اس کا وہ دیوان مصر میں طبع ہو چکا ہے اور ہمارے سامنے موجود ہے اُس میں اُس نے اپنی شراب خواری ہی کا پروپگنڈا کیا ہے۔ پرہیزگاری کا نہیں۔

(۵) صحابیِ رسولؐ عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی گواہی ہے کہ اس کا کوئی مذہب نہیں۔ وہ شراب پیتا ہے، طنبورہ بجاتا ہے، گانے والیوں سے گانے سنتا رہتا ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے۔"
نیز یہ کہ "وہ ایسا شخص تھا جو ماں بہنوں بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتا تھا، شراب پیتا اور نماز ترک کرتا تھا۔"

(۶) منذر بن زبیر کی گواہی ہے کہ "وہ شراب پیتا ہے اور مست ایسا ہوتا ہے کہ نماز ترک کر دیتا ہے۔"

(۷) بنی امیہ کے خلیفہ صالح عمر بن عبدالعزیز کی گواہی ہے جیسکے سامنے کسی نے یزید کے نام کے ساتھ "امیرالمومنین" کی لفظ کہدی تو انھوں نے اُسے بیس تازیانوں کی سزادی۔

(۸) اس کے علاوہ تیرہ سو برس کے تمام مورخین کی گواہیاں ہیں جنھوں نے اُس کے فسق و فجور کے واقعات تفصیل کے ساتھ درج کیے ہیں ——— ان کے مقابل میں دمشق (دارالسلطنت یزید) کے ایک لفر لکھنے والے کی درج کردہ حکایت کا سہارا لینا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

(۱۰)

عباسی تبصرہ نگار آج کل کے اپنے ایسے ایک عصری مورخ کے اس جسارت آمیز فقرہ کو بڑی اہمیت دے رہا ہے کہ "حسین نے بڑی شدید غلطی اپنے خروج میں کی" نعوذ باللہ من ذالک۔ لیکن آخر وہ اس کے بالمقابل اُسی دور کے اہل الرائے کے آراء کو کیوں نہیں دیکھتے اور اُن کی روشنی میں کیوں فیصلہ نہیں کرتے مثلاً

(۱) عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی رائے:—
"معاویہ کا یزید کو اپنے بعد حاکم بنانا کسریٰ اور قیصر کا طریقہ ہے۔ ہم ہرگز اس شرابی و زانی کی بیعت نہ کریں گے۔"

(۲) امّ المومنین عائشہ (معاویہ سے مخاطب ہوکر) "کیا تم سے پہلے شیخین نے بھی اپنے بیٹوں کے لیے کبھی بیعت لی تھی؟ پھر تم کس کی پیروی کرتے ہو؟"

(۳) حسن بصری "معاویہ کی چار باتیں وہ ہیں جن میں سے ایک بھی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔ اول انھوں نے بزور شمشیر خلافت کو حاصل کیا در آنحالیکہ اُس وقت اصحاب رسولؐ میں اُن سے افضل لوگ موجود تھے۔ دوسرے اپنے بعد اپنے بیٹے کو جو شراب خوار نشہ باز تھا اور خلاف شریعت محمدی ریشم پہنتا اور طنبورہ بجایا کرتا تھا مسلمانوں کا خلیفہ بنایا۔ تیسرے زیاد کو اپنا بھائی ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اُسی کا ہو سکتا ہے جو اصلی شوہر ہو اور زناکار کے لیے پتھر ہیں۔ چوتھے حجر اور اصحاب حجر کا قتل کرنا۔

(۴) یزید کا چچازاد بھائی ولید بن عقبہ بن ابی سفیان (حاکم مدینہ)
"جو شخص حسین کے خون کی ذمہ داری لے کر خدا کے یہاں جائے گا اُس کے اعمال خیر کا پلہ انتہائی سبک ہوگا۔"

(۵) تمام عالم اسلامی نے امام حسینؑ کے اقدام اور اُس کے نتیجہ کو کس نظر سے دیکھا اُس کے لیے خود یزید کی گواہی موجود ہے کہ "قتل حسینؑ کے جرم کو سنگین سمجھ کر نیکوکار اور بدکار سب ہی آدمی مجھکو دشمن رکھنے لگے ہیں۔"

(۶) اس بحث کے خاتمہ پر آخر میں پھر حبر الامۃ عبداللہ بن عباسؓ کی شہادت درج کی جاتی ہے جس سے ظاہر ہو گیا کہ حضرت امام حسینؑ پر خروج کا الزام ہی غلط ہے۔ بلکہ جب آپ مکہ میں پرامن طور پر مقیم تھے اُسی وقت یزید نے آپ کے خون بہانے کا انتظام کر دیا تھا ——— اُسی خط میں انھوں نے یزید کے نام تحریر فرمایا تھا کہ:
"تم نے اپنے آدمیوں کو حرم الٰہی میں خانہ کعبہ کے پاس بھیجا کہ حسینؑ کو حرم خدا میں، کعبۂ الٰہی کے پاس ہی قتل کر ڈالیں اور تم برابر حسینؑ کو خوف دلاتے اور پریشان کرتے رہے یہاں تک کہ تم نے حسینؑ کو عراق جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ اسلیے کیا گیا کہ تمھارے دل میں عداوت الٰہی اور دشمنی رسول اور اُن کے اہلبیت اطہار کا جن کی شان میں خدا نے آیۂ تطہیر نازل فرمائی بغض بھرا ہوا ہے۔"
اس کے بعد حضرت امام حسینؑ کو مورد الزام وہی سمجھ سکتا ہے جس کا سلسلۂ نسب کسی طرح یزید اور آل یزید تک پہنچتا ہو یا اُن نمک خواروں تک جن کا گوشت و پوست بنی امیہ کے یہاں کے حرام لقموں ہی کا پروردہ ہوا تھا اور یہ انھی لقموں کا اثر ہے جو اب تک کسی نہ کسی شکل میں سامنے آیا کرتا ہے۔

شہید اعظم

(منشی بشیشر پرشاد صاحب منورؔ لکھنوی)

نگاہِ یزداں میں خاص عظمت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے
جو ہے شہادت تو بس شہادت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے

لباسِ آلِ معاویہ کی تو دھجیاں وقت نے اڑا دیں
مگر سلامت بقائے حرمت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے

رسالتیں ہیں نثار اس پر تصدق اس پر نبوتیں ہیں
اماموں میں تو بس امامت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے

وہ عکسِ انوارِ فاطمہؑ ہے یہ آئینہ جوہرِ علیؑ کا
جمیل سیرت حسین صورت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے

ہے عزم شاہد یقین شاہد ہے کربلا کی زمین شاہد
جو ہے شجاعت تو بس شجاعت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے

دعا میں فرقِ نماز خم ہی نہیں جھکا سر یہ زیرِ خنجر
جو ہے عبادت تو بس عبادت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے

رہِ حقیقت میں جان دے کر ہوا ہے کس کو نصیب مرنا
الٰہی نظر میں بڑی فضیلت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے

نہ اب یہ محدود ہے عرب تک نہ اب یہ محدود ہے عجم تک
تمام دنیا میں آج عزت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے

لگائے سینے سے کیوں نہ اسکو ہے جسکے پہلو میں دل منورؔ
یہ غم تو اک بے بہا امانت شہیدِ اعظم حسینؑ کی ہے

المیۂ کربلا

اور حقیقت پسندی کی ضرورت

(جناب آفتاب اختر صاحب رضوی تلہری)

ڈاکٹر اقبال کی ایک مشہور نظم ہے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" اس گراں مایہ "منظومہ" میں ابلیس اور اس کے پانچ مشیروں کی ایک "خیالی مجلسِ مشاورت" کا حال عالمی رجحانات سامنے رکھتے ہوئے نظم کیا گیا ہے اور بڑی ژرف نگاہی کے ساتھ اس مجلس میں اس امر پر غور کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں "ابلیسی نظام" کو خطرہ کن قوتوں سے ہے۔ "جمہوریت" کی قوت کو ایک مشیر نے شیطانی سلطنت کے کاروبار کے لیے فتنۂ عظیم قرار دیا ہے۔ لیکن دوسرے مشیر نے اسے ملوکیت کا ایک پردہ بتا کر اُس کی اہمیت ختم کر دی ہے۔ مگر پھر تیسرا مشیر اشتراکی فتنہ کی طرف یوں توجہ دلاتا ہے:-

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اُس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیم بے تجلّی وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

جب یہ بحث کچھ آگے بڑھتی ہے تو خود ابلیس بحث میں حصہ لیتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں یوں گویا ہوتا ہے۔

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کیا ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار آشفتہ مو آشفتہ خو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

ابلیس، اسلام کو ابلیسی نظام کے لیے فتنہ قرار دینے کے بعد اپنے حلقہ بگوشوں کو یہ بتاتا ہے کہ اس فتنہ کا توڑ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو لایعنی اُمور میں مشغول رکھا جائے۔ وہ کہتا ہے۔

—:—

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اُس خدا اندیش کی تاریک رات
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدّد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

ہے یہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

ابلیس کی زبانی مسلمانوں کے تباہ و برباد کرنے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا ہو اُس میں یقیناً بہت زیادہ حقیقت پسندی موجود ہو. ممکن ہے اقبالؔ نے مسلمانوں کے علم کلام کے مباحث و مسائل کی نوعیت پر جو طنز کئے ہیں اُن کی تلخی عام مسلمان مفکروں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو اور وہ اپنے الٰہیاتی مسائل پر ترشے ہوئے لات و منات کی پھبتی شاعر کی غیر پسندیدہ شوخی قرار دیں تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابلیس کی زبان سے مسلمانوں کی موجودہ کیفیت کی جو تصویر کھینچی گئی ہو وہ بالکل ٹھیک ہو۔ ان کے زوال کا اصلی سبب یہی ہو کہ وہ غیر متعلق مباحث میں اُلجھے رہنے کی وجہ سے عالمِ کردار سے بیگانہ ہیں اور اس طرح "مزاجِ خانقاہی" میں پختہ تر ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کا جب تک یہ رجحان ہو ابلیس کی سلطنت کو ان سے کوئی خدشہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ شیطانی اوامر و نواہی کا سکہ ہر چہار طرف جاری رہ سکتا ہو۔

اسی رجحان کی وسعتوں کا اسے بھی ایک کرشمہ سمجھئے کہ ہمیں کردار سازی کے جو مواقع ملتے ہیں انھیں، مابعد الطبیعیاتی قسم کی تاویلوں سے کام لے کر اپنے لیے بیکار بنا لیتے ہیں۔

دنیائے اسلام میں شہادتِ حسینؑ اپنی خصوصیات کی وجہ سے ایک بڑا ہی اہم واقعہ ہو۔ ایک سرکش۔ جابر اور انسان دشمن بادشاہ۔ دیانتِ اسلامی کی تمام اعلیٰ روایات غارت کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس کے فسق و فجور کا تعفن تمام اقطارِ عالم میں پھیل چکا تھا اور وہ اپنی بداعمالیوں کی لپیٹ میں اسلامی اصول و فروع کو بلا امتیاز لیتا جا رہا تھا۔ رسولِ اسلام کے نواسے کے لیے اس برباد کن صورتِ حال کا دیکھنا ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اس کے مقابلہ کے لیے انسانی عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن اسلام کے دیئے ہوئے ہدایات کا ہر قدم پر مکمل لحاظ رکھا۔ بھلا وہ ایسا کیوں نہ کرتے۔ اُس وقت کے حالات نے اسلام کے تحفظ کی ذمہ داری اُن پر عائد کر دی تھی۔ انھوں نے اُس جابرانہ و ظالمانہ نظام کے خلاف آستینیں اُلٹ لیں مگر کہیں سے اپنے اقدامات میں دنیوی لوث کا شائبہ بھی پیدا نہ ہونے دیا۔ شروع سے آخر تک "انسان ساز" اسلامی دیانت کا لحاظ رکھا۔ اور اسے عملی طور سے بتایا کہ ظلم و جور کے مقابلہ کے لیے کون سے اخلاقی اسلحہ کارآمد ہو سکتے ہیں۔ ظالم و خود سر حکومت سے بیعت نہ کی۔ اس کے شیطانی احکام کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ لیکن خونریزی سے امکانی حد تک احتیاط برتتے رہے۔ دشمن کی فوج نے ایک جگہ روکا۔ اگر حسینؑ چاہتے تو پوری فوج کی گوشمالی اس وقت تک آسانی سے ہو سکتی تھی لیکن آپ نے اپنے ساتھ کا تمام پانی دشمن کی پیاسی فوج کو پلا دیا۔ اور ان کی جان بچائی۔ کربلا میں پہنچ کر بھی شہادت کا خونیں کفن پہننے سے پہلے تک اپنے اقدام میں کوئی جارحانہ رنگ نہ آنے دیا۔ اور اپنے ہر فعل ہر عمل سے اسلامی دیانتوں کی ترجمانی کرتے رہے۔

اور اس طرح واقعۂ کربلا اعلیٰ اسلامی اخلاق و دیانت کا نصاب بن گیا اور اس کے ذریعہ سے ہمیں موقع مل گیا کہ صحیح معنوں میں انسانی اخلاق سے آراستہ ہو جائیں۔ اور حسینؑ اور رفقائے حسینؑ کے نقشِ قدم پر چل کر پھر ویسے ہی مسلمان بن جائیں جن کی اخلاقی قوتوں کے سامنے بڑی بڑی سلطنتوں کے پتے پانی ہو جائیں اور ان میں اس کا یارا نہ رہ جائے کہ وہ اُن سے آنکھیں چار کر سکیں۔ لیکن اتنے بڑے "انسان ساز" واقعہ کے متعلق ہماری کیا روش رہی۔

اُن مسلمانوں کا ذکر جانے دیجئے جنھوں نے اپنی مادی مصلحتوں کے تحت ظلم و جبر کی قوتوں کی ہوا خواہی اپنا دین و ایمان سمجھ لیا۔ اور "شہید انسانیت" حسینؑ کا دامن چھوڑ کر یزید و ابن زیاد کے دامن سے لپٹے رہنا ہی دنیوی فوز و فلاح کے لیے ضروری سمجھا۔ ہمیں اُن مسلمانوں سے بحث ہے جنھوں نے اس جنگ میں حسینؑ ہی کو حق پر قرار دیا اور یزید وغیرہ کو باطل قوتوں کا ترجمان بتایا۔

انھیں حق پرستوں کی بہت بڑی تعداد مابعد الطبیعاتی نوعیت کی تاویلات میں اُلجھ کر شہیدِ کربلا اور اُن کے رفقائے کرام کی تاسی کو اپنی دسترس سے بلند قرار دینے لگی۔ اور انسان بننے کے اس موقع کو صرف چند آنسوؤں کی نمائش کا ذریعہ سمجھنے لگی۔ عزائے حسینؑ کی روح سے اُس نے اس غلط رجحان کے تحت اپنے کو علیحدہ کر لیا۔ اور عزائے حسینؑ سے جو رسمیں وابستہ ہو گئی تھیں انھیں کی انجام دہی کو اپنے لئے زادِ آخرت مان لیا۔

اس جماعت سے اسلام کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور یقیناً وہ ہر دور کے مقتضیات کا لحاظ کرتے ہوئے ضرورت کے موقع پر انقلاب کے قالب میں روح پھونک سکتی تھی۔ اس طرح کہ کوئی انسانی اصول پامال نہ ہو۔ لیکن اُس کی اس صلاحیت کے بروئے کار آنے کے راستے میں مابعد الطبیعاتی ذہنیت کے بطن سے پیدا ہونے والے حیلوں نے سیکڑوں سنگہائے گراں ڈال دیئے۔ اور ہمارے دل و دماغ کی تمام توانائیاں سلب کر لیں اور سچ مچ ہم "انسان سازی" کے نقطۂ نظر سے نکمے ہو کر رہ گئے۔ عزائے حسینی کے سلسلے میں صرف آنسو بہانا، ماتم کرنا اور چند بے جان رسموں کا پابند ہو جانا ہم نے اپنا شعار بنا لیا اور اس واقعۂ عظمیٰ کی تہوں میں جو "انسانیت ساز" سبق پوشیدہ تھے اُن کی طرف سے نگاہوں کو بالکل پھیر لیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ غمِ حسینؑ کے سلسلے میں اشک افشانی اور سینہ کوبی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یا عزائے حسینؑ کے سلسلے میں تعزیہ داری اور علمداری وغیرہ رسوم کے قیام میں افادیت نہیں ہے۔ ان سب چیزوں میں یقیناً افادیت ہے اور ہماری قومی زندگی کے لیے اہمیت رکھتی ہیں لیکن جبکہ ہماری نگاہ کا زاویہ کج نہ ہو۔ ان سب رسوم کے پس منظر میں صالح ذہنیت موجود ہو۔ ہماری عزاداری میں اگر اس کا سامان نہیں ہے کہ قوم کے بچے جوان اور بوڑھے اس میں منہمک رہ کر اخلاقی حیثیت سے اپنے کو اچھے انسان کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔ اور دوسری قوموں کو انسانی نقطۂ نظر کی بلندی کی کشش سے اپنی طرف کھینچ سکیں تو پھر یہ سب رسم و رواج کی پرستش ہے اور کچھ نہیں۔ سچ ہے۔

؎

اگر پرستشِ رسم و رواج ہے ایماں
تو پھر گناہ کوئی سجدۂ بتاں میں نہیں

(اختر تلہری)

نہر فرات سے دو باتیں

جناب فائق چند سریواستو صاحب عشرت - ایم اے - ایل - ٹی - منشی فاضل رساہتیہ رتن وائس پرنسپل لائل کالیجیٹ اسکول بلرام پور ـــ (گونڈہ)

خواب میں کل آئی تھی نہر فرات
پھر یہ بولا غیظ و استعجاب سے
میں نے مانا سنگدل تھے اشقیا
اشک ہے، رقت ہے، آہ سرد ہے
کس طرح تو دیکھتی ہی رہ گئی ؟
عترت ساقیٔ کوثر اور پیاس
طفل کیا پیر و جواں بیتاب تھے
شاہ دیں ڈوبے ہوئے غیرت میں تھے
سوچتے تھے اپنے دل میں بار بار
فوج دشمن کو کرے سیراب جو
دیکھ کر یہ حال بھی تو چپ رہی
کیوں پہونچ پائی نہ تو خیمہ کے پاس؟
مانگنے پانی گیا اک شیرخوار
جب بجھائی پیاس آب تیر سے
تب بھی تیرے آب میں جنبش نہ تھی
یہ نہ سوچا تیرا کیا ہوگا جواب
تجھ کو بڑھنا چاہیئے سیلاب سا
ڈوب جاتے جس میں کوفہ کربلا
نوح کی کشتی کا منظر دیکھ کر
گر کے قدموں پر معافی چاہتی
تجھ پہ ہو جاتی عطوفت کی نگہ
شکوہ پر بولی وہ : ہاں با شور و شین
مانتی ہوں ٹھیک ہے تیرا گلہ
تجھ کو لیکن ہے نہیں کچھ آگہی
پیشتر اس سے کہ ہو جاتا شہید

چل پڑی کچھ کربلا کی اس سے بات
اس سراپا اضطراب آب سے
تیری ہی غیرت سے مگر کیا ہو سکا
پیچ و تاب درد میں تو نہر ہے
جو نہ سہنا تھا کیونکر سہہ گئی
حلق و لب سوکھے ہوئے چہرے اداس
تین دن سے سب کے سب بے آب تھے
اپنے سب انصار و یاور کے لیے
خطرے میں ہے خلق کا میرے وقار
وہ نہ قطرہ دے سکے انصار کو
جنگ کے میدان میں گویا نہ تھی
کیوں بجھا پائی نہ تو پیاسوں کی پیاس
ہو سکی پھر بھی نہ تو کچھ شرمسار
روح نکلی جب تن بے شیر سے
تب بھی تیرے جسم پر لرزش نہ تھی
حشر کے دن تجھ کو آئے گا حجاب
نوح کا طوفان لاتی برملا
خیمہ گاہ فوج سرور کے سوا
ٹھنڈا ہوتا شاہ کا تفتہ جگر
اپنی غفلت کی تلافی چاہتی
باغ رضواں میں تجھے ملتی جگہ
میری بھی سن اے ہوا خواہ حسینؑ
مانتی ہوں اس میں تھی میری خطا
ورنہ شکوہ ہی نہ کرتا تو کبھی
کوئی بھی فوج حسینی کا شہید

دست موج اپنا بڑھا دیتی ضرور
پیاس پیاسوں کی بجھا دیتی ضرور
خشک صحرا کو بھگو دیتی ضرور
دشمنوں کو میں ڈبو دیتی ضرور
نقد پر اپنے مگر لوٹ کی گئی
گام اٹھانے ہی نہ پائی رو کی گئی
آگیا صبر امامت سامنے
اب بڑھی تو تھی قیامت سامنے
ہیبت و اجلال سے تھرا گئی
کچھ نہ سمجھی کیا کروں گھبرا گئی
اس طرح فوراً ہوا مجھ سے خطاب
بس حدوں میں اپنی رہ اے موج آب
مانتا ہوں فرض ہے بڑھنا ترا
دشمنوں میں غیظ سے چڑھنا ترا
تجھ کو لازم تھا مگر یہ جاننا
تجھ کو لازم تھا مگر یہ ماننا
گو امام دوسرا محصور ہیں
لیکن اب بھی وہ نہیں مجبور ہیں
یاد رکھ بندے نہیں محتاج ہیں
دو جہاں کے مالک و سرتاج ہیں
جن کی خاطر آئے ہوں سیب جناں
عرش سے جلے بطور ارمغاں
وہ اگر چاہیں تو کیا ممکن نہیں
دو جہاں کی نعمتیں آئیں یہیں
چشمے اُبلیں خیموں کے اندر ابھی
تشنہ لب سیراب ہو جائیں سبھی
صبر لیکن ہو رہا ہے امتحاں
اس لیے چپ ہیں امام دو جہاں
مجھ کو موقع دے دکھاؤں دہر کو
مجھ کو موقع دے بتاؤں دہر کو
مجھ کو پورا کرنے دے تو فرض عین
دیکھ لیں سب درجۂ صبر حسینؑ
صبر ایوبی کا دامن چاک ہو
اس کی شہرت کا بھی قصہ پاک ہو
اصل میں وہ ہی عرض جوہر ہوں میں
بیگماں وہ قطرہ ہے گو ہر ہوں میں
لوٹ جا بس کہا نہ کچھ اب ہیچ تاب
تجھ کو مل جائے گا جنت کا ثواب
لوٹ آئی سن کے میں یہ گفتگو
پا گئی سب کی نظر میں آبرو
گو کہ اب بھی میں ہوں بر روئے زمیں
میرے درجے میں کمی لیکن نہیں
ہر طرف ہے میرے ارض کربلا
نہر جنت سے سوا ہے مرتبہ
تو بھی عشرت آج کی شب عزم کر
مجھ سے اپنی گفتگو کو نظم کر
پھر سنا مجلس میں سب کو اپنا جواب
اور حاصل کر ثواب بے حساب

سلام

(جناب۔ آغا محمدؐ باقر صاحب کشمیری رام پور)

رکھ توسل اے سلامی شبرؑ و شبیرؑ سے
مرتبہ جن کا عیاں ہے آیہ تطہیر سے
مشورے آپس میں کرتے تھے رفیقان حسینؑ
پانی بچوں کے لیے لائیں کسی تدبیر سے
آسماں پر شور ماتم تھا فرشتوں میں بپا
قبر اصغرؑ شہ نے خود کھودی تھی جب شمشیر سے
بولے شہ میں قتل ہوں گا اور تم ہوگی اسیر
صبر کرنا اے بہن چارہ ہے کیا تقدیر سے
باپ کی آغوش میں جب دم ہوا بچہ شہید
ہائے اصغرؑ کی صدا نکلی زبان تیر سے
خیمہ سادات میں اک تازہ محشر تھا بپا
شہ نے کہنہ پیرہن مانگا تھا جب ہمشیر سے
باپ سے بیٹے کی رخصت اکام یہ آساں نہ تھا
صبر کرنا سیکھتا او سدم کوئی شبیرؑ سے
ناتواں بیمار غمگین دکھ زدہ سرتاج خلق
ہائے اس کے پاؤں باندھے آہنی زنجیر سے
حرملہ کے ظلم پر یہ پوچھنے والا نہ تھا
کیوں شقی آخر ہوئی تھی کیا خطا بے شیر سے
ہر گھڑی صبح و مسا یارب ہے تجھ سے التجا
قبر باقر متصل ہو مرقد شبیرؑ سے

کیسے کوئی مانے گا بانو ہر سال محرم آتا ہے

(شاعرۂ ملت محترمہ بانو سید پوری)

ایماں کے رشتے سے اب تک انساں یونہی کتراتا ہے — بندوں کی خوشی پر بیتا ہے خالق کی رضا ٹھکراتا ہے
کمزور ابھی تک دنیا میں آنکھوں سے لہو برساتا ہے — باطل کی اطاعت ہوتی ہے حق دیکھ کے مبہوت رہ جاتا ہے
کیسے کوئی مانے گا بانو ہر سال محرم آتا ہے

ہے اہلِ دغا پر لطف و کرم ہیں اہلِ وفا معتوب ابھی — فیشن کی پرستش کے آگے ہے حق کا چلن معتوب ابھی
بندوں کی حکومت بندوں پر انساں کو ہے مرغوب ابھی — ظالم کی اطاعت ہوتی ہے مظلوم دبایا جاتا ہے
کیسے کوئی مانے گا بانو ہر سال محرم آتا ہے

اب تک وہ نمائش کفر کی ہے اسلام نمایاں ہو نہ سکا — تخریبِ مسلسل کے باعث تعمیر کا امکاں ہو نہ سکا
سرمایہ و طاقت بیچ میں ہیں اللہ کا عرفاں ہو نہ سکا — افزائشِ دولت کی خاطر ایماں کو بیچا جاتا ہے
کیسے کوئی مانے گا بانو ہر سال محرم آتا ہے

تدبیر و سیاست کے بل پر محکوم زمانہ ہو جائے — یہ کفر کی ہیبت کا عالم اسلام کی دنیا تھرائے
بازارِ جہالت کی رونق ایسی ہے کہ ایماں للچائے — باطل سے بغاوت کرتے ہوئے انساں ابھی گھبراتا ہے
کیسے کوئی مانے گا بانو ہر سال محرم آتا ہے

ہے جبرِ حکومت کا دھڑکا پابندیٔ قرآں کون کرے — سرمایہ پرستی کی دھن ہیں مزدور پہ احساں کون کرے
اندھیر یزیدی کفر کا ہے اسلام درخشاں کون کرے — مفسد بھی لقب اس دنیا میں جو پائے صداقت پاتا ہے
کیسے کوئی مانے گا بانو ہر سال محرم آتا ہے

گفتار میں حق حق کے نعرے کردار میں حق سے غفلت ہے — یہ نشۂ طاقت کیا کہنا اصرارِ گنہ پر شدت ہے
مفہومِ شرافت دولت ہے معیارِ صداقت قوت ہے — جو خلقِ حسن پر عامل ہو وہ خلق میں پیسا جاتا ہے
کیسے کوئی مانے گا بانو ہر سال محرم آتا ہے

سونے کے چمکتے سکوں سے ہیں اہلِ نظر مرعوب ابھی — اللہ سے باغی ہو جانا انساں کو ہے محبوب ابھی
ایامِ جہالت کی رسمیں اسلام سے ہیں منسوب ابھی — شیطان کا مسلک آج تلک ایماں کا چلن کہلاتا ہے
کیسے کوئی مانے گا بانو ہر سال محرم آتا ہے

حسینی سیرت کی روشنی میں زندگی بسر کی جائے

صدر جمہوریہ پاکستان میجر جنرل اسکندر مرزا

امام حسینؑ نے دنیا کی تاریخ پر ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑا ہے۔ انسانوں نے ہر زمانہ میں ان کی زندگی سے سبق لیا ہے۔ انھوں نے اللہ کی خوشنودی اور اس کے بندوں کی بہبودی کے بلند نصب العین اپنی زندگی کے لیے مقرر کئے ہیں۔ ان اعلیٰ مقاصد کے لیے وہ ساری زندگی کوشش کرتے رہے اور کربلا کے میدان میں جب امتحان کا وقت آیا تو اپنا سب کچھ اس کی راہ میں قربان کر دیا۔

آجکل یہ طریقہ ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی حکومت کی مخالفت کرتا ہے وہ امام حسینؑ کی مثال پیش کر دیتا ہے۔ ہمیں نہ بھولنا چاہئے کہ ان کے سامنے نہ تو ذاتی فائدے تھے اور نہ صرف وہ کسی حکومت کو توڑنا چاہتے تھے وہ تو اسلام کی سچی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے جنگ کو ہر طرح رُکنا چاہا لیکن جب ان کے دشمنوں نے کوئی راستہ نہ چھوڑا تو وہ بھی کسی بلا سے نہ ڈرے اور راہ حق سے منھ نہ موڑا۔ کربلا میں جو کچھ ہوا وہ امام حسینؑ کی زندگی کا ایک پہلو تھا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انکی ساری زندگی کا مطالعہ کریں اور انکی سیرت کی روشنی میں زندگی بسر کریں۔ اللہ ہم کو انکی سچی پیروی کی توفیق دے اور انکے طفیل ہمیں سب کے راستہ پر چلائے۔

سلام اے فاطمہؑ کے لال

(سید حرمت الاکرام صاحب رکن ادارہ روزنامہ آزاد ہند کلکتہ)

(۱)

حسینؑ تیری زمانہ ستیز فطرت نے
کراہتی ہوئی انسانیت کے سینہ کو
ترے وجود نے اپنے لہو کی چھینٹوں سے

جہاں میں عظمتِ انساں کو سربلند کیا
صدا قتوں کی امانت سے بہرہ مند کیا
ستم نصیب حقائق کو ارجمند کیا

(۲)

ہزار فتنۂ باطل نے کی صف آرائی
یزیدیت نے ابھارا تو سر بہت لیکن
دلوں میں کوندتی جاتی ہیں بجلیاں پیہم

ہٹا نہ جادۂ حق سے مگر قدم تیرا
بلند اور بھی ہوتا گیا علم تیرا
رواں لبوں پہ جو پاتے ہیں نام ہم تیرا

(۳)

سدا گواہ فنا ہے مآل باطل کا
اسی کا حصہ ہے پہنائے قلزم ہستی
ہے آج کفر بھی اس اعتراف پر مجبور

بہ بانگِ دُہل شہادت یہ تیری کہتی ہے
تلاطموں کے تھپیڑے جو ناؤ سہتی ہے
کہ حق کی فتح بہر طور ہو کے رہتی ہے

(۴)

ترے لہو کی اک اک بوند مہر و مہر بن کر
فنا کو ڈھالنے والے بقا کے سانچہ میں
تھی تیری روح میں پنہاں وہ جرأتِ بیباک

عروسِ وقت کے ماتھے پہ جگمگاتی ہے
حیات تیرے عزائم کے گیت گاتی ہے
جو حق کے نام پہ شعلوں میں کود جاتی ہے

(۵)

ادھر تھے تشنہ لبی کے بھنور میں کام و دہن
چلو میں اپنے لئے سیلِ آہن و فولاد
مچل رہی تھیں ادھر بجلیاں سنانوں میں

کڑکتے نیزوں کی ہر دھار جن پہ ہنستی تھی
اُدھر طلسم حکومت کی چیرہ دستی تھی
اُدھر فقط تری مظلوم حق پرستی تھی

۱؎ تصرف بربنائے ضرورت شعری

(۶)

رہِ وفا میں بڑھاتا ہے جو قدم اپنا
وہ گھر سے باندھ کے سر سے کفن نکلتا ہے

عجیب چیز ہے مومن کا فقرِ بے پروا
ملوکیت کے پہاڑوں کا دل دہلتا ہے

ترے ثبات نے دنیا پہ کر دیا روشن
ہوا کی زد پہ بھی اپنا چراغ جلتا ہے

(۷)

عجیب تر ہے یہ طرزِ عطا بھی کس درجہ
دیئے نہ لعل و گہر اور نہ سیم و زر بخشا

یقیں کی شمع جلا کر دلوں کی دنیا میں
ہماری راتوں کو سرمایۂ سحر بخشا

بلند و پست کی پہچان دی نگاہوں کو
دلوں کو جذبۂ تمیزِ خیر و شر بخشا

(۸)

مگر یہ کیسے بتائیں کہ اپنے ذہنوں سے
ترے پیام کا ہر نقش دھو دیا ہم نے

بتائیں کیسے کہ تاریکیوں کے طوفاں میں
تجلیوں کا سفینہ ڈبو دیا ہم نے

بنا کے مصلحتِ وقت کو شعار اپنا
ترا دیا ہوا سرمایہ کھو دیا ہم نے

(۹)

بجھا کے رکھ دیا محکومیت کی پھونکوں نے
ہمارے سینوں میں جو آتشیں شرارہ تھا

ہیں سر بسجدہ ہمیں آج قیصروں کے حضور
کبھی ہمارے ہی قدموں میں فرقِ دارا تھا

ڈبو کے بیٹھے ہیں ہم آنسوؤں کے طوفاں میں
ترا سبق کہ جو اک نور کا منارا تھا

(۱۰)

بڑھے ہیں فتنۂ باطل کے آہنی پنجے
ہماری نذر کو ڈالر کی بجلیاں لے کر

جتایا جاتا ہے احسان ناخدائی کا
ہماری کشتی کو اُلٹے بہاؤ پہ کھے کر

سوال کرتا ہے تاریخ کا اک اک صفحہ
ہمارے ہاتھوں میں ماضی کا آئینہ دے کر

دلوں میں جذبِ شہ مشرقین ہے کہ نہیں
یزید لاکھوں ہیں کوئی حسینؑ ہے کہ نہیں

قطعہ

سیادتِ علوی کا وقار مان گئی
اُسی پہ حق کا ہے دار و مدار مان گئی

نہیں ہے طالبِ بیعت یزید عابدؑ سے
سیاستِ اموی اپنی ہار مان گئی

(مبالغ سید پوری)

سیّدنا امام حسینؑ کا اسوۂ حسنہ
ہماری نجات کا ذریعہ ہے

آنریبل مولوی فضل الحق صاحب گورنر مشرقی پاکستان

حسینؑ ایک طرف تو خاندانِ اہل بیتؑ کے درخشاں اور تابندہ فرد ہونے کے لحاظ سے دنیائے اسلام کی مایۂ ناز اور قابلِ احترام ہستی ہے دوسری طرف ان کا ایک ایسے خاندان سے تعلق ہے جس کے فضائل و مناقب قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ میں بکثرت موجود ہیں، پھر فرزند رسولؐ لختِ جگر بتولؓ نے جو معرکہ حق و صداقت گرم کیا۔ ملوکیت شہنشاہیت کے خلاف بہتر نفوس کی مختصر جماعت لے کر جس پامردی صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا وہ تاریخ اسلام کا سنہری باب ہے حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ حریت و آزادی، تبلیغ حق و صداقت کے وہ مبلغ اعظم ہیں جن کی حیات مقدسہ کا ایک ایک گوشہ انسانیت کے لیے سبق آموز ہے۔ حضرت امامؑ نے بتایا کہ ایک مومن کو جب راہ حق سے ہٹایا جائے۔ ہر قسم کی زیادتیاں کی جائیں۔ دنیوی مال و متاع کا لالچ دیا جائے۔ اسلام کے دامن کو فسق و فجور سے داغدار کیا جائے تو مسلمان ہماری طرح عمل کرے۔

سیدنا امام عالی مقام نے آغوش نبویؐ میں پرورش پائی حضرت سیدہ طاہرہؓ کا پاک دودھ پیا۔ حضور شیر خداؓ جیسے محترم باپ کی آنکھیں دیکھیں۔ اس پاک ماحول میں آپ نے یہی سبق سیکھا کہ حق پر جینا۔ سچائی کی دعوت دینا۔ باطل کا مقابلہ کرنا۔ ضلالت کے سامنے گردن نہ جھکانا۔

ہر حالت میں حق کا پیام دینا ہی اسلام ہے۔

آپ نے اس وقت جب کہ ہر چہار طرف مخالفتوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ حق کی آواز نکالنا جرم تھا۔ مادی طاقتیں آپ کے خلاف صرف ہو رہی تھیں۔ حکومت کے خزانہ کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ دنیوی لالچ دے کر آزاد ضمیر خریدنے کی فکریں تھیں۔ حکومت رسے کی پیشکش کی جا رہی تھی مخاصمتیں مخالفتیں نت نرالی شکل و صورت میں سامنے آرہی تھیں مشیران وقت اپنے اپنے انداز فکر پر مشورے پیش کر رہے تھے۔ ظاہری اسباب آپ کے خلاف تھے لیکن فرزند رسولؐ ان مادی سامانوں سے قطع نظر فرما کر تبلیغ دین کا عزم فرما چکا تھا اپنے محترم و معظم نانا خاتم الانبیاء علیہ التحیۃ والثناء کی حیات مقدسہ کو سامنے رکھتے ہوئے دین کی خدمت پر کمربستہ تھا۔ حضرت امامؑ اس واقعہ سے بخوبی واقف تھے کہ ایک بار حضرت ابوطالبؓ نے کفار و مشرکین کی مخالفتوں اور اذیتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ بیٹے مجھ پر اتنا بوجھ ڈالو جتنا میں اٹھا سکوں۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس اشارہ کو سمجھ گئے اور پورے جوش و خروش کے ساتھ جواب دیا۔ یا عم واللّٰہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی لیساری واللّٰہ ما اترک ھذا الامر۔

اے چچا! خدا کی قسم۔ اگر وہ سورج کو میرے سیدھے ہاتھ پر اور چاند کو اُلٹے ہاتھ پر رکھ دیں تب بھی خدا کی قسم میں جس کام پر مامور ہوں اُسے نہ چھوڑوں گا۔

حضرت سیّدنا امام عالی مقام سیرت نبویہؐ کا سراپا تھے۔ آپ نے یزید اور اس کے رفقاء کی دسیسہ کاریوں کا حال معلوم فرما لیا تھا۔ آپ بخوبی واقف تھے کہ میری راہ میں کس کس طرح رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں۔ قدم قدم پر رقابتیں ہیں۔ حکومت کے حاشیہ نشین تبلیغ دین کو دبانے پر کمربستہ ہیں۔ میرے پاس نہ مال و متاع ہے نہ عسکری قوتیں۔ میں اپنے خاندان کی ایک مختصر سی جماعت ساتھ رکھتا ہوں۔ مخالفین کے پاس افواج کثیرا ہیں وہ صاحب مال و متاع اور میں بےنوا فقیر۔ یہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے آپ نے طے فرمایا کہ مجھے کلمۂ حق

بلند کرنا ہے دعوت حق دینا ہے۔ ممکن نہیں کہ حسینؑ زندہ ہو اور اسلام کا دامن فسق وفجور سے داغدار ہو جائے۔ میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک پیام حق پہنچاؤں گا۔ تلوار سے اقدام کرنا ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم تو حق کے داعی و پیامی ہیں۔ سب وشتم سنیں گے۔ مصیبتیں برداشت کریں گے مگر جادۂ حق سے منھ نہ موڑیں گے۔ ہم نے حق کی گودوں میں پرورش پائی۔ پیدائش سے لیکر ہوش سنبھالنے تک حق کا ہی مشاہدہ کیا ہے۔ حق پر جینا حق پر مرنا ہمیں سکھایا گیا ہے ؎

جان جائے کہ رہے ان کو نہیں کچھ پروا
ہے عجب حال ترے عشق کے دیوانوں کا

مادر مشفقہ سیدہ طاہرہؑ کے پاک دودھ نے حق کہنے کی طاقت دی ہے۔ شیر خدا کو حق ہی پر کاربند دیکھا ہو۔ پس یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یزید مسلمانوں کو حق سے ہٹائے اسلام میں رخنہ ڈالے اور ہم دیکھتے رہیں، وہ کتنا ہی ظلم کرے۔ ہم برداشت کریں گے مگر حق کی دعوت اور لیکار سے باز نہ آئیں گے سوئی ہوئی دنیا کو بیدار کریں گے۔ چنانچہ سنہ ۶۰ھ میں جبکہ یزید جیسا فاسق سریرائے مسند خلافت نبویہ ہوا۔ اس نے حاکم مدینہ کو حکم دیا کہ حضرت حسینؑ کو ہماری بیعت پر مجبور کیا جائے۔ حاکم مدینہ کے دربار سے طلبی ہوئی۔ آپ اگرچہ سلطانوں شہنشاہوں کے درباروں کی حاضری سے متنفر تھے سلطنتیں حکومتیں ان کی ٹھوکروں سے بنتی بگڑتی ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے تاجدار آستانۂ نبویہ پر اپنی جبینیں جھکاتے تھے مگر حضرت امامؑ نے صرف تبلیغ حق کی خاطر حاکم مدینہ کے دربار میں جانا طے فرمایا۔

آپ حاکم مدینہ کے یہاں تشریف لے گئے۔ یزید کا پیغام سُنا۔ درباریوں کی نگاہیں حاکم کی طرف تھیں اور حضرت امام حاکم حقیقی کی طرف متوجہ تھے۔ حق و باطل کا یہ پہلا تبلیغی معرکہ تھا جسے سر کرنے کے لئے آپ نے ایک تاریخی خطبہ دیا۔ نہ حاکم مدینہ سے مرعوب ہوئے نہ اس کی امارت و جبروت ہی آپ کو تبلیغ سے روک سکی۔ آپ اس وقت الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ کی سراپا تفسیر بنے ہوئے تھے جن کے گھروں میں قرآن اُترا جنھوں نے ترکہ اور ورثہ میں فصاحت و بلاغت پائی جو سراپا دلیل و برہان تھے ان کی مدلل تقریر کا حاکم مدینہ کیا جواب دیتا۔ ہاں قوت وطاقت سے خوفزدہ کیا گیا۔ مگر جو ذات صرف رب حقیقی کا خوف رکھتی تھی۔ وہ بھلا حاکم مدینہ سے کیا متاثر ہوتی۔ آپ تفصیلی خطبہ ارشاد فرما کر روضۂ رسالت نبویہ پر حاضر ہوئے۔ روحانی توجہات حاصل فرمائیں وہاں سے بقیع شریف ہوتے ہوئے ہدیہ سلام دعائے صبر وثبات فرما کر مکان تشریف لے آئے خاندان کے افراد کو مجتمع کر کے سفر کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ حکم ملتے ہی سامان درست ہوگیا۔ اہلبیت عظام کا سامان ہی کیا تھا دنیوی شہنشاہوں کی سواریاں تو تھی نہیں بلکہ یہ گلیم پوش ٹوٹے ہوئے بوریہ پر آرام کرنے والے تھے۔ رات ابھی ختم نہ ہو پائی تھی کہ قافلہ اہلبیت اس دیار رسول سے جو اُسے عزیز تھا۔ دعوت تبلیغ کی خاطر روانہ ہو رہا ہو قافلہ سالار آگے آگے اور جماعت خاندان پیچھے پیچھے۔

یہ وقت بھی کیسا عجیب ہو جس کے نانا علیہ التحیتہ والثنا نے دنیا کے بے ٹھکانوں کو مدینہ میں لاکر آباد کیا۔ نواسہ مدینہ چھوڑ رہا ہو۔ منزلیں طے ہو رہی ہیں جب تک مدینہ منورہ نظر آتا رہا مڑ مڑ کر دیکھتے رہے یہاں تک کہ مکہ معظمہ میں داخلہ ہوگیا جیسے ہی مکہ والوں کو معلوم ہوا۔ سب نے عقیدت سے اپنی اپنی گردنیں جُھکا دیں۔

کعبہ مقدسہ جیسے مامن میں بھی آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ ہر قسم کی سازشیں ہوتی رہیں۔ تا آنکہ کوفے کی مراسلتوں کا تانتا بندھ گیا۔ کافی سے زیادہ خطوط میں مذکور تھا کہ ہم گم کردہ راہوں کو صراط مستقیم دکھائیے تو آپ نے حضرت سید نا مسلمؑ کو اپنا نائب بنا کر دعوت حق کے لئے روانہ فرما دیا۔ وہ اپنے کمسن بچوں کو ہمراہ لیکر کوفے پہنچ گئے۔ جامع کوفہ میں آپ نے خطبات شروع فرمائے جن کا اثر یہ ہوا کہ لوگ جوق درجوق آپ کی جماعت میں داخل ہونے لگے۔

آپ نے ایک تفصیلی مکتوب بارگاہ امامت میں روانہ فرمایا۔ جیسے ہی نامہ گرامی پہنچا۔ آپ نے سفر عراق کا ارادہ فرما دیا۔ ہرچند کہ مخلصین بربنائے اخلاص سفر عراق سے منع کر رہے تھے۔ مگر آپ نے کسی کی فہمائش اور مشوروں پر عمل نہ کیا۔ مکہ معظمہ سے روانہ ہو گئے۔

جذبۂ دعوت حق میں ڈوبے ہوئے منزل بمنزل سفر فرماتے رہے۔ اثنائے راہ میں حضرت مسلمؓ کی شہادت کی خبر پہنچی صبر و شکر ادا کرتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ جب اعلائے کلمۃ الحق کے لئے قدم اُٹھا دیے تو پھر خاندان اہلبیتِ نبویہ سے ممکن نہ تھا کہ بغیر ادائیگی فریضۂ تبلیغ واپس ہوں تا آنکہ آپ کا قافلہ ارض ماریہ میں پہنچا۔ اس سرزمین کا نام جب عرض کیا گیا تو آپ نے سابقہ بشارات و پیشین گوئیوں کے تحت جو کانوں میں پڑی ہوئی تھیں، اس سرزمین کو پہچان لیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہمارے قافلہ کو راہ حق میں سب کچھ قربان کرنا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت سیدہؑ کی کمائی لوٹی جائے گی۔ اعداء کے درمیان حق کا کلمہ بلند ہوگا۔ خواہ ہماری جانیں ہی کیوں نہ ختم ہو جائیں۔

یزیدی افواج قافلہ کی نقل و حرکت سے پوری طرح واقف تھیں۔ جیسے ہی آپ یہاں پہنچے، آپ کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا مگر آپ پر مطلقاً اس کا اثر نہ ہوا۔ اطمینان و سکون کے ساتھ خیمے نصب ہوئے، قافلہ کو ٹھہرا کر آپ میدان تبلیغ میں باہر آئے اور خطبات کا سلسلہ شروع فرما دیا۔ آپ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سُناتے اور بار بار زبان مبارک سے ارشاد ہوتا۔ دنیا چند روزہ ہے۔ کھوٹے سکوں پر ایمان و ایقان کی نعمت قربان نہ کرو۔ میں تمہاری دعوت پر تمہیں پیام حق سُنانے، صراط مستقیم دکھانے آیا ہوں۔ نہ تخت شاہی کا خواہاں ہوں نہ امارت دنیوی کا آرزومند ہوں۔ میرا یہ سفر تو صرف تبلیغ دین کی خاطر ہے۔ یاد رکھو یزید اسلام میں جو رخنہ ڈال رہا ہے وہ صدیوں تک باقی رہے گا۔ جس دین کو اللہ کے مقدس رسولؐ نے پیش فرمایا۔ آپ کے خلفائے کرام نے جس کی خدمت جلیلہ انجام دی تم اسے آج ایک فاسق و فاجر کے ہاتھ بیچ رہے ہو۔ دنیا ہی میں فاسق کے ہاتھوں دین کا دامن ہمیشہ کے لیے داغدار ہو جائے گا۔ تمہارے نزدیک اگر میری یہ دعوت گردن زدنی ہو تو میں آخر دم تک وہی کروں گا جو میرے خدا اور اُس کے رسولؐ نے بتایا ہے۔ حق کہنا حق پر چلنا حق پر مرنا میرا دستور حیات ہے۔ سلطنتیں آتی جاتی ہیں مگر صداقت ہی قائم رہنے والی ہے۔ مخاطب ایسے لوگ تھے جو زبان سے محبت کا دعویٰ کرتے تھے مگر عملاً قتل و خونریزی پر آمادہ تھے۔

ایک ایسے قافلے کے مقابلہ پر جس میں کل بہتر۷۲ نفوس شریفہ شامل تھے ہزارہا افواج جمع تھیں۔

ادھر جام شراب چل رہا تھا اور خاندان اہلبیت پانی کے قطرات سے محروم تھا۔ فرات پر پہرے لگے ہوئے ہیں۔ جانور پانی پی سکتے ہیں مگر ساقی کوثر کا گھرانا تشنہ لب ہے۔ ان سارے مصائب و آلام کے باوجود حضرت امامؑ آخر وقت تک تبلیغ حق فرماتے رہے۔ جب ہر چہار طرف سے حملے شروع ہو گئے تو خاندان اہلبیت کا ایک ایک فرد خیمے سے برآمد ہو کر اعلائے کلمۃ الحق فرما کر جام شہادت نوش فرماتا۔ یہاں تک کہ عاشورہ محرم کی صبح نمودار ہوئی خیمۂ اہلبیت اطہار کے اندر شب عاشورہ اس طرح گزری کہ مخدرات عالیات نے اپنی چادریں بچھا کر سجدہ ہائے عبادت ادا فرمائے۔ ساری رات اذکار الٰہی میں صرف فرمائی۔ سفیدی صبح برآمد ہوئی تھی کہ دشمنوں کے حملے کا آغاز ہوا۔ باری باری ہر فرد نے اپنی جانبازی و شجاعت کے جوہر دکھائے۔ اب خیمہ شریف میں صرف ایک سیدنا سجاد رضی اللہ عنہ باقی ہیں وہ باوجود علالت کے اذن چاہتے ہیں مگر فرمایا جاتا ہے کہ تم مخدرات کی حفاظت کرنا۔ اب شاہ اہلبیت فرزند رسول حضرت سیدہ کے لال نے سب کو پیوند زمین فرما کر آخری بار اتمام حجت کے لیے افواج کو دعوت حق دی۔ جب اُسے ٹھکرایا گیا تو اندر آ کر تبرکات نبویہ پہنے۔ عمامہ شریف سر پر باندھا۔ ہاتھ میں ذوالفقار حیدری لی۔ خیمہ میں سیدانیوں پر نگاہ ڈالی۔ سب کو صبر و ضبط ہمت و استقلال کی نصیحت فرما کر سپرد خدا کیا اور میدان میں آ کر ذوالفقار میان سے نکال لی۔ اب جدھر وار ہوتا ہے کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔ ہر ایک وار پر ہوتی ہے آپ کو معراج۔ دوپہر ڈھل چکی ہے مولائے کائنات اپنے گھرانے کی شجاعت کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے جس کے لیے مدینۃ الرسول بلد اللہ الامین ترک کیا۔ ادھر حضور سید عالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارۂ روحانی ہوا۔ بیٹا بس ہاتھ روک لو، ہم سب تمہارے انتظار میں ہیں۔ آپ کے جسم اقدس پر کافی زخم آ چکے ہیں۔ اس حالت میں بھی آپ نے سجدۂ آخر

ادا کرنے کی نیت فرمائی۔ اس قیامت خیز وقت کو کیونکر الفاظ میں ادا کیا جائے کہ جس فرزند رسولؐ کو حضرت نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم اپنی آغوش میں پرورش فرماتے۔ جس کے بالوں کو سیدہ فاطمۃ الزہراؑ گوندھا کرتیں۔ آج اس کے سینہ شریف پر ایک شقی القلب دنیا کی خاطر سوار ہو کر گلا تن سے جدا کر رہا ہے:۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

یہ ہے وہ واقعہ شہادت جس نے اسلام کو تازگی بخشی اور تبلیغی زندگی کا نقش قائم فرمایا۔ زندگی و موت کا حقیقی فلسفہ سمجھایا۔ یہ مرنا نہیں بلکہ زندگی جاوید ہے الی یوم القیامۃ دنیائے انسانیت کے لیے موعظت و نصیحت ہے۔

ہم سب کا فرض ہے کہ سیرت و کردار سیدنا حسین امام عالی مقام کو سامنے رکھیں۔ حق کے لیے جینا حق پر مرنا سیکھیں قولاً عملاً سیرت حضرت حسینؓ کی تقلید کریں۔ ہم جب تک اس پیام پر جو حضرت حسینؓ نے انسانیت کو دیا عمل نہ کریں گے انسانیت اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ آج کے دن ہر مسلمان عہد و پیمان کرے کہ اس کا سر باطل کے سامنے نہ جھکے گا۔ حق پر مرنا حق پر جینا اس کا شعار زندگی ہوگا۔ حضرت امام کی تبلیغی زندگی اگر ہمارا دستور حیات ہو تو صدیوں کا راستہ برسوں مہینوں میں طے ہو سکتا ہے۔

حضرت حسینؓ کا کارنامہ دنیائے عشق و ولایت اور دنیائے سیاست کے لیے ہزاروں اسباق کا مجموعہ ہے۔ اور اعدائے دین کے لیے شمشیر صداقت اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضرت سیدنا امام کی مبارک زندگی پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

نبی کی عترت کا سر کھلا ہے ادھر نہ دیکھیں زمانے والے

جناب شارب لکھنوی

یزید کے دورِ ظلم میں جب بھٹک رہے تھے زمانے والے
قسم خدا کی حسینؑ ہی تھے چراغِ منزل جلانے والے

کہاں بہشت اور کہاں جہنم یہ حُر کی قسمت تو کوئی دیکھے
حسینؑ کے راستے پہ چل کر سنبھل گئے ڈگمگانے والے

رسولِ اُمت سے کہہ چکے ہیں حسینؑ ہی میرے دل کا ٹکڑا
رسولؐ کو کیا جواب دیں گے حسینؑ کا دل دکھانے والے

دہم کو میداں میں سینہ تانے کھڑے تھے عزم و عمل کے پیکر
سنان و خنجر سے کیا جھجکتے گلا اجل کو لگانے والے

حسینؑ پیاسے نے کربلا میں اٹھائی جب نوجواں کی میت
حسینؑ کے پیچھے چُپ کھڑے تھے غمِ دو عالم اٹھانے والے

پڑا جو ننھے گلے پہ ناوک کہا یہ اصغرؑ نے مسکرا کے
اجل کے طوفاں سے کھیلتے ہیں چراغِ ایماں جلانے والے

جلے جو اہلِ حرم کے خیمے یہ کہہ کے سورج نے منہ چھپایا
نبی کی عترت کا سر کھلا ہے ادھر نہ دیکھیں زمانے والے

غموں کے طوفان میں بھی شارب شکن جبیں پر نہیں پڑے گی
غموں کو اپنا بنا چکے ہیں حسینؑ کے آستانے والے

سلام

از بھگوت سرن جی اگروال ممتاز چیرمین ٹیکس کمیٹی ڈسٹرکٹ بورڈ مراد آباد محلہ جیلال گلی مراد آباد

سرزمینِ کربلا کے ماہ و اختر کو سلام
جو ہوئے اُمت پہ قرباں ان بہتر کو سلام
جس نے اک قطرہ بھی پانی کا نہ پایا تین دن
تشنہ لب غنچہ دہن معصوم اصغر کو سلام
حضرت عون و محمدؑ پر درود و دوں پر درود
حضرت زینبؑ کے نازک تن گلِ تر کو سلام
جان کی پرواہ نہ کی اپنی سکینہؑ کے لئے
مشک لی دانتوں میں جس نے اس دلاور کو سلام
جس نے جاں قربان کر دی راہِ حق میں بے دریغ
اس بہادر اس جری اس ابنِ حیدرؑ کو سلام
حامیِ دینِ متیں یعنی حسینؑ تشنہ لب
دو جہاں کے رہنما سبطِ پیمبرؐ کو سلام
کربلا کی دھوپ میں بے آب جو کمھلا گئے
مصطفٰے کے باغ کے ہر اک گلِ تر کو سلام
جس کا سر نیزے پہ رکھا کوفیوں نے بعد قتل
اس شہیدِ کربلا اس شاہ بے سر کو سلام
بخششِ اُمت کے حامی پر ہزاروں رحمتیں
سیکڑوں ممتاز ہوں اُس دیں کے رہبر کو سلام

قطعہ

خونبار فلک بود زمیں اشک بداماں ؛ بر تشنگی حالِ شہنشاہِ شہیداں
جب دھوپ کی شدت سے تھا عالم تہ و بالا ؛ اُس وقت بھی میداں میں تھا وہ سرگرداں
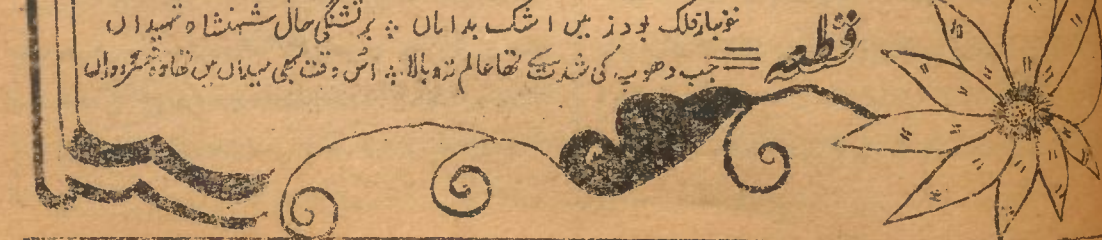
"استقلال"

حسین ابن علیؑ —— زینب بنت علیؑ

(سرکار نجم العلما جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ مجتہد لکھنؤ)

قریش، قبیلہ نسبی شرافت کے اعتبار سے "عرب" میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے اس قبیلہ کو قریش کا لقب نضر بن کنانہ کے زمانہ میں حاصل ہوا۔

نضر و فہر و قصی اپنے اپنے زمانہ میں انتہائی شرافت و عزت و حشمت کے مالک تھے قصی کے بعد ابن مناف نے خاندانی وقار میں چار چاند لگائے اور کعبہ کی تولیت حاصل کی۔

ابن مناف کے دو فرزند تھے، ایک ہاشم دوسرے عبد الشمس ان دونوں بھائیوں میں ہاشم انتہائی با اثر آدمی تھے امیہ جس کا انتساب عبد الشمس کی طرف تھا اس نے ہاشم کا مقابلہ کیا اور چاہا کہ عزت کا تاج اور شرافت کا تمغہ ہاشم سے چھین لے لیکن اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اس ناکامی کی وجہ سے امیہ کے دل میں ہاشم کی طرف سے بغض و حسد کینہ و عداوت پیدا ہوگیا اور اس روز سے بنی ہاشم اور بنی امیہ کی عداوت و اختلاف کی ابتدا ہوئی۔

لیکن یہ کوئی اصول نہیں کہ جس کو دنیا رسوا کرنا چاہے وہ رسوا ہو ہی جائے بلکہ عزت و عظمت و تخت و تاج عطا کرنے والی کوئی اور ہی ذات ہے چنانچہ بنی امیہ کی مسلسل چھیڑ چھاڑ جنگ اور بنی ہاشم کے خلاف پروپگنڈہ غرض کہ ان چیزوں نے کوئی اثر نہ کیا اور آبائی عزت کے مالک بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر عظمت کے مالک عبد المطلب ہوئے عبد المطلب کے دس بیٹے تھے جن میں سے ایک عبد اللہ دوسرے ابو طالب عبد اللہ کے فرزند محمد مصطفیٰ جنھوں نے انتہائی مخالفت کے باوجود اپنے مطمح نظر کو نہ بدلا جن کے ارادوں کو پتھروں کی بارش متزلزل نہ کر سکی۔ جنھوں نے کہہ دیا کہ ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ کر بھی میری زبان بندی نہیں کر سکتے۔ کیا کوئی عقلمند انسان مستقل مزاج آدمی معاذ اللہ ایسے انسان کو ضدی کہہ سکتا ہے نہیں نہیں اس کو ضد اور ہٹ نہ کہنا چاہیئے اگر بات پر جمے رہنے کو ضد ہی کہا جائے تو پھر مستقل مزاج انسان کو کیا کہا جائے گا؟

بہر حال رسولؐ اکرم نے کوہ گراں بار کی طرح سخت سے سخت مخالف سے مخالف ہواؤں اور طوفانوں کا مقابلہ کیا اور (قولوا لا الٰہ الا اللہ) کے ایک حرف میں تبدیلی پسند نہ کی

ابو طالبؑ کے فرزند حضرت علیؑ جنھوں نے رسولؐ کی آواز پر لبیک کہی اور اپنے بازوؤں کی طاقت کو کبھی بھی اسلام سے عزیز نہ کیا مبلغ اسلام محمد مصطفیٰؐ کی صاحبزادی فاطمہؑ اور علی بن ابیطالبؑ کے فرزند حسین ابن علیؑ تھے اور بیٹی زینب بنت علیؑ۔ اس مختصر تعارف سے میرا مقصد یہ تھا کہ حسینؑ و زینب محتاج تعارف ہیں بلکہ میں تو یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ حسینؑ و زینب اپنے ارادوں میں کس قدر پختہ تھے بلند ہمتی بلند حوصلگی مستقل مزاجی یہ صفات انسان حاصل بھی کرتا ہے اور کچھ نہ کچھ ان کا تعلق خاندان سے بھی ضرور ہے۔ اس لئے مجھ کو تمہید کے طور سے یہ لکھنا پڑا کہ نضر بن کنانہ سے لے کر محمد مصطفیٰؐ اور علی مرتضیٰؑ تک قبیلہ والوں اور خاندان والوں کی مخالفتوں کا کیا عالم تھا اور ان کی طاقت کس قدر تھی مگر مخالفت کے مقابل میں کسی کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی چنانچہ جب حضرت محمدؐ نے دین اسلام کی تبلیغ کرنا شروع کی جو یقیناً ہاشمی اقتدار کے بڑھنے کا موجب تھی تو اس وقت امیہ کے خیالات کا مالک ابوسفیان موجود تھا لہٰذا اس نے چاہا کہ محمدؐ کے جلائے ہوئے چراغ کو جلاتے ہی بجھا دوں ورنہ چراغ ہدایت جلنے کے بعد پروانوں کا ہجوم چراغ کے لئے فانوس بن جائے گا لیکن محمد مصطفیٰؐ نے اس اقدام کا موقع ہی آنے نہ دیا اور آپ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

مختصر یہ کہ محمد و علی بن ابیطالب و حسن مجتبیٰ نے اپنے اپنے زمانہ میں اسلام کی بنیادوں کو مستحکم بنانے کے لئے مناسب اقدام کئے نگران حضرات کے ارادوں کی مضبوطی کو کون بیان کر سکتا ہے جنھوں نے اپنے ذاتی مفاد پر اسلام کی بہبودی کو مقدم فرمایا یہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسان اپنا ارادہ اسی وقت بدلتا ہے جب سابقہ نظریہ کسی ذاتی مفاد کو ٹھیس پہونچائے مگر ان معصوم ذاتوں کے لئے وقوع تو درکنار ایسا تصور بھی نہیں ہو سکتا ہے۔

تو اب ہر ہوش و خرد کا مالک انصاف سے کہہ دے کہ ان آغوشوں اور اس ماحول میں جن بچوں کی تربیت ہوگی وہ کیسے ہوں گے.....

حسین بن علی، زینب بنت علی ان دونوں بزرگواروں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے جد عالی مقدار اور پدر بزرگوار کے طور طریقے کا مطالعہ کیا! حسین و زینب نے بچپنے ہی میں سنا ہوگا کہ نانا نے فرمایا تھا کہ اگر آفتاب و ماہتاب میرے ہاتھوں میں رکھ دیئے جائیں تو بھی اپنے ارادہ سے باز نہ آؤں گا۔ کیا حسین و زینب نے زمانۂ طفلی ہی میں نہ سنا ہوگا کہ ابوسفیان و ابوجہل کے پتھروں کی بارش سے جسم رسول دب جاتا تھا مگر کلمۂ حق سے انکار نہیں کیا کیا فاطمہ نے اپنے بچوں کو باپ کی ہجرت کے واقعات سے آگاہ نہ کیا ہوگا۔

نہیں نہیں فاطمہ ایسی حوصلہ مند ماں نے بچوں کے حوصلے بڑھانے کی خاطر ضرور بیان کیا ہوگا۔

تو کیا حسین کو ان واقعات سے زینب کو ان حالات سے آگاہ ہونے کے بعد بس باپ دادا کی مظلومی کا ہی صرف علم ہوا "نہیں" بلکہ ابوسفیان اور اس کے ہمنوا عربوں کے مظالم کا علم ہونا بھی ٹھہری بنی ہے۔ لہذا میں تو یہ کہوں گا کہ حسین و زینب مظلوموں کی داستان سن سن کر ظالم کے مظالم کے احساس کے ساتھ ساتھ قوت برداشت و جذبۂ تحمل پیدا کر رہے تھے۔

سخت و دشوار منزلوں کے سامنے آنے پر قومی مفاد کے پیش نظر اپنے مفاد سے قطع نظر حق کے راستہ میں قدم کو لغزش نہ ہونا ثبات و استقلال ہے اور اپنے مفاد کے زیر نظر باطل کے راستے میں قدم کو جنبش نہ ہونا یہ ہے ضد اور ہٹ..................

حسین و زینب اور اس گھرانے کا بچہ بچہ مستقل مزاج اور مستحکم ارادوں کا مالک تھا یزید اور اس کے ہمنوا ضدی و ہٹی تھے یا در کھئے ان کے استقلال میں کبھی بھی تزلزل نہیں پیدا ہوا ہاں ضدی سابقہ مفاد سے کم و بیش پر معاملہ کر لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کیوں نہ کہوں کہ استقلال میں کسی قسم کی تردید نہیں ہوتی بس ایک نظریہ ایک مقصد اور ایک ارادہ جس کے بدل جانے کا امکان نہیں اور ضد میں تردید ہوا کرتی ہے لینے یا یہ یا وہ کا امکان ہے۔

چنانچہ حسین کا صرف ایک قول تھا کہ بیعت نہیں کروں گا اور یزید نے والی مدینہ سے کہلا بھیجا کہ حسین یا بیعت کریں یا پھر ان کا سر قلم کر لیا جائے۔ حسین نے جب یہ فرمایا کہ "بیعت نہیں کروں گا" تو اس وقت یہ حقیقت ہے کہ ان الفاظ کا صحیح مفہوم دنیا کو معلوم نہ تھا کیونکہ انسانی تخیل کے حدود ان امکانات کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے جہاں تک واقعات کی رفتار بعد کو پہنچ گئی۔

اس "نہیں" میں کتنے مصائب و آلام کا مقابلہ پوشیدہ ہے اس کو دنیا کا کوئی فرد تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن امام حسین جس وقت نہیں کی آواز بلند کر رہے تھے تو دل کی گہرائیوں میں اپنی قوت ارادی و برداشت و تحمل کا جائزہ لے کر اور حالات کی نزاکت پر غور کر کے یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ شدائد اپنے امکانات کی آخری منزل تک پہونچ جائیں گے۔ لیکن میرے ارادوں کو نہیں بدل سکیں گے۔ جب تک مستقبل کے پردے میں وہ شدائد پوشیدہ تھے اس وقت تک ہم کو اس "نہیں" کے وزن کا تصور بھی نہ تھا لیکن اب ماضی کے صفحات پر آنے کے بعد ہم کو اس کا احساس ہوا۔ اب خدا کے واسطے انصاف سے بتایئے جب وہ ڈراونے حالات مستقبل و ماضی کو اس قدر بھیانک بنا دیتے ہیں کہ انسان سوچ کر لرز جاتا ہے تو جب صفحۂ حال پر باری باری یہ نقوش ابھر رہے تھے کہ وہ منظر کس قدر بھیانک ہوگا لیکن کیا کہنا حسین تیرے عزم و استقلال کا کہ جس کو تو نے اپنی آغوش میں لے لیا وہ بھی تیرے ارادہ و عزم کا آئینہ بن گیا۔

یاد رکھئے مستقبل ہمیشہ حالات کا تصور کراتا ہے اور ماضی بس ان حالات کے نقوش چھوڑ جاتا ہے البتہ حال ان خطرناک حالات سے مقابلہ کا زمانہ ہے جو کم ہمت انسان ہیں وہ بس مستقبل کے حالات کا تصور کر لیتے ہیں اسی وجہ سے جب مقابلہ کا وقت آتا ہے تو اکثر فرار

کر جاتے ہیں اس کا سبب کیا ہے یہ کہ ان میں صرف تصور کی طاقت تھی مقابلہ کی ہمت نہیں لیکن وہ لوگ جو مقابلہ میں کامیاب ہی نہیں بلکہ حال پر چھا جائیں تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ شدائد مستقبل میں روپوش تھے لیکن ان کے تصورات ان حدود سے آگے بڑھ چکے تھے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یزید کے مظالم کی انتہا کربلا میں معلوم ہوگئی مگر حسین کے صبر و ثبات کی حد معین نہ ہوسکی۔

آپ کے اس قوت عزم کا اندازہ دشمن کو بھی تھا یاد کیجئے اسی وقت کو جب شمر ابن زیاد کا خط لے کر نویں تاریخ کربلا آیا کہ حسین سے اطاعت کا اقرار لو یا جنگ کرو اور عمر سعد نے خط دیکھ کر اپنی جگہ پر کہہ دیا کہ حسین اس طرح سے اطاعت نہیں کریں گے وہ اپنے باپ کا دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔

حسین ابن علی تیرا کیا کہنا تو نے اپنے باپ کے نظریہ کو اجاگر کردیا اور دشمن نے اپنی محفل میں علی کے بیعت نہ کرنے کا اقرار کر ہی لیا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ سیدان جنگ میں ہزاروں مصائب کے سیلاب آئے اور اس کوہ عزم و استقلال سے ٹکرا کر خود واپس چلے گئے اور گویا حسین کی زبان پر یہ شعر جاری تھا ؎

ان کان دین محمد لم یستقم
الا بقتلی یا سیوف خذینی

اگر میرے نانا کا دین برقرار نہیں رہ سکتا جب تک میری رگ حیات قطع نہ ہو جائے تو اے تلوارو آؤ یہ جسم حاضر ہے۔ امام حسین نے اپنے نظریہ کی تکمیل اس طرح کی کہ اپنے تمام عزیز و اقارب، اہل و عیال و احباب کے ساتھ دشت غربت و مصائب میں محصور رہا، جدا ہوگئے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو بھوک اور پیاس کی شدت میں آہ و فغاں کرتے دیکھا پھر ان میں سے ایک ایک کی خون آلودہ لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھایا حتیٰ کہ گل نوشگفتہ طفل شیر خوار علی اصغر کو اپنے ہاتھوں پر لائے مگر صبر و استقامت میں ایک لمحہ کے لئے بھی متزلزل نہ ہوئے اعزا، و احباب و انصار شہید ہوئے اس وقت بھی جب یہ علی کا فرزند میدان میں آیا ہے تو ابرو پر شکن نہ تھی فوج عمر سعد کا ایک آدمی کہتا ہے کہ خدا کی قسم کوئی دل شکستہ و ستم رسیدہ زخم خوردہ جس کی اولاد بھائی اعزہ قتل ہوگئے ہوں نہیں دیکھا جو حسین سے زیادہ مطمئن مستقل مزاج ثابت قدم اور باہمت ہو۔ خدا کی قسم میں نے ان کے قبل اور ان کے بعد بھی ان کے مثل کوئی نہیں دیکھا۔

یہ ہے حسین بن علی جو استقلال و ثبات و اطمنان کا مجسمہ تھا جس کو کربلا میں دشمن دین خدا نے تین دن کا بھوکا پیاسا قتل کردیا۔

"زینب بنت علیؑ"

بعض مصائب تو ایسے ہیں جن میں یہ بھائی بہن برابر کے شریک ہیں اگر مدینہ چھوڑنے کا رنج حسین کو تھا تو زینب بھی اس میں برابر سے شریک تھیں اگر حج نہ کرنے کا صدمہ حسین کو تھا تو زینب بھی اس میں حصہ دار تھیں سفر کے شدائد شدت کی گرمی جلتی ریگ تپتا ہوا صحرا اس میں حسین اور زینب برابر کے شریک ہیں کربلا پہنچ کر صبح عاشور تک کوئی امتحان حسین کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ زینب کے لئے بھی صبر آزما تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ حسین ایک ذمہ دار حیثیت سے تھے اور زینب ضمنی طور سے تھیں۔

ہاں جنگ کی ابتداء کے بعد بھائی بہن کے امتحان میں ظاہری نظر سے فرق ضرور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو درحقیقت کوئی فرق نہ ملے گا۔

ان دونوں بھائی بہن میں بچپنے ہی سے اس قدر انسیت تھی کہ ایک کا رنج دوسرے کو ملول اور ایک کا صدمہ دوسرے کو غمگین بنا دیتا تھا اس لئے موقع شہادت پر یہ کہا ہی نہیں جاسکتا کہ علی اکبر کی شہادت سے حسین کو زیادہ صدمہ ہوا اور زینب کو کم، عون و محمد کے قتل ہو جانے سے زینب زیادہ رنجیدہ تھیں اور حسین کم جیسا کہ حالات بتلاتے بیٹوں کی شہادت کے وقت زینب خیمہ سے باہر نہیں آئیں البتہ بھتیجے کی شہادت کے وقت زینب کا دل بیچین ہوگیا اور خیمہ سے باہر تشریف لے آئیں۔

اب باقی شہداء بنی ہاشم کے لئے جو رشتہ حسین کا تھا وہی تعلق زینب سے تھا عبداللہ اور قاسم اور جناب عباس اور ان کے بھائی حسین اور زینب دونوں ہی سے ایک رشتہ اور ایک تعلق رکھتے تھے۔

لہٰذا اگر اس موقع پر حسین کے صبر کا امتحان تھا اور حسین اس میں

کامیاب ہوئے اور زینب میں عورت ہونے کی وجہ سے فطری طور سے فطری کمزوری ہونی چاہئے تھی وہ بہ نسبت حسین کے لیکن کامیابی نے ایسے موقع پر بڑھ کر زینب کے قدم بھی چوم لئے۔

البتہ جناب زینب کا امتحان کچھ حسین سے زیادہ ہی تھا خدا کی قسم اگر حسین ہوتے تو وہ بھی کامیاب ہوتے وہ بلکہ حسین اس سے زیادہ سخت امتحان میں مشغول تھے، اگر حسین کے لئے یہ موقع ناممکن سا تھا اس لئے کہ جناب عباس اور ان کے بھائیوں کی خون آلودہ لاشیں حسین ہی اٹھا کر لائے اور زینب نے ماتم کیا لیکن زینب نے اپنے ایک اور بھائی کی گردن کو کند خنجر سے کٹتے دیکھا اور وہ تھے حسین۔

لہٰذا اگر اپنی شہادت کے اعتبار سے حسین منفرد تھے تو اس امتحان میں جناب زینب بھی (بھائی کے مقابلہ میں) تنہا تھیں۔

اس موقع پر زینب کے تاثرات کا اندازہ معصومہ کے چند جملوں سے ہوتا ہے کہ آج میرے جد بزرگوار رسول خدا کی وفات ہوئی آج میرے باپ علی مرتضیٰ دنیا سے گزر گئے۔ آج میری ماں فاطمہ زہرا دنیا سے سدھاریں آج میرے بھائی حسن مجتبیٰ کی شہادت ہوئی ذبح عظیم کی تکمیل تک حسین کے امتحانات میں زینب برابر کی شریک رہیں لیکن سے کوفہ اور شام اور مدینہ کی واپسی تک بلکہ آخری لمحۂ حیات تک کے امتحانات میں منفرد نظر آتی ہیں۔

کیا خیام امام کی غارتگری آتشزدگی معمولی امتحان ہے گیارھویں کی بھیانک رات معمولی رات تھی کیا یزیدی کشتوں کا دفن ہونا امام کی لاش کا مقتل میں گرم زمین پر رہنا زینب کے لئے ایک عظیم امتحان کی حیثیت نہیں رکھتا؟

الغرض کی اسیری کوفہ کی سجی ہوئی بازاروں سے گزرنا ہر موقع پر اپنی مظلومی، بیکسی بے بسی کا اعلان کرنا کیا زینب کے علاوہ کسی کا سینہ میں یہ دل تھا۔ شام کے دربار میں قیدی بن کر جانا یزید کو دنداں شکن جواب دینا یہ علی ہی کی بیٹی کا کام ہو سکتا ہے۔

میدان کربلا میں حسین و انصار حسین کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اپنے دل کی بھڑاس اعدا کو قتل کر کے نکال رہے تھے لیکن دربار ابن زیاد میں زینب کی بیکسی دیکھنے کے قابل ہے کہ ہر طرف (معاذ اللہ) شماتت کرنے والے ہنس ہنس کر طعن و تشنیع کرنے والے اشقیا کے علاوہ کوئی نظر نہ آتا تھا ان کے سامنے وہ جفا کار اشخاص موجود تھے جن کی تلواروں نے جوان فرزندوں بھائی بھتیجوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا

زینب کبریٰ کے خصوصیات و حالات کو دیکھتے ہوئے کیا کسی شخص کو کہنے میں جھجک ہو سکتی ہے کہ آپ نے دربار ابن زیاد و دربار شام میں وہ کیا جو اس مرحلہ سے زیادہ دشوار تھا جس کو حسین اور انصار حسین نے کربلا کے میدان میں سر کیا۔

مدینہ سے روانگی کے وقت حسین نے غور کیا کہ میری شہادت کے بعد کون ایسا ہے جو میری مظلومی کا اعلان ظالم کے تخت حکومت کے نزدیک بیٹھ کر کر سکتا ہے تو حسین نے فیصلہ کر لیا کہ یہ دل و جگر علی کی بڑی بیٹی زینب کبریٰ کا ہے چنانچہ زینب کو حسین اس مصلحت کی خاطر ہمراہ لائے اور آخری وقت اس خدمت کو حسین نے زینب کے سپرد کیا در حقیقت زینب نے کوفہ کی بازاروں میں شام کے راستوں میں دربار ابن زیاد میں دربار یزید میں مظلوم کی مظلومی اور ظالم کے ظلم کا اعلان فرمایا۔ تاکہ اندھی دنیا پہچان لے کہ یزید باطل پر تھا اور حسین حق پر تھا مزید مختصر یہ کہ یزید جس کو زمین نینوا پر ظلم و جور کے ساتھ بظاہر فنا کر چکا تھا۔

زینب نے خود اس کے دربار میں مظلوم کا ماتم کیا بس یوں سمجھئے کہ یزید نے جس کو مٹایا۔

زینب بنت علی نے اسے زندۂ جاوید کر دیا۔

وہ تھے حسین .... یہ ہیں زینب جن کے پائے استقلال کو بھی یزید کے انتہائی مظالم متزلزل نہ کر سکے۔

شہیدانِ آلِ محمدؐ

شاعرِ مشرق جناب رَوِش صدیقی

زہے عظمت و شانِ آلِ محمدؐ
مشیت ہے فرمانِ آلِ محمدؐ

ہوئی دینِ قیمؐ کی بنیاد محکم
ابد تک ہے احسانِ آلِ محمدؐ

شہادت نے اعزاز معراج پایا
بہ فیضِ شہیدانِ آلِ محمدؐ

ادا سجدۂ حق ہوا زیرِ خنجر
عبادت ہے شایانِ آلِ محمدؐ

شمائل میں اوصافِ خلقِ نبیؐ سے
مشرف ہیں خاصانِ آلِ محمدؐ

اُبلتے ہیں قدموں سے تسنیم و کوثر
زہے تشنہ کامانِ آلِ محمدؐ

تصور میں پھر مشہدِ کربلا ہو
بیادِ شہیدانِ آلِ محمدؐ

اُدھر فسق و بدعت کے تاریک بادل
اِدھر مہرِ تابانِ آلِ محمدؐ

اُدھر بدنہادان کوفی و شامی
اِدھر نونہالانِ آلِ محمدؐ

نثارِ رخِ آفتابِ امامت
نجومِ درخشانِ آلِ محمدؐ

وہ عباسؑ پرچم کشائے شہادت
زعیمِ شجاعانِ آلِ محمدؐ

علی اکبرؑ پاک اجلال فرما
وقارِ جوانانِ آلِ محمدؐ

وہ قاسمؑ جگر گوشۂ سبطِ اول
چراغِ شبستانِ آلِ محمدؐ

ریاض امامت کی معصوم کلیاں ‌ ‌ مرادِ گلستانِ آلِ محمد

وہ اصحاب حضرت فدایانِ عترت ‌ ‌ دل و جاں سے قربانِ آلِ محمد

وہ تصویر اخلاص ابن مظاہر ‌ ‌ جلالِ رفیقانِ آلِ محمد

وہ حُر، حق پرستی کی قندیل روشن ‌ ‌ وہ تصدیق برہانِ آلِ محمد

اٹھا فوجِ اعداء سے نیزوں کا طوفاں ‌ ‌ بڑھے شہسوارانِ آلِ محمد

حمیت، شجاعت، صداقت نے بڑھ کر ‌ ‌ پڑھا خطبۂ شانِ آلِ محمد

اُدھر بارشِ نیزہ و تیر و خنجر ‌ ‌ ادھر، ابرِ نیسانِ آلِ محمد

اُدھر آندھیاں مکر و بغض و حسد کی ‌ ‌ ادھر شمع ایمانِ آلِ محمد

میسر ہوئی امرِ حق کو بلندی ‌ ‌ بنامِ شہیدانِ آلِ محمد

وہ خوشنودیِ ربِّ اعلیٰ کا مژدہ ‌ ‌ وہ تکمیل پیمانِ آلِ محمد

درخشاں ہے آئینۂ کربلا میں ‌ ‌ جمالِ جوانانِ آلِ محمد

مقامات تسلیم و صبر و رضا ہیں ‌ ‌ قدم بوس خاصانِ آلِ محمد

جسے کشتیِ نوح کہتا ہے قرآں ‌ ‌ ہے تمثیل پاکانِ آلِ محمد

موادِ تسلی کہاں روزِ محشر ‌ ‌ مگر ظلِّ دامانِ آلِ محمد

نگہبان تقدیس بیت الحرم ہیں ‌ ‌ غزالانِ بستانِ آلِ محمد

بہ شانِ فضائل کہ رطب اللساں ہیں ‌ ‌ خطیبِ خوش الحانِ آلِ محمد

الٰہی درود و سلام و تحیت ‌ ‌ بروحِ شہیدانِ آلِ محمد

بہ حسنِ ادب ہے روش مثل جامی
غلامِ غلامانِ آلِ محمد

ہماری اقتصادی پستی کا اثر ہماری عزاداری پر

(فخرِ قوم خان بہادر مولوی سید کلب عباس صاحب)

تمام مراسم مذہبی کی شان و شکوہ کا انحصار دو چیزوں پر ہے ایک اُس فرقہ کی اقتصادی حالت پر دوسرے اُس کے خلوصِ نیت پر۔ ہماری عزاداری میں بھی یہی دونوں عناصر کار فرما تھے اور ہیں۔ آخر الذکر یعنی خلوصِ نیت کی تو بحمد اللہ اب تک کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر شیعہ کے دل میں تربت امام مظلوم بنی ہوئی ہے اور جب تک یہ خلوص باقی ہے عزائے حسینؑ مظلومؑ باقی رہے گی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمام مراسم روپیہ کے محتاج ہیں۔ جتنے مادی اور خارجی عمل ہیں مجالس عزا، جلوس ماتم، امام باڑوں کی اور حسینیوں کی آبادی اُن کا زیب و زین اور تبرک کی تقسیم ان سب کے لئے روپیہ درکار ہے۔ چنانچہ جب ہمارے فرقہ کی مالی حالت اچھی تھی ان سب میں بڑا اہتمام ہوتا تھا اور یہ سب انتہائی شان کے ساتھ انجام پاتے تھے۔ یہ کہنا بیجا ہو گا کہ بعض دیندار شیعہ تو اپنی نجی تقریبات شادی وغم کے مقابلہ میں عزاداری میں زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ ان کے تعمیر کردہ امامباڑے اور اُن کا ساز و سامان، علم پٹکے فرش فروش، جھاڑ فانوس، شیشہ آلات سب اس کے شاہد ہیں۔ لکھو کا روپیہ کا مطلا مرصع، گنگا جمنی، روپہلی سنہری منبر تحیں، سونے چاندی کے علم، زربفت اور زردوزی پٹکے، ہزار کنول والے جھاڑ، چاندی اور سونے کے کٹاؤ کے کام کی قندیلیں، طغرہ دار نشان اور علم، ماہی مراتب کیا کیا سامان ہمارے امامباڑوں میں نہیں ہوتا تھا۔ جہاں تک تعزیوں کا تعلق ہے بعض منفرد روزگار صنعتی نمونے اس صنف میں پائے گئے ہیں۔ چنانچہ ملتان کا شاگرد والا چوبی تعزیہ جس میں تین منزلیں اور ۱۲ برج تھے اور ہر برج ہر امام کے روضہ مبارک کی نقل تھی اور جس میں کٹاؤ کا اور نقش و نگار کا کشمیری کام اسقدر باریک کیا گیا تھا کہ دو سال تک متعدد ماہرین نے جب مسلسل کام کیا تو دو منزلیں تیار ہوئیں۔ ہندستانی صنعت کا ایک نادر المثال نمونہ تھا۔ ۱۹۴۲ء میں جب یہ تعزیہ اہل شقاوت نے شہید کر دیا اور اسی سلسلہ میں ہمارا ایک وفد بسر کردگی نواب افتخار محمد امیر حیدر خاں آف محمود آباد (جو اُس وقت صدر آل انڈیا شیعہ کانفرنس تھے) ملتان گیا تو مسٹر میٹھ کمشنر ملتان نے ہمارے وفد سے کہا کہ مجھے ان لوگوں کی اس بد مذاقی پر تعجب اور افسوس ہے کہ ایسی چیز جو ہمارے ملک کی صنعت و حرفت کے لئے مایۂ افتخار تھی ان لوگوں نے اپنی عصبیت سے ختم کر دی ان کو ملکی نقصان کا بھی کچھ خیال نہ ہوا۔ بعض امامباڑوں کے کتبے بھی گردش قلم کے شاہکار نمونے فن خطاطی کے ہیں۔ اسی طرح بعض امامباڑے مثلاً امامباڑہ آصفی لکھنؤ فن تعمیر کے حیرت انگیز کرشمے ہیں۔

لیکن یہ سب تزک و احتشام، شان و شکوہ، عروج و ارتقاء عزاداری کو کیوں حاصل ہوا اس لئے کہ اہل دول کی عقیدتمندی نے اُن کو سرکار حسینی میں ایسے ہدیے پیش کرنے پر آمادہ کیا اور اُن کے ہاتھ اتنے کشادہ تھے کہ وہ جی کھول کر لکھو کا روپیہ ان کاموں پر صرف کر سکے حسینیت کے عالمگیر اثر نے صرف مسلمان بادشاہوں تک اس عقیدت کو محدود نہیں رکھا بلکہ غیر مسلم فرمانرواؤں نے بھی اپنی نذریں بقدرِ ظرف پیش کیں۔ چنانچہ ریاست گوالیار کا عزا خانہ وہاں کی عزاداری اور عزاداری کے لئے دو لاکھ کا بجٹ اور لنگر کی تقسیم آج تک مشہور روزگار ہیں۔ اندور اور بجے پور کی عزاداری اور جلوس عزا بھی وہاں کی تاریخ عزاداری کو چمکا دیتے ہیں۔ ہمارے لکھنؤ کی عزاداری شاہان اودھ کے جود و کرم اور ارادت کیشی کا زریں ورق ہے۔ حسین آباد مبارک، آصفی امامباڑہ، شاہ نجف۔ امجد علی شاہ مرحوم کا حسینیہ تو شاہی امامباڑے ہیں۔ اُمرا اور رؤسا کے بنا کردہ عالیشان امامباڑہ بھی یہاں اس کثرت سے موجود تھے اور ہیں کہ ان کا ذکر ایک کتاب چاہتا ہے لیکن ان میں سے کیا سب باقی ہیں اور کیا ان کی وہ تمام پُر زینت مجالس اور گراں سنج تقسیم اور پُر شکوہ جلوس باقی ہیں جو پہلے نکلا کرتے تھے۔ نہیں بیسوں امامباڑے نیلام ہو کر نجی رہائش گاہ بن گئے۔ سیکڑوں ویران اور اجاڑ ہو گئے ہزاروں بے مرمت اور غیر مسقف پڑے ہوئے ہیں اور لاکھوں عزا خانے (خدا جھوٹ نہ بلائے) جو نجی گھروں میں تھے اب مفقود و بے نشان ہیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے جو تغیرات لکھنؤ میں ہوئے عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔ نواب

مہدی حسین صاحب ماہر مرحوم کا امامباڑہ اور اُس کی عالیشان مجالس ختم ہوگئیں۔ چھوٹی شہزادی کا مشہور جلوس برائے بیت رہ گیا۔ اکرام اللہ خاں کا امامباڑہ جس میں اٹھنی کی تقسیم ہوا کرتی تھی گر گیا اور مجالس ختم ہوگئیں۔ دل آرام کی بارہ دری کی ۲۵ ر رجب کی تحت اللفظ خوانی کے نئے مرثیہ کی مجلس جس میں صوبہ بھر کے لوگ آتے تھے بند ہوگئی۔ گولہ گنج کی بیگم کا جلوس جس میں سینکڑوں اونٹ اور ہاتھی ہوتے تھے اب نہیں نکلتا۔ مجھے تو یاد ہے کہ یکم محرم سے ۸ ر ربیع الاول تک شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی جلوس نہ نکلتا ہو اور کوئی نہ کوئی یادگار مجلس نہ ہوتی ہو لیکن اب اقتصادی پستی نے رنگ محفل دگرگوں کر دیا۔ نہ وہ پر تکلف حصوں کی تقسیم ہے نہ نقدی تقسیم کی مجالس نہ وہ دبدبے والے جلوس نہ وہ مشہور روزگار مجالس۔ یہ سب کیوں ہوا۔ صرف اس لئے کہ لکھنؤ میں ہماری اقتصادی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ اُس نے ہماری عزاداری میں بھی انحطاط پیدا کر دیا۔ امامباڑوں کا سامان نخاس میں فروخت ہوگیا۔ علم اور ضریح اور پٹکے بازار میں آنے لگے۔ صاحبان کرم دست نگر ہوگئے۔ سچ ہے۔

زمیں چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا   بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

شہری آبادی میں انقلابات زیادہ اور جلد جلد رونما ہوتے ہیں اس لئے خیال ہو سکتا ہے کہ شہری انقلاب سے دیہاتی رقبوں کی حالت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ دیہات میں انقلابی اور اقتصادی اثرات اتنا زیادہ رونما نہیں ہیں مگر خاتمۂ زمینداری کے بعد تو میرے خیال میں شہری رقبہ سے زیادہ دیہاتی رقبوں میں اقتصادی پستی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے فرقہ کے زیادہ تر افراد اہل قلم تھے جو ملازمت سے گذر بسر کرتے تھے۔ ہمارے یہاں اہل حرفت بہت کم تھے۔ اہل قلم کے علاوہ دوسرا طبقہ ہمارے یہاں زمینداروں کا تھا اور سوائے اودھ اور چند اضلاع کے یہ طبقہ چھوٹے زمینداروں پر مشتمل تھا جن کے یہاں صرف بقدر ضرورت کاشت ہوتی تھی اور کل آراضی کاشتکاروں کے ساتھ ترددشدہ تھی۔ خاتمۂ زمینداری کے بعد نہ صرف ان کی زمینداری ختم ہوئی بلکہ جملہ آراضی جو آسامیوں کے قبضہ میں تھی ان کے قبضے سے نکل گئی اور اب ان کی مثال ایک درخت بے برگ و ثمر کی ہے۔ سوائے اُتر پردیش کے چند اضلاع مغربی کے مثلاً بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور بقیہ تمام اقطاع ہندوستان

جہاں خاتمۂ زمینداری کا قانون نافذ ہوا شیعوں کی اقتصادی حالت نہایت زبوں ہوگئی ہے۔ اکثر لوگوں نے وقف علے الاولاد کے ساتھ اپنی املاک کا ایک جزو امور خیر و خیرات و عزاداری کے لئے وقف کیا تھا۔ گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح وہ بھی پس گیا اور باوجود قانون میں اُس جزو کے متعلق عطیہ دیئے جانے کے لئے خاص دفعہ کے موجود ہونے کے جو معاوضہ کے نقشے بنے اُن میں اس جزو خیراتی کو علیحدہ نہیں رکھا گیا۔ موقوف علیہم کا اس میں فائدہ ہے کہ بلا استثنا جزو خیراتی کے وہ معاوضہ پاویں اس لئے وہ بھی حکومت کے حکام معاوضہ کے اس تسامح پر خاموش ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عزاداری کے لئے وقف علے الاولاد کی دستاویزوں میں جو آمدنی واقفان نے مخصوص کر دی تھی وہ بھی غائب ہوگئی۔ چھوٹی چھوٹی جو معافیاں امامباڑوں یا کربلاؤں کے لئے یا عزاداری حسینؑ کے لیے نذر تھیں وہ بھی ہنوز حکام معاوضہ کے رحم و کرم پر ہیں اور اب تک اکثر متولیان کو اُن کا عطیہ نہیں ملا۔ مختصر یہ کہ خاتمۂ زمینداری نے انفرادی حیثیت سے بھی اور قومی حیثیت سے بھی ہماری اقتصادی حالت کو خراب کر دیا اور عزاداری کا جو منبع و مخزن تھا اُس کا سوتا ہی غائب کر دیا۔

جس کا نہایت خراب اثر ہماری دیہات کی عزاداری پر پڑ رہا ہے۔ یہ انحطاط ہر عنوان سے ہر جگہ رونما ہے۔ تبرک کی تقسیم کا معیار گر گیا ہے۔ سامان زینت و آرائش جلوس ہائے عزا میں کم ہو گیا ہے۔ مہندی وغیرہ کے جلوس میں رونق کم رہ گئی ہے۔ ذاکرین جو بلائے جاتے تھے اُن میں ۷۵ فیصدی کمی ہو گئی ہے اور امامباڑوں کی عمارت کی صفائی و مرمت میں تو نمایاں غفلت روبکار ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کا حل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا حل تو اقتصادی حالت کی درستی ہے مگر یہ تو اپنے بس کی چیز اس معنی میں نہیں کہ کسی جماعت کی اقتصادی حالت کی اصلاح مضامین یا تقریروں سے ممکن نہیں ہوتی بلکہ اُن کی معاشرتی اور قومی زندگی اور تمام ملک کی اقتصادی حالت اور جماعتی تنظیم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ضرورت، ماحول، سیاسی مواقع، حوصلہ، اُمنگ، جفاکشی یہ سب اقتصادی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ ہماری کانفرنس کا شعبۂ اقتصادیات اور رہبران ملت اس کے لئے کوشاں ہیں کہ ہماری جماعت کی اقتصادی حالت سنبھل جائے۔ مگر اس کے لئے وقت چاہیئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ اقتصادی پستی کے دور میں ہم کو

جو انحطاط عزاداری میں رونما ہے اُس کے روکنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

(۱) سب سے پہلے میرے نزدیک انفرادی عزاداری کے بجائے پنچائتی یا مرکزی عزاداری کو ترقی دینا چاہیئے۔ اب سے پچاس برس پہلے عزاداری انہیں پنچائتی اور مرکزی امامباڑوں میں ہوا کرتی تھی اور سارے محلہ یا حلقہ کے لوگ اُس کی ترقی میں دامے درمے قدمے سخنے شریک رہتے تھے اور اُس کو اپنی انفرادی مجالس پر اور جلوس و عزاداری پر ترجیح دیتے تھے، بعض مقامات مثلاً امروہہ میں اب بھی یہ طریقہ بڑی کامیابی سے رائج ہے انفرادی گشت مرکزی گشتوں میں ضم کر دیئے جائیں اور جو پیسہ عزاداری میں لگتا ہے وہی مرکز پر صرف کیا جاوے۔

(۲) مرکزی یا پنچایتی مقابر کی مرمت و بقا کے لئے ایک فنڈ مثل ہاؤس ٹیکس کے ہونا چاہیئے اور اُسی سے اُس کی سالانہ مرمت ہونا چاہیئے۔ حیثیت کے لحاظ سے آمدنی کا ایک فیصدی اس فنڈ میں ہر ایک کو دینا چاہیئے۔ کربلاؤں کے بقا کا یہ انتظام کرنا چاہیئے کہ اُن میں درختان ثمر لگا کر اُن کو ذریعہ آمدنی بنایا جائے اور محافظ درختان ہی کو محافظ کربلا بنایا جائے۔ یہ طریقہ قصبہ دھولڑی رسول پور ضلع میرٹھ میں کامیاب ہو چکا ہے اور کثیر المنفعت ثابت ہوا ہے۔

(۳) ہر ضلع میں متعدد مقامات پر تبلیغی مجالس منعقد کی جاتی ہیں اُن کو ایک مرکز پر مختص کر دینا چاہیئے تاکہ اُن میں مرکزیت پیدا ہو اور متعدد بار شرکا کو بار مصارف برداشت نہ کرنا پڑے اور ان اجتماعات کے موقع پر عزاداری کی ایسی اہم ضرورتوں کے لئے جو اُس حلقہ کی ہوں چندہ کر کے اُسی فنڈ کے کچھ جزو کو اُس پر لگانا چاہیئے مثلاً اگر کوئی امامباڑہ گر گیا ہے یا کسی موضع یا قصبہ کی اجتماعی عزاداری کے لیے کوئی سامان نہ رہا ہو تو اُس میں سے اُس کو امداد دینا چاہیئے۔

(۴) جو متعلقات امامباڑہ یا کربلا یا دیگر املاک متعلق عزاخانہ جات ہیں اُن کا کوئی منفعت بخش مصرف نکالنا چاہیئے۔ مثلاً اگر امامباڑہ کے زیریں حصہ میں دو کانات تعمیر ہو سکتی ہیں تو وہ تعمیر کی جائیں۔ احاطہ میں درخت لگ سکتے ہوں تو درخت لگائے جائیں وغیرہ وغیرہ۔

(۵) بجائے نئے امامباڑے تعمیر کرنے کے یا اُن کے متعلق اوقات قائم کرنے کے پرانے شکستہ امامباڑوں ہی کی مرمت کی جائے اور اُنہیں کے بقا کے لئے املاک وقف کی جائیں۔

(۶) غیر ضروری مراسم پر جو جزو عزاداری نہیں ہیں بلکہ محض رسماً نام و نمود یا شہرت و وجاہت کے لئے کئے جاتے ہیں ترک کیا جائے اور یہی رقم ترقی عزا میں صرف کی جائے۔

(۷) ایک گروہ حسینی خدمت گزاروں کا قائم کیا جائے جو غیر آباد اور اُجاڑ عزاخانوں کی درستی، آبادی، احیائے عزا، اور ترقی کے لئے برابر سعی جاری رکھے۔

قطعہ

جی چاہے تو حرملہ کی توقیر کرو
ظلم اُس کا مجاہدہ سے تعبیر کرو
ہے اتنی گزارش اُسے انساں کہہ کر
انسان کے لفظ کی نہ تحقیر کرو

(آفو بدایونی)

بندگی کا نام تھا لیکن خدائی اس نے کی

(جناب مغیث الدین صاحب فریدی ایم اے)

کفر کی کالی گھٹا مذہب پہ جب چھانے لگی | دین کے شانوں پہ زلف شرک لہرانے لگی
جب عبادت کو مسلماں سے حیا آنے لگی | چاندنی جب ملتِ بیضا کی گہنانے لگی

نفس کی موجوں میں جب روح شریعت بہہ گئی
جب اذاں سکوں کی جھنکاروں میں دب کر رہ گئی

ایسے نازک دور میں اک مردِ حق حجرہ نشیں | محرم رمز شریعت، واقف اسرار دیں
جانِ خاتونِ قیامت، روح ختم المرسلیں | جس کی عظمت کا تصور کوئی کر سکتا نہیں

گوشۂ عزلت سے باہر آگیا مردانہ وار
لا فتیٰ الّا علی لا سیف الّا ذو الفقار

وہ حسینؑ ابن علیؑ راز ازل کا رازدار | جس کے تیور پر نظام دو جہاں کا انحصار
پھیر دیں جس کی نگاہیں گردش لیل و نہار | جس کی ہر تشنہ نظر تسنیم و کوثر در کنار

ملّتِ اسلام کی عقدہ کشائی اس نے کی
بندگی کا نام تھا ورنہ خدائی اس نے کی

تیری قربانی سے تنظیم دو عالم ہو گئی ‖ خون سے تیرے بنائے شرع محکم ہو گئی
تیری خونیں آستیں ملّت کا پرچم ہو گئی ‖ بزمِ باطل تیرا نعرہ سُن کے برہم ہو گئی

ظلم سے انسانیت مجروح ہو سکتی نہیں
جسم ہو سکتا ہے فانی رُوح ہو سکتی نہیں

اے نگہبانِ شریعت ترجمانِ کن فکاں ‖ اے امامِ دیں اے شہزادۂ کون و مکاں
حشر تک گونجے گی تیری خشک ہونٹوں کی اذاں ‖ اے سرِ مقتل نبوت کے اکیلے پاسباں

جان دے کر صور پھونکا نعرۂ تکبیر کا
رنگ گہرا کر دیا ایمان کی تصویر کا

قوت حق کے علاوہ کوئی قوت کچھ نہیں ‖ تو نے سمجھایا کہ شانِ آمریت کچھ نہیں
ذہن کا اک خوشنما دھوکا ہے عشرت کچھ نہیں ‖ دل غنی ہو تو یہ دولت یہ حکومت کچھ نہیں

جان دیتا ہے مسلماں وعدۂ دیدار پر
رقص کرتا ہے مجاہد تیغ کی جھنکار پر

اک نئی انگڑائی لی اسلام کی تقدیر نے ‖ نور پھیلایا جہاں میں نور کی تنویر نے
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں شبیرؑ نے ‖ حوصلے دل کے بڑھائے نعرۂ تکبیر نے

آشکارا کر دیا باطل اُبھر سکتا نہیں
موت سے بھی زندۂ جاوید مر سکتا نہیں

حسینؑ کیسے تھے

(جناب سید مظاہر حسین صاحب شوف نوگانوی از وزیر آباد پاکستان)

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؑ
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

میرے ایک عزیز دوست نے سید الشہدا امام حسینؑ کی مدح و منقبت میں ایک زبردست اور طویل نظم کی پرزور فرمائش کی۔

عزیز محترم نے فرما دیا اور میں نے سن لیا۔ لیکن جب امام حسین علیہ السلام کی جلالت قدر اور ان کے مافوق بشر کردار پر نظر ڈالنی شروع کی تو میری قوت متخیلہ جواب دے گئی۔ اور میں نے اپنی صلاحیتوں کو اس معاملہ میں مجبور اور قابل رحم پایا لہٰذا میں کچھ نہ لکھ سکا۔ میں کیا اور میری تعریف کیا۔ میں اس ہستی کی کیا تعریف کرسکتا ہوں جس کی شان میں خود خدائے بے نیاز قصیدہ خوانی کرے اور خدا کا محبوب اس کی ناز برداری اپنا فخر سمجھے اس کے لئے اونٹ بنے، اونٹ کی آواز نکالے۔ مہار کے طور پر اپنی زلفیں اس کے ہاتھوں میں دے دے اور اگر کہنے والا یہ کہہ بیٹھے

"کیا اچھی سواری ہے"

تو رسول اکرم ٹوک کر یہ فرمائیں

"یہ کیوں نہیں کہتے کتنا اچھا سوار ہے"

اگر نماز پڑھتے ہوئے سجدے کی حالت میں رسولؐ کی گردن پر حسینؑ سوار ہو جائیں تو خدا کا حکم پہنچ جائے کہ

اے حبیب جب تک حسینؑ اپنی مرضی سے نہ اترے تم اتارنے کی کوشش نہ کرنا خواہ ذکر سجدہ تین مرتبہ کے بجائے ستر مرتبہ کیوں نہ ادا کرنا پڑے اور حسین کے سبب سے ذکر سجدہ کا ستر بار ادا کرنا سنت ہی قرار دیا جائے اور اس درازی سجدہ کے متعلق یہ بھی نہ سوچا جائے کہ حضور کے پیچھے جو لوگ نماز پڑھ رہے ہیں وہ کیا سوچیں گے۔

مومنین۔ صدیقین متقین۔ اولیا و انبیا و مرسلین کے جتنے اوصاف کلام پاک میں پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب اور کسی میں ہوں یا نہ ہوں امام حسین کی ذات والا صفات پر سب منطبق ہو جاتے ہیں۔ امتحان کے سلسلہ میں جو جو معیار قدرت نے اپنے مخلصین کے آزمانے کے لئے مقرر فرمائے ہیں۔ حسین نے اپنا امتحان ان معیاروں کے ساتھ بلکہ ان سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر بیک وقت میدان کربلا میں دے کر اس شان کی کامیابی حاصل کی کہ تاریخ اس کے جواب میں خاموش اور مورخین اور اقوام عالم انگشت بدنداں ہیں یہ کہہ دینا کہ

"حسینؑ ایسے تھے جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔"

حسینؑ کی تعریف نہیں بلکہ توہین ہے اس لئے کہ

"حسینؑ تو ایسے تھے جیسا خدا چاہتا تھا"

لہٰذا امام حسین کی تعریف میں میرے تخیل کی انتہائی پرواز یہی ہو سکتی ہے کہ۔

"امام حسین علیہ السلام ایسے نہیں تھے جیسا ہم چاہتے ہیں بلکہ وہ ایسے تھے جیسا خدا چاہتا تھا"

یا بالفاظ دیگر۔

"وہ نشانۂ قدرت عزم احدیت تقریر الٰہی بلکہ اس دنیا میں نمائندۂ جبروت و قدرت خداوندی تھے۔

بڑا فرق ہے ہماری چاہت اور خدا کی چاہت میں ہم حادث ہیں وہ قدیم۔ ہم رنگ بدلنے والے ہیں وہ بے رنگ و بیرنگ۔ ہم آج کچھ اور کل کچھ۔ ماحول ہم کو بدلے زمانہ ہم میں تغیر پیدا کرے لیکن قدرت ان سب سے بے نیاز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں ہیجانات کے زیر اثر ہمارے افکار و خیالات اور افکار و خیالات کے ماتحت تمدن اور تہذیب میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ نئے نئے تمدن نئی نئی تہذیبیں پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ ماہر نفسیات اس امر پر متفق ہیں کہ آب و ہوا کا اثر انسانی صحت اور اعصاب و عضلات پر پڑنے سے مختلف ممالک کے رہنے والوں کی شکل و شباہت اور آواز تک میں بھی نمایاں تبدیلی ہو جاتی ہے اور اسی سے خیالات و افکار میں بھی۔

حد یہ ہے کہ خوراک کے اثر کو بھی کافی دخل ہے جس سے مزاج بنتا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی کا مزاج صفراوی کسی کا سوداوی کسی کا بلغمی کسی کا دموی۔ کوئی قوم سرخ۔ کوئی زرد کوئی سفید اور کوئی سیاہ دیس معلوم ہوا کہ۔

نظام جسمانی سے بھی ہمارا دل و دماغ متاثر ہوتا ہے آب و ہوا سے بھی ہمارا دل و دماغ متاثر ہوتا ہے لیکن قدرت ان سب سے بے نیاز ہے لہٰذا ممکن ہی نہیں بلکہ یقینی ہے کہ زمانہ اور ماحول کے اختلاف کے باعث ہماری رائے میں اختلاف پیدا ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ ہم ایک بات کو آج اچھا کہتے ہیں اور کل اسی کے بارے میں خاموش ہیں۔

"پس ہماری رائے خدا کی رائے سے کبھی لگا نہیں کھا سکتی اس کو ثبات ہے وہ" "انسانی کیفیات سے مبرا وہ حقیقت محض بلکہ ازلی و ابدی حقیقت ہے ہم" میں تغیر کی رنگا رنگی ہماری رائے اختلاف کا جوہر اور ابن الوقتی کا نچوڑ" ہوتی ہے ہمارا دماغ و مزاج حالات و حادثات سے غیر دائمی طور پر مرعوب" "ہوتا رہتا ہے جس کا ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس مرعوبیت کی وجہ سے" "ہم اپنے عقائد اور پسندیدہ خیالات کی ماحول کے مطابق تاویل کرتے رہے ہیں تاکہ ہم اپنے خیالات کو اہل عالم کے ذہنوں" سے قریب کر کے ان عقائد و مقالات کے متعلق ان داہل عالم کی

نفرت کو کم کر سکیں۔ خواہ اس تاویل میں ہم خود ہی دھوکہ کیوں نہ کھا جائیں اور حقیقت ہی سے دور کیوں نہ جا پڑیں۔ دور کیوں جائیں" دس پندرہ سال کی مدت میں انسانی ذہنوں اور عقلوں نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں اور مذہبی عقائد و مسلمات کیا جھٹکا ہوا ہے اور باب بصیرت سے پوشیدہ نہیں برتھ کنٹرول کا شور مچا تو اس کی حمایت میں آیات و احادیث" "تلاش ہونے لگیں" "عدم تشدد کی شہرت ہوئی تو اس کے ثبوت میں مذہبی مستندات کی" "کھینچا تانی ہونے لگی حالانکہ اہنسا ایک سیاسی اسٹنٹ سے زائد وقعت نہیں رکھتی اور یہ حربہ محض انگریز کو نیچا دکھانے کے لئے ایجاد و استعمال کیا گیا تھا جس کا شور و غلغلہ اب آزادی ملنے کے بعد تو می نہیں رہا ہے اسی طرح تعداد ازدواج "" کی مخالفت وغیرہ وغیرہ۔

اسی مرعوبیت نے تفاسیر قرآن کو طوطا مینا کی کہانیوں سے بھر دیا ہے ہزارہا تفسیریں لکھی گئیں لکھوکھا اختلاف پیدا ہوئے اور کروڑہا اغلاط رواج پا گئے۔ ان تفاسیر کو ایک جگہ جمع کر کے اگر مطالعہ کرنا چاہیں تو عمر نوح بھی کافی نہ ہوگی۔ اور پھر جب ان کو پڑھ ہی نہ سکیں گے تو سمجھیں گے کیا۔ اور جب سمجھیں گے نہیں تو اس پر عمل کیا خاک ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کو ہم سمجھ ہی نہ سکے یا سمجھ ہی نہیں سکتے بالفاظ دیگر قرآن ایک ناقابل فہم و ناقابل عمل قانون بن کر رہ جاتا ہے۔ تیسری صورت وہی ہے کہ پسند خاطر اور رجحیب تو زمانے کی رو سے ہے اس لئے قرآن مجید کی آیات کو تاویل کے چکر پر زمانے کے ساتھ گھماتے رہتے ہیں یہی وجہ تھی جو رسول اکرم کو فرمانا پڑا۔

من فسّر برائه ....

جس شخص نے قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے کو دخل دیا اس نے اپنے پیٹ کو آتش جہنم سے بھر دیا

تاریخ قرآن شاہد ہے تفسیریں چیخ چیخ کر زبان حال سے فریاد کر رہی ہیں کہ ہم میں بے انتہا اختلافات بھر دیئے گئے ہیں۔ محض ہمارے ذریعے سے صحیح نتائج تک پہنچنا بہت مشکل ہے ایسے قال اقول کرنے والے تو ہماری بساط قرآن کے بارے میں اتنی

ہی ہے کہ لغت اور قواعد صرف و نحو کو سے کر دوڑ پڑیں اور بس نتیجہ ظاہر ہے کہ ہم لوگ پڑھ لکھ لینے کے بعد بھی حسین اور حسین کے باپ دادا کے محتاج ہیں"۔ جب تک قرآن حسینؑ اور حسین کے گھر سے نہ حاصل کریں گے قرآن اپنا مطلب نہ بتائے گا۔

ہم تو اس مرعوبیت کے ہاتھوں یا باطل کی ظاہری خوشنمائی سے مبہوت ہو کر خود حق کو باطل جیسا بنا لیتے ہیں اور باطل کو حق۔ پس جب ہم قرآن کے عرفان سے جو ہمارے ذہنوں سے بھی بہت کچھ قریب ہے اتنے دور ہیں تو حسین اور خدا کے عرفان کے بارے میں تو ہمارے مبلغ علم کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اس صورت میں ہماری تعریف کا جو وزن رہ جاتا ہے وہ ظاہر ہے۔

قدرت نے ہم کو ایسا بنایا ہے جیسا کہ ہم چاہتے ہیں لہٰذا ہم کرتے بھی وہی ہیں جو ہم چاہتے ہیں۔ اسی لئے تو ہم خاطی گنہگار اپنی خواہش سے عمل کرنے والے اچھائی برائی کو اختیار کرنے والے ہیں اور حسین کو قدرت نے ایسا بنایا جیسا کہ قدرت خود چاہتی تھی یہی وجہ تھی کہ حسین اپنی خواہش کو ٹھکرانے والے اور اعزا و احباب کے ان بظاہر مفید مشوروں کو بھی رد کرنے والے تھے جو خدا کی خواہش میں رکاوٹ پیدا کر سکتے تھے نیز وہ یعنی حسین وہ کرنے والے تھے جو خدا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معصوم تھے لہٰذا یہ کہنا کہ

"وہ ایسے تھے جیسا کہ ہم چاہتے ہیں" غلط بالکل غلط۔

حسین اگر ایسے ہوتے کہ جیسا کہ ہم چاہتے ہیں تو وہ وہی کرتے جو ہم کرتے ہیں یا جیسا ہم چاہتے ہیں احباب و اقارب کے مشوروں پر عمل کرتے وہ احتیاطی تدابیر اختیار کرتے جو جنگ کے خطرے کے پیش نظر ایک سخت حریف کے مقابلے میں اختیار کی جاتی ہیں اپنا پروپیگنڈا تیز کرتے اور حریف کو ہر مغالطے ہر دھوکے اور ہر فریب سے شکست دینے کی کوشش کرتے لیکن انھوں نے ہرگز ایسا نہ کیا بلکہ ہم جیسوں کا کہنا بھی نہ مانا مشورہ بھی قبول نہ کیا اور ان دہم جیسوں کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر ان سب کی خواہشات کو خواہ وہ سیاسی تھیں یا اقتصادی، مروت کے ماتحت تھیں یا محبت کے یا بظاہر حالات کے مطابق دلفریب و مفید۔ ان سب کو ٹھکراتے ہوئے کربلا پہنچ کر وہ کیا جو خدا چاہتا تھا۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری!
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

محمد حنفیہ جو امام حسین علیہ السلام کے بھائی تھے اور دوست بھائی تھے اور جو آپ کو امام مفترض الطاعۃ بھی مانتے تھے اور جو عرب کے مشہور سیاستدانوں میں گنے جاتے تھے وہ آپ (امام حسین) کے گھوڑے کی لگام پکڑ لیتے ہیں اور یہ مشورہ دیتے ہیں کہ۔

"آپ بجائے عراق کے یمن تشریف لے جائیں یہ (عراق کے) لوگ قابل اعتماد نہیں یمن میں آپ کے دوستوں کی کافی تعداد موجود ہے وہ آپ کی ہر طرح اعانت و امداد کریں گے۔

اور جب امام حسین علیہ السلام اس مشورے کو نہیں مانتے تو محمد حنفیہ عرض کرتے ہیں اچھا

"آپ بچوں اور مستورات کو ہمراہ نہ لے جائیں"

یہ مشورہ کیا بادی النظر میں غیر مفید تھا؟ یا دنیا کا کوئی انسان ہے جو اس مشورے کی افادیت سے انکار کر سکے یا کوئی ہے جو یہ کہہ سکے کہ محمد حنفیہ کی رائے میں اخلاص نہ تھا کوئی ہے جو یہ ثابت کرے کہ محمد حنفیہ کی ذات شبہات سے بالا نہ تھی یا کوئی ایسا مفکر ہے جو یہ ثابت کر سکے کہ مذکورہ بالا مشورہ اس زمانے کی احتیاطی تدابیر کا سرتاج نہ تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی امام حسین نے ان کی سنہری رائے سے اختلاف کیا کیوں؟ اس لئے کہ حسین ایسے نہ تھے جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ ایسے تھے جیسا خدا چاہتا تھا۔ ان کی نگاہیں جس منظر کو دیکھ رہی تھیں وہاں تک ہماری آنکھوں کی رسائی نہ تھی یا نہیں ہے۔ جو مقصد یا دستور العمل ان کے پیش نظر تھا ہم اس کو صدیوں میں کہیں تھوڑا بہت سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اگر محمد حنفیہ کی رائے پر عمل کر لیا جاتا تو حسین ایسے نہ رہتے جیسا کہ خدا قابل چاہتا تھا۔ بلکہ ایسے ہو جاتے جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔ اس وقت بنی ہاشم میں چار شخص ایسے موجود تھے جن کا جواب شجاعت و بسالت اور فوجوں کے لڑانے میں تمام عرب میں نہ تھا۔ اور ان میں سے ہر ایک شخص ہزار ہزار آدمیوں کے مقابلے کا تصور کیا جاتا تھا یہ تھے

مسلمؑ ابن عقیل، عباسؑ ابن علی، محمدؐ حنفیہ ابن علی اور...

عبدؓ اللہ بن جعفر، مسلم ابن عقیل جو سفارت کے کام سے بھی بخوبی واقف تھے ان کی شان یہ تھی کہ مضبوط سے مضبوط قوی ہیکل آدمی کو اتنا اونچا پھینک دیتے تھے کہ وہ کوٹھے پر جا پڑتا تھا چنانچہ کوفے میں اس کا مظاہرہ ہوا۔ جب ابن زیاد کی فوج کو تین مرتبہ تابڑ توڑ شکست دے چکے اور کمانڈر پھر بھی حسب سابق فوجی کا طالب ہوا تو اس نے جواب دیا کہ تین مرتبہ متواتر تازہ دم فوج ایک بھوکے پیاسے آدمی سے شکست کھا جائے کس قدر حیرت انگیز واقعہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ سے جی چراتے ہو اور لڑنا نہیں چاہتے۔ کمانڈر نے جواب دیا مسلم بنی ہاشم کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے ہمارا مقابلہ کسی بنئے بقال سے نہیں بلکہ عرب کے مشہور اور جانباز سورما سے ہے۔

عبداللہ ابن جعفر کے متعلق مشہور تاریخی واقعہ ہے

ایک مرتبہ نئی زرہ پہنی تو وہ اتفاق سے جسم سے بڑی نکلی آپ نے زرہ کا فالتو حصہ ہاتھ سے پکڑ کر انگلیوں کے زور سے توڑ توڑ کر پھینک دیا محمد حنفیہ اپنے والد محترم امیر المومنین علی ابن ابیطالب کے ہمراہ کئی معرکوں میں داد شجاعت دے چکے تھے آزمودہ کار مرد میداں تھے۔

عباس ابن علی قمر بنی ہاشم ایک طویل القامت قوی الجثہ اور پرجلال انسان تھے عرب کا کوئی گھوڑا آپ کے فٹ نہ آتا تھا عرب میں ایک گھوڑا ہوتا ہے جس کو "مرتجز" کہتے ہیں اس کے اوصاف وخصوصیات میں یہ بات شامل ہے کہ کیسا ہی زبردست سوار کیوں نہ ہو یہ اتنا بلند اور عظیم الجثہ ہوتا ہے کہ جب یہ اپنی گردن اٹھاتا ہے تو سوار اس کی گردن کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور سامنے سے آنے والے آدمی کو سوار بالکل نظر نہیں آتا جب دم کو کھڑا کر کے سوار کے سر پر چنور کر لیتا ہے تو پیچھے سے بھی اکثر سوار معلوم نہیں ہوتا لیکن عباس ابن علی جب مرتجز پر سوار ہوتے تھے تو آپ کا سینہ اور سر و گردن سامنے سے دکھائی دیتے تھے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کس قدر طویل القامت انسان تھے آنکھوں کی جلالت اور چہرے کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ بہادر سے بہادر انسان بھی نظر نہیں ملا سکتا تھا۔ ایسے منتخب روزگار سورماؤں کو ایسے خطر وقت میں ضرور اپنے ساتھ رکھنا چاہئے تھا۔ نیز دیگر بنی ہاشم کو بھی جو شمشیر زنی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے ساتھ لے کر میدان میں آنا چاہئے تھا۔ لیکن آپ نے ان کو ہمراہ نہ لیا بلکہ ان یگانۂ روزگار افراد کو بھی منتشر کر دیا اور ایک جگہ جمع نہ ہونے دیا۔

عبداللہ ابن جعفر کو آشوب چشم کے بہانے چھوڑا۔ محمد حنفیہ کو بنی ہاشم کی نگرانی کے بہانے، مسلم ابن عقیل کو کوفے کا سفیر بنا کر جدا کیا اور عباس ابن علی کو اپنے ساتھ رکھا کہ ہر وقت آپ کی نظر کے سامنے اور آپ کے احکام کے ماتحت رہیں۔ علاوہ ازیں مکہ یا مدینہ جنگ کے لئے مناسب مقامات تھے۔ آپ کا اثر و رسوخ بھی ان مقامات پر کافی تھا۔ نیز اس وقت میں اتفاق سے مکے کی افادیت اور اہمیت یقیناً شک و شبہ سے بالا ہو جاتی ہے۔ جب کہ حج کا زمانہ قریب تھا دنیائے اسلام فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے مکے کا رخ کئے ہوئے تھی اور آپ نواسۂ رسول ہونے کی بنا پر مکے میں مشہور ہی نہیں بلکہ قابل احترام اور بہت حد تک مرجع انام تھے ایسی صورت میں آپ یزید کے خلاف اگر تحریک شروع کرتے تو محض خطبات ولقاریر ہی سے آگ لگا سکتے تھے۔ اور پورے عرب بلکہ دنیائے اسلام میں ایسی چنگاریاں بکھیر سکتے تھے جو قصر حکومت کے ہر دالان اور ہر گوشے میں شعلۂ جوالہ بن کے بھڑکیں اور بہت ممکن تھا کہ تخت خلافت ہی کو پھونک کر خاک سیاہ میں تبدیل کر دیتیں اور آپ آرام سے مکے ہی میں رہتے لیکن آپ مدینہ سے مکے اور مکے سے کربلا منتقل ہوتے گئے۔ اور ان مرکزی مقامات کو مرکز نہ بنایا یہی نہیں الٹا اپنے ساتھیوں کو بھی کم کرنا شروع کر دیا ہر منزل پر خطبوں پر خطبے کہ۔

"میرے ساتھ جانے والے سوچ لیں کہ اس میں مال غنیمت اور دنیاوی فائدے کا قطعاً کوئی امکان نہیں جو مصائب و مشکلات پسند ہوں اور جان دینے کے لئے تیار ہو وہ میرے ساتھ آئے۔

بھلا اس صورت میں کس طرح لشکر کی نفری میں اضافہ ہو سکتا تھا وہی ہوا جو آپ چاہتے تھے اور ہم نہ چاہتے تھے یعنی ساتھی کم ہونے شروع ہو گئے اس کے ساتھ ساتھ حیران کن یہ امر بھی ہے کہ جہاں ان ہزارہا ساتھیوں کو ان صاف اور دو ٹوک خطبات کے ذریعے سے الگ فرما رہے تھے وہاں بعض حضرات کو انفراداً

بذریعہ خط وکتابت طلب بھی فرما رہے تھے۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام امور ذاتی خواہش کی بنا پر نہیں تھے بلکہ یہ کام کسی خاص طاقت و قوت کے ماتحت ہو رہا تھا۔ اگر حسین ایسے ہوتے جیسا ہم چاہتے ہیں تو مندرجہ بالا کاموں میں سے جو انھوں نے کئے ایک بھی نہ کرنا چاہئے تھا اس لئے کہ یہ تمام کام وہ ہیں جن کو ہمارے دل و دماغ قبول نہیں کرتے بلکہ ہمارا دل تو یہ چاہتا تھا اور چاہتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کسی طرح سے بچ جاتے ــــ اور امام حسینؑ یہ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح بھی اس قربانی سے نہ بچیں اور یہ امتحان نہ ٹلے اس بنا پر وہ برابر کوشش کر رہے تھے کہ ہر اس معمولی سے معمولی رکاوٹ کو بھی دور کر دیا جائے جو اس قربانی کو ہلکا کرتی ہو۔ یا ٹالنے میں معاون ثابت ہو۔ تاکہ وہ اس میں ایسے کامیاب ہوں کہ ماضی و مستقبل بلکہ ہمیشہ کے لئے امتحانی کامیابیوں اور قربانیوں کا ریکارڈ توڑ کر رکھ دیں۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں ایسے کامیاب ہوئے کہ قیامت تک بلکہ ابدالآباد تک اپنی ہستی کو لاجواب و عدیم النظیر و عدیم المثال بنا گئے موت کا ایسا مقابلہ کیا کہ موت کے چھکے چھوٹ گئے موت کو مار گئے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ موت کو زندگی بنا گئے۔

موجودہ دور میں سوائے خوارج کے قریب قریب تمام دنیائے اسلام کو چھوڑ کر ہر اسلامی فرقے اس امر پر متفق ہیں کہ امام حسینؑ حق پر تھے یا کم از کم یزید لعین حق پر نہیں تھا اور وہ زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے کردار و عمل سے اسلام کا خون کرنے والا شعائر اللہ کی بے حرمتی سے خوش ہونے والا منہیات میں مستغرق خواہشات نفسانیہ شہوانیہ میں ماں بہن کی تمیز اڑا دینے والا اور مسلمانوں سے اس شرط پر بیعت لینے والا کہ جان و مال و اولاد بیوی بچے سب کے سب خلیفہ وقت کی ملکیت ہیں وہ جہاں چاہے اور جس وقت چاہے ان کو اپنی مرضی کے مطابق... استعمال کر سکتا ہے اور بیعت کرنے والے کو اس میں کسی وقت بھی کسی قسم کے عذر کا کوئی حق نہ ہوگا یہ یزید دین میں فتنے برپا کرنے والا ارکان اسلام کو ڈھانے والا۔ چنانچہ حجر ابن عسقلانی صواعق محرقہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

یہ شخص ماں بہنوں بیٹیوں سے نکاح جائز سمجھتا تھا شراب پیتا تھا کتوں سے کھیلتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا۔ یزید ان اوصاف کے ساتھ تخت خلافت پر ڈٹ کر بیٹھتا ہے اور من مانی کارروائیاں کرتا ہے اور اسی وقت ماشاء اللہ صحابہ بھی موجود اور تابعین و تبع تابعین بھی۔ علاوہ ازیں خلفائے راشدین کے فرزندان بلند اقبال بھی تشریف فرما ہیں۔ اور یزید سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تیرے منہ میں کے دانت ہیں۔ تمام دم بخود، سر بجیب۔ ابتدا از چار نفر منکرین بیعت یزید نظر آتے ہیں جن میں سے ایک عبد اللہ ابن عمر بھی ہیں جو کچھ دنوں کے بعد خلیفہ وقت (یزید) کی بیعت سے مشرف ہو کر بحیثیت مفتی کے جلوہ گر ہوتے ہیں اور مخالفین یزید کے خلاف انحراف امیر کا فتویٰ دے کر ان کو اسلام سے خارج کرنے کا ثواب کماتے ہیں الا ماشاء اللہ یہ چوٹ گویا امام حسین علیہ السلام پر کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ لطیفہ بھی سنتے چلئے کہ امام مظلوم کی شہادت کے بعد کسی عراقی نے جب مکھی کو مارنے کے متعلق فتویٰ پوچھا تو فرمانے لگے "حسین فرزند رسول کو قتل کرتے ہو اور مکھی کے مارنے کے متعلق فتویٰ پوچھتے ہو۔ خود ہی ملاحظہ فرمالیجئے کہ ان دونوں فتووں میں کوئی قدر مشترک بھی ہے یا نہیں۔

دوسرے صاحب بھی ان کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔

تیسرے عبد اللہ ابن زبیر اپنی خلافت کی تاک لگائے بیٹھے ہیں لیکن حسین کی موجودگی کو اپنی راہ کا روڑا تصور کرتے ہیں امام حسین کے تشریف لے جانے کے بعد دنیاوی سیاست کے بل بوتے پر فضا کی سازگاری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن نتیجہ ان کے خلاف نکلتا ہے اور "توہین حرم" کا بدنما دھبہ بھی اپنے دامن پر لے جاتے ہیں۔ بہرحال افسوس تو یہ ہے کہ اسلام کے نام پر کوئی نہیں اٹھتا اور کوئی میدان میں نہیں آتا اسلام کی توہین و تذلیل اور بے حرمتی کا تماشہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور لب تک نہیں ہلاتے یہ اساطین اسلام کے سپوت اور خلفائے راشدین کے فرزندان بلند اقبال اور رسول اکرم کا فیض صحبت اٹھانے والے اصحاب اور اصحاب کے تربیت یافتہ و تبع تابعین سب ہی تو چپ سادھ لیتے ہیں اور اسلام کی غریب الدیاری سے متاثر ہو کر ایک بھی حمایت

حق کو نہیں اٹھتا۔ ان حضرات کی رگوں میں کیا خلفا و صحابہ کا خون نہ تھا کیا ان کی تربیت ان کے والدین نے اسلامی اصولوں پر نہ کی تھی آج اسلام مجبور مقہور اور مظلوم بے بیکس ہے۔ ہل من ناصر کی آواز زبان حال سے بلند کر رہا ہے اور کوئی سنتا نہیں کوئی لبیک نہیں کہتا حالانکہ یہ سب اسلام کے پروردہ اور اسلام کے خانہ زاد تھے اسلام نے ان کو ظاہری وجاہت و ثروت سے نوازا دنیا میں سرفراز کیا ان کے فقر و فاقے کو توڑا لیکن یہ تمام آزادیٔ خیال و افکار کے حامی اور دعویدار تلوار لے کر میدان میں تو کیا آتے زبان سے بھی دو لفظ حمایت کے نہ کہہ سکے اور کہتے کس منہ سے اس کو منتخب کرنے والے اور مسند خلافت دینے والے خود یہی حضرات تو تھے۔

ہاں ایک حسینؑ کی ذات ہے جو سب سے پہلے اس آواز کو سنتی ہے اور تڑپ اٹھتی ہے اور سب سے پہلے اسلام کی امداد کے لئے گھر بار چھوڑ کر میدان میں کود پڑتی ہے اور ڈٹ کر ایسا مقابلہ کرتی ہے کہ مخالفین حق کے چھکے چھڑا دیتی ہے اسلام کو موت کے منہ سے بچا لیتی ہے اسلام کی کھیتی کو اپنے خون سے ایسا سیر و سیراب کرتی ہے کہ وہ لہلہا اٹھتی ہے۔

کیوں؟

اس لئے کہ حسینؑ کی تربیت خدا نے کی تھی اور دوسروں کی تربیت ان کے والدین نے۔ حسینؑ ایسے تھے جیسا کہ خدا چاہتا تھا اور دوسرے حضرات ایسے تھے جیسا کہ ان کے والدین چاہتے تھے یا ہم چاہتے ہیں۔

اسلام اسلام پکارنے والے اپنے آپ کو لاکھ ثقۃ الاسلام مجدد اور محی الدین کے الفاظ سے نوازیں اگر حسینؑ کی یہ قربانی نہ ہوتی تو کیا وہ آج مسلمان بھی ہوتے — برائے نام ہی سہی۔ ہرگز نہیں۔

تاریخ کربلا پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ محاربہ کربلا میں اصحاب نبیؐ کی خاصی تعداد موجود تھی اور تابعین و تبع تابعین کی تو کوئی حد و انتہا ہی نہیں تھی۔ اس لئے جب جمہور اہل اسلام کے نزدیک صحابہ کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے تو ان لاکھوں اصحاب کے بیٹوں اور پوتوں کی تعداد لاکھوں تک بھی نہیں پہونچے گی۔ ضرور پہنچے گی۔ چنانچہ حسینؑ اور اصحاب حسینؑ پر تیر و خنجر اور تیغ و تبر کی بارش کرنے والے اکثر یہی حضرات تھے۔ جیسا کہ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کی مبارز طلبی اور تلواروں کی کاٹ دیکھ کر ایک صحابی رسول کی رگ شجاعت بھڑک اٹھتی ہے اور ترنگ میں آ کر فرماتے ہیں کہ

یہ کل کا لڑکا یکہ و تنہا بھوکا پیاسا جو بھی اس کے مقابل ہوتا ہے اسی کو دور کر دیتا ہے میں بھی دیکھوں یہ کیسا سورما ہے۔

اسی جوش و خروش میں امام مظلوم کے مقابلے میں آ ڈٹے۔ کچھ انعام و اکرام کی خواہش کچھ عرب کے خون کی گرمی و تیزی اور حمیت اور کچھ نسلی و بے تکی غیرت کا ابھار آنے کو تو آ گئے لیکن مقابلہ ہوا تو معاملہ ہی کچھ اور نظر آیا موت کا سامنا جان کا خطرہ اور یقینی وحتمی خطرہ تمام نشہ ہرن ہو گیا تمام جذبات جھاگ کی طرح بیٹھ گئے عقل نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ جس طرح ہو جان کو بچایا جائے جواز فرار کے لئے احادیث کی تلاش ہوئی لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

یہ جانتے ہوئے مقابلے کو آئے تھے کہ یہ حسینؑ ہے محمدؐ کا نواسہ ہے جب تک اپنی کامیابی و فتح مندی کا یقین تھا سب کچھ جائز تھا حسینؑ کو قتل کر لینے کے بعد در توبہ کھلا ہوا تھا لیکن جب معاملہ دگرگوں نظر آیا تو از راہ تجاہل عارفانہ یا از راہ تقیہ پوچھتے ہیں۔

ہم لڑ تو رہے ہیں لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو۔ کس خاندان سے ہو تمہارا کیا نام ہے؟ افسوس صحابی رسولؐ اور حسینؑ سے اتنا ناواقف

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

امام حسینؑ بتلاتے ہیں صحابی رسولؐ اپنی لاعلمی پر بظاہر افسوس فرماتے ہیں کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوئی کہ تمہارے مقابلے کو تحقیق کئے بغیر آ گیا

امام حسینؑ فرماتے ہیں اگر یہ بات ہے تو واپس چلے جاؤ۔

صحابی: واس طرح واپس بھی نہیں جانا چاہتے اور مقابلہ بھی نہیں کر سکتے ذاتی وجاہت اس پر رسوائی کا خیال دامن پکڑتا ہے کہ دنیا طعنے دے گی میدان سے بھاگ نکلے اور ادھر رکنے اور لڑنے میں جان کا خطرہ ہے۔

"اس طرح واپس بھی نہیں جا سکتا"

امام حسینؑ پھر کیا چاہتے ہو۔

صحابی: آپ ذرا خیمہ گاہ کی طرف چلے جایئے میں ادھر لشکر کی طرف چلا جاؤں گا میری عزت بھی رہ جائے گی اور کام بھی

بن جائے گا۔

آہ حسین غیرت دار تھے اور غیرت دار کے فرزند بلکہ خود غیرت حق تھے وہ عوام کی کمزوریوں سے واقف تھے وہ کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا اپنی غیرت کے خلاف اور شان کے منافی سمجھتے تھے وہ دوسروں کی عزت و حرمت کا پاس و لحاظ بھی رکھتے تھے اگرچہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو نیز جو جنگ سے بچنا چاہتا ہو اس کا پیچھا کرنا ہاشمی شجاعت و حیدری غیرت اور دینی حمیت کے خلاف جانتے تھے۔ چنانچہ آپ خیمہ گاہ کی طرف تشریف لے گئے اور صحابی اپنے لشکر کی طرف۔ اس کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ ایسے بلند اخلاق کا نمونہ تو ہم جیسے انسانوں کی پرواز تخیل سے بھی پرے ہے۔ چہ جائیکہ ہم عملی نمونہ پیش کریں ہم تو کبھی بھی اور کسی صورت میں بھی ان حضرت کو نہ چھوڑتے خواہ وہ کتنی ہی صحابیت کی دلیلیں کیوں نہ پیش کرتے اس لئے کہ ہم ایسے نہ تھے جیسے حسین۔

امام حسین کا سفر عراق جاری ہے اور حکومت وقت کی طرف سے برابر انتظامات مکمل کئے جا رہے ہیں۔ ناکہ بندیاں ہو رہی ہیں چوکیاں اور پہرے بٹھائے جا رہے ہیں۔ راستے روکے جا رہے ہیں کوفے میں کرفیو آرڈر نافذ ہے تاکہ کوئی کوفے کا باشندہ حسین کے لشکر میں جانا تو بڑی بات کوئی خبر بھی نہ پہنچا سکے حکومت کا کوئی راز باہر نہ نکل سکے۔ حر کو ایک ہزار جرار سپاہیوں کا دستہ دے کر اس مہم پر روانہ کیا جاتا ہے کہ حسینؑ کو کسی اور طرف نہ جانے دیا جائے بلکہ اسی مقام پر لایا جائے جو فوجی نقطہ نظر سے حکومت کے لئے مفید ہے۔ حر کا دستہ چلتا ہے اور تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے ساتھی ایک مقام پر ٹھٹھک جاتے ہیں اور کہتے ہیں مبارک ہو سفر ختم ہوا سامنے نخلستان نظر آ رہا ہے ایک صاحب فرماتے ہیں میں نے یہاں کبھی نخلستان نہیں دیکھا یہ نخلستان کہاں سے آ گیا ایک تیسرے شخص نے جو تیز نظر تھے غور سے دیکھ کر کہا یہ تو ایک لشکر ہے جس کو نخلستان کہا جا رہا ہے وہ اس لشکر کے سپاہیوں کے جھنڈے ہیں جو ہماری طرف کو آ رہے ہیں چنانچہ انتظار کیا جاتا ہے اور وہ لشکر قریب پہونچ جاتا ہے۔

دھوپ کی حدت لو کی شدت ہے آفتاب کی تیز شعاعیں آگ برسا رہی ہیں دور دور تک نہ آدم نہ آدم زاد نہ سایہ نہ سایہ دار درخت فضا اور افق کی آخری حد تک کوئی پرندہ بھی نظر نہیں آتا۔ چرندوں کا پتہ نہیں گرمی کا شباب ہے لو کے تھپیڑے ہر چیز کو جھلس رہے ہیں حر کے لشکر کی یہ حالت کہ تمام گھوڑوں کی زبانیں لگ پڑی ہیں بری طرح سے ہانپ رہے ہیں سپاہیوں کے چہرے گرد سے اٹے پڑے ہیں ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں زبانیں خشک چہرے سنولائے ہوئے اور اترے ہوئے۔ پیاس کے مارے بوکھلائے ہوئے ہیں ان کی زبانوں پر العطش العطش کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں پیاس نے ایسی جان پر بنا دی ہے کہ وہ اپنے فرائض کو بھی بھول چکے ہیں اور جس کی نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے تھے اس کی نگرانی کے بجائے اس سے گڑگڑا کر پانی طلب کرتے ہیں۔ فضا پانی پانی کے شور سے گونج رہی ہے اور ایک غل مچا ہوا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی بدحواسی انتہا کو پہنچ چکی ہے مخالف و موافق کی تمیز تک جاتی رہی۔ حسین ان کے مہمان ہیں اور یہ میزبان۔ مگر مہمان میزبان کا میزبان بنتا ہے اور میزبان مہمان اور اسی طرح میزبانی کے فرائض انجام دیئے جاتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا حسین ان کے جانی دشمن ہیں اور یہ اپنے دشمن سے پانی کی بھیک مانگتے ہیں مگر واہ رے حسین۔ حکم ہوتا ہے۔ کہ ان سب کو پانی پلایا جائے۔ کیا مجال کوئی اختلاف کر سکے فوراً مشکوں کے منہ اور پکھالوں کے دہانے کھل جاتے ہیں اور دم کے دم میں سب کو سیراب کر دیا جاتا ہے۔ ابن ساقی کوثر کا دریائے فیض اور جوش میں آتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جانوروں نے کیا خطا کی ہے یہ تو بے زبان جانور ہیں ان کو بھی پانی پلایا جائے

عباس (ہاتھ باندھ کر)

"مولا گرمی کا شباب ہے لو کے جھکڑ چلتے ہیں کچھ ساتھ ہے چھوٹے چھوٹے بچے ہمراہ ہیں اور سفر دور دراز درپیش ہے کوسوں تک پانی نظر نہیں آتا اگر پانی کم رہ گیا تو قیامت ہو جائے گی۔

امام حسین۔ "عباس تم تو ساقی کوثر کے فرزند ہو تمہیں بھی احتیاط کی ضرورت نہیں اللہ مالک ہے۔"

پکھالوں کے دہانے کھل جاتے ہیں اور گھوڑوں کو بھی پانی پلا دیا جاتا ہے اس کے بعد جو مذاکرات ہوتے ہیں وہ کتب سیر و تواریخ

میں مفصل مندرج ہیں۔ دشمن کیل کانٹے سے تیار ہے کہ حسین کو کسی صورت سے بھی بچ نکلنے کا موقع نہ دیا جائے۔ لشکر امام میں بزم مشاورت منعقد ہوتی ہے آپ کے ساتھی اس رائے پر متفق ہو جاتے ہیں کہ پہلے لشکر حر سے دو دو ہاتھ کر لئے جائیں۔ ہم اس لشکر کو بڑی آسانی سے شکست ہی نہیں دے سکتے بلکہ تباہ کر سکتے ہیں اور حر کے لشکر کی شکست اور تباہی کا اثر جو فوج یزید پر پڑے گا وہ ظاہر ہے۔ دشمن کی ہمت پست ہو جائے گی اور ہمارے لشکر اور ہی خواہوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔

امام حسینؑ نے حر کے لشکر کو پانی پہلے ہی پلا دیا تھا نیز اس رائے کو بھی نہیں مانا حسینؑ کے ساتھیوں کا دشمن کے لشکر کو مندرجہ بالا حالات میں پانی دینے سے انکار کرنا ہر قانون اور ضابطہ حیات و اخلاق و مذہب کے مطابق تھا بچوں کا ساتھ پانی کا نایاب ہونا۔ اول خویش بعدہ درویش کے معاملہ کو دیکھا جائے تب بھی درست اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ پانی کے پیاسے خون کے بھی پیاسے ہیں اور پانی پی کر اور زیادہ خونخوار ہو جائیں گے تو ایسی صورت میں انھیں پانی پلانا سانپوں کو دودھ پلانا تھا اور اس کے بعد انھیں تازہ دم کر کے بھی ان کی کمزوری سے فائدہ نہ اٹھانا اور جنگ سے گریز کرنا دشمن کو من مانی کارروائی کرنے کی کھلی چھٹی دینا ہی نہیں بلکہ اپنے ہاتھ سے خود اپنے گلے کو کاٹنا تھا۔

یقیناً اپنے آپ کو ہر مصیبت سے محفوظ کرنا نیکی ہے دشمن کے شر کو توڑنا بھی نیکی ہے۔ حالات اور وقت کی مناسبت کے لحاظ سے اپنا بچاؤ اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنا نیکی دشمن کی قوت کو ہر جائز طریقے سے کمزور کرنا جائز بلکہ بعض اوقات وجوب کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ مگر ہر شخص کے فرائض اور ذمہ داریاں الگ الگ ہیں۔ حسینؑ مظلوم کی نگاہیں ان دوررس نتائج پر جمی ہوئی تھیں جو ہمارے ادراک کی حدود سے بھی پرے تھے مخالفین کو سیر چشمی، وسیع المشربی اور رواداری کا سبق دیا جا رہا تھا ان کے دل میں اسلام کے ان اصولوں کو بٹھانے کی کوشش کی جا رہی تھی جو یزیدی مذہب کی اشاعت کے باعث مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے نیز چند سعید روحوں کو آتش دوزخ کا ایندھن بننے سے بچایا جا رہا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ حر مع اپنے بھائی بھتیجے اور غلام نیز کئی فوجی سپاہیوں سمیت امام حسین سے آ ملا اور اتنے اختلاف کے باوجود آپ کی حمایت میں جان دیدی نیز ہمارے واسطے یہ مثال قائم کر دی کہ امر حق کی اشاعت میں انتہائی نازک حالات میں بھی کوتاہی نہ کرنی چاہئے۔ اور حق کی تاثیر کے معاملے میں کسی وقت بھی مایوس نہ ہونا چاہئے جس کا نتیجہ اوپر نکل چکا ہے۔

یہ وہی منزل ہے جس مقام پر فرمایا گیا ہے۔

حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ

بعض اوقات وہ باتیں جو عام نیکو کاروں کے لئے نیکیاں ہوتی ہیں وہی بارگاہ ایزدی کے لئے کسر شان اور ان کے علو مرتبت کے مقابلے میں بری گنہگاری معلوم ہوتی ہے۔

حر کے لشکر کو پانی نہ دینا اس کے لشکر کو تباہ کر دینا ہمارے لئے یقیناً حسنات میں داخل تھا اور ہے لیکن یہی کام حسینؑ جیسی ہستی کے لئے سیئات و گنہگاری اور کسر شان امامت تھا جس کو ہماری نظریں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس لئے کہ ایسے تھے حسینؑ جیسا کہ خدا چاہتا تھا ایسے نہیں تھے جیسا ہم چاہتے تھے یا چاہتے ہیں قدرت برابر اپنی مخلوق کو ڈھیل دیتی ہے وہ دیر گیر ہے جلد انتقام نہیں لیتی وہ انتہائی سرکشی اور ظلم و عدوان پر بھی کبھی ہوا بند نہیں کرتی کہ عوام تڑپ کر مر جائیں کبھی غلے میں کمی نہیں کرتی وہ پانی کو خشک نہیں کر دیتی اور سورج کی روشنی کو تاریکی میں تبدیل نہیں کرتی وہ برابر ڈھیل دیئے جاتی ہے "حسینؑ خدا کے نائب اور مظہر صفات الٰہی تھے وہ کیسے" ان اوصاف کو نہ ظاہر کرتے اور زود گیری پر اتر آتے۔

"دنیا کو چیلنج"

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حسینؑ تو ایسے تھے جیسا خدا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ افراد جو ایسے ہوتے ہیں جیسا کہ خود خدا چاہتا ہے تو ان کا کام بھی ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ خود خدا کا کام اور خدا کے کام میں کوئی نقص یا غلطی و کوتاہی نہیں ہوتی یہ دوسری بات ہے کہ ہم اس میں اپنی کم فہمی سے کمی یا غلطی نکالے جائیں لیکن حقیقت میں وہ مسئلہ عن الخطا ہوتا ہے اب ہم اس ثبوت میں

کہ حسین کا کام تھا ان کا ایک انتخاب پیش کرتے ہیں۔

دنیا میں آج کل جمہوریت کا بہت زیادہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے دنیا اس کی تعریفیں کرتی نہیں تھکتی۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جمہوریت آج تک بذریعہ انتخاب حق تک نہیں پہنچ سکی اور دنیا کا کوئی بھی انتخاب ایسا نہیں جس میں عوام و خواص نے صحیح نمائندہ من حیث الاجماع منتخب کیا ہو۔

مذہبی تاریخ ہمارے سامنے ایک انتخاب پیش کرتی ہے اور وہ حضرت موسیٰؑ کا اپنی امت سے ستر آدمیوں کا انتخاب ہے جو خدا کا دیدار کرنے کے لئے طور پر پہنچے تھے یہ ستر آدمی ستر لاکھ میں سے منتخب ہوئے تھے یہ تمام منتخب آدمی قوم یہود کا مرکز اعتماد تھے اور اس کے نزدیک روحانیت و حقانیت کا محور بلکہ ایک لحاظ سے اس قوم کے نزدیک حضرت موسیٰؑ سے بھی اہم تھے اور وہ اس طرح کہ موسیٰ کی صداقت اور خدائے موسیٰ کے وجود کی اگر یہ گواہی دیدیں گے تو قوم کے نزدیک قابل قبول ہوگی ورنہ موسیٰؑ و خدائے موسیٰ ناقابل قبول ہوں گے اس انتخاب کا نتیجہ جو نکلا وہ یہ تھا کہ تجلی طور کے ساتھ موسیٰ تو بیہوش ہوگئے تھے اور یہ قوم کے نمائندہ قفس عنصری خالی کرکے رہگرائے منزل عدم ہوگئے تھے۔

مذہبی تاریخ میں دوسرا انتخاب سیاسی ہے جس کو بعد میں لوگوں نے زبردستی مذہبی بنا لیا ہے اور وہ حضور ختمی مرتبت کی وفات کے بعد دنیا نے بڑی حیرت اور استعجاب سے دیکھا وہ اس لئے کہ صحابہؓ و تابعین کی اتنی اکثریت نے یعنی پانچ چھ کم باقی تمام اہل مدینہ نے اس میں اتنی دلچسپی لی کہ رسولؐ کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ میں بھی شرکت نہیں کی اور اس سیاسی انتخاب کا وہ خطرناک نتیجہ نکلا جس کو دیکھ کر اور سن کر آج تک انسانیت لرزہ بر اندام ہے اور اسلام نا جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ پوری چھ صدیوں تک انسان خون میں نہاتی اور دیواروں میں چنی جاتی رہی۔

یہ وہی انتخاب ہے جس کی بھینٹ آل رسول چڑھ گئی اور آج تک اس کی جاں بخشی نہ ہوئی۔ یہ وہی انتخاب تھا جس کا منتخب شدہ امیر "یزید" شیطان کا نمائندہ بن کر خدائی نمائندہ "حسینؑ" سے اپنی من مانی منوانا چاہتا تھا۔

لیکن حسینؑ نے جو انتخاب کیا ہے وہ ایسا مکمل انتخاب اور ایسی سعید روحوں کا چناؤ ہے جو حق کی چٹان، عزم و ارادے کا طوفان آدمیت و انسانیت کی جان ہے اس میں وہ کوہ عزم انسان چنے گئے جن کے پائے ثبات کو دنیا کی تمام طاغوتی طاقتیں مل کر بھی نہ ڈگمگا سکیں اور جو غیر معصوم ہو کر اپنے عرفان و عزم میں بہت سے انبیا سے اونچے نظر آتے ہیں۔ ان کا انتخاب حسینؑ کی نظر اور شان کو اور اونچا کر دیتا ہے۔

حسینؑ کا انتخاب حقیقت میں خدا کا انتخاب تھا اور ایک دو کا نہیں پورے بہتّر کا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا۔ کل مورخ ساری تاریخیں تمام دیدہ و حیران ہیں کہ نظم و ضبط، عزم و اطاعت امیر کا جو نمونہ کربلا کے مجاہدین نے پیش کیا وہ انبیا و مرسلین کی صفوں میں بھی نظر نہیں آتا کیا مجال جو کسی مقام پر اختلاف یا حکم امام سے سرتابی نظر آئے۔ یا دشمن کے ٹڈی دل لشکر کا دل میں ہراس پیدا ہو۔ جوں جوں مشکلات و مصائب کا اضافہ ہوتا تھا ان کے عزم، غیرت اور خلوص میں اسی مناسبت سے جوش پختگی اور صلابت بڑھتے جاتے تھے بھائی بھائی کو بہنیں بھائیوں کو۔ بیویاں شوہروں کو اور مائیں بیٹوں کو سجا سجا کر حسینؑ پر قربان کرنے کے لئے پیش کر رہی تھیں۔ اور ہر ایک کی کوشش یہی تھی کہ پہلے میں ہی اپنے آپ کو قربان کردوں جن بچوں کو اجازت نہیں ملتی تھی وہ انتہائی جوش میں امام کے ہاتھوں کو متواتر چومے جا رہے تھے اس خوشامد میں کہ شاید امام اجازت دیدیں اور اگر امام حسین پوچھتے ہیں کہ بیٹا قاسم تم موت کو کیا سمجھتے ہو تو یہ حسن کا تیرہ سال کا چاند جوش میں جواب دیتا ہے "احلیٰ من العسل" چچا جان شہد سے بھی زیادہ میٹھا۔

تازہ دم ہونے اور سیرابی کی حالت میں مانتا ہوں کہ انسان انجام سے بے نیاز ہو کر آگ میں بھی گر جاتا ہے یا گر سکتا ہے یہ بھی بڑی ہمت ہے لیکن بار بار آگ میں جھلسنا بھوک پیاس میں جسمانی طراوت کے خشک ہو جانے اور موت کے یقینی خطرے اور قوائے جسمانیہ کے اضمحلال کی صورت میں اگر پیمبرانہ عزم اور شیرانہ حوصلہ ہو تو ہم بتا جانیں اور مانیں۔ یہ اوصاف سوائے جانثاران حسینؑ کے آپ کو کہیں نہ ملیں گے۔

امام حسینؑ کا منشا یہ تھا کہ میری قربانی میں کسی قسم کے بیرونی اثر اور معمولی سے معمولی کمزوری کا بھی شائبہ نہ آنے پائے۔ چنانچہ آپ نے شب عاشور اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے فرمایا۔

"ایہا الناس یہ گروہ محض میرے خون کا پیاسا ہے اور فقط میری جان" "کا خواہاں ہے اگر میں کسی سوراخ میں بھی گھس جاؤں تو یہ" "وہاں بھی مجھ کو نہ چھوڑیں گے۔ لہٰذا میں یہ نہیں چاہتا کہ تم" خواہ مخواہ میرے ساتھ اپنے آپ کو مصیبت میں پھنساؤ میں نے اپنی بیعت کا حلقہ تمہاری گردن سے نکال لیا۔ یہ رات کا اندھیرا تمہارا بہترین معاون ہے اور اگر میرے سامنے جاتے شرماتے ہو تو لو میں یہ شمع گل کئے دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر آپ نے شمع گل کردی اور فرمایا

"جاتے ہوئے میرے اہلبیت میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ لو اور" "اپنے ساتھ لے جاؤ تاکہ تمہارے سبب سے یہ بھی مصائب و آلام" "سے محفوظ ہو جائیں"

خطبہ ختم ہوا۔ بعض روایات میں ہے کہ جانے والے جا چکے رکنے والے رک گئے اور حالات و واقعات بتلاتے ہیں اگر آپ یہ خطبہ ارشاد نہ فرماتے تو جانے والے بھی رکے رہتے اور آپ کی حمایت میں لڑتے مرتے۔ لیکن آپ کو تو ایسا انتخاب کرنا تھا جس میں منتخب شدہ افراد کے عزم و یقین جانبازی و سرفروشی پر کسی قسم کا شبہ بھی پیدا نہ ہو سکے۔ چنانچہ آپ کے انصار کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک شخص نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ امام کی نصرت میں کہیں "عباسؑ ابن علیؑ" سستی نہ برت جائیں ان کا فرض یہ کہہ کر یاد دلایا۔

"عباسؑ آپ کو معلوم ہے کہ امیر المومنین نے آپ کی والدہ سے کیوں عقد" "کیا تھا" العظمتہ للّٰہ

عباسؑ جواب میں فرماتے ہیں

"تم مجھے غیرت دلاتے ہو انشاء اللہ آج وہ جنگ ہوگی جو زمانے" "میں یادگار رہے گی"

یا بعض انصار کا نزع کے وقت میں امام حسین علیہ السلام کے متعلق ایک دوسرے کو وصیت کرنا وصیکم بہذا الغریب یعنی اس مسافر کے متعلق تمہیں وصیت کرتا ہوں اس کی نصرت سے تا دم آخر غافل نہ رہنا۔

یا آپ کے ایک صحابی کا آپ کے سامنے آکر آٹھ آٹھ آنسو رونا اور اضطراب کا اظہار کرنا اور پوچھنے پر جواب دینا

"کہ ہم جان کے خوف سے نہیں رو رہے بلکہ اس لئے رو رہے ہیں" "کہ ہم اپنی جانیں دے کر بھی آپ کو نہ بچا سکے"

دنیا کی تاریخ اس مثال سے قاصر ہے۔ جوش نصرت اور جذبہ فداکاری کے یہ نمونے آج تک نادر ہی رہے یہ حسینؑ اور حسینؑ کے ساتھیوں ہی کا حق تھا نہ اب تک کوئی حسینؑ ہوا اور نہ ایسے انصار و فداکار اور نہ قیامت تک یہ صورت ممکن ہے۔ اسلام کو محیر العقول اور بے پناہ خطرہ حسینؑ ہی کے زمانہ میں تھا اور اس کو ٹالنے والی بھی ایسی ہی محیر العقول ہستی اور ایسے ہی محیر العقول انصار کی ضرورت تھی جیسے کہ امام حسینؑ کے فدائی۔ اب قیامت تک اسلام کو کوئی خطرہ نہیں اور نہ ایسی قربانی کا امکان۔

انصار حسینی کے کارنامے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں یہ تاریخ کا کتنا عظیم الشان واقعہ ہے کہ انصار حسینی نے اپنی زندگی تک حسینؑ کے جسم اقدس پر زخم تو زخم معمولی خراش تک بھی نہ آنے دی۔

کربلا میں حسینؑ و یزید کا مقابلہ تھا۔ بلکہ خدائے مہیمن و جبار کی قدرت و جبروت و قدوسیت اور صمدیت و قہاریت کا مقابلہ شیطان کی شیطنت و ابلیسیت و خباثت، خود غرضی ہٹ دھرمی اور یزیدیت سے تھا۔ حسینؑ خدا کے نمائندے تھے اور یزید شیطان کا نمائندہ تھا۔ اس مقام پر حسینؑ کی شکست حقیقت میں خود خدائے قدوس کے اصولوں کی شکست اور خدا کی شکست تھی اور شیطان کی ایک دائمی فتح۔ حسینؑ مظہر صفات خداوندی و حقانیت تھے ذات احدیت کی صفات کاملہ حسینؑ کی ذات میں کارفرما تھیں ایسے ہزارہا مقامات آتے جہاں ایک انسان کے قدموں کا ڈگمگا جانا یقینی امر تھا لیکن حسینؑ ثابت قدم رہے۔

میرے نزدیک حسینؑ کا ثابت قدم رہنا کوئی اتنا تعجب خیز امر نہیں جتنا حسینؑ کا یزید کی بات کو مان لینا اور اس کی ہاں میں ہاں ملا دینا تعجب خیز اور حیرت انگیز ہوتا پھر حق کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی انسان کی آنے والی نسلوں کے لئے ایسے ہجوم آفات و بلیات

میں کوئی مثال یا نمونہ نہ رہتا۔ انسانیت کا مستقبل انتہائی تاریک ہو جاتا اور دنیا ضلالت و تباہی کے گڑھے میں ابد الآباد تک کے لئے گر جاتی۔ لیکن حسینؑ نے اپنے فرائض کو پہچانا اپنی ذمہ داری اور منصب کا پاس اور احساس کیا اور انسانیت کو تباہی سے بچا لیا بلکہ انسانیت کا سر افتخار ہمیشہ کے لئے بلند کر دیا۔ دنیا سب کچھ مٹا دیا لیکن حق کی بگڑی بنا دی۔ حسینؑ کے خون کی ایک ایک بوند شمع ہدایت چشمۂ عرفان اور طوفان زندگی بن کر اسلام کی رگوں میں دوڑی جو یزیدیت کو ہمیشہ کے لئے مٹا کر رکھ گئی۔

حسین حقانیت کا ایک روشن منارہ تھے اور ہیں جو اب تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور دنیا کو حق کی روشنی سے منور کر رہا ہے ان کا دل زبان اور عمل ایک تھے وہ یک رنگ تھے اور انھوں نے اس قربانی سے اپنے آپ کو اتنا نمایاں کیا کہ دین اسلام ہی نہیں بلکہ ہر مذہب و ملت کے مظلوموں اور حق پسندوں کے رہنما بن گئے اور ہر قوم چاہتی ہے کہ کاش حسین ہم میں سے ہوتے۔

ہر قوم دیکھتی ہے تجھے حسرتوں سے آج
تو ہے جہاں میں یوسفِ کنعانِ زندگی

یہ چند الوہی رموز اور حسینؑ کی جلالت قدر کے معمولی نمونے ہیں جو ہم سمجھ سکے ہیں ورنہ حسین کی ذات میں ایسے لاکھوں معارف اور کروڑوں نکات اور لاتعداد عظمتیں نہاں ہیں جن تک تا حال ہماری کوہ نظریں پہنچتی ہی نہیں دور ایام کے ساتھ ساتھ جوں جوں عقل کو صیقل اور انسانیت میں جلا اور چمک پیدا ہوتی جائے گی ویسے ہی ویسے حسینؑ کے مقام و درجے روشن اور واضح ہوتے جائیں گے یہ کیوں اسلئے کہ "حسین ایسے تھے جیسا خدا چاہتا تھا ایسے نہیں تھے جیسا ہم... چاہتے ہیں"

اسی لئے ہم حسینؑ کو کما حقہ پہچان بھی نہیں سکے اور اس کی ذات کی حقیقی معرفت سے ہنوز قاصر ہیں۔ بقول اقبال

بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی
حقیقت ابدی ہے مقام شبیری

اُٹھانے جا رہے ہیں رن سے حضرت لاش اکبرؑ کی

عمدۃ الحکما حکیم سید عزیز احمد صاحب عزیز کنتوری ضلع مرادآباد

صلہ میں مدح حیدرؑ کے ملی جاگیر منبر کی
کسی کا اس میں کیا دعویٰ رسائی ہے مقدر کی

غرض مولودِ کعبہ سے جو کچھ ہو اس کو کیا کہیے
یہ کیا کم ہے کہ آبادی ہوئی اللہ کے گھر کی

نصیری کیا غلط سمجھا ہمیں اب کوئی سمجھا دے
سمجھ میں آنے والی بات بھی تھی کوئی حیدرؑ کی

کئے پر اپنے گہ نادم کبھی خوش عزم پر اپنے
عجب حالت شب عاشور تھی حرؑ دلاور کی

کہاں ہو اے حبیب ذوعشیرہ امداد کو پہونچو
اُٹھانے جا رہے ہیں رن سے حضرت لاش اکبرؑ کی

نہ سر کرنا تھا یوں تیر سہ شعبہ حرملہ تجھ کو
خطا بھی دیکھ لینا تھی کوئی معصوم اصغرؑ کی

وفا کا لفظ بالکل تشنۂ معنی ہی رہ جاتا
نہ آتی کام سقائی جو عباسؑ دلاور کی

عزیز مدح گستر کو یہ دنیا کیا سمجھتی ہے
بگڑ بیٹھا تو قیمت بھی نہیں ہے ایک ٹھوکر کی

شاہِ شہیداں سے فریاد

(جناب مضطرب سلطان نظامی حنفی لکھنوی)

یا حسینؑ آئینہ زیست بھی اب خواب ہے آج　　سخت کوشی ہیں یہاں کر چکی نظریں تاراج
گر چکا ہے سرِ ہستی سے تمناؤں کا تاج　　اب ہر اک سانس میں ہے کشمکشِ زیست کا راج

ہر طرف چھائی ہے سنجیدگی لایعنی!
آج ثابت ہوا ہے لفظ خوشی بے معنی!

چھا رہا ہے افق دل پہ "تفکر" کا خروش　　سجتی جاتی ہے خیالات کی اک بزم خموش
رہزنِ عقل ہیں جذبات تو غم دشمن ہوش　　ذہن ہے گوش بر آوازِ نواہائے سروش

ہر نفس عرصۂ بے نور کی جھنکار ہے اب
زندگی شدّتِ احساس سے بیزار ہے اب

ہے یونہی رقص مسرّت بھی بہ گردابِ الم　　جیسے گل برگ کی لرزش میں وقارِ شبنم
بسکہ ہر لمحۂ نو نغمۂ اشک پیہم　　قلب فطرت کی قسم صبح کے تارے کی قسم

افقِ زیست اگر محوِ سحر کوشی ہے
دائم البسط دھڑکتی ہوئی خاموشی ہے

ہے یوں افسردہ، ذرا فسردہ، ستاروں کی جبیں　　صبح رنگیں بھی بنی جاتی ہے اک شامِ حزیں
اب وہ ذرّوں کے دھڑکنے کی صدائیں بھی نہیں　　نکہت غم سے ہے مدہوش یہ دنیائے حسیں

ہر نفس عشرتِ بے کیف ہوا جاتا ہے
پھول ہنستے ہیں مگر رنگ اُڑا جاتا ہے

عہد حاضر نے تراشی ہے وہ تصویرِ جنوں　　رازِ ہستی ہیں نہاں ہو گیا اک رنگِ فنوں
ہر نفس زہر میں ڈوبا ہے مگر کس سے کہوں　　ہے یہی فکر کہ یہ جام پیوں یا نہ پیوں

آج مسلم کا سفینہ ہے تلاطم میں رواں
موج غم ہر لبِ ہستی کے تبسم میں دواں

بزمِ پر شوق میں نغمات طربناک نہیں!
سازِ ہستی کی بھی جھنکار تو بےباک نہیں
ہیں ستارے مگر آرائشِ افلاک نہیں
منزلِ زیست میں اب جلوۂ ادراک نہیں
ہر مسرّت کی کرن وجہ الم کوش ہوئی
عقل حیرت کدۂ غم میں فراموش ہوئی

چاندنی بھی ہے مگر پرتوِ شاداب نہیں
نگہ شوق میں کیفِ خلشِ خواب نہیں
اشکِ پیہم ہے مگر گوہرِ نایاب نہیں
منظرِ صبح تو ہے، حسن جہاں تاب نہیں
نقرئی جھیل میں تاروں کا سفینہ ڈوبا
شبنمستاں میں بہاروں کا سفینہ ڈوبا

دل شگفتہ ہو تو انداز تبسّم سیکھیں
مہر بر لب ہو تو کیا طرز تکلّم سیکھیں
ساز بجتا ہو تو نغمات و ترنّم سیکھیں
وقت کہتا ہے ابھی گردشِ انجم سیکھیں
شوخیٔ غم ہی نہیں فطرتِ غم باقی ہے
دامنِ صبح میں کیفیتِ نم باقی ہے

دل کو اک فخر ہے اس پر کہ گنہگار ہیں ہم
سازِ دلکش کا تو ٹوٹا ہوا اک تار ہیں ہم
لفظِ انکار میں بھی معنیٔ اقرار ہیں ہم
کیوں کہ الفت کے تری دل سے طلبگار ہیں ہم
کہ دریں قطرۂ سائل نم لاتنہر نیست
دُرِ یکے دریتیم آیۂ لاتقہر نیست

کرم خاص بصد رنگ گل افشاں ہو جائے
یعنی آئینۂ کونین بھی حیراں ہو جائے
شمعِ عرفاں دلِ مسلم میں فروزاں ہو جائے
اک نظر اِدھر تو ادھر شاہ شہیداں ہو جائے
گو کہ ہر حال میں الطاف و کرم تیرے ہیں
اب بھی یہ فخر مکمّل ہے کہ ہم تیرے ہیں

افقِ دین پہ اک مہرِ امامت تو ہے
پرتوِ نور ہے تو رازِ رسالت تو ہے
کعبۂ دین ہے تو نازِ عبادت تو ہے
عزمِ راسخ کی قسم فخرِ شہادت تو ہے
تجھ سے فریاد ہے اے شاہِ شہیداں سن لے
مددِ خاص کے طالب ہیں مسلماں سن لے

کربلا کے واقعات میں دُعا کے اثرات

سرکار سلطان العلماء مولانا سید قائم مہدی صاحب قبلہ مجتہد لکھنؤ

اس مختصر مضمون میں نہ فلسفۂ دعا پر مبسوط بحث کرنا ہے اور نہ شرائط و آداب دعا کو لکھنا ہے نہ قرآن مجید و احادیث کی روشنی میں دعا کرنے کی اہمیت دکھانا ہے اور نہ اُن افراد کی دعاؤں کے تذکرے میں کہ جن کی منزل تقرب انبیاء و مرسلین بنی اسرائیل سے فزوں تر ہو، اس بحث کا چھیڑنا بزم اہل معرفت میں اپنی ہی قلت معرفت کی دلیل واضح ہے۔

اگرچہ مذہب اہل حق کے نزدیک منجملہ شرائط نبوت و امامت نبی و امام کے مستجاب الدعوات ہونے کی بھی شرط ہے مگر جن عصمتاکد کی خاص وابستہ ہستیاں جب بھی دُعا کے لیے ہاتھ بلند کریں تو شرف قبولیت سے ممتاز ہو کر رہیں، تو خود اُن ذوات مقدسہ کی دعائیں کیسے درجۂ قبولیت سے معاذ اللہ واپس آسکتی ہیں؟ بلکہ جبکہ اُن کے اسماء مبارکہ کے توسل سے کسی کی توبہ قبول ہو اور کسی کی کشتی غرق ہونے سے بچ جائے، اور کسی کے لیے آگ گلزار ہو جائے اور کوئی اپنے یوسف کا دیدار کرے، اور کوئی جن و انس پر شاہی کرے، لہٰذا یہ کہنا کہ انھوں نے بھی دُعا کی اور قبول ہوئی یہ قول غواص بحر معرفت کی زبان پر جاری نہیں ہو سکتا۔ اُن کی دعائیں تجلی ایک طرز ہدایت کی آئینہ دار ہیں اور بعینہٖ مشیت پروردگار ہیں، اُن کی دعائیں امر و حکم الٰہی کی راز دار ہیں، کسی نبی یا کسی ولی کی دعا قبول ہو کے رد ہو جائے، ممکن ہے لیکن ان کی دُعا رد ہونے کے قابل ہی نہیں کیونکہ یہی تو مقصود کُن فکاں ہیں، یہی نظم عالم کی استواری کے سبب ہیں۔

ناظرین نکتہ رس کو الفاظ کے پردے میں وہ دُر معانی تو مل ہی گئے ہوں گے، جن کو نعل شب چراغ نبوت و گہرہائے امامت تو ایک ہلکی سی نگاہ میں کہہ سکتے ہیں، اور حقیقت میں اور گہری نظر سے کسی کو نور خدا، کسی کو وجہ اللہ، ید اللہ، نفس اللہ، کہیں تو بھی حق معرفت ادا نہ ہو کیونکہ خدا کو سوائے حبیب خدا اور نفس خدا کے کسی نے نہ پہچانا اور حبیبؐ خدا اور وجہ خدا کو سوائے خدا کسی نے نہ پہچانا، بلکہ گیارہ اور بھی ہیں وہ بھی حقیقتاً کسی کے پہچانے سے نہیں پہچانے جا سکتے، اس لیے کہ اُن کی بھی وہی منزلت ہے جو اُن کی ہے یعنی ہمارا اوّل بھی محمدؐ اور اوسط بھی محمدؐ اور آخر بھی محمدؐ اور کُل کے کُل ہی محمد ہیں لہٰذا ان میں کسی کی اُس معیاری نقطہ پر کسی شخص کو سوائے خدا کے معرفت نہیں ہو سکتی جو انکی شان کے موافق ہے۔ یہ شبہ نہ ہو کہ اہلبیتؑ رسول کی مخدرات عصمت و طہارت کی منزلت شناسی ممکن ہے۔ ہاں انھیں معظمات کی معرفت و منزلت کا پہچاننا ممکن ہے کہ جو فاطمہؑ کی سی نہ ہوں لیکن فاطمہؑ جو کہ بضعۃ الرسولؐ جزو نبوت و حقیقت محمدیہ ہیں جو بجدیت رسولؐ اصل محمدؐ اور اُم ابیہا کے لقب سے ملقب ہے اُس کی اور اس کی ایسی بیٹیوں کے بلند مراتب اور اُن کی نورانی حقیقت کو پہچاننا محال ہے۔ اور جب اُن کی منزلت اور اُن کے فہم و ادراک کی معرفت محال ہے تو اُنکے کسی فعل اور اقدام کی نوعیت کیونکر مادی کثافتوں سے گھرے ہوئے انسانوں کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ ہمارے نبیؐ خصوصیت سے بزور دُعا .... ہدایت قوم کر سکتے تھے مگر دعا کے محل و موقع وہی سمجھتے تھے اور فرائض کی ادائیگی کی اہمیت انھیں کے پیش نظر تھی۔ حسینؑ بھی دعا سے ابن زیاد و یزید کے جور و ستم کو خاک میں ملا سکتے تھے مگر دعا

کے اوقات اُن کی نگاہ میں تھے حسینؑ تو حسینؑ اُن کی بہنوں نے بھی عالمہ غیر معلمہ ہونے کا اپنے مختلف کردار اور قوت عمل سے ثبوت دیا، اُنہی نے دعا کرنے سے فرض شناسی اور وقت و موقع سے باخبر ہونے کا اظہار فرمایا ہے۔ آیئے ہم آپ کو امامؑ اور اُن کی بہنوں کی قوت برداشت وتحمل کا ایک منظر دکھاتے ہوئے اُن کی دعاؤں کے اثرات کا نقشہ بھی دکھا دیں۔

صبر وتحمل و استجابت دعا کا پہلا منظر

وہ ہے کہ جب شب عاشورہ اپنی گہری تاریکیوں سمیت رخصت ہوئی اور صبح عاشورہ بھی نمایاں ہوئی۔ حسینؑ سے عابد شب زندہ دار نے فریضہ صبح ادا کر کے اپنے اصحاب سے ارشاد فرمایا ان اللہ قد اذن فی قتلکم فعلیکم بالصبر یعنی خداوند عالم نے تم کو قتل ہو جانے کی اجازت دی ہے (یعنی جہاد کی) پس تم کو لازم ہے کہ صبر و شکیبائی کی زرہوں کو پہن لو اور جتنی سعی و نصرت جہاد میں ممکن ہو کرو۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ امام حسینؑ نے فرمایا کہ تم سب قتل ہو جاؤ گے اور سوائے علی ابن الحسینؑ کے اور کوئی زندہ نہ بچے گا۔ ابھی حضرت اپنے جاں نثاروں سے ہمکلام تھے کہ لشکر ابن سعد نے امام حسینؑ کے لشکر کی طرف رُخ کیا اور چاہا کہ خیمہ ہائے حسینؑ کو لوٹ لیں لیکن جب خندق میں آگ روشن دیکھی تو سب متحیر ہو گئے، مگر شمر نے بارگاہ امامت میں گستاخانہ کہا یا حسین التعجلت بالنار قبل یوم القیامۃ۔ امام حسینؑ نے فرمایا کہ یہ کہنے والا سوائے شمر کے اور کوئی نہیں، پھر آپ نے اُس کے جواب میں فرمایا او بکریاں چرانے والی کے لڑکے تو آتش جہنم کا زیادہ مستحق ہے۔

مسلم بن عوسجہ نے غضبناک ہو کر اسکو تیر مارنا چاہا لیکن حضرتؑ نے روکا مسلم نے اصرار کیا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میں ان لوگوں سے جنگ کی ابتدا مکروہ سمجھتا ہوں۔ یہ موقع تھا کہ حضرتؑ شمر کیلیے بددعا فرماتے مگر آپ نے بددعا نہ کی بلکہ اُس کو صرف جواب دینے پر اکتفا فرمائی۔ نیز یہ کہ شمر بالکل زد پر تھا اور مسلم بن عوسجہ کی اس درخواست پر کہ میں ابھی اس دشمن خدا و رسولؐ کو نشانہ تیر بنا سکتا ہوں مگر حضورؑ کی اجازت کی ضرورت ہے، اور حضرت کا اجازت نہ دینا بھی آپ کے مراتب صبر پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ امر واضح کرتا ہے کہ امامؑ کے نزدیک یہ موقع نہ تیر دعا سے کام لینے کا تھا اور نہ مسلم بن عوسجہ کے ناوک انتقام سے کیونکہ فوراً اُسی کے بعد جب ابن جویریہ خندق کے قریب پہونچکر یہ کہتا ہے کہ اے حسینؑ و اصحاب حسینؑ تم کو بشارت ہو کہ تم نے آخرت کی آگ سے پہلے دُنیا کی آگ کو اختیار کر لیا تو اُس وقت امامؑ نے اُس کے اس کلام کا یہ جواب دیتے ہوئے کہ تو دُنیا کی آگ سے ہم کو شرمندہ کرتا ہے، حالانکہ ہم اپنے پروردگار کریم کی بارگاہ میں جا رہے ہیں، یہ دُعا فرمائی اللھم اذقہ عذاب النار فی الدنیا۔ پروردگار اس کو جہنم کی آگ کا مزا اس دنیا میں چکھا دے۔ اس دعا کے ساتھ ہی اُس کا گھوڑا بھڑکا اور وہ زین فرس سے گرا لیکن ....اس کا ایک پیر رکاب میں پھنسا رہا اسی طرح اس کا گھوڑا کھینچتا ہوا خندق کے کنارے لے گیا اور اس کو آگ میں جھونک دیا۔ اصحاب حسینؑ نے صدائے تکبیر بلند کی اور عرض کی کیسی مبارک دعا ہے۔ کتنی جلد قبول ہوئی ؟ اور آسمان سے بھی آواز آئی کہ اے فرزند بنت رسولؐ تمھاری دعا قبول ہوئی تم کو مبارک ہو۔ مروان بن وائل لشکر ابن سعد سے تھا اُس نے اس واقعہ کو دیکھ کر امامؑ سے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا۔ ابن سعد نے دریافت کیا تو کہا کہ میں نے حسینؑ کا وہ معجزہ دیکھا ہے جو تو نے نہیں دیکھا میں ہرگز حسینؑ سے جنگ نہیں کر سکتا۔

استجابت دعا کا دوسرا منظر

تمیم بن حصین فزاری کی جسارت اور حضرتؑ کی بددعا کا اثر مورخین کی تحریروں سے یوں ملتا ہے کہ جب اس دشمن خدا نے جگر گوشہ رسولؐ کو مخاطب کر کے یوں لب کشائی کی کہ اے حسینؑ و اصحاب حسینؑ ذرا اس فرات کے پانی کو دیکھو کس طرح شکم ماہی کی طرح چمک رہا ہے اور کس طرح لطافت و سبک رفتاری سے بہہ رہا ہے لیکن خدا کی قسم ایک قطرہ بھی تم لوگوں کو نہ ملے گا جب تک کہ تیغ موت

پانی نہ پی لو ——— اُذن اللہ کے فرزند نے جب اس مرحب سیرت کا یہ پیغام سُنا تو اپنے اصحاب سے اس کا نام دریافت کیا۔ اصحاب نے عرض کی تمیم ابن حصین ہے، خامس آل عبا نے اس کا نام سنکر فرمایا کہ یہ اور اس کا باپ دونوں جہنمی ہیں، پھر کہا، پروردگار تو اس کو پیاسا ہلاک کر دعا کے الفاظ ختم نہ ہوئے تھے کہ تمیم کے گلوگیر ہو گئے اس ملعون پر پیاس کا اتنا غلبہ ہوا کہ گھوڑے پر سنبھل نہ سکا اور گر پڑا یہاں تک کہ لشکر والوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہو کر ہلاک ہو گیا۔

استجابت دُعا کا تیسرا منظر

اہلبیت رسولؐ جن کی محبت کرنا قرآن و احادیث رسولؐ سے آفتاب کی طرح روشن ہے، جن کی عزت و حرمت کرنا ہر مسلمان پر اخلاقی حیثیت سے بھی فرض ہے، جن کی فضیلتیں اور بلند مرتبے ناقابل انکار ہیں، انقلاب زمانہ کے ہاتھوں خبیث طینت عمر بن سعد اور محمد بن اشعث بن قیس کندی انھیں سے روز عاشورہ تجاہل عارفانہ اور دانستہ انکار کے طور سے کہتا ہے، کہ اے حسینؑ پسر فاطمہؑ تم کو رسولؐ خدا کی وجہ سے کون سی ایسی عزت ملی ہے جو تمھارے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکی۔ جگر پارہ قرآن ناطق نے اس کے جواب میں قرآن صامت کی آیت کو تلاوت فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے، کہ خدا نے آدم و نوح و آل ابراہیم و آل عمران کو تمام عالمین میں چن لیا اور فضیلت دی ہے اور بے شک آل ابراہیم میں محمدؐ ہیں اور آل محمدؐ ہیں اُن کی وہ عترت ہے کہ جو ہدایت کرے۔ اس کے بعد حضرت نے پوچھا یہ کہنے والا کون تھا، عرض کیا گیا محمد بن اشعث حضرت نے دست دعا بلند کر دیے اور درگاہ احدیت میں عرض کی پروردگار اس کو کبھی عزت نہ ملے۔ بہر حال محمد بن اشعث قضائے حاجت کے لیے گیا اور خداوند عالم نے اس پر ایک بچھو مسلط کر دیا اس نے اس کو کاٹا اس ملعون کو اتنی اذیت ہوئی کہ وہ طہارت بھی نہ کر سکا اور عریاں بدن نجاست میں غلطاں زمین پر تڑپتے ہوئے جان دے دی۔

المختصر یہ چند واقعات بابت قبولیت دعائے امام حسین علیہ السلام تھے جو صرف صبح عاشور سے متعلق ہیں، ان کے علاوہ بھی امام مظلوم کے اثرات دُعا صفحات تاریخ پر مرقوم ہیں۔ اب ہم صدیقہ طاہرہ مریم کبریٰ حضرت فاطمہ زہراؑ کی اُن صاحبزادیوں کے اثرات دعا کو قید تحریر میں لانا چاہتے ہیں جو اپنے بھائی کے شہید ہو جانے کے بعد گلشن اسلام کی اُس آبیاری کو کہ جو حسینؑ نے اپنے پاک و پاکیزہ لہو سے کی تھی حفاظت کر رہی تھیں اور مقاصد حسینی کو اپنے عملی اقدام اور لرزہ بر اندام و انقلاب آفریں خطبوں سے عام کر رہی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شیر خداؑ کی ان شیر دل بیٹیوں نے اپنے پرُ جگر بھائی کی محنت کو اگر اپنے تدبر عالمانہ سے چار چاند لگا دیئے ہیں تو محل و موقع پر اُس روحانیت کی طاقت کا بھی ایسا ابدی نقش دلوں پر بٹھا دیا ہے جو اُن کو اپنے نانا، باپؑ و ماںؑ سے وراثت میں ملی تھی ناظرین مندرجہ ذیل چند واقعات سے ان مخدراتؑ عظمت و جلالت کی روحانی منزل کا مرقع ملاحظہ فرمائیں۔

بعد شہادت نور عین رسول الثقلینؐ اسیروں کا قافلہ مختلف منازل سے گذر رہا تھا کہیں یزید کی چاپلوسی میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور کہیں اُس کے اس ظالمانہ اور غیر شریفانہ فعل پر مذمتیں کی جا رہی تھیں۔ اگر کسی منزل پر دوستان اہلبیتؑ کو خبر مل گئی تو وہ اپنی ..... بہر حمایت ذریت رسول میں اپنی جان کی بازی لگاتے رہے، اور جناب اُم کلثوم کی دُعاؤں کے مستحق ہو گئے، اور اگر اسیران محمدؐ پر اس حال میں بھی ظلم و ستم کیا گیا تو اُم کلثوم نے اپنی بد دعا سے اُس منزل والوں کو اُن کے کیفر کردار تک پہونچا دیا ہم اس مقام پر حسین مظلومؑ کی بہن جناب اُم کلثومؑ کی استجابت دعا کے سلسلہ میں چند واقعات تحریر کرنا اپنا فریضہ ایمانی سمجھتے ہیں۔

استجابت دُعا کا چوتھا منظر

ابو مخنف وغیرہ نے لکھا ہے کہ جب اہلبیتؑ نے شام کی طرف کوچ کیا اور معرۃ النعمان پہنچے وہاں کے لوگوں نے اپنے فسق و فجور کی وجہ سے نصرت اہلبیتؑ کی طرف کچھ بھی اعتنا نہ کی تو جناب اُم کلثومؑ نے چند اشعار اپنی مصیبت کے پڑھے اور دریافت کیا کہ اس قریہ کا کیا نام ہے۔ کہا گیا معرۃ النعمان فرمایا خدا کرے ان لوگوں کو شیریں پانی میسر نہ ہو اور کبھی یہاں غلّہ کی ارزانی نہ ہو اور خدا دست ظالمین سے اہل قریہ کو محفوظ نہ رکھے۔ ابو مخنف کہتا ہے خدا کی قسم اُس وقت سے آج تک یہاں

نہ ارزانی ہوئی نہ قحط سے اہل قریہ محفوظ رہ سکے۔

استجابت دُعا کا پانچواں منظر

جس وقت اہل بیت حسینؑ کا یہ قافلہ قصر عجوزہ جس کو ام الحجام کہتے تھے پہونچا تو اُس ملعونہ نے سر امام حسینؑ کے ساتھ پتھر سے ایسی گستاخی کی کہ سر حسینؑ سے خون جاری ہو گیا۔ جناب اُمّ کلثومؑ نے یہ ظلم دیکھ کر موُنھ پر طمانچے مارے، سر کے بال پریشان کیے، بارگاہ احدیت میں دست دعا بلند کر دیئے۔ اللّٰھم خرب علیھا قصرھا واحرقھا بنار الدنیا قبل نار الآخرۃ پروردگار اس ملعونہ کے مکان کو نیست و نابود کر دے، اور اس کو آخرت سے پہلے ہی دنیا کی آگ میں جلا دے۔ راوی کہتا ہے جیسے ہی ام کلثومؑ کی دعا تمام ہوئی ویسے ہی وہ قصر زمین پر آ رہا اور اس میں آگ لگ گئی اور اس آگ نے اس ملعونہ کو اور اس کے مکان کو تمام اشیاء سمیت جلا کر خاکستر کر دیا اس کے بعد ایک تیز ہوا چلی اور اس ہوا نے اس خاک کو بھی پراگندہ کر دیا اور اس طرح زمین صاف و شفاف ہو گئی جیسے یہاں پر کبھی کوئی عمارت ہی نہ تھی۔

استجابت دُعا کا چھٹا منظر

جب اہلبیتؑ رسول کا یہ لٹا ہوا قافلہ بعلبک پہونچا تو وہاں کے ملاعین نے لشکر یزید کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے شہر کو آراستہ و پیراستہ کیا جناب اُمّ کلثومؑ نے دریافت کیا اس شہر کا کیا نام ہے۔ بتایا گیا "بعلبک" فقالت اباد اللّٰہ تعالیٰ خضراءھم ولا اعذب اللّٰہ نساءھم ولا رفع ایدی الظلمۃ عنھم خداوندا انکی کھیتوں کو خشک کر دے ان کو شیریں پانی پینا نصیب نہ ہو اور یہ لوگ دشمنوں کے ہاتھوں سے محفوظ نہ رہیں۔ جیسا ام کلثومؑ کی زبان مبارک سے نکلا ویسا ہی ہو کے رہا۔

استجابت دُعا کا ساتواں منظر

جب اہلبیتؑ حسین مقام شیزر پہونچے وہاں کے مومنین نصرت آل رسول پر آمادہ ہو گئے جوش محبتؑ جذبۂ نصرت میں لشکر یزید سے آزادانہ تلوار چلی اور کثیر تعداد میں اشقیاء کو واصل جہنم کیا جناب اُمّ کلثومؑ نے دریافت کیا اس مقام کا کیا نام ہے، کہا گیا اسکو شیزر کہتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ حسینؑ کی چاہنے والی بہن نے دست دعا بلند کر دیئے، پروردگار ان لوگوں کے لیے پانی کو شیریں بنا دے۔ ان کے طعام میں برکت عنایت فرما ان کو ظالموں کے ہاتھ سے محفوظ رکھ۔

ابو مخنف کہتا ہے کہ اُن مخدرہ کی برکت دعا سے چاہے دنیا بھر میں ظلم و جور قبضہ کر لے مگر اس قصبہ میں سوائے زیادتی نعمت اور سلامتی و رفاہیت کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

استجابت دُعا کا آٹھواں منظر

جب یہ قافلہ قصر منیع کے پاس پہونچا تو وہاں کے لوگ بھی ذریت رسولؐ کی حمایت پر کمربستہ نظر آئے۔ پسر سعد کے لشکر پر حملہ کیا سیکڑوں ملاعین کو آتش جہنم کا ایندھن بنایا اہل منیع کی یہ دینداری ملاحظہ فرمانے کے بعد حسینؑ کی فدائی بہن اُمّ کلثومؑ نے دست دعا بلند کر دیئے اللّٰھم امنع عن اھلہ البلاء انک سمیع الدعاء وانزل علیھم برکاتک ولا تسلط علیھم الاعداء والظلام واحرسھم بعینک التی لا ینام۔ پروردگارا ان لوگوں سے بلائیں دور رکھ بیشک توہی تو دعاؤں کا سننے والا ہے۔ اور ان لوگوں پر اپنی برکتیں نازل کر اور کبھی ان پر دشمن و ظالم قبضہ و اقتدار حاصل نہ کر سکیں اور تو ان کی حفاظت کر اپنی نہ سونے والی آنکھوں سے۔

استجابت دُعا کا نواں منظر

جب اہلبیتؑ منزل سیبور میں پہونچے تو وہاں کے لوگ بھی آداب دینداری بجا لائے، تو جناب اُمّ کلثومؑ نے یہاں کا نام دریافت کیا جب معلوم ہوا کہ یہ سیبور ہے تو ان لوگوں کے لیے بھی دعا فرمائی، خداوندا ان کے لیے پانی شیریں کر دے غلہ اور لباس کی ارزانی ہو دشمنوں کے ظلم سے یہ لوگ محفوظ رہیں

چنانچہ یہی ہوا۔

استجابتِ دُعا کا دسواں منظر

جب اہل بیت حسینؑ قصر خلوظ کے قریب پہونچے

وہاں کے لوگ بھی نصرت وحمایت ذریت رسولؐ پر آمادہ ہوگئے،" تو ان خداپرستوں اور دینداروں کے لیے جناب ام کلثومؑ نے اسطرح دعا فرمائی اللّٰھم احفظ من فیہ وسلمھم من الردی وانزل علیھم من برکاتک واعم عنھم ابصار الظالمین، پروردگار یہاں کے لوگوں کی حفاظت کر اور ھلاکت سے محفوظ وسالم رکھ اور ان پر اپنی برکتیں نازل کر اور ظالمین کی آنکھوں کو ان کی طرف سے نابینا کردے۔ راوی کہتا ہے کہ اُن معظمہ کی یہ دُعا بھی مستجاب ہوئی:- اُس قصر کے تمام مرد وزن سیاہ پوش تھے اور بطنا بعد بطن اسی حالت میں رہتے ہیں، اور تا قیامت یوں ہی رہیں گے۔

استجابتِ دُعا کا گیارھواں منظر

جس وقت دربار یزید میں شامی سرخ رنگ

نے جناب فاطمہؑ بنت امام حسینؑ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ امیر یہ دختر معاذاللہ میری کنیزی میں دیدے جناب زینبؑ کو یہ سن کے غیظ آگیا۔ جناب زینبؑ نے اُس شامی سے فرمایا "او دشمن خدا چپ رہ۔ خدا تیری زبان کو گونگا کردے، تیرے موںھ کو توڑدے، تیرے ہاتھ پیر قطع کردے، تیری آنکھوں کو اندھا کردے اور تجھ کو نار جہنم میں جگہ دے۔ تیرے بچّوں کو یتیم کردے، تیری حرمت کو ذلیل کرے، وائے ہو تجھ پر تیرا قلب کتنا اندھا ہوگیا ہے کیا تو نہیں جانتا کہ عترتِ رسول ہرگز کسی کی مملوک اور بندۂ زنازادگان نہیں ہوسکتی۔ راوی کہتا ہے خدا کی قسم ابھی زینبؑ کی دُعا تمام نہ ہوئی تھی کہ اُس شامی نے یزید کے سامنے ہی نالہ وفغاں کرنا شروع کیا اور اپنی زبان کو اس قدر چبایا کہ وہ کٹ کر گر پڑی اور اپنی آنکھوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے اندھا کرلیا اور اُس کے دونوں ہاتھ گردن سے لپٹ کر رہ گئے۔

استجابتِ دُعا کا بارہواں منظر

دربار یزید میں اس مرد شامی کی گستاخی پر جناب

زینبؑ کی بددعا کا حال عرض کیا جاچکا" لیکن دوسری روایت سے یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناب ام کلثومؑ نے اس شامی ملعون کی یہ گستاخی ملاحظہ فرمائی تو شیرِ خداؑ کی بیٹی کو بھی جلال آگیا اور فرمایا چپ رہ او ذلیل ترین، خدا تیری زبان کو قطع اور آنکھوں کو کور، اور ہاتھوں کو خشک کردے، اور جہنم تیرے رہنے کی جگہ قرار دے، یقیناً اولاد انبیاء زنازادوں کی خدمت کرنے والی نہیں ہوسکتی۔ راوی کہتا ہے کہ ہنوز دعاء ام کلثومؑ تمام نہ ہوئی تھی کہ وہ شامی گونگا اور اندھا ہوگیا اور اسکے دونوں ہاتھ خشک ہوگئے۔

جناب ام کلثومؑ نے اُس شامی سے فرمایا خدا کا شکر کہ اُس نے ہم لوگوں کی دعا کو تیرے حق میں بھی مستجاب کیا اور تجھ کو آخرت سے پہلے دنیا ہی میں محل ابتلاء میں ڈال دیا۔

اُس کے بعد فرمایا کہ یہ جزا ہے اُس کی جو حرم رسولؐ خدا سے متعرض ہو۔ یہ تھے استجابت دعا کے سلسلہ میں چند مواقع جو مجملاً ہدیۂ ناظرین کیے گئے" اگر موقع مل سکا تو آیندہ اور بھی تفصیل کی جائے گی۔

قلبِ مومن میں ہے کرن تیری
نام ایماں کا ہے ترا دین
تازگی بخشتی ہے ... تیری
بو گلوں میں ... تیری
المجتبیٰ لکھنوی
...

تاثراتِ مانی

(جناب مانی جائسی مدظلہ)

فتح حق کا ولولہ تھا عزم قربانی کے ساتھ
زورِ شیرِ فاطمہ تھا زورِ ایمانی کے ساتھ

خامشی یا گفتگو یا صبر یا حرب حسینؑ
ہر ادا وابستہ تھی احکامِ ربانی کے ساتھ

شاہِ دنیا بھی ہیں شاہنشاہ عقبیٰ بھی حسینؑ
ایک طرّہ بھی ہے اکلیل جہاں بانی کے ساتھ

ذرّے وہ خاکِ شفا ہیں سجدہ گاہِ خلق ہیں
جن کو ہے ادنیٰ سی نسبت شہ کی پیشانی کے ساتھ

مرضیِ رب کا سہارا تھا کہ شہ طے کر گئے
امتحاں کی منزلِ دشوار آسانی کے ساتھ

اُف یہ نفسِ مطمئن یہ حوصلہ یا شاہِ دیں
شکر گویا فرض ہے ہر ایک قربانی کے ساتھ

تخت اُلٹ جائے گا ڈر قہرِ خدا سے اے یزید
کھیلنا کیا سہل ہے آیاتِ یزدانی کے ساتھ

عرش پر پہونچا دیا روح الامیں نے اے حسینؑ
تو نے جو سجدہ کیا تھا جذبِ رُوحانی کے ساتھ

خاک نے پاک اس نے ارضِ کربلا کو بھی کیا
جو کرم تھا کارفرما شہ کی قربانی کے ساتھ

آستانِ شہ پہ حاضر ہو کہ اے مانی یہاں
دولتِ دارین بھی ملتی ہے دربانی کے ساتھ

تذکرۃ الواقعات

(جناب مولانا مرتضیٰ صاحب صدر الافاضل)

سرفراز کے گذشتہ شماروں میں مولوی ظل حسنین صاحب اور ان کے بعد مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی نے مذکورہ بالا کتاب کے بارے میں کچھ توضیحات پیش کیئے۔ اسوقت میرے سامنے کتاب کا ترجمہ موجود ہے جس کا مقدمہ میں مترجم (معین الحق) نے بتایا ہے کہ اصل کتاب کے معلوم قلمی نسخوں کی تفصیل یہ ہے: (۱) نسخہ مملوکہ مولوی ظفر حسن صاحب (۲) نسخہ عبد السلام کلکشن علی گڑھ (۳) نسخہ شیفتہ کلکشن علی گڑھ وغیرہ ...... اس کے علاوہ انگریزی اور اردو میں بھی ترجمے ہیں۔

یہ ترجمہ "رسالہ تاریخ و سیاست" کراچی میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" کی طرف سے "آکسفورڈ پریس کراچی نے شائع کیا "تذکرہ الواقعات" ہمایوں کے آفتابچی جوہر نامی کی تالیف ہے جسمیں ہمایوں کی تخت نشینی سے "اکبر کی تخت نشینی" تک کے واقعات مختصر طور پر مندرج ہیں۔

جوہر کون تھا؟ کچھ نہیں معلوم لیکن کتاب دیکھ کر مترجم کے الفاظ میں "وہ تعلیم یافتہ، اور ادب آشنا تھا لیکن عالم و پختہ مورخ نہیں کہا جا سکتا"۔ اس کا یہ سقم ایک لحاظ سے طلباء تاریخ کے لئے مفید ثابت ہوا، اس نے جو کچھ دیکھا اسی طرح قلمبند کر دیا نہ عبارت آرائی سے واقعات کی شکل بدلی اور نہ اسباب و نتائج مرتب کرنے کی خاطر ان کو مخصوص ترتیب اور الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی اس ساری کتاب تعصب و تصنع اور ذاتی تاثرات سے مبرا ہے اس میں شک نہیں کہ ایک ادنیٰ اور وفادار خادم کی حیثیت سے اس کے دل میں ہمایوں کی بہت زیادہ عزت ہے اور وہ اس احترام کا اظہار ہر جگہ کرتا ہے، لیکن "سرکاری" مورخوں کی طرح اپنے آقا کی کمزوری اور ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا ہے۔"

وہ پختہ کار مورخ نہیں جس کے ثبوت میں کتاب کے بہت سے موجو

ہیں جن پر مترجم نے حاشیے لکھے ہیں، اسی سلسلے میں "جناب محمد حنفیہ اور یزید کی جنگ" بھی قابل ذکر ہے۔ اور یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے مولوی ظل حسنین صاحب نے اس کتاب طرف توجہ دلائی

شیر شاہ سوری کی فتح اور ہمایوں کی شکست اور بھائیوں سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اے جواں مرد! امیر المومنین محمد بن حنفیہ کا قصہ جو حضرت علیؑ کے بیٹے تھے بہت طویل ہے۔ لیکن تھوڑا سا بیان کرتا ہوں خدا کا حکم تمام احکام پر غالب ہے۔

جب محمد حنفیہ اپنے بھائی امیر المومنین حسین علیہ السلام کا یزید لعین سے انتقام لینے کے لئے دمشق میں داخل ہوئے تو یزید لعین بارہ لاکھ سوار چالیس ہزار پیادہ اور پانچو ہاتھیوں کے ساتھ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آیا۔ ہزار آدمیوں اور چالیس ہاتھیوں کو امیر المومنین محمد حنفیہ نے ایک حملہ میں مار ڈالا۔ جب یزید لعین نے امیر المومنین محمد حنفیہ کو دیکھا تو بھاگ کر دمشق کے قلعہ میں داخل ہو گیا اور دروازے بند کر لیئے۔ اس کو ساری رات چین نہ آیا مروان وزیر کو طلب کیا اور اپنے بارہ لاکھ سوار پیادے اور ہاتھی مروان کے سپرد کر دیئے۔ جب مروان امیر المومنین محمد حنفیہ کے مقابلے میں آیا۔ تو ان کی نظر اس لشکر پر پڑی انھوں نے شیر کی طرح نعرہ لگایا اور اپنے والد بزرگوار کی ذوالفقار کو کھینچ کر حملہ آور ہوئے اور پچاس ہزار آدمی اور تین سو ہاتھیوں کو مار ڈالا اسی طرح چند مرتبہ حملہ کیا۔ اور لشکر کے اتنے آدمی مار ڈالے کہ ان کی تعداد بس اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یزید لعین کے سپاہیوں نے ہاتھیوں کو ان کے گرد جمع کیا۔ یہاں تک کہ امیر المومنین محمد حنفیہ بالکل محصور ہو گئے اور بیچ میں آ گئے۔ ایک ہاتھی کی طرف بڑھے۔ جب قریب پہونچے۔ تو ہاتھی بان نے موقع پا کر پیچھے سے تلوار کھینچی اور امیر المومنین محمد حنفیہ پر چلائی اور ان کا ہاتھ کٹ

زنّار کے ساتھ زمین پر گر پڑے شہزادے بغیر ہاتھ کے کس طرح لڑ سکتے تھے یزید لعین کے لشکر نے شہزادے کو زندہ گرفتار کر کے یزید لعین کے سامنے پیش کیا گیا آخر کار یہ طے ہوا کہ امام معصوم کو جلا دیا جائے یزید لعین کے وزیر مروان نے امیر المومنین محمد بن حنفیہ کے بھائیوں کو لکھا۔ اور خود اپنے غلام کے ہاتھ (خط) روانہ کیا۔ غلام نے رات کی رات میں وہ خط ان کے پاس پہونچا دیا۔ (اس خط میں کہا گیا تھا) کہ فلاں دروازے پر اور فلاں وقت امیر المومنین محمدؐ بن حنفیہ کو جلائیں گے۔ اگر ممکن ہو تو تیار رہو کر آجاؤ اور ان کو بچا کر لے جاؤ۔ خدائے تبارک وتعالیٰ کے حکم سے جوں ہی امام معصوم کو جلانے کے لئے دروازے پر لائے۔ ان کے بھائی آگئے۔ اور بچا لیا۔ اور بہت مال و زر صدقہ کر کے عرض کیا اے امام معصوم کیا کریں کہ ہم سے آپ کا ہاتھ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اس رات کو امیر المومنین محمد بن حنفیہ علیہ السلام نے حضرت محمد مصطفٰےؐ کے جمال جہاں آرا کو خواب میں دیکھا۔ حضورؐ نے فرمایا اے فرزند خدائے لایزال کا حکم تھا۔ جو واقع ہوا۔ اے فرزند تمہارا ہاتھ اور پنجہ اسی جگہ پر تین سو ہاتھیوں اور چالیس ہزار آدمیوں کے درمیان جن کو تم نے قتل کیا تھا پڑے ہوئے ہیں۔

آدمیوں کو حکم دو کہ وہاں سے لے آئیں۔ اور اپنے ہاتھ پر پھر بڑت لو۔ قادر بے ہمتا کے حکم سے تمہارا ہاتھ شانے میں پیوست ہو جائے گا۔ اور چند روز میں بالکل درست ہو جائے گا۔ اپنے بھائیوں کی دشمنی اور عقدہ کو رد کئے اس کے بعد آپ کا تشریح اور نفرت ہے۔ امیر المومنین محمد بن حنفیہ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور حاکم لایزال کے حکم سے ان کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا اور اپنی قوت آگئی کہ ذوالفقار حیدر علیہ السلام کو کھینچ کر لشکر یزید لعین پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ جس طرح بھیڑیا بھیڑوں کے گلے پر حملہ آور ہوتا ہے اور ذوالفقار کو ایسا چلایا کہ خون کی نہر بہہ نکلی۔ الغرض یزید لعین بھاگ گیا۔ اور امیر المومنین محمد حنفیہ علیہ السلام کے ڈر سے ایک گندے گڑھے میں گر گیا۔ اس کے بعد امیر المومنین محمد بن حنفیہ علیہ السلام نے گڑھے سے نکال کر اسی جگہ اسے قتل کیا!

(ص ۴۵ – ۴۶)

اس طرح کے دو تین واقعے اور بھی ہیں مثلاً ص ۳۵ پر جنگ احد کا ذکر ہے کہ

"سنو! جب امیر المومنین حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ہندہ کے بیٹے کو نیزے سے مار ڈالا تو اس کی ماں نے شاہان روم و حبش و فرنگ اور مصر و شام کے لشکر جمع کئے اور ہرمز بن شاہ خوارزم کے سامنے عرض کیا، کہ اے ابن اعرابی نژاد۔ حمزہ نے میرے لڑکے کو مار ڈالا ہے۔ اس لئے میں نے لاتعداد فوج جمع کی ہے اور تیرے سامنے لائی ہوں اگر تو مدد کرے تو عرب بچے کی اولاد سے (اپنے مظلوم لڑکے کا) انتقام لوں۔ اور مکّہ کو تباہ کر دوں۔ ہرمز تین لاکھ سواروں کے ساتھ مدائن سے آیا اور مکّہ کی سمت روانہ ہوا مکّہ کے قریب پہونچ کر احد کی پہاڑی پر پڑاؤ کیا۔ جناب رسولؐ مقبول کو خبر ہوئی کہ تمام روئے زمین کی فوج جمع ہو کر آئی ہے حضرت رسول مقبولؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے کہ ان لشکروں کی وجہ سے ہم کو کوئی فکر نہیں، کیونکہ تنہا حمزہ ان کے لئے بہت کافی ہیں۔ خدائے لایزال کی غیرت کارفرما ہوئی اور اسلام کے لشکر نے شکست کھائی۔

تیسرا لطیفہ یہ ہے کہ ہمایوں کی زبانی ایک حکایت بیان کی ہے جس میں یعقوب لیث (متوفی سنہ ۲۶۵ھ) کو محمود غزنوی (متوفی سنہ ۴۲۱ھ) سے لڑا دیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہمایوں کے سفیر ہونے، کابل میں گرفتار ہونے، اور ہمایوں کے واقعات زندگی کے بہت سے چشم دید جزئیات اور بیانات کے لحاظ سے یہ کتاب کافی اہمیت رکھتی ہے۔

حیاتِ نو

خاص سرفراز محرم نمبر کیلئے

جناب سید حیات وارثی صاحب لکھنوی شاعر ماہنامہ سنی لکھنؤ

ہو زمانے بھر پہ روشن یہ حقیقت اے حسینؑ — تم ہو دنیا کے لیے شمعِ ہدایت اے حسینؑ

ہو خدا اس کا اسی کا باغِ جنت اے حسینؑ — جس کو بھی دل سے تمھاری ہو محبت اے حسینؑ

آپکے در کی غلامی کا ملا جس کو شرف — مل گئی دونوں جہاں کی اس کو نعمت اے حسینؑ

عہدِ ماضی کی طرح سے آج پھر اسلام پر — چھائے ہیں چاروں طرف ابرِ مصیبت اے حسینؑ

ق

مائلِ جور و ستم ہیں پھر پرستارِ یزید — ایسے عالم میں تمھاری ہو ضرورت اے حسینؑ

ہوں غلام مرتضیٰؑ اور مدح خوانِ اہلبیتؑ — میری جانب بھی نگاہِ لطف و رحمت اے حسینؑ

دے کے سر تو نے حیاتِ نو عطا کی دین کو — نام ہو اسلام کا تیری بدولت اے حسینؑ

بن گیا ہو بیکسی کی ایک خونی داستاں — کربلا میں آپ کا یومِ شہادت اے حسینؑ

جانتا ہو یہ حیاتِ خستہ کا قلبِ حزیں

ہم گنہگاروں پہ ہو تیری جو شفقت اے حسینؑ

عالمی حکومت

(جناب مولانا رضی الدین حیدر صاحب ایم اے
منیجر یادگار حسینی ہائر سکنڈری اسکول الہ آباد)

(زیر تصنیف کتاب کے چند مقامات)

منظم حکومت و سلطنت کی صحیح تاریخ کا پتہ لگانا ضرور مشکل بلکہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے مگر اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جب انسانی ارتقاء کا قدم دور وحشت سے نکل کر دائرہ تہذیب و شائستگی کی طرف بڑھا اور بشریت کی داخلی و خارجی ضروریات نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے پر مجبور کیا تو فطری طور پر یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اب انفرادیت کی بے ضابطہ زندگی پر قناعت نہیں ہو سکتی۔ انسیت کے باطنی لگاؤ نے انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنا شروع کر دیا اور اسی نزدیکی و قرب نے ہر ہر قدم پر باہمی ضروریات میں اشتراک و تعاون کی زنجیر ڈال دی۔ ضرورت منزلی کا یہی نقطہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے تا ایندم ہر لمحہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور اسی ہمہ گیر "پھیلاؤ" کو ارتقائے انسانی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اجتماعیت کی داغ بیل پڑتے ہی انسانوں میں باہم دگر فوقیت و برتری کا جبلی احساس جاگ اٹھا اور چند معینہ امتیازی قدروں کے پیمانہ میں بڑے اور چھوٹے، امیر و غریب، سرمایہ دار و مزدور اور حاکم و محکوم ناپے جانے لگے۔ انسانی کی یہ تفریق اگر انصرام امور اور تکمیل ضروریات کی سہولتوں کی حد تک رہتی تو بجزا ایک رحمت کاملہ ثابت ہوتی مگر غضب تو یہ ہو گیا کہ اس خارجی فرق نے داخلی طور پر ذات کے اندر بھی مدارج قائم کرا دیئے اور یہیں سے جسم انسانیت میں خود غرضی و تنگ نظری، قتل و غارت اور فساد و خونریزی کے مہلک جراثیم پیدا ہو کر اسے کھوکھلا کرنے لگے اور پھر باوجود ہزارہا کوششوں کے یہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ...... الحاصل انسانوں نے نوعی ضروریات کا باہمی تصادم و ٹکراؤ روکنے کے لئے ایک ایسی ہستی کی موجودگی فطری تسلیم کرنا پڑی جسے بڑا سمجھا جائے اور فیصلہ طلب امور میں جس کا حکم لائق تعمیل اور جس کا قول قابل پذیرائی ہو۔ یہ ایک ایسا فطری رجحان تقاضہ کے بغیر چارہ کار ہی نہ تھا۔ غالباً ایسے شخص کی ضرورت زمانہ سابق کے رسم قرعہ اندازی سے پیدا ہوئی ہو گی جب کہ نزاعی امور میں فیصلے قرعہ اندازی کے ذریعہ کئے جاتے تھے قرعہ اندازی میں خواہ یہ تصور مضمر نہ رہا ہو بلکہ اسے اتفاق اور مواقع کی تائید یا تردید سے تعبیر کیا جائے مگر ذرا غائر نظر سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں اپنے امور ایک ایسی نادیدہ طاقت کی طرف پیش کئے جاتے تھے جس کے وجود کا کم از کم ذہنی تصور تو ضرور ہی موجود رہتا تھا ورنہ پھر تسلیم کر لینے کے کوئی معنی ہی نہیں رہ جاتے لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ طاقت و بزرگی کو ہر دور میں حاکمیت کے لئے ایک اساسی حیثیت حاصل رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مادی رفتار ترقی کے ساتھ انسان کا ذہن و شعور بھی مدارج ارتقاء حاصل کرتا رہا ہے اور اسی تبدیلی مسلسل نے ہمیشہ اس کے نقطہ خیال کو بھی متاثر بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ اس ایک "بڑے" کے انتخاب میں نظریات بدلتے رہے اور اصول بنتے بگڑتے رہے مگر اب تک کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ زمانہ کی ہر کوشش اصلاح اور ہر سعی بہتر خرابی و ابتری ہی کا پیش خیمہ بنتی رہی ہے، دور کیوں جایئے اپنی زندگی کا تازہ ترین تجربہ مثال کے طور پر سامنے رکھئے۔ ہندوستان جو مدت سے بیرونی طاقت کے ناز یبا دباؤ میں جکڑا ہوا تھا قومی تحریک کا نظریہ لے کر اٹھا اور سالہا سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد غیر فطری بندگی کا پھندا ہمارے گلوں سے دور ہوا پھر کیا ہوا؟ ہندوستان نے سامراجی شکنجوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بہت بڑی قیمت ادا کی، بیرونی سامراج کا آخری افسوں تقسیم ملک کی صورت میں نمایاں ہو کر اپنے پیچھے درد و کراہ اور خون و خاک کی ایک بھیانک تاریخ چھوڑ گیا۔ قومی تحریک کچھ اختلافات کی بنیاد پر

دو قومی نظریہ میں تبدیل ہو گئی یہ اچھا ہوا یا برا صحیح تھا یا غلط اب اس پر غور و فکر اور تامل و تبصرہ بیکار ہے کیونکہ وقت نکل چکا ہے اور وہ بھی ذہنی تصور معہ نتائج کے آج حقیقت کے لباس میں ہمارے سامنے ہے۔ ملک کی تقسیم اس نظریہ کے ماتحت ہوئی اور ایک بڑی اکثریت جو بلند بانگ دعاوی کے ساتھ اس خیال کی حامی تھی یہاں سے ہجرت کر گئی جو یہاں رہ گئے وہ بری طرح احساس کمتری میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔ ملک کی اس غالب اقلیت کا یہ بحران و تعطل ملک کی خرمن ترقی کے لئے دبی ہوئی چنگاری ہے جسے کبھی کبھی برادران وطن کی دوسری ملک دشمن جماعتیں ہوا دیتی رہتی ہیں گویا "دو قومی نظریہ" کوئی ایسا انسانی کارنامہ تھا جسے بہر حال کسی نہ کسی روپ میں زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ صورت حال در اصل ملک کے لئے ایک وبال ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملک خیر خواہ مدبرین اور ماہر سیاستداں ہمیشہ اس زہر کہنہ کے لئے تریاق کے متلاشی رہتے ہیں کیونکہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ بجائے خود ایک ایسی وحدت ہے جس کے اجزا مختلف شعبے اپنے اشتراک عمل سے اسے تقویت بخشتے ہیں اور پھر وہی مرکز طاقت اپنے ماتحت اجزاء کے اختلاف عمل میں ایک رنگی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی دین، کا یہ عمل حکومت کی جان ہے کیونکہ ان اجزاء میں کسی ایک کا بھی مریض ہو جانا در اصل مرکز کی کمزوری کا باعث ہوگا لہذا ہم پر بھی اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم خود اس ملک کا ایک ضروری، مفید اور باکار جزو بن سکیں مگر یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہمارے اندر اخلاقی شگفتگی اور کردار کی بلندی نہ ہو گزرے ہوئے زمانہ کو آواز دیجئے وہ بتلائے گا کہ اس متاع گراں کے ایک وقت میں ہم مالک تھے جس کے نتیجہ میں ہمارے عزم و ارادے، ایثار و قربانی، فیاضی و بہادری اور استقلال و جرأت کے بے مثال عملی نقوش سے تاریخ کی پیشانی جگمگا رہی ہے۔ اس وقت ہم میں تنظیم و ضابطہ تھا۔ ہمارے اندر خودداری و خود اعتمادی کا جوہر تھا اور محنت و جفاکشی ہمارا زیور تھا مگر آج ہمارا یہ سب سرمایہ لٹ چکا ہے اور ہماری وہ تمام... خصوصیتیں مٹ چکی ہیں اور ہم ماحول سے اب بالکل متاثر نظر آ رہے ہیں اس کا اصل سبب ہماری خود فراموشی ہے لیکن اپنے وجود کا احساس رکھنا اور دوسروں کو یہ احساس دلانا میرے نزدیک

ملک کی ہمنوائی کے کبھی منافی نہیں قرار پا سکتا۔ اپنے وجود کا مستقل تصور ملک کے وجود کے لئے تقویت بخش ہوتا ہے کیونکہ افراد کی بہتری و فلاح مجموعہ (ملک) کی ترقی و بہبود کی ضامن ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے میرا مدعا واضح ہو گیا ہوگا کہ جو حکومت کسی محدود حلقۂ انسانیت میں قائم ہوگی وہ دوسرے حلقہائے انسانی کے لئے مستقل ایک آہنگ بیکار ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح فرد اپنے نامنتہائی اغراض کی تکمیل میں دوسرے افراد کو مزاحم سمجھتا ہے بعینہ اسی طرح اقوام کی حالت ہے۔ ایک قوم کی حاکمیت دوسرے کے لئے مطالبۂ غلامی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جنگ و جدل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جسے تاریخ برابر ہمارے ملک میں سیکولر حکومت کا قیام ایک نیا تجربہ ہے اور اسے وقت ہی بتلائے گا کہ نوع انسانی کو اس طریق حکومت نے کتنا سکون بخشا۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جو حکومت مذہب بیزاری کی آڑ میں اصل سرچشمۂ راحت و سکون ہی سے رشتہ قطع کرے وہ انجام کار کس طرح انسانیت کے لئے دائمی طور پر نوید شادمانی بن سکتی ہے۔ دوسرے قطعات ارض پر جو اور حکومتیں موجود ہیں ان کا باہمی خلفشار اور کبھی کبھی دست و گریباں ہو جانا اخبار بین حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے اور اسی سے یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ انسانی ارتقا کا کمال اس وقت ہی ہوگا جب وہ تمام مصنوعی نظریات کو چھوڑ کر "عالمی حکومت" کے نقطہ کی طرف آ جائے گا اور حاکمیت کو صرف ایک خدائے واحد کی ذات میں مرکوز سمجھے گا اور اس حکومت کی عملی صورت کو شریعت آسمانی کے لازوال تعلیمات میں متصور کرے گا

تاریخ عالم میں اس کی مثال بھی موجود ہے اور رہتی دنیا تک نوع بشر کی عقلی و وجدانی رہنمائی کے لئے ہمیشہ پیشانی عالم پر تابندہ رہے گی۔ اس مثال کو سمجھنے کے لئے ہم پہلے لوازم حکومت کو سمجھیں حکومت بغیر قدرت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ قدرت روحانی بھی ہو سکتی ہے اور مادی بھی۔ اور جو حکومت مادی اساس پر قائم ہوتی ہے اس کی تعمیر میں دو عظیم الشان ستون ہوتے ہیں۔ خزانہ اور فوج!

جن کے اوپر لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے ایمان و ضمائر کا خون آج بھی صاف نظر آ رہا ہے مگر یہ جب یہی جزیں حکومت عالمی کے صحیح نمائندے کے بالمقابل صرف ہوتی ہیں تو لاشک نصرت

دحقارت کے ساتھ بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے حسینی تذکرۂ غم کو سنو!

عاشورِ محرم تاریخِ انسانیت میں ایک ایسا ہی ناقابلِ فراموش دن گزرا ہے جب بالکل واضح طور پر یہ طلسم خیال ٹوٹ گیا۔ فوج کی کثرت و دولت کی فراوانی، ظلم کی بہتات اور غیر فطری حکومت وقت کا سارا مصنوعی کر و فر خاک میں مل گیا اور ایک ایسی مختصر جماعت کے مقابلہ میں جو بظاہر راحت سے دور مادی وسائل سے مجبور، اور عمر و صنف کے اعتبار سے بھی کمزور کہے جانے کے لائق تھی۔ یہ مٹھی بھر جماعت حضرت امام حسین علیہ السلام کی قیادت میں صفحۂ عالم پر ابھری جس میں چند ضعیف العمر بوڑھے، چند تشنہ و گرسنہ نوجوان کچھ یتیم و بیکس بچے، کچھ لاوارث و غم دیدہ خواتین تھیں اور ان میں سے ہر ایک کے مقابلہ میں اپنی پوری جبروت و استبداد کے ساتھ حکومت وقت کی لاتعداد افواج شیطانی حکومت کا ایک ادنیٰ سا اشارہ سکون و اطمینان خاطر کو درہم و برہم کر دیا کرتا ہے مگر وہاں تو ظلم و بربریت اور شیطنت و حیوانیت کی پوری مشینری کام کر رہی تھی مگر بزار آفرین فطری حکومت کی باوقار و سنجیدہ رعیت کے آہنی ارادوں میں ذرا سی بھی جنبش پیدا نہ کر سکی۔ ان کے آہنی اسلحہ بیکار ہو گئے تلواریں کند ہو گئیں۔ نیزے ٹوٹ گئے تیر کٹ گئے۔ اور ہاں ادہر بھی سر جسم سے اتر گئے جگر چاک ہو گئے ہاتھ قطع ہو گئے اور گلے چھد گئے مگر شریعت کی کامل فرمانروائی کا یقین مستحکم اور ان کا عمل پائیدار اپنی منزل سے نہ ہٹ سکا۔

"خدا رحمت کند آن عاشقانِ پاک طینت را"

پُرسوزِ فسانہ

(سید احمد حسن صاحب اثر صفی پوری)

دل میں یزید کے ہے امرِ خدا مٹانا
حسرت کا اک مرقع آنکھوں کے سامنے تھا
کیا نفسِ مطمئن تھا ظاہر تھا ہر قدم پر
صبر و رضا کی راہیں بچوں کو بھی دکھا دیں
عباسؑ کی شجاعت نے وہ اثر دکھایا
جب تیرِ حرملہ نے چھیدا گلوئے اصغرؑ
جس کی نظر میں ہر دم ہو مرضیٔ الٰہی
کیا وقت پُرخطر تھا تھی شعلہ ریز ساعت
وہ شمر کا اٹھانا دستِ نجس کسی پر
بانو کا تھا یہ نوحہ اے شیرخوار بچے

پیشِ نظر تھا شہ کے اسلام کو بچانا
سب سے وداع ہو کر شہ کا وطن سے جانا
کچھ کر سکا نہ شہ کا بدلا ہوا زمانا
وہ سب سے مل کے شہ کا مقتل کی سمت جانا
اعدا کو جان اپنی مشکل ہوئی بچانا
دیکھا کئے ملک بھی اصغرؑ کا مسکرانا
آسان ہو نہ کیونکر اکبرؑ کی لاش اٹھانا
خیموں کا آہ جلنا بچوں کا باہر آنا
تھی بیکسی کا عالم بچی کا تلملانا
تجھ کو نہ راس آیا جھولے سے جا کے آنا

کیونکر اثر بیاں ہوں حالات کربلا کے
پُر درد داستاں ہے پُرسوز ہے فسانا

"کربلا"

(جناب شمیم کرہانی)

(خاص سرفراز محرم نمبر کیلئے)

کربلا کے ذرّے ذرّے پر یہی تحریر ہے
کربلا قسمت نہیں ہے ناخنِ تدبیر ہے

ظلمتِ شر سے کرن پھوٹی ہے صبحِ خیر کی
کربلا تخریب سے نکلی ہوئی تعمیر ہے

خوفِ باطل کا کرشمہ ہے نہ فعلِ اضطرار
کربلا کی جنگ سچے خواب کی تعبیر ہے

لڑ رہا ہے آندھیوں کے تند جھونکوں سے چراغ
کربلا اک ایسے نازک وقت کی تصویر ہے

سجدہ تیروں میں تو شمشیروں کے سائے میں قیام
کربلا اسلام کی تاریخِ باتصویر ہے

سارا عالم ختم ہو جائے تو یہ بھی ختم ہو
کربلا اک ایسا ماتم ہے جو عالم گیر ہے

روحِ انساں قید سے آزاد آتی ہے نظر
کربلا جیسے کوئی ٹوٹی ہوئی زنجیر ہے

رکھ دیا سفّاکی باطل کا پنجہ موڑ کر
کربلا بھی یادگارِ ہمتِ شبیرؑ ہے

کربلا ہی تک یزید و شمر و ابن سعد تھے
کربلا کے بعد پھر شبیرؑ ہی شبیرؑ ہے

رن میں لاکھوں کے مقابل ہیں بہتّر دیکھئے

ڈاکٹر متین خاں صاحب نیازی ایم' بی' بی' ایس

کربلا میں یہ قیامت خیز منظر دیکھئے
حرملہ کا تیر اور حلقوم اصغرؑ دیکھئے

اس کو کہتے ہیں شجاعت یہ ہے شانِ حیدریؑ
رن میں لاکھوں کے مقابل ہیں بہتّر دیکھئے

کانپتا ہے نام سن کر بابِ خیبر آج بھی
یہ ہے شانِ ہیبتِ بازوئے حیدرؑ دیکھئے

کفر و باطل پر ظفر ہوتی ہے حاصل یا نہیں
راہِ حق میں زورِ ایماں آزما کر دیکھئے

کیا بتاؤں کیسی نعمت ہے مئے حُبِّ حسینؑ
جذبۂ ایماں سلامت ہو تو پی کر دیکھئے

بن گئے حر کیا سے کیا ہو کر نثارِ اہلِ بیتؑ
آن واحد میں سنورتا ہے مقدر دیکھئے

اللہ اللہ ذوق و ارمانِ شہادت اے متینؔ
گود میں شہ کی چلے ہیں رن کو اصغرؑ دیکھئے

"کربلا"

(جناب شمیم کرہانی)

(خاص سرفراز محرم نمبر کیلئے)

کربلا کے ذرّے ذرّے پر یہی تحریر ہی ۔ کربلا قسمت نہیں ہی ناخن تدبیر ہی

ظلمتِ شر سے کرن پھوٹی ہی صبحِ خیر کی ۔ کربلا تخریب سے نکلی ہوئی تعمیر ہی

خوفِ باطل کا کرشمہ ہی نہ فعلِ اضطرار ۔ کربلا کی جنگ سچے خواب کی تعبیر ہی

لڑ رہا ہی آندھیوں کے تند جھونکوں سے چراغ ۔ کربلا اک ایسے نازک وقت کی تصویر ہی

سجدہ تیروں میں تو شمشیروں کے سائے میں قیام ۔ کربلا اسلام کی تاریخِ با تصویر ہی

سارا عالم ختم ہو جائے تو یہ بھی ختم ہو ۔ کربلا اک ایسا ماتم ہی جو عالم گیر ہی

روحِ انساں قید سے آزاد آتی ہی نظر ۔ کربلا جیسے کوئی ٹوٹی ہوئی زنجیر ہی

رکھ دیا سفّاکیٔ باطل کا پنجہ موڑ کر ۔ کربلا بھی یادگارِ ہمتِ شبیرؑ ہی

کربلا ہی تک یزید و شمر و ابن سعد تھے

کربلا کے بعد پھر شبیرؑ ہی شبیرؑ ہے

رن میں لاکھوں کے مقابل ہیں بہتّر دیکھئے

ڈاکٹر متین خاں صاحب نیازی ایم' بی' بی' ایس

کربلا میں یہ قیامت خیز منظر دیکھئے
حرملہ کا تیر اور حلقوم اصغرؑ دیکھئے

اس کو کہتے ہیں شجاعت یہ ہے شانِ حیدریؑ
رن میں لاکھوں کے مقابل ہیں بہتّر دیکھئے

کانپتا ہے نام سُن کر بابِ خیبر آج بھی
یہ ہے شانِ ہیبتِ بازوئے حیدرؑ دیکھئے

کفر و باطل پر ظفر ہوتی ہے حاصل یا نہیں
راہِ حق میں زورِ ایماں آزما کر دیکھئے

کیا بتاؤں کیسی نعمت ہے مئے حُبِّ حسینؑ
جذبۂ ایماں سلامت ہو تو پی کر دیکھئے

بن گئے حر کیا سے کیا ہو کر نثارِ اہلِ بیتؑ
آن واحد میں سنورتا ہے مقدر دیکھئے

اللہ اللہ ذوق وارمانِ شہادت اے متینؔ
گود میں شہ کی چلے ہیں رن کو اصغرؑ دیکھئے

کربلائے تازہ اور عزمِ حسینؑ

(جناب مولانا اسحٰق علمی صاحب ایڈیٹر روزنامہ سیاست کانپور)

میدان کربلا میں سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا واقعہ تاریخ کا وہ اہم و عظیم واقعہ ہے جس نے انسان اور انسانیت کے ذہن و فکر کو حقائق و معارف کے نازک و لطیف اسرار و رموز سے آشنا کیا اور اس پر عمل و کردار کے دشوار ترین مراحل و مقامات کو آسان بنایا۔

یہ واقعہ حیاتِ انسانی میں، حق اور جراءت و بیباکی کا سب سے بڑا مظاہرہ ہے۔ یہ واقعہ اعلائے کلمۃ الحق کی جد و جہد کا بلند ترین نمونہ ہے۔ یہ واقعہ راہ حق و صواب میں ثبات و استقامت کی لازوال مثال ہے۔ اور یہ واقعہ معرکۂ حق و باطل میں بظاہر حق کی شکست اور باطل کی فتح۔ لیکن بباطن حق کی لازوال اور ابدی کامرانی کا ایک جگمگاتا ہوا مرقع ہے ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حضرت امام حسینؑ کی شہادت نے بتایا کہ معراج اسلام و انسانیت تقاضائے حق کی تکمیل کے سوا کچھ اور نہیں۔

حضرت حسینؑ کی شہادت نے بتایا کہ فرض عبدیت و عبودیت رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کے سوا کچھ اور نہیں۔

حضرت حسینؑ کی شہادت نے بتایا کہ سچا مسلمان اور اعلیٰ انسان وہ ہے جو باطل کے طاغوتی غلبہ میں بھی حق گوئی و حق کوشی کی جراءت رکھتا ہو۔

حضرت حسینؑ کی شہادت نے بتایا کہ بدی کی قوتوں سے لڑنے اور سچائی کی منزل کی جانب گامزن ہونے کی راہ میں کثرت و قلت کا خوف کوئی خوف نہیں۔

حسینؑ کی شہادت نے بتایا کہ مسلمان اور صاحب ایمان کے لئے دنیا کی ترغیبوں و تحریصوں، تمام انفرادی و اجتماعی طاقتو

اور تمام حکمرانوں اور حکومتوں کے مقابلہ میں اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی تحریص۔ طاقت اور حکومت ہی سب کچھ ہے اور جب ان احکامات کی خلاف ورزی پر اسے مجبور کیا جائے تو اسے سر بکف ہو کر میدان جہاد میں نکل آنا چاہیئے۔

حضرت حسینؑ کی شہادت نے بتایا کہ ایک مومن و مسلم کے لئے خدا اور رسولؐ کی اطاعت و محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ جب فرائض الٰہی کی تکمیل اور ناموس رسولؐ کے استقرار کو خطرہ میں دیکھے تو اپنی جان و مال اور اپنی عزت و دولت کی بازی لگا دے۔

حضرت حسینؑ کی شہادت نے بتایا کہ مسلمان اور انسان وہی ہے جو کسی ظالم و جابر حکومت اور فاسق و فاجر حکمران کی اطاعت و فرمانبرداری اپنی زندگی کی قیمت لگا کر بھی نہ کرے۔

حضرت حسینؑ کی شہادت نے بتایا کہ جو حکومت دوسروں کے دین و مذہب، تہذیب و معاشرت، خیال و عمل کی آزادی پر ہاتھ ڈالتی ہے وہ شیطان کی حکومت ہے اور اس کی مخالفت کرنا ایک اہم فریضۂ انسانی ہے۔

حضرت حسینؑ کی شہادت نے بتایا کہ جو شخصیت عوام و جمہور کے مفادات پر اور جو ملوکیت، عوامیت و جمہوریت کے اختیارات پر ڈاکہ ڈالتی ہے وہ ایک انسان اور ایک مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔

غرضکہ حضرت حسینؑ کی شہادت عظمیٰ نے، انسانیت کو اسکے علاوہ بھی بہت سے انقلابی پیغامات دیئے ہیں اور تاریخ کو ایک ایسا موڑ عطا کیا ہے جہاں سے اس کی راہیں باطل سے حق کی طرف بے دینی سے دین کی طرف ظلم سے انصاف کی طرف اور ملوکیت و شخصیت سے جمہوریت و عوامیت کی طرف مڑ جاتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس باطل پرست زمانہ میں۔ اس بے دینی کے دور میں اس ظلم کی اندھیر نگری میں اور ڈکٹیٹر شپ، ملوکیت پسندی و شخصیت پرستی کی اس فضا میں حضرت حسینؑ کی شہادت عظمیٰ کے دیئے ہوئے پیغامات سے روشنی لے کر ایک بار پھر ہماری مجروح و خوابیدہ انسانیت انگڑائی لے کر اٹھے گی اور حق پسندی و حق کوشی کی منزل کی طرف گامزن ہو جائے گی

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائب یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوع بشر دو چار
اے زندگی! جلال شہ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسین دے

شمع عالم، مشعلِ دنیا، چراغِ دیں حسینؑ

نتیجۂ فکر بلند جناب سردار کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحرؔ

تشنہ کامی، بے کسی، غربت، فریبِ دشمناں
نوکِ خنجر، بارشِ پیکاں، گلوئے خوں چکاں

ہر دم شمشیر سے بھی تیز تر راہِ جہاں
ہر قدم اک مرحلہ ہے، ہر نفس اک امتحاں

زندگی پھر اہلِ دل کی اور آسانی طلب
یہ وہ مے ہے جس کا ہر قطرہ ہے قربانی طلب

فطرتِ آدم کو کر دیتی ہے قربانی بلند
دل پہ کھل جاتی ہے اس کے نور سے ہر راہِ بند

مہر و مہ ہوتے ہیں اس کی خاکِ پا سے ارجمند
ہے فرشتوں کے گلوئے پاک میں اس کی کمند

سر کہ جس میں ذوقِ قربانی ہو جھک سکتا نہیں
تنکوں سے بڑھتا ہوا سیلاب رُک سکتا نہیں

گلشنِ صدق و صفا کا لالۂ رنگیں حسینؑ
شمع عالم، مشعلِ دنیا، چراغِ دیں حسینؑ

سر سے پا تک سُرخیٔ افسانۂ خونیں حسینؑ
جس پہ شاہوں کی خوشی قرباں وہ غمگیں حسینؑ

مطلعِ نورِ مہ و پرویں ہے پیشانی تری
باج لیتی ہے ہر اک مذہب سے قربانی تری

جادۂ عالم میں ہے رہبر ترا نقشِ قدم
سایۂ دامن ہے تیرا پرورش گاہِ ارم

بادۂ ہستی کا ہے تعبیر تجھ سے کیف و کم
اُٹھ نہیں سکتا ترے آگے سرِ لوح و قلم

تو نے بخشی ہے وہ رفعت ایک مشتِ خاک کو
جو یہ ایں سرکردگی حاصل نہیں افلاک کو

بارشِ رحمت کا مژدہ بابِ حکمت کی کلید
روزِ روشن کی بشارت، صبحِ رنگیں کی نوید

ہر نظامِ کہنہ کو پیغامِ آئینِ جدید
اے کہ ہے تیری شہادت اصل میں مرگِ یزید

تیری مظلومی نے عالم کو کیا یوں بے نشاں
ڈھونڈتا پھرتا ہے اس کی ہڈیوں کو آسماں

ہر گلِ رنگیں، شہیدِ خنجرِ جورِ خزاں
ہر دلِ غمگیں ہلاکِ نشترِ آہ و فغاں

جاگزیں ہے اے سحرؔ ہر شئے میں وہ سوزِ نہاں
پھول پر شبنم چھڑکتا ہوں تو اُٹھتا ہے دھواں

خنجرِ آہن، گلوئے مردِ تشنہ کام ہے
چھٹ نہیں سکتا یہ وہ داغِ جبینِ شام ہے

سلام

جناب محمد عمر صاحب نشتر کھنڈوہ

تبر سے تیر سے اہلِ دغا سے کھیلتے دیکھا — سلامی شاہ کو صبر و رضا سے کھیلتے دیکھا
محمدؐ کے نواسے کو بلا سے کھیلتے دیکھا — وصیت سے اذیت سے جفا سے کھیلتے دیکھا
علیؑ کے شیر کو رن میں قضا سے کھیلتے دیکھا

یہ تھے آپس میں چرچے اور پریشاں حال تھے اعدا — یہ منظر دیکھ کر فوجِ ستمگر کو ہوا سکتا
لگا جب تیرِ حرمل حلق پر یہ شور برپا تھا — بھلا کیا حال ہوگا اُس گھرانے کے جوانوں کا
جہاں معصوم اصغرؑ کو قضا سے کھیلتے دیکھا

نہ کوشش کی لعینوں نے کبھی رفعت کی پستی کو — سگ زر تھے یہ اعدا بے خبر تھے اپنی ہستی سے
خدا کو بھول بیٹھے تھے یہ ظالم اپنی مستی سے — نہ باز آئے ستمگر عمر بھر باطل پرستی سے
جو دیکھا بھی تو بس ان کو ریا سے کھیلتے دیکھا

لعینوں نے جہاں خوں آلِ احمدؐ کا بہایا تھا — جہاں پیاسے گلے پر شمر نے خنجر چلایا تھا
جہاں سر سجدۂ خالق میں سرور نے جھکایا تھا — جہاں شبیرؑ نے مقتل میں اپنا سر کٹایا تھا
وہاں کی خاک کو عرشِ علیٰ سے کھیلتے دیکھا

یہ عالم دیکھ کر تھے دشمنِ آلِ نبی ششدر — خدا کی راہ میں مرنے کو خود جاتے تھے بڑھ بڑھ کر
سرِ مقتل گراں تھا دوش پر خود ان کو اپنا سر — شہادت کی خوشی میں اس قدر بیتاب تھے نشتر
کہ ہر مردِ مجاہد کو قضا سے کھیلتے دیکھا

یزید نے اپنے دادا ابوسفیان کا گھر پھونک دیا

جناب آغا شہر لکھنوی مدظلہ

یوں تو ہر زمانے میں فتح کے ڈنکے بجتے رہتے ہیں اور مفتوحوں کے جگر خراش نالوں کی آواز انسانیت کے دل کو برماتی رہتی ہے لیکن فاتح کے لئے اس سے بہتر کوئی تمغۂ افتخار نہیں ہو سکتا کہ اپنے جذبۂ انتقام کی دبی ہوئی چنگاریوں کو رحم و کرم کے چھینٹوں سے بجھائے اور مفتوح کے زخم خوردہ دل پر حسن سلوک کا پھاہا چڑھا سکے۔ تاریخ عالم میں فاتحانہ ہنگامے اتنے قابل التفات نہیں جتنے مفتوح سے حسن سلوک کے کارنامے کجکلاہ ایران دارا شکست کھا کے اسیر ہو جاتا ہے۔ فاتح عالم سکندر کو اسکے قتل کا مشورہ دیدیا جاتا ہے لیکن باطن میں روم کی فاتحانہ اولوالعزمی اس انسانیت سوز طرز عمل کو گوارا نہیں کرتی۔ ایک خط کے ذریعے سے مفتوح دارا کے احساسات ضبط کر لیتا ہے اور لکھتا ہے۔

دارا! اب تم ہمارے قیدی ہوئے۔ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟"

خاک نشین قیدی۔ کرسی نشین فاتح کے رحجان کرم کو تاڑ جاتا ہے اور یوں جواب دیتا ہے۔

"مفتوح دارا اسی سلوک کا مستحق ہے جو فاتح کے شایان شان ہو"

اس حسرت خیز جواب سے سکندر کا بلند آہنگ دل متاثر ہو جاتا ہے اور وہ دارا سے برادرانہ سلوک کرنے لگتا ہے۔ تاریخ فتوحات سکندریہ میں اس واقعہ کرم کا مطالعہ روس کی فتح ایران سے زیادہ جاذب نظر ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب لشکر اسلام فاتحانہ شان سے اللہ اکبر کا جنگی نعرہ لگاتا ہوا داخل حدود مکہ ہوتا ہے تو قبائل قریش ایک دوسرے پر مایوسانہ نظریں ڈالنے لگتے ہیں کہ اب محمدؐ کی تلوار ہے اور ہماری گردن۔ لیکن فاتح برحق اور فاتح مادیات میں بڑا فرق ہے۔

بستی کے باہر رسالت پناہؐ نے ٹھیرائے ہوئے حاضر ہونے والوں سے خطاب فرماتے ہوئے پہلا فقرہ جو ارشاد فرمایا وہ یہ تھا،

الیوم یوم الوفاء والبر

(آج ایفائے وعدہ اور عفو عام کا دن ہے)

اور آبادی مکہ میں جب کیمپ کیا تو دوسرا شاندار اعلان یہ تھا۔

من دخل دار ابی سفیان فھو آمن

(جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ گزیں ہوگا وہ ہر گرفت سے محفوظ ہے)

ان دونوں بریز کرم اعلانوں پر تاریخ فتح مکہ جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ آج مجاہدین جنگ اسلام کے جنگی کارنامے افسانۂ پارینہ ہو کے رہ گئے ہیں لیکن مفتوح کے ساتھ فاتح اسلام کی کریمانہ روش الوقت بھی حساس دلوں کو حلقہ بگوش کئے ہوئے ہے اور اس ذات گرامی سے براہ راست نسبت رکھنے والوں کے لئے تو دائمی سامان افتخار ہے۔ ابوسفیان جن کے گھر کو قائد اسلام نے معاندین و مفتوحین قریش کے لئے جائے امن مقرر فرمایا تھا وہ یزید نافرجام کے دادا تھے۔

قاعدہ ہے کہ ہر مقام کے انسان خصوصاً عرب اپنے اجداد کے فضائل و اوصاف کو خاندانی طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں اور اسکے برقرار رکھنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں لیکن یزید ملعون نے محسن ابوسفیان کے نواسے کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اپنے خاندانی اعزازو واقعات کا بھی کچھ خیال نہ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نشۂ مادیات سے مست ہو گیا تھا جب امامؑ عالی مقام داخل حدود کوفہ ہوئے تھے تو ایسے سوچا تھا، کہ انہی حسینؑ کے نانا فاتح مکہ نے اس کے دادا ابوسفیان کے گھر کو یہ اعزاز مرحمت فرمایا تھا کہ اسے مفتوحین کے لئے جائے امن قرار دیا تھا حسینؑ غریب نے نہ تو اس کے پہلے اس سے کوئی جنگ کی تھی اور نہ ارادہ جنگ۔

کر کے داخل حدودِ کوفہ ہوئے تھے۔ وہ تو صرف اس غرض سے عازم کوفہ تھے کہ بیعت کرنے والوں کے لئے مشعلِ ہدایت بن کے رہیں اور اپنی روحانی تعلیم سے ان کے دامنِ ایمان کو مالامال کریں۔ مدینے سے کربلا تک کے دوران سفر میں آنحضرتؑ سے متعلق جتنے اعمالِ افعال و اقوال کتابوں میں ملتے ہیں ان کا گہرا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں کہ کوئی ایک موقع یا کوئی ایک ایسا لفظ ان کی تقریر و تحریر میں ایسا نہیں جس سے مترشح ہوتا ہو کہ عزمِ جنگ دل میں پوشیدہ ہے۔ ابتدائے سفر سے غور کیجئے کہ مسلم بن عقبہ اور اس کے نائب مروان بن حکم سے امام حسینؑ کی ناکام گفتگو کے وقت جب عباس بن علیؑ کے تیور بگڑ گئے تھے تو خود امام مظلومؑ نے بھائی کی آتشِ غضب پر آبِ سکون چھڑکا تھا۔ اس کے بعد دورانِ سفر میں بھی ہر احتمالِ جنگ کے موقع پر یہ شہادت ملتی ہے کہ جذبۂ جنگ رکھنے والے ساتھیوں سے ارشاد ہوتا ہے "جس کو جانا ہو شوق سے چلا جائے" یہی ایک ایسی قاطع دلیل ہے جو اس رسوائے تاریخ فقرے کو قطع کر دیتی ہے کہ قتل الحسین بسیف جدہ ۔ اگر ارادہ جنگ ہوتا تو کچھ تو سامان کرتے حسینؑ کو ہرگز لڑنا نہیں تھا بلکہ انھیں تو معاملۂ حق و صداقت میں امیرِ دمشق یزید سے صرف جھگڑنا تھا۔ اگر اس میں کامیاب نہ ہوتے تو لکم دینکم ولی دین ۔ کے مطابق خاموش ہو جاتے۔ بھلا ان کو کب گوارا ہوتا کہ اپنے محترم بھائی امام حسنؑ کے اسوۂ حسنہ کو ترک کر دیتے جنھوں نے امیر معاویہ سے اس لئے نہ برپا جنگ نہیں کی کہ مسلمانوں کی خواہ مخواہ خونریزی ہو گی حتیٰ کہ عمداً ترکِ عہدۂ خلافت کے بعد اربابِ مدینہ آنجناب کو یا عاد المسلمین کا ناگوار طعنہ دیا کرتے تھے جس کا جواب وہ یوں دیتے تھے العار خیر من النار ۔ انھیں اس کا خیال تھا کہ اپنے جدِ محترم رسولِ اکرم کے قول کا احترام اپنے حسنِ عمل سے برقرار رکھیں جنھوں نے ان کے لئے ارشاد فرمایا تھا

سیصلح اللہ بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین

(حسنؑ کی ذات سے مسلمانوں کے دو عظیم الشان گروہ ہوں میں خدا صلح کر دے گا۔)

اسی طرح دوران سفر میں امام حسینؑ کے عزمِ صلح کی (علاوہ بیعت یزید) تین شہادتیں ملتی ہیں۔

(۱) منزلِ زبالہ پر جب عبداللہ بن یقطرؓ (اماٌم کے رضاعی بھائی) جن کو آنجناب نے خبر گیری مسلم بن عقیل کے لئے کوفے کی جانب بھیجا تھا۔ ابن زیاد کے اصحاب کے ہاتھوں قادسیہ میں قتل کر دئے گئے۔ تو یہ خبر سن کے آنجناب نے جس عملی روش کا اظہار کیا وہ یہ تھا کہ اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کے فرمایا۔

من احب ان ینصرف فلینصرف

(جو واپس جانا چاہتا ہے وہ واپس جائے)

لہٰذا لوگ داہنے بائیں ہو جاتے ہیں۔ سوائے ان وفاداروں کے جو مکے سے ساتھ ہوئے تھے۔

(۲) آگے بڑھ کے جب بطنِ عقبہ میں پہونچتے ہیں تو وہاں کا ایک عرب سردارِ قبیلہ حاضرِ خدمت ہوتا ہے جسے فضائے کوفہ کی اطلاع ہے۔ مختصر گفتگو کے بعد عرض کرتا ہے۔

انشدک اللہ الا انصرفت۔ فواللہ ما تقدم الا علی الاسنۃ وحد السیوف

(فرزندِ رسولؐ خدا کے لئے آپ واپس جائیے۔ ورنہ یہ سمجھ رکھئے کہ آپ نیزوں کی انیوں اور تلواروں کی دھاروں پر خود قدم رکھ رہے ہیں)

اسے جواب ملتا ہے۔

لا یخفی علیّ شیئ مما ذکرت
ولکنی صابر محتسب حتیٰ یقضی اللہ امراً کان مفعولا

(جو تم کہتے ہو مجھے بھی معلوم ہے لیکن مجھے اپنے صبر پر کافی بھروسہ ہے آگے جو اللہ چاہے گا وہ ہو کے رہے گا)

یہ سن کے وہ خیر خواہ عترتِ رسولؐ خاموش واپس جاتا ہے۔

(۳) اس کے بعد قافلۂ حسینی جب کوفے کی طرف کوچ کر جاتا ہے اور صرف دو منزلیں باقی ہیں کہ حسینؑ کے ساتھ کا کھیلا ہوا سردار فوجِ ابن زیاد حرؓ بن یزید ریاحی مع اپنے تابعین کے خدمتِ امام میں حاضر ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ مجھے ابن زیاد نے

آپ کی نگہبانی سپردگی ہے کہ یا تو آپ کے ہمراہ رہ کے آپ کے حرکات و سکنات پر نظر رکھوں۔ یا اگر بخیر و عافیت ہو یا کوفہ تو ابن زیاد کے پاس پہنچا دوں۔ پھر اپنے پوشیدہ جذبات و خیالات کا یوں اظہار کرتا ہے۔

وانا واللہ کارہ ان تبتلینی اللہ بشئی من امرک

(خدا کی قسم میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ میری ذات سے آپ کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔ اور مجھے وبالِ آخرت بھگتنا پڑے۔)

امام حسینؑ مختصراً فرماتے ہیں۔ بھائی ارباب کوفہ نے مجھے متعدد خطوط طلب بھیجے ہیں جن کی بنا پر میں نے یہ سفر اختیار کیا ہے تم بھی کوفے کے رہنے والے ہو غالباً تمہیں بھی اس کی اطلاع ہو گی۔ جناب حرؓ جواباً عرض کرتے ہیں۔ فرزند رسولؐ مجھے بخدا اس کا کوئی علم نہیں۔" خلاصہ یہ کہ فضا کے رُخ آپ کے خلاف ہے۔ واپس جائیے۔ میں ابن زیاد کو لکھ دوں گا کہ باوجود تلاش قافلہ حسینؑ کو نہ پا سکا۔ انہوں نے غالباً کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

اس مقام پر صاحب نور الابصار نے لکھا ہے کہ امام حسینؑ واپسی کے لئے راہ حجاز پر ہو لئے تھے سوائے اس کتاب کے اور کسی کتاب میں میری نظر نہیں پڑی کہ حسینؑ مشورہ حرؓ سے آمادہ رجعت ہو گئے ہوں جسینؑ ایسے آہنی عزم رکھنے والے کے لئے بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ اگر واپس ہوتے تو اپنے مخلص ناصحین عبداللہ بن عمر۔ محمد حنفیہ۔ عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عباس کی بیک نگاہی سے محفوظ نہ رہ سکتے۔ کیا حسینؑ کو یہ گوارا ہوتا؟ ہرگز نہیں۔

دوسرے مراجعت کا ذرا بھی شائبہ حسینؑ کے دامن صبر و استقلال پر ایک ناگوار دھبہ بن کے رہ جاتا بلکہ اگر یوں کہدیا جائے تو درست ہو گا کہ حسینؑ اپنی حیات تک قربت رسالتؐ کی سائے میں تو بے شک معزز و ممتاز امام حسینؑ ہو کے رہتے۔ لیکن ہر زمانے کے حسینؑ نہ ہوتے۔

ان سب واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ آنجناب نے ہر طرز عمل سے اپنے اسلاف کے فضائل کا معیار بلند رکھنے کی کامیاب کوشش فرمائی حتیٰ کہ اپنا سب کچھ قربان کر کے ابدی افتخار کے حامل ہوئے

اسی تعلق سے صاحب نور الابصار نے ایک واقعہ یوں نقل کیا ہے کہ "شیخ نصر اللہ بن یحییٰ نے جن کا شمار بہترین ثقات میں ہے ایک شب عالم رویا میں علی مرتضیٰؑ کو دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے عرض کی "یا امیر المومنینؑ ایوم فتح مکہ کے متعلق مشہور ہے کہ سرور کونینؐ نے یہ اعلان فرما کے ابوسفیان کے گھر کو دائمی شرف و افتخار مرحمت فرمایا تھا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائیگا وہ محفوظ ہے۔ افسوس انھیں ابوسفیان کے حقیقی پوتے یزید نے کربلا میں رسولؐ کے نور نظر اور آپ کے لخت جگر کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کیا۔

آنجناب نے جواباً ارشاد فرمایا۔

انعرف ابیات ابن الصیفی فی ھذا المعنی؟

(کیا ابن صیفی کے وہ اشعار جو اس بحث میں اس نے کہے ہیں تجھے معلوم ہیں!)
میں نے عرض کی مجھے کیا معلوم۔ فرمایا اس کے پاس جاؤ اور اشعار سنو۔ وقت سحر جب میری آنکھ کھلی تو میں فوراً شاعر کے مکان پر پہنچا۔ دھو حیص بیص الشاعر الملقب بشہاب الدین۔ جو شاعر تو تھے مگر عالم عسرت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کم کہتے تھے۔ اُن کا لقب شہاب الدین تھا۔ الغرض میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آئے جب میں نے ذکر خواب کیا تو وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگے اور کہنے لگے کہ رب العزت کی قسم میں نے یہ تین شعر اسی رات کو نظم کئے ہیں جن کا علم سوائے میرے اور کسی کو ابھی تک نہیں ہے۔ میں نے کہا جلدی سنائیے مجھے بیحد اشتیاق ہے۔ انھوں نے حسب ذیل تین اشعار پڑھے جن میں خاندان رسالتؐ کی طرف سے شکایت آمیز لہجہ تھا۔

ملکنا فکان العفو منا سجیۃ
جب ملک میں ہمارا اقتدار تھا تو ہماری طینت عفو و کرم تھی
فلما ملکتم سال بالدم ابطح
لیکن جب تم مالک ہوئے تو بطحیٰ وادی کے خون کی ندیاں بہ گئیں
حللتم قتل الاساری ولطالما
تم نے اسیروں کا قتل جائز رکھا
غدونا علی الاسری فنعفو و نصفح
لیکن ہم نے اکثر عفو و درگذر سے کام لیا
وحسبکم ھذا التفاوت بیننا
ہمارے تمہارے درمیان یہی فرق مراتب کافی ہے
وکل اناءٍ بالذی فیہ ینضح
(مانی ہوئی بات ہے۔ کہ ہرچہ در دیگ ست بہ چمچہ بر می آید)
خصوصیات بنی ہاشم کے برقرار رکھنے والے پر لاکھوں درود و سلام۔

شہیدِ راہِ وفا تیری بات کیا کہنا

جناب سید مہدی حسن صاحب بی، اے، شیخپورہ، ضلع مونگیر

نیاز و ناز کی خالق سے بات کیا کہنا — بسر ہوئی جو عبادت میں رات کیا کہنا

عدو کی فوج میں صیقل شبِ دہم شب بھر — خیامِ شاہ میں شورِ صلوٰۃ کیا کہنا

حسینؑ پاک نے مرنا بھی کر دیا آساں — بنا کے موت کو عینِ حیات کیا کہنا

عجیب شان سے مقتل میں لیکے آئے ہیں — تمام عمر کی شہ کائنات کیا کہنا

نبیؐ کے دین کو تو مر کے کر گیا زندہ — شہیدِ راہِ وفا تیری بات کیا کہنا

وہ سیر چشم تھے واللہ کربلا والے — نظر نہ کی سوئے نہرِ فرات کیا کہنا

دکھایا شاہ نے جو کربلا میں اے مہدی
وہ صبر و شکر وہ عزم و ثبات کیا کہنا

یادِ حسینؑ

جناب جگدیش سہائے صاحب سکینہ وکیل شاہجہانپوری

محرّم آگیا پیغام شاہِ کربلا لے کر
وفا پر مٹنے والوں کے لئے جامِ بقا لے کر

عزادارانِ آلِ مصطفےٰ دل کھول کر رو لیں
کہ آیا ہے یہ اذنِ گریہ و آہ و بُکا لے کر

جنھوں نے سینہ کوبی کی یہاں حسینؑ کے غم میں
انہیں عرشِ بریں پر جائیں گے خود مصطفےٰ لے کر

یزیدی فوج نے چاروں طرف سے شبیر کو گھیرا
چلے عباس گویا مشک میں آبِ بقا لے کر

بجھائی پیاس اکثر ظالموں نے آبِ پیکاں سے
جب آئے گود میں اصغرؑ کو شاہِ کربلا لے کر

شہادت راہِ الفت میں سند ہے استواری کی
سند ایسی کہ آنکھوں سے لگائیں انبیاء لے کر

صداقت مسکرائی عزم نے بڑھ کر قدم چومے
چلے کوفے کو جب شبیرؑ اپنا قافلہ لے کر

مقدس ہو گئی کس کے لہو سے یہ کہ اک عالم
لگاتا ہے جبیں سے اپنی خاکِ کربلا لے کر
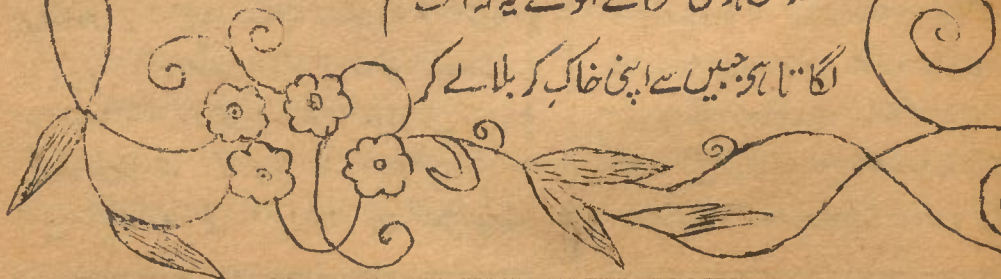
حسین علیہ السلام اور یزید کا کردار غیر مسلموں کی نظروں میں

(از جناب سید قمر رضا صاحب بارہ بنکوی اسسٹنٹ کورٹ آفیسر ہائیکورٹ الہ آباد)

—— (۱) ——

تاریخ عالم میں مسلمانوں کا لاڈلا خلیفہ یزید ابن معاویہ اپنے سیاہ کارناموں کے سبب بدنام ہے، شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جس نے تاریخ نویسی کے فرائض انجام دیے ہوں اور مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیا ہو۔ اس وقت یزید کے بدترین اعمال کا ذکر نہ کیا ہو، یورپ کے مشہور مؤرخین ہوں یا ہندوستان کے ماہر تاریخ داں، ایران کے مشاہیر اہل اسلام ہوں یا عرب کے علمائے کرام بلاتفریق قوم و ملت ان سب نے اس کا ماحول، کیرکٹر، جذبات، سیاست دانی کو حقیقت کے آئینے میں پیش کیا ہے۔

آج کراچی سے نکلنے والا "اردو" اخبار ہو یا اس کا نام نہاد اڈیٹر ادیب زمانہ، کتاب "الحسنین" کا تبصرہ نگار ہو یا اس کا حامی مددگار بابائے اردو، اس کی اس ذہنیت پر دنیائے انسانیت لعنت و ملامت کرے گی کہ جس نے زمانہ بھر کے بدنام شخص کی قصیدہ خوانی ایسے سے مقابل میں کی جو فضل و شرف، عزت و مرتبہ، رفعت و بزرگی، زہد و تقویٰ، سیاست و تدبر، اخلاق و عادات، حسب و نسب، گفتار و رفتار، نفس کی طہارت، کردار کی پاکیزگی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

کاش کہ "یزید" ہی کی مدح سرائی کی جاتی لیکن اس کی قصیدہ خوانی میں "الحسین" کے تبصرہ نگار نے حسینی اقدام کو غلط، ضد، ہٹ دھرمی پر محمول کیا ہے اور یزید جو خلیفۂ اسلام اور امیر المومنین بنا بیٹھا تھا اس کو شرع کا پابند ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، اب یزید چونکہ جانشین رسولؐ بنا دیا گیا تھا اس لیے اس کی مدح سرائی سیاست کا تقاضا ہو سکتی تھی۔ اور بالفرض آج کی دنیا میں بھی یزید پرستی کی اگر ضرورت تھی تو "یزید" ہی کو "حسین علیہ السلام" سے افضل ٹھہرانے کی کوشش "ناکام کی جاتی" لیکن تبصرہ زیر بحث میں "حسین" سے افضل و اعلیٰ دیگر شخصیتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔

اس بحث میں تقریباً بھی رسالہ ہمارے منظر عام میں سپرد قلم کیے گئے ہیں اول یزید اور اس کا ماحول" (۲) "یزید اپنے اشعار کے آئینے میں" (۳) "یزید اور یزیدیت کی دائمی پشیمانی" (۴) "یزید مشاہیر اہل سنت کی نظروں میں جو انشاء اللہ رضا کار۔ شیعہ۔ آستانہ اور آئینہ قسمت" لاہور کے محرم نمبروں میں بالترتیب دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس مضمون میں یزید کو غیر مسلموں کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قارئین اندازہ کر سکیں کہ "یزید کو خلق خدا غائبانہ کہتی کیا ہے"۔

—— (۲) ——

بانوشنکر سہائے صاحب سری واستو جوہر بلگرامی بی اے ایل ایل بی وکیل نے پیغام اتحاد میں لکھا ہے کہ یزید نشۂ نخوت میں چور تھا دنیاوی جاہ و جلال کے غرور نے اس کو الیا متوالا بنا دیا کہ اس نے تخت خلافت پر شاہدان تو بہ شکن کے جھنجھٹ میں بد مست بیٹھ کر امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ اس معاملہ میں اس قدر وہ حد سے گزرا کہ امام حسینؑ کو بھی بیعت کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ امام حسینؑ کی ایسی پاک اور مقدس ہستی اس ننگ کو کہاں تک گوارا کر سکتی تھی ظاہر ہے انھوں نے اس بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر دس محرم ۶۱ھ کو آپ مع رفقائے کے راہ رضا میں شہید ہوئے۔ اس شہادت سے اسلام پر جو اثر پڑا وہ ظاہر ہے رسول اسلام بانی اسلام ضرور تھے مگر اس کی بقا کا سہرا حسینؑ ہی کے سر رہا...... اگر اس شہید راہ خدا نے گلشن اسلام کو اپنے مقدس خون سے سینچ کر اس کو سدا بہار نہ بنا دیا ہوتا تو اسلام مٹ گیا ہوتا، برباد ہو گیا ہوتا، معدوم ہو گیا ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیائے انسانیت

کی حیات کا گل سرسبد جناب حسینؑ ہی کے نورانی کارنامہ کو کہا جا سکتا ہے جو اب تک ہمارے لیے شاہراہ زندگی میں شمع ہدایت کا کام کر رہا ہے۔

اسی طرح دیوان بہادر کے، ایم جھویری سابق چیف ڈین فیکلٹی آف لا بمبئی نے "ہندو قوم اور عزاداری" میں تحریر فرمایا ہے کہ کربلا کا واقعہ اتنا دردناک ہے کہ کوئی شخص اس واقعہ کو بلا یزید سے نفرت کے نہیں سن سکتا۔ یہ پہلا سبب ہے دوسرا سبب اس عظیم جد و جہد کی اہمیت کا ہے۔ خدا کے حامیوں فوج باطل کے عساکر سے ٹکرائی اور وقتی طور پر باطل کے فوج کو فتح بھی نصیب ہوئی۔ امام حسینؑ جانتے تھے کہ جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا مگر پھر وہ یزید سے کیوں لڑے؟ انھوں نے حق و صداقت کی خاطر جنگ کی۔ اس تمام عہد میں ان کی اعلیٰ مثال تاریکی اور نور کی شمع بن کر روشنی پھیلا رہی ہے۔

سرفراز یکم مارچ ۱۹۴۲ء میں رائے بہادر مسٹر شیام نندن سہائے ایم۔ ایل۔ سی۔ چیرمین میونسپلٹی مظفرپور نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کی تہذیب و دبدبہ کی قوت امام حسینؑ کے کوہ آسا عزم و استقلال کو ایک انچ نہ ہٹا سکی۔ آپ نے روحانیت کی طاقت دکھا کر مادیت کی بنیاد کو جسے یزید اور اس کے اعوان قائم کر رہے تھے فنا و برباد کر دیا۔ اور اسی لیے ہمیشہ ہندو مسلمان حسینؑ کے کارنامے کو اپنے طریقہ پر یاد کرتے رہیں گے۔

یہ دو چار اقتباسات بھی "حسینؑ اور یزید" کے فرق کو واضح طور سے نمایاں کر رہے ہیں، پھر بھی چونکہ انھیں تاریخ دانی پر پورا پورا عبور حاصل نہیں ہے۔ اسی لیے ان کے بیانات کو سند کی شکل میں پرستاران یزید شاید قبول نہ کریں اس واسطے ضرورت ہے کہ اپنے توثیق بیان کے لیے کچھ مزید تاریخی حقائق پیش کیے جائیں۔ لیکن وہ بھی "غیر مسلم" ہی کے قلم سے ہوں تاکہ یہ نمائشی مسلمان کچھ شرم محسوس کر سکیں۔

—— (۳) ——

تعمیر اخبار فیض آباد مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۲ء میں مسٹر ترمن لال صاحب ایڈوکیٹ نے یزید کو برائیوں کا مجسمہ بتاتے ہوئے لکھا کہ خداوند کریم کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ بنی نوع انسان کی حالت گرتی چلی جائے اس لیے مختلف اوقات و مقامات میں کچھ ایسی ہستیاں نمودار ہوتی ہیں جو انسان کو گڑھے سے نکال کر عمدہ مثالیں دے کر راہ راست پر لاتی ہیں۔ چنانچہ حسینؑ بھی ان ہی ہستیوں میں سے تھے۔ انھوں نے کربلا میں جو کچھ کیا وہ ملکی جنگ کے لیے نہ تھا بلکہ اصولی کی لڑائی تھی۔ وہ صرف بہتر آدمیوں کے ساتھ تھے جن میں ہر عمر کے انسان تھے اور چھ ماہ کا بچہ بھی تھا اور عورتیں بھی ساتھ تھیں۔ حسینؑ نے اپنی آنکھ سے ہر ساتھی کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ حسین کو صرف اتنا ہی کہنا تھا کہ یزید خلیفہ ہے۔ جان بچ جاتی۔ لیکن راستی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے اس لیے حسینؑ نے جان و مال قربان کرنے میں کچھ رعایت نہ کی۔ جب تک دنیا قائم ہے حسینؑ کا نام باقی رہے گا۔ حسینؑ کے ساتھیوں نے جان دے کر عظمت قائم کی۔ یہ سبق کچھ اہل اسلام کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اس سے تمام بنی نوع انسان مستفید ہو سکتے ہیں۔ ہم کو حسینؑ اور ان کے ساتھیوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ یزید مجسم نمونہ برائیوں کا تھا۔

جناب بابو نرنک نام صاحب بیتوا سنٹرل انڈیا ٹیڈیٹ کمو ۔۔۔ ۱۰ فروری ۱۹۳۹ء کے آزاد لکھنؤ میں صاف طور سے کہا کہ یزید ۔۔۔ بیعت لینا چاہتا تھا۔ مگر حسینؑ نے اس ننگ دنیاوی زندگی پر موت کو ترجیح دی اور دنیا والوں کو بتلا دیا کہ ذلت اختیار کرنے سے موت بہتر ہے۔ افسوس مسلمانوں نے اپنے رسولؐ کے نواسے کی یہ قدر کی۔ اگر آپ ایسا محبوب صفات ہم اہل ہنود میں ہوتا تو خدا جانے ہم اس کو کیا سمجھتے اسلام کو یزید کے باپ دادا نے نہیں پھیلایا تھا بلکہ حسینؑ کے باپ دادا نے پھیلایا تھا۔ بظاہر حسینؑ کو شکست ہوئی اور ایسی شکست و ذلت مگر خدا جانے اس بستی میں کیا اثر تھا کہ جتنا پست کیا اتنا ہی بلند ہوا۔ حسینؑ کی شہادت خدا کا ایک قہر ثابت ہوئی۔

مسٹر جند اگر آف بمبئی غالباً پارسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں آپ نے سرفراز لکھنؤ مورخہ ۷ فروری ۱۹۴۲ء میں اپنا بیان بھیجا کہ حضرت امام حسینؑ نے اپنی زندگی سے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ انسانوں کے دلوں کے بادشاہ ہیں۔ اگر امام حسینؑ اس زمانہ کے خلیفہ یزید سے بیعت کر لیتے تو آج دنیا میں اسلام نظر نہ آتا اور وہ ملیامیٹ ہو جاتا۔ اسی

کی صورت مسخ ہو کر رہ جاتی۔ آپ کی شہادت سے ہم سب سے بڑا سبق یہ حاصل کر سکتے ہیں کہ کسی فاسق و فاجر کی چاہے وہ خلیفہ ہو یا پیر کوئی مسلمان بیعت نہیں کر سکتا۔

اہل بنگال بھی اپنی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست میں دنیا کی دیگر اقوام سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس سرزمین سے بڑے بڑے سیاست داں، سائنس داں، ادیب اور شاعر اٹھے اور اپنا نام رہتی دنیا کے لیے چھوڑ گئے۔ آئیے یزید کے متعلق دو ایک بنگالی سربرآوردہ شخصیت کے تاثرات کا اندازہ لگائیں۔

(۴)

"حسینؑ دی مارٹر" مطبوعہ پٹنہ ۱۹۳۱ء میں پروفیسر بی بی موزمدار ایم۔ اے پٹنہ یونیورسٹی نے کتنے واضح طور پر لکھا ہے کہ امام حسینؑ کی زندگی کا اہم سبق یہ ہے کہ باطل کو بہادری کے ساتھ روکنا چاہیے جب کہ دوسرے لوگ خاموشی سے یزید کے مظالم سے اتفاق کر رہے تھے تو امام حسینؑ نے اس کے خلاف بہادری کے ساتھ اٹھنے کا ارادہ فرمایا۔ آپ کو اچھی طرح اپنے قوی دشمن کے مقابلہ میں اپنی ظاہری طاقت کا علم تھا مگر یہ امر بنی امیہ کی بد اعمالی کے خلاف احتجاج میں مانع نہ ہوا۔ آپ کو خطرات کا علم تھا مگر یہ امر بنی امیہ کی بد اعمالی کے خلاف احتجاج میں مانع نہ ہوا۔ آپ کو خطرات کا علم تھا مگر آپ کے لیے ناممکن تھا کہ اپنی زندگی میں دنیاوی آرام کے لیے باطل سے صلح کر لیتے۔ موت اور اذیتوں سے خوف نہ تھا اور اپنے عزیز و اقارب کے سخت مصائب سے ڈر نہ سکتا سے اپنے مستحکم ارادے میں متزلزل نہ ہوئے کیونکہ آپ کو علم تھا کہ ہر چیز فانی ہے بجز ذات باری تعالیٰ کے جس نے اپنی قدرت سے تمام چیزوں کو پیدا کیا۔ اور جس کو وہ اپنی طاقت سے فنا کر دے گا۔ جو اس کے سامنے تنہا واپس جائے گی۔ میدان کربلا میں یزید ظالم تھا نہ کہ امام حسینؑ جنھوں نے موت گوارا کی۔ میدان کربلا نے اس کی زندگی کا آغاز دیکھا جو امام حسینؑ کے لیے غیر فانی ہے جو تمام عالم کے ساتھ ہے جس کی کوشش ظلم و ستم اور حقانیت کی فتح کے لیے ہے ہر مذہب میں شہدا موجود ہیں۔ مگر سوائے اسلام کے کسی مذہب کو امام حسینؑ ایسا شہید نصیب نہیں ہوا جن کی شہادت بنی نوع انسان کے لیے دائمی افادیت رکھتی ہے۔

اسی سلسلہ میں مسٹر کالی ہر پدا ابز جی نشاناتھ دراے کا بیان سن لیجیے۔

"میں مختلف زمانوں میں مذہب کی اشاعت کے لیے دنیا میں ظاہر ہوتا ہوں" یہ الفاظ کرشن جی نے گیتا میں کہے۔ حسب سابق تیرا سو برس پہلے بھی کچھ لوگ یزید کی سرکردگی میں مذہب اسلام کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت مقدس امام حسینؑ نے بڑی شجاعت سے صداقت اور مذہب کی حفاظت کے لیے میدان کربلا میں اپنی قربانی پیش کی۔ مادی لحاظ سے بظاہر یزید کو فتح ہوئی لیکن روحانی حیثیت سے اس نے سب کچھ کھو دیا وہ غلط اسلام جس کی کذب و دروغ پر بنیاد رکھنا چاہتا تھا جلد تباہ و برباد ہو گیا اور حسینؑ کی قربانی نے کامیابی حاصل کی اور اسی قربانی کی بدولت اسلام کی حقیقت کی از سر نو بنیاد پڑ گئی۔ کرشن جی نے اپنی جان ایک شکاری کے ہاتھ سے دی۔ حضرت عیسیٰؑ کی موت بھی بے شک حسرت ناک تھی۔ ان دونوں حضرات نے جو مذہبی نمونے قائم کیے وہ اب تک نسل انسانی کے لیے فائدہ رساں ہیں۔ مگر مقدس حسینؑ کی غم ناک شہادت یا قربانی نے تاریکیوں کو دور کر دیا اور ایک نئی روشنی سے تمام عالم کو منور کر دیا۔ حسینؑ کی قربانی نے ہزارہا مسلم و غیر مسلم ہر ایک میں یہ جذبہ پیدا کر دیا کہ وہ وقت ضرورت اپنے فریضہ کو پورا کرنے کے لیے موت سے ہم آغوش ہو جائے۔ پس آج کل جب کہ حب الوطنی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ آؤ ہم سب مل کر یہ دعا کریں کہ حسینؑ کی روح پرفتوح کو روز بروز عظمت و فتح نصیب ہو۔"

ان مندرجہ بالا اقتباسات سے کم از کم یہ ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ حسینؑ کی پوزیشن یزید کے مقابلے میں کیا تھی۔ "یزید" کیا تھا اور "حسینؑ" کیا تھے؟

(۵)

مسٹر گوپال کرشن گوکھلے ریاست دانی اور حب الوطنی میں ہندستان کے رہنمائے آزادی" مہاتما گاندھی جی کے بھی پیش رو تھے۔ آپ ہی کے فیض صحبت سے گاندھی جی سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ دنیا کی بڑی شخصیتوں میں گوکھلے کا نام لیا جاتا ہے۔ آپ کے تاثرات گو کہ مختصر ہیں لیکن یزید اور اس کے زمانے کو حقیقت بیں نظروں سے دیکھا ہے۔ اسلام کے ساتھ حسینؑ نے کیا کیا۔ اسے گوپال کرشن

گو لکھنے نے کافی غور و خوض سے سمجھا ہے۔

"اگر حسینؑ" اپنی شہادت سے اسلام کو از سرِ نو زندہ نہ کرتے تو یا اسلام مٹ جاتا، اور اگر اسلام کا وجود ہوتا بھی تو بے اصول و بے ترتیبا مذہب کی حیثیت سے جس کے اندر بڑی آزادی سے وہ سب بُرائیاں پھیل جاتیں جن کا رواج یزید اور اس زمانے کے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کا شعار ہو گیا تھا۔

ایس۔ ایل ۱۹ مارچ ۱۹۴۱ء مسلم عمر برانچ
کوآپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور

اسی طرح پروفیسر مسٹر بھولا ناتھ صاحب۔ ایم۔ ایس۔ سی لکھنوی نے ۷ فروری ۱۹۴۲ء میں محمود آباد کے جلسہ میں تقریر فرماتے ہوئے کہا "حسینؑ آفتاب کی طرح ہیں۔ اگر یزید حسینؑ سے معافی کا خواستگار ہوتا تو ضرور معاف کر دیتے، جیسے کہ حُر کو معافی مل گئی فوج کے قوانین کے تحت اندازہ کیجیے کہ حسینؑ کا یہ فرمانا کہ میرے ساتھ سے چلے جاؤ، عورتوں، بچوں کا ساتھ لانا یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ آپ جنگ کا ارادہ ہرگز رکھتے ہی نہ تھے میرا تو خیال یہ ہے کہ آپ درحقیقت جنگ روحانی لڑ رہے تھے۔ مسٹر فلپ نے کہا ہے کہ جنگ روحانی یہ ہے کہ اپنا سب کچھ دے دے اور نثار کر دے۔ دیکھیے علی اصغرؑ ایک ہیرا تھا، اس وجہ سے حسینؑ نے اس کو بھی پیش کر دیا۔ میں نے تلاش کیا تو آج تک مجھ کو یزید کے نام کا کوئی آدمی نہیں ملا۔ برخلاف اس کے حسین کے نام والے ہر جگہ موجود ہیں۔ میں حسینؑ کی شکست نہیں سمجھتا بلکہ ان کی فتح ہوئی اور تمام لوگوں میں دھوم مچی۔ حسینؑ کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا، برخلاف اس کے کہ رسول اسلام کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ان کا قول کچھ تھا اور عمل کچھ تھا۔ امام حسینؑ نے آخر وقت ہندوستان جانے کے متعلق کہا تھا کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ ہندوستان والے ہندو رحم کریں گے کیونکہ وہ گائیں کاٹنا بھی اور جیو مارنا بُرا سمجھتے تھے۔

مندرجہ بالا اقتباس ہر صاحب فکر کے لیے ایک مستقل درس ہے خصوصیت کے ساتھ الحسین کے تبصرہ نگار محمد احمد عباسی صاحب اور ان کے سرپرست ڈاکٹر عبدالحق دہلوی کے لیے جو یزید کی منقبت ہی کے نہیں بلکہ حسین علیہ السلام کے غلط اقدام کے بھی (معاذ اللہ) قائل ہیں۔ ایک غیر مسلم پروفیسر کا اندازہ ایسا ہو جو حقیقت پر مبنی ہے کہ آج کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ یزید لگانا پسند نہیں کرتا ہے۔ لیکن حسینؑ پر نام رکھنے والے کروڑوں کی تعداد میں صفحہ ہستی پر پھیلے رہے ہیں۔

اچھا آئیے اب وہ انسان جو "اچھوت" کی صف میں داخل ہیں۔ اُن کے بھی تاثرات کا جائزہ "حسینیت" اور "یزیدیت" کے متعلق سرسری طور سے لیتے چلیں پھر فیصلہ کریں کہ یہ یزید پرست مسلمان اچھے ہیں۔ یا "حسینؑ اور اسلام" کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے والے بہتر ہیں۔

سوامی کلجگ آنند سنیاسی اچھوت لیڈر کا بیان "حسینی پنتھ اچھوت" اخبار علی گڑھ میں لکھتے ہیں۔

"اونچ نیچ ذات پات اور چھوت چھات کی لعنت کو دور کرنے کا عملی ثبوت سبیل حسینی دیتی ہے جو دنیا اور دین سے واقف ہیں ان کی خوبصورت اور حسین آنکھیں امام حسینؑ کی فتح اور آپ کے گلہائے مبارک میں کامیابی اور جیت کا اندازہ کر چکی ہیں۔ خونِ ناحق جو دوسروں کے لیے ہوا تھا یزید کے دور [illegible] حسینؑ [illegible] میں اپنی دولت اور اپنی جانیں دینے کے وہ پہلے دن [illegible] ہو گئی تعداد ہونے لگی جو آج دنیا کے کونے کونے اور جنگلوں تک میں ہر ایک زبان میں طرح طرح سے آپ کی یادگار کروڑوں کی تعداد میں ڈنکے کی چوٹ سے باجے بجا کر آپ کے نام کو روشن کرنے کے لیے لاکھوں چراغوں سے روشنی کی جاتی ہے کیونکہ حسینؑ دنیا کو دیندار، ایماندار بنانے کا چراغ تھا۔ اور آج یزید کا کوئی نام لیوا نہیں، کوئی چراغ جلانے والا نہیں، حسینؑ کی شہادت قتل یزید کو یا یزید کی بادشاہت کو ختم کرنے کے لیے نہیں تھی۔ اس کو آپ اپنے خطبوں میں صاف کر گئے ہیں کہ یزیدی سسٹم یزیدی طریقہ اور یزیدیت کا رسم و رواج یعنی ظالمانہ حکومت، کنوئیں، نہروں سے پینے کے لیے پانی نہ لینے دینا وغیرہ وغیرہ ایسی حرکتوں اور بندشوں کو ختم کرنے کے لیے شہادت حسینؑ تمام دنیا کے انسانوں کو سبق دیتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ کے بہتر (۷۲) ساتھیوں میں اچھوت بھی شریک تھے جنھیں نے اپنی گردنیں کٹوا کر حسینؑ کے مشن کا ساتھ دیا۔"

اسی اخبار میں جناب رام سروپ صاحب اڈیٹر آزاد ہند لکھنؤ نے کیا اصول قائم کیا ہے، حسینؑ و یزید کے دو واضح راستے اپنے مختصر الفاظ میں پیش کر دیئے ہیں جو دیکھئے کتنے حقیقت افروز ہیں ہاں ہاں ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے بھی کچھ اصول قائم کئے ہیں۔ موصوف نے کسی سے فرمایا تھا کہ مومن ہونے کی تین علامتیں ہیں اُردو سے محبت کرتا ہو، اصلی گھی کھاتا ہو، اور شیعہ سے نفرت کرتا ہو۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بلکہ آپ نے اپنے ایک حنفی مسلمان دوست سے کہا کہ یہ سُنی وُنی کوئی مذہب نہیں ہے۔ بس یا شیعہ ہو یا خارجی۔

کتنی پتے کی بات ڈاکٹر موصوف نے کہی ہے اگر یہی دو مذہب نمایاں طور سے ہو جائیں تو ہمیں بھی شکایت کچھ نہ ہو لیکن افسوس "مُسلم" کی نقاب جو یزید نے اوڑھ رکھی تھی وہی ڈاکٹر صاحب اور اُن کے دوسرے ہم نوا ہمسفر "الحسین" اوڑھے ہوئے ہیں۔ بہرحال یہ جملۂ معترضہ درمیان میں آ گیا۔ جناب رام سروپ کے اصول کی وضاحت مختصر الفاظ میں بتانا چاہتا تھا۔ سنیئے۔

"دریا، کنوئیں، نہر، تالاب سے پانی پینے کی روک تھام کرنا یہی طریقۂ یزیدی ہے۔ اسی طریقے کو مٹانے کا رستہ امام حسینؑ نے اپنے خون میں نہا کر گردن کٹوا کے بتلا دیا۔

(حسینی پنتھ اچھوت اخبار علی گڑھ)

(۷)

آیئے مشہور واقعات مسٹر پریم چند صاحب مرحوم کے تاثرات کا جائزہ لیں، ڈاکٹر عبد الحق خواہ کتنے ہی بلند ادیب ہوں لیکن پریم چند مرحوم کی طرز نگارش کے ضرور قائل ہو گئے، اس کے علاوہ جو بنیاد اُردو اور ہندی میں مرحوم قائم کر گئے ہیں اس کے اوپر قیامت تک عمارتیں بلند ہوتی رہیں گی۔ دیکھئے واقعات کربلا اور یزید کے کردار پر کن الفاظ میں روشنی آزاد ۱۲ فروری ۳۶ء میں ڈالی ہے۔

معرکۂ کربلا دنیا کی تاریخ میں پہلی آواز ہے اور شاید آخری بھی جو مظلوموں کی حمایت میں بلند ہوئی اور جس کی صدا آج تک فضائے عالم میں گونج رہی ہے۔ حسینؑ کو خلافت کی محبت کو نہیں لائی تھی۔ نہ وہ جنگ کے ارادے سے آئے تھے۔ اگر انہیں یزید سے جنگ کرنا ہوتی تو لاؤ لشکر سے آتے۔ حکمرانی اور ملک گیری کی ہوس نہ ان کو تھی نہ اُن کے نفس عالی کو ڈانواڈول کر سکتی تھی۔ وہ تو کوفیوں کی دعوت پر محض امر حق کی دستگیری کے لیے آئے تھے اور جان بوجھ کر آئے۔ اس معرکے کا انجام ان سے پوشیدہ نہ تھا وہ خوب جانتے تھے کہ یہ بالآخر موت کا پیش خیمہ ہے۔ اصول نے کبھی اتنی شاندار قربانی نہیں پائی۔ یہ ایثار و قربانی کی زندۂ جاوید داستان ہے۔ اسے معرکہ کون کہے گا۔

ایک طرف کل ستّر بہتّر ذی روح جس میں زیادہ تر بوڑھے ضعیف حسینؑ کے بچے اور بیمار ہیں۔ دوسری طرف ایک فوج عظیم ہے ٹڈی دل سامان حرب سے لیس۔ حسینؑ کے ایثار و قربانی کے لحاظ سے یہ سانحہ بے مثال ہے جس نے بنی امیہ کے ظلم و استبداد کو بنیاد تک سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ حسینؑ پست ہو کر اُبھرے اور ایسا کہ آج کروڑہا نفوس پر ان کی حکمرانی ہے۔ یزید اُبھر کر ایسا پست ہوا کہ آج تک، ہر انصاف پسند شخص اس پر لعنت کرنا فرض انسانیت سمجھتا ہے اگر حسینؑ شہادت کو گوارا نہ کرتے تو اسلام کا تختہ یزید ہی اُلٹ دیتا۔ مگر اے حسینؑ تو بڑا جواں مرد اور سیاست داں تھا۔ تو نے موقع کی نزاکت کو خوب سمجھا۔ تو نے اپنے اور اپنے عزیزوں کی جانیں دے کر صرف اسلام ہی نہیں بلکہ انسانیت کی لاج رکھ لی۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان کہتے ہیں ہمارا حسینؑ، نصاریٰ کہتے ہیں ہمارا حسینؑ، یہودی کہتے ہیں ہمارا حسینؑ اور اہل ہنود کہتے ہیں۔ ہمارا حسینؑ اے مظلوم حسینؑ! اے عزیزوں کے رکھوالے اے حسینؑ تجھ کو عاشور کے دن نام نہاد مسلمانوں نے پانی نہیں دیا مگر آج سرزمین ہند پر دیکھ کہ تیرے نام پر مرنے والے مسلم و غیر مسلم تیرے نام کی سبیلیں کھول کر پیاسوں کو پانی پلاتے ہیں۔ عزیب وہ بے وطن حسینؑ تجھ کو یزید نے بعد شہادت دفن نہ ہونے دیا۔ آ۔ اور آ کر دیکھ کہ کتنے کروڑ دل آج تیری قبر بنے ہوئے ہیں"۔

پریم چند مرحوم اگر زندہ ہوتے تو میں بھی اُن سے عرض کرتا کہ بے شک کروڑوں انسانوں کے دل میں قبر حسینؑ بنی ہے لیکن آپ اگر اور حقیقت بین نظروں سے جائزہ لیتے تو نام نہاد (شائی) مسلمان کے دلوں میں بھی آپ کو یزید کی قبر ملتی۔ یہ ضرور ہے کہ

آج دنیا میں یزید کی قبر کا پتہ نہیں ہے۔ لیکن حیرت دہلوی اور ان کے ہمنوا اپیر اس دور میں ڈاکٹر عبدالحق دہلوی اور ان کے دست راست محمود احمد عباسی تبصرہ نگار الحسین ایسی شخصیتیں موجود ہیں جو یزید کی مفروضہ قبر اپنے دلوں میں بنائے ہوئے ہیں۔

اچھا اب آیئے ایک مقدمہ کا فیصلہ سن لیجئے جو کسی مسلم کے اجلاس سے نہیں بلکہ انصاف پسند ہندو کے اجلاس سے ہوا تھا عالی جناب پنڈت ٹھاکر پرشاد دوبے ایم اے ایل ایل بی منصف جونپور کے اجلاس سے مقدمہ نمبری ۵۶۵ میں بتاریخ ۲۰ جولائی ۱۹۳۸ء کو فیصلہ دیتے ہوئے کتنے واضح الفاظ میں تحریر فرمایا ہے۔

"یزید اپنے باپ سے بدتر تھا، یہ یزید ہی تھا جو واقعہ کربلا کا ذمہ دار تھا، یہ حادثہ تاریخ کا بدترین واقعہ ہے جب کہ یزید اپنے باپ کے مرنے کے بعد تخت پر بیٹھا تو اس نے پورے طور پر محسوس کیا کہ اس کا عروج اسلامی دنیا کی رضامندی پر نہیں ہے، اور خلفاء کے انتخاب کے اصول پر بھی جو اب تک مروج رہا ہے نہیں ہے، وہ جانتا تھا کہ سچے مسلمان کا دل نبیؐ کے نواسہ امام حسینؑ کی طرف لگا ہے اور وہ محسوس کرتا تھا کہ امام حسینؑ کی زندگی میں اس کا پوزیشن غیر محفوظ ہے اسی وجہ سے اس نے ان پر فتح پانے کی کوشش کی، یا تو اپنی سرداری ان سے منوائے یا ان کو قتل کرے اسی وجہ سے اس نے امام حسینؑ سے بیعت لینے کے لئے اپنے آدمیوں کو بھیجا، یزید اس وقت اسلامی دنیا کا محض سیاسی بادشاہ ہی نہیں تھا بلکہ اپنے اس کفر کا محافظ اور مبلغ بھی تھا، جو اس کے باپ معاویہ نے نئے اسلام کے لباس میں دمشق میں جاری کیا تھا۔ امام حسینؑ نے محسوس کیا کہ اسلام کے ہر قابل غور اصول سے سلطنت ان کی ہی تھی اور ان کا حق مادی طاقتوں سے سب سے زیادہ نالائق آدمی نے چھینا تھا، انھوں نے اس کا بھی احساس کیا کہ یزید کے پاس عہدۂ خلافت رہنے سے سب سے بڑا حادثہ یہ ہوگا کہ نبیؐ کا اسلام ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا اور کفر جس کے اکھاڑنے کے لئے جناب رسالتمآبؐ نے کوشش کی تھی، پھر دوبارہ اسلام کے بھیس میں جس کو یزید قائم اور سنبھالے ہوئے ہے، عروج پا جائے گا اسی لئے امام حسینؑ اپنے نانا کے دین کی تباہی کو برداشت نہ کر سکے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یزید کی بیعت کو قبول کرنے سے یزید کی ماتحتی بحیثیت دنیاوی بادشاہ کے ہی نہیں ہے، اسی سے اسلام کی پاک امانت کا بھی انکار تھا جس کے اب صرف وہی آخری امین تھے، اسی وجہ سے انھوں نے بیعت سے انکار کر دیا، وہ یزید کی غاصبانہ خلافت سے متفق نہ تھے، ان کو اپنے نانا کے دین کے تحفظ کا احساس تھا اور یہ یقین تھا کہ شہید کا خون مذہب کی بنیاد ہوتی ہے، اس کے بعد واقعہ کربلا ظہور پذیر ہوا۔ امام حسینؑ کی شخصیت زمانہ قدیم کے آسمان پر مثل ستارۂ درخشاں کے ہے اور صبح اسلام میں نسل انسانی کی بے مثال فائدہ پہنچانے والی ہستی ہے حسینؑ تمام دنیا کے بڑے سے بڑے شہیدوں کے مقابلہ میں بالاتر ہیں"۔

اس مقدمہ کی روداد کو ہر انصاف پسند پڑھ سکتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ حسین علیہ السلام، عزت و شرافت صبر و رضا کے مجسمہ تھے اور یزید ظلم و شقاوت بے رحمی و سنگدلی کا تپلا تھا اس کا تقابل ہی حسینؑ سے خلاف عقل ہے بلکہ اس کا نام ہی حسینؑ کے ساتھ لیا جانا باعث ننگ و شرافت لیکن جس طرح ابراہیمؑ کے ساتھ نمرود و موسیٰؑ کے ساتھ فرعون، پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ ابولہب و ابوجہل کے نام آتے ہیں ویسے ہی حسین کے ساتھ یزید کا نام بھی درست ہے۔

میرا یہ مقالہ بہت طویل ہوتا جا رہا ہے لیکن شاید غیر مسلموں کے اتنے اقتباسات یزید نوازوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہوں۔ حالانکہ یہ کافی تو میں بخیال خود لکھ رہا ہوں ورنہ ان یزید پرستوں کے لئے "کافی" کوئی چیز نہیں ہوتی ہے گو کہ "الحسینؑ" کے تبصرہ کے خلاف پاکستان کے اخباروں میں خصوصیت کے ساتھ احتجاجی مقالات شائع ہوئے خاص کر کے جناب آغا سلطان مرزا صاحب کا پُرمغز مقالہ حرف آخر اس سلسلے کی بحث کا ہے مگر پھر بھی مولوی عبدالحق صاحب دہلوی نے اپنی غلطی نہ تسلیم کرتے ہوئے بالکل یزید کی تاسی کی ہے جس نے قتل حسینؑ کی ذمہ داری ابن زیاد پر ڈالنے کی ناکام کوشش کی تھی بالکل اسی طرح ڈاکٹر صاحب موصوف نے جواباً فرمایا ہے کہ ہمارا رسالہ سب کے لئے ہے اور کسی خاص طبقے یا فرقہ سے تعلق نہیں رکھتا جو صاحب اس تبصرے کے متعلق کچھ دریافت فرمانا چاہیں وہ مولوی محمود احمد عباسی صاحب کو مکان ۱/۲۶ اے سیکشن لالوکھیت کراچی سے مل کر یا خط وکتابت کر کے دریافت کر سکتے ہیں۔

ذمہ داری کا اپنے اوپر نہ لینا ہی احساس شکست ہے ورنہ

ڈاکٹر صاحب فخر کے ساتھ جواب دے سکتے تھے اور یزید اور یزید کی شان میں دو چار قصیدے مزید لکھ ڈالتے بہرحال میں اپنے اس مقالہ کو مسٹر سی ایس رنگا آر سابق ایم ایل اے سنٹرل کے پرمغز بیان پر ختم کر رہا ہوں۔

اگر حسینؑ کی زندگی اور قربانی کے مقصد اعلیٰ کو سمجھ لیا جائے تو ہر ہندو، شیعہ، سنی اور ہر ایک انگریز بالکل اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ پست سیاست حسینؑ کی نظر میں بیکار تھی حسینؑ اپنے دشمن کی فوج میں تفرقہ اندازی یا پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کا خیال ہی ان کے دماغ میں نہ تھا وہ تو اپنے ہی ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ متفرق ہو جاؤ اور میرے ساتھ اپنی جان نہ دو مگر ان کے مٹھی بھر اصحاب باوفا کے قدموں کو جنبش ہی نہ ہوئی اور اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک ان کا ساتھ دیا نہ موت کی تلخی اور نہ حیات کی شیرینی ان کو اپنے آقا سے جدا کر سکی اس لئے کہ وہ لوگ حسینؑ میں تجلیات الٰہی کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ حسینؑ دنیوی مقاصد رکھتے ہی نہ تھے بس ان کا مقصد یہ تھا کہ مستقبل میں تاریک اور یزید پرست دنیا کے لئے ایک مثالی انسان، ایک نور ہدایت اور ایک غیر فانی رہنما ہو کر رہیں۔ انھوں نے موت کو خود دعوت نہیں دی لیکن یزید کی بیعت اور اپنے ضمیر کا خون کر کے زندہ رہنا بھی ان کو گوارا نہ تھا وہ صرف اپنے ضمیر کے پابند تھے جو اس فرمانروا یزید کو تسلیم نہ کرتا تھا اس لئے کہ وہ نا اہل فاسق اور اسلام سے کوسوں دور تھا وہ یکسوئی کنارہ کشی اختیار کر لیتے اگر یزید شیطان کا بندہ نہ ہوتا بلکہ حسینؑ کی طرح خدا کا برگزیدہ بندہ ہوتا اگر حسینؑ کو حکومت ملتی تو ان کی حکومت زمین پر آسمانی حکومت ہوتی تاہم مرنے کے بعد بھی وہ ایسی حکومت کر رہے ہیں جو کوئی حکمران نہیں کر سکتا۔ وہ لازوال تخت و تاج کے مالک ہیں۔ وہ ہمارے غیر فانی بادشاہ ہیں انھوں نے فطرت انسانی کو غیر محدود وسعت عطا فرمائی ہے حسینؑ کے دنیا دار آسمان کے ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں نسل انسانی جب تک کہ صفحۂ ہستی سے خود نہ مٹ جائے ان کے کارناموں کو فراموش نہیں کر سکتی۔

حسینؑ اپنی قوت ارادی کا بادشاہ اپنی قسمت کے سفینہ کا ناخدا حسینؑ جن کی صداقت محاسن اور عظمت کے منارہ کی طرح ابدالآباد تک تمام طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے قائم ہے حسینؑ ایسی یادگار میں جس سے زندگی برستی ہے وہ کربلا میں کیا خوب لڑے ہیں ایسا دوسرا لڑنے والا پیدا ہی نہیں ہو۔ حسینؑ فانی انسانوں کی دنیا کے آدمی نہیں تھے ان کا واسطہ حی و قیوم سے تھا، حسینؑ زمین پر خدائی احکام کے ترجمان تھے یہی وجہ ہے کہ آج ہم مثل بچوں اور یتیموں کے روتے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ آنسوؤں سے کسی کا کام نہیں چلتا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گریہ و ماتم المناک نمائش ہے مگر واقعہ کربلا کے اذکار اور حسینؑ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے آنسوؤں کے دریا بہہ جاتے ہیں یہ گریہ و زاری بیکار نہیں جاتی اور نہ کوئی لاحاصل نمائش ہی ہے بلکہ یہ آنسو ہماری قوت حیات اور زندگی کا سرچشمہ ہیں یزیدیت کی خاک۔ جو ہم میں اور ہمارے ہر چہار جانب جمع ہوتی رہتی ہے اسے سال بسال دھونا ضروری ہے جو آنسو ہم حسین کے لئے بہاتے ہیں وہ ملک کو ہمارے نفسوں کو سب کو پاک کر دیتے ہیں اس لئے ہمیں جی بھر کے رونا چاہیئے آؤ ہم اپنے آنسوؤں سے امام حسین کے پاؤں دھلائیں ہم بچے اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے ہیں کہ اپنی مختصر اور غمگین زندگی میں روئیں اور رو کر اپنے کو ان کی نظر میں اہل ثابت کریں جو ان کی حیرت انگیز قربانی کے شایان شان ہو اپنی غلطیوں کا اعتراف اس سے بہتر کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ عقیدت کے آنسو بہائیں۔

خداوندا۔ ہمیں یزیدیت کی ضلالت و گمراہی سے دور رکھنا ہمیں حسینؑ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق اور ان کے زبردست ایمان میں سے شمہ بھر مرحمت کرنا جو پہاڑوں کو متزلزل کر دینے والا تھا۔"

(مون لائٹ ۲۸ر جنوری ۵۶ء)

کاش کہ ہوا خواہان یزید غیر مسلموں کے اس تبصرے کے آئینہ میں حسین علیہ السلام اور یزید بدکردار کا موازنہ نہ کریں لیکن وہ تو بانو سید پوری کے اس شہرہ آفاق قطعہ کے مصداق ٹھہرتے ہیں ؎

واللہ عجیب چیز ہے یہ صنف بشر!
شیطان سے بدتر ہے ملک سے بہتر
بڑھنے جو لگا تو بڑھ کے شبیرؑ بنا
گھٹنے جو لگا بنا یزید خودسر!

بعد کربلا کے

از شاعر مودت جناب رزم ردولوی

احساں حسینؑ کا ہے رسولؐ خدا کے بعد
اسلام درد بن کے بڑھا کربلا کے بعد

کیا ہوگا کچھ خبر بھی ہو تجھ کو قضا کے بعد
سب سے بڑا سوال نبیؐ و خدا کے بعد

بعد نبیؐ علیؑ یوں ہیں مولائے خلق ہیں
مولائے خلق جیسے نبیؐ ہیں خدا کے بعد

دنیا سے پھر حقیقت ایماں نہ چھپ سکی
شبیرؑ کی شہادت پردہ کشا کے بعد

فتح یزید ہو کے رہی اک شکست بد
اسلام سرخرو ہوا خون وفا کے بعد

بعد حسینؑ سبط پیمبرؐ کوئی نہیں
امکان کربلا کا نہیں کربلا کے بعد

کیوں شان منفرد نہ ہو ذبح عظیم کی
پھر کوئی کربلا نہ ہوئی کربلا کے بعد

قربانی حسینؑ کے قربان جایئے
اسلام زندہ ہو کے رہا کربلا کے بعد

خونی کفن کسی پہ نہ اس طرح پھر کھلا
اے جامہ زیب فاطمہؑ تیری ادا کے بعد

صبر و رضا کی قوت تسخیر و انقلاب
دنیا نسمجھ سکی ترے صبر و رضا کے بعد

شاہی بنی اُمیہ کو جس پر بہت تھا ناز
وہ بھی رہی نہ کشتۂ جور و جفا کے بعد

دل تھے وفا کے حسن کرامت سے بے خبر
آنکھیں کھلیں حیات کی تیری وفا کے بعد

اسلامیت جہان میں پروان چڑھ گئی
بیٹے نہ اہل بیت نبیؐ کربلا کے بعد

بازار شام و کوفہ کے تھے معرکے نہ کم
عابدؑ کو کربلا ہی ملی کربلا کے بعد

وہ فاتح فرات ہے سقائے تشنہ کام
قطرہ وفا کا بحر ہے جس کی وفا کے بعد

ظالم کی سلطنت کا جنازہ نکل گیا
تشہیر اہل بیت رسول خدا کے بعد

ماں کا مباہلہ ہے تو بیٹی کا نشر غم
زینبؑ بھی حق کی محسنہ ہو فاطمہ کے بعد

شادی و غم جہان میں توام سہی مگر
خوش ہو سکی نہ آل نبیؐ کربلا کے بعد

اپنے خدا سے مانگنے میں جائے کیوں وقار
بڑھتی ہو رزم اور شرافت دعا کے بعد

طاقتِ شبیرؑ

خاص محرم نمبر کے لئے

از جناب خاور نوری، حیدرآباد دکن

زہے شہادتِ شبیرؑ و عظمتِ شبیرؑ
کہ آج دینِ خدا ہے امانتِ شبیرؑ

ابھی نگاہ بشر پر ہیں سیکڑوں پردے
چھپی ہوئی ہے ابھی تک حقیقتِ شبیرؑ

ہر ایک رخ سے پُر آشوب انقلاب آئے
بدل سکے نہ اصولِ حکومتِ شبیرؑ

اگر حسینؑ نہ ہوتے بشر کہاں ہوتا
یہ آبروئے بشر ہے عنایتِ شبیرؑ

کسی کی ہمتِ دل سے مقابلہ کیسا؟
بہت بلند ہے معیارِ ہمتِ شبیرؑ

وہ خوش نصیب کہاں راہ ناصواب کہاں
اٹھی ہو جس پہ نگاہِ محبتِ شبیرؑ

ہر ایک قوم کے مانے ہوئے شہیدوں نے
قدم اٹھائے ہیں زیرِ قیادتِ شبیرؑ

کلام حق کی صداقت صداقتِ شبیرؑ
رسالتوں کا خلاصہ امامتِ شبیرؑ

لطیف طرزِ تکلم لطیف ارشادات
دلوں پہ نقش ہے ایک ایک آیتِ شبیرؑ

نظر کی حد سے تھی باہر پسر کی قربانی
خلیل کو نہ ملی استقامتِ شبیرؑ

وہی اصولِ ہدایت وہی طریقِ عمل
رسالتِ نبوی ہے امامتِ شبیرؑ

وہ یادِ حق میں ہو دونوں جہاں سے بے پروا
ابھی ہے دونوں جہاں کو ضرورتِ شبیرؑ

کسی طرح نہ دلِ کائنات ڈوبے گا
بروئے کار ہے جب تک حرارتِ شبیرؑ

ہجوم خنجر و شمشیر دم نہ مار سکا
کھلی جہاں بھی زبانِ مودتِ شبیرؑ

مقام صبر میں ایثار کے منازل میں
خدا گواہ مسلّم ہے وحدتِ شبیرؑ

ذرا بھی بارش تیغ و سناں سے کم نہ ہوا
بڑھا کچھ اور متاعِ عبادتِ شبیرؑ

یزیدیت کا رہا نادرست اندازہ
لہو بہا تو بڑھی اور طاقتِ شبیرؑ

وہاں ملیں گا قیامت کے روز لے نما در
جہاں ہو سایۂ دامانِ رحمتِ شبیرؑ

لبوں پہ اہلِ فصاحت کے لگ گئیں مہریں
زہے جمال و جلالِ خطابتِ شبیرؑ

ہر ایک قوم میں شبیریت کا چرچا ہے
ہر اک فضا میں ہے ذوقِ شریعتِ شبیرؑ

یہ سنتے ہیں دلِ قاتل بھی ڈوب ڈوب گیا
زہے تلاطمِ رعب و جلالتِ شبیرؑ

عمل کی راہ میں شبیرؑ کے پرستارو
قدم اٹھیں نہ خلافِ طبیعتِ شبیرؑ

نثر خوانی کی ایک مجلس

جناب سید نجم الحسن صاحب رضا نقوی نثار لکھنؤ

جیسا کہ ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں نثر خوانی کا فن جسے سید فدا علی صاحب نثار اور میر ولایت حسین صاحب نثار مرحومین نے ترقی کے خط نصف النہار پر پہونچا دیا تھا اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ پورے برصغیر ہندوستان و پاکستان میں اسوقت سوائے سید نجم الحسن صاحب رضا نقوی نثار کے اس فن کا جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ فن ذاکری بڑا پسندیدہ مقبول اور موثر ہے چنانچہ اسوقت نجم الحسن صاحب ملک کے چوٹی کے ذاکروں میں شمار ہوتے ہیں اور اسوقت اس میدان میں کوس لمن الملک بجا رہے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نئے نثر خواں پیدا نہیں ہو رہے ہیں اور اسوقت سوائے نجم الحسن صاحب کے کوئی دوسرا شخص اس فن کا جاننے والا موجود نہیں ہے۔ اگر ہمارے نوجوان اس طرف توجہ کریں اور اس فن کو سیکھ لیں تو ہر بستی میں اچھے اچھے ذاکر پیدا ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ فن مشکل بھی نہیں ہے تھوڑی سی محنت سے بہ آسانی آسکتا ہے ہمیں توقع ہے کہ نثر خوانی کے اس واحد چراغ (سید نجم الحسن صاحب نثار) سے اور بہت سے چراغ روشن ہونگے اور اس فن کو فنا نہ ہونے دیا جائے گا ——————— (ایڈیٹر)

حبیب و مسلم ابن عوسجہ پکے مسلماں تھے۔

ارادے کے دھنی ہمت کے پورے مرد میداں تھے

ڈرے حق سے لڑے حق کے لئے سارے زمانے سے

جہادوں میں نہ چوکے وہ کبھی تیغ آزمانے سے

حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ اُن کا عشق کامل تھا

حقیقت میں کیا جو کام دونوں نے وہ مشکل تھا

وطن چھوڑا عیال اطفال چھوڑے اقربا چھوٹے

تعلق جن کا اس دنیا سے تھا جتنے وہ سب توڑے

کمریں کس کے باندھی نصرت سبط پیمبرؐ پر

کہ جس کو کربلا سے جا کے کھولا حوض کوثر پر

کیا قائم نشانِ دین احمدؐ بے نشاں ہو کر

اجل آئی او نخیں لیکن حیاتِ جاوداں ہو کر

کچھ اس انداز سے سا کھا کیا اُن مرنے والوں نے

مثال اپنی قیامت تک نہ چھوڑی بے مثالوں نے

یہ کہنا فاطمہ کے لال سے اُن جاں نثاروں کا

تری چاہت میں ہم پانی پئیں خنجر کی دھاروں کا

پیمبرؐ کے نواسے تیری نصرت حق کی نصرت ہو

یہ ہمت دے جسے اللہ۔ قسمت اس کی قسمت ہے

اسے اسلام کہتے ہیں اسی کا نام ایمان ہے

عمل جس کا عمل یہ ہو وہی پکا مسلمان ہے

حقیقتاً ہم کو اور ہماری قیامت تک آنے والی نسلوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے حسینؑ بے کس و مظلوم اور ان کے ساتھ شہید ہونے والے ان کے اصحاب کے نقش قدم سے ۶۱ھ کا کربلا کا وہ خونی میدان قیامت تک کے لئے ہمارے واسطے ایک درس گاہ

جہاں سے ہمکو محبت اہل بیتؑ کا درس اُن مجاہدین کے سرفروشانہ عمل سے ملتا ہے جو پنجتن پاکؑ کی آخری شمع کے پروانے تھے، وہی تھے آئمۂ معصومینؑ کے خالص الایمان فدائی اور وہی تھے اہل بیت طاہرین کے سچے شیدائی اور راسخ الاعتقاد۔ انھیں کے خلوص اور عقیدت پر اسلام اور ایمان کی مہریں لگیں اور وہی اسلام کے سچے ہر دل عزیز ہیرو، امت مرحومۂ محمدیہ کے متبرک خطاب سے مخاطب ہونے کے لائق تھے۔ ہمکو اور ہماری آئندہ نسلوں کو انھیں بزرگواروں کے حالات کا غور سے جائزہ لینا چاہیئے اور انھیں کے نقش قدم پر چلنے کی امکانی کوشش کرنا چاہیئے جنھوں نے عاشور کے دن جبکہ ایک طرف تو گرمی کی وجہ سے آگ برس رہی تھی، اور دوسری جانب جنگ کی وجہ سے گویا کہ خون کی بارش ہو رہی تھی مگر نہ خدا کی عبادت کو چھوڑا اور نہ اہل بیتؑ کے دامن کو۔ لشکر مخالف کو یہ فکر کہ کسی طرح جلد سے جلد مہم سر ہو جائے اور امامؑ کے ساتھیوں کی یہ خواہش کہ دنیا سے جاتے جاتے ایک بار اور آقا کے ساتھ خدا کی نماز پڑھ لیں حسینؑ ان نمازیوں کو نماز گذاروں میں محسوب ہونے کی دعا دیتے ہیں، اور ارشاد فرماتے ہیں کہ ان سے اتنی مہلت مانگ لو کہ ہم خدا کی عبادت کر لیں، مگر افسوس کہ رسولؐ کا فرزند کہ جس کے گھر سے نماز قائم ہوئی، نماز کی اجازت مانگے اور جواب یہ ملے کہ تمہاری نماز قبول نہیں ہے، اس گستاخانہ جملہ کی حبیبؑ تاب نہ لا سکے اور آپ نے تلوار کھینچ لی۔ کون حبیب؟ حبیب ابن مظاہر اسدی جنھوں نے اہل بیتؑ کی محبت میں اپنی عمر صرف کی تھی، ان ہی کے متعلق ابن کلبی نے لکھا ہے کہ وہ صحابی تھے انھوں نے رسولؐ کی زیارت کی تھی۔ شیخ طوسی انھیں اصحاب امیرالمومنینؑ، پھر اصحاب امام حسنؑ اور پھر اصحاب امام حسینؑ میں شمار کرتے ہیں۔

قوم اسد کے یہ حبیب ابن مظاہر علی ابن ابی طالب کے اتنے حبیب تھے کہ آپ نے میثمؑ اور رشید ہجری کی طرح خاص طور سے ان کو علوم باطنی اور اسرار کی تعلیم دی تھی، یہی وہ حبیب ابن مظاہر اسدی ہیں کہ جب جناب مسلم ابن عقیلؑ نے کوفہ میں امام حسینؑ کا خط پڑھکر لوگوں کو سنایا ہے تو سب سے پہلے لبیک کی آواز انھیں نے بلند کی تھی اور یہ کہا تھا کہ میں دوسرے لوگوں کی ذمہ داری نہیں لیتا مگر جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اپنے آخری قطرۂ خون تک حسینؑ کی مدد کروں گا۔ بنی اسد کی یہی وہ فرد ہیں جنھوں نے قرۃ بن قیس سے کہا تھا کہ ایسے بزرگ کی مدد نہیں کرتے جس نے تم کو اور ہمارے بزرگوں کو اسلام کی عزت عطا کی۔ نویں محرم کی شام کو جب جناب امام حسینؑ نے جناب عباسؑ کو مع بیس سواروں کے لشکر مخالف کے بے وقت اقدام کا منشا معلوم کرنے بھیجا ہے تو یہی حبیب ابن مظاہر، زہیر ابن قین اور مسلم ابن عوسجہ اس وقت بھی ہمرکاب تھے اور انھیں سے قیس کے بیٹے نے جو ایک رکیک الحرکات انسان تھا، جناب عباسؑ کی بات کاٹنے کے لئے پکار کر کہا تھا کہ کیا تم ہی حبیب ابن مظاہر اسدی ہو جن کا یہ خیال ہے کہ وہ اور ان کے بزرگ بڑے عبادت گذار ہیں جبس بے جا مداخلت پر زہیر کو غصہ آ گیا اور انھوں نے کہا کہ بیشک حبیب اور ان کے بزرگوں کے نفس کا خدا نے تزکیہ کیا ہے۔ پھر یہی حبیب شب عاشور امامؑ سے اجازت لے کر بنی اسد کے قبیلہ میں جو کربلا کے اطراف میں آباد تھے گئے اور ان کو امامؑ کے حالات سے آگاہ کیا جس پر عبد اللہ ابن بشر اسدی اور کچھ اور لوگ یہ کہتے ہوئے ان کے ساتھ ہو لئے کہ بیشک اگر اس وقت ہم حسینؑ کی نصرت کو نہ گئے تو ہمارے بزرگوں کی روحیں ہم سے بیزار رہیں گی مگر اسکی خبر کسی صورت سے عمر سعد کو ہو گئی اور اس نے فوراً ایک کثیر لشکر روانہ کیا اس لئے کہ حبیب کو اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ راستہ ہی میں یہ مختصر جماعت اُس لشکر کو مل گئی کچھ تو مارے گئے اور باقی گرفتار کر لئے گئے:

حبیب کسی نہ کسی طرح بچ نکلے اور صبح ہوتے ہوتے پھر امام کی خدمت میں واپس آ گئے۔ عمر سعد نے بنی اسد کے قبیلہ کی سختی کے ساتھ نگرانی شروع کر دی، پھر صبح عاشور جب امامؑ نے خطبہ ارشاد فرمایا ہے اور شمر نے گستاخی سے کہا ہے کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو انھیں حبیبؑ نے کہا تھا کہ بے شک تو سچ کہتا ہے

تو امامؑ کے کلام کو کیا سمجھ سکے گا تیرے دل پہ تو مہر لگ چکی ہے۔
یہی حبیب حسینی لشکر کے سردار میسرہ تھے۔ قبیلہ بنی اسد کے یہی جان نثار حسینؑ کے ساتھ مسلم ابن عوسجہ کے جنازہ پر پہونچے تھے اور کہا تھا کہ بھائی مسلم مبارک ہو تم کو یہ شہادت، اگر مجکو یہ یقین نہ ہوتا کہ میں بھی تمہارے بعد ہی آتا ہوں تو کہتا کہ کچھ وصیت کرو۔

رونے والو! ہم حبیب ابن مظاہر اور قوم بنی اسد کی جس درجہ بھی تعریف کریں وہ کم ہوگا۔ اس لئے کہ اسی قوم نے ہمارے بے گور و کفن امامؑ کو دفن بھی کیا ہے اور اس سعادت عظمیٰ کے حاصل کرنے میں اسی قوم کو فخر حاصل ہے چنانچہ جب حسینؑ بے کس و مظلوم دسویں محرم کو مع جمیع عزیز و انصار تین دن کے بھوکے پیاسے شہید کر دیئے گئے اور لڑائی ختم ہوگئی تو اُن ظالموں نے اپنے کشتوں کو جمع کیا اور ان پر نمازیں پڑھیں مگر فرزند رسولؐ کو مع انکے ساتھیوں کے اسی طرح بے گور و کفن اس جلتی ہوئی زمین پر چھوڑ کر اہلبیت اطہار کو قید کر کے روانہ ہو گئے۔ یہاں راویوں میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ تین دن کے بعد، بعض کا خیال ہے دس روز کے بعد کچھ ایک ماہ لکھتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ چالیس روز کے بعد جب کربلا کی قریبی بستیوں کے رہنے والے تمام لوگوں کے دلوں سے فوجوں کی دہشت کم ہوئی اور انھوں نے گھروں سے نکلنا شروع کیا بالخصوص بنی اسد کے کسان جن کے کھیت کربلا کے قریب تھے تو ؎

کھیتوں پہ جو آتے تھے وہاں اہل زراعت
لاشے نظر آتے تھے انھیں آتی تھی رقت
دن بھر تو یہاں روتے تھے با صد غم و حسرت
اور شب کو گھروں میں بھی نہ تھی غم سے فراغت
کھاتے تھے نہ پیتے تھے نہ سوتے تھے سحر تک
شبیرؑ کی مظلومی پہ روتے تھے سحر تک
تب عورتیں کہتی تھیں یہ با دیدۂ پُرنم
کیوں بے خور و بے خواب ہو کس بات کا ہے غم
اشک آنکھوں سے تم لوگوں کے تھمتے نہیں کم
بتلاؤ یہ ہے کون سے مظلومؑ کا ماتم
کھانے جو پکائے ہیں اسی طرح دھرے ہیں
کون اٹھ گیا دنیا سے جو دل غم سے بھرے ہیں
تم لوگوں کے غم کھانے کا کھلتا نہیں کچھ حال
خرمن پہ گری برق کہ کھیتی ہوئی پامال
کیا پہنچ پڑا کون سا نقصان ہوا امسال
املاک ہوئی ضبط کہ دنیا پہ پڑا اکال
کچھ جرم کسی طرح کا ٹھہرایا ہے تم پر
یا حاکم جابر کا عتاب آیا ہے تم پر

جواب دیا انھوں نے کہ ان میں سے کوئی حادثہ نہیں ہوا اور نہ ہم کو ان امور کا اس قدر خیال ہوتا، لیکن وہ صدمۂ جانکاہ ہے کہ کلیجے ہمارے منہ کو آئے جاتے ہیں، کیا بیان کریں عجب واقعہ ہوا ہے کہ از آدمؑ تا ایندم یقین ہے کہ نہ ہوا ہوگا جب وہ عورتیں بہت مُصر ہوئیں تو ناچار ہو کر ان لوگوں نے حال کثیر الاختلال سبط رسولِ ربِ ذی الجلال از وقت داخلۂ ارض ماریہ تا روز عاشورہ شنیدہ و دیدہ جو کچھ گذرا تھا من و عن بیان کیا اور کہا اس سبب سے ہم لوگ مہموم و مغموم ہیں اور از دہم محرم تا ایندم وہ حادثے اس صحرا میں دیکھے ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتے از آں جملہ ؎

شب کو جو زراعت کی حفاظت کو گئے ہم
اس بن میں نظر آیا عجب طرح کا عالم
کچھ مرد تھے کچھ عورتیں با دیدۂ پُرنم
غل ہائے حسینؑا کا تھا اور کرتی تھیں ماتم
بے جرم چھُری جسکے کلیجے پہ چلی ہے
معلوم ہوا اب کہ حسینؑ ابن علی ہے
یہ سنتے ہی عورات نے اک شور مچایا
گھبرا کے کہا ہائے یہ کیا تم نے سنایا
شبیرؑ تو خاتون قیامت کا ہے جایا
کیا شمع امامت کو لعینوں نے بجھایا

شبیرؑ کا تن سر سے اتارا گیا ہے ہے
ہے ہے پسر فاطمہؑ مارا گیا ہے ہے

افسوس صد ہزار افسوس کہ دسویں تاریخ سے فرزند فاطمہ زہراؑ اور دلبند علی مرتضٰیؑ بے غسل وکفن ریگ گرم پر افتادہ ہے اور تم نے کچھ تجہیز و تکفین کی فکر نہ کی اور اس سید بیکس کی لاش نہ اٹھائی کہ جس کے جمیع اعزاء و اقربا شہید ہو گئے کیا منہ دکھاؤ گے روز حشر پیغمبرؐ خدا اور سید اوصیاؑ کو۔ معلوم ہوا کہ تم نے بخوف حاکم کوفہ و شام اپنے ایمان کو مٹا دیا اور طریقۂ اسلام سے ہاتھ اٹھا کر شاید راہ دیگر اختیار کرنے کا قصد کیا ہے بلکہ آلہ ہائے حرب و ضرب بھی جسم پر آراستہ کرنے کی غیرت کو خاک میں ملا دیا۔ تم سے تو ہم عورتیں اچھی کہ ہم کو اپنی بات کا تو خیال ہے بس ع

لو اوڑھ رو دائیں ہمیں دو جنگ کے ہتھیار
بس آج سے تلواریں نہ تم باندھنا زنہار
ناخوش ہیں نبیؐ تم سے علیؑ تم سے ہیں بیزار
بے پردہ ہے زینبؑ ہمیں پردہ نہیں درکار
فوجیں بھی جو بھیجے تو نہ حاکم سے ڈرینگے
اب فاطمہؑ کے لال کو ہم دفن کرینگے

ارے ہم کیا منہ دکھائیں گے دختر رسولؐ خدا کو روز قیامت جب وہ ارشاد فرمائیں گی کہ تمہارے مرد تو اس قابل نہ تھے مگر تم نے بھی میرے بچے کو دفن کرنے کی کچھ کوشش نہ کی اور لاش حسینؑ کا پڑا رہنا گوارہ کیا ہم کچھ جواب نہ دے سکیں گے نہایت حجاب ہوگا ع

یہ کہتے ہی عورات نے عریاں کئے سر
جلدی سے اتارا سے جو پہنے تھیں زیور
آغوش سے بچوں کو بھی بٹھلا دیا رو کر
اور پھینک دیا سب نے رداؤں کو زمیں پر
گہ سینہ زنی تھی کبھی فریاد و بکا تھی
اس غول میں زہراؑ کے بھی رونیکی صدا تھی

مردوں نے جو دیکھا کہ چلیں عورتیں باہر
گھبرا گئے اور بولے یہ گر گر کے قدم پر
تم روؤ گھروں میں صف ماتم کو بچھا کر
ہم گاڑتے ہیں لاشۂ فرزند پیمبرؐ
دیویں گے کفن شاہ غریب الغربا کو
منہ ہم کو بھی دکھلانا ہے محبوبؐ خدا کو

یہ کہہ کر ان لوگوں نے آلہ ہائے کندیدن قبور اٹھالئے اور جانب مقتل امامؑ تشنہ کام روانہ ہوئے۔ اب تو پھر عورتوں کو ضبط باقی نہ رہا اور روتی پیٹتی سر و پا برہنہ اپنے مردوں کے پیچھے پیچھے گھروں سے نکل پڑیں۔ جس وقت وہ سب مرد و زن مقتل سبط رسولؐ رب ذو المنن پر پہنچے تو لاشہ ہائے شہداءؑ دیکھ کر مشغول گریہ و زاری ہوئے۔ جب کچھ شدت گریہ سے افاقہ ہوا تو اپنے زمرہ سے چار شخص ہر چہار جانب برائے حفاظت بٹھا دیئے اس سبب سے کہ تابعان ابن سعد کچھ ضرر نہ پہنچا سکیں بعد اس تدبیر کے قبریں شہیدان دشت کربلا کی تیار کیں اور قصد دفن کیا مگر تلاش لاش جناب سید الشہداؑ میں کمال متردد تھے اس وجہ سے کہ کسی بزرگوار کے جسم پر سر نہ تھا اور لاشیں پہچانی نہ جاتی تھیں۔ نہایت حیران و پریشان تھے کہ سبط رسولؐ مقبول کی لاش کونسی ہے آپس میں رو رو کر کہتے تھے کہ کیا تدبیر کریں جو لاش سید الشہداءؑ کا امتیاز ہو کاش کوئی امامؑ تشنہ کام کا جاننے والا مل جاتا تو اس سے دریافت کرتے یہ سب جان نثار تو خواب عدم کے باعث آرام میں ہیں کس سے پوچھیں۔ ایسا نہو کہ ہم اس سعادت عظمٰی سے محروم رہ جائیں اسی فکر و تردد میں تھے کہ باعجاز لاش بے سر امامؑ سے آواز آئی۔ کہ کیوں پریشان ہوتے ہو جس مظلوم و بے کس کی تلاش میں ہو وہ میں ہوں۔ تھوڑی دیر صبر کرو اور دیکھو کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے ع

صد شکر کہ آخر ہوئے بے دفنی کے ایام
ہوتا ہے کوئی دم میں لحد کا بھی سرانجام
مشرق میں جو ہو نوحۂ امام ذو الاکرام
مغرب سے امامؑ آتا ہے واں دفن کی ہنگام

رہنے دو زمیں پر نہ اٹھاؤ ابھی ہم کو
ٹھہرو کہ امام زمن آیا کوئی دم کو

ہاں ہاں۔ اہل عزا کیونکر پہچان لیتے بنی اسد لاشِ حسینؑ غریب کو اور کیونکر دفن کر سکتے تھے اُس جسم مُطہر کو بغیر امامؑ وقت کی موجودگی کے۔ میں نے مستند ذاکرین سے سنا ہے بلکہ میرا تو یہ ایمان ہے کہ امامؑ کو بغیر امام دفن ہی نہیں کر سکتا۔ ادھر نعش مظلوم سے یہ آواز آئی اور اُدھر ع

ناگاہ ہوئی سامنے سے گرد نمودار
مقتل کی زمیں ہو گئی سب مطلع انوار
آواز یہ ہر سمت سے آنے لگی اک بار
آ پہونچے پئے دفنِ پدر عابدِ بیمارؑ
ہر گام پہ گر پڑتے تھے یہ زور گھٹا تھا
عمامہ نہ تھا سر پہ گریبان پھٹا تھا
مقتل میں پڑھی پہلے کھڑے ہو کے زیارت
پھر گر پڑے لاشے پہ نہ تھامی گئی رقت
چلائے کہ اے دلبرِ خاتونِ قیامت
زندوں میں نہ تھا جب سے ہوئی آپ سے فرقت
پاس آپ کے سب چین سے سو یا کئے بابا
ہم اتنے دنوں قید میں رویا کئے بابا

بعد اس بیان جانکاہ کے جناب سید الساجدین امام زین العابدینؑ نے اشخاص بنی اسد سے فرمایا کہ لاشیں شہیدان ارض نینوا کی ایک مقام پر لاکر رکھدو۔ یہ سن کے وہ لوگ سب لاشیں اٹھا لائے جب تمام لاشیں جمع ہو گئیں تو آپ نے سب پر نماز پڑھی اور پہلے سوائے لاش سید الشہدا کے اور سب کو دفن کیا۔ اشخاص بنی اسد میں سے ایک شخص ناقل ہے کہ میں متحیر تھا کہ آپ نے اپنے پدر بزرگوار کو کیوں نہ دفن فرمایا مگر رعب امامت نے کچھ عرض کرنے کی ہمت نہ دی۔ میں نے امامؑ کے چہرۂ مبارک کو غور سے دیکھنا شروع کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ امامؑ کو کسی کا انتظار ہے حسینؑ کے چاہنے والو! یہ کسی اور کا جنازہ نہ تھا۔ یہ حسینؑ بیکس و مظلوم کا جنازہ دفن ہو رہا تھا کوئی شک نہیں امامؑ کو انتظار تھا رسولؐ مقبول کا۔ علی مرتضیٰؑ اور حسن مجتبیٰؑ کا۔ امامؑ منتظر تھے حسینؑ کی کوکھ جلی ماں فاطمہ زہراؑ کے چنانچہ تاریخیں لکھتی ہیں کہ جب ع

جب آپ ہوئے دفن پہ شبیرؑ کے تیار
اک چادر نور آکے کھنچی قبر پہ اک بار
تربت سے ہوئے ہاتھ محمدؐ کے نمودار
سر کھولے یہ چلاتی تھی زہراؑ جگر افگار
بے کس کو نبیؐ زادے کو معصوم کو لاؤ
میں صدقے ہوں لاؤ مرے مظلوم کو لاؤ
حیدرؑ کی صدا آتی تھی ہے ہے مرا پیارا
آہستہ اُتارو کہ بدن چور ہے سارا
کہتے تھے نبیؐ اُمت بد نے ہمیں مارا
ان باغیوں نے لوٹ لیا باغ ہمارا
افسوس کہ پانی نہ دیا سبط نبیؐ کو
پیاسا ہی کیا قتل حسینؑ ابن علیؑ کو
بس خاک میں عابدؑ جو لگے شہ کو چھپانے
رو رو کے لگی قوم اسد خاک اڑانے
منھ پیٹ لیا ہاتھوں سے محبوب خدا نے
غم کھا کے فرشتے بھی لگے شور مچانے
مرقد جو بنا سبط رسولؐ عربی کا
غل قوم بنی جان میں ہوا سینہ زنی کا

قطعہ

لاؤ زباں پہ کبھی کوئی نام حسن
سمجھی گئی جو کچھ عظمت انجام حسن
ہاتھ لگی جو مست مر بعد شہادت ہو فرض
جز ماتم نہیں کچھ اور پیام حسین
بخشش جمہور سکینہ

طالب دہلوی

سلام

(سید ریاض علی صاحب ریاض جرولی)

وفورِ غم سے اشکوں کی فراوانی نہیں جاتی
مدد اے ضبطِ چشمِ تر کی طغیانی نہیں جاتی

ہزاروں حسرتیں آباد ہیں دل میں مگر پھر بھی
نہ جانے کیا ہوا اس بستی کی ویرانی نہیں جاتی

بدل جائیں ہزاروں رنگ چرخِ کینہ پرور کے
مگر پابندیٔ وضعِ ستم رانی نہیں جاتی

لگائے لاکھ کوئی اتہام چاک دامانی
مگر حق بیں نظر سے پاک دامانی نہیں جاتی

ہو سوئے معرفت شکوہ تری کوتاہ دستی کا
یہی سچ ہو میری کوتاہ دامانی نہیں جاتی

نمازِ عشق کے سجدہ میں کیا تاثیر ہو یارب
کہ جس کے داغ کی تا حشر تابانی نہیں جاتی

نیازِ عشق میں کیا سرفرازی اس کو حاصل ہو
نہ شمشیرِ سجدہ تک جو پیشانی نہیں جاتی

شہیدِ ناز کے یہ خونِ ناحق کی کرامت ہے
کہ بعدِ قتل قاتل کی پشیمانی نہیں جاتی

گلا ناآشنائے تیغ کیوں جانباز کا رہتا
بلا جو سر پہ آتی ہو بآسانی نہیں جاتی

میں وہ ہوں بلبلِ آزاد فطرت باغِ ہستی میں
کہ معراجِ سناں پر بھی گل افشانی نہیں جاتی

ملک دیکھیں یہ داغِ ماتمِ شبیرؑ کے جلوے
کہ ان کی کنجِ مرقد تک درخشانی نہیں جاتی

سیہ بختوں کے بہکانے سے حُر کیوں منحرف ہوتا
کسی لالچ سے بھی تنویرِ ایمانی نہیں جاتی

زباں ہو قطع یا سر ہو قلم جرمِ مودت میں
مگر فطرت سے شہ کی منقبت خوانی نہیں جاتی

حقائق پر حکومت شاہ نے کی تا دمِ آخر
یہ سچ ہے مرتے مرتے خوئے سلطانی نہیں جاتی

لگے ہیں زخم اس کثرت سے جسمِ پاکِ مولا پر
شہِ گلگوں قبا کی شکل پہچانی نہیں جاتی

ملا دی ہائے اکبرؑ کی جوانی خاک میں تو نے
یہ بے رحمی تری اے عالمِ فانی نہیں جاتی.

مرض بھی ضعف بھی صدمات بھی طوق و سلاسل بھی
پیادہ خاک اب سجادؑ سے چھانی نہیں جاتی

زباں ہے خشک کانٹے حلق میں اور ہونٹھ پپڑائے
یہ بے چینیٔ علی اصغرؑ کی بے پانی نہیں جاتی

در شہ پر مرادیں چل کر تمنا ہو ریاض اپنی
کہ ارضِ کربلا سے مہربانی نہیں جاتی

رنگین بنا کر دیں کی فضا اسلام کا سورج ڈوب گیا

(فصیح الہند ابو الفضل جناب شمس لکھنوی حنفی)

شہ قتل ہوئے اندھیر ہوا اسلام کا سورج ڈوب گیا
کہتی ہے زمین کرب و بلا اسلام کا سورج ڈوب گیا

باطل کو حقیقت کرکے گیا بخشائش امت کرکے گیا
دکھلا کے بقا میں رنگ فنا اسلام کا سورج ڈوب گیا

دنیا کا اُجالا بنکے رہا پُر نور کیا ذرّہ ذرّہ
رنگین بنا کر دیں کی فضا اسلام کا سورج ڈوب گیا

دنیا سے تو وہ منھ موڑ گیا انوار سب اپنے چھوڑ گیا
کیوں چھائے نہ دل پہ غم کی گھٹا اسلام کا سورج ڈوب گیا

راضی برضائے رب علی تھی تیغ گلے پر اور چپ تھا
ہر ایک کو دیکر درس وفا اسلام کا سورج ڈوب گیا

توحید کی باتیں سمجھا کر اسلام کی راہیں دکھلا کر
تاریکیوں کو دے کے ضیا اسلام کا سورج ڈوب گیا

تھا راہ عمل کا راہ نما ہر ظلم و ستم برداشت کیا
راہوں کو بنا کر شمع ہدیٰ اسلام کا سورج ڈوب گیا

دنیا میں کرو جس سے بھی وفا کرتا ہے وہ ظالم بنکے جفا
جب رنگ زمانہ دیکھ لیا اسلام کا سورج ڈوب گیا

مغموم ہے شب دھندلی ہے سحر کرنوں کی نہیں پہلی سی نظر
سنسان ہے عالم بھر کی فضا اسلام کا سورج ڈوب گیا

تاروں کو بنایا جس نے قمر راتوں کو بنایا جس نے سحر
وہ روشن روشن چمکیلا اسلام کا سورج ڈوب گیا

کیوں شمس نہ ہر سو خاک اڑے آنکھوں سے نہ کیونکر خون بہے
غمگین ہے کیوں نہ ارض و سما اسلام کا سورج ڈوب گیا

خدائے سخن میر انیس صاحب کی مرثیہ نگاری

(از قلم سید سردار مہدی الرضوی زیدپوری)

میر ببر علی انیس ادب اردو کے بہترین شاعر تھے آپ میر خلیق کے لائق بیٹے اور میر حسن مصنف "سحر البیان" کے نامور پوتے تھے ۱۲۱۹ھ میں فیض آباد کے محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے اور بہتر سال کے سن میں ۱۲۹۱ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی اپنے ذاتی باغ کوچہ میر انیس میں دفن ہوئے آپ رضوی سید تھے۔

بارہ سال کے تھے کہ غزل کہنے لگے چند ہی سال میں ایسی مہارت حاصل کی کہ مشاعروں میں اساتذۂ وقت نے غزلیں پڑھنا اس خیال سے ترک کر دیں کہ انہیں کے ہونے رنگ جمنا محال ہے یہ کمال دیکھ کر میر خلیق کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی بیٹے سے کہا کہ اب غزل گوئی ترک کرو اور وہ مسلک اختیار کرو جس سے دین و دنیا دونوں میں بھلا ہو غزل سے کنارہ کش ہو کر مرثیہ گوئی اپنا آبائی فن اختیار کیا جس میں ایسا نام پیدا کیا جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔

لکھنؤ میں میر انیس نے جو پہلی مجلس پڑھی اس کا آغاز اس رباعی سے کیا

بالیدہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا!
ظل علم صاحب معراج ملا!
منبر پہ نشست سر پہ حضرت کا علم
اب جانئے کیا تخت ملا تاج ملا

ہمعصر شاعروں نے داد دی اور میر صاحب ترقی کے میدان میں گامزن ہوئے اور اردو زبان کو جس کی حقیقت زبان فارسی کے مقابل کچھ نہ تھی اتنی ترقی دی کہ اس کے ہم پلہ کر دیا چنانچہ خود فرماتے ہیں:

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

میر خلیق کے زمانہ تک مرثیہ گوئی ایک محدود شاعری تھی اور "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کی مثل مشہور تھی لیکن میر انیس نے اسے غلط کر دیا اور مرثیہ کو جملہ اصناف شاعری سے مالا مال کر دیا۔ مضمون طول پکڑنے کے خیال سے اس باکمال شاعر کے کلام پر تفصیل سے کچھ نہیں لکھ سکتا صرف محاکات و تخیل کے بابت نہایت اختصار سے لکھتا ہوں کیونکہ یہ دونوں صنف شاعری کی جان ہیں۔ جو میر صاحب کے کلام میں بوجہ اکمل پائے جاتے ہیں

مناظر قدرت وغیرہ جن کا شاعر مشاہدہ کرتا ہے اور انھیں بعینہ نظم کرتا ہے اسے محاکات اور جب اپنے زور طبیعت سے اس میں ندرت پیدا کرتا ہے تو اسے تخیل کہتے ہیں۔ صبح کے منظر کی تصویر کشی فرماتے ہیں بہترین محاکات۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح
گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح!
سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

یہ تو بعینہ منظر قدرت کی نقشہ کشی ہے لیکن شاعر مسلمان ہے اور حسین مظلوم کا عزادار اس لئے صبح عاشورہ کے منظر کو نظم کرتے ہوئے اپنے زور تخیل سے کام لے کر ارشاد فرماتے ہیں۔ ..

تھا بسکہ روز قتل شہ آسمان جناب
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب
روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
اک دھوم تھی جو قتل شہ کائنات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

آفتاب کا رنگ طلوع ہوتے وقت سرخ ہوتا ہے لیکن میر صاحب کہتے ہیں کہ وہ غم حسین کے سبب چہرے پر خون ملے تھا۔ نہر علقمہ کا خجالت سے آب آب ہونا اس لئے کہ امام و عزیزان کے ننھے ننھے بچوں پر اعدائے دین نے پانی بند کر دیا تھا۔ حباب کی خاصیت بننا اور پھوٹنا ہے لیکن میر صاحب کی تخیل اس کی متقاضی ہے کہ ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نظم فرمائیں کہ امام کی بیکسی پر حباب زار زار روتے تھے پھوٹ پھوٹ کر روندے کی جتنی تعریف ہو کم ہے۔ چھٹا مصرعہ تو تخیل کی جان ہے موجیں ساحل سے ٹکرایا ہی کرتی ہیں لیکن میر انیس کی تخیل کا زور اس سے یہ مطلب لیتا ہے کہ وہ مصائب امام مظلوم سے متاثر ہو کر ساحل سے سر ٹپک رہی تھیں۔

باوجود اختصار کے مضمون طول ہو گیا لیکن آخر میں میر صاحب کا ایک بند نماز صبح کی اذان کے بابت لکھ کر ختم کرتا ہوں ورنہ میر صاحب کے محاسن کلام پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔

صبح عاشورہ امام علیہ السلام اپنے اٹھارہ سال کے نوجوان فرزند جناب علی اکبر کو اذان دینے کا حکم فرماتے ہیں۔ یہ وہ یگانہ روزگار بیٹا تھا جو صورت سیرت رفتار و گفتار میں جناب خاتم المرسلین کی تصویر تھا اسی لئے ہم شبیہ پیغمبران کا لقب ہو گیا اس مقام کے تمام بند مرصع ہیں لیکن یہ بند جو امام کی سوگوار بہن جناب زینب کی زبانی ہے جنہوں نے حضرت علی اکبر کی پرورش کی تھی، جو بند ذیل ہے

یہ حسن صوت اور یہ قرات یہ شد و مد
حقا کہ افصح الفصحا ہے انہیں کا جد
گویا ہے لحن حضرت داؤد با خرد
یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے اذاں میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں

ایسے ایسے ہزاروں شہ پاروں سے میر انیس علیہ الرحمہ کا کلام مزین ہے افکار زمانہ مہلت نہیں دیتے ورنہ ان کے کلام بلاغت نظام سے انتخاب کر کے چیدہ چیدہ مضامین پر مشتمل ایک رسالہ شائع کرتا۔

قطعہ

رہتی ہے زباں پہ صرف تحسین حسینؑ
گوش دل سے سُنی نہ تلقین حسینؑ
اُلجھن میں نہ اس طرح کو ڈالو ہرگز
خالی باتوں سے اور تسکین حسینؑ

(شیش چندر سکسینہ، طالب دہلوی)

کہ اک بچہ جہازِ اُمتِ عاصی کا لنگر ہو

جناب میر ولایت حسین صاحب شاد المتخلص بہ ولاؔ اعلی اللہ مقامہ

یہ فرماتے تھے سبطِ مصطفٰےؐ پیدا جو اصغرؑ ہو / بنے فردِ شہیدانِ وفا تکمیل محضر ہو
جمالِ دوست کا اک آئینہ وہ دل نہ کیونکر ہو / جہاں داغِ پسر بھی جلوۂ صد حسنِ داور ہو
زمانہ لاکھ بدلے کروٹیں یہ یاد رکھیے گا / نہ اب شبیرؑ پیدا ہوں نہ قربانیٔ اصغرؑ ہو
جو عاقل ہیں وہ سمجھیں داغِ اصغرؑ کیوں سہا شہؑ نے / بڑھے وزنِ شہادت اور بھی اس غم میں لنگر ہو
وہ لائے دل کے ٹکڑے رکھ کے ہاتھوں پر سرِ مقتل / پیا ہو جس نے شیرِ فاطمہؑ سبطِ پیمبرؐ ہو
یہ اک رازِ وفا ہے سن نہیں دل کی ضرورت ہے / گلے پر کھا کے ناوک مسکرائے کون اصغرؑ ہو
وہی جانے حقیقت لذتِ شوقِ شہادت کی / عطش میں حرملہ کا تیر جس کو شیرِ مادر ہو
کرے اسلام جتنا فخر کم ہے ذاتِ اصغرؑ پر / کہ اک بچہ جہازِ اُمتِ عاصی کا لنگر ہو

سوائے حرملہ ہر سنگدل فوراً یہ کہدے گا
نہ ہو جس دل میں تیرا داغ اے اصغرؑ وہ پتھر ہو

سلام

(جناب سید علی حسین صاحب زیبا ایم، اے انفارمیشن افیسر، کراچی)

جو شہرِ علم پیمبرؐ کا باب دیکھتے ہیں / وہی دراصل خدا کی کتاب دیکھتے ہیں
ہمارے میکدۂ غم میں جبرئیل امیں / جھکے ہوئے ہیں تو شراب دیکھتے ہیں
ہے استعارہ اشکِ عزا کی فکر ہمیں / ٹھہر ٹھہر کے جو موتی کی آب دیکھتے ہیں
بیاں کیا ہو شبیہِ نبیؐ کی گردشِ چشم / یہ سمجھو جیسے رسالت مآب دیکھتے ہیں
لبِ فرات یہ کیا ہے کہ دن کو سبطِ نبیؐ / غروب ہوتے ہوئے آفتاب دیکھتے ہیں
کسی رسولؐ کا دل سینۂ حسینؑ میں ہے / وہی سکون وہی اضطراب دیکھتے ہیں

ملائکہ سے نہ زیبا مسابقت ہو جائے
تمہیں گدائے درِ بوتراب دیکھتے ہیں

کارنامۂ جاوید

(سرکار اسد العلماء مولانا اسد علی صاحب قبلہ مجتہد الٰہ آباد)

ہاں بے شک عالم کا ذرہ ذرہ تغیرات کا ہر لحظہ نشانہ ہے اور یہی تغیر اس کے واسطے فنا کا پیش خیمہ ہے لیکن انسان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تغیرات کے لامحدود خطوط کا مرکز ہے اور ساتھ ہی ساتھ بہ نسبت اور مخلوق کے یہ تغیرات سے اثر بھی زیادہ لیتا ہے لہٰذا تغیر پذیری اس کی فطرت ہو گئی۔ اب یہ تغیر اور انقلاب اگر مرضی کے مطابق ہے تو راحت و آرام، کیف و سرور ہے۔ اور اگر مرضی کے خلاف ہے تو رنج و غم، صدمہ و الم ہے۔ ظاہر ہے کہ حالات، مزاج، کیفیات، زمان و مکان کے اختلافات کی بنا پر انسانی منشا اور طلب مختلف ہونا چاہیئے تو ہو سکتا ہے کہ ایک حالت کسی قوم یا شخص کے لیے محل سرور ہو لیکن دوسرے کے لیے نہ ہو، کوئی درجہ کسی کے لیے باعث ہو لیکن دوسرے کے لیے نہ ہو لہٰذا کسی حد، درجہ، حالت کے لیے مطلقاً یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ یہ حقیقی راحت ہے یا حقیقی تکلیف ہے اس کا مقصد یہ ہوا کہ راحت و تکلیف اعتباری چیزیں ہیں ذاتی صفتیں نہیں ہیں، ایک ہی حالت سرمایہ رنج و راحت دونوں ہے؛ اکثر درجات اور بیشتر حالات اپنے حصول سے قبل نعمتیں ہیں۔ اور حصول کے بعد زحمتیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ رنج کا تعارف راحت کے ذریعے سے اور راحت کی تشخیص رنج کے ذریعہ سے ہوئی ہے، یہ کہنا غلط ہے کہ دنیا میں آرام ہی آرام ہوتا تکلیف نہ ہوتی تو خوب ہوتا یہ تو اس وقت درست ہوتا جب آرام کوئی جسم ہوتا مصافحہ اور معانقہ کے قابل اور اگر ایسا ہوتا تو پھر تھوڑے ہی انسان اس سے بہرہ مند ہو سکتے۔ سب تک اس کی تقسیم کا پہنچنا دشوار ہوتا انسان کو عقل دے کر اور خیال کی قوت عطا کر کے اس نے آرام و تکلیف سب پر تقسیم کر دیا۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان انہیں تغیرات کو پسند کرتا ہے جن میں وہ راحت محسوس کرتا ہے اور ان تغیرات اور انقلابات سے بیزار ہو جاتا ہے جن میں تکلیف کا سوال سامنے ہو، وہ زیادہ خوش رہنا چاہتا ہے۔ غم کو بھلا دینا چاہتا ہے اور قدرت نے بھی اس کے تخلیقی نظام میں اس امر کا لحاظ رکھا ہے تاہم وہ کچھ دنوں یہ لباس حیات پہنے رہے اگر غم اسی کیفیت اور حالت پر برقرار رہے جس حالت پر کہ وہ اپنے وجود کی ابتدائی منزل میں تھا۔ تو صاحب غم کو جلد ہی فنا کر دے، وہ شدید احساس جو حادثۂ غم کے موقع پر ہوتا ہے جب کہ سبب احساس کوئی بڑی مصیبت ہو اگر اسی درجہ پر باقی رہ جائے تو جلد ہی اس کو موت سے ہم کنار کر دے، بلکہ ایک متوسط درجہ کا احساس اگر لمحہ بہ لمحہ کم نہ ہوتا جائے اگر ٹھہر جائے تو لب گور پہنچا دے۔ خیر یہ تو غم ہے۔ خوشی اور اس کا احساس اگر انحطاط پذیر نہ ہو اور ابتدائی حالت پر قائم رہے تو ہلاکت یا فساد کا سبب بن جائے۔ یہاں مجھ کو باب سرور کے متعلق کہنا نہیں ہے۔ مبحث غم کے متعلق لکھنا ہے کہ دنیا میں اولاد کا غم سب سے بڑا غم کہا جا سکتا ہے لیکن دیکھ لیجیے کہ یہ غم بھی اپنی خصوصیات کی بنا پر جس قدر بھی المناک ہو لیکن روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ مرنے والے فرزند کے لیے جو بات کل تھی وہ والدین کے لیے آج نہیں ہے۔ اور جو آج ہے وہ کل نہ رہے گی یہاں تک کہ وہ دن قریب ہے کہ اس کا تذکرہ ہو اور آنکھیں نم نہ ہوں، نام آئے اور دل بے قرار نہ ہو اس کی یادگاروں اور آثاروں سے نظر گزرے لیکن طائرانہ نظر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں تبدیلی ہوا کرتی ہے، کتنے دن پر ہوتی ہے۔ اس کی تعیین انسانوں کے لیے دشوار ہے۔ کچھ خارجی حالات اور اسباب بھی اس کی طبیعت میں انقلاب پیدا کرتے ہیں، اس کے علاوہ حال کے واقعات گزشتہ واقعات کے لیے حجاب بنتے جاتے ہیں۔ ماضی جتنا بعید ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس پر حجابات کی تہیں چھائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایسا ہوتا ہے کہ ماضی بعید کا اہم واقعہ ماضی قریب یا حال کے نسبتاً معمولی واقعہ کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا

یہ گفتگو ایک متوسط عمر والے انسان کے دور زندگی کے پیش آنے والے واقعات کے متعلق ہے جنھیں اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے پھر وہ واقعات جو دیکھے نہ ہوں، زندگی سے قبل کے ہوں اور پھر وہ واقعات جن پر صدیاں ہزاروں پردے ڈال چکی ہوں اور جن کے بعد ہزاروں انقلابات آئے ہوں زمانے نے ہزاروں کروٹیں لی ہوں۔ تمدن نے بہت پلٹے کھائے ہوں۔ اخلاقی معیار نے تغیرات کا سامنا کیا ہو، اقوام و ملل کے مزاج بدلے ہوں، ان کو تو بالکل دماغوں سے محو ہو جانا ہی چاہیئے ان میں ذرا اثر نہیں رہنا چاہیے وہ اپنے وقت میں کتنے ہی اثر انداز ہے ہوں اور اس وقت کتنے ہی دلوں کو برما دینے والے ثابت ہوئے ہوں۔ لیکن تاریخ کے صفحات پر اگر کوئی واقعہ ایسا نظر آئے جو لاتعداد انقلابات، سیکڑوں تغیرات، ہزاروں کروٹوں کی گود میں نشو و نما پاتا چلا جائے اور بجائے مٹنے کے ابھرتا ہی رہے تو وہ ضرور انسانی دنیا کا ایک عظیم معجزہ ہوگا۔ اور جب وہ دنیائے انسانیت کا معجزہ ہوا تو پھر تمام عالم کے انسانوں کا فریضہ یہ ہوا کہ اس کے بقا و فروغ کی کوشش کریں۔

ایسا نہیں ہے کہ صدیوں بعد اس واقعہ سے اثر لینے کی بنا پر آج یہ قلبی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے کیونکہ ایسا ہوتا ہے کہ اہم فروگزاشت کی طرف جب ذہن مدت کے بعد متوجہ ہوتا ہے تو اس توجہ میں ایک زوردار ولولہ شدت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ تاریخ کے صفحات میں شاہد ہیں کہ سنہ ۶۱ھ میں یہ واقعہ ہوا اور اسی صدی میں مسلمانوں نے اس اہم ترین کارنامہ کی یادگار قائم کرلی۔ اور اس کے بعد برابر یہ یاد ترقی کرتی رہی نہ دبائے دبی۔ نہ مٹائے مٹی، نہ چھپائے چھپی۔ نہ حکومت کا اس پر بس چلا، نہ سلطنت کا تسلط اس پر مسلط ہو سکا، نہ ارباب جبروت کا جبر اس پر کامیاب ہو سکا۔ نہ صاحبان جور کی جفا کاریاں پیش کی جاسکیں بادشاہتیں اس کے مٹانے کی درپے ہوئیں۔ مگر خود مٹ گئیں سلطنتیں اس کی بیخ کنی میں مصروف ہوئیں لیکن ناکامی کے سوا دوسری چیز میسر نہ آئی یہاں تک کہ جو پامال کرنے اٹھے خود پامال ہو گئے۔ ہزاروں نام لینے والوں کو سولیاں دی گئیں، ہزاروں لوگوں کو سوگ منانے سے روکا گیا۔ مگر یہ ماتم بند نہیں ہوا۔ بے شک یہ غور طلب مسئلہ ہے کہ کیوں؟ جب کہ تاریخ کے صفحات پر واقعہ کی حیثیت سے اس سے زائد طویل تر غم انگیز داستانیں موجود ہیں۔ اس کے مقابل ایسے واقعات ہیں جن میں جنگ کا سلسلہ، دنوں، ہفتوں، مہینوں نہیں برسوں جاری رہا۔ اس واقعہ کی خونریزی کے مقابل ایسے ہولناک واقعات ہیں جن میں خون کی ندیاں بہ گئیں، لاکھوں انسان تہ تیغ کر دیئے گئے۔ سلطنتوں کے انقلابات کے موقعوں پر ہزاروں کیا لاکھوں مردوں، عورتوں بچوں جوانوں بوڑھوں کے خون سے زمین لالہ زار بنادی گئی جس میں بچے ماں باپ سے جدا ہوکر، عورتیں شوہروں سے الگ ہوکر، بہنیں بھائیوں کو کھو کر شہر بہ شہر اور دیار بہ دیار پھرائی گئیں یا پھریں۔ تعداد نفوس کے لحاظ سے بھی بڑے بڑے لشکروں کی جنگیں تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں جب کہ یہاں بہتر افراد تھے تو پھر کیا اس کارنامہ کا اعجاز نہیں ہے کہ اہمیت اور اثر کے لحاظ سے جو درجہ اس کارنامۂ جاوید کو حاصل ہوا وہ تو درکنار اس کے قریب بھی کسی واقعہ کو جگہ آج تک نہ مل سکی۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج تک جتنا نظم و نثر کے ذریعہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کارنامہ کے متعلق کہا گیا ہے یا لکھا گیا ہے کسی دوسرے واقعہ کے متعلق نہ کہا گیا نہ لکھا گیا جب کہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جو واقعہ لوگوں کی نگاہ میں جس قدر اہم ہوگا اور انسانی دنیا جس واقعہ سے جتنا زیادہ اثر لے گی اسی قدر اس کے متعلق نظم و نثر، تقریر و تحریر کے ذخیرے دستیاب ہوں گے۔

بے شک ایسا ہوتا ہے کہ بعض کم اہمیت رکھنے والے واقعات حکومت وقت کی دستگیری کی وجہ سے یا کسی منظم جماعت کی پشت پناہی یا پروپیگنڈے کی بنا پر اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے مخالف کو کمزور بنانے کے لیے، سلطنت کی زینت ہموار بنانے کے لیے، اقتدار قائم کرنے کے لیے کسی معمولی واقعہ کو اہمیت دی جائے مگر یاد رہے کہ یہ باتیں چند روزہ ہوا کرتی ہیں۔ مردہ جسم کو گیس اور انجکشن کے ذریعے حیات نہیں بخشی جاسکتی۔ خس و خار کو عطر لگا کر گلاب نہیں بنایا جاسکتا۔ بے جان درخت آبیاری سے لہلہا نہیں اٹھتا۔

دنیا میں ایسے واقعات موجود ہیں جن کو لفظوں کی جزالت، بندشوں کی چستی، بیان کے زور اور الفاظ کے پرشوکت ہونے نے باثر بنادیا۔ یہ واقعات مورخ کے زور قلم، مقرر کے لطف بیان، شاعر کی قادر الکلامی کے رہین منت ہیں۔ ایسے واقعات کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بدصورت یا معمولی شکل والے انسان کو خارجی چیزوں سے آراستہ کرکے پیش کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ حسن ذاتی نہ ہوگا اور ایسی

صورت میں اس کا اثر اور اس کی اہمیت بھی عارضی ہو گی ۔ یقیناً اس سے زائد اور کہیں زائد طویل و عریض واقعات دنیا میں آج تک رونما ہو چکے ہیں اور آئندہ ہوتے رہیں گے لیکن وجود کی حیثیت سے لمبا چوڑا ہونا اور ہے اور بقا کی حیثیت سے لافانی روح کا مالک ہونا ایک دوسری بات ہے کربلا کے عظیم کارنامے نے دماغوں کو اس بات کی طرف متوجہ کر دیا اور انسانی عقلوں سے منوا لیا کہ ہر قسم کی ظاہری اور مادی بے سروسامانی کے باوجود، ہر قسم کی اکثریت اور فراوانی سے تہی دستی کے باوجود کوئی کام عظیم ترین کارنامہ بن سکتا ہے اور اہمیت اور اثر کے اعتبار سے ہمیشہ رہنے والی زندگی حاصل کر سکتا ہے جب کہ اس کے اجزا اور جزئیات جنھوں نے اس واقعہ کی صورت گری کی ہے اہمیت اور اثر کے لحاظ سے بے مثال ہوں، جرأت و اقدام کے لحاظ سے بے مثال ہوں، صبر و استقلال کے لحاظ سے بے مثال ہوں، تسلیم و رضا کے اعتبار سے بے مثال ہوں، ایثار و قربانی کے لحاظ سے بے مثال ہوں ۔ جفاکشی اور مجاہدۂ نفسانی کے لحاظ سے بے مثال ہوں، اتحادِ فکر و نظر اور اتحادِ اقدام و عمل کے لحاظ سے بے مثال ہوں، ایک ہی روحِ سیاست ہر ایک کے ہر ہر عمل میں کارفرما ہو۔ اس کارنامہ کو حیاتِ ابدی عطا کرنے میں سب سے زیادہ مظلومیت کو دخل ہے ۔ مظلومیت ایک ایسی صفت ہے جس میں فطری جاذبیت پائی جاتی ہے اور جو چیز فطری ہوتی ہے وہ عقائد و نظریات، مذاہب و ملل کی سطح سے بلند ہوتی ہے اس کے احساس کے لیے صرف انسان ہونا کافی ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی ذات میں دنیائے انسانیت کے لیے جو جاذبیت موجود ہے دوسرے کے لیے نہیں ہے ۔

کسی کی مظلومیت سے متاثر ہونے میں اس کی ذات کی بلندی، تقدس و طہارت، بلندیٔ کردار کو بہت زیادہ دخل ہے ۔ ایک ہی قسم کا ظلم اگر دو شخصوں پر ہو جن میں سے ایک کی شخصیت تقدس و طہارت کے لحاظ سے زیادہ مسلم ہو تو اسی کی مظلومیت بہ نسبت دوسرے مظلوم کے زیادہ جاذب اور مؤثر ہو گی ۔ امام حسین علیہ السلام کی مظلومیت کی جاذبیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تقدس و طہارت کے اعتبار سے اس وقت آپ کی ذاتِ مبارک اپنی آپ مثال تھی ۔ جس کی شہادت ایک طرف قرآن دے رہا تھا اور دوسری طرف پیغمبر کے ارشادات اور عملی نمونے دے رہے تھے آیتِ تطہیر اور مشہور حدیث "حسین منی وانا منہ" اس تقدس و طہارت کے سمجھانے والے ارشادات میں سے ہیں ۔ حسین کو گود میں لینا، پیار کرنا سینے پر سلانا ۔ پشتِ مبارک پر سوار ہو جانے کی وجہ سے سجدہ کو طول دینا، فرشِ مسجد پر اونٹ بننا اور سوار کرنا، زلفیں بجائے مہار کے دینا اور آوازِ شتر سے مشابہ آواز بنا کر دلجوئی کرنا، یہ سب اسی تقدس اور طہارت کے مظاہرات تھے جس کی قرآن نے "لیطہرکم تطہیراً" کہہ کر تصریح کی تھی ۔ یہ تقدس و طہارت ہی کی بنا پر شخصیت کی بلندی تھی کہ اس وقت بھی جب کہ زمانہ کروٹیں لیتے لیتے اموی دور کی ہیئت میں اوندھا پڑا ہوا تھا ۔ اور خاندانِ رسالت کے لیے تاریک ترین دور آ چکا تھا مگر عام اہلِ اسلام کے نزدیک اتنا احترام تھا کہ پا پیادہ حج کو روانہ ہوئے ہیں چلتے چلتے حاجیوں کا قافلہ مل جاتا ہے نظر پڑتے ہی لوگ سواری سے اتر پڑتے ہیں ۔ اور ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگتے ہیں ۔ کچھ لوگوں کی طاقت جواب دے جاتی ہے ۔ سعد بن وقاص جو سن رسیدہ تھے اور صحابیٔ رسول کہے جاتے تھے ان سے آ کر کہتے تھے کہ آخر کہاں تک ہم لوگ چلیں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ سوار ہو لیں ۔ اور یہ دونوں پیغمبر کے دوش پر سوار ہونے والے پیدل راستہ طے کریں یہ کہنے کے لیے سعد بن ابی وقاص سے کارِ سفارت لیا جاتا ہے، خود مسلمانوں کی جرأت نہیں ہوتی کہ آ کر عرض کریں ۔ سن رسیدہ صحابی سے کہلواتے ہیں، وہ آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ حضور بعض لوگوں سے پیدل اب نہیں چلا جاتا مگر آپ کو پیدل دیکھ کر ان سے سوار بھی نہیں ہوا جاتا لہٰذا اب آپ سوار ہو جائیں ۔ تاکہ یہ لوگ بھی سوار ہو سکیں، لیکن امام نے فرمایا کہ ہم عہد کر چکے ہیں کہ خدا کے گھر تک پیادہ جائیں گے ۔ لہٰذا ہم تو اپنا رویہ بدل نہیں سکتے ۔ ہاں لوگوں کو زحمت میں مبتلا رکھنا بھی ہم کو گوارا نہیں لہٰذا ہم راستہ بدلے دیتے ہیں ۔

یہ شخصیت کی انتہائی بلندی ہی تو تھی کہ ابن عباس جن کی بزرگی مسلم ہے وہ سوار ہوتے وقت رکاب تھامتے تھے اور جب کوئی معترض ہو کر کہتا تھا تو آپ فرما دیتے تھے تمھیں کیا معلوم یہ کون ہیں ۔ یہ میرے لیے باعثِ شرف ہے اور یہ انعامِ خداوندی ہے کہ مجھ کو قدرت نے اس کا موقع دیا ہے ۔

شخصی عظمت کا عالم یہ تھا کہ لوگ ان کے مقابلے میں اپنے باپ کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے ۔ سنیے ایک شخص نے نذر کی کہ اگر

فلاں کام ہو گیا تو قریش کی سب سے بڑی شخصیت کے قدموں پر تیل کی مالش کروں گا۔ ایفاء نذر کا وقت آیا تو اس کو قریش کی عظیم ترین شخصیت کی تلاش ہوئی۔ جاہلوں نے اس کو مخزومہ کا حوالہ دیا اور کہا کہ جاؤ ان کے قدموں پر مالش کر آؤ وہ آیا اور عمل کرنا چاہتا ہی تھا کہ اس کا بیٹا بیٹھا تھا اس نے واقعہ دریافت کیا اس نے اپنی منت بیان کی اس نے کہا ہرگز ایسا نہ کرنا تو اپنی نذر سے ہلکانہ ہو گا ارے یہ سمجھیا گیا ہی جاہلیت کے دور کا خیال اپنے دماغ میں لیے بیٹھا ہی جب کہ وہ بزرگ ترین انسانیت خیال کیا جاتا ہی۔ جاؤ دونوں سرداروں کے مکان پر اگر نذر پوری کرنی ہی اور یہ خدمت انجام دو کیونکہ ان کے ہوتے دوسرا افضل نہیں ہو سکتا۔

یہ تو خیر عام بیباک کا سوال تھا ایسے جسور اور جری شہنشاہ کو جو اپنے اغراض و مقاصد کے خلاف فرمان رسول سے بھی معارضہ کر بیٹھتا تھا۔ آپ نے اس وقت ٹوک دیا۔ جب کہ وہ شہنشاہیت کے انتہائی نقطۂ عروج پر تھا۔ اور اس نے تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ سچ کہتے ہو تمھارے ہی باپ کا منبر ہی میرے باپ کا منبر نہیں ہی۔ اور اٹھا کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور کہا کہ یہ بال ہمارے سر پر آپ کے باپ کے سوا کسی اور نے اگائے ہیں۔

اب ایسی عظیم شخصیت جب مظلوم قرار پائے گی اور ظلم بھی ایسا ظلم جس میں یہ مقدس و مطہر ہستی خود اپنی مثال ہو۔ یوں تو دنیا میں بہت سے لوگوں پر بڑے بڑے مظالم ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگ لوٹے گئے ہیں۔ اور بہت سے بے گناہ قتل کیے گئے ہیں۔ پاکیزہ اور مقدس ہستیوں میں بھی بہت سی شخصیتوں پر مظالم ہوئے ہیں۔ لیکن دوسری ہستیوں میں انفرادی حیثیت سے جو مظالم ملیں گے وہ امام حسین کی ذات پر اور زیادہ شدت کے ساتھ۔ اجتماعی حیثیت سے نظر آئیں گے۔ تو پھر اس کی مظلومیت کی اثر اندازی بھی خود اپنی مثال ہو گی۔ اب صرف انسانی دل و دماغ رکھنے والے ہی نہیں پتھر کے جگر سے بھی خون تراوش کرے گا کیونکہ یہاں انتہا درجہ کی صرف ایک مظلومیت ہی نہیں ہی بلکہ انتہائی بلند مقصد کے لیے انتہائی مظلومیت ہی۔ اس سے زیادہ مظلومیت کا تصور کرکے فرض کیجیے کہ کوئی اس کا ثانی بن جائے لیکن یہ سوال سامنے آئے گا کہ اتنے شدائد اور ایسے مظالم کیوں برداشت کیے اگر اس "کیوں" کے

جواب میں کوئی بلند مقصد نہیں ہی۔ تو یہ مظلومیت کسی ہمہ گیر اثر اور عالمگیر جاذبیت کی مالک نہ ہو گی کتنے ہی شدید مصائب کا سامنا کیوں نہ ہو۔ امام حسین علیہ السلام کے پیش نظر ایک بلند ترین مقصد تھا اور وہی تھا جو خدائی مقصد کے ساتھ اتحاد کامل رکھتا تھا۔ جس کے لیے خالق نے انسانوں کو خلق کیا تھا۔ جس کی تکمیل و تبلیغ کے لیے اس نے ہزاروں پیغمبروں کو پیغام کا امین بنا کر بھیجا تھا اور جس کے لیے اس نے خاص کر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا تھا یعنی انسانوں کو ان کی صحیح قدر و قیمت منصب و مقام کا احساس پیدا کرانا یا دوسرے لفظوں میں اس کی نگاہ توجہ کو مادیت سے ہٹا کر روحانیت کی طرف موڑ دینا، کائنات سے ہٹا کر روح کائنات کی طرف متوجہ کر دینا وہ مشاہدہ پرستی سے کھینچ کر ایمان بالغیب کی منزل پر پہونچا دینا، اسی ایک لفظ کی وسعت میں تمام انسانی صفات، صداقت، حقانیت، مساوات، عدل، ثبات و استقلال، ضبط و صبر، ایثار و قربانی حق پروری و راست کرداری سب کچھ مندرج ہی۔

درحقیقت امام حسین علیہ السلام نے اپنے اس کارنامہ سے خدا کے وجود پر ایسا زبردست برہان قائم کر دیا جو کبھی مٹایا نہیں جا سکتا تمام انبیاء و مرسلین کا وجود اور ان کی وہ تبلیغیں جو انھوں نے خدا کی راہ میں برداشت کیں اگر خدا کے وجود کا ثبوت ہیں تو امام مظلوم کی ذات ان سب میں روشن تر ثبوت ہی۔ اتنے شدید مصائب کو خدا کی راہ میں برداشت کرنا اور خدا کے لفظ کا کوئی مصداق نہ ہونا عقل کے نزدیک کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس مادی ماحول کے علاوہ جس کو کسی روحانی زندگی کا تصور نہیں، تصدیق ہو گی اور ہی اتنے شدائد کے مقابل استوار رہ سکتا ہی ایک لامذہب انسان بھی اگر اس اختیاری خود پسند کردہ مظلومیت پر غور کرے گا۔ تو اس کا دل خدا کی طرف مائل ہو گا۔ اسی بنا پر جناب سرور کائنات نے ارشاد فرمایا تھا۔ "حسین منی و انا منہ" یعنی میں اسی لیے آیا تھا کہ انسانوں کو خدا کا یقین دلاؤں کیونکہ یہی یقین ہر بھلائی کا مقدمہ ہی تو میرے اس مقصد کی تکمیل ایک وقت میں حسین کے ذریعہ سے ہو گی اور مادیت کے بالکل بے حقیقت ہونے کا بلند ترین اور روشن ترین ثبوت کربلا میں حسین اور اصحاب حسین کے ذریعے سے انسانی دنیا کو ملے گا۔ کہنے کو تو ہزاروں قائدوں نے قول و عمل سے موقع بموقع اس کا ثبوت دیا ہی لیکن حقیقت یہ ہی کہ عملی طور پر کربلا میں اس کے لیے جیسا ثبوت پیش کیا گیا

کبھی نظر سے نہیں گزرا جہاں بچوں، لڑکوں جوانوں، ادھیڑ عمر والوں بوڑھوں، مردوں اور عورتوں سب نے یک دل اور یک زبان ہو کر پیغمبر اسلام کے پہونچائے ہوئے پیغام کو ان نوں تک ایسا پہونچایا کہ جو آج تک غافلوں کو رہ رہ کے چونکا دیا کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لوگ آج بھی خدا کے منکر اور اس سے غافل ہیں لیکن یہ یا تو ایسے لوگ ہیں جن کے کانوں تک شہید اعظم کا کارنامہ نہیں پہونچا لہذا ضروری ہے کہ ان تک حسینی پیغام اور حسینی کارنامہ پہونچایا جائے اور بجائے یہ کہنے کے کہ "واعظ پر حسینی کارنامہ کا تذکرہ حرام ہے" یہ کہا جائے کہ ہر جاننے والے پر واجب ہے کہ یہ تذکرہ کرے۔ یا ایسے اشخاص ہیں جنھوں نے اس کارنامہ پر غور نہیں کیا، حسینی سیاست پر غور نہیں کیا۔ ان کو غور کرنا چاہیئے اور اس کے اسباب و نتائج تک پہونچنے کی فکر کرنا چاہیئے۔

اس مظلومیت میں ایک خاص اثر اور قوت پیدا ہو جانے کا سبب اس کا خود اختیاری ہونا بھی ہے۔ یہ بات اس شخص کو حاصل نہیں ہو سکتی جو ایسے یا اس سے بھی زیادہ مصائب جبراً برداشت کرے۔ حضرت نہایت آسانی سے اس مصیبت کو بیعت کر کے ٹال سکتے تھے مگر یہی سوال تو امام کے لیے مشکل نہیں محال تھا وہ اور تھے جن کے لیے یہ سوال نہایت آسان تھا۔ وہ خلافت الٰہی اور پیغام نبوی کے امین نہ تھے۔ حسین تو امین الٰہیہ کے امین تھے یہی تو بات تھی کہ حسین سے بیعت لینے پر اس قدر ضد تھی اور حسینؑ کو بیعت نہ کرنے پر ثبات و استقلال تھا۔ حسین تو حسین تھے اس گھرانے کے کسی بچے نے بھی بیعت کی طرف رغبت نہیں کی وہ ہولناک مناظر دیکھ کر سہم ضرور گئے لیکن بیعت کی طرف ایک لمحہ کے لیے بھی متوجہ نہیں ہوئے۔

اس کارنامہ کے ضمن میں امام نے یہ بھی دکھلا دیا کہ مختلف اقوام و قبائل، رنگ، نسل، سن و سال کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اتنے زبردست اتحاد کے ساتھ یوں جمع کرتے ہیں۔ دیکھو کتنا شدید اتحاد ہماری جماعت میں ہے۔ یزیدیت اتحاد کا ایسا مثالی کارنامہ نہیں پیش کر سکی۔

یہ اور اس کے ماسوا عقول انسانی سے بالاتر کتنے ہی وجوہ، خصوصیات اور جزئیات ہیں جنھوں نے اس کو ابدی زندگی عطا کر دی ہے جن میں سے کسی ایک کا بھی بیان کرنا الفاظ کی محدود قوت سے باہر ہے۔

کہتا ہے کون ذکرِ شہادت حرام ہے

ابو العدل سید فاروق صاحب رضوی قیصر وارثی حنفی، منیجر ماہ نامہ سُنی لکھنؤ

جس دل میں حبِ آلِ نبیؐ کا اثر نہیں
تاریک ہے وہ، نور کا اس میں گزر نہیں

جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں حسینؑ
ان کے عدو کا باغِ جناں میں گزر نہیں

پانی جو بند کرتا ہے آلِ رسولؐ پر
کیا یہ گروہ اُمتِ خیر البشر نہیں

دنیا کے ہر الم کا تو ملتا جواز ہے
جائز غمِ حسینؑ ہی دل میں مگر نہیں

منکر ہے جو محبتِ آلِ رسولؐ کا
مومن ہے کیا؟ تمھیں کہو! کافر اگر نہیں

ظالم غمِ حسینؑ میں رونا ہو گر حرام
اس غم میں کیا رسولؐ کی خود چشم تر نہیں

کہتا ہے کون ذکرِ شہادت حرام ہے
کیا خود یہ ذکر کرتے تھے خیر البشر نہیں

اصحاب پاک ہی ہیں ستارے رسولؐ کے
حسنینؑ کیا رسولؐ کے لختِ جگر نہیں

شانِ نزولِ آیۂ تطہیر دیکھ لو
گر پنجتن کے وصف کی تم کو خبر نہیں

نیزہ پہ آہ تم نے چڑھایا ہے جس کو آہ
آغوش میں رسولؐ کے تھا کیا یہ سر نہیں

بکھرے پڑے ہیں نور کے ٹکڑے یہ خاک پر
ان میں سے کون غیرتِ شمس و قمر نہیں

مجبوریاں حسینؑ کو تھیں ورنہ حشر تک
کعبے سے کرتے جانب کوفہ سفر نہیں

بہ وقتِ ذبح لب پہ دعا تھی حسینؑ کے
جب تک ہے دم اُٹھے ترے سجدے سے سر نہیں

منکر مقامِ حیدرؑ و حسنینؑ کا ہے کیوں؟
حضرت نے کیا اٹھایا انھیں دوش پر نہیں

کافر جو مومنوں کو کہے خود وہ کون ہے
سب کی خبر ہے پر تمھیں اپنی خبر نہیں

قیصرؔ جسے ہے دشمنی آلِ رسولؐ سے
ایماں نصیب ہوگا اسے عمر بھر نہیں

حسینؑ نے بعنوانِ خاص توحید کا سبق دیا

(ابو الخلیل راحت رضوی بھیکپوری حسینی مشنری)

زمین کرب و بلا میں تمام مصائب و آلام کو جھیل کر مظلوم کربلاؑ نے کس طرح توحید کا درس دیا۔؟

سُنئے! سرکار حسینیؑ کی بہادرانہ اور دلیرانہ جان بازی نے صاف طور سے دلوں پر واضح کر دیا کہ اگر کوئی متوجب خوف و رجا اور کوئی زبردست بادشاہ، قوی ترین طاقت، یکتا حاکم علی الاطلاق سلطان اس پردے میں موجود نہ ہوتا جس کے حکم کی مخالفت نہایت ناگوار نتیجہ پیدا کرنیوالی ہے جس کا امر ہرگز قابل تاخیر نہیں جس کی اطاعت فرض عقل سے، جس کے آگے ہر ذی ہوش و عقل کو سر تسلیم خم کرنا واجب عینی ہے تو ہرگز امام حسین علیہ السلام جیسا اپنی جان کو اس طرح بے کھٹکے ایسے سخت ترین مصائب میں نہ ڈالتا، کبھی اتنی زحمتیں بے سود اپنے جسم پر اٹھاتا، ہرگز اس کوہ بلا کو خوشی خوشی اپنے سر پر نہ اٹھا لیتا، جس کے اٹھانے سے آسمان و زمین بھی عاجز تھے چہ جائیکہ آدمی، لیکن حسینؑ کے اس طرز عمل نے بتایا کہ بیشک اس پردے میں کوئی بڑے سے بڑا ملک الملوک ہے جس کے قبضہ قدرت میں حسینؑ کی جان ہے جس کی مِلک میں حسینؑ کا جسم ہے، جس کے ہاتھ میں حسینؑ کا سارا اثاثہ ہے جس کی عطا کی ہوئی حسینؑ کی ساری بضاعت ہے، جس کا حکم ناطق ہے جس کا امر واجب الاطاعت جس کی خوشی ہر زحمت و ایذا کا بدلہ ہے جس کی رضا کا حاصل کرنا لازمۂ بشری ہے جو کبھی کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا جو یقیناً تمام

ایذاؤں کا بدلہ اچھے سے اچھا دیگا جو رؤف بھی ہے اور رحیم بھی، جو قہار بھی ہے اور جبار بھی، جو مظلوم کا طرفدار بھی ہے اور ظالم کا برباد کرنیوالا بھی، یہی معنی اقرار توحید کے ہیں۔

اب ایک بات اور بھی سمجھ میں آئی کہ خدا کا پسندیدہ دین، دین اسلام ہے (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ) جس کی ایک لاکھ ۲۴ ہزار پیغمبروں، رسولوں نے اپنی بساط بھر حفاظت فرمائی خاص کر حسینؑ کے جدّ بزرگوار (احمد مختار)، پدر بزرگوار (حیدر کرار) برادر نامدار (حسن مجتبیٰؑ) نے اس کے استحکام و اشاعت کے لئے بڑا ہی ریاض فرمایا۔ وہ سنہ ۶۱ھ میں بری طرح برباد ہو رہا تھا تو سرکار حسینیؑ نے اپنی تمام کائنات اس کی بقا کے لئے قربان فرمادی۔

حمید بن مسلم (لشکر یزید کے سات نامہ نگاروں کا افسر اعلیٰ) بیان کرتا ہے کہ میں نے روز عاشورہ عجیب و غریب بات دیکھی کہ جوں جوں حسینؑ پر مصیبتیں نازل ہوتی تھیں آپ کا چہرہ مبارک چمکتا جاتا تھا خاص کر جب ننھا مجاہد (شیرخوار علی اصغرؑ) باپ کے ہاتھوں پر خون کی کلیاں کرتا ہوا ٹھنڈا ہو گیا تو حضرت کا چہرہ مبارک اس طرح چمکنے لگا جیسے چودھویں رات کا چاند، جس کے معنی یہ ہوئے کہ مالک جہاں حسینؑ کی تمام کائنات اسلام پر قربان کر چکا ہے ایک حقیر سا تحفہ اور بھی حاضر ہے گر قبول افتد زہے عز و شرف یہ بھی قبول ہو گیا، حسینؑ کامیاب ہو گئے۔ روحی و ارواح المومنین لہم الفدا

انقلاب کعبہ بھی ہے [illegible] دنیا میں
حق ہے بود و بقا کی پیامِ حسینؑ
آج خلق کربلا ہے [illegible] حسینؑ
[illegible] ہے جہاں [illegible] حسینؑ

اکبر نقوی

[illegible]

"تم نے"

(نتیجہ فکر جناب کنور سورج نرائن صاحب ادب سیتاپوری)

نظر نظر میں جو کعبے بنا دیئے تم نے
حسینؑ کون سے جلوے دکھا دیئے تم نے

نظر سے پردۂ غفلت اٹھا دیئے تم نے
حقیقتوں کے وہ جلوے دکھا دیئے تم نے

جمک سی جن کی منور ہے آجتک اسلام
چراغ ایسے بہتر جلا دیئے تم نے

حسینؑ عظمت انسانیت بچانے کو
لحد میں گود کے پالے سلا دیئے تم نے

بچھے تھے جو رہِ ایماں پہ چلنے والوں کی
پلک سی چن کے وہ کانٹے ہٹا دیئے تم نے

سکون و صبر سے لہرا کے پرچم اسلام
قصورِ کفر کے گنبد ہلا دیئے تم نے

مٹے نہ تیرگیٔ کفر کیوں زمانے سے
چراغ دیں کے بہتّر جلا دیئے تم نے

نہ ڈگمگائے قدم تشنگی کی شدت سے
سکون و صبر کے دریا بہا دیئے تم نے

بہا کے خون خود اپنا اور اپنے کنبے کا
جو شعلے کفر کے بھڑکے بجھا دیئے تم نے

شہیدِ ظلم و جفا خود پرست ذہنوں میں
محبتوں کے تلاطم اٹھا دیئے تم نے

حسینؑ چشم عنایت ذرا ادب پر بھی
نہ جانے کتنے مقدر بنا دیئے تم نے

تاریخ عالم کا اچھوتا انقلاب

(سید تہذیب الحسن صاحب جعفری۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی علیگ سیتاپور)

آج تاریخ عالم کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ کے بعد جب کہ دنیا ایک عجیب اضطرابی دور سے گذر رہی ہے اور قومیں اعصابی کشمکش کا شکار ہیں۔ بھوک اور قحط کی گھنگھور گھٹائیں عالم انسانیت پر یاس و الم انگیزی کی بارش کر رہی ہیں اور ضمیر کی بھیانک تاریکی میں نجات کا راستہ گم نظر آتا ہے۔ زندگی ایک مستقل عذاب بن چکی ہے اور انسانی کردار کی خوبیاں نظروں سے اوجھل سی ہوتی جاتی ہیں۔ فطری طور پر ہمیں ایک ایسے رہنما ایک ایسے پیشوا کی تلاش ہوتی ہے جو پھر سے دنیا کو صلح و آشتی کا درس دے۔ انسان کے بھولے ہوئے سبق کی یاد تازہ کرے، اپنے بے پناہ جذبۂ ایثار و استقامت سے انسانی کردار میں وہ آہنی عزم پیدا کر دے کہ ظلم و جور کے سیلاب ٹکرا کر اپنی ناکامی کا خود احساس کرتے ہوئے واپس جائیں مگر اس کوہِ عزم و ثبات کے تیور پر بل نہ آئیں۔ انقلابات کی آندھیاں اپنے پورے جوش و خروش کے ساتھ آئیں مگر انسانی ضمیر کی قندیل اخلاقی خوبیوں کو اور اجاگر کر کے پیش کرے۔ انسانیت کے جسدِ مردہ میں تازہ روح پھونک دیجئے اور اس دکھ کی نگری" کو پھر سے "جنتِ ارضی" بنا دے۔

تاریخ کے اوراق کو الٹ جایئے۔ قوموں کے عروج و زوال کے افسانے پڑھ جایئے۔ انقلاباتِ عالم کے تذکروں کا مطالعہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کیا کوئی سانحہ واقعۂ کربلا سے عظیم تر یا اُس سے مساوی یا نہ منزل پر دکھائی دیتا ہے۔ کیا کوئی مجاہد حسینؑ شہید سے زیادہ کشش انگیز شخصیت کا مالک نظر آتا ہے؟ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اس سانحۂ عظیم اور اس کے عظیم المرتبت ہیرو کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کیوں نہ ہو؟ حسینؑ کن گودوں میں پرورش پا چکے تھے؟ رسولؐ اسلام کی تربیت جن کی زلزلہ افگن اور انقلاب بداماں تعلیم نے قوموں کی قسمتیں بدل دیں۔ انسان کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر دیا انسانی مزاج میں اعتدال پیدا کر کے کشمکش حیات میں سکون کی صورتیں پیدا کیں۔ حسینؑ کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ علیؑ و فاطمہؑ کی گود اور حسنؑ جیسے صلح جو اور امن پسند بھائی کی معیت میں حسینؑ زندگی کے بیش بہا تجربات حاصل کر چکے تھے بچپن ہی سے حلم۔ مروت۔ ایثار۔ استقامت وغیرہ جیسے اہم صفات حسینؑ میں نمایاں تھے جو ظاہر کر رہے تھے کہ حسینؑ کسی معمولی شخصیت کے مالک نہیں۔ کربلا جیسے عظیم واقعہ کے لئے حسینؑ ہی جیسے بلند مرتبہ اور صاحب عزم انسان کی ضرورت تھی۔

واقعہ کربلا کی عظمت کا کچھ اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم دنیا کے چند اہم انقلابات کا سرسری جائزہ لیں جنھوں نے قوموں کی زندگی پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ سب سے پہلے ہماری نظر انقلاب فرانس پر پڑتی ہے۔ لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کا یہ انقلاب حقیقتاً فرانس کے ظالم و جابر فرمانرواؤں کے ظلم و جبر و تشدد سے نجات حاصل کرنے کی ایک متفقہ کوشش تھی۔ روح آزادی نے عوام کے دل میں تڑپ پیدا کی۔ اور ان کو ان کے اضطراری عمل میں متحد کیا مگر کتنے ہی تھے کہ انقلابیوں کے گروہ میں شامل ہوتے ہوئے بھی۔ وہ پہلے ٹھہرے کہ کون کی پا پر اپنے ضمیر کو بیچنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور اس انقلاب کے اثرات کو محدود کر دیا۔ بادشاہ اور ملکہ کا خون رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا اور بعد میں پھر وہی پچھلا دور طاری ہو گیا۔ ان حالات کے ماتحت

انقلاب فرانس زندگی کے کسی محدود شعبے میں بھی رہنمائی سے قاصر ہے۔
انگلستان میں چارلس اوّل کی خود مختارانہ حکومت نے عوام کو جنگ آزادی میں حصّہ لینے پر مجبور کیا اور ۱۶۴۹ء میں رعایا نے اپنے بادشاہ کو قتل کر کے کرامویل کی فوجی حکومت میں کچھ سکون محسوس کیا لیکن ابھی گیارہ سال ہی گذرے تھے کہ شہنشاہیت پھر بحال ہوئی اور چارلس دوم انگریزوں کا فرماں روا بخوشی منظور کیا گیا۔ اور ادھر دھندا انتقامی جذبہ کارفرماں نظر آنے لگا۔ یہاں تک کہ کرامویل کی لاش کو قبر سے نکال کر سولی دی گئی۔ کیا دنیا ایسے انقلاب کو اپنے لئے نمونہ بنا کر کسی صورت میں بھی نجات کی توقع رکھ سکتی ہے؟

انقلاب روس بھی بالشویک تحریک کا ایک لازمی نتیجہ تھا لینن کا خواب شرمندۂ تعبیر تو ضرور ہوا۔ مگر روس کو دور حاضر میں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ ظاہر بہ ظاہر ناقابل حل معلوم ہوتے ہیں۔ روس بین الاقوامی معاملات میں خود ہی قومی برتری کی دلدل میں پھنس گیا۔ زبان سے مساوات کا ادّعا مگر عمل کا دفتر اسکے برخلاف کسی دوسرے جذبات کی غمازی کر رہا ہے۔ روسی زارہ کے مظالم سے اتنا تنگ آئے کہ اپنے زعم ناقص میں خدا کا جنازہ نکال دیا اور اُسے اپنے ملک کی سرحد سے باہر کر دیا۔ اس کے رحم سے مایوسی نے اُن کو انتہائی پست اخلاقی حالت پر پہونچا دیا۔ مگر قدرت بھی منتظر تھی کہ یہی عاصی اور نافرمان بندے اسی پالنے والے کے حضور میں سرِ نیاز جھکائے نہ دکھائی دیں تو سہی! زمانہ نے کروٹ بدلی ۱۹۴۱ء کا پرہول سال جرمنی طیارے روسی مقبوضات پر آگ کی بارش کر رہے ہیں۔ اور روسی گرجا گھروں میں فتح کی دعائیں ہو رہی ہیں — یہ کس سے! اُسی خدا سے جسے روسی بزعم خود اپنے ملک سے نکال چکے تھے…
… مگر اُس رحمان و رحیم کا دامن رحمت اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے ان گمراہ بندوں کی التجاؤں کو رد نہیں کرتا۔ ہر مظلوم کے دل سے نکلی ہوئی پر درد صدا اُس کے دریائے رحمت کو جوش میں لانے کے لئے کافی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کی توہین آمیز شکست نے جرمنوں کے دل میں بھی انتقامی آگ روشن کر دی۔ ہٹلر نے بھی اسی جذبہ سے فایدہ اٹھا کر جرمنوں کو متحد کیا اور عالم انسانیت کو دوبارہ جنگ کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا، جن کے اثرات مابعد ہماری زندگی کو آج بھی جہنم بنا رہے ہیں۔ اس تحریک میں تعمیر کی جگہ تخریبی عناصر کس حد تک کام کر رہے تھے۔ اسکا اندازہ لگانا ذرا دشوار ہے۔

جاپان مغربیت کے نقش قدم پر چلکر بام ترقی پر پہونچا مگر اس کے پروگرام میں بھی ملک گیری کی ہوس اور قومی وقار کا غلط تصور جزو اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تو مادی ترقی کا ایک نمونہ ہو سکتا ہے۔ مگر احساس فرائض کا فقدان اس پروگرام میں بھی بری طرح محسوس ہوتا ہے۔

ان انقلابات کے تذکروں میں ٹرکی کا انقلاب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی ضربوں نے ٹرکی کو مفلوج کر دیا تھا۔ اور یہ کام مصطفےٰ کمال جیسے سخت اور جوشیلے مدبر کا تھا کہ ٹرکی کی مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑا دیا لیکن اس نے ایک ایسی زبردست ٹھوکر کھائی جس نے اس انقلاب کی حقیقی عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ کیا دنیا کا کوئی سمجھدار شخص اسے قابل تعریف فعل کہہ سکتا ہے کہ اصلاح کے جذبہ کے ماتحت انسان اپنے خصوصیات کو چھوڑ کر دوسروں میں مدغم ہو جائے۔ عربی زبان، عربی رسم الخط اور اسلامی لباس و طرز تمدن کا خاتمہ ہرگز قابل ستائش نہیں کہا جا سکتا ظاہر بیں نگاہیں اسے فتح سے تعبیر کریں، مگر حقیقت کی نگاہ تو اسے شکست ہی کا نام دے گی۔

ایران نے ٹرکی سے اسقدر اثر قبول کیا کہ اپنے اصلاح کے پروگرام کو وسعت دینا شروع کی اور حد و دسے اسقدر متجاوز ہوا کہ دین و سیاست کے اصولوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے پہ کمر باندھ لی۔ رضا شاہ پہلوی نے تو اسلامی زبان اور اسلامی طرز معاشرت ہی کی کوئی اہمیت باقی نہ رکھی اور اس نکتے کو بالکل فراموش کر دیا کہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

یقیناً اُن معرکوں میں بعض شخصیتوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور قوم و ملک اور مفاد عامہ پر مرٹنے کے بڑے اعلیٰ نمونے پیش کئے مگر سچ عرض کرتا ہوں کہ احساس فرائض اور بے لوث قربانی و ایثار کی وہ اعلیٰ ترین مثالیں جو حسینؑ مظلوم نے پیش کیں وہ تاریخ عالم میں بے نظیر ہیں۔

کون ہے؟ جو جوان، عزیز اور جاں نثار بھائی کی لاش اٹھانے جائے اور ثابت قدم رہے۔ نوجوان، خوشرو اور مطیع بیٹے کو برچھی سے شہید ہوتا ہوا دیکھے اور اپنا سر سجدۂ خالق میں جھکا دے۔ یتیم بھتیجے کی روندی ہوئی لاش سامنے ہو اور اپنی جگہ بہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا رہے۔ پیاری اور معصوم بیٹی کی العطش العطش کی صدائیں اس کے ارادہ میں تزلزل نہ پیدا کر سکیں۔ حد یہ ہے کہ اپنی گود میں چھ ماہ کے بچے کو تیر سے شہید ہوتا ہوا دیکھے اور اس کے لبوں پر احساس فخر و کامرانی ایک فاتحانہ مسکراہٹ کی صورت میں ظاہر ہو۔

کربلا کے میدان میں بچے بچے نے عجیب و غریب کارنامے انجام دیئے ہیں مہیب تاریک اور ڈراونی عاشور کی رات تاریکی کا تسلط، فوجوں کے درمیان میں مظلوم مسافر تین دن کی بھوک اور پیاس میں محصور اور حسینی عزم ان بلند شوق سے اور مضبوط ہو رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو رخصت کرنا چاہتے ہیں چراغ گل کر دیا جاتا ہے "جہاں چاہو چلے جاؤ۔ یہ لوگ محض میرے خون کے پیاسے ہیں۔ جب مجھے تنہا پائیں گے تو کسی کے پیچھے نہ جائیں گے۔ میں تمہاری گردنوں سے بیعت اٹھائے لیتا ہوں اور ضامن جنت ہوتا ہوں"۔

حسینؑ نے ان سب کے ضمیر پر بڑا بوجھ ڈال دیا۔ مگر واہ رے جانبازو! ان جیالے سورماؤں کے خون میں گرمی پیدا ہوتی ہے۔ دلی جذبات الفاظ کی شکل اختیار کرتے ہیں "مولا ہم اس لئے آپ کا ساتھ چھوڑ دیں کہ آپ کے بعد زندہ رہیں۔ پھر آخر ہم آپ کے نانا کو روز قیامت کیا جواب دیں گے؟ اگر ہم ستر بار مارے جائیں۔ ہماری لاش کو جلا دیا جائے اور خاک کو ہوا میں منتشر کر دیا جائے اور پھر زندہ ہوں تو آپ کی نصرت سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتے"۔ حسینؑ نے اپنے جانبازوں کو کسوٹی پر کس لیا اور دکھا دیا کہ یہ کسی مجبوری سے نصرت پر آمادہ نہیں بلکہ اپنے عمل کے مختار بن کر ساتھ آئے ہیں۔ ان کی زندگیاں حسینؑ واپس کر رہے ہیں مگر وہ ہیں کہ اپنی جانیں اپنے امامؑ کے قدموں پر ڈالے دے رہے ہیں۔

رات بھر مائیں بچوں کو خیموں میں سمجھاتی رہیں اور عاشور کے دن میدان جنگ میں بھیج کر ان کی تیغ زنی کے تماشے اور اپنی امیدوں اور مرادوں کی بربادی کے ہولناک مناظر دیکھتی رہیں۔ تاریخ نہیں بتا سکتی کہ ان دلشکن حالات میں حسینؑ کے کسی ساتھی نے کوئی حوصلہ شکن کلمہ تک زبان سے ادا کیا ہو، مگر اتنا ضرور ملتا ہے کہ اگر کسی ہاشمی بچے سے موت کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو وہ یہی جواب دیتا ہے کہ "موت تو مجھے شہد سے زیادہ شیریں معلوم ہوتی ہے۔" رات بھر جانباز اس انقلابی صبح کا انتظار کرتے رہے جو عالم انسانی میں ایک نئے دور کا آغاز بننے والی تھی۔

صبح عاشورہ نمودار ہوئی اور صلح کے جملہ امکانات ختم ہونے کے بعد جنگ عملاً شروع ہونے والی ہے کہ حسینؑ کو پہلی فتح حاصل ہوئی۔ یعنی یزیدی فوج کا مقتدر افسر حرؒ بن یزید ریاحی عیش و آرام عزت و جاہ پر لات مار کر حسینؑ کے ساتھ مرنے کے لئے آپ کا ساتھی ہو گیا۔ حقیقتاً یہی وہ ذہنی انقلاب تھا جو حسینی کارنامہ کا منتہائے مقصد کہا جا سکتا ہے سچ یہ ہے کہ حرؒ ہی تنہا شخص نہ تھا جو حسینی کارنامہ کا منتہائے مقصد کہا جا سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ حرؒ ہی تنہا شخص نہ تھا جس کے دل میں احساس فرائض کی تڑپ پیدا ہوئی ہو۔ بس حرؒ میں اور دوسرے اشخاص میں فرق صرف اسقدر تھا کہ حرؒ کا اقدام برمحل جرأت کردار کا آئینہ دار ہے۔

کربلا کی جنگ معنوی حیثیت سے جنگ ہی کہلانے کی مستحق نہیں ہے؟ تو حسینؑ کی فطرت آزاد اور ان کے ساتھیوں کی اُن صبر آزما حالات میں انتہائی بلندی کردار تھی کہ بہتر ۷۲ بھوکے پیاسے سورما ہزاروں کی سیر و سیراب فوج سے نبرد آزما

تھے۔ مخالف فوج بار بار اپنے طریق جنگ میں تبدیلی کر رہی تھی، حرب و ضرب کی جملہ چالیں استعمال کر رہی تھی مگر بھوکی پیاسی حسینی فوج ایک آہنی دیوار، عزم و استقلال کے پہاڑ کی طرح اٹل تھی۔ آفتاب بلند ہوتا رہا۔ جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔ حسینی انصار وفا کی حیثیت سے اپنی اور اپنی شاہزادوں کی امکانی حفاظت میں مصروف رہے۔ حسینؑ اور ان کے اعزا و انصار کی پیاس جنگل کی آگ کی طرح بڑھتی رہی

جب مخالف فوج کے افسران نے دیکھا کہ دست بہ دست جنگ میں ان بھوکے پیاسوں سے پیش نہیں پا سکتے۔ تو ایک دم ان مٹھی بھر شیروں پر (جنکی تعداد اب اور بھی کم ہو گئی تھی) چاروں طرف سے تیروں کی بارش شروع کر دی۔ اللہ اکبر! تیروں کا بے پناہ حملہ مگر واہ رے حسینؑ کے جاں بازو! تیروں کے استقبال کے لئے سینہ ہائے قفا کھول دیئے۔ پچاس جاں باز اسی جنگ مغلوبہ میں شہید ہو گئے مگر تاریخ خاموش ہے کہ کسی ہاشمی جوان کے کوئی زخم لگ گیا ہو۔ بس انصار حسین پروانہ وار اپنی خونِ لہدوں کی حفاظت میں مصروف تھے، نزع کے عالم میں ایک دوسرے سے وصیت ہوتی تھی کہ دیکھو تمھارے جیتے جی مولا پر آنچ نہ آجائے۔ روتے تھے تو حسینؑ کی تنہائی پر۔ درد تھا تو حسینؑ کی بے کسی کا فکر تھی تو حسینؑ کے بچوں کی پیاس کی!

ذرا غور تو کیجئے ان ہمت شکن حالات کا اور پھر حسینیوں کے احساس فرض کی گہرائی کا! جب کہ ابو ثمامہ صائدیؓ نے وقت ظہر حسینؑ سے آخری بار نماز پڑھانے کی درخواست کی، نہ تو ان بہاروں سے زیادہ اپنی موت کا کسی کو یقین ہو سکتا تھا اور نہ احساس فرض کا اس سے زیادہ کھلا ہوا مظاہرہ۔ نماز خوف طمانیت قلب کے ساتھ تیروں کی بارش میں ادا ہوئی۔ سعید و زہیر امامؑ کے سامنے سینہ سپر ہیں۔ مگر قوت ارادی کا کیا کہنا! کہ موت سے یہ عہد کر کے کھڑے ہوئے کہ جب تک حسینؑ نماز پڑھیں ہمیں ان کی محافظت کرنی ہے۔ نماز ختم ہوئی اور سعید نے دم توڑ دیا۔

بے شک کربلا کا سانحہ عظیم عالم انسانی میں حق و صداقت کی قوتوں کی دائمی فتح کا ابدی نشان ہے۔ زہیر ابن قین، مسلم بن عوسجہ، حبیب بن مظاہر، بریر بن خضیر، عابس بن ابی شبیب کی بے لوث قربانیاں جون، غلام ترکی اور شارب جیسے غلاموں کی خدمات۔ عباسؑ بن علیؑ، علی اکبرؑ، عونؑ بن علیؑ کا مجاہدہ، قاسم بن حسنؑ۔ عبد اللہ بن حسنؑ۔ عون و محمدؑ اور فرزندان مسلمؑ بن عقیل جیسے بچوں کا دلیرانہ اقدام اس سانحہ کی زینت میں چار چاند لگا رہا ہے۔

معرکہ کربلا میں حسینؑ ایک ایک جان نثار کی قربانی بارگاہ ایزدی میں پیش کرتے رہے۔ بارگاہ امامت کے پروانوں کی شمع زندگی رفتہ رفتہ گل ہوتی رہی۔ کبھی حسینؑ بچپن کے ساتھی حبیب کی لاش پر پہونچے۔ تو کبھی بھانجوں کے لاشے خیمے میں لائے۔ کبھی اپنے مہمان حرؑ کو نزع کے عالم میں ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھا تو کبھی قاسمؑ کا روندا ہوا لاشہ سامنے تھا کبھی عباسؑ کے آخری سلام نے کمر توڑ دی اور کبھی علی اکبرؑ جیسے ماہ رو بیٹے کے قتل نے بصارت زائل کر دی۔ بقول انیسؔ

کبھی لاش اٹھائی کبھی رو دیے
اسی شغل میں شاہ دن بھر رہے۔

گرمی کی شدت۔ آفتاب کی تمازت۔ تپتی ہوئی ریت دل میں اعزا و انصار کی مفارقت کے زخم۔ پیاس کی شدت اب درد و کرب کی تصویر یکہ و تنہا حسینؑ ہیں اور تیر و سنان نیزہ و شمشیر اور پتھروں کے زخم۔ نہ تو اس وقت کی حالت بیان کی جا سکتی ہے اور نہ احساس انسانی میں اتنی وسعت کہ حسینؑ کی اس مظلومیت کا تصور کر سکے۔ حسینؑ کا جہاد تو صبح ہی سے جاری تھا۔ جیسا جاویدؔ مرحوم نے فرمایا ہے۔

اُٹھائیں صبح سے لاشیں نہ کی فغاں اب تک
لڑائی ہیں شہ نے بہتر لڑائیاں اب تک

مگر پھر بھی حسینؑ صلح کی آخری کوششوں میں مصروف ہیں۔ آواز استغاثہ بلند ہوتی ہے اور لاشہائے شہدا منقلب ہو جاتے ہیں۔ مگر نہیں! ابھی حسینؑ کا وہ شتماہہ

انقلابی۔ حق و صداقت کا آخری حربہ باقی ہے۔ حسینؑ کی اس آخری قربانی نے یزیدیت کو اس کے اصلی رنگ روپ میں ظاہر کر دیا۔ یزیدیت کے چہرے سے انسانیت کی مصنوعی نقاب الٹ کر اسکی مکروہ شکل تمام دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ اور حسینؑ کے افسانے میں درد کی وہ چاشنی بھر دی کہ انسان کا دل خود بخود اسکی طرف کھینچنے لگا۔ اور یزیدیت پر وہ کاری ضرب لگائی کہ ان جہنمی اصولوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر چھوڑا۔ اور یزید کے اصلی مقاصد کو عالم انسانیت پر پوری طرح آشکارا اور واضح کر دیا۔ اس بے زبان کی خاموش رہنے نے فوج شام میں ایک تہلکۂ عظیم پیدا کر دیا۔ پیاسے بچے کا سوکھے ہوئے ہونٹوں پر اینٹھی ہوئی زبان کا پھیرنا جذبات انسانی پر وہ ضرب تھی کہ پتھر پگھلنے لگے مگر ایک تیر نے بچے کا گلا اور حسینؑ کا بازو چھید دیا۔ معصوم بچے نے داد طلب نگاہوں سے حسینؑ کے چہرے پر نگاہ کی۔ حسینؑ کے چہرہ پر افتخار آمیز فاتحانہ سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اور حسینؑ کے دل کا ٹکڑا۔ دنیا کا سب سے بڑا انقلابی تڑپ کر باپ کے ہاتھوں پر بے جان ہو گیا۔ حسینؑ کا آخری حربہ کامیاب ہوا۔ بچے کی آخری ہچکی کے ساتھ فطرت کی نبضیں چھوٹنے لگیں مگر حسینؑ جذبات انسانی کا پروردگار ہیں۔ انھیں ایک دُھن ہے اور وہ اُسی میں مگن ہیں۔ ناشکر گذار دنیا آج تو اپنے سب سے بڑے محسن، صداقت کے پیکر، امن و آشتی کے دیوتا کے جذبات کے ساتھ اس بیدردی کے ساتھ ہولی کھیل رہی ہے مگر کل اپنے کئے پر خود ہی پچھتانا پڑے گا اور اس کا بے پناہ ظلم حسینؑ کی فتح کے ڈنکے خود ہی بجوا دیگا

حسینؑ یہ تمام مظالم برداشت کرتے رہے مگر ان کے لئے بزدلانہ قوت اتنی ہی نفرت انگیز شے تھی جسقدر ذلت کی زندگی۔ ابھی تک حسینؑ کے صبر و ضبط کا امتحان تھا لیکن اب ایک دل شکستہ اور مجروح بہادر نے نیام سے شعلہ در حسام نکالی تاکہ دنیا یہ بھی دیکھ لے کہ حسینؑ نے سپردگی کے عالم میں سر نہ کٹوایا۔ حسینؑ کی رگوں میں ان کے بہادر اجداد کا خون جوش زن تھا۔ فوج یزید میں ہلچل پڑ گئی۔ یکہ و تنہا عزیز مردہ اور بے نوا مسافر ایک پوری مسلح فوج کے مقابل بھرے ہوئے شیر کی صورت حملے پر حملے کر رہا تھا اور میدان کی زمین خون سے لالہ زار ہو رہی تھی۔ لڑتے ہوئے نہر کے کنارے پہونچے۔ حسینؑ کی نگاہ عباس دلاورؑ کی لاش پر پڑی۔ ایک بہادر دوسرے بہادر ہی سے داد طلب ہوا کرتا ہے۔ حسینؑ کے دل سے ایک آہ نکلی کہا "بھیا"! تم ہوتے تو دیکھتے کہ حسینؑ نے کسطرح اس بے سرو سامانی کے عالم میں جنگ کی ہے!"

عصر کا وقت آیا اور حسینؑ نے تلوار نیام میں رکھ لی۔ بھاگی ہوئی فوج واپس ہوئی اور مظلوم کو گھیر کر گھوڑے سے گرا دیا یہ نازک موقع اور حسینؑ کا ذوق عبادت تاریخ عالم میں اگر ایک طرف بے مثال کارنامہ ہے تو دوسری طرف وجود الٰہ کا ایک بے نظیر ثبوت یہ بھی ایک نہ فراموش ہونیوالی حقیقت ہے کہ سجدۂ خالق میں سر گلے پر قاتل کا خنجر اور لبوں پر نجات امت عاصی کی دعا صرف حسینؑ ہی جیسے انسان کامل سے ممکن تھی۔

حسینؑ کے قتل کے بعد کے واقعات تو اور بھی دلدوز ہیں۔ خیموں سے آگ کے شعلے بلند تھے۔ پردہ نشیں مخدرات عصمت کے سروں سے چادریں چھینیں اور حسینؑ کا بیمار یتیم طوق و زنجیر میں مقید کیا گیا۔ بلوائے عام میں تشہیر مگر عزم میں وہی بے پناہ ثبات۔ اپنے کشتوں کو دفن کر سکتا تو کجا رونے تک کی اجازت نہ تھی۔ عرب کی دھوپ۔ مرض کا غلبہ۔ راستے میں کانٹے بچھے ہوئے۔ اور کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام کا سفر مگر پائے استقامت میں وہی استقلال جو حسینی کارنامہ کی روح ہے۔ عملاً اس سفر کی قافلہ سالاری حسینؑ کی دکھیاری بہن زینبؑ کے سپرد تھی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ شاہزادی بجا طور پر زینت کربلا کہلانے کی مستحق ہے بقول حریق سیتاپوری مرحوم بجلیاں بھر دی تھیں۔ قدرت نے حجاب آفریں سطوت حیدرؑ کی دیکھو فاطمہ کے صبر میں ان اسیروں کی حالت نے زباں حال سے یزیدیت کے خلاف انقلاب کے شعلوں کو ہوا دے رہی تھی۔

زینبؑ وام کلثومؑ اور دیگر اہلحرمؑ کے بے پناہ استقلال جناب زینب کے بازار کوفہ اور دربار شام کے خطبات اور اُمّ کلثوم کے دلدوز مرثیوں نے حسینی مقصد کو اور اُجاگر کر دیا۔ ورنہ حکومت تو اس واقعہ پر پردہ ڈالنے میں پورا زور صرف کر رہی تھی۔ مردہ رگوں میں جذبۂ احساس اور رعب شاہی سے خوفزدہ انسان میں جرأت اظہار پیدا کی اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا۔ کہ یہ اسیری بھی کربلا کے سانحہ کا تتمہ تھی۔ جسطرح حسینؑ نے حدود کا ہر موقع پر لحاظ رکھا اور ذرہ برابر بھی کوئی اقدام جوش یا عجلت میں نہ کیا اسی طرح حسینی مقصد کے ان معاونین نے ہر تفصیل کا لحاظ اور ہر موقع پر قربانی کے لئے اپنے کو تیار رکھا۔ بیمار بھتیجے کی دیکھ بھال۔ بچے کھچے بچوں کی حفاظت اور مقصد حسینی کی اشاعت وہ ہمت رہا اور حوصلہ شکن امور تھے کہ بڑے سے بڑے سورما کے حواس معطل ہو جاتے، مگر مصیبتوں میں یہ سکون کامل صرف بنی ہاشم کا حصہ ہو سکتا ہے۔ بس مصائب کی انتہا یہ تھی کہ حسینؑ کی چہیتی بچی سکینہؑ قید و بند کی ہولناک سختیاں برداشت نہ کر سکی۔ موت نے اُسے قید سے رہائی دلائی مگر یہی مظالم تھے جنھوں نے غافل انسانوں کو جھنجھوڑ دیا۔ اور ایک ایسے انقلاب کی بنیاد ڈالی جس میں ظالم سے نفرت اور مظلوم کے مقاصد سے ہمدردی بنیادی چیز تھی۔ بقولے دمشق کے ایک دروازے سے اسیران کربلا اور دوسرے دروازے سے انقلاب داخل ہوا۔

سب کچھ تھا مگر حسینؑ کے مقاصد کی حفاظت ان مظلوم اسیروں کے لئے منتہائے مقصد اور اُن کی اشاعت ان کی فتح تھی۔ یزیدی اپنی ظاہری فتح کے نشہ میں چور، وہ سب کر رہے تھے جو انسان کو بہائم سے بھی گرا دینے کے لئے کافی ہے مادیت خوش تھی کہ وہ فاتح ہوئی مگر بہت ہی قلیل عرصے میں ظاہر ہو گیا کہ حسینؑ کربلا کے اصلی فاتح تھے۔ حسینؑ نے دنیا کو ایک نئے طرز وغا سے آشنا کرایا۔ اُن کا طریق جنگ اتنا نرالا اور اچھوتا تھا کہ دنیا اس سے اب تک آشنا نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے کثرت کا مقابلہ قلت سے۔ عیش و عشرت کا مقابلہ بھوک پیاس سے۔ جھوٹ کا مقابلہ حق و صداقت سے۔ طاقت کا ناطاقتی سے کر کے تاریخ انسانی میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ اور بعد کی قوموں کے لئے ایک ایسا مکمل نظام حیات چھوڑا جسکی بنیاد عمل پر ہے۔ انھوں نے مختلف جماعتوں۔ مختلف نظریات و جذبات کے حامل افراد کو ایک ہی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ نہ ان کے ہاں عمر کی تفریق تھی۔ نہ آقا و غلام کی تمیز ــــ ہر شخص اپنی اپنی جگہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنا فرض انجام دے رہا تھا ــــ اس قسم کا تجربہ دنیا کے لئے بالکل نیا تھا۔

آج ہندوستان بھی ایک عظیم انقلاب کا گہوارہ بنا ہوا ہے اور اس کے ارباب حل و عقد اس کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہیں۔ اور اس کے لئے تاریخ عالم کا مطالعہ کر رہے ہیں اور مختلف قوموں کے تجربات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ آئیں اور تلاش کریں اپنے مسائل کے حل اُس رہبر عالم کی سیرت میں جس کی سیرت کے تذکرے نازش انسانیت ہیں۔

حسینؑ نے جو تعلیمات ارض کربلا پر عاشور کی دوپہر میں پیش کئے وہ ہر حیثیت سے ممتاز و بلند ہیں۔ اور ان کا کارنامہ دنیا کے انقلابات پر بدرجہا فوقیت رکھتا ہے۔ ایثار و قربانی صبر و استقامت۔ قیادت و اطاعت ایمان و یقین۔ اتحاد و یکجہتی۔ خدمت خلق۔ احساس خودداری اور جذبات لطیف کا اظہار جس بلندی اور کمال کے ساتھ اس واقعہ میں ہوا ہے وہ عدیم النظیر ہے۔ اس معرکہ سے الوہی نظام کی عالمگیر اور وقت گیر فتح کا اظہار ہوتا ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ:۔

دل پہ قبضہ نہیں ہوتا ہے جہانبانی سے
حق ابھرتا ہے فقط نفس کی قربانی سے

(زائر سیتاپوری)

ایثار و قربانی ہی ارتقائے انسانیت کی روح ہے

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
کہ جسکی انتہا ہے حسینؑ ابتدا ہے اسماعیلؑ

(علامہ اقبالؒ)

انسان کی بلندئ نفس و معراج کمال کی ہلکی سی جھلک نظر ہوں کے سامنے آجاتی ہے یہی سبب ہے کہ دنیا آج حسینؑ کا ماتم کر رہی ہے۔ حسینؑ صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ ان کے تعلیمات عالم انسانیت کا ما یہ نازش و افتخار ورثہ ہیں:۔

شہید ظلم زمانہ شہید ہے تیرا
ہر ایک قوم میں ہیں سوگوار کیا گیا
(نجم آفندی)

زمانہ جسقدر ارتقائی منزلیں طے کرے گا۔ حسینؑ کے تعلیمات کی مقبولیت اسی قدر بڑھتی جائے گی اور ہر انسان کا سر بارگاہ حسینی میں جھکتا دکھائی دے گا۔ حسینؑ نے ذکر الہی کو قائم کیا اسلئے ان کا ذکر رہتی دنیا تک مٹایا نہیں جا سکتا۔

رکھ کے سر خاک اطاعت یہ سنوارے سجدے
آپ کی خاک پہ تا حشر ہمارے سجدے
(آل رضا)

اور بقول جناب جوش:۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ٭٭ ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

عاشور کے دن

(حسینی شاعر فضل کے قلم سے)

بھائی ہے اندھیرے مقتل میں نیزے پہ ہے سر عاشور کے دن
شبیر پہ جتنا بڑھتا گیا خنجر کا اثر عاشور کے دن
دیکھا جو وفا کی نظروں سے کٹتا ہوا سر عاشور کے دن
کچھ دل کو سہارا دو اکبر کچھ شستہ کو تسکین دو اکبر
باطل کے اندھیرے سے ہٹ کر ایماں کے اُجالے میں آکر
لٹتا ہوا جھولا نظروں میں سہمے ہوئے بچے گودی میں
مشکیزے میں ناوک دل زخمی عباسؑ ہیں اور ساحل کی زمیں
دل اپنا سنبھالے آتے ہیں بیٹے کا سہارا لے کے حسینؑ
شبیرؑ کے رُخ میں دیکھے ہیں توحید کے کچھ ایسے جلوے
سجدوں سے لہو کی دھاروں سے اور صبر و رضا کی طاقت سے
اللہ ری کشش اللہ رے اثر حُرؑ حق کی طرف کھنچ کر آیا
میدان سے اُجڑے خیمے تک لائے تو ہیں مولا میت کو
فوجوں میں تلاطم آکے رہا سینوں میں کلیجے ہل کے رہے

کیا جانے بہن تک پہونچا دی کس نے یہ خبر عاشور کے دن
اُتنا ہی خدا کے سجدے میں جھکتا گیا سر عاشور کے دن
مقتل کی زمیں پر بچھتے گئے جبرئیل کے پر عاشور کے دن
ہٹتی نہیں زخمی سینہ سے بابا کی نظر عاشور کے دن
حُر جان کو دے کر کرتے ہیں جنت کا سفر عاشور کے دن
شبیرؑ بہن پر چھوڑ گئے جلتا ہوا گھر عاشور کے دن
اے جلتی ہواؤں پہونچا دو خیمہ میں خبر عاشور کے دن
عباس تمہارے مرنے سے ٹوٹی ہے کمر عاشور کے دن
اے کرب و بلا ہٹتی ہی نہیں کعبہ سے نظر عاشور کے دن
شبیر بہاتے جاتے ہیں اللہ کا گھر عاشور کے دن
کیا جانے کیونکر دیکھ لیا شبیرؑ کا در عاشور کے دن
اکبرؑ کا کلیجہ دیکھ تو لے لیلا کی نظر عاشور کے دن
ہلکی سی ہنسی کا اے اصغر اتنا تھا اثر عاشور کے دن

تیرہ سو (۱۳۰۰) برس سے باقی ہے اے فضل غم شہ میں یہ اثر
آنکھوں سے برستے رہتے ہیں ایماں کے گہر عاشور کے دن

انقلابِ حشر ساماں

انقلابِ حشر ساماں کی یہ اک تصویر ہے
قید میں ہے غمزدہ ماں قبر میں بے شیر ہے

کیا قیامت ہے ہجومِ عام میں بعد حسینؑ
سر برہنہ خاندانِ صاحبِ تطہیر ہے

جس نے دربارِ یزیدی میں کیا تھا انقلاب
یاد ہم کو ثانیٔ زہراؑ کی وہ تقریر ہے

اب تو ہر انساں ہے تائید میں اس بات کی
دل وہی دل ہے کہ جس دل میں غمِ شبیرؑ ہے

اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا تغیر رونما
حرملہ کا تیر حلقِ اصغرؑ بے شیر ہے

آنکھ نم ہونے لگی دل مضطرب ہونے لگا
اب بہت نزدیک شاید روضۂ شبیرؑ ہے

غیرتِ قہرِ خداوندی بس اب بیدار ہو
حلقِ سبطِ مصطفےٰ پر شمر کی شمشیر ہے

کاش کوئی شام والوں کو بتادے اس کا نام
طوق ہے جسکے گلے میں پاؤں میں زنجیر ہے

کہتے تھے بیدیں جوانوں کیطرح کرتا ہے جنگ
دیکھنے میں گو حبیب ابن مظاہر پیر ہے

خوف ہے سوئے ادب کا ورنہ از روئے عمل
کہہ تو سکتے ہیں کہ حُر بھی محسنِ شبیرؑ ہے

شکل اکبرؑ دیکھکر کہتی ہے فوجِ اشقیا
یہ شبابِ احمدِ مختارؐ کی تصویر ہے

بے خطا اصغرؑ نشانہ ہوگئے عاشور کو
منہ چھپائے آج ترکش میں ہر اک تیر ہے

کون ہے جو شمر سے یہ عصرِ عاشورا کہے
دیکھ تو کس کا گلا ظالم تہِ شمشیر ہے

مرتضیٰ اس کو بلائیں گے مئے کوثر ہاں
جو زمانے میں عزادارِ شہ دلگیر ہے

جناب نہال رضوی لکھنوی

مسلمانوں کا عروج وزوال

حقیقت کی روشنی میں

(نوشتہ سید میر حیدر صاحب رضوی۔ مہابن۔ ضلع متھرا)

اس مقالہ میں اگرچہ براہِ راست واقعۂ کربلا سے بحث نہیں کی گئی ہے مگر ایسے اسباب و علل ضرور بتائے گئے ہیں جن کے نتیجہ میں کربلا کا خوں چکاں واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ یہ پس منظر ہے حادثہ کربلا کا اور اسکی اسی افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس گراں قدر مقالہ کو محرم نمبر میں جگہ دے رہے ہیں۔

(ایڈیٹر)

ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں مشکل ہی سے کوئی انگریزی جاننے والا ایسا نکلے گا جس نے انگلستان کے مشہور مورخ گبن کی کتاب سلطنت روما کا عروج وزوال پڑھی ہو اور اوس کے دل میں یہ ولولہ پیدا نہ ہوا ہو کہ کاش ہماری قوم میں بھی کوئی گبن پیدا ہوتا جو اسلام کے عروج وزوال کی داستان اُسی دلکش انداز اور اُسی دلآویز پیرایہ میں سناتا جیسے کہ ڈاکٹر گبن نے سلطنت روما کی داستان عروج وزوال سُنائی ہے۔

ہماری نگاہ سے اکثر اسلامی تاریخیں ایسی گذریں جن کے ناموں سے ہم کو یہ ضرور دھوکا ہوا کہ ہماری آرزو کے پورے ہونے کے دن آگئے مگر جب ہم نے کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی تاریخ اور سیرت کی پرانی کتابیں ہیں جن کو نام بدل بدل کر پیش کیا جا رہا ہے لیکن جب پروفیسر محمد سعید صاحب ایم۔ اے فاضل دیوبندی کا وہ مضمون جو انھوں نے مسلمانوں کے عروج وزوال کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیا ہے ہمارے ہاتھوں میں پہونچا تو ہماری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور اسی کے ساتھ جب ہمکو یہ علم ہوا کہ کتاب ایسے علم و فضل کے افکار ذہنی کا نتیجہ ہے جو دیوبند کی دستار فضیلت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ علوم مغربی میں بھی کامل دستگاہ رکھتا ہے تو ہماری توقعات کہیں سے کہیں پہنچ گئیں اور ہم نے یہ سمجھنے میں اپنے آپ کو بالکل حق بجانب سمجھا کہ کتاب میں ضرور اسی علمی دقیقہ سنجی اور فلسفیانہ موشگافی سے کام لیا گیا ہوگا جو ڈاکٹر گبن کی کتاب سلطنت روما کے عروج وزوال کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہم نے کتاب کو نہایت غور و فکر اور شوق و انہماک کے ساتھ پڑھا اور ایکبار نہیں بلکہ کئی کئی بار پڑھا لیکن جوں جوں ہمارا مطالعہ وسیع ہوتا گیا ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی گئی کہ کتاب تاریخی واقعات کے انتخاب، منطقی استدلال، اور استخراج نتائج کے لحاظ سے اپنی پیش رو کتب سے کسی حالت میں ممتاز و ممیز نہیں ہے۔ ہماری آنکھیں جن فلسفیانہ موشگافیوں اور ذہن و فکر کی دقیقہ سنجیوں اور استدلال اور استنباط کی نکتہ رسیوں کو ڈھونڈھ رہی تھیں ان کا سرے سے اس کتاب میں کوئی پتہ ہی نہیں تھا۔ وہی فرسودہ روایتیں اور پارینہ حکایتیں جو ایک مرتبہ نہیں ہزار بار پہلے کبھی دیکھی جا چکی ہیں اس کتاب میں بھی دیکھنے میں آئیں۔ گویا وہی پرانی شراب تھی جس کو نئی بوتل میں بھر کر پیش کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ مصنف نے ڈاکٹر گبن کی شہرت اور اس کی کتاب سے فائدہ اٹھا کر اپنے عقائد کی ترویج کے لیے ایک نئی شاہراہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کو اس کتاب کے دیکھنے کے بعد اس تلخ حقیقت کا بُری طرح انکشاف ہوا کہ [illegible] ...... کہ ہند شیعہ ایسی کمزور نہیں کہ

آسانی سے لوٹ جائیں۔ دنیا میدانِ علم و عمل میں کتنی ہی آگے کیوں نہ نکل جائے فطرت کے تقاضے اپنی جگہ عمل پیرا ہی رہیں گے۔ افسوس ہے کہ اس مسئلہ کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کی کسی نے آج تک کوئی کوشش نہیں کی۔ جس کسی نے دیکھا اُس کو خوش اعتقادی کی نگاہ سے دیکھا یا پھر جنبہ داری کی عینک لگا کر۔

مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ لکھنے والے سب سے بڑی اصولی غلطی جو کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ اس عروج کا پہلے سے کوئی معیار متعین نہیں کرتے جس کے مدّ و جزر کی وہ داستان سناتے والے ہیں۔ جب تک اس کا تعین نہ کیا جائے کہ وہ کون سا عروج تھا جس تک پہنچنے کے لیے اسلام مسلمانوں کے قدموں کی رہنمائی کر رہا تھا یا جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلمان من حیث المسلمان کوشاں تھے، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو کوئی عروج حاصل ہوا یا نہیں۔ یا جو عروج حاصل ہوا وہ مطلوبہ عروج کے مطابق تھا یا نہیں؛ ظاہر ہے کہ اسلام دنیا میں اس غرض سے تو بھیجا نہیں گیا تھا کہ مسلمانوں کو شداد اور نمرود کے ممالک کا جانشین بنا دے، اور نہ وہ اس غرض ہی سے آیا تھا کہ اُس کے نام لینے والوں کی یلغاریں نپولین اور جولیس سیزر کی تیغ آزمائیوں کو شرما دیں۔ اَنتُمُ الاَعلَون کی بشارت کا یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ مسلمان ہنی بال اور سکندر اعظم کے ہمسر ہو جائیں۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کے عروج کو ملک و مال کی وسعت اور فراوانی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے انھوں نے مسلمانوں کے عروج اور ترقی کے اسباب کی سراغرسانی نہیں کی ہے، بلکہ قیصر و کسریٰ کے اصولِ جہاں بانی کی داد دینا چاہی ہے۔ بانیٔ اسلامؐ کے فاتحانہ کارنامے کتنے ہی عظیم الشان اور عدیم المثال کیوں نہ ہوں یہ حقیقت پھر بھی اپنی جگہ باقی ہی رہے گی کہ بانیٔ اسلامؐ نے جارحانہ تیغ آزمائی کی خود کبھی کوئی ہمت افزائی نہیں کی، بلکہ وہ تو اُس جہاد کو بھی جو اُسے کبھی مجبوراً کرنا پڑا ہمیشہ جہادِ نفس کے مقابلہ میں حقیر ہی سمجھتا رہا۔ جب ایسا ہے تو پھر کسی مسلمان کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ اسلام کی ترقیوں کو قرطبہ اور غرناطہ کے سازوں کی بلندی سے ناپنے کی کوشش کرے یا قادسیہ اور شام کی خون ریز لڑائیوں کے افسانے سنائے اور پھر اس پر فخر بھی کرے۔

ہماری اس کجروی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے کسی نیک و بد کے جانچنے کا خود کوئی معیار مقرر نہیں کیا۔ ہمیشہ دوسروں کی نگاہ سے اپنے حسن و قبح کے پرکھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں جو چیز سب سے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوئی وہ ہماری یورپ زدگی ہے۔ ہم یورپ کی مادی ترقی پر کچھ اس طرح فریفتہ اور مفتون ہوئے ہیں کہ اپنا اچھا اور بُرا اُسی کے معیار سے جانچنے لگے ہیں۔ جس چیز کو یورپ نے اچھا سمجھ لیا، بس آنکھیں بند کر کے ہم نے بھی اُسی کو اچھا کہہ دیا۔ جس چیز کو یورپ نے بُرا کہہ دیا ہماری نظر سے بھی وہ چیز اُتر گئی۔ یورپ ایک زمانہ دراز سے سیاسی جنون میں گرفتار ہے۔ وہ ہر چیز کے حسن و قبح کو سیاسی معیار سے جانچتا ہے۔ یورپ کی نگاہ میں سب سے زیادہ کامیاب انسان وہی ہے جس میں سب سے زیادہ سیاسی سوجھ بوجھ اور مکر و فریب ہو۔ یورپ کے اسی اصول کو اپنانے کے بعد ہم بھی آنکھ بند کر کے اب سب سے زیادہ اُسی کے کارناموں کو سراہتے ہیں جس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مکر و فریب اور خدع و نفاق سے کام لیا۔ اور یہ صرف اس لیے کہ ہم کسی نہ کسی طرح یورپ کی نگاہ میں ممدوح قرار پا سکیں؛ اس کے لیے ہم نے اپنی تصانیف اور تالیفات تک بگاڑ لیں اور اُن میں کسی تحریف اور تدلیس تک سے گریز نہیں کیا۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ جس یورپ کی خوشنودی کی خاطر یہ سب کچھ ہم نے کیا۔ اپنی تاریخیں بگاڑیں، اپنی تفسیروں میں تحریفیں کیں، اُسی یورپ نے سب سے زیادہ ہمارے مذہب میں عیب نکالے اور ہماری نیتوں پر حملہ کیا۔ سمجھنے کی بات ہے کہ جب ہم خود ہی یہ کہنے لگے کہ اسلام کا حقیقی عروج ملکی فتوحات اور سلطنتوں کی تسخیر میں پوشیدہ ہے، تو یورپ کو یہ کہتے ہوئے کیا دیر لگتی تھی کہ رسولؐ کے جانشین تو درکنار خود رسولؐ کی وہ مساعیٔ جمیلہ جن کو تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کا نام دیا جاتا ہے وہ ملک گیری کی ہوس سے زیادہ کچھ نہیں تھیں۔ کسی یورپین مورخ کی کوئی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو سب میں یہی لکھا پاؤ گے کسی میں صاف صاف، اور کسی میں دبے الفاظ میں کہ مکہ تک تو رسولؐ نے برائے نام مذہبی رنگ بھی قائم رکھا، لیکن مدینہ پہنچتے ہی اُن پر ملک گیری کی ہوس غالب آ گئی۔ لیکن اس میں یورپین مورخین کا کیا

قصور ہے جنگ بدر کے اسباب کی سراغرسی میں ہمارے مورخین نے جو موشگافیاں کی ہیں اور مشرکین کے تجارت کے اسی قافلہ کے لوٹنے نہ لوٹنے کے متعلق جو شام سے آرہا تھا، جس انداز میں گفتگو کی ہے حقیقت میں یورپین مورخین کے خیالات کا مواد ایسی ہی تحریروں کا فراہم کیا ہوا ہے۔ قرآن کے ایک سیدھے سادھے اور واضح بیان کے بعد کسی بحث کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر جن لوگوں کے پیش نظر اسلام کے مفاد سے زیادہ افراد کی نام آوری اور ان کی کارکردگی کی مدح سرائی ہو ان کے لیے سوائے ایسی باتیں کرنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے بنی نوع انسان کی بہبودی کے لیے جو کچھ کیا وہ تو پس پشت پڑ گیا اور نام آوران اسلام کے کارناموں کے افسانے زبان زد خلائق ہو گئے۔ انھیں غلط بنیادوں پر ہماری اسلامی تاریخ کی عمارت اٹھائی گئی اور آج تک اسی پرانی اینٹ پر اینٹ رکھی جارہی ہے۔

ہمارے اس نئی تہذیب کے دور کے مورخین مسلمانوں کے عروج و زوال اور اسلامی فتوحات کے متعلق کچھ پوچھتے یا لکھتے ہیں، تو اس نکتہ کو فراموش کر جاتے ہیں کہ اسلام جس حکومت کو قائم کرنے آیا تھا اگر قیام حکومت واقعی اس کا منشار تخلیق تھا، تو اس اسلامی حکومت میں جو رسولؐ کی سرکردگی میں قائم ہوئی اور اس ریاست یا شہنشاہی میں جو رسولؐ کے بعد ملک عضوض کی صورت میں نمایاں ہوئی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک نظام معیشت کی خود بخود بنیاد پڑتی جاتی تھی، جس کو اگر حکومت ہی کہنا ضروری ہے تو حکومت الٰہیہ کہا جا سکتا ہے مگر وہ حکومت قیصر و خاقان کی حکومت سے بالکل مختلف تھی۔ قیصر و خاقان کی حکومت کی عمارت انانیت کی بنیادوں پر اٹھتی ہے جو عیش پرستی اور ہوس کوشی کی منزلوں کو طے کرتی ہوئی جور و استبداد کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد ان مبارک ہاتھوں سے رکھی جاتی ہے، جو یمشون علی الارض ھونا کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں، اور جو تمام مادی اسباب سے بے نیاز ہو کر محض انما المومنون اخوۃ پر اپنے عمل کی عمارت اٹھاتے ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی عمارت فلک بوس اور عرش پیما تو نہیں ہوتی مگر اس کی منزلیں دلوں کی خلوتوں کے اندر ع

چو تار سبحہ گم گردید ایں رہ زیر منزلہا

قائم ہوتی ہیں اور جو بڑھتے بڑھتے انتم الاعلون کی انتہائی چوٹیوں پر پہنچ جاتی ہیں۔ دنیا کے حکمران زمین کے ایک ایک انچ کے ٹکڑے پر جان دیتے پھرتے ہیں۔ حکومت الٰہی والے سخر لکم ما فی الارض جمیعا کی طمانیت آفریں دنیا میں سانس لیتے ہیں۔ دنیاوی حکومت والوں کو اپنی حفظ و امان کے لیے تلواروں کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ تیغ و تفنگ کی آڑ لینا ہوتی ہے۔ حکومت الٰہیہ کا مرد میدان ماسواء اللہ سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ میدان جہاد میں قدم بھی رکھتا ہے تو اس ایمان و اعتقاد کے ساتھ کہ ع

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

لڑائی میں برا وقت آپڑتا ہے تو شہنشاہیت کے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔ مومن پر کوئی ایسی آفت آتی ہے تو اس کے قدم اور بنیان مرصوص ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے پاس بس ایک ہی ہتھیار تھا اور وہ اسکی روحانیت تھی اور اس کا ایمان تھا۔ اسی کو لے کر اٹھنا اور اسی سے بڑے بڑے فرعون طینت بادشاہوں کو نیچا دکھا دیا۔ بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ مسلمانوں کے جوش ایمان کی کارفرمائی کا تماشہ دیکھنا ہو تو حبش کے دربار کو دیکھیے کہ کس طرح ایک آوارہ وطن ستم رسیدہ اور بلاکش جماعت نے محض اپنے جوش ایمانی اور کردار کی بلندی سے ایک اولوالعزم بادشاہ کو اسلام کا گرویدہ بنا لیا۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کے ہاتھوں اسلام کی کامیابی ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر مذہبی دنیا میں جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ خود حضرت صلعم کو اس کامیابی پر اتنی مسرت ہوئی کہ جب حضرت جعفر حبشہ کی سفارت سے واپس ہوئے اور حضرت صلعم سے خیبر میں ملاقی ہوئے تو بے اختیار حضرتؐ کی زبان سے نکل گیا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ فتح خیبر کی مجھ کو زیادہ خوشی ہوئی یا جعفر کی حبشہ سے کامیاب واپسی کی۔ حبشے کی تسخیر کو جس طرح اسلامی فتوحات میں ایک تقدم حاصل ہے اسی طرح اسکی اہمیت کو بھی ایک خاص تفوق حاصل ہے۔ حبشہ میں جو فتح حاصل

ہوئی وہ دلوں کی فتح تھی۔ اصول کی جیت تھی۔ یہی انسانیت کا وہ عروج تھا جس کو حاصل کرنے کے لیے اسلام آیا تھا۔ اسلام زمین کے چند ٹکڑوں پر قبضہ جمانے نہیں آیا تھا وہ قلوب پر فتح حاصل کرنے آیا تھا۔ نیزہ و تلوار کا لوہا منوانے نہیں بلکہ دلوں پر لاالٰہ کا سکہ جمانے۔ فتح مکہ اسلام کے زریں اصولوں کی کامیابی کی سب سے بڑی مثال ہے۔ بہت ممکن تھا کہ رسولؐ پہلے ہی سال مکے میں داخل ہو جاتے جیسا کہ اون کے بعض ہمراہیوں کی خواہش تھی لیکن چونکہ اس داخلہ کے وقت مشرکین کی طرف سے مزاحمت ہو چکی تھی اور ہتھیاروں کے نمود و نمایش کی نوبت آچکی تھی جو اسلام کے اصول کے منافی تھی اس لیے حضرت صلعم یا یہ کہیے کہ خود شہنشاہ حقیقی نے یہ نہیں چاہا کہ اس فتح کو آلات حرب و ضرب کے سہارے حاصل کیا جائے اور اسکے حصول کو کسی ایسے ذریعہ کا منت کش بنایا جائے جو روحانیت سے سراسر عاری ہو۔ اسی اصول کے پیش نظر رسولؐ ایک معاہدہ کر کے مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ یہ معاہدہ بذات خود اسلام کے اصولوں کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ گو ظاہر میں نگاہیں اس پر نکتہ چینی ہی کرتی رہیں۔ یہ فتح اسلام کی فطرت کی فتح تھی۔ اس فطرت کی فتح تھی جس کے لیے کہا گیا ہے کہ ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

چنانچہ یہی ہوا کہ ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ مکہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ انا فتحنا لک فتحاً عظیم کی سند بھی ہاتھ لگی۔

اسلام جس حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے آیا تھا رسولؐ کی زندگی ہی میں اُس کا تکملہ ہو گیا تھا۔ تمام جزیرۃ العرب اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا تھا۔ یہ سب کیا تلوار ہی کے ذریعہ ہوا۔ ہرگز نہیں۔ یہ نتیجہ تھا اُسی قرآنی تعلیم کا جو رسولؐ اپنے عمل سے دنیا کو سکھا رہے تھے یہ سب نتیجہ تھا تخلقو باخلاق اللہ پر عمل کرنے کا۔ قلوب مسخر ہو رہے تھے سلطنتیں قدموں پر گر رہی تھیں۔ اسلام منتہائے عروج پر تھا۔ انسانیت درجۂ کمال پر پہنچ رہی تھی۔

جس طرح اسلامی حکومت حکومت الٰہیہ تھی اُسی طرح اس کا تاجدار بھی روحانیت کا شہنشاہ تھا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ رسولؐ اسلام بادشاہ تھا مگر ایسا بادشاہ کہ پورا ملک اسکے قبضہ اقتدار میں اور پھر ایسا بے بس کہ اپنے کو بھی اپنے بس میں نہ پائے۔ دولتمند ایسا کہ خزانہ کے خزانہ اونٹوں پر لد کر دارالحکومت میں آئیں اور خود ایسا محتاج کہ گھر میں ہفتوں چولھا نہ جلے۔ کئی کئی وقت فاقہ سے گذر جائیں۔ شجاع ایسا کہ تو تنہا ہزاروں میں کھڑا ہو جائے اور پھر ایسا رحمدل کہ یتیم کو دیکھکر آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ با تعلق ایسا کہ عرب کے ذرے ذرے کی اس کو فکر، بیوی بچوں کی اس کو فکر، مفلس مسلمانوں کی اس کو فکر، خدا کی بھولی بھالی دنیا کی اس کو فکر، اور پھر ایسا بے تعلق کہ سوائے خدا کی یاد کے اس کے دل میں اور کسی کی یاد نہیں۔ عین اُس وقت کہ جب اُس پر ایک سپاہی کا دھوکا ہو وہ ایک زاہد شب زندہ دار کی شکل میں نمایاں ہو۔ عین اُس وقت کہ ہم اُس کو شہنشاہ عرب کہنے پر مجبور ہوں وہ ایک چٹائی پر تکیہ لگائے نظر آئے۔ عین اُس وقت کہ جب مسجد میں سیم و زر کا انبار لگا ہو اہلبیتؑ میں فاقہ کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔ یہ ہے اُسی عروج کی ایک ہلکی سی جھلک جو انسانیت کو بانی اسلام کے ہاتھوں حاصل ہوا اور جسکی طرف اسلام مسلمانوں کو لیجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ لکھنے والوں کا یہ بھی کچھ ایک دستور سا ہو گیا ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے زوال کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی ابتدا، اُس زمانہ سے کرتے ہیں جب اُن کے بقول خلافت راشدہ کا دَور ختم ہوا۔ کسی نے اگر اور ذرا گہرائی میں جانے کی کوشش کی تو اُس نے حضرت عثمان کے زمانہ میں جو شورشیں اور ہنگامے ہوئے اُن کو زوال کی ابتدا قرار دیدیا۔ اُن کے خیال میں زوال بھی کوئی آسمانی گولہ ہے کہ آسمان سے ایکدم ٹوٹ پڑا اور عروج کے شیرازہ کو درہم برہم کر کے رکھدیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت صلعم کے زمانہ سے لے کر حضرت عمر کی وفات تک اسلام کے عروج کا زمانہ رہا۔ حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں یکایک شورشیں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور قومی شیرازہ کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ بنی اُمیّہ کے بیشتر خلفاء کے زمانہ تک یہی حالت رہی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت میں زمانہ نے پھر کچھ پلٹا کھایا اور خلافت علیٰ منہاج

سنت آگئی لیکن نشأۃ ثانیہ کا یہ دَور تھوڑے ہی دن رہا اور پھر وہی دورِ ابتلا شروع ہوگیا جو مختلف ادوار میں مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا۔ عروج و زوال کی اس مختصر داستان سے جو کچھ سمجھا جاسکتا ہے بس یہی ہے کہ اسلام کا عروج و زوال بھی شاہان وقت کی جنبش چشم و ابرو پر منحصر تھا۔ جب صاحب اختیار نے جیسا چاہا ویسا ہی اسلام کے عروج و زوال کا نقشہ مرتب کر دیا۔ جب کسی صاحب اقتدار نے نحن الزمان من رفعناہ ارتفع کہہ دیا سلطنت کا عروج ہوگیا اور جب کسی نے من وضعنا اتضع کہہ دیا تو زوال ہوگیا ایسا سمجھا۔

ہمارا ایسا سمجھنا حقیقت میں فلسفہ کون و فساد کی ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ مسئلہ ارتقاء کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ جو چیز عالم وجود میں آتی ہے وہ اپنی تعمیر اور تخریب کے اجزاء خود ساتھ لے کر آتی ہے۔ کسی چیز کا وجود ہی ان دو متضاد عناصر کی آپس کی کشمکش کا نام ہے۔ جب تک تعمیری عناصر تخریبی عناصر پر غالب رہتے ہیں وہ وجود ترقی کے راستہ پر گامزن رہتا ہے۔ لیکن جوں ہی تخریبی عناصر غالب ہوئے اُس چیز میں انحطاط کے آثار نمایاں ہونے لگ جاتے ہیں۔ اگر درمیان میں کوئی زبردست ردعمل حائل نہ ہوا تو وہ چیز تھوڑے دن میں خود بخود فنا ہوجاتی ہے۔ عالم روحانیت میں بھی قدرت کا یہی عمل کار فرما ہے۔ علامہ اقبال نے اسی نکتہ کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

ایک چیز یہاں اور بھی ذہن نشین کرلینی چاہیے وہ یہ کہ رسول اسلام حقیقت میں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ یا ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ جیسا کہ حضرت صلعم کے لیے ایک مشہور حدیث میں کہا گیا ہے کہ اخلاقہ قرآن جو قرآن ہے وہ رسولؐ ہیں اور جو رسولؐ ہیں وہی قرآن۔ یہ جو قرآن کے لیے کہا گیا ہے کہ یفسر بعضہ بعضا تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ رسولؐ کا عمل قرآن کی تفسیر اور قرآنی احکام رسولؐ کے عمل کی تفسیر۔ اگر حدیث ثقلین اور قرآن ناطق اور قرآن صامت کی تفریق کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ مطلب اور بھی واضح ہوجاتا ہے۔

مسلمانوں کے عروج و زوال کا کھوج لگاتے وقت حقیقت میں ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس رسالت کے عروج و زوال کا کیا عالم رہا جس سے مسلمان وابستہ ہیں۔ اگر رسالت اپنے صحیح مفہوم پر باقی ہے اور مسلمان اُس سے وہی کام لے رہے ہیں جس کے لیے وہ عالم وجود میں آئی تو یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام عروج کے راستہ پر گامزن ہے۔ لیکن اگر رسالت کے اقتدار میں کہیں کوئی خامی آئی یا کوئی رخنہ پیدا ہوا یا معاذ اللہ کہیں یہ ثابت ہوا کہ رسولؐ اپنے منصب سے ہٹا ہوا کوئی فعل کر رہا ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام اور مسلمان دونوں گمراہی کے راستہ پر جا رہے ہیں۔ ترقی اور عروج کا کوئی سوال ہی نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ رسولؐ کا اسلامی مفہوم کیا ہے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق رسولؐ دو مختلف النوع حقیقتوں کا مظہر ہے یا یہ کہنا چاہیے کہ قرآن نے ہمارے رسولؐ کی یہ دو حیثیتیں مقرر کی ہیں (۱) بشر مثلکم (۲) ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ یعنی ایک مادی اور دوسری روحانی۔ یا بشریت اور ملکوتیت یا شہیدی کی زبان میں وہ برزخ کبریٰ جو حرف مشدد کی طرح۔ ادھر مخلوق میں شامل اُدھر اللہ سے واصل۔

جس طرح خود رسولؐ کی دو حیثیتیں تھیں اسی طرح اُس کے ماننے والے بھی دو طبقوں میں منقسم تھے۔ ایک وہ تھے کہ جو رسولؐ کی روحانیت کے دل سے قائل نہ تھے اور اُس کو بالکل اپنا جیسا ہی بشر سمجھتے تھے، اگر ان کو رسولؐ کی روحانیت کا کچھ احساس تھا بھی تو بالکل ایسا ہی جیسا کہ ایک صاحب کشف و کرامات کے متعلق ہوتا ہے، حالانکہ وحی کے مفہوم کو کشف و کرامات یا معجزہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ وحی رسولؐ کے اُن تمام تعلقات اور رشتوں پر حاوی ہوتی ہے جو رسولؐ اور اُس کی اُمت کے درمیان میں ہوتے ہیں۔ خواہ وہ تشریعی حیثیت سے ہوں یا تشریحی۔ رسولؐ کا ہر قول و فعل وحی الٰہی کا پابند

ہوتا ہے سوائے اُن اضطراری یا فطری افعال کے جو اُس کی ذات سے بحیثیت ایک بشر کے متعلق ہوتے ہیں لیکن اُن کی شان بھی ایک معمولی انسان کے افعال کی شان سے بہت ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ تھے جو رسولؐ کی روحانیت پر ایمان رکھتے تھے اور جو اُس کی بشریت کو اس کی روحانیت کا محض ایک جامہ سمجھتے تھے۔ بس یہی دو خیالات یا اعتقادات تھے جن کے تصادم یا جن کی کشاکش سے اسلام کے عروج و زوال کے تھرمامیٹر کی تعمیر ہوئی۔ جب تک رسول کی روحانیت، اُن کی خاندانی وجاہت، اُن کے اہل خاندان کی جاں نثاریاں اور سب سے زیادہ رسولِ خدا کا اخلاق، اُن کی معاشرت، حقوق العباد کی نگہداشت، اخوۃ بین المسلمین وغیرہ کا اثر لوگوں پر پڑتا رہا، وہ تخریبی قوتیں جو آپ کو بالکل مثل بشر سمجھتی تھیں کبھی سر نہ اٹھا سکیں اور اسلام باوجود مخالفین کی تخریبی سرگرمیوں کے ترقی اور عروج کے راستہ پر گامزن رہا مگر تو بھی شرارے گو خاک میں پنہاں ہو گئے تھے مگر دبی چنگاریوں کی طرح اُس وقت کے منتظر رہے کہ جب چراغ مصطفوی گل ہو اور اُس سے جو عارضی اندھیرا پیدا ہو تو پھر چمک اٹھیں۔

دنیائے اسلام اور رسولؐ کا سب سے بڑا دشمن ابوسفیان تھا گو فتح مکہ کے وقت اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھتے ہوئے اُس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا تھا مگر اُس کا اسلام مؤلفۃ القلوب کی حد سے آگے نہیں بڑھا تھا چنانچہ جب اسلامی افواج موج در موج مکہ میں داخل ہوئیں اور ابوسفیان نے اُن کے داخلہ کا منظر حضرت عباس کی معیت میں دیکھا، تو بے اختیار اُس کی زبان سے نکل گیا کہ تمھارا بھتیجہ تو بڑا بادشاہ ہو گیا ہے۔ حضرت عباس نے کہا کہ یہ بادشاہت نہیں نبوت ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ دو بے تعلق تماشائیوں کی گفتگو تھی مگر حقیقت بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اس لاابالی گفتگو میں حقیقت کے کتنے گہرے راز پوشیدہ ہیں یہ الہامی پیغام کے دو مختلف نظریے تھے جو حضرت عباس اور ابوسفیان کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ ایک اَنذِر عشیرتک الاقربین کی نمائندگی کر رہا تھا اور دوسرا اعرض عن المشرکین کی۔ آج حضرت عباس کی تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ رسولؐ کی روحانیت کے سمجھنے کی اہلیت صرف وہ ہی لوگ رکھتے ہیں جن کو قرآن حکیم نے انذر عشیرتک الاقربین کے موقر خطاب سے یاد کیا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ وہ گروہ جو پہلے ہی سے ملت ابراہیمی کا حلقہ بگوش تھا اُس کے لیے تو یہ حکم ہوتا ہے کہ اُن میں قرآنی تعلیم کی ابتدا کی جائے اور وہ گروہ جو کفر و شرک کی کثافت سے ملوث ہو اُس کے لیے کہا جائے کہ اُن سے اعراض کیا جائے حالانکہ اسلام کی سب سے زیادہ ضرورت اسی گروہ کو تھی۔ لیکن ایسا ہونا ناگزیر تھا اس لیے کہ اہلبیت کا سوال درمیان میں تھا، مشرکین لاکھ کہتے رہے کہ اٰمنّا مگر وحی الٰہی ہمیشہ یہی جواب دیتی رہی لما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ برخلاف اس کے دوسری طرف انذر عشیرتک الاقربین کا گروہ تھا کہ جب اُن کے سامنے قرآن پیش کیا گیا تو فوراً پکار اٹھے اٰمنا به انه الحق من ربنا انّا کنّا من قبله مسلمین۔ یہ تو پہلے ہی سے مسلمان تھے۔ ان کے ایمان کی تجدید ہو رہی تھی۔ اُس پر جلا کیا جا رہا تھا۔ حکمت الٰہی کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوں اُس کو تو اُن کے اسلام کو مجلّی کرنا تھا جو انّا کنّا من قبله مسلمین کہہ رہے تھے۔ اگر عزیزوں کے حلقہ میں اسلامی تعلیم سے روحانیت کے خیالات راسخ نہ کیے جاتے تو پھر رسولؐ کی نبوت اور شہنشاہیت میں کوئی فرق کرنے والا بھی پیدا نہ ہوتا اور اسلام کی جگہ رسولؐ ہی کی حیات میں ختم ہو کر رہ جاتی۔

نزول وحی ہی ایک ایسی چیز تھی جو رسولؐ کی روحانیت کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں راسخ کیے ہوئے تھی۔ لیکن اُس کو سب سے پہلی اور کاری ضرب جس عقیدہ نے پہنچائی وہ یہ تھا کہ وحی الٰہی کا نزول اکثر و بیشتر بعض حاشیہ نشینانِ مسند رسالت کی رائے کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ توارد ایسا ہی ہوتا جیسا کہ اکثر دو ہمعصر شاعروں کے اشعار میں ہوتا ہے تو چنداں مضائقہ نہ تھا مگر جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ توارد ہمیشہ ایسے موقعوں پر ہوا جب رسولؐ کی

رائے معاذ اللہ خطا پر تھی، تو پھر وحی الٰہی کی وقعت لوگوں کی نگاہ میں ایک کھیل سے زیادہ نہیں ٹھرتی جب تک رسولؐ بقید حیات رہے، تو تقدس کا ایک ہلکا سا پردہ بھی رہا۔ لیکن رسولؐ کے بعد جب وہ لوگ برسراقتدار ہوئے جن کی رائے پر کہا جاتا ہے کہ اکثر وحی کا نزول ہوتا تھا تو اُن کے ہوا خواہوں نے اس وحی کے تواردکو کچھ اس طرح اور اس شدت کے ساتھ اُبھارا کہ رسولؐ کا وہ وقار جس کی بنیاد سراسر وحی الٰہی پر تھی لوگوں کی آنکھوں سے گرنے لگ گیا۔ اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، اس خیال میں ترقی ہی ہوتی گئی ہر کہ و مہ کے لیے بے تکلف گفتہ،' اور گفتہ اللہ بود کہا جانے لگا، اور ہر اُس شخص کو جس کو اپنے سے ذرا بھی بہتر پایا اُس کو بڑی بنی کہدیا گیا۔ رسولؐ کی ہر اُس بات کی جس میں ذرا سا بھی وحی کا لگاؤ ہوتا مخالفت کی جاتی۔ بات بات پر لوگ مرتد ہوتے تھے۔ معراج کی صبح جب رسولؐ نے شب اسریٰ کے واقعات بیان کیے تو ایک جماعت کی جماعت مسلمانوں کی مرتد ہوگئی۔ کیوں؟ رسولؐ کی روحانیت کا استیلاء بعض طبیعتیں برداشت نہیں کرسکیں۔ تحویل قبلہ کے وقت بھی یہی ہوا۔ لوگ نماز سے رسولؐ کو چھوڑ چھوڑ کر تماشہ دیکھنے نکل جاتے تھے۔ نماز کی صفوں میں عورتوں کو گھورنے کی غرض سے آگے پیچھے ہوجاتے تھے۔ اُن تمام امور جامع سے جہاں سے بغیر رسولؐ کے حکم کے لوگوں کو ہٹنا نہیں چاہیے تھا چپکے سے کھسک جاتے تھے۔ یہ سب کیوں تھا؟ اُسی روحانیت کا فقدان تھا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب کی جبلّت روحانیت کو قبول ہی نہیں کرسکتی تھی۔ یہ خدا پر ایمان نہ تھا جو لوگوں کی جبینوں کو خاک پر ٹکوا رہا تھا، یہ رسولؐ کی وجاہت،' اور اُن کی معزوضہ شہنشاہیت کا رعب تھا جو سب کی گردنیں آستانہ الٰہی پر جھکائے ہوئے تھا، ورنہ ماجاء وحی ولا ملائک منزل کا جو خیال دادا کے دماغ میں تھا وہ پشت در پشت پوتوں میں بھی منتقل ہو رہا تھا۔

جوں جوں تبلیغ اسلام کا کام آگے بڑھتا جاتا تھا رسولؐ کی وجاہت،' اور آپ کے رسوخ و اقتدار میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی۔ اور یہی چیز آپ کی شہنشاہیت کا خیال لوگوں کے دلوں میں روز بروز بڑھاتی جاتی تھی۔ شہنشاہیت کا خیال لوگوں کے دلوں میں راسخ ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ لوگ رسولؐ کے انتقال کی صورت میں اُن کے جانشین کے متعلق طرح طرح کی منصوبہ بندیاں کرنے لگیں۔ اگرچہ حضرت ابراہیم (پسر محمدؐ) کی ولادت نے بظاہر لوگوں کے خیالات کا رُخ بدلدیا تھا مگر اسی کے ساتھ مایوسی نے تمناؤں میں اور شدت بھی پیدا کردی تھی اس مسئلہ کو رسولؐ کی ازواج کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اُن کی بے اولادی نے اور پیچیدہ بنا دیا تھا۔ حضرت ابراہیم کی ولادت سے پہلے ازواج کو یہ خیال قدرتی طور پر پیدا ہوچلا تھا کہ رسولؐ کی وراثت اور جانشینی کا قرعہ اُنھیں کے اعزا میں سے کسی نہ کسی ایک کے نام ضرور نکلے گا اسلیے وہ بظاہر تو نہیں، مگر اندرونی طور سے اس مسئلہ سے پوری دلچسپی لے رہی تھیں، اور جہاں تک اُن کے اختیار میں تھا اُس کے لیے اپنی سی سعی کرنے میں کمی نہ کرتی تھیں کہ اتنے میں حضرت ابراہیم کا انتقال ہوگیا اور دیرینہ آرزوئیں پھر عود کر آئیں جذبات کی رو اس حد تک بڑھ گئی کہ حضرت ابراہیم کے انتقال پر بعض طبیعتیں اپنے مسرت کے جذبات کے اظہار پر قابو نہیں پاسکیں، خود رسولؐ کے مواجہہ میں ایسی ایسی باتیں کہی گئیں جن سے تعزیت کا دور کا بھی علاقہ نہیں تھا۔ رسولؐ بھی ان ریشہ دوانیوں سے ناواقف نہیں تھے وہ وقتاً فوقتاً ایسی تدبیریں اختیار کرتے تھے کہ وہ ناسور جو اندر ہی اندر پک رہا تھا کسی ایسے عنوان سے پھوٹ نہ نکلے کہ جس سے اسلام کی بنی بنائی ساکھ کو صدمہ پہنچ جائے۔ لیکن جب آپ کے وصال کا زمانہ قریب آہی گیا اور بہ سبب شدت مرض آپ صاحب فراش ہوگئے اور لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اب آپ بستر علالت سے نہ اُٹھ سکیں گے، تو پھر وہ اُنھیں تدبیروں میں لگ گئے جو ایک بادشاہ کے انتقال کے وقت اختیار کی جاتی ہیں یعنی مرنے والے کی طرف سے بے رخی اور بلند ہونے والے ستارہ کی طرف آنکھوں کا اُٹھنا۔ معمولی باتوں میں اُس کے حکم سے سرتابی۔ کبھی تعمیل بھی کی تو اس طرح کہ اپنی کامیابی کا پہلو اُن میں

مقصر جب رسولؐ اس دار فانی کو خیرباد کہہ گئے تو آپ کے تعزیتی اور الوداعی مراسم میں اُنھیں باتوں کو پیش نظر رکھا گیا جو ایک بادشاہ کے تعزیتی مراسم میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی گئی کہ جب تک آپ کے جانشین کا تقرر نہ ہو جائے آپ کے انتقال کی خبر عام نہ کی جائے۔ لیکن جب جبر و تشدد کی نمائش کے باوجود خبر پھوٹ ہی گئی اور جانشینی کے متعدد دعویدار پیدا ہو گئے تو اخفائے وفات رسولؐ کی تمام کارروائیاں درمیان ہی میں منقطع کرنی پڑیں اور جانشینی کے مسئلے کے طے کرنے کی طرف سوائے رسولؐ کے چند مخصوص اعزا کے سب کی توجہ مرکوز ہو گئی۔ چونکہ روحانیت جو رسولؐ کے جانشین کے لیے ایک مابہ الامتیاز چیز ہونی چاہیے تھی درمیان میں نہ تھی تو پھر ہر شخص بجتہ مساوی اپنے کو اس منصب کا اہل سمجھنے میں حق بجانب سمجھتا تھا۔ رسولؐ کی وفات کا اعلان جن الفاظ میں کیا گیا اُس کی وہی شان تھی جو انگلستان میں بادشاہ وقت کے انتقال پر ہوتی ہے

The King is dead. Long-live the King.

ذرا اعلان کے الفاظ کی شان دیکھیے "جو محمدؐ کو پوجتا ہے جان لے کہ محمدؐ مر گئے۔ خدائے حی لایموت زندہ اور باقی ہے" رسولؐ کی روحانیت کا جو تھوڑا بہت اثر لوگوں کے دلوں میں باقی تھا وہ اس اعلان سے بالکل زائل ہو گیا۔ پوجنے کے معنی خیز لفظ کے استعمال نے اس پر اور سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ رسولؐ کے جانشین کے انتخاب کے بعد وہ تمام کارروائیاں ہونے لگیں جو ایک نیا تخت نشین اپنے تسلط کے قائم کرنے کے لیے کرتا ہے۔ فوج کشیاں تھیں۔ گردن زدنی تھی۔ قید و بند تھی۔ دھمکیاں تھیں۔ زجر و توبیخ تھی۔ غرض سب کچھ وہی تھا جو عام طور سے ایسے موقع پر کیا جاتا ہے۔ صرف نام بدلا ہوا تھا۔ سلطنت کی جڑیں مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں پر فوج کشی شروع کر دی گئی۔ یہ تمام چیزیں یکے بعد دیگرے کچھ اس تیزی سے کی گئیں کہ لوگوں کو کسی دوسری طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اور وہ یہ غور ہی نہیں کر سکے کہ وہ کیا سمجھتے تھے اور کیا ہو گیا۔ رسولؐ کے پہلے اور دوسرے جانشین کے زمانہ تک معاملہ گو مگو ہی میں رہا۔ رسولؐ کے تیسرے جانشین کے زمانہ میں جب دار و گیر کا بخار لوگوں کے دماغوں سے اترا تب کچھ ان کو اس کا احساس ہوا کہ وہ جس راستہ پر گامزن ہیں وہ کسی اور ہی سمت کو جا رہا ہے۔ سب سے پہلے جس چیز نے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا وہ اس تیسرے جانشین کا انتخاب تھا۔ پچھلے دونوں انتخابوں کا پس منظر کچھ ایسے پردۂ خفا میں رہا کہ لوگ صحیح طور پر یہ امتیاز نہ کر سکے کہ جانشین رسولؐ کا تقرر کسی اسلامی اصول کے تحت ہوتا ہے یا ملکی مصلحتوں کے پیش نظر۔ لیکن جب تیسرا تقرر شوریٰ سے ہوا تو لوگوں کو محسوس ہوا کہ یہ تو بالکل ہی ایک دنیاوی چیز ہے اور روحانیت سے اس کو دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ حکومت نے مذہب میں جن جن باتوں کا احداث کیا اس پر تو لوگوں کی نگاہ کم گئی مگر جب اُن باتوں میں بھی جن پر رسولؐ کی سنت کی مہر تصدیق ثبت ہو چکی تھی، ذاتی اور ملکی مصلحتوں کی بنا پر تبدیلیاں ہونے لگیں تو لوگوں کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ اگرچہ تاویل اور تفسیر کے بھاری پردے اُن پر ڈالے گئے مگر نگاہ اُن کی تہ تک پہنچ ہی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت سے بیزاری کے ساتھ ساتھ دین کی طرف سے بھی بد اعتقادی پھیل گئی۔ مولانا مودودی نے اس زمانہ کی حالت کی جو تصویر کھینچی ہے اُس کا تھوڑا سا اقتباس یہاں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"جہالت کو اسلامی نظام اجتماعی میں گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد سرطان کی طرح جاہلیت نے اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے پھیلانے شروع کر دیے کیونکہ اقتدار کی کنجی بجائے اسلام کے اُس کے ہاتھ میں تھی۔ سب سے مشکل بات یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر نہیں آئی تھی مسلمان بن کر آئی تھی۔ مشرکین اور کفار سامنے ہوتے تو مقابلہ آسان تھا مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار۔ رسالت کا اقرار صوم و صلوٰۃ پر عمل۔ قرآن و حدیث سے استناد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وقت میں جاہلیت اور اسلام کا اجتماع ایسی پیچیدگی پیدا کر دیتا

ہے کہ اُس سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوتا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیے تو سیکڑوں مجاہد لڑنے کو تیار ہو جائیں، مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑیے تو منافق ہی نہیں، خود مسلمان اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں اور اُلٹا آپکو موردِ الزام بنا دیں۔ جاہل سیاست کی رہنمائی پر مسلمان کا جلوہ افروز ہونا۔ جاہل مدرسہ میں مسلمان کا مدرس ہونا۔ جاہلیت کے سجادہ پر مسلمان کا مرشد بنکر بیٹھنا، وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے بہت کم مسلمان بچ سکتے ہیں۔"

مولانا نے کیسی سچی تصویر اُس حالت کی کھینچی ہے جو اسلام میں روحانیت کے فنا ہونے سے پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن کیا یہ اسکا اعتراف نہیں ہے کہ اسلام کے ڈھانچہ میں جاہلیت کی یہ بالا دستی امام زمانؑ کی صحیح معرفت کے حاصل نہ ہونے کی وجہ سے نہ تھی۔

زمامِ حکومت بنی امیہ کے ہاتوں تک پہنچتے پہنچتے مذہب کا رہا سہا وقار بھی ختم ہوگیا۔ اُنھوں نے مذہب سے صرف اتنا ہی واسطہ رکھا، جتنا اُن کی حکومت کے بقا اور استحکام کے لیے ضروری تھا۔ اتنا بھی جو ہم کہہ رہے ہیں تو وہ اُس خوش اعتقادی کی بنا پر ہے جو ہم کو مسلمان حکمرانوں کے متعلق ہے، ورنہ اس زمانہ میں مذہب کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ اُس زمانہ میں بھی نہیں ہوا جب ان حکمرانوں کے مورث اعلیٰ رسولؐ سے برسرِپیکار تھے۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا رسولؐ کے ساتھ کیا، مذہب کی کوئی علانیہ توہین نہیں کی۔ نہ نماز کا مذاق اڑایا اور نہ کبھی قرآن کو نظرِ استخفاف سے دیکھا۔ انھوں نے اگر نماز کو اچھا نہ سمجھا تو کبھی اُس کو پڑھا بھی نہیں۔ قرآن کو اساطیر الاولین کہا تو کبھی اُسکو آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں مگر یہ اسلام کے نام لیوا نماز پڑھتے تھے تو شراب کے نشہ میں چور ہو کر۔ قرآن کو ہاتھ میں لیتے تھے تو اُسوقت تک اُسکو نہ چھوڑتے تھے جب تک تیروں سے اُس کو پارہ پارہ نہ کر دیتے۔ بنی امیہ کے ہاتھ میں جب اسلام کی حکومت کی باگ پہنچی تو رسولؐ کے متعلق جو بنیادی سوءِ اعتقادی تھی اُس میں قبیلہ کی عصبیت کا اور اضافہ ہوگیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی الاعلان رسولؐ کے خاندان سے اپنے خاندان کا تفوق ظاہر کیا جانے لگا۔ اپنے اسلاف اور اخلاف کے ساتھ وہی باتیں منسوب کی جانے لگیں جو خاندانِ رسولؐ کے افراد کے ساتھ اور خود رسولؐ کے ساتھ کی جانی چاہیے تھیں، تاکہ رسولؐ اور دوسرے لوگوں میں کوئی امتیازی فرق باقی نہ رہے۔

اس کو اتفاق کہیے یا زمانہ کی رفتار کہ اُسی زمانہ میں اسلامی علوم اور اُس کی روایات کے مدوّن کیے جانے کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ جس دورِ حکومت میں کسی قاضی یا مفتی کا تقرر تو بڑی چیز ہے معمولی تقریر یا تحریر ہی بغیر حکومت کی اجازت کے نہیں کی جاسکتی تھی، تو پھر کتابوں کی تدوین کیسے حکومت کی نگرانی سے بچ سکتی تھی، لہٰذا جو کتاب بھی اس زمانہ میں مرتب یا مدوّن ہوئی اُس پر حکومت کے خیالات کی مہرِ تصدیق سب سے پہلے ثبت ہوئی اور اسی کے رجحانات کے نشانات سب سے پہلے اُس میں لگائے گئے۔ ان کتابوں میں ایک خاص پالیسی کے تحت جہاں رسولؐ کی روحانیت کا ذکر کیا وہاں ایسے سرسری طریقے سے اسکو بیان کیا کہ اُس سے کوئی قابلِ اعتبار نتیجہ مرتب نہ ہو سکے لیکن رسولؐ کی بشریت کے ذکر و اذکار میں وہ تمام باتیں کہہ دی گئیں جو عام طور سے ایک معمولی انسان کے لیے بھی نہیں کہی جاتی ہیں۔ رسولؐ کے ازدواجی تعلقات، اُن کی خانگی زندگی اور نجی معاشرت کے پوست کندہ حالات بیان کیے گئے تاکہ اُن سے رسولؐ کی جو تصویر مرتب ہو وہ رسولؐ کے دوسرے معاصرین سے کسی حالت میں بہتر نہ ہو۔ حکومت کے زیرِ اثر صرف کتابیں ہی مرتب نہیں ہوئیں بلکہ یہ انتظام بھی کیا گیا کہ اُن کتابوں کی صداقت پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے پائے۔ عام طور سے یہ دستور ہے کہ جب کوئی کتاب منظرِ عام پر آتی ہے تو کچھ روز اُسکی طرف سے بالکل توجہ ہٹالی جاتی ہے، اور اُس کو تنقید اور تبصرہ کے ہاتھوں میں دیدیا جاتا ہے کہ اُس کے کھوٹے سے کھرا الگ کر دیا جائے۔ لیکن اس زمانہ میں جو کتابیں مرتب ہوئیں وہ ابھی مصنفین کے ہاتھوں سے بھی نہ نکلی تھیں کہ اُن پر تقدس کی مُہر لگا دی گئی۔ اس اہتمام کا یہ نتیجہ ہوا کہ کتاب پر تنقید تو درکنار اُس کو چھونا بھی گناہِ عظیم ہوگیا۔ رسولؐ اسلام کی روحانیت کو سمجھنے میں جو کمی اور نارسائی تھی

کے ہاتھوں سے رہ گئی تھی وہ ان کتابوں کی ترویج واشاعت سے پوری ہو گئی۔

ہم نے اس مضمون میں واقعات کی کوئی تنقید نہیں کی ہے کہ اس مختصر مضمون میں اُس کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن تاریخ کی تحریر سے یہ اچھی طرح سے واضح ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں کا یا اسلام کا عروج صرف اُن لوگوں کی ذات سے وابستہ تھا جن پر رسولؐ کی روحانیت کا پُورا پرتو پڑ چکا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حقیقی اسلام کا کھوج لگانا ہو تو شہنشاہوں کے بلند اساس ایوانوں اور جگمگاتے محلوں میں مت دیکھو بلکہ مدینہ کی اُن جھونپڑیوں کی سیر کرو جہاں دن کو چولھا اور شب کو چراغ خاموش رہتا تھا۔ ان خدا رسیدہ بزرگوں کی مختصر جماعت جب تک دنیا میں رہی اسلام اور مسلمان عروج کے راستہ پر گامزن رہے لیکن جب وہ جماعت دنیا سے رخصت ہو گئی یا اُس کا خاتمہ کر دیا گیا تو مسلمانوں کے عروج کا بھی خاتمہ ہو گیا جو مسلمان باقی رہ گئے وہ فوج کے اُن کیمپ فولوورز (CAMP FOLLOWERS) کی طرح تھے جو فوج کی وردیاں تو ضرور زیب تن کیے ہوتے ہیں لیکن اُن کو فوج کی ذمہ داری سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا یا اُن رنگروٹوں کی طرح تھے جس کے ہاتھ پیر کی حرکتیں تو ایک تربیت یافتہ سپاہی کی سی ہوتی ہیں مگر ان کو فوجی تنظیم اور فوجی ربط و ضبط سے دُور کا علاقہ بھی نہیں ہوتا۔

سلام

(سید معجز حسین صاحب معجز سنبھلی)

اے شہیدوں کے تاجدار سلام　　نسل انساں کے غمگسار سلام
میرا تجھ پر سلام سبط نبی　　اے بہتّر کے سوگوار سلام

پسرِ فاتحِ حنین سلام　　جگر شاہِ مشرقین سلام
تجھ پہ لاکھوں سلام جانِ وفا　　قوّتِ بازوئے حسینؑ سلام

اُم لیلیٰ کے دل کی جان سلام　　اہل بیت نبی کی شان سلام
ہم شبیہ رسول کو مجرا　　تجھ پہ اے فخر خاندان سلام

گلِ نو بادۂ حسنؑ کو سلام　　جگر و جانِ پنجتن کو سلام
لُٹ گیا ایک شب میں جس کا سہاگ　　تیرے ہمراہ اُس دُلھن کو سلام

گو دسے خلد کے راہی کو سلام　　چھ مہینے کے سپاہی کو سلام
تیرے بچپن کے تدبر پہ فدا　　تیری اِس دُور نگاہی کو سلام

ایک بیمار و ناتواں کو سلام　　موردِ غم کو نیم جاں کو سلام
کسی منزل پہ قافلہ والو　　میرا کہہ دینا سارباں کو سلام

حاملِ عفت و عصمت تسلیم　　حاملِ رازِ امانت تسلیم
ہو گئے تجھ پہ قیامت کے ستم　　بنتِ خاتونِ قیامت تسلیم
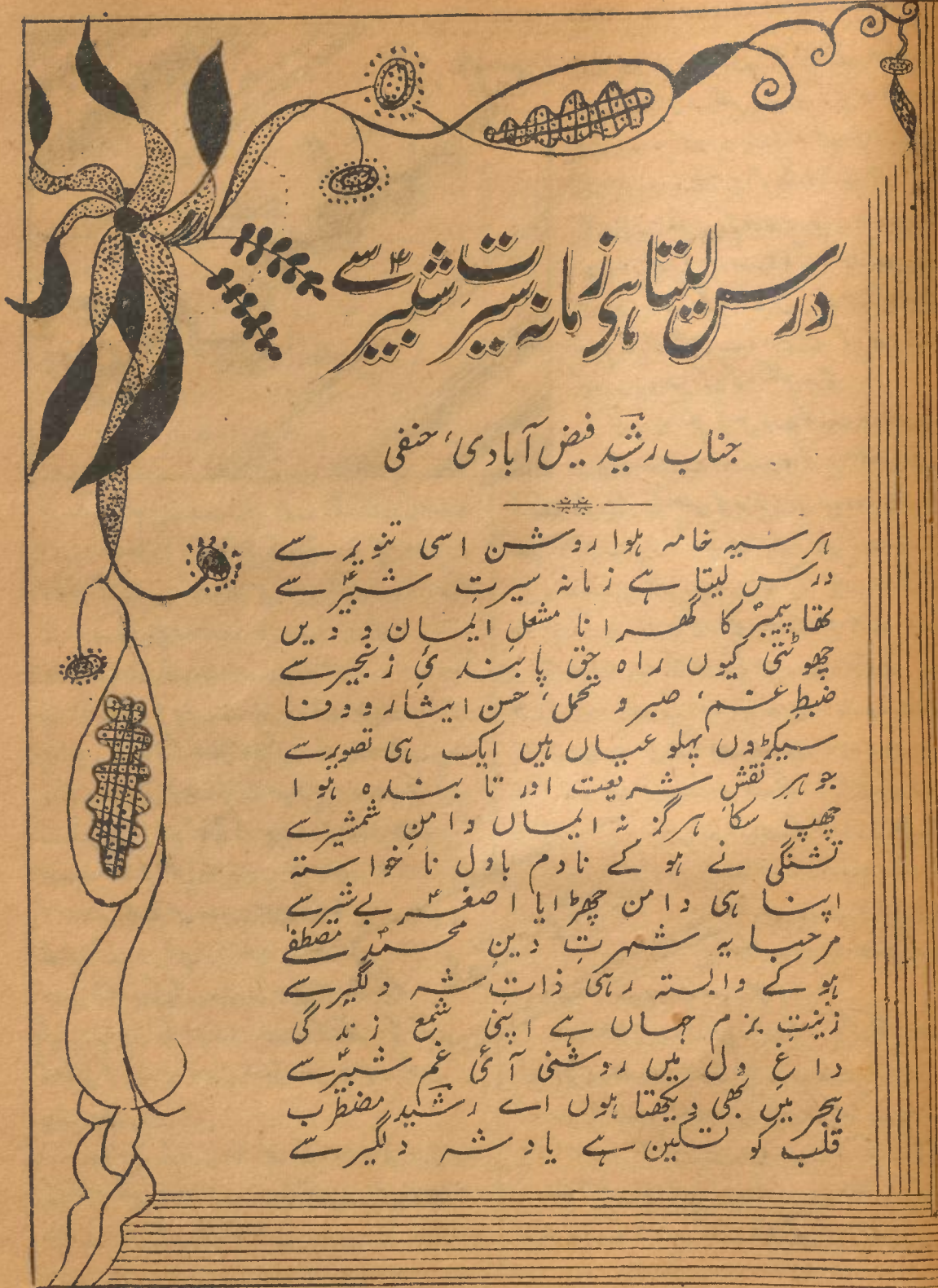
درس لیتا ہے زمانہ سیرتِ شبیرؑ سے

جناب رشید فیض آبادی، حنفی

ہر سیہ خامہ ہوا روشن اسی تنویر سے
درس لیتا ہے زمانہ سیرتِ شبیرؑ سے

تھا پیمبرؐ کا گھرانا مشعلِ ایمان و دیں
چھوٹتی کیوں راہ حق پابندیٔ زنجیر سے

ضبطِ غم، صبر و تحمل، حسن ایثار و وفا
سیکڑوں پہلو عیاں ہیں ایک ہی تصویر سے

جو ہر نقشِ شریعت اور تابندہ ہوا
چھپ سکا ہرگز نہ ایماں دامنِ شمشیر سے

تشنگی نے ہو کے نادم بادلِ ناخواستہ
اپنا ہی دامن چھڑایا اصغرؑ بے شیر سے

مرحبا یہ شہرتِ دینِ محمدؐ مصطفٰے
ہو کے وابستہ رہی ذاتِ شہِ دلگیر سے

زینتِ بزمِ جہاں ہے اپنی شمعِ زندگی
داغِ دل میں روشنی آئی غمِ شبیرؑ سے

ہجر میں بھی دیکھتا ہوں اے رشید مضطرب
قلب کو تسکین ہے یادِ شہِ دلگیر سے

سہیل صفی الہ پوری

جب امام حسینؑ کو انسانی سطح پر رکھ کر اُن کی بلندی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے تو اکثر محبانِ حسینؑ کو ناگوار گزرتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام حسینؑ کو مافوق الانسانی کے درجہ سے نیچے لانا اُن کی توہین ہے لیکن اُن کا یہ تصوّر معقولیت پر مبنی نہیں ہے۔ جب ہم امام حسینؑ کے کردار کا جائزہ ایک "انسان" کی حیثیت سے لیتے ہیں تو درحقیقت ہم انھیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم عام افرادِ انسانی کے معیارِ فہم اور عام انسانوں کے نفسیات کو امام حسینؑ کی معرفت کے حصول کا ذریعہ بنائیں جب حادث کے نقص کی بنیاد پر ہم واجب الوجود کے کمال کا اندازہ لگانے میں واجب الوجود کی توہین کے جرم کے ملزم نہیں قرار دیئے جا سکتے تو عام انسانوں کی کمزوریوں کو پیشِ نظر رکھکر اگر ہم امام حسینؑ کے معیاری اوصاف کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم پر حسینؑ دشمنی کا الزام کیوں کر عائد ہو سکتا ہے!

امام حسینؑ کے نفس اور اُس کے اطمینان کی پوری معرفت یقیناً اُسی شخص کو ہو سکتی ہے جس کی شخصیت، جس کا علم، جس کا کردار، جس کے جذبات اُتنے ہی بلند اور اتنے ہی معیاری

ہوں جتنے خود امام حسینؑ کے تھے لیکن وہ افراد جن کے نفوس اور نفسِ امام میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ امام حسینؑ کی بلندی کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے شعراء اور بڑے بڑے مفکرین کے خیالات و جذبات عام فہم انسانی سے بالاتر ہوتے ہیں اور جو لوگ انھیں سمجھ لیتے ہیں وہ خود عالم سمجھے جاتے ہیں۔ پھر جب عام انسانوں کو پہچاننا اتنا مشکل ہے تو امام حسینؑ کو سمجھنا اور اُن کی معرفت حاصل کرنا کتنا مشکل ہوگا۔

لیکن اس مشکل کو حل کرنے کا ایک اور محض ایک طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہی کہ ہم "نفسِ مطمئنہ" کو سمجھنے کے لئے اپنے نفس کا جائزہ لیں اور دونوں کا موازنہ کریں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسا کرنے میں ہم امام حسینؑ کو عام انسانی سطح پر لے آتے ہیں لیکن اس کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ امام حسینؑ کی بلندی میں کمی واقع ہو جائے اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے نقائص کے ذریعہ سے امام حسینؑ کے مثالی کردار کو سمجھنے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ ہمارے لئے ایسا کرنا ضروری ہے اس لئے کہ اس کے علاوہ ہمارے پاس معرفت امام کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور جب تک امام حسینؑ کے کردار کا ایک عظیم انسان کے کردار کی حیثیت سے جائزہ نہ لیا جائے نہ اُن کی تعلیم ہمارے لئے قابلِ فہم ہو سکتی ہے اور نہ اُن کا کردار ہمارے لئے معیارِ عمل!

اس وقت ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ نفسِ مطمئنہ کسے کہتے ہیں اور واقعات کی دنیا میں یہ لقب امام حسینؑ پر کتنا صادق آتا ہے۔ "امام" کے نفس کو سمجھنے کے لئے ہمارے پاس "معصوم" کا نفس نہیں ہے اس لئے ہم "انسان" کی حیثیت سے لفظ "نفس" پر بحث کریں گے اور اپنے نفس کے نقائص کا تجزیہ کر کے "نفسِ مطمئنہ" کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

اس طرح سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسانی نفس کے نقائص کیا ہیں اور یہ دیکھنا ہے کہ اُس میں ارتقاء کی صلاحیت کس درجہ کی موجود ہے۔

اپنے نفس اور نفسِ امام میں موازنہ کرتے وقت بہتر یہ ہوگا کہ ہم بنی نوعِ انسان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں۔ ایک عوام جو بالکل ہی جاہل، نہایت ہی پست اور محض انسان نما حیوان ہوتے ہیں اور دوسرے ممتاز انسان ادباء، شعراء، فلاسفہ، علماء، مصلحین اور بڑے بڑے ہیرو۔ بالکل ہی پست انسانوں کے نفس کا جائزہ لینے سے بہتر یہ ہے کہ ہم اُن ممتاز اور بلند انسانوں کے نفس کا تجزیہ کریں جن کی بلندی کا حصول ہر شخص کے لئے ممکن ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ دنیا کے مشاہیر علماء، فضلاء اور بڑے لوگ عام انسان ہیں اس لئے اُن کے نفس کا جائزہ لینا یقیناً "انسانی نفس" ہی کا جائزہ لینا ہے اور یہ اس لئے ضروری ہے کہ اس طرح "نفسِ مطمئنہ" کی بلندی اور "نفوسِ انسانی" کی پستی کے درمیان کا فاصلہ کچھ کم ہو جائے گا اور ہمیں یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی کہ عوام کے مقابلہ میں جس طرح خواص بلند ہیں اسی طرح خواص کے مقابلہ میں نفسِ مطمئنہ کتنا بلند ہے۔

عوام کی کمزوریوں سے ہر شخص واقف ہے۔ وہ جاہل ہوتے ہیں ان کے سامنے بالکل تاریکی ہوتی ہے، انھیں اپنی ناواقفیت کا احساس بھی نہیں ہوتا، اُن کے سامنے زندگی کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا نہ اُس کے حل کی فکر۔ محض تصورات و عقائد، توہمات و خیالات جو انھیں ادھر اُدھر سے مل جاتے ہیں وہی اُن کا سرمایۂ علم ہوتا ہے اور انھیں کی بنیاد پر اُن کی عقل فیصلہ کرتی ہے۔ وہ جذبات کا شکار ہوتے ہیں اور اُن کے اعمال جبلت (Instincts) کے پابند ہوتے ہیں۔ اُن کے خواہشاتِ نفسانی قوی ہوتے ہیں اور انھیں وہ زندگی میں اہم ترین درجہ دے دیتے ہیں۔ اُن کے مفاد اور اُن کی مسرت کا دائرہ زیادہ تر اُن کی ذات تک محدود ہوتا ہے۔

بلند انسانوں کے جذبات مختلف ہوتے ہیں، شعراء اور ادباء کے احساسات قوی اور لطیف ہو جاتے ہیں علماء و فلاسفہ کا ذہن رسا اور فکر نکتہ رس اور وسیع ہو جاتی ہے اُن کے یہاں جہل کی تاریکی نہیں ہوتی۔ کم از کم زندگی کے مسائل اُن کے پیشِ نظر ضرور ہوتے ہیں اور اُن کو حل کرنے کی دقت سے وہ واقف ہوتے ہیں۔ اُن کا فلسفۂ حیات اتنا سیدھا سادہ نہیں ہوتا جتنا عوام کا ہوتا ہے۔ زندگی کے پیچ و خم سے وہ واقف ہوتے ہیں اسی لئے اُن کا فلسفۂ حیات پیچیدہ ہوتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ امتحان کی منزلوں میں، قربانی کے میدان میں جذبات کے طوفانوں میں، حق و باطل کے پیچ و خم میں اور زندگی کی بعض دشوار گزار وادیوں میں وہ اپنی بلندی کھو بیٹھتے ہیں اور اُسی سطح پر آجاتے ہیں جن پر قابلِ رحم عوام ہوتے ہیں اور کبھی کبھی اس بلندی سے پستی کی طرف آنے میں وہ ایسے مہیب، تاریک اور گہرے غاروں میں گر جاتے ہیں جن میں عوام بھی نہیں گرتے۔ مشاہیرِ عالم کے سوانحِ حیات سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا شاعر کبھی ہمیں ایسی حالت میں نظر آتا ہے کہ ہمیں تعجب ہونے لگتا ہے، بڑے سے بڑا مفکر کبھی ایسی بات کہہ دیتا ہے جس کی ہمیں اُس سے توقع نہیں تھی اور بڑے سے بڑا مصلح کبھی ایسی اخلاقی لغزش کا شکار نظر آتا ہے کہ انسانیت انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مشاہیرِ عالم جن کی شخصیتوں کو ہم تاریخِ انسانی کا جوہر کہہ سکتے ہیں کس طرح نقائص اور کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے جو اُن کے علم کو جہل میں تبدیل کر دیتی ہے اور اُن کی بلندی کو پستی میں بدل دیتی ہے۔ اگر بلند انسانوں کی کمزوریوں کا جائزہ اُن اسباب و حالات کو پیشِ نظر رکھ کر لیا جائے جن میں وہ اُن کے کردار میں رونما ہوئیں تو ہم آسانی کے ساتھ نتیجہ نکال سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ ان لغزشوں کا پس منظر کیا ہے۔

بلند فلسفیوں، شاعروں اور ادیبوں کے اقوال کبھی
کبھی اتنے قنوطیت میں ڈوبے ہوئے اور عقل سے عاری
نظر آتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا بڑا انسان کس طرح
ایسی فاش غلطی کا مرتکب ہوگیا لیکن بلند انسانوں کے جہل
پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ حقیقت اتنی بلند ہے کہ بلند
انسانوں کی بھی رسائی وہاں تک آسان نہیں۔ باطل کو
پہچاننا اتنا مشکل ہے کہ حقیقت شناس نگاہیں بھی اس سے
دھوکا کھا جاتی ہیں۔ انسان کے جذبات کا طوفان اتنا
قوی ہے کہ بلند انسانوں کا فلسفۂ حیات بھی اس سے ٹکرا کر
پاش پاش ہو سکتا ہے۔ تلاشِ حق کا جذبہ قابلِ تعریف جذبہ
ہے لیکن ابتداءً وہ ہر جویائے حق کو ایک ایسی وحشت ناک
وادی کی طرف لے جاتا ہے جہاں نہ کوئی رہنما ہوتا ہے نہ
کوئی راستہ۔ وہ تنہا ہوتا ہے بالکل تنہا! بالکل بے یار
و مددگار! اُسے زندگی ایک بھول بھلیاں معلوم ہونے لگتی
ہے۔ وہ کبھی حق کو باطل کہنے لگتا ہے کبھی باطل کو حق۔
اور کبھی یہ سمجھتا ہے کہ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔
یقیناً جاہل عوام اس وحشتناک وادی کی صعوبتوں سے
ناواقف رہتے ہیں۔ اُن کا ذہن کبھی اس "آوارہ گردی"
کا شکار نہیں ہوتا اور یہی وہ عالم ہوتا ہے جب بڑے
بڑے مفکر عجیب و غریب باتیں کہہ جاتا کرتے ہیں اور
یہی وہ منزل ہوتی ہے جب عوام کے مقابلہ میں بہت
زیادہ علم ہونے کے باوجود وہ اُسی سطح پر ہوتے ہیں جس
پر ایک جاہل شخص ہوتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ
جاہل اپنے جہل سے ناواقف ہوتا ہے اور مطمئن ہوتا
ہے اور عالم اپنے جہل سے واقف ہوتا ہے اس لئے
غیر مطمئن ہوتا ہے۔ جاہل مسائل سے بھی ناواقف ہوتا
ہے اور اُن کے حل سے بھی اور عالم مسائل سے واقف
ہوتا ہے لیکن اُن مسائل کی نوعیت اور اُن کے حل سے
بالکل ناواقف ہوتا ہے۔

اسی طرح بلند انسانوں کی زندگی میں ایسی منزلیں
بھی آجاتی ہیں جب اُن کے جذبات اُن کے فلسفۂ حیات
اور اُن کے اخلاق کے دامن کو چاک چاک کر دیتے ہیں۔
اُن کے صبر و سکون، اُن کے وقار و تمکنت اور اُن کی
عظمت و بلندی کی پُرشکوہ چٹانیں جذبات کے تند
طوفانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں، اُن کی
بلندی اُن سے چھن جاتی ہے اور وہ ایک عام آدمی کی
سطح پر اُتر آتے ہیں۔ اس کی ایک معقول وجہ ہے اور وہ
یہ کہ عام انسانوں کے جذبات بہت حد تک اُن کے محدود
خواہشات کے پابند رہتے ہیں لیکن بلند انسانوں کے
خواہشات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اُن کی وسعت
کے لحاظ سے اُن کے جذبات میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔
ایک عام آدمی زندگی کی مسرتوں کا کبھی اتنا رنگین تصور
نہیں قائم کر سکتا جتنا ایک شاعر۔ اس لئے آرزو کے
حسین خواب کے شکست ہونے کا غم عام آدمی کو کبھی اتنی
شدت کے ساتھ نہیں ہو سکتا جتنا ایک شاعر کو ہوگا۔ اسی
طرح ایک عام انسان کو اپنے اعزا و اقارب کی تکلیف کا
کبھی اتنا شدید احساس نہیں ہو سکتا جتنا ایک مصلح کو اپنی
قوم یا ملک یا ابنائے نوع کے مصائب کا ہوتا ہے اپنی مسرتوں
کے دائرہ کو وسیع بنا لینے، دوسروں کے مفاد کو اپنا مفاد
تصور کرنے اور زندگی کے مقصد کو وسیع اور بلند بنا لینے
کے بعد جذبات کا قوی ہو جانا ضروری ہے اور ناکامیوں
کے موقع پر جذبات کا قابو سے باہر ہو جانا کوئی تعجب کی
بات نہیں۔ جب کسی انسان کے ذہن میں اخلاق، مسرت،
اور حُسن کا اعلیٰ تصور موجود ہوگا اور زندگی میں ایسے مواقع
آجائیں گے جب اُسے بداخلاقی، غم اور بدصورتی کے انتہائی
خوفناک مناظر نظر آئیں گے تو اس کا قوی امکان ہے کہ وہ
قنوطیت کا شکار ہو جائے۔ دُنیا اُسے ایک وحشت کدہ نظر
آنے لگے اور اُس کا دم گھٹنے لگے۔

انسانی جذبات کے دو پہلو ہیں۔ ایک اُسے بلندی کی طرف
لے جاتا ہے دوسرا پستی کی طرف۔ خوف، غم، غصہ، نفرت،

انتقام وغیرہ بہت قوی جذبات ہیں۔ وہ انسان کے تحفظ کے لئے ضروری ہیں لیکن حدِ اعتدال سے بڑھ جانے کے بعد جس کا نہایت ہی قوی احتمال رہتا ہے اُس کو تباہ کر دیتے ہیں محبت، رحم، مسرت، ہمدردی، ایثار وغیرہ لطیف جذبات ہیں اور خوف، غم، غصہ اور نفرت سے ان کو دشمنی ہے یہ دونوں طرح کے جذبات بیک وقت انسان پر طاری نہیں ہو سکتے۔ غم کے ساتھ غصہ، خوف کے ساتھ غم اور غم کے ساتھ انتقام کے جذبات ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قوتِ دافعہ سے پیدا ہونے والے تمام جذبات ایک ساتھ زندہ رہیں اسی طرح محبت کے ساتھ رحم، رحم کے ساتھ مسرت اور مسرت کے ساتھ محبت کا امتزاج ممکن ہے لیکن مخالف جذبات یعنی قوتِ دافعہ سے پیدا ہونے والے اور قوتِ جاذبہ سے پیدا ہونے والے جذبات بیک وقت زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایک انسان ایک وقت میں ایک ہی طرح کے جذبات کے ماتحت عمل کر سکتا ہے۔

فلسفۂ حیات کے بھی دو ہی حصے کئے جا سکتے ہیں اس لئے کہ فلسفہ درحقیقت انسانی جذبات کا ذہنی عکس ہوتا ہے۔ مسرت کی تلاش اور غم کو دفع کرنے کی جذباتی کوشش جب فکر کو آلۂ کار بنا لیتی ہے تو فلسفۂ حیات کی تخلیق ہوتی ہے انسان مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی فلسفۂ حیات کو اختیار کرے اور ہر شخص اپنی استعداد اور صلاحیت کے لحاظ سے ایک مخصوص نظامِ خیال کی تشکیل کرتا ہے لیکن یہ نظامِ خیال جذبات کے بدلنے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور فلسفیوں کے اقوال میں تضاد کا سبب یہی ہے ایک حالت میں اُس کے ذہن کا رجحان ایک طرف ہوتا ہے دوسری حالت میں دوسری طرف۔ ایک حالت میں وہ ایک طرح کے خیالات کو یکجا کر کے انھیں ترتیب دیتا ہے دوسرے حالات میں دوسرے طرح کے خیالات کو ترتیب دے کر دوسری طرح کا نظامِ فکر خلق کرتا ہے، اور جس طرح انسان کا ذہنی رجحان جذبات کا پابند ہوتا ہے اُسی طرح جذبات بہت کچھ حالات کے پابند ہوتے ہیں۔ حالات کے بدلنے کے ساتھ جذبات بدل جاتے ہیں اور جذبات کے بدلنے کے ساتھ تصورات کے بدل جانے کا قوی امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

اکثر مصنفین، شعراء و ادباء کے یہاں پہلے نمایاں طور پر رجائیت نظر آتی ہے لیکن کسی غم سے دوچار ہو جانے کے بعد آخری عمر میں یاسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ورڈز ورتھ (Wordsworth) جو اپنی رجائی نظموں کے لئے مشہور ہے اور انھیں کی وجہ سے زندہ ہے آخری عمر میں قنوطی ہو گیا تھا۔ ابو العلاء معری عرب کا ایک بہت بڑا شاعر، ادیب اور فلسفی تھا۔ اُس کے فلسفہ کا تعمیری اور اثباتی حصہ اتنا اہم تھا کہ وان کریمر (Von Kremer) نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وہ عظیم اخلاقیین میں سے ایک تھا اور اُس کی غیر معمولی قوتِ فکر نے جن حقائق کا انکشاف کیا وہ وہی ہیں جو دورِ حاضر کے علم و تمدن کے روحِ رواں ہیں۔ لیکن اس بلندی کے باوجود ماں کی بیماری، ایک مربی کے توہین آمیز برتاؤ، زمانہ کی ناسازگاری اور آخر عمر میں نابینا ہو جانے کی وجہ سے وہ قنوطی ہو گیا اور آخری دور کے تخریبی اور منفی حصہ میں اُس کے فلسفہ کا تعمیری حصہ دب گیا اور اُس کے بلند فلسفۂ اخلاق کا بہت دھندلا نقش جو باقی رہ گیا تھا وہ تشکیک اور قنوطیت کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ اگرچہ وہ پکا موحد تھا لیکن درحقیقت اُس کا عقیدۂ الوہیت اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ تمام دنیا بے رحم قسمت کی محکوم ہے جس کے اسرار کو کوئی نہیں سمجھ سکتا اور جس کے تسلط و اقتدار سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ وہ حیات بعد الممات کا منکر ہو گیا تھا اور سمجھتا تھا کہ چونکہ موت انسان کی آخری منزل ہے فلسفی کی ہمیشہ یہ خواہش ہو گی کہ وہ جلد از جلد زندگی کے مصائب سے چھٹکارا حاصل کر لے اور وہ کبھی یہ نہ چاہے گا کہ وہ دوسروں کو اُس مصیبت میں مبتلا کر دے جس میں وہ خود بغیر کسی قصور کے مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ افزائشِ نسل کا مخالف ہو گیا اور تمام عمر

وتناسل کو گناہ سمجھنے لگا اور عالم کی بربادی ہی کو نوعِ انسانی کی نجات کا واحد سہارا سمجھنے لگا۔ اُس نے اپنے خیالات پر عمل بھی کیا اور شادی نہیں کی۔ اُس کی خواہش تھی کہ اس کی قبر پر ایک شعر لکھ دیا جائے جس کا ترجمہ نکلسن نے انگریزی میں اس طرح کیا ہے :۔

"This wrong was by my father done,
To me, but ne'er by me to one."

"میرے باپ نے میرے ساتھ یہ زیادتی کی تھی لیکن میں کسی کے ساتھ کبھی اسے جائز نہ رکھوں گا۔"

موجودہ زندگی سے نفرت اور اُس کے بارے اُکتایا ہوا ہونے کے ساتھ وہ زندگی کے بعد بھی کسی خوشنما تصور سے روشناس نہ تھا سوا عدم کے۔ ابوالعلار گو صاف صاف نہ کہہ سکا کہ وہ منکرِ خدا ہے اور وحی پر یقین نہیں رکھتا لیکن اُس کے ذہن کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت وہ خدا اور وحی کا منکر تھا۔ بہت زیادہ مثالوں کو اکٹھا کرنا مقصود نہیں۔ صرف نتیجہ سے مطلب ہے۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جذبات انسان کے فلسفۂ حیات کو بدل دیتے ہیں۔ غم کا جذبہ نہایت ہی قوی اور خطرناک جذبہ ہے۔ یہ انسان کو بیماری اور پھر قبل از وقت موت کی طرف لے جاتا ہے۔ قنوطیت جذبۂ غم کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مسرت کا جذبہ لطیف جذبہ ہے اور جب اُس کی کارفرمائی ہوتی ہے تو "رجائیت" کا فلسفہ وجود میں آتا ہے۔ تمام مکاتیبِ خیال خواہ اُن میں آپس میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو قنوطیت یا رجائیت کی پیداوار ہیں یا ان دونوں کے امتزاج کا نتیجہ ہیں۔

انسانی فطرت کی یکسانیت مسلّم ہے۔ ایک ہی حالات میں جب دو مختلف انسان سوچنے بیٹھتے ہیں تو اُن کے خیالات اختلاف کے باوجود بنیادی طور پر یکساں ہوتے ہیں۔

قنوطیت کا شکار ہو جانے کے بعد جب کوئی مفکر سوچنے بیٹھتا ہے اور نظامِ کائنات پر غور کرتا ہے تو وہ ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ "Blind doting rules the world" یعنی "اندھی تقدیر کائنات کی فرمانروا ہے"۔ کبھی وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید کائنات اور انسان جبر کی ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور بالکل بے بس اور مجبور ہیں، کبھی سوچتا ہے کہ شاید فطرت بہت ہی بے رحم ہے ورنہ انسانوں کو کبھی اتنے آلام و مصائب برداشت نہ کرنا پڑتے۔ یہی وہ موقع ہے جب انسان اللہ کے خلاف بغاوت پر اُتر آتا ہے۔ کبھی وہ اُس کے وجود کا انکار کر دیتا ہے اور کبھی اُسے ایسے صفات سے متصف کرتا ہے جو اُس کے شایانِ شان نہیں۔

اسی طرح ایک مصلح جو نوعِ انسانی کا پُرخلوص ہمدرد ہے اور ابنائے نوع کی خدمت کے لئے اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار رہتا ہے جب دیکھتا ہے کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے وہ نہیں کر سکتا۔ وہ ظلم و تشدد کے شکنجہ میں اسیر ہے اور پھر یہی نہیں بلکہ جن کی محبت میں اُس نے اپنی ہر خوشی کو قربان کر دیا ہے اور جن کے لئے وہ ہر مصیبت خوشی خوشی برداشت کرنے کے لئے تیار ہے وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ وہ اُس کے خیالات سے ناواقف ہیں، وہ اُس کے جذبات سے ناآشنا ہیں، وہ اُس کے عزائم سے بے بہرہ ہیں اور خلوص کا بدلہ دشمنی سے، محبت کا بدلہ نفرت سے اور خدمت کا بدلہ ظلم سے دینے کے لئے ہر وقت مستعد ہیں تو وہ کبھی کبھی قنوطیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ شاید نوعِ انسانی کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہے، شاید فطرت نے انسان کو بداخلاقی، بیماری اور جہالت کی مصیبتیں برداشت کرنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ جب وہ اپنی بے بسی پر غور کرتا ہے اور اپنی تنہائی کا اُسے احساس ہوتا ہے تو اُس کا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ جسے نوعِ انسانی کی خدمت سمجھتا ہے وہ حقیقتاً ایک بے اثر فعل ہے ایک عبث کوشش! جس کی اہمیت کسی کی نظر میں ہے نہ جس

کا کوئی نتیجہ ہے۔ اُس وقت اُس کا نفس اُسے دھوکا دیتا ہے اور وہ اپنے کئے پر پچھتانے لگتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اُس نے جن لوگوں کے لئے اتنی تکلیفیں برداشت کیں اُن کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا اُسے اپنے مصائب کا اجر دینے والا کوئی نظر نہیں آتا اور وہ گھبرا جاتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ وہ اپنے نفس کے سکون کے لئے جد و جہد کرتا ــــ وہ مصیبتیں برداشت تو کر سکتا ہے لیکن کس کے لئے کرے اور کیوں کرے جب کہ نہ اُسے کوئی فائدہ ہے نہ دوسروں کو۔ کبھی اُن کی بداخلاقی کا ردعمل اُس کے یہاں انتقام کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے وہ غیظ و غضب کا شکار ہو جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ یہ مخلوق جسے انسان کہتے ہیں کتنی ظالم، کتنی بے رحم، کتنی احسان فراموش مخلوق ہے۔ کاش خدا اُن پر اپنا عذاب نازل کر دے۔ زلزلہ آئے اور یہ سب دفن ہو جائیں طوفان آئے اور یہ سب غرق ہو جائیں اور دنیا ان کے وجود سے پاک ہو جائے۔ اس طرح کبھی کبھی وہ ایسے نظریے اور ایسے اصول مرتب کرتا ہے جن کی بنیاد رحم کے بجائے نفرت، محبت کے بجائے انتقام، امید کے بجائے قنوطیت اور انسانیت کے بجائے حیوانیت پر قائم ہوتی ہے اور اس طرح اُس کی بلندی پستی میں، اُس کا علم جہل میں، اُس کا اخلاق بداخلاقی میں بدل جاتا ہے اور وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا بالکل اُس کے برعکس کرنے لگتا ہے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے لوگ جذبات کا شکار ہو کر قنوطیت کے دام میں اسیر ہو جاتے ہیں تو ان کی قوت فکر جو اُن کے لئے سرمایۂ ناز اور باعثِ امتیاز ہوتی ہے معطل نہیں ہو جاتی بلکہ وہ ایک ایسے فلسفۂ حیات کی تخلیق میں مصروف ہو جاتی ہے جسے صحت مند نہیں کہا جا سکتا۔ غم، بیماری اور بداخلاقی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ غم و آلام کے بوجھ سے دبا ہوا فکر و دماغ مثبت نتائج نکالنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اُس کے قائم کردہ تصورات کی نوعیت منفی ہوتی ہے۔ اُس کے عقائد میں اختیار کی جگہ جبر، امید کی جگہ یاس، محبت کی جگہ نفرت اور عمل کی جگہ جمود کی ترغیب ہوتی ہے اور یقیناً یہ فلسفۂ حیات جہل سے زیادہ خطرناک اور جہل سے زیادہ مضر ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ جاہل کا جہل صرف اُسی تک محدود رہتا ہے اور متفکر کا فلسفہ دوسروں کے لئے بھی مضر اثرات پیدا کرنے کا سبب ہو سکتا ہے۔

عوام کی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ ہم نے اُن کمزوریوں کا جائزہ لیا جن کا بلند اور ممتاز انسان شکار ہو جایا کرتے ہیں اور ہم نے یہ دیکھا کہ کس طرح ناخوشگوار حالات اور زندگی کی پُر صعوبت راہوں میں انسان کی قوت واقعہ غم و الم، خوف و دہشت، انتقام و نفرت اور یاس و نومیدی پیدا کر کے اُس کے اطمینانِ قلب کو تباہ کر دیتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ جذبات اُس کے فلسفۂ حیات کو متاثر کر کے اُس کے ذہنی سکون کے خرمن پر بجلیاں گرانا شروع کر دیتے ہیں اور پھر اس ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اثر قہری طور پر غیر معتدل اور غیر عقلی عمل کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ امام حسینؑ کی جگہ اگر مشاہیرِ عالم میں سے کسی بلند انسان کو دکھ دیا جائے تو اُس کے لئے کتنی لغزشوں کے امکانات تھے۔ اس کے بعد اندازہ ہوگا کہ "بلند انسانوں" کے نفس اور نفسِ مطمئنہ میں کیا فرق ہے اور امام حسینؑ کی بلندی کس درجہ کی ہے کہ اُس کے سامنے بلند سے بلند انسان کی بلندی بھی پستی معلوم ہوتی ہے۔

وہ حالات جن میں امام حسینؑ گھرے ہوئے تھے ایسے تھے کہ تاریخ اُس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ظلم و تشدد برسرِ اقتدار، شہنشاہیت کا غرور فرعونیت سے ہم آغوش۔ طبل و علم، لشکر و خزانہ اور طاقت و اقتدار متحد ہو کر صف آرا۔ جاہل عوام بھوکے بھیڑیوں کی طرح یزیدی پرچم کے نیچے اکٹھا۔ امن و صلح، پند و نصیحت، گفت و شنید، دلیل و برہان کے سارے دروازے بند! ــــ یہ ایسے حالات

تھے جن میں ایک تنہا انسان خواہ وہ کسی درجہ بلندی کا حامل کیوں نہ ہو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ خوف و دہشت پیدا کرنے کی کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ ۷۲ انسانوں کے قتل کے لئے ہزار دو ہزار کی فوج کافی تھی لاکھوں کی تعداد کی کیا ضرورت تھی۔ پورا کوفہ کربلا میں انڈیل دیا گیا تھا۔ یہ اسی لئے تھا کہ امام حسینؑ کو خوفزدہ کر دیا جائے۔ خوف و دہشت کے اس ماحول میں بڑے سے بڑے انسان کو خوفزدہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ اگر کوئی دوسرا انسان ہوتا اور موت کو نہ بھی ڈرتا ہوتا تو ممکن تھا وہ اس بات سے ڈر جاتا کہ اس کے ساتھ اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جنھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ اگر اس سے بھی نہ ڈرتا تو ممکن ہے اس بات سے ڈر جاتا کہ اُن کے ساتھ اس کی عورتیں ہیں کہیں اُن کی بے حرمتی نہ ہو۔ اگر وہ اور بلند انسان ہوتا اور اپنے اصول کے تحفظ کے لئے ان چیزوں سے بھی نہ ڈرتا تو اس بات سے ڈر جاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مصائب برداشت کر کے قتل بھی ہو جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ کون قتل ہوا اور کس لئے قتل ہوا۔ لبظاہر کوئی ایسی صورت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ امام حسینؑ کے کارنامہ سے دنیا واقف ہو سکتی جب حکومت مخالف ہو، تحریر و تقریر اور عمل کے سب دروازے انسانوں پر بند ہوں۔ قید و بند اور قتل و غارت گری کا سامان ہر پرستار حق کے لئے مہیا ہو تو کیوں کر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اصل واقعہ کی نوعیت یا امام حسینؑ کی مظلومیت اور حق پسندی یا دشمن کے ظلم و ستم کا تذکرہ تاریخ میں درج ہو سکے گا۔ اس کے برخلاف اس کا قوی امکان تھا کہ واقعات کو مسخ کر دیا جائے، مقصدِ حسینی کو مٹا دیا جائے تعلیمات امام کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ ظالم کے مظالم کا ذکر ہی نہ کیا جائے مظلوم کی حق پسندی اور مظلومیت کو الزامات کے پردہ میں چھپا دیا جائے اور یہ خوف ایسا تھا جس کا بڑے سے بڑا انسان بھی شکار ہو سکتا تھا۔ تمام آلام، تمام مصائب تمام ذلت برداشت کرنے اور اپنی اور اپنے اعزا کی جانیں قربان کر دینے کے بعد بھی وہ مقصد حاصل نہ ہو جس کے لئے یہ سب کچھ اختیار کیا جائے۔ یہ بہت ہی تکلیف دہ تصور ہے۔ اگر زندگی میں کسی بلند انسان کو اُس کے خلوص اور اُس کے کردار کا اجر نہ ملے تو اُسے پروا نہیں ہوتی۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو سکتا ہے کہ آیندہ آنے والی نسلیں اُس کی قدر کر سکیں گی۔ اگر اُس کی زندگی میں نوعِ انسانی کی اصلاح کی کوششیں بار آور نہیں ہوئیں تو وہ یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ آیندہ نسلیں اس سے سبق حاصل کرنے کے لائق ہو سکیں گی۔ لیکن کتنا دل شکن تھا سنہ ۶۱ھ کا ماحول جب اُصولِ حق اور نوعِ انسانی کا مستقبل بالکل تاریک نظر آ رہا تھا۔ جب جہل، ظلم اور باطل کی تاریکیاں حق اور انسانیت کو نگل جانے پر آمادہ نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ خیال ایسا تھا کہ بڑے سے بڑا انسان بھی اس خیال سے خوفزدہ ہو جاتا اور اُس کے قدمِ ثبات میں لغزش آ جاتی۔

خوف و دہشت پیدا کرنے والے حالات کے ساتھ اب غم پیدا کرنے والے اسباب پر نظر ڈالیے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ واقعۂ کربلا سے زیادہ المناک کوئی اور واقعہ بھی گزرا ہے؟ — وہ ایسا واقعہ ہے جس کے تذکرے سے آج بھی دل بے چین ہو جاتا ہے۔ پھر غم و آلام کے اُس طوفان میں ہوش و حواس کا برقرار رکھنا کتنا مشکل ہو گا جس میں امام حسین گھرے ہوئے تھے۔ اگر امام حسینؑ کی جگہ کوئی بلند سے بلند انسان بھی ہوتا تو کسی نہ کسی موقع پر ضرور غم کا شکار ہو جاتا، اور ضرور کبھی نہ کبھی اُس کا غم اس نقطہ پر پہنچ جاتا جب صبر و سکون کا دامن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور اُس کا قدم راہِ حق سے ہٹ جاتا۔ اگر بچپن کے دوست اور وفادار ساتھیوں کا غم وہ برداشت کر لیتا تو ممکن تھا کہ اعزا کا داغِ جدائی وہ برداشت نہ کر سکتا۔ اگر قاسمؑ کی لاش کی پامالی کا منظر دیکھ کر دل سنبھال لیتا تو بہت ممکن تھا کہ علی اکبرؑ کو دم توڑتے ہوئے دیکھ کر اُس کے خرمنِ صبر پر بجلی گر پڑتی۔ اگر جوان بیٹے کی موت اُسے راہِ حق سے نہ ہٹا سکتی تو ممکن تھا کہ اُس کے

بعد جب قوتِ بازو کے شانے قلم کئے جاتے تو قوتِ برداشت جواب دے جاتی اور اگر ان سب صدموں کو برداشت کرلیتا تو بے زبان، تشنہ لب شِشماہے کا داغ برداشت نہیں کرسکتا تھا اور اگر برداشت کرلیتا تو اُس کا دل پھٹ جاتا ـــــ وہ موقع تو ایسا تھا کہ انسان تو انسان ہے چٹان کے سینے میں شگاف پڑ جاتا! ـــــ وہ صرف نفسِ مطمئن تھا جو اسے برداشت کرسکا۔ اس مصیبت کو برداشت کرنا اور حق کی راہ پر باقی رہنا بلندی کردار کا معجزہ ہے۔

ہم دنیا کے ممتاز اور بلند انسانوں میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھتے ہیں جب کسی ایک عزیز کی موت کے بعد انسان قنوطی ہو جاتا ہے۔ کسی ایک ناخوشگوار واقعہ کا نفسیاتی اثر برسوں دور نہیں ہوتا یہاں تک کہ خیالات میں عظیم انقلاب اُسی کی بنا پر پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اتنے صدموں، اتنے مصائب اور اتنے آلام میں توازنِ دماغی کا باقی رکھنا بھی کتنا دشوار تھا۔

بڑے سے بڑا مصلح اور نوعِ انسانی کا [illegible] کسی موقع پر نوعِ انسانی کے مستقبل سے مایوس ہو سکتا ہے۔ اُس میں نفرت اور انتقام کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ امام حسینؑ کو جن اشقیا سے سابقہ پڑا تھا وہ بھی ظلم کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ آج بھی اُن کا نام سُن کر ہمارے نفس میں نفرت کی ایک رَو دوڑ جاتی ہے۔ ایسے ظالم اور شقی القلب دشمنوں کے خلاف انتقام کے جذبہ کا نہ پیدا ہونا انسانیت کی معراج ہے۔

حزن، غضب، انتقام، نفرت اور غم کے ایسے شدید جذبات کو پیدا کرنے کے لئے جب اتنے غیر معمولی اسباب فراہم ہوں تو عقلی طور پر ان سب کا پوری شدت کے ساتھ رونما نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور اتنے قوی جذبات اتنی شدت کے ساتھ جب ایک شخص کے یہاں بیک وقت پیدا ہو جائیں تو جذباتی ہیجان کی شدت کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا اور اگر ایسے موقع پر بلند سے بلند انسان سے بھی غیر معتدل، غیر متوازن اور اضطراری افعال صادر ہونے لگیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ امام حسینؑ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ امام حسینؑ کا کردار اس تصویر کا بالکل دوسرا رُخ پیش کرتا ہے۔ اگر ہمیں نفسِ مطمئنہ کی تشریح کرنا ہے تو ہمیں کردارِ امام کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا اور اُن حالات کا جائزہ لینا ہوگا جن میں انھوں نے تاریخِ انسانی کا سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ شاندار اور سب سے زیادہ بلند کارنامہ انجام دیا۔ اگر ہمیں ایک شخص کے حالات اور اُس کا جذباتی اور ذہنی پس منظر معلوم ہو تو ہم آسانی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ اُس کا کردار کیسا ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے حالات کا ہمیں علم ہو اور اُس کا کردار ہمارے سامنے ہو تو ان دونوں کو ملا کر ہم اُس کے جذباتی اور ذہنی پس منظر کو معلوم کرسکتے ہیں۔ امام حسینؑ کے جذبات و احساسات اور تصورات و عقائد کا کوئی مکمل خاکہ تاریخ میں موجود نہیں ہے اور نہ تاریخ کی نگاہیں اُس تک پہنچ ہی سکتی تھیں لیکن اُن کے حالات، اُن کے زمانہ کا ماحول اور اُن کا کارنامہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے اور ہم ان دونوں کی مدد سے اُن کے جذبات و تصورات کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم "نفسِ مطمئنہ" کی تشریح کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے۔ واقعات کی دنیا میں یقیناً محض امام حسینؑ ہی کا کردار ہمیں ایسا نظر آتا ہے جس کی وجہ سے "نفسِ مطمئنہ" کے الفاظ بامعنی بن سکے ہیں اور اگر کردارِ حسینی ہمارے پیشِ نظر نہ ہوتا تو یہ الفاظ شرمندۂ معنی نہ بن سکتے۔

"نفس" ایک وسیع المفہوم لفظ ہے۔ وہ انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ یہ لفظ انسان کے پورے وجود پر محیط ہے۔ اسی طرح "اطمینانِ نفس" بھی ایک بہت وسیع لفظ ہے۔ اطمینانِ قلب، سکونِ دماغ، جذبات کا سکون، وہ سکون جو حق سے واقفیت اور یقین میں ہوتا ہے، وہ

سکون جو بلندیٔ کردار سے حاصل ہوتا ہے یہ سب "اطمینانِ نفس" کا جزو ہیں۔

ہمیں نفس مطمئنہ کی تشریح کے لئے امام حسینؑ کے فلسفۂ حیات کا جائزہ لینا ہوگا۔ اُن کے جذبات کا تجزیہ کرنا ہوگا، اُن کے خواہشات پر نظر کرنا ہوگی، اُن کی قوتِ ارادی کی طاقت کا اندازہ لگانا ہوگا۔ اُن کے ضبطِ نفس کی صلاحیت کا تصور کرنا ہوگا تب کہیں ہم یہ سمجھنے کے قابل ہوسکیں گے کہ نفس مطمئنہ کسے کہتے ہیں۔

نفس امام کا جائزہ لیتے وقت سب سے پہلے ہمیں اُن کے فلسفۂ حیات پر غور کرنا ہوگا۔ اور یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کون سے پُرطاقت تصورات تھے جو اتنے شدید جذباتی طوفانوں کو روکے رہے اور جذبات پر بہرحال حکمراں رہے۔ غم و الم کا نشانہ بننے سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کو خوف کی دہشتناک وادی سے گزرنا پڑا۔ دشمن نے اپنی ساری کوششیں اُنھیں خوفزدہ کرنے میں صرف کردی تھیں۔ طاغوتی طاقتیں اپنی بے پناہ صلاحیتِ ظلم و تشدد پر نازاں تھیں۔ ایسے موقعوں پر مصیبت سے زیادہ مصیبت کا خیال اور موت سے زیادہ موت کا تصور خوفناک بن کر سامنے آتا ہے۔ ایسے عالم میں خوف زدہ نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ذہن امام میں کوئی نہایت ہی پرطاقت تصور تھا جو دشمن کے خوف کو دبائے رہا۔ اُس وقت جب مادی اسباب مہیا نہ ہوں جب مادی طاقت حاصل نہ ہو جب بالکل بے بسی اور تنہائی کا عالم ہو۔ جب عالم اسباب میں کسی شے پر اقتدار نہ ہو، جب لوازم حیات کے حصول کے سارے دروازے بند ہوجائیں اگر کوئی چیز انسان کے ذہن کو سکون پہنچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسی ہستی کا تصور ہے جسے قادرِ مطلق اور خالقِ کائنات تسلیم کرلیا جائے۔ ایسے عالم میں اگر انسان حق پر ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کی پشت پناہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی قدرت و عظمت کے آگے کائنات سربسجود ہے تو ضرور اُس کے دل و دماغ کو تقویت اور سکون حاصل رہے گا اور وہ ایک ایسی بلندی پر اپنے آپ کو محسوس کرے گا جہاں خوف و دہشت کی آندھیاں نہیں پہنچ سکتیں۔ اور یہی اللہ کی بے پناہ عظمت و جلالت اور عظیم قدرت و اقتدار کا تصور تھا جس کے مقابلہ میں یزیدی طاقت نہایت ہی درجہ پست اور نہایت ہی درجہ حقیر نظر آتی تھی اور تصور الٰہ کی یہی وہ طاقت تھی جس نے امام حسینؑ کو مجسمۂ صبر و سکون بنادیا۔

اسی طرح غم کی منزل میں جب کہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو دماغی توازن کھو بیٹھتا امام حسینؑ کوہِ استقلال بن کر ثابت قدم رہے۔ نفسیاتی طور پر انسان کو اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنی مسرتوں کا تحفظ کرتا ہے اور سب سے بڑھکر اُسے اپنی زندگی عزیز ہوتی ہے اس لئے کہ ساری مسرتیں، ساری لذتیں، ساری دلفریبیاں زندگی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ جب زندگی خطرہ میں ہو اُس وقت کون خیال ایسا ہوسکتا ہے جو زندگی کی نعمتوں کو خوشی خوشی قربان کردینے پر آمادہ کرسکے۔ ایک بلند انسان نوعِ انسانی کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے، دوسروں کو مصائب و آلام سے چھٹکارا دلانے کے لئے، دوسروں کے مفاد کا تحفظ کرنے کے لئے اپنی ذات کو قربان کرسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے اعزا و اقارب کو بھی اپنے مقصد کے حصول کے لئے قربان کردے لیکن جب ایسا موقع ہو جیسا میدان کربلا میں آگیا تھا جب قربانی اور ایثار کی ان تمام منزلوں سے گزر جانے کے بعد بھی حقیقت کے گم ہوجانے کا اندیشہ ہو، جب تمام آلام و مصائب برداشت کرنے کے بعد بھی اس کا احتمال ہو کہ تمام قربانیاں بےکار ہوجائیں گی اور وہ اُصول دشمن کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکیں گے جن کا تحفظ مقصود ہے اور وہ مقصد نہ حاصل ہوسکے گا جس کے لئے یہ سب کچھ قبول کیا جارہا ہے اُس وقت یقیناً بلند سے بلند انسان بھی قنوطیت کا شکار ہوسکتا ہے، نوعِ انسانی کے مستقبل سے مایوس ہوسکتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ عالمِ یاس میں اُس کے یہاں عمل کے بجائے جمود پیدا ہوجائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مقاومت کے بجائے

وہ خودسپردگی پر آمادہ ہوجائے۔ ایسی حالت میں جب نوعِ انسانی کی محبت کا جذبہ اور تمام اُصولِ عقلی انسان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اگر کوئی چیز انسان کو راہِ حق پر برقرار رکھ سکتی ہے تو وہ نفسیاتی طور پر تصور اللہ ہے۔ ایک ایسے اللہ کا تصور جو حکیم ہے جو خالقِ کائنات ہے جو انسان کے افعال کا نگراں ہے اور جو نیکی اور بدی کا اجر دینے والا ہے۔ اللہ کا تصور اس نفسیاتی کشمکش کے وقت یقیناً اُس ذہنی خلا کو پُر کرسکتا ہے جہاں عقلی اُصول کی رسائی نہیں اور وہ انسان جو اس مصیبت میں گھرا ہوا ہے یہ سوچ کر مطمئن ہوسکتا ہے کہ اگر انسانوں میں کوئی اُس کے خلوص، اُس کی محبت، اُس کے ایثار، اُس کی قربانی اور اُس کے عمل کا قدرشناس نہیں تو اللہ تو ہے جو اُس کی قدر کرے گا۔ اگر انسانوں میں کوئی اُس کی نیت سے واقف نہیں تو اللہ تو ہے جو نیتوں کا جاننے والا ہے۔ اگر اُس کے اعلیٰ مقاصد سے جاہل عوام واقف نہیں تو اللہ تو واقف ہے۔ اگر اللہ کی مخلوق کی خدمت کے لئے وہ اپنا سب کچھ قربان کر رہا ہے اور تابحدِّ امکان اُن کی بہبودی اور فلاح کے لئے کوشاں ہے اور حالات اُس کے عمل کو بے نتیجہ بنائے دے رہے ہیں تب بھی اللہ کی نگاہ میں تو وہ بے نتیجہ نہیں ہے وہ تو اُس کا اجر دینے پر قادر ہے اور یقیناً یہی وہ تصورات ہوسکتے ہیں جو اتنے ہولناک ماحول میں بھی جیسا کربلا کا تھا انسان کو انسانیت اور نوعِ انسانی کی خدمت اور اصلاح کے راستہ پر گامزن رکھ سکتے ہیں۔ اگر ایسے موقع پر اللہ کے عقیدے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نفسیاتی طور پر وہ محض اللہ کے وجود کا عقیدہ نہیں بلکہ حق کی عظمت کا عقیدہ ہے، کائنات کے نظامِ حکمت پر مبنی ہونے کا عقیدہ ہے، حق کے طاقت اور صرف حق ہی کے طاقت ہونے کا عقیدہ ہے، انسان کے ذی شعور اور مختار ہونے کا عقیدہ ہے، انسان کے فطرۃً نیک ہونے کا عقیدہ ہے اور نوعِ انسانی کے شاندار مستقبل کا عقیدہ ہے! —— وہ محض اللہ کے وجود کا عقیدہ نہیں ہے۔ وہ امید کا روشن منارہ بھی ہے، وہ مسرت کا جگمگاتا ہوا ستارہ بھی ہے، وہ اخلاق کا پُرشکوہ قلعہ بھی ہے، وہ انسانیت، رحم، ہمدردی اور محبت کا سکون آفریں خلوت کدہ بھی ہے اور یہی امید، یہی مسرت، یہی اخلاق، یہی محبت، یہی ہمدردی، یہی سکون وہ ہے جس کا حصول مقصدِ حیات ہے۔ اگر مرتے مرتے بھی انسان ان نعمتوں سے ہمکنار ہے تو وہ با مقصد جیا اور با مقصد مرا اور اگر زندگی میں بھی انسان ان سے محروم ہوگیا تو وہ مردہ سے بدتر ہے۔

امام حسینؑ کے فلسفۂ حیات کے اس مختصر سے خاکہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم امام حسینؑ کے جذبات اور عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ ایسے خطرناک ماحول میں امام حسینؑ اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے میں کیونکر کامیاب ہوسکے جو نفسیاتی طور پر بلند سے بلند انسان کے لئے بھی محال تھا۔ آیئے اور اس عظیم المرتبت انسان کے کردار کا جائزہ لیجئے اور آپ دیکھیں گے کہ اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں، نوعِ انسانی کے ساتھ بلند ترین جذبۂ محبت، ابنائے نوع کی اصلاح کا شدید جذبہ، عفو و کرم، ملاطفت و محبت، ایثار و ہمدردی اور سکونِ نفس کا قدم قدم پر مظاہرہ ہو رہا ہے۔ کبھی دشمن کو پیاسا دیکھ کر اُس کا دل بے چین ہوجاتا ہے اور خود پیاس کا خطرہ مول لے کر اُسے سیراب کیا جاتا ہے، کبھی دشمن کی ندامت کے بعد اُسے نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ معاف کر دیا جاتا ہے اور اس طرح بدی سے نکلنے والے اُس شخص کو سہارا دیا جاتا ہے جو کربلا میں گھیر کر لانے والا اور اُس کی تشنگی کا ذمہ دار تھا، کبھی خوف کے محل پر نماز اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ سامنے سے فوجیں تیر اندازی کر رہی ہیں اور وہ نماز پڑھا رہا ہے کبھی اُس موقع پر جب اُسے نفسیاتی طور پر پانی سے نفرت ہوجانا چاہیئے تھی، یعنی علی اصغر کے تیر کھا کر تشنہ لب دم توڑ دینے کے بعد، دشمن کے اعلیٰ انسانی جذبات سے پیاس بجھانے کی اپیل کی جا رہی ہے۔ بخدا اگر دشمن امام حسینؑ کو اُس وقت پانی دے دیتے تو وہ کبھی نہ

پہنچے لیکن یہ ضرور تھا کہ دشمن ایک ایسے جرم سے کسی حد تک محفوظ ہو جاتا جو انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا بن گیا ہے کبھی اُس موقع پر جب قاتل کو یہ تصور تھا کہ امام حسینؑ بد دعا دے رہے ہیں۔ دشمن کو دعا دی جارہی ہے اور دعا بھی ایسی جس میں پیغمبرانہ شان نمایاں ہے، کبھی اُس موقع پر جب زخموں کی تاب نہ لاکر امام حسینؑ کی روح خود جسم سے مفارقت کرجاتی۔ قاتل کو قتلِ مظلوم کے جُرم سے بچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یقیناً اُس عالم میں امام حسینؑ کے لئے نفسیاتی اور جسمانی طور پر سکون اسی میں تھا کہ جلد سے جلد وہ موت کی پُرسکون آغوش سے ہمکنار ہو جائیں۔ لیکن وہ نفس مطمئن تھا، اُسے سکون کے لئے موت کی پناہ گاہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ امامت کا فرض پورا کر رہا تھا اور فرض کی ادائیگی اُسے وہ سکون بخش رہی تھی جو کوئی دوسری شئے نہیں دے سکتی اور کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ اُس وقت جب ایسا قیامت خیز وقت آگیا تھا کہ دریا کی روانی ختم ہوگئی تھی، دشمن کی فوجیں دم بخود ہوگئی تھیں، ظلم کے ہاتھ شل ہوئے جارہے تھے، تشدد کو پسینہ پر پسینہ آرہا تھا، باطل کی نبضیں ساقط ہوئی جارہی تھیں، آسمان سرنگوں تھا، کائنات سکتے میں آگئی تھی —— امام حسینؑ ایک بلندی پر کھڑے ہوئے تھے، خیمہ کا پردہ ہل رہا تھا اور ایک ننگِ انسانیت نے کلام حسینؑ کو قطع کر دیا —— اُس وقت جب ایک بے زبان خون اگل کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، جب ایک تشنہ لب ہمیشہ کے لئے پیاس کی اذیت سے چھوٹ گیا، جب ایک بے شیر انسانی درندوں کی بربریت سے بچنے کے لئے فردوسِ بریں کی پُرسکون آغوش میں ہمیشہ کے لیے چلا گیا، امام ساکت کھڑے ہوئے تھے۔ نہ ہاتھوں میں لغزش پیدا ہوئی نہ قدموں میں! —— اس پُرہول ماحول اور اس دردناک منظر پر امامت کا تقدس چھایا ہوا تھا!!!! —— ایسے عالم میں دل و دماغ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، رقت سے گلا رُندھ جاتا ہے، ہاتھ پیر جواب دے دیتے ہیں، ہوش و حواس رخصت ہو جاتے ہیں اور زبان سے قوت گویائی سلب ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ہے نفسِ مطمئن! اگر زبان گنگ ہو جاتی تو فرض کون ادا کرتا! —— امام کی زبان کو جنبش ہوئی —— "انا للہ و انا الیہ راجعون رضًا بقضائه و تسليمًا لامره" —— اس ماحول کو دیکھئے اور اس جملہ پر غور کیجئے! زندگی کی مسرتوں کے ختم ہو جانے کا ماتم نہ تھا اللہ کی طرف سُرخرو پلٹنے کی خوشی تھی، غم و الم، ظلم و تشدد کی اللہ سے شکایت نہ تھی، اُس کی مرضی کے سامنے سرِ عبودیت خم کر دینے کی خواہش تھی۔ یہی وہ موقع ہے جب سارے عقلی نظریے اور سارے فلسفے انسان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور وہ اضطرار و بے چینی، کرب و مصیبت کے عالم میں تنہا رہ جاتا ہے —— لیکن یہ ہے امام حسینؑ کا فلسفۂ حیات جو کسی عالم میں بھی انسان کو تنہا نہیں چھوڑتا اور نہ کسی موقع پر رہنمائی سے منھ موڑتا ہے

امام حسینؑ کے فلسفۂ حیات کی ہمہ گیری اور دشوار سے دشوار منزلِ عمل میں اُس کا کارآمد ثابت ہونا ہی محض کردارِ حسینی کی تشکیل کا باعث نہ تھا اسی کے ساتھ یہ بات بھی لائقِ غور ہے کہ اگر ان عقائد و تصورات کو یقین کا درجہ حاصل نہ ہوتا تو جذبات سے اُن کا متاثر ہو جانا ضروری تھا۔ اسی لئے تعلیماتِ اسلام میں وجودِ الٰہ، آخرت اور سزا و جزا پر یقین لانے کی ہدایت کی گئی ہے اور یہی یقین کی منزل وہ ہے جسے مذہب کی اصطلاح میں "ایمان" کہتے ہیں۔

امام حسینؑ کے فلسفۂ حیات اور جذبات کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم "نفسِ مطمئن" کا مفہوم معین کرسکتے ہیں نفس کے جتنے شعبے ہیں اُن سب کا جائزہ لے سکتے ہیں اور اُن میں سے ہر شعبہ کے اطمینان کے معنی سمجھ سکتے ہیں۔ انسان کا نفس جن چیزوں سے عبارت ہے ان میں سب سے اہم مرتبہ ذہن کو حاصل ہے۔ ذہنی سکون کے لئے ضروری ہے کہ انسان اعلیٰ ترین اُصولِ حیات کو رہنما بنائے، کائنات کو نظامِ حکمت کا پابند سمجھے، انسان کی صلاحیتِ ارتقاء پر یقین رکھے، رجائیت عمل اور جد و جہد کا حامی ہو، خالقِ کائنات کو ہمیشہ اپنا

پشت پناہ تصور کرے اور اصلاح نفس کو بلندترین خوش بختی تصور کرتا ہو اور ان عقائد کا اُس کے ذہن میں دھندلا سا خاکہ ہی نہ ہو بلکہ ان کے گہرے نقوش اُس کے ذہن پر مرتسم ہو چکے ہوں، وہ یقین اور ایمان کی منزل پر فائز ہو یہاں تک کہ جذبات و احساسات اور خواہشات کا مدوجزر انھیں متزلزل نہ کرسکے بلکہ سارا نظامِ جسمانی، تمام احساسات و جذبات، تمام افعال و حرکات، تمام اعضاؤ جوارح خود ان اصول کے تابع ہوں اُس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ذہنی سکون کی منزل ہے

جذباتی طور پر سکون کے معنی یہ ہیں کہ قوت جاذبہ سے پیدا ہونے والے لطیف جذبات جو معینِ حیات ہیں یعنی محبت، رحم، مسرت، ہمدردی، ایثار وغیرہ وہ قدرت کے منشار کے مطابق ہمیشہ، ہر حالت میں متحرک بالعمل رہیں اور قوت دافعہ سے پیدا ہونے والے جذبات یعنی غصہ، نفرت، خوف، انتقام اور غم وغیرہ محض اعتدال کے اُن حدود میں مقید رہیں جہاں تک وہ انسان کے نفس کے تحفظ کے لئے ضروری ہیں۔ اور جب وہ اپنے مقصدِ وجود یعنی تحفظ نفس کو پورا کرنے سے قاصر ہو جائیں اور اُسے تباہ کر دینے کے درپے ہو جائیں تو اُنھیں لطیف جذبات کی قوت سے دبا دیا جائے۔ درحقیقت جذبات کا یہی وہ حکیمانہ اعتدال و توازن ہے جسے ہم "سکون" کی لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

ذہنی و جذباتی سکون کے بعد قوت ارادی کی منزل آتی ہے۔ لبعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب انسان جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے اور اس کمزوری کے نتیجہ میں اُس سے لغزش کا امکان پیدا ہو جاتا ہے اُس وقت یا اس طرح کے دوسرے موقعوں پر قوت ارادی توازن باقی رکھتی ہے اور نفس انسانی میں حق کا ساتھ دے کر تخریبی عناصر کی بغاوت کو کچل دیتی ہے۔

اس کے بعد خواہشاتِ جسمانی کا ذکر ضروری ہے۔ مثلاً بھوک اور پیاس۔ خواہشاتِ جسمانی پر قابو پالینا بھی ہر انسان کے لئے ممکن نہیں۔ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جنگ یا قحط کے موقع پر انسان صرف پیٹ بھرنے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اخلاق، انسانیت، مذہب، عزت، شرم اور انسان کی تمام بلندیاں بھوک کے مقابلہ میں سپر انداختہ ہو جاتی ہیں۔ قحط کے زمانہ میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ مائیں اپنے بچوں کے گوشت سے پیٹ بھر لیتی ہیں، عزت و حرمت ایک ٹکڑے روٹی کے عوض بیچ دی جاتی ہے اور کوئی خوفناک سے خوفناک اور شرمناک سے شرمناک فعل ایسا نہیں ہے جسے کرنے پر انسان تل نہ جائے۔ لیکن نفسِ مطمئن وہ ہے جو خواہشاتِ جسمانی کا حکمراں ہو۔ تین دن کی بھوک اور تین دن کی پیاس ہو اور چہرے پر شکن نہ آنے پائے۔ نہ عقائد میں کمزوری پیدا ہو، نہ جذبات میں ہیجان اور نہ عمل میں کمزوری!

اب ان سب باتوں کو ملا کر دیکھیے تو نفسِ مطمئن کی تصویر نظر آئے گی۔ اعلیٰ ترین فلسفۂ حیات، ایمان، معتدل جذبات، خواہشات جسمانی پر اقتدار، انتہائی پُرطاقت قوت ارادی، یعنی نفس کے تمام شعبے اعتدال اور سکون سے ہمکنار ہوں اور ان سب میں ہم آہنگی، یکسانیت اور اشتراکِ عمل ہو تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے "اطمینانِ نفس" — یہ ایک ایسا وسیع اور جامع لفظ ہے کہ ہر انسانی بلندی پر محیط ہے جتنی بلندی اور عظمت ایک انسان میں تصور کی جاسکتی ہے وہ سب "اطمینانِ نفس" کے دائرہ میں آجائے گی

میں سچ کہتا ہوں کہ امام حسینؑ کی روحانیت اور اُن کی روحانیت سے ظاہر ہونے والے معجزوں کا انکار اگر جرم ہے تو امام حسینؑ کی انسانیت اور اُن کے بے مثال کردار کی معجزنمائی کا انکار اُس سے بڑا جرم ہے — ! امام حسینؑ کی روحانیت ہرگز ایسی روحانیت نہ تھی جس کا اتباع نہ کیا جاسکے، نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم امام حسینؑ کی روحانیت کو محض وجدانیت کی تاریک فضا میں گم کر دیں۔ اس کی ضرورت تو اُن لوگوں کو ہے جو اپنے رہنماؤں کے کردار کی عقلی تاویل سے عاجز ہیں اور مجبوراً وجدانیت اور سریت کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں۔ اور

کوئی وجہ نہیں ہے کہ جب ہم اُن کے فلسفۂ حیات، اُن کے جذبات اور اُن کے کردار کا عقلی تجزیہ کرسکتے ہیں اور اپنے لئے اُسی کی مدد سے راہِ عمل معین کرسکتے ہیں تو ہم ایسا نہ کریں اور اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہم یقیناً اُس اہم مقصد کو نقصان پہنچا رہے ہیں جس کے لیے امام حسینؑ نے اتنی بڑی قربانی پیش کی تھی۔

ساری دُنیا پکارتی ہے حسینؑ

(انتقام الحسنین منتقمؔ سنبھلی ایم۔ اے ایل ایل بی وکیل بریلی)

تیرے غم کی وہ روشنی ہے حسینؑ
زندگی جگمگا رہی ہے حسینؑ

تیرے نقشِ قدم کے بوسے کو
ساری دنیا جھکی ہوئی ہے حسینؑ

موجِ غم موجِ درد ہے جو نظر
وہ نظر تجھکو ڈھونڈھتی ہے حسینؑ

یاد میں کربلا کے پیاسوں کی
روحِ دریا تڑپ رہی ہے حسینؑ

کہتے ہیں اشک رونے والوں کے
ابھی زخموں میں تازگی ہے حسینؑ

ہائے وہ تیرا آخری سجدہ
اُسی سجدے کی روشنی ہے حسینؑ

ہر زمانے میں ہیں یزید مگر
تیری ہر دَور میں کمی ہے حسینؑ

آج ماتم کی ہر صدا میں تجھے
ساری دُنیا پُکارتی ہے حسینؑ

قلبِ مضطر میں چشمِ انساں میں
تیرے ہی غم کی روشنی ہے حسینؑ

حلقِ اصغرؑ میں تیر ہے پیوست
کربلا خوں اُگل رہی ہے حسینؑ

اب ترائی ہے اور ہیں عباسؑ
شیر کو نیند آگئی ہے حسینؑ

تیرے ماتم سے جوشِ ماتم سے
نظمِ ہستی میں برہمی ہے حسینؑ

کربلا میں چراغ جلتے ہیں
اور کعبہ میں روشنی ہے حسینؑ

اشک ہیں منتقمؔ کی آنکھوں میں
پھر تری یاد آرہی ہے حسینؑ

"حسینؑ کی عظمت"

جناب سید کلب مصطفیٰ صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ

انسان کی عظمت دراصل اس کی نسلی حیثیت اور انتی خصوصیت تعلیم و تربیت، ماحول و معاشرت اور قول و عمل کے امتزاج کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان عناصر میں سے ہر ایک کسی نہ کسی حد تک انسان کی عظمت کے درجات معین کرنے اور اس کی بلندیوں کو بڑھانے یا گھٹانے کا سبب ہوتا ہے۔ مگر جب تک اور عناصر بھی موجود نہ ہوں صرف ایک ہی عنصر معیار فضیلت انسانی نہیں بن سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک پڑھا لکھا شخص برا اور ایک جاہل اچھا ہو اور یہ بھی لازم نہیں کہ اچھے والدین کی اولاد بھی اچھی ہو یا برے ماں باپ کے بچے برے ہی ہوں۔ اسی طرح بعض طینتیں تربیت کا اچھا اثر لیتی ہیں اور بعض اُلٹا البتہ قول و عمل انسانوں کی عزت کو بڑھانے یا گھٹانے کے لیے موثر آلات ہیں۔ انسان اپنے اقوال و اعمال سے تعلیم و تربیت اور وراثتی آئینے پر جلا بھی کر سکتا ہے اور اُس کو دھندلا بھی۔ نیک پیدا ہو کر برا بن سکتا ہے اور بُروں کی آغوش میں پرورش پا کر اپنے گفتار و کردار کی بدولت اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جس میں جوہر ذاتی بھی ہو اور وصف اضافی بھی۔ تعلیم بھی بے نظیر ہو اور تربیت بھی تو پھر وہ ہیرا ہی نکلے گا۔ اور حسینؑ ایسے ہی تھے۔

عرب کے بہترین اور معزز ترین خاندان میں ہجرت کے چوتھے سال تیسری شعبان پنجشنبہ کے دن آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ رسولِ خدا محمد مصطفیٰؐ کی باعزت بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ اور محافظ اسلام حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے صاحبزادے تھے۔ نانا وہ جس نے انسانیت کو پیغام اسلام سُنا کر زنگ آلودہ دماغوں کی جلا کی اور لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلند کر کے مصنوعی خداؤں کی تکذیب صریح کر دی جس نے عزم و استقلال اور صبر و رضا کی مشکل منزلوں کو آسانی سے طے کیا اور جس نے قابو پا کر بھی دشمن پر سختی نہ کی، جو مجسمۂ اخلاق، پیکر حلم و مروت، عین حق اور مظہر رحم و انصاف تھا۔ دادا وہ جس نے پیغمبر اسلام کی حفاظت کے مقابلے میں اپنی اولاد کی جانوں تک کی پروا نہ کی اور جس نے رہتی دنیا تک حق گوئی، حق دوستی اور یتیم پروری کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا۔

ماں وہ جس کی تعظیم خود رسول خداؐ کرتے تھے اور جس کے اعمال و کردار عورتوں کے لیے معاشرت یا تدبیر منزل کے منارے بنے ہوئے ہیں۔ حسینؑ کی ماں اس خاتون کی لخت جگر تھیں جس نے شجر اسلام کی آبیاری اور نشو و نما میں کسی دوسرے سے کم حصہ نہیں لیا اور جو اُس وقت رسالت کی گواہ بنی جب دنیا رسولؐ کو جھٹلا رہی تھی۔

باپ وہ جس کی تلوار کا احسان اسلام کی گردن پر ہے جس نے اسلامی غزوات میں سے دو ایک کے علاوہ سب ہی میں شرکت کی اور سب ہی کو سر کیا۔ جس نے راہ حق میں جاں فروشی و جاں سپاری کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ جس نے خود رسول اسلام کی آغوش میں تربیت پائی تھی اور جو نہ صرف شجاع بلکہ رسولؐ کے بعد اعلیٰ ترین ادیب، حکیم، فلسفی اور مدبر تھا۔

ایسے ماحول، ایسے خاندان اور ایسے نانا اور ماں باپ کے گھر پیدا ہونا ہی حسینؑ کی بلندیٔ عظمت کے لیے کافی تھا چہ جائیکہ سینتیس سال تک یکے بعد دیگرے جو آغوش تربیت بھی ملی اُسے نورٌ علیٰ نور ہی کہہ سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ مدت علیؑ جیسے یگانۂ روزگار اور مظہر پروردگار کے زیر تربیت گزری اور تربیت بھی کیسی، جنگ کی بھی اور صلح کی بھی۔ فاقہ کشی کی بھی اور حق کوشی کی بھی ——— عالم کا پھریرا بھی کھلتے دیکھا اور گلے میں رسیاں بندھتے بھی۔ ماں کو نانا کی وفات کے بعد ایذا پہونچتے بھی دیکھا اور باپ کے ساتھ ناقابل برداشت بدسلوکی بھی۔ علمی مسائل کی گتھیوں کو سلجھتے ہوئے بھی دیکھا اور اسلامی مسائل کو علیؑ کی مدد کے بغیر اُلجھتے ہوئے بھی۔ یہاں تک کہ سنہ ۴۰ھ میں باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ تو خلافت کو سلطنت بنتے، بھائی کو مصالحت کرتے، لگن میں بھائی کے جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرتے اور انجام کار بھائی کے جنازے پر تیر برستے بھی دیکھے اور ایسے عالم میں دیکھے کہ شجاعت اور تیغ بازی کا عروج تھا۔ لیکن بھائی کی صلح جو سرشت کے لحاظ اور شر و فساد سے بچاؤ کے خیال سے باوصف امکان مدافعت تک نہ فرمائی اور بھائی کے جنازے کے رُخ کو دفن

رسولؐ سے جنت البقیع کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح بھائی کی شہادت کے وقت یعنی تقریباً چھیالیس سینتالیس برس تک حسینؑ نے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لئے تھے اور جنگ صفینؑ جمل اور صلح حسنؑ سے بڑے بڑے سبق لے چکے تھے۔ اس کے بعد دس برس کی طویل مدت تک محض عبادت و ریاضت میں بسر کرنا اور ایسے قنوت[۵] اور اشعار[۲] کا ورد رکھنا

جن سے انتہائے عبودیت کا پتہ چلتا ہو بجائے خود عظمت حسینؑ کی روشن دلیلیں ہیں۔ اگر حسینؑ کا صرف یہی عمل ہم تک پہونچتا تو واقعی ہم اس کو ایک مہتم بالشان کارنامہ سمجھتے۔ مگر حسینؑ نے تو کردار کا وہ مظاہرہ کیا کہ اس کے سامنے سارے مظاہرے ماند پڑ گئے۔ حسینؑ نے اپنی سیرت کو ایثار و قربانی کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ ان کی سیرت میں دلوں میں لرزہ ڈال دینے والا فداکاری و سرفروشی کا جذبہ اس قدر نمایاں طور پر مہیا ہو گیا تھا کہ اس کے مقابلے میں دنیوی حکومت اور اقتدار سب ہیچ نظر آتے تھے۔ ان کی زندگی عبدیت خالص کی مکمل تفسیر تھی۔ اور غیر خدا کا کوئی دور کا بھی تصور اُن کے ذہن و خیال میں نظر نہیں آتا۔

خدا کی طرف ان کے اس قدر مکمل کھچاؤ' دل و دماغ کا انتہائی جھکاؤ' تسلیم و رضا سے محیر العقول لگاؤ' ماسوا المعبود سے کامل بے نیازی کے مشاہدے کے بعد بارگاہ حسن میں امکان کہاں تھا کہ کوئی دوسرا مدعی عشق باریاب ہو خواہ وہ کیسا ہی صاحب جبروت اور کتنی ہی قوت و طاقت کا مالک کیوں نہ ہو۔

خدا کی ربوبیت کے اس شدید احساس کے بعد ایسا بلند کردار اور صلح پسند انسان اپنی حق تلفی کو برداشت کر سکتا ہے۔ ایک غاصب بادشاہ کی انفرادی بے راہ روی' اس کی غیر اسلامی اور اس کی حرام کاری سے غمض بصر کر سکتا ہو لیکن نہیں کر سکتا تو یہ کہ انسان کو انسان کا رب مانے اور انسان پر کسی انسان کی خدائی کے قیام پر راضی ہو جائے۔

صورت حال زبان و ضمیر کی آزادی کے اس فطری بنیادی حق کے لیے پیام اجل ہو جس کے بغیر انسان انسان نہیں رہ جاتا۔ کار خداوندی کی انجام دہی کے لیے جس علم کی ضرورت ہو اور جو بے غرضی' بے لوثی اور بے نیازی درکار ہے وہ عام انسانوں میں کہاں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے

سلہ (۱) "خداوندا! اگر تیرے سوا کوئی کسی کی پناہ لیتا ہو تو ے میری جائے پناہ تو ہو اور صرف تو۔ کوئی شخص دوسرے کا سہارا اختیار کرتا ہو تو کرے' میرا سہارا تو تیری ذات ہو اور صرف تیری ذات۔ امتحان و ابتلا میں کسی فتنے سے دوچار ہونے یا گروہ شیاطین کی دراندازی سے تو میری حفاظت کر۔ یہاں تک کہ تو مجھے اپنی طرف بلائے اس طرح کہ نہ میرے دل میں نہ فاسد خیالات ہوں نہ ابنائے زمانہ میری نسبت برے خیالات قائم کریں۔ نہ میں دوسروں کی طرف سے شک میں رہوں نہ میری طرف سے دوسروں کو شک ہو"

(۲) "تو جو فیصلہ میرے بارے میں کر چکا ہے میں اس پر راضی ہوں جس راستے پر تو مجھے چلاتا ہے میں تو اسی پر چلتا ہوں۔ تو نے میرے دل میں جس چیز کا قصد وارد کیا ہے میں اسی کا قصد رکھتا ہوں۔ میں اُن باتوں میں جو تیری رضامندی کا باعث ہوں قطعاً بھی کوتاہی نہیں کرتا اور نہ اپنی جد و جہد میں تیرے احکام کی تعمیل میں کوئی کمی کرنا چاہتا ہوں' جو راستہ تو نے مجھے بتا دیا ہے اسی پر تیزی سے چلتا ہوں جو مقصد تو نے مجھ پر واضح کر دیا ہے اُس کو برابر نظر میں رکھتا ہوں جن ذمہ داریوں کو تو نے میرے سپرد کر دیا ہے میں ان سے عہدہ برآ ہونے کی مسلسل کوشش کرتا ہوں۔ اب تو اپنی نگہبانی سے مجھ کو الگ نہ کر اور اپنی توجہ کے دائرے سے باہر نکال اور مجھے در ماندہ و عاجز نہ ہونے دے اور اُس مقصد سے مجھے علیحدہ نہ کر جس کے واسطے میں تیری مشیت پوری کرنا چاہتا ہوں۔ میری رفتار کو بصیرت کا تابع رکھ اور میرے مسلک کو اپنے منشاء کے مطابق بنا' میرے راستے کو صحیح منزل کی طرف موڑ۔ یہاں تک کہ مجھے میری آرزو اور اس محل تک پہونچا دے جس کا تو نے میرے لیے ارادہ کیا ہے اور مجھے اس مقام پر اُتار دے جس کے لیے تو نے مجھے خلق کیا ہے اور جس کی طرف تو نے میرا رُخ موڑا ہے۔" (از منہج الدعوات سید ابن طاؤسؒ مطبوعہ بمبئی)

سلہ ۲۔ اشعار "خدا سے لو لگا اور مخلوق سے بے نیاز ہو جا اس کے بعد تجھے کسی جھوٹے سچے کی پرواہ نہ ہو گی۔ مانگنا ہو تو خدا ہی سے مانگ۔ خدا کے سوا کوئی رازق دینے والا نہیں۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ بندے اُسے غنی کر دیں گے وہ در حقیقت خدا پر اعتماد نہیں رکھتا اور جو یہ سمجھتا ہے کہ لوگ اس کے لیے کافی ہیں وہ یقیناً پستی میں گرنے والا ہے۔ ——— جب زمانے کے دانت تمھیں کاٹیں اور ۴

۴ زمانہ تمھیں حوادث کا نشانہ بنائے تو (کفالت) مخلوق کی طرف کبھی نہ جھکو اور اُس خدا کے علاوہ جو رزق بانٹنے والا ہے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرو کیونکہ اگر تم مشرق سے مغرب تک کا چکر لگاؤ گے تب بھی تم کو کوئی شخص ایسا نہ ملے گا جو مقدر کو بنا یا بگاڑ سکتا ہو؟

نوٹ:۔ یہ حاشیہ کچھ تغیر الفاظ کے ساتھ سید اختر علی صاحب تلہری کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جو سرفراز (۱۳۷۰ھ) میں شایع ہوا تھا۔

انسانوں کے خدا بننے کا لازمی نتیجہ مطلق العنانی اور ظلم کا دور دورہ ہوتا ہے۔ وہ تو خدا بننے کا شوق ہی مطلق العنانی کے جذبے سے پیدا ہوتا ہے تو اب ظاہر ہے کہ انسانی مطلق العنان کی خدائی میں ضعیف کو کس مپرسی اور بے موت مرنے کے سوا اور کیا میسر ہو سکتا ہے۔

اس میں نہ تو بے لوثی ہوتی ہے نہ بے غرضی، نہ بے نیازی ہوتی ہے نہ صدق آگینی بلکہ کسی نہ کسی عنوان سے ظلم و عدوان، بے اعتدالی، بے راہ روی، غلط نگاہی، ناہمواری، ناحق اندیشی، مصلحت بینی، قابو پرستی اور نہ معلوم اور کتنی انسانی کمزوریاں عجیب عجیب عنوان سے دیکھنے میں آتی ہیں۔ نتیجہ میں انسانی جسم اعمال و کردار کے اعتبار سے نفس امارہ کا ایک غلام محض بن کر رہ جاتا ہے اور انسانی روح اپنی فطری آزادی اور ازلی حقوق سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ دنیوی اعتبار سے بھی انسان نفس پرستیوں اور خود غرضیوں کے شکنجے میں دب کر کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آجکل جو یہ جنگ کی ہماہمی ہر طرف نظر آتی ہے وہ کسی اور بات کا نہیں اسی غلط نظری کا نتیجہ ہے۔

ایسی نازک صورت حال سے انسانوں کو بچانے اور اس کو قعر مذلت میں گر جانے سے محفوظ رکھنے کا ایک ہی علاج ہو سکتا تھا کہ کوئی مرد میدان کلمۂ لا الہ کو از سر نو زندہ کر دے اس میں ایک لازوال قوت بھر دے۔ اور انسانوں کو اس غلامی کی جکڑ بند سے آزاد کر دے۔ ایسا مرد میدان بس حسینؑ ہی تھا جو اس یزیدی ذہنیت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے خدا کا نام لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

حسینؑ کو ولید حاکم کا پیغام ملاقات ملا۔

اس نے معاویہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ آپ نے کلمۂ انا للہ جاری فرمایا۔ ولید نے پھر یزید کی بیعت کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا "تم یہ تو پسند نہ کرو گے کہ مجھ سے چپ چاپ اور پوشیدہ طور سے بیعت لو۔ جب اور اہل مدینہ کو اس غرض سے بلوانا مجھے بھی اطلاع کر دینا۔" اس پیغام کے بعد زیادہ سوچنے یا غور کرنے کا موقع نہ تھا۔ حسینؑ کے لیے یہ وقت بہت سخت تھا کہ انکار بیعت کو کس طرح ناقابل انکار کامیابی کے ساتھ بروئے کار لائیں — غلبہ کا مقابلہ غلبہ سے کیا جائے ظلم کا سر ظلم سے کچلا جائے یا قوت کا مقابلہ استقامت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومی سے کیا جائے۔ یہ ممکن تھا کہ جماعتیں فراہم کی جائیں، مددگار اکٹھا کیے جاتے، عزیمے

گوشے گوشے میں یزید کی بد اعمالی و بد کرداری کو طشت از بام کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کی مخالفت پر آمادہ کیا جاتا اور آخر کار یزید کو شکست دے کر مسند خلافت قبضے میں کر لی جاتی لیکن یہ تو غلبے کو غلبے ہی سے ختم کرنا ہوتا جو دور و تسلسل کا مرادف بھی ہوتا اور جو اہل زمانہ کے شیوۂ فرسودہ کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اور اس طور پر ممکن تھا کہ یہ عارضی کامیابی ابدی ناکامی کا پیش خیمہ بن جاتی لہذا حسینؑ نے ایک دوسرا راستہ ہی اختیار کیا۔ مادی ہتھیاروں کے بجائے روحانی حربوں کو جمع کیا۔ ظلم کا مقابلہ مظلومی سے کرنا طے کیا قوت جماعت کے مقابلے کے لیے استقامت و بے کسی کو بہیمیت کے مقابلے کے لیے انسانیت کو اور شیطنت کے مقابلے کے لیے حقانیت کو اپنا رفیق کار بنایا اور اس راہ حق میں قدم قدم پر جو گوناگوں مزاحم در پیش تھے اُن میں سے کوئی ایک بھی حسینؑ کو اُن کے ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ کوئی دہشت انھیں روک نہ سکی اور کوئی قوت انھیں اس صراط مستقیم سے ہٹا نہ سکی۔

سر داد نہ داد دست در دست یزید

یہ تھی حسینؑ کی حقیقی عظمت جس نے اُن کو بڑوں بڑوں میں بھی ممتاز اور ابتدائے عالم سے قیام قیامت تک سرفراز کر دیا۔

خون شہیداں

شاعر سُنی جناب معراج صاحب قدیری شارقی دارثی لکھنوی

حسنینؑ ہیں بہار خیابان اہلبیت
یہ دونوں گل ہیں جان گلستان اہلبیت

قرآن آج بھی ہے ثناخوان اہلبیت
اللہ رے طہارت دامان اہلبیت

فردوس میں رہیں گے محبان اہلبیت
جنت ہے زیر سایۂ دامان اہلبیت

دنیا کا ذکر کیا ہے قیامت میں دیکھنا
لائے گا رنگ خون شہیدان اہلبیت

قلب و نظر پہ جن کے ہیں پردے پڑے ہوئے
سمجھینگے کیا وہ منزلت و شان اہلبیت

یہ تو ہے اپنی اپنی نظر ورنہ آج بھی
جلوہ فگن ہے نیر تابان اہلبیت

اے دل نجات اسی میں ہے قرآں کی ساتھ ساتھ
ہاتھوں سے چھٹنے پائے نہ دامان اہلبیت

یارب اسے بھی کچھ ملے صدقہ حسینؑ کا
معراج ہے غلام غلامان اہلبیت

ہر اک زباں پہ عباسؑ نام تیرا

جناب تکمیل صاحب رضوی لکھنوی

جہاں میں ذکرِ وفا صبح و شام ہے تیرا
وفا شعاروں میں عباسؑ نام ہے تیرا

ہر ایک موج کی بے چینیاں بتاتی ہیں
دل فرات میں مولا قیام ہے تیرا

جہاں نگاہِ ملک فرش راہ بنتی ہے
وہی تو روضۂ جنت مقام ہے تیرا

علیؑ کے بعد تو مشکل کشائے عالم ہے
ہر اک زبان پہ عباسؑ نام ہے تیرا

تمہی تو ہے گل عباسی ریاض علیؑ
شمیم دیں سے معطر مشام ہے تیرا

علیؑ ہیں قوتِ بازوئے احمدؐ مختار
تو زور بازوئے شبیرؑ نام ہے تیرا

حسینؑ جانِ برادر کہا کرے تجکو
تھا تیرا قول کہ بندہ غلام ہے تیرا

لکھی ہے مدحت عباسؑ تو نے اے تکمیل
وفا کے رنگ میں ڈوبا کلام ہے تیرا

جلد (۳۳) یکم اگست ۱۹۵۶ء مطابق ۲۴ر ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ نمبر (۱)

یہ بنی اُمیہ کے پرستار

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کو کفر نے اتنا نقصان نہیں پہونچایا جتنا نقصان نفاق نے پہونچایا ہے۔ جب کفر کھلم کھلا اسلام کا مقابلہ کرنے سے عاجز آگیا اور اسے اپنی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے ایک اور داؤں چلا اور دکھاوے کے لیے اس نے اسلام کا لبادہ اپنے اوپر ڈال لیا تاکہ وہ منافقانہ مسلم بن کر بے خبری میں اسلام کی رگ حیات پر وار کر سکے۔ یہ پیچ اتنی مضبوطی سے گانٹھا گیا تھا کہ اسلام اس سے بچ نہ سکا اور اسے ایسا نقصان پہونچا جس کی تلافی نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ شاید کبھی ہو سکے۔ اسلامی تاریخ کا صفحہ صفحہ گواہی دے رہا ہے کہ بنی امیہ حالت کفر میں رہتے ہوئے بھی اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کرتے رہے اور اسلام لانے کے بعد وہ منافقین کے سرگروہ بن گئے۔ دراصل انھوں نے اسلام قبول ہی اس لیے کیا تھا کہ وہ جو نقصان اسلام کو کفر کی حالت میں پہنچانے سے قاصر رہے تھے وہ اسلام میں چور دروازے سے گھس کر پہنچا دیں۔ یوں تو رسولؐ کے گرد و پیش شروع ہی سے منافقین جمع تھے لیکن ان مولفۃ القلوب کے اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان کی قوت میں حیرت انگیز اضافہ ہوگیا۔ وہ رسولؐ کی زندگی میں بھی رسولؐ کو اذیتیں پہونچاتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد اور ان کی تعلیمات دونوں کو نقصان پہونچانے کی مسلسل گوناگوں کوششیں کرتے رہے۔ اہل بیت رسالت جن پر بعد جناب سرور کائناتؐ اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ منافقوں کی جارحانہ اور اسلام کش سرگرمیوں کا برابر مقابلہ کرتے رہے اور ان کی چالوں اور جوڑ توڑ کو بے اثر بناتے رہے۔ ان مقدس نفوس نے ان "بغلی گھونسوں" کا مقابلہ کرنے میں اپنی جانوں تک کی بازی لگا دی اور کسی بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ رسولؐ کے زمانہ میں نفاق کی چنگاریاں راکھ کے اندر دبی رہیں۔ لیکن جیسے ہی رسولؐ مرض الموت میں مبتلا ہوئے یہ چنگاریاں روشن و فروزاں ہونا شروع ہو گئیں رسولؐ کی آنکھ کا بند ہونا تھا کہ نفاق پھلنے پھولنے لگا۔ اور منافقین طائفہ دزداں بر قلعہ کوہے نشستہ بودند کے مصداق بندر بانٹ میں لگ گئے۔ شام کا صوبہ پہلے یزید بن ابوسفیان اور اس کے انتقال کے بعد معاویہ ابن ابوسفیان کے قبضہ میں آیا اور اس طرح منافقین کو پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے لیے ایک گڑھ ہاتھ آگیا۔ نفاق کی چنگاریاں بھڑکتی رہیں اور بھڑک کر میدان کربلا میں انھوں نے آتش فروزاں کی شکل اختیار کر لی۔

آپ اگر صرف اسی محرم نمبر کا مطالعہ کریں۔ تو آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ منافقین جن کی سرگرمیاں رسولؐ کے زمانہ سے شروع ہو گئی تھیں۔ ۶۱ھ میں اپنے شباب کو پہونچ چکی تھیں اور انھوں نے خاندان رسالت اور تعلیمات رسولؐ کے ساتھ ایسا معاندانہ برتاؤ کیا کہ اگر رسولؐ ان کے ساتھ اس ناروا سلوک کرنے کی اپنی امت کو وصیت بھی کر جاتے تو بھی وہ اس سے زیادہ نہ اہل بیتؑ کے ساتھ ظلم کر سکتے تھے اور نہ تعلیمات اسلامی کو اس سے زیادہ مسخ کر سکتے تھے۔

یہ اسلام اور نفاق کی جنگ تیرہ سو برس سے آج تک جاری ہے اور بنی امیہ کے پرستار اب بھی برابر اسلام کو نقصان پہونچانے کے درپے بنے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اسلام کو مضمحل کرنے کی موثر تدبیر یہ اختیار کی ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو رسولؐ کے اہلبیتؑ کو گرانے کی کوشش کریں۔ جب تک یہ ذوات مقدسہ موجود رہیں ان کو ستایا، ان پر مظالم توڑے۔ ان کی علمی منزلت کو گھٹایا، ان کے مقابلے میں کم سواد لوگوں کو مفتی کی حیثیت سے کھڑا کیا اور یہ حکم دیا کہ ہمارے مفتی سے مسئلہ دریافت کروگے تو اتنے درہم انعام پاؤ گے اور راسخون فی العلم میں سے کسی بزرگ شخصیت سے استفتا کروگے تو اتنے درہم جرمانہ دینا پڑے گا۔ آج دنیا میں وہ مقدس ہستیاں موجود نہیں ہیں پھر بھی ان پر مظالم کا سلسلہ یہ بنی امیہ جاری

رکھے ہوئے ہیں اس کی مثالیں یوں تو آئے دن ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن آج کل پاکستان بنی امیہ والوں اور یزید کی نسل کی ترک تازیوں کا خاص طور پر میدان بنا ہوا ہے۔ بابائے خلافت کے رسالہ "اردو" میں کتاب "الحسینؑ" پر تبصرہ کرتے ہوئے جن گستاخیوں اور دریدہ دہنیوں سے کام لیا گیا ہے ان کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ اگرچہ کہنے کو بنی عباس نے بنی امیہ کا کلی استیصال کر دیا، ان کی قبروں تک کو کھدوا کر ہڈیاں نکال پھینکیں اور بظاہر اس "شجر ملعونہ" کے برگ و بار یا اس کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی شاخ بھی اب دنیا میں باقی نہیں ہے اور اگر ہوگی بھی تو وہ اپنی رسوائی اور تاریخی بد اعمالیوں کی بنا پر اس نسل سے اپنے انتساب کو شرمناک خیال کرتے ہیں۔ ان کے زبان سے ظاہر نہ کرنے کے باوجود بھی ان کے اعمال و افعال اور خاندان رسالتؐ سے ان کی دشمنی و مخاصمت اس کا اعلان کر دیتی ہے کہ وہ اسی قوم و قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی بالائی پشتوں میں ہندہ جگر خوارہ، ام جمیل، سمیہ اور قطامہ جیسی بدکردار اور عصمت فروش عورتیں گزری ہیں۔ اس نسل کے بہت سے افراد آج کل پاکستان میں مجتمع ہو گئے ہیں اور ذرا سی آزادی مل جانے کے بعد انھوں نے خاندان رسالتمآبؐ کے خلاف گستاخیاں اور دریدہ دہنیاں کرنا اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دے رکھا ہے۔

رسالہ اردو کراچی کے رسوائے عالم تبصرے کے بعد اب ایسی ہی دوسری چیزیں سامنے آ رہی ہیں۔ چنانچہ اخبار "رضاکار" نے ایک پاکستانی ملا خالد محمود کی ان تقریروں پر بڑا مضبوط اور زبردست احتجاج کیا ہے جو اس نے کرشن نگر لاہور میں منعقد ہونے والے پاکستانی ملاؤں کے عظیم الشان جلسوں میں کی تھیں۔ ہم ان میں سے بعض اقتباسات نقل کفر کفر نباشد کے مصداق محض اس غرض سے نقل کر رہے ہیں تاکہ قارئین کرام پاکستان کے وہابیوں، ناصبیوں، اور خارجیوں کی ذہنیت کا اندازہ کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ان لوگوں کو ذرا سی اکثریت حاصل ہو جانے اور کھلی فضا میں سانس لینے کا جو موقع مل گیا ہے اس کی بنا پر یہ کیسے گل کھلا رہے ہیں۔ اور کتنی بدتمیزیوں پر اتر آئے ہیں۔

خود ملا خالد محمود کہتا ہے۔

"جناب فاطمہ زہراؑ نور نظر لخت جگر رسولؐ نہایت حسین و جمیل تھیں رسول اللہ نے ان کی شادی علیؑ سے کر دی مگر ان کے آپس میں ہمیشہ نزاع رہا۔ اگر دس دن علیؑ کے گھر رہیں تو بیس دن اپنے باپ کے یہاں۔ باپ سے اکثر فریادی ہوتی تھیں کہ ابا جان آپ نے میری کس سے شادی کر دی۔ اس کے یہاں نہ کھانے کو ہے نہ پہننے کو۔ اس کا رنگ کالا، قد پست بال سخت، انگلیاں موٹی، پیٹ نکلا ہوا۔ منہ سے پیاز کی بو آتی ہے۔"

اس بدبخت ناصبی نے علیؑ دشمنی میں جو تیر چلایا ہے اس سے بظاہر تو حضرت علیؑ ہی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے مگر لپیٹ میں جناب فاطمہ زہراؑ اور رسول خدا صلعم کو بھی لے لیا ہے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ رسولؐ کوئی بڑے دولت مند شخص تھے۔ جن کے یہاں بیویوں اور بیٹی کو کھانے پینے پہننے اوڑھنے کا بڑا آرام رہتا تھا۔ مگر علیؑ مفلس تھے اور ان کے یہاں ہمیشہ فاقے ہوا کرتے تھے۔ اور معاذ اللہ رسولؐ کی یہ غلطی تھی کہ انھوں نے علیؑ جیسے نادار شخص کے ساتھ جناب سیدہ کی شادی کر دی۔ خالد محمود نے اسی طرح علیؑ ہی کی نہیں بلکہ رسولؐ اور دختر رسولؐ کی بھی توہین کی ہے۔

خالد محمود بھی ابو سفیان کا ویسا ہی بیٹا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ زیاد تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے آگے چل کر یہ کہنے کی ہرگز جرأت نہ ہوتی کہ جب تک باپ (رسولؐ) زندہ رہا علیؑ خاموش رہے اور گھٹتے رہے مگر باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی علیؑ نے (فاطمہؑ کو) اتنا ستایا کہ وہ صرف ۶۳ یا ۷۵ دن یا بروایتے چھ مہینے زندہ رہ سکیں۔ ایک رات کو علیؑ نے فاطمہ کا گلا گھونٹ دیا اور رات کی تاریکی میں ہی دفن کر دیا۔"

علمی اور تاریخی اعتراضات کے جوابات تو دینا آسان ہے لیکن بدتمیزیوں کا جواب کیا دیا جائے۔ جس طرح شاہان بنی امیہ شراب کے نشہ میں اول فول بکا کرتے تھے۔ اور صبح کی نماز دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح خالد محمود بھی نشہ کی ترنگ میں خدا معلوم کیا کیا بک رہا ہے۔

یہ ملعون ایک جگہ کہتا ہے کہ علیؑ تو سگ اصحاب کہف سے بھی گئے گزرے اصحاب کہف کا کتا غار کے منہ پر بیٹھ کر حفاظت تو کرتا رہا مگر رسولؐ کا یہ کتا تو شب ہجرت آرام سے سوتا رہا۔"

یہ بکواس یہیں پہ ختم نہیں ہو جاتی آگے چل کر کہتا ہے کہ

"شب معراج رسولؐ نے دوزخ میں چند عورتوں کو عذاب میں مبتلا دیکھا۔ کچھ فرشتے خاردار آتشیں سلاخیں ....

حالت یہ تھی کہ ان سلاخوں کی آگ ان کے منھ سے باہر نکل رہی تھی۔ رسولؐ کے پوچھنے پر جبریل نے بتایا کہ یہ عورتیں وہ ہیں جو زندگی میں ماتم کیا کرتی تھیں، آہ و بکا کرتی تھیں۔"

ملاحظہ کئے آپ نے تہذیب و شرافت کے نمونے۔ کیا اس میں اب بھی شبہ ہے کہ دنیا ہندۂ جگر خوارہ کی اولاد سے خالی ہے۔ یہ تو وہ بدتمیزیاں ہیں۔ جنھیں شیعہ تو شیعہ خوش عقیدہ اہل سنت حنفی اور صوفیہ حضرات بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

ہمیں تعجب ہے کہ پاکستان کے سُنّی حنفی اور صوفیہ کی اسلامی غیرت و حمیت کہاں چلی گئی ہے کہ وہ رسولؐ، علیؑ اور فاطمہ زہراؑ کی شان میں ایسی گستاخیوں کو برداشت کئے ہوئے ہیں۔ آخر علیؑ اور فاطمہؑ تنہا شیعوں ہی کے تو نہیں ہیں۔ سنیوں کے بھی تو وہ مذہبی پیشوا ہیں۔ انھیں بھی تو ان مقدس ہستیوں سے عقیدت ہے۔ ان کے اسوۂ حسنہ پر چلنا وہ اپنے لیے بھی باعث سعادت دارین سمجھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستانی اہل سنت حضرات ان بدتمیزیوں اور دریدہ دہنیوں پر احتجاج کیوں نہیں کر رہے ہیں۔

پاکستان کے اہل سُنّت سے زیادہ ہمیں پاکستان کی حکومت کے طرزِ عمل پر حیرت اور افسوس ہے کہ اس نے اپنے یہاں کے وہابی ملاؤں کو اتنی آزادی کیوں دے رکھی ہے اور وہ ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کیوں نہیں کرتی۔ ذرا سے سیاسی اختلاف کی بنا پر تو خان عبدالغفار خان اور خان عبدالصمد خان جیسے ہر دلعزیز لیڈر گرفتار کر لیے جاتے ہیں مگر پاکستان میں مذہبی منافرت پھیلانے والے مولویوں کو بالکل ہی چھوٹ دے رکھی گئی ہے۔ ایسی اسلامی سلطنت سے تو ہمارا ہندستان ہی اچھا ہے کہ جہاں اگر کوئی ایسی بدتمیزی کرتا ہے تو خود بدتمیزی کرنے والے کے فرقہ سے تعلق رکھنے والے افراد ہی اس پر لعن و طعن شروع کر دیتے ہیں۔ اور حکومت کی مشنری بھی فوراً ہی حرکت میں آ جاتی ہے۔ مگر پاکستان کی حکومت نظریۂ پاکستان کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کرنے والوں سے بھی کوئی باز پرس نہیں کرتی۔ اور وہ "صمٌّ بکمٌ" بنی تماشا دیکھ رہی ہے۔

پاکستان کے شیعہ حنفی اور صوفی فرقوں کو چاہیئے کہ وہ اس تعصبیت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں اور یہ انسان نما شیطان اور مسلمان نما ملحد مذہب اسلام کو جس طرح نقصان پہونچانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کو کامیاب نہ ہونے دیں۔

مسکن و مدفن میرانیسؔ

ادبی حلقوں میں یہ خبر بڑی مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ حکومت ہند نے میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہ کے مکان مسکونہ اور مزار کو اپنی نگرانی میں لے لیا ہے اور یہ دونوں جگہیں قومی ملکیت قرار پا گئی ہیں۔ شکر ہے کہ اس طرح یہ دو تاریخی مقام محفوظ ہو گئے۔ اب مرحوم کی قبر پر مقبرہ بھی بن جائے گا اور ان کے مکان مسکونہ میں ان کی کوئی یادگار از قسم لائبریری وغیرہ بھی قائم ہو جائے گی۔

میر انیسؔ کے مقبرہ کی تعمیر کی ضرورت کو بہت عرصہ سے بری طرح محسوس کیا جا رہا تھا اور اس سلسلے میں برسوں سے سرفراز افراد قوم کو توجہ دلاتا رہا ہے مگر ہمیشہ اس کی یہ آواز صدا بصحرا ہی ثابت ہوئی اور شیعہ قوم نے کبھی اس ضروری اور اہم کام کی طرف توجہ نہیں کی۔ شیعوں کے دامن پر یہ ایک بدنما دھبا تھا جسے وہ برسوں کی چیخ پکار کے بعد بھی نہ چھڑا سکے۔ انیسؔ کے خاندان کے بہت سے افراد پاکستان جا چکے تھے۔ مکان اور باغ جس میں مرحوم کی قبر ہے دونوں کا زیادہ حصہ کسٹوڈین کے قبضہ میں پہونچ گیا تھا اور عنقریب اس کا نیلام ہونے والا تھا مگر عین وقت پر حکومت کی توجہ نے دستگیری کی اور دونوں جگہوں کو اس نے قومی ملکیت قرار دے کر محفوظ کر دیا۔ بہر حال جو کام شیعوں سے اتنے عرصہ میں نہ ہوا وہ ہماری قومی حکومت کے ہاتھوں انجام پا گیا اور اس کے لئے ہم اس کے جتنے بھی شکر گزار ہوں کم ہیں۔

آخر میں ہم حکومت کو اتنی توجہ اور دلائیں گے کہ وہ مرزا دبیرؔ مرحوم کے مزار کو بھی میر انیسؔ کے مزار کی طرح قومی ملکیت قرار دیدے گی اور ان کی قبر پر بھی اسی طرح مقبرہ تعمیر کرا دے گی جس طرح وہ میر انیسؔ کے مزار پر تعمیر کرائے۔ یہ دونوں حضرات ایک ہی دور میں اُردو ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ہیں اور ان کے احسان سے اُردو ادب کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ ہمیں توقع ہے کہ ہماری ادب نواز حکومت اب مرزا دبیرؔ اعلی اللہ مقامہ کی مزار کی طرف بھی توجہ فرمائے گی اور اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گی جو میر انیسؔ کی

بلند شخصیت کو پیش نظر رکھ کر ان کے مزار اور ان کے مکان مسکونہ کے مناسب رو دار رکھا ہے۔

ایک ہندو بزرگ کی حسینیت دوستی

یہ معلوم کر کے قوم کو بڑی مسرت ہوگی کہ شری چندر موہن جناب نگم آئی۔ اے۔ ایس۔ ایڈ منسٹریٹر میونسپل بورڈ و امپرومنٹ ٹرسٹ بنارس نے امامیہ مشن لکھنؤ کو مبلغ ڈھائی سو روپیہ کا گرانقدر عطیہ مرحمت فرمایا ہے تاکہ اس رقم سے واقعہ کربلا سے متعلق لٹریچر چھپایا جا سکے اور حسینیت کی تبلیغ ہو سکے۔

حضرت امام حسینؑ صرف شیعوں یا مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ آپ کی ذات اقدس پر ہر مذہب و ملت والے کا مساوی حیثیت سے حق ہے اور ہر شخص اپنی استعداد اور اپنے ظرف کے بقدر حسینی تعلیمات اور حسینی اسوہ سے مستفید ہوتا ہے۔ یہی ایک واقعہ ہے جس نے بنی نوع انسان کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ غیر مسلموں کو بھی۔ ہندو ہو یا مسلمان سکھ ہو یا عیسائی، بودھ ہو یا پارسی ہر مذہب والا حسینؑ کا عقیدت مند نظر آتا ہے اور ہر ایک اپنے طریقہ پر کسی نہ کسی صورت میں ان کی یاد کو تازہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہر کس بہ زبانے صفت حمد تو گوید
مطرب بہ سرود غم و بلبل بہ ترانہ

شری نگم نے حسینیت کی نشر و اشاعت کے لیے جو گرانقدر عطیہ مرحمت فرمایا ہے وہ کسی شیعہ کے لاکھوں کروڑوں روپیہ کے عطیہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ حسینیت کے پرستار مسٹر نگم کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔ ہم شیعہ جماعت کی طرف سے جناب نگم صاحب کے اس قابل مدح اقدام پر ہدیہ مبارکباد و تشکر پیش کرتے ہیں۔

ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ

ہمارے اتر پردیش کی حکومت کو اُردو سے جتنی دلچسپی اور محبت رہ گئی ہے اس کا اندازہ آجکل ہر اُردو دوست کو پوری طرح ہے اور یہاں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ لیکن اس صریحی اُردو مخالفت کے باوجود ہماری صوبائی حکومت قابل ستائش و مبارکباد ہے کہ اس کا "سوچنا و بھاگ" اُردو کا بھی ایک ماہوار رسالہ "نیا دور" نکال رہا ہے جو طباعت و کتابت، کاغذ اور ترتیب و تہذیب ہی کے اعتبار سے دیدہ زیب نہیں ہے بلکہ معیاری مضامین و منظومات کے اعتبار سے بھی وہ ہندوستان کے بلند پایہ رسائل میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے بھی ایک ماہنامہ "آجکل" نکلتا ہے جو کافی شہرت کا حامل ہے لیکن اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو ہماری یو۔پی گورنمنٹ کا رسالہ "نیا دور" کا معیار "آجکل" سے بھی بہت زیادہ بلند ہے حالانکہ یقیناً ایک صوبائی رسالہ پر اتنا خرچ نہیں کیا جاتا ہوگا جتنا مرکزی حکومت کے ماہنامہ پر لیکن جو لوگ ان دونوں رسائل کا بالالتزام مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ "نیا دور" اور "آجکل" کے معیار اور ان کی افادیت میں کیا فرق ہے۔ اگر محکمہ اطلاعات کے ذمہ دار "نیا دور" کی طرف ذرا اپنی توجہ اور مبذول کر دیں تو یہ جریدہ بہت زیادہ مقبولیت و کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

پھر حکومت کو توجہ کرنے کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ نیا دور حکومت کی ان سرگرمیوں کی برابر رپورٹ شایع کرتا رہتا ہے جو پنج سالہ منصوبوں کے سلسلے میں ہمارے صوبہ کے اندر جاری ہیں۔ اس رسالہ کے ذریعہ اُردو داں طبقہ حکومت کی کارگزاریوں سے پوری طرح باخبر رہتا ہے۔

مگر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ "نیا دور" کا انتظامی شعبہ کچھ ڈھیلا ڈھالا ہے اور وہ اس مفید رسالہ کی طرف اتنی توجہ نہیں کر رہا ہے جتنی توجہ کا وہ مستحق ہے۔

مثلاً نیا دور بہت کم وقت مقررہ پر شایع ہوتا ہے حالانکہ ہر مہینے کی پہلی دوسری تاریخ کو شایع ہو جانا چاہیئے زیادہ سے زیادہ تاخیر ہو تو مہینے کے ہفتہ اول کے ختم ہونے تک شایع ہو جائے۔ اسی طرح غالباً ڈسپیچ میں بھی بے توجہی سے کام لیا جاتا ہے چنانچہ جولائی کا پرچہ ہمیں آج تک نہیں مل سکا ہے حالانکہ معلوم ہوا ہے کہ وہ جولائی کے پہلے ہفتہ ہی میں نکل چکا۔ بعض لوگ جن کو کوئی پرچہ خریدنا ہوتا ہے اور وہ "نیا دور" کے دفتر جاتے ہیں تو انھیں بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گاہک کے ساتھ گاہک کا سا

برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کسی کچہری میں اہلکاروں کے پاس اپنے کسی مقدمہ کے سلسلے میں کسی ضرورت سے گیا ہو۔ اسے نہ معلوم کتنے قرنطینوں سے گزرنا پڑتا ہے اور جواب آنے کے رسالے کے پیسے غریب کو کہاں کہاں دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہو۔ ضرورت ہے کہ رسالہ کی انتظامی مشنری کو فعال بنایا جائے اور ہر ہر کل پرزہ صحیح طور پر کام کرے۔

اتنا بلند پایہ رسالہ مگر اس کی اشاعت بھی زیادہ نہیں معلوم ہوتی حالانکہ حکومت کے پاس ایسے ذرائع اور سہولتیں موجود ہیں کہ نیا دور کے ہزاروں خریدار پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اس کا سرکیولیشن یوپی کے تمام اردو جرائد و رسائل میں سب سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ انفرادی خریداروں کی تعداد بڑھانے کے علاوہ صوبہ بھر کے اسکولوں کالجوں، شہری اور دیہی لائبریریوں میں اسے بھیجا جا سکتا ہے اگر محکمہ تعلیم ہی کو توجہ دلادی جائے تو ہزاروں کی تعداد میں نیا دور اس صوبہ میں کھپ سکتا ہے۔ اس وقت یہ پرچہ خود کفیل بھی ہو جائے گا اور حکومت کو اپنے پاس سے ایک پیسہ بھی اس پر صرف کرنے کی نوبت نہ آئے گی۔

یقین ہے کہ نیا دور کے منتظمین ہماری معروضات پر توجہ فرمائیں گے اور اس رسالہ کو جس میں پنپنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں بے توجہی کر کے ٹھٹھرنے اور مرجھانے نہ دیں گے۔

سید علی ظہیر صاحب جا رہے ہیں

معلوم ہوا ہے کہ ہمارے صوبہ کے وزیر عدل و انصاف سید علی ظہیر صاحب یوپی کابینہ سے مستعفی ہو رہے ہیں اور انھیں سفیر بنا کر انڈونیشیا بھیجا جا رہا ہے۔ اگر ان کے جانشین کا مسئلہ یوپی کے بڑے بڑے نیتاؤں کے درمیان طے ہو گیا تو وہ اگست کے آخر ہی میں رخصت ہو جائیں گے۔

یوپی میں اب تک برابر دو مسلمان وزیر رہے ہیں۔ سید علی ظہیر صاحب کے ہٹ جانے کے بعد رواج اور قاعدہ کے روسے ان کی جگہ پر بھی کسی مسلمان ہی کو ہونا چاہیئے۔ اگر کانگریسی قیادت اس اصول کو باقی رکھنا ضروری سمجھے تو اسے مجالس قانون ساز میں سے کسی ایسے مسلمان ممبر کو چن لینا مشکل نہیں جو سید صاحب کا صحیح معنوں میں جانشین ہو سکتا ہو۔ جنگ آزادی میں ۱۹۴۷ء تک شیعہ برابر کانگریس کے دوش بدوش کام کرتے رہے۔ اگر سید علی ظہیر صاحب نے اس پرخطر دور میں جب کہ مسلم لیگ کا طوفان آیا ہوا تھا لکھنؤ میں خلیق الزماں صاحب کا مقابلہ کیا تو آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے صدر سیٹھ حسین بھائی لال جی نے بمبئی میں مسٹر جناح کا۔ حسین بھائی لال جی صاحب نے تو اپنی جان تک کو خطرہ میں ڈال دیا تھا اس لئے کہ اس زمانہ میں مسٹر جناح کے مقابلہ پر الکشن میں کھڑا ہونا کسی مسلمان کے لیے اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس وقت شیعی حقوق کے قائدین نے یہ مطالبہ بھی پیش کیا تھا کہ حکومت میں ایک شیعہ نمائندہ بھی لیا جائے۔ اس سلسلے میں سردار پٹیل اور رفیع احمد قدوائی کو شیعوں سے پوری پوری ہمدردی تھی اور اسی ہمدردی کا یہ نتیجہ تھا کہ مرکز کی عبوری کابینہ میں سید علی ظہیر صاحب کو شیعہ نمائندہ کی حیثیت سے لیا گیا۔ اس کے بعد وہ ایران و عراق کی سفارت پر بھیج دیئے گئے اور آخر میں یوپی کابینہ میں انھیں شامل کر کے شیعی نمائندگی کو باقی رکھا گیا۔ اگر شیعی نمائندگی اب بھی ضروری ہے تو یوپی کابینہ میں سید علی ظہیر صاحب کے جانشین کو بھی شیعہ ہی ہونا چاہیئے۔ جناب وصی نقوی صاحب ایم ایل اے رائے بریلی اس عہدے کے لئے موزوں ترین شخص ہو سکتے ہیں۔

ہمیں توقع ہے کہ کانگریسی قیادت سید علی ظہیر صاحب کا جانشین چنتے وقت شیعوں کے جذبات و خواہشات کا ضرور خیال رکھے گی۔

سرفراز محرّم نمبر

اس سال محرم نمبر عشرہ محرم شروع ہونے سے آٹھ نو دن پہلے ہی قارئین کرام کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس میں دو حصے ہیں ــــ پہلے حصہ میں سرفراز کے سن تاسیس (یعنی ۱۹۲۵ء) سے اب تک کے محرم نمبروں کے اعلیٰ مضامین و منظومات کا مجموعہ ہے اور حصہ دوم میں اس سال کے تازہ مقالے اور نظموں کا گلدستہ۔ حصہ اول کے انتخاب و ترتیب کا کام بڑا الجھن کا تھا جس کے لیے کافی وقت کی ضرورت تھی مگر کم سے کم وقت میں جو بہتر سے بہتر انتخاب ممکن تھا اس کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انتخاب میں دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے ایک یہ کہ کوئی اچھا مضمون یا نظم چھوٹنے نہ پائے اور دوسرے یہ کہ زیادہ سے زیادہ بلند پایہ اہل قلم شخصیتوں کے نتائج فکر آ جائیں۔ اس کوشش کے باوجود بھی بہت سی شخصیتیں ہی نہیں رہ گئیں بلکہ بہت سے گرانقدر مقالے اور

میں بھی درج نہ ہو سکیں۔ پچیس تیس برس کے محرم نمبروں کے انتخاب کے لیے ہمارے پاس صفحات بہت کم تھے ان کے لیے تو ہزار ڈیڑھ ہزار صفحے ہوتے جب کہیں تمام بہترین مضامین سما سکتے۔

ابھی تازہ مضامین کے لیے بھی ہم اتنے صفحے مخصوص نہ کر سکے جتنے اس سے پہلے ہر سال ہوا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے اچھے مضامین اور نظمیں روک لینا پڑیں اور ان کے لیے جگہ کا نکالنا ممکن نہ ہو سکا جس کا ہمیں افسوس ہے۔ افسوس کے ساتھ شرمندگی بھی ہوتی لیکن اس کا انتظام ہم نے پہلے ہی کر لیا تھا اور ابھی ہم نے سوائے معدودے چند اپنے قلمی معاونین کے اور کسی سے مضمون یا نظمیں طلب نہیں کی تھیں۔

اس نمبر کی تیاری میں ہم کہاں تک کامیاب یا ناکامیاب رہے اس کا فیصلہ قارئین کرام ہی فرما سکتے ہیں۔ بس ہم نے خلوص نیت کے ساتھ دن رات محنت کر کے یہ ہدیہ بارگاہ حسینی میں پیش کر دیا ہے۔ اتنے ضخیم نمبر کا نکالنا تنہا ایڈیٹر اور مینیجر کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کی تکمیل میں سرفراز مینیجنگ بورڈ کے آنریری سکریٹری سے لے کر عملہ کے چھوٹے سے چھوٹے فرد کی امداد و اعانت شامل ہے خصوصاً قومی پریس کے مشین مین سید رضا حسین صاحب اور ان کے اسسٹنٹ عباس حسین و منشی صاحبان کی توجہ اور محنت کو اس میں بڑا دخل ہے جنھوں نے دن رات محنت کر کے نمبر چھاپا ہے اور ہمیں اس قابل بنایا ہے کہ وہ ۲ر اگست کو ٹھیک وقت پر ڈسپیچ ہو جائے۔

اس نمبر کے ڈسپیچ میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ ہر ہر پتہ کو رجسٹر سے ایک مرتبہ نہیں کئی کئی مرتبہ متعدد اشخاص نے مقابلہ کر لیا ہے۔ ڈاکخانہ جانے سے پہلے ہر ہر پرچہ پر نظر ڈال لی گئی ہے۔ ڈاکخانہ میں بھی پوری احتیاط سے پرچہ دیا گیا ہے اور چونکہ سرفراز پوسٹ آفس خود ہماری عمارت ہی میں موجود ہے اس لیے اس کی روانگی بھی ہماری ہی موجودگی میں ہوتی ہے۔ غرضکہ سرفراز پوسٹ آفس سے پرچہ تھیلوں میں بند ہو کر حفاظت سے بھیجا گیا ہے اس کے بعد بھی اگر کسی خریدار کو نہ ملے تو اس میں دفتر سرفراز کا کوئی قصور نہیں ہو سکتا۔ اب اگر پرچہ ضایع ہوگا تو وہ کہیں راستہ میں جس کی ذمہ داری ہمارے اوپر نہیں آتی۔ اس خیال سے کہ یہ نمبر یقینی طور پر مکتوب الیہ کو مل سکے پہلے ہی سرفراز کے ذریعہ ہم نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہر شخص کو محرم نمبر بذریعہ رجسٹری منگانا چاہیے اور رجسٹری کے اخراجات کے لیے موازی آٹھ آنے بھیج دینا چاہئیں۔ جن حضرات نے آٹھ آنے بھیج دیے ہیں ان کے پرچے ہم رجسٹری سے بھیج رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جن حضرات نے رجسٹری کے مصارف کے لیے آٹھ آنے کا بار برداشت کرنا گوارا نہیں کیا ہے اگر انھیں ہماری ہر ممکن احتیاط کے بعد بھی پرچہ نہ مل سکے تو وہ دفتر سے دوبارہ پرچہ بھیجے جانے کی فرمائش نہ فرمائیں گے۔

قومی انجمنوں سے استدعا

ملک میں سیکڑوں قومی انجمنیں ہیں جو برابر اپنے یہاں کی کارروائیاں سرفراز میں شائع کراتی رہتی ہیں۔ سرفراز بھی ان کے مراسلات وغیرہ کی اشاعت میں کسی بخل سے کبھی کام نہیں لیتا اور خندہ پیشانی سے ان کی تفویض کی ہوئی خدمت انجام دیتا ہے۔ مگر یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ سرفراز کی خریدار بہت کم انجمنیں ہیں۔ وہ اتنا بھی نہیں کرتیں کہ اپنے فنڈ سے سالانہ چندہ ادا کر کے سرفراز منگا لیا کریں جب کہ سرفراز قومی انجمنوں اور لائبریریوں کے ساتھ چندہ میں رعایت بھی کرتا ہے اور آٹھ روپیہ سال کے بجائے ان سے سات ہی روپیہ سال قبول کر لیتا ہے۔ اگر سرفراز آپ کی خدمت کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کی خریداری قبول نہ کریں۔

امید ہے کہ وہ شیعہ انجمنیں جو اب تک سرفراز کی خریدار نہیں ہیں اسی محرم نمبر سے خریداری قبول فرما کر ہمیں شکریہ کا موقع بخشیں گی۔

اگلا پرچہ ۲۵ر اگست کو شائع ہوگا

۲ر اگست کو محرم نمبر ڈسپیچ کر دینے کے بعد دفتری امور کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے اس لیے کہ محرم نمبر کی تیاری کی وجہ سے تمام حساب منتشر حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ۹ر اگست کو یکم یا ۲ر محرم ہوگی، ۱۷ر کو ۹ یا ۱۰ر محرم پڑے گی اس لیے ۹ و ۱۷ر اگست کے پرچے شائع نہ ہو سکیں گے اور آیندہ پرچہ انشاءاللہ ۲۵ر اگست کو شائع ہوگا۔

محرّم کے منتخبہ مراثی و نوحہ جات

ہلال محرّم عرف شمشیر ماتم حصّہ اول چھٹا ایڈیشن جس میں ۱۱۴ رُباعی ۳۷ سوز ۲۸ سلام ۸۵ سوزخوانی کے مرثیے ۲۸ نوحے وفات رسول خدا سے شہادت امام حسینؑ تک ہیں صفحہ ۳۲۶ ہیرہ

ہلال محرّم حصّہ دوم پانچواں ایڈیشن جس میں ۳۴ رُباعی - ۳۳ سوز - ۲۳ سلام ۷۰ مرثیے ۲۴ نوحے تاراجی خیام سے واپسی اہلحرم بمدینہ منورہ تک ہیں ہیرہ ہر دو حصے یکجائی مل جاتے ہیں

ہلال محرم حصہ سوم و چہارم و ششم زیر طبع ہیں

فغان محرم یعنی مجموعہ نوحہ جات سفرائے محترم و باقر مرحوم۔ حصہ اول، دوسرا ایڈیشن صفحہ ۳۸۲ مبکی بینہ مشہور شعرا کے نوحے وفات رسول خدا سے شہادت امام حسینؑ تک صفحہ ۲۴۴ عہ حصہ دوم زیر طبع ہے۔

جام شہادت نوحہ جات شوکت بلگرامی مرحوم حصہ دوم ساتواں ایڈیشن ۲۲۶ نوحے صفحہ ۳۰۴ عہ حصہ اوّل و دوم زیر طبع ہے جو عنقریب شائع ہوگا۔

فغان زہرا یعنی آہ جگر خراش چوتھا ایڈیشن حضرت مسرور کے نہایت مبکی نوحے صفحہ ۲۴۴ ہے۔

بیاض اہل ماتم نوحہ جات لائق مرحوم حصہ اول عہ دوم ۸ر و ۶ر

تسکین فاطمہ نوحہ جات نگین حصہ اول تیسرا ایڈیشن ۱۳۰ نوحے صفحہ ۱۷۶ عہ حصہ دوم ۱۲۰ نوحے صفحہ ۲۰۸ عہ حصہ سوم ۱۰۰ نوحے صفحہ ۱۴۱ عہ حصہ چہارم عہ زیر طبع

محصول ڈاک اس کے علاوہ ہوگا اولاً محصول ڈاک میں کچھ رعایت کی جائے گی

اس کے علاوہ ہر قسم کے کتب مذہبی، مرثیے، نوحے وغیرہ کتب خانہ ہذا میں مل سکتی ہیں۔ فہرست مفت طلب کیجیے یا دریافت فرمائیے۔

حیات القلوب (اردو) حصہ اول ھدیہ

سوانح چہاردہ معصومین کا سٹ غیر مجلد

محرم کے ایمان افروز دنوں اور راتوں میں

جب دنیا شہید کربلا کے غم سے متاثر ہوتی ہے۔ گوشہ گوشہ سے یاحسینؑ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور نوحوں کی آوازیں درد انگیز لہجوں میں سنائی دیتی ہیں۔ یہ نوحے آپ کو کہاں سے دستیاب ہوسکیں گے؟ یہ نوحے آپ کو صرف ہماری طبع شدہ بیاضوں میں ملسکیں گے۔ جہاں صحت طباعت وصفائی وغیرہ کا کافی خیال رکھا جاتا ہے۔

ذبیح فرات معزز ۴	زمین کربلا شارب ۶	فرات کی لہریں فضل ۱۲
نبی کا نواسہ نبی ۴	داستان کربلا قرار ۸	تصویر قیامت نہال ۶
تبرکات سبزوا ازعارف	مظلومین نینوا	انوار کربلا ۶
عصر عاشور شور	تصورات ماتم شارب	

ازعالی جناب مولوی سید ریاض الحسن صاحب قبلہ موسوی

گنجینہ مصائب

تیسرا اڈیشن تیار ہوگیا ہے

نظم ونثرخوانی کی لاجواب کتاب مع بعض ضروری اضافوں کے

اس کتاب کی خصوصیات بھی قابل لحاظ ہیں اس میں جابجا نثر کی آغوش میں نظم کو بھی جگہ دی گئی ہے اور اس بات کو بھی مدنظر رکھا ہے کہ مجالس میں طول نہ ہونے پائے۔ مصائب کے حق میں بھی یہ کتاب آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب مجموعی حیثیت سے نہایت قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔ کتاب ہذا کی ایک خصوصیت یہ بھی قابل تذکرہ ہے کہ اگر اشعار درمیان سے علیحدہ کرلئے جائیں تو بھی سلسلہ مضمون کہیں سے بے ربط نہیں ہوگا اور حدیث میں وہی مزہ باقی رہے گا۔ لیکن جابجا اشعار نے احادیث کے مضامین میں ایک تازہ روح پھونک دی ہے جس سے مضامین میں ایک لطف اور مصائب میں ایک خاص تلاطم پیدا ہوگیا ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۲ صفحات تقریباً پونے دو سو قلم خوب جلی کہ بوڑھے لوگ بھی آسانی سے پڑھ سکیں۔ اردو نہایت سلیس کہ کم پڑھے لکھے حضرات اور خاص کر مستورات بھی اس کتاب سے لطف اندوز ہوسکیں۔

مومنین اس کتاب کو دست بدست خرید کر اپنے عورتوں اور بچوں کو اسلامی معلومات سے بہرہ ور فرمائیں اور ان میں ذاکری کی اسپرٹ پیدا کرکے تذکرہ اہلبیت کا احیاء کریں تاکہ ثواب عبادت سے ان کا نامۂ اعمال مزین ہوجائے۔

قیمت ... دو روپیہ بارہ آنے ۲/۱۲ قیمت مجلد تین روپیہ چار آنے (علاوہ محصول)

بیخ البکا	رقیہ بیگم	۶
مقبول آنسو	سالک	۸
شاہ کربلا نینوا	شور	۶
ہاشمی تارہ	”	۸
آل رسول	”	۶
باغ زہرا	”	۶
کربلا کا نمازی	متفرق	۵
کربلا والے	”	۶
الہٰی دنیا	”	۶
گلزار زہراء	”	۵
ہدیۂ عقیدت	”	۱۲
ٹوٹے تارے	”	۴
کرب وبلا	شارب	۶
سفینۂ کربلا	معزز	۸
گریۂ گلرنگ	مقرب	۸
پیاسے	قرار	۸
پیاسوں کی یاد	احسن	۴
نغمات معصومین	”	۴
شام غریباں	قرار	۴
آفتاب کربلا	صدر	۴
انقلاب کربلا	نہال	۶
حسینی پرچم	خنداں	۴

داستان مظلوم ۸ ریاقوت والماس ۸ رجواہر وحدت ۸ ر ذاکری کے جدید مسودات ...

صحیفۂ علویہ

جناب امیرؑ کی ۱۶۱ دعاؤں کا مجموعہ ...

صحیفۂ کاملہ

امام زین العابدین علیہ السلام کی دعاؤں کا مجموعہ ...

ذکر العباس

سوانح جناب عباس علیہ السلام ...

ہفت سورہ ... ۸

وظائف الابرار مترجم

اکیس سورے اور متفرق دعائیں ہیں ...

ذخیرہ مناقب

واسخ جلی قلم ...

بستان المجالس

مصنفہ عالی جناب مولانا مولوی سید علی ماہر صاحب قبلہ اجتہادی (صدر الافاضل) نہایت عام فہم سلیس اردو میں خواتین شیعہ اطفال کے لیے جدید مسودا لکھے گئے ہیں ذاکری کے واسطے اچھی کتاب ہے ۸

مجموعۂ مناقب۔ مناجات کی

چھوٹی سی کتاب (زیر طبع)

جواہر المصائب

حدیث خوانی کی نئی کتاب

از مولوی سید ریاض الحسن صاحب قبلہ

سال پیوستہ کا نیا اڈیشن

چند جلدیں باقی ہیں ...

چہل مجلس

نیا اڈیشن

واقعات کربلا کے متعلق چالیس مجلس (نظم ونثر)

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

چودہ ساقی

صرف ۲ مخمس چھوٹے سائز میں از حضرت عندر لکھنوی ۲

استخارۂ سجادیہ ۸

تحت وبیر سکھانے

سکھانے کی لاجواب کتاب ہے کئی اڈیشن چھپ چکی ہے ...

تحفہ احمدیہ جلد دوم

اس میں کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے رہنے سہنے کے احکام مطابق اقوال آئمہ اطہار جمع کئے گئے ہیں

عملیہ

ھدیہ ... سرکار آقائے بروجردی مدظلہ کے تمام ضروری مسائل ...

تحفۃ العوام

نہایت مشہور مقبول کتاب ہے قیمت ...

قصائد چہاردہ معصومین

سو شاعروں کے تقریباً دو سو قصیدے

لاکٹ تعویذی حمائل

بچوں کے گلے میں ڈالنے کے لئے وزن ۳ ماشہ ...

کتبے اور طغرے

عزاخانوں، مسجدوں اور گھروں کی سجاوٹ کے لئے نہایت موزوں زیارت میں لگانے کے لئے۔ فی ۳

شاہزادہ علی اصغر

سوانح جناب علی اصغر علیہ السلام

مراثی سوزخوانی

تقریباً ۵ طرح کے فی ارد ۲

سوز کی کتاب

چھوٹے سائز کے ۳۲ صفحوں میں یہ سوز مرثیہ خوانی کے پہلے پڑھے جاتے ہیں۔ قیمت ۲

فلسفۂ مذہب شیعہ	
تاریخ بنی ہاشم	
ماجرائی کربلا	
مرقع اسلام	
نہج البلاغہ۔ ترجمہ حصہ اول	
” حصہ دوم ، حصہ سوم	
تاریخ احمدی	
دینیات حصہ اول	۳
” حصہ دوم	۱۰
” حصہ سوم	۱۲
مذہبی کہانیاں	۱۰
دعائے نور	
حدیث کساء	۲
دعائے سابب	۳
دعائے صباح	۲
دعائے مشلول	۳
مکارم الاخلاق	۲

تعویذات عکسی

برائے حفاظت مکین ومکاں خود پہنئے اور بچوں کو پہنائیے

ام الصبیان	۱
حرز جواد	۱
دعائے نور	۱
دعائے ابودجانہ	۱
دعائے سوسن	۱
ہفت ہیکل شریف	۱
علقۂ یسین مع آیۃ الکرسی	۳
حرز امیر المومنین	۱
پنجۂ حیدری	۱
آیۃ الکرسی تعویذی	۱

جلدہائے مراثی

وقار انیس، افکار وحید، افکار تعشق، اسرار محسن، افکار نفیس، آثار عشق، بہار موزوب، بازار سخن، بہار کامل، اشعار دبیر، گلزار رشید، افکار تعشق جلد دوم، وقار انیس، مرثیۂ نفیس مع صلاح انیس، اذکار محسن

ہماری مندرجہ ذیل شائع کردہ کتابیں خریدیئے

ایک جان تین قالب خان محبوب طرزی کا حیرت انگیز ناول میڈیکل سرجری کا ایک عجیب و غریب کارنامہ، دلچسپ ہمان جس کے متعلق مصنف کا دعوئی ہے کہ آجتک عجیب و غریب ناول میرے قلم سے نہیں نکلا قیمت چار روپیہ للعہ

دوشیزۂ قاف خان محبوب طرزی کا معرکۃ الآرا جدید تاریخی اسلامی ناول جو کہ اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے قیمت پانچ روپیہ صہ

قیامت صغریٰ خان محبوب طرزی کا سائنٹفک ناول قیمت سہ

دلربا۔ خان محبوب طرزی کا سماجی ناول قیمت ے

معمار۔ کہنہ مشق اور کامیاب ترین ناول نگار مائل ملیح آبادی کا شمالی افریقہ کے پس منظر پر ایک رزمیہ تاریخی ناول مغرب کے معماروں کی ایک زندۂ جاوید تصویر قیمت للعہ

غزنی دروازہ۔ مائل ملیح آبادی کا جدید ترین تاریخی اسلامی ناول تیار ہوگیا ہے قیمت للعہ

سفر۔ مائل ملیح آبادی کا جدید ترین اسلامی تاریخی ناول قیمت ے

زینب ساحرہ۔ مغرب اقصیٰ کی وہ اولوالعزم حسینہ جس نے اپنے شوہر کو جام شراب کے بجائے تلوار پیش کرکے افریقہ و اسپین کا فاتح بن تاشقین بنادیا۔ دحشی محمود آبادی کا تازہ ترین تاریخی ناول قیمت ے

سید سالار مسعود غازی۔ ناول کے انداز میں مکمل سوانحیات از دحشی محمود آبادی۔ قیمت ے

زلیٹوں کا بادشاہ۔ حکیم بابا مشہور ادیب جناب علی عباس حسینی کا تازہ ترین ناول، قدیم زندگی کی ایک جھلک زلیٹوں کے ساتھ ضلع جگتی اور طلسم ہوشربا نامی کتاب کی طرح نہایت ہی دلچسپ ہنسانے والا ناول قیمت ۔ ے

سخنہائے گفتنی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کے جدید تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو کہ اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت للعہ

جوئے رواں۔ حامد اللہ افسر کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ قیمت عہ

ادبی خطوط غالب۔ مرزا عسکری بی۔ اے ایسے خطوں کا مجموعہ جن میں مرزا غالب نے نکات ادبیہ حل کیئے ہیں اور اشعار کے معنی سمجھائے ہیں اور شعراء کے متعلق رائے زنی کی ہے۔ قیمت سہ

ذوق ادب اور شعور۔ پروفیسر سید احتشام حسین رضوی کے معرکۃ الآرا جدید تنقیدی مضامین کا مجموعہ جن کے متعلق ہندو پاکستان کے ادبی رسالوں نے اپنی عمدہ رائیوں کا اظہار کیا ہے قیمت ے

روایت اور بغاوت۔ (مع اضافہ جدیدہ) پروفیسر احتشام حسین کی معرکۃ الآرا کتاب جلد از جلد طلب فرمائیے۔ قیمت ے

ادب و نظریہ۔ پروفیسر آل احمد سرور کا چوتھا جدید تنقیدی مضامین کا مجموعہ جس کو ہر بہی خواہ اردو نے سراہا ہے اور اپنی لائبریریوں کی زینت بنایا۔ آپ بھی جلد اس کو خریدیئے۔ قیمت ے

محبوبۂ کربلا۔ جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر کے مشہور ناول غادۃ کربلا کا اردو ترجمہ یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی شائقین کے اصرار پر اس کا جدید ایڈیشن شائع کیا گیا ہے لہذا جلد آرڈر دیجئے قیمت عہ

حجاج بن یوسف۔ جرجی زیدان کے مشہور ناول غادۃ کربلا کا اردو ترجمہ جو کہ تقریباً پچیس برس سے نایاب تھا۔ اب تیار ہوگیا ہے جلد طلب فرمایئے قیمت للعہ

پیسہ اور پرچھائیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کے نو ڈراموں کا مجموعہ جس پر ہند گورنمنٹ نے مجموعی طور پر ۵۰۰ روپیہ انعام دیئے ہیں قیمت عہ

قدر و نظر۔ پروفیسر اختر اورینوی۔ صدر شعبہ اردو پٹنہ کالج پٹنہ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ جس کا آپ کو بیچینی سے انتظار تھا۔ جلد طلب فرمائیے۔ قیمت ے

کف گلفروش ۔ غلام احمد فرقت کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ قیمت ۲/
ستاروں سے ۔ شوکت تھانوی کے تنیش محل کی طرح
آگے نہایت دلچسپ کتاب ۔ ۸/
تنقیدی اشارے ۔ (مع اضافہ جدید) آل احمد سرور ہمارے ممتاز نقادوں میں سے ہیں ان کی تنقید میں تخلیقی رس ہے ۔ اسی لئے علم و ادب کے شیدائی ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں ۔ آپ بھی تنقیدی اشارے (مع اضافہ جدید) ضرور ملاحظہ فرمائیے جو کہ تیار ہو گئی ہے اور یو۔پی کے محکمہ تعلیم نے انٹرمیڈیٹ کورس میں بھی شامل کر لی ہے
قیمت ۔/

مندرجہ ذیل کتب کے بغیر آپکی لائبریری نامکمل ہے اسلیے جلد

ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتابیں خریدیے

۱۔ مطالعۂ حالی ۔ ناظر کاکوروی و شجاعت علی سندیلوی ۸/
۲۔ مطالعۂ شبلی ۔ " " ۸/
۳۔ داکھی ۔ ڈرامہ شجاعت علی سندیلوی کا ۔ قیمت ۶/
۴۔ ادب کیا ہے مجموعہ مضامین جدید ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
۵۔ ایک نادر روزنامچہ ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
۶۔ ستاروں سے آگے ۔ ناظر کاکوروی ۔ قیمت ۸/
۷۔ اردو کے ہندو ادیب "
۸۔ سخنہائے گفتنی ۔ جدید تنقیدی مضامین ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد للعہ
۹۔ قدر و نظر ۔ مجموعہ مضامین تنقید اختر اورینوی ۔/
۱۰۔ نقوش و افکار ۔ جدید تنقیدی مضامین ۔ مجنوں گورکھپوری ۔/
۱۱۔ حسرت موہانی ۔ اضافہ شدہ ایڈیشن عبدالشکور ۸/
۱۲۔ ذوق ادب و شعور مضامین تنقید احتشام حسین ۔/
۱۳۔ ساحل اور سمندر ۔ سفرنامہ امریکہ سید احتشام حسین للعہ
۱۴۔ روایت اور بغاوت مجموعہ مضامین ۸/
۱۵۔ ادب اور نظریہ ۔ آل احمد سرور مجموعہ تنقید مضامین ۸/
۱۶۔ نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدید ۔ آل احمد سرور ۔/
۱۷۔ ذوق جنوں (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) آل احمد سرور ۸/
۱۸۔ تنقیدی اشارے ۔ مجموعہ مضامین تنقید (مع اضافہ جدید) آل احمد سرور ۔ قیمت ۔/
۱۹۔ اردو میں تنقید ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۔ قیمت

۲۰۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں ۔ عبدالماجد دریابادی ۔/
۲۱۔ گاندھی جی کے ساتھ یکم جنوری سے ۳۱ دسمبر تک ۸/
۲۲۔ جوئے رواں ۔ مجموعہ جدید کلام حامداللہ افسر
۲۳۔ مقدمہ شعر و شاعری ۔ حالی
۲۴۔ ادبی خطوط غالب ۔ مرزا عسکری
۲۵۔ طرۂ امیر ۔ امیر احمد علوی ۸/
۲۶۔ فلسفۂ اقبال و انتخاب کلام اقبال ۔ عبدالقوی دریابادی بی۔اے
۲۷۔ بہادر شاہ ظفر ۔ مع انتخاب کلام امیر احمد علوی ۔ بی۔اے ۔/
۲۸۔ شاہان مالوہ " ۸/
۲۹۔ ہندی کے مسلمان شعراء ۔ نورالٰہی
۳۰۔ سرمایۂ زبان اردو ۔ جلال لکھنوی
۳۱۔ کف گلفروش ۔ مزاحیہ مضامین غلام احمد فرقت ۔/
۳۲۔ اپنی موج میں ۔ مزاحیہ مضامین آوارہ ۸/
۳۳۔ پیسہ اور پرچھائیں (نو ڈراموں کا مجموعہ) ڈاکٹر محمد حسن
۳۴۔ ادبی تنقید " ۸/
۳۵۔ رخسار سحر ناول ۔ انفر کریم قدوائی ۸/
۳۶۔ مجموعۂ کربلا ۔ جرجی زیدان ۸/
۳۷۔ حجاج بن یوسف " للعہ
۳۸۔ اسپین کی شہزادی ۔ اسلامی ناول ۔ مولانا صادق حسین للعہ
۳۹۔ معرکۂ روم و یونان ۔ " " ۔/

۴۰۔ تنقیدی اصول اور نظریے ۔ حامداللہ افسر
۴۱۔ شرح دیوان اردو غالب ۔ طباطبائی
۴۲۔ ثنائے حبیب نعتیہ کلام بہزاد لکھنوی
۴۳۔ اچھی نظمیں ۔ اختر مشتاق
۴۴۔ قیامت صغریٰ ۔ ناول خان محبوب طرزی ۔/
۴۵۔ ایک جان تین قالب ۔ خان محبوب طرزی للعہ
۴۶۔ دوشیزۂ قاف " اسلامی تاریخی ناول ۔/
۴۷۔ دلربا ۔ سماجی ناول " ۔/
۴۸۔ سپہ سالار مسعود غازی وحشی محمود آبادی
۴۹۔ زینب ساحرہ ۔ تاریخی ناول
۵۰۔ معمار (اسلامی تاریخی ناول) مائل ملیح آبادی للعہ
۵۱۔ سفر ۔ اسلامی تاریخی ناول ۔/
۵۲۔ غزنی دروازہ " للعہ اسلامی تاریخی ناول
۵۳۔ زبیٹوں کا بادشاہ ۔ حکیم بابا مزاحیہ ناول علی عباس حسینی ۔/
۵۴۔ مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی
۵۵۔ دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ
۵۶۔ شہر آشوب ۔ ناظر کاکوروی
۵۷۔ ابوالجبر ۔ مجنوں گورکھپوری
۵۸۔ اپنی پہچان ۔ اعجاز فاروقی

محرم کی ایمان افروز آوازیں

جب فضائیں شہید کربلا کے غیرفانی غم سے متاثر ہوتی ہیں، گوش عالم سے یا حسینؑ کی صدائیں ٹکراتی ہیں، عزاداروں کا سیاہ لباس دعوت گریہ دیتا ہے اُس وقت آپ کو نوحوں کی آوازیں دردانگیز لہجوں میں سُنائی دیتی ہیں یہ نوحے زیادہ تر حسینی شاعر حضرت **فضل لکھنوی**

کے نظم کیے ہوئے ہوتے ہیں، ان کی تقریباً بیس تصانیف "ہند و پاکستان" کے علاوہ جنوبی افریقہ اور عراق ایران تک پہونچ چکی ہیں۔ ہر ہر کتاب کئی کئی اڈیشن چھپ کر ختم ہو چکی ہے تلاش کرنے کے بعد بھی بہت سی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں **ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کی جانب سے** موج فرات کی پانچویں جلدیں حسینی شاعر کی نظرثانی کے بعد چھپ رہی ہے اور اُن کی نئی بیاض

فرات کی لہریں

اور ساتھ ہی ساتھ شمع فرات جلوۂ فرات صحیفہ ماتم، انقلاب فرات اور عروج فرات بھی ادارۂ فروغ اردو کی جانب سے عنقریب شائع ہونیوالی ہیں

موج فرات کی پانچوں جلدوں کی قیمت ۱۲ روپے اور شمع فرات اور عروج فرات اور "فرات کی لہریں" ہر ایک فی جلد ۱۲ ار کی ہے۔ (علاوہ محصول ڈاک) ابھی سے اپنا نام خریداروں میں درج فرما دیجیے تاکہ تیار ہوتے ہی بذریعہ وی، پی۔ آپ کی خدمت میں روانہ کر دی جائیں۔

ایجنٹ حضرات کو معقول کمیشن

ملنے کا پتہ:۔ منیجر ادارۂ فروغ اردو ۲۷ امین آباد پارک لکھنؤ

فہرست رسائل امامیہ مشن، لکھنؤ

ان رسائل کی زیادہ سے زیادہ تعداد خرید فرما کر جدید رسائل کی اشاعت میں اپنے مشن کی امداد فرمایئے۔

نمبر	نام رسالہ	قیمت	محصول
	قاتلان حسینؑ کا مذہب (چوتھا ایڈیشن)	۶ر	۲ر
	اصول دین اور قرآن (دوسرا ایڈیشن)	۶ر	۲ر
	اتحاد الفریقین حصہ اول	۴ر	۲ر
	حسینؑ اور اسلام (اردو)	۴ر	ار
	حسینؑ اور اسلام (ہندی)	۸ر	ار
	حسینؑ اور اسلام (انگریزی)	۱۲ر	ار
	[illegible] اور اسلام (دوسرا ایڈیشن)	۱۲ر	۳ر
	تجارت اور اسلام	۹ر	ار
	رجال بخاری حصہ اول	۹ر	۲ر
	نور و نار غدیر (دوسرا ایڈیشن)	۳ر	ار
	تذکرہ حفاظ شیعہ حصہ اول	۹ر	۲ر
	〃 〃 حصہ دوم	۷ر	۲ر
	مقصود کبیر	۲ر	[illegible]
	مذہب باب و بہا حصہ دوم	۱۲ر	۳ر
	دور استبداد	۶ر	۲ر
	حقیقت براء	۳ر	ار
	خطیب آل محمدؐ	۶ر	۲ر
	تدوین حدیث	۲ر	ار
	مطلوب کعبہ	۲ر	ار
	محاربہ کربلا	۳ر	ار
	اسلام کا پیغام اردو	ار	ار
	دی میسیج آف اسلام (انگریزی)	ار	ار
	اثبات عزاداری	۶ر	۲ر
	فدک	۷ر	۲ر
	[illegible] کعبہ	۲ر	ار

نمبر	نام رسالہ	قیمت	محصول
۴۳	خلافت و امامت حصہ اول	۷ر	۲ر
۴۴	〃 〃 حصہ دوم (دوسرا ایڈیشن)	۱۴ر	۲ر
۴۵	خلافت و امامت حصہ سوم (دوسرا ایڈیشن)	۱۴ر	۲ر
۴۶	تحقیق اذان	۲ر	ار
۴۷	ذوالجناح اردو	۲ر	ار
۴۸	شہدائے کربلا حصہ اول	ختم	شد
۵۰	حسینؑ اینڈ دی سیلین آف کربلا (انگریزی)	۴ر	ار
۵۲	لانفسدو فی الارض	۱۱ر	۲ر
۵۳	نہج البلاغہ کا استناد	۶ر	ار
۵۴	خلافت و امامت حصہ چہارم	ختم	شد
۵۵	شہدائے کربلا حصہ دوم	۷ر	۲ر
۵۶	ابو الائمہ کے تعلیمات	۶ر	۲ر
۵۹	آثار باقیہ	۲ر	ار
۶۰	صحیفہ سجادیہ کی عظمت	۲ر	ار
۶۱	خلافت و امامت حصہ پنجم	۸ر	۲ر
۶۲	خدا کی معرفت	۱۱ر	۲ر
۶۳	شہدائے کربلا حصہ سوم	۶ر	۲ر
۶۴	خلافت و امامت حصہ ششم	۱۱ر	۳ر
۶۵	دی لاسٹ میسیج آف حسینؑ	۳ر	ار
۶۶	ہمارے رسوم و قیود	۳ر	ار
۶۷	شیعوں کی تازہ زندگی	۲ر	ار
۶۹	مذہب شیعہ اور تبلیغ	۲ر	ار
۷۰	اسیری اہل حرم	۳ر	ار
۷۲	نظام زندگی حصہ اول	۶ر	ار
۷۳	〃 حصہ دوم	۷ر	۲ر

نمبر	نام رسالہ	قیمت	محصول
۷۴	حقیقت اسلام	۲ر	ار
۷۵	مظلومؑ کربلا	۳ر	ار
۷۶	دی مارٹرس آف کربلا (انگریزی)	۲ر	ار
۷۷	تناسخ پر مختصر بحث	۳ر	ار
۷۸	نظام زندگی حصہ سوم	۹ر	ار
۷۹	حیات قومی	۲ر	ار
۸۰	جبر و اختیار	۲ر	ار
۸۱	مذہب اور عقل	۱۲ر	۲ر
۸۲	حسینؑ کا پیغام عالم انسانیت کے نام (گجراتی ترجمہ)	۳ر	ار
۸۳	حسینؑ کا پیغام عالم انسانیت کے نام (سندھی ترجمہ)	۳ر	ار
۸۵	حسینؑ کا پیغام عالم انسانیت کے نام (بنگالی ترجمہ)	۳ر	ار
۸۶	ذرات ازلی نہیں (اردو)	۲ر	ار
۸۷	اقوام عالم میں عورت کا معیار	۶ر	ار
۸۸	نظام زندگی حصہ چہارم (دوسرا ایڈیشن)	۹ر	ار
۹۳	شیعہ علم کلام کی برتری	۲ر	ار
۹۴	مذہب و سیاست	۴ر	ار
۹۵	عہد مامون اور امام رضاؑ	۶ر	ار
۹۶	مسائل و دلائل	۱۱ر	ار
۹۸	عربی مرثیہ کی مختصر تاریخ	۱۲ر	۲ر
۹۹	امام حسینؑ میسیج ٹو دی نیشنس (انگریزی)	۲ر	ار
رسائل ۹۷ و ۱۰۰ تا ۱۱۱ و ۱۱۴	مکمل سٹ، سوانح چہاردہ معصومینؑ (اردو)	عہ ۱۲ر	۴ر
۱۱۲	عزائے حسینؑ پر تاریخی تبصرہ	۱۴ر	۲ر
۱۱۳	اثبات پردہ	عہ ۲ر	۲ر

نمبر	نام رسالہ	قیمت	محصول ڈاک	نمبر	نام رسالہ	قیمت	محصول ڈاک	نمبر	نام رسالہ
۱۱۵	تقیہ	۵ر	ار	۱۵۴	حیات جناب ہاشمؑ (اردو)	۲ر	ار	۱۷۹	ابوالاعلیٰ مودودی کا
۱۱۷	سلطان عربؐ	۲ر	۱۰ر	۱۵۵	معاد (انگریزی)	۳ر	ار		نظریہ اسلامی سیاست
[illegible]	محرم کا سامان (ہندی)	۳ر	ار	۱۵۶	نماز (اردو)	۲ر	ار	۱۸۰	دفاع از اسلام (انگریزی)
[illegible]	مختصر سوانح چہاردہ معصومینؑ			۱۵۷	عدل (ہندی)	۴ر	ار	۱۸۱	فرق اسلامی کا ابتدائی
[illegible]	(انگریزی)	۸ر	۶ر	۱۵۸	علمدار کربلا (اردو)	۲ر	ار		مطالعہ
۱۳۲	اسلام کا نظریہ حکومت	۲ر	ار	۱۵۹	معصومؑ شہزادی	۲ر	ار	۱۸۲	زکوٰۃ (اردو)
۱۳۳	توحید (اردو)	۲ر	ار	۱۶۰	صدیقہ صغریٰ	۲ر	ار	۱۸۳	ذوالجناح (انگریزی)
۱۳۴	عدل "	۲ر	ار	۱۶۱	شیرخوار مجاہد	۲ر	ار	۱۸۴	شانتی سروت (ہندی)
۱۳۵	نبوت "	۲ر	ار	۱۶۲	ازواج حسینؑ	۵ر	ار	۱۸۵	حضرت زینب خاتون اردو
۱۳۶	امامت "	۲ر	ار	۱۶۳	روزہ (اردو)	۲ر	ار	۱۸۶	مقصد حسینؑ
۱۳۷	قیامت "	۲ر	ار	۱۶۴	سورگ بالا (ہندی)	۴ر	ار	۱۸۷	دیں پناہ است حسینؑ
۱۳۸	محرم انگریزی	۲ر	ار	۱۶۵	ہلاکت و شہادت (اردو)	۳ر	ار	۱۸۸	شب شہادت
۱۳۹	ہیروز آف اسلامک اسٹیٹ (انگریزی)	۴ر	ار	۱۶۶	کربل نگری (ہندی)	۴ر	ار	۱۸۹	شاہ است حسینؑ بادشاہ است ح
۱۴۰	شجاعت کے مثالی کارنامے (اردو)	۴ر	ار	۱۶۷	آفٹر کربلا (انگریزی)	۴ر	ار	۱۹۰	شہادت زار کربلا
۱۴۱	حسینؑ اور ہندوستان (ہندی)	۳ر	ار	۱۶۸	دی مارٹر انٹرنیشنل (انگریزی)	۲ر	ار	۱۹۱	تاریخ اسلام میں واقعہ
۱۴۲	توحید انگریزی ترجمہ	۳ر	ار	۱۶۹	مہان انترراشٹریہ شہید				کربلا کی اہمیت
۱۴۳	حیات عبدالمطلب اردو	۴ر	ار		(ہندی)	۲ر	ار	۱۹۲	اگر واقعہ کربلا نہ ہوتا
۱۴۴	عدل (انگریزی ترجمہ)	۳ر	ار	۱۷۰	بین الاقوامی شہید اعظم			۱۹۳	استقامت علی الحق کا مع
۱۴۵	نبوت	۳ر	ار		حسینؑ ابن علیؑ (اردو)	ار	ار	۱۹۴	زندہ جاوید کا ماتم
۱۴۶	تاریخ شیعہ کا مختصر خاکہ اردو	۲ر	ار	۱۷۱	منازل آلام (اردو)	۵ر	ار	۱۹۵	طاقت کا مقابلہ کردا
۱۴۷	امامت انگریزی ترجمہ	۴ر	ار	۱۷۲	الصلوٰۃ (انگریزی)	۴ر	ار	۱۹۶	ذوالجناح ہندی
۱۴۸	حیات ابوطالب اردو	۴ر	ار	۱۷۳	صوم (انگریزی)	۳ر	ار	۱۹۷	ڈیفینیشن اینڈ سالو
۱۴۹	توحید ہندی	۳ر	ار	۱۷۴	نماز (ہندی)	۳ر	ار		تھرو ڈیتھ
۱۵۰	شیعہ ازم انگریزی	۴ر	ار	۱۷۵	روزہ (ہندی)	۳ر	ار	۱۹۸	جناب مسلم ابن عقیلؑ
۱۵۱	شانتی سندیش ہندی	۴ر	ار	۱۷۶	حیات ام المومنین جناب			۱۹۹	امر سینانی ہندی
۱۵۲	ڈیوائن رول انگریزی	۴ر	ار		خدیجۃ الکبریٰؑ	۴ر	ار	۲۰۰	جناب ہانی بن عروہ
۱۵۳	شیعہ اتہاس کی سنچھپت			[illegible]	ابھرانت آتما (ہندی)	۴ر	ار	۲۰۱	عزاداری اور بدع
	روپ ریکھا ہندی	۴ر	ار	۱۷۸	اسلام اور انسانیت (اردو)	۶ر	ار		

الداعی الی الخیر:- سید ابن حسین نقوی عفی عنہ۔ آنریری سکریٹری امامیہ مشن، نخاس، لکھ